اب کنوائر کے ذریعہ
دہلی کا
سفر کیجئے۔
پی۔آئی۔اے کی کنوائر سروس سے دہلی کا
ہوائی سفر کیجئے
پاکستان انٹرنیشنل ائرلائنز

کیپسٹن سگریٹ خریدیئے
اِن کا قوام
بہتر
ہے
MEDIUM
CAPSTAN
Navy Cut
CIGARETTES
W D & H O WILLS
BRISTOL & LONDON
TRADE
MARK
۶|۸|- میں دس سگریٹ
جہاں کہیں مقامی ٹیکس لگتا ہو وہاں اس قیمت میں کچھ فرق ہو سکتا ہے
PAKISTAN TOBACCO CO LTD.
SUCCESSORS TO W D & H O WILLS, BRISTOL & LONDON
CIGARETTES MADE IN PAKISTAN.

LUX
LUX
TOILET SOAP
میں لکس
ٹائیلٹ صابن استعمال کرتی ہوں
رخشی کہتی ہے
فلمی
ستاروں کا سفید
اور خوشبودار حسن بخش صابن

ماہِ نو

جلد ۹ ——— شمارہ ۱۰

جنوری ۱۹۵۷ء

●

مدیر : رفیق خاور

نائب مدیر : ظفر قریشی

●

سالانہ چندہ

ساڑھے پانچ روپے

فی کاپی ——— آٹھ آنے

●

ادارۂ مطبوعات پاکستان

پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی

●

شاہین کمپنی

نیوز پیپر ایجنٹ

معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد دکن

اداریہ :	آپس کی باتیں		۶
	ذ ظفر علی خاں : "نازشِ قوم"	مولانا حالی مرحوم	۷
	بابائے صحافت	مولانا عبد المجید سالک	۸
		سید عابد علی عابد	۹
	"یادِ ظفر علی خاں"	عشرت رحمانی	۱۰
مقالات :	اردو کی دو مقبول مثنویاں	منیر فاروقی	۱۳
	ہمارے صحرائی نغمے	حامد علی خاں	۴۱
	اسہال	ڈاکٹر محمد باقر	۴۳
	خوشبو	سید یوسف بخاری	۴۸
افسانے :	جیب کترا	غلام عباس	۲۴
	"شہی تور دلئی" (پشتو رومان)	رضا ہمدانی	۲۸
	نتیجہ	کمال پاشا	۳۵
نظمیں :	مناجات	یوسف ظفر	۲۰
	حسینۂ یونان (کینٹوم)	سید جعفر طاہر	۲۱
	تابِ نظارہ	جمیل نقوی	۲۳
غزلیں :	حامد اللہ افسر	• روش صدیقی	۳۸
	سید عبد الحمید عدم	• ادا جعفری	۳۹
	ضمیر اظہر	• مشفق خواجہ	۴۰
	ہماری ڈاک		۵۴

سرورق : بندرگاہ کیماڑی (کراچی) میں ماہی گیری کا نیا گھاٹ۔

آپس کی باتیں

وہ شمع جس نے برسوں ہماری ادبی محفلوں میں اجالا کیا تھا، آخر کار خاموش ہوگئی یعنی پیکرِ حریت، بابائے صحافت مولانا ظفر علی خاں ہم سے رخصت ہوگئے۔ اس سانحے پر ایک تڑپا دینے والے درد کا احساس ہوتا ہے۔ وہ بھیانک سائے جو ایک ایک کرکے کتنی ہی منور شمعوں کو نگل چکے ہیں، ایک مدت سے اُس شمع فروزاں کو گھیرنے جا رہے تھے جس نے نصف صدی سے زیادہ عرصہ ادب وصحافت کی فضاؤں کو آب وتاب کے ساتھ روشن رکھا تھا۔ پھر بھی ہمیں تسلی تھی کہ یہ جھلملاتی ہوئی شمع ہماری انجمن میں موجود ہے۔ اب اگرچہ یہ شمع بھڑک بھڑک کر گل ہوگئی، پھر بھی جو روشنی اس نے پھیلائی تھی اس سے ادب وصحافت کی دنیا برابر جگمگاتی رہے گی۔
مولانا ظفر علی خاں کے تاریخی ہنگامے، انقلاب آفریں سرگرمیاں، سیاسی تحریکیں، خطیبانہ جوش وخروش، ادبی معرکے اور صحافتی کارنامے مدتوں یادگار رہیں گے کیونکہ ان کا دامن اُس دور سے وابستہ ہے جو آزادی کے لئے سرفروشانہ جدوجہد کا دور رہا ہے اور جس میں ظفر علی خاں نے ایک ہراول کی حیثیت سے نمایاں اور مختلف النوع کردار ادا کیا ہے۔ ایک چومکھی لڑنے والا، ان تھک مجاہد، بالغ نظر سیاست داں، بے باک صحافی، آتش بیان مقرر، صاحب طرز ادیب، باکمال شاعر، منفرد مترجم، ماہر زباں داں، زندہ دل بذلہ سنج اور بے پناہ طنز نگار، یہ ان کی شخصیت کے چند اہم پہلو ہیں۔ ان کی ہمہ گیر زندگی ایک ۵۷ء سے دوسرے ۵۷ء تک کے بحرانی دور کا روشن آئینہ ہے جس میں اس عہد کی تمام سرگرمیوں، تحریکوں، ہنگاموں اور خارجی و داخلی رجحانات کا پورا عکس دکھائی دیتا ہے۔ آزادی گہری نیند سو رہی تھی، ظفر علی خاں نے دوسروں کے ساتھ مل کر اسے ولولہ آفریں تقریروں سے جگا دیا۔ سیاست گھٹنوں کے بل رینگ رہی تھی، انہوں نے اسے پاؤں پر کھڑا کرکے چلنے کی سکت عطا کی۔ علم وادب کو انہوں نے زورِ بیان سے کئی منزل آگے پہنچا دیا۔ اور زبان کا دامن گوناگوں اصطلاحات اور اعلیٰ تراجم کے گلہائے رنگ رنگ سے بھر دیا۔ ان کی محبوب ملت بے سروسامانی کی حالت میں ان کے سامنے تھی، انہوں نے اس کے پیکرِ افسردہ میں اپنے حیات آفریں نفس سے نئی روح پھونکنے میں مدد دی۔ ان کے فیضان میں وہ بے نظیر نعتیں بھی شامل ہیں جو آج بھی ہمارے وردِ زبان ہیں۔

اتفاق سے اس پیکرِ حریت کی وفات بھی ہوئی تو اس وقت جب ہماری پہلی جنگِ آزادی کی سالگرہ واقع ہو رہی ہے۔ شاید اُن کی آزاد روح اسی وقت کی منتظر تھی جو حریت سے مخصوص ہے۔ ایک اور پیکرِ حریت مولانا حالی مرحوم کی برسی بھی اسی مہینے واقع ہو رہی ہے جنہوں نے مولانا ظفر علی خاں کے جذبۂ اسلامی پر بڑی گرمجوشی سے خراجِ تحسین ادا کیا تھا۔ ہم اس دوگونہ مناسبت کی بنا پر یہ منظوم خراج، جو حقیقتہً قندِ مکرر ہے، تبرکاً پیش کرتے ہیں تاکہ اس سے شمعِ آزادی کے ان دونوں پروانوں کی یاد تازہ ہو، جو بجائے خود قرانِ السعدین ہے۔

یہ شمارہ نئے سال ۱۹۵۷ء کو اپنے ساتھ لا رہا ہے۔ ایک مبارک سال کیونکہ اس سے ایک طرف ہماری آزاد زندگی کا دسواں سال پورا ہوتا ہے اور دوسری طرف حصولِ آزادی کی اوّلیں کوشش کو پورے سو سال گزر جاتے ہیں اور یوں ابتدا، انتہا سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی ہمیں پلاسی کی جنگ آزادی کا پرتو بھی دکھائی دیتا ہے اور ہم اُن تلواروں کی جھنکار سنتے ہیں جو دو سو سال پہلے حصول آزادی کے لئے بلند ہوئی تھیں۔ اس طرح یہ سال اُن تمام قربانیوں، سرفروشیوں، تحریکوں، ہنگاموں، سرگرمیوں، کارناموں اور شخصیتوں کا خلاصہ ہے جنہوں نے اس صدی کو ہماری تاریخ میں یادگار حیثیت عطا کر دی ہے۔ یہ تہری سالگرہ ہمارے لئے فخر وشادمانی کا تاریخی موقع ہے اور قومی عز ووقار کو بلند تر کرنے کا حیات افروز پیغام!

اب کی "ماہ نو" کا شمارۂ خاص اگست کے بجائے مارچ میں شائع ہوگا جبکہ ہمارے ملک کو "جمہوریہ اسلامیہ پاکستان" بننے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ واقعہ ہماری قومی تاریخ میں سب سے اہم حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا ہماری انتہائی کوشش ہوگی کہ "ماہ نو" کے شمارۂ خاص کو بیش از بیش اہتمام سے پیش کریں۔ یہ بڑی حد تک یارانِ نکتہ داں کی پذیرائی پر موقوف ہے ؏ چمن میں خوشنوایانِ چمن کی آزمائش ہے۔
اہلِ قلم سے التماس ہے کہ وہ اپنے فن پارے جلد از جلد ارسال فرما دیں۔

نازشِ قوم

حالی مرحوم

اے مالکِ "دفتر" "زمیندار"
اے نازشِ قوم و فخرِ اقراں

اے روحِ روانِ جمعِ احباب
اے چشم و چراغِ بزمِ اخواں

اے دین کے امتحاں میں جانباز
اے نصرتِ حق میں تیغِ عریاں

اے صدق و صفا کی زندہ تصویر
اے شیر دل، اے ظفر علی خاں

قدرت نے بھرے تھے تجھ میں جو گُن
جب تک وہ رہے نظر سے پنہاں

فوقیت و برتری پہ تیری
قائم کوئی ہو سکی نہ برہاں

ہر وقت کی تاک میں برابر
ہمت تری گن رہی تھی گھڑیاں

بلقان و طرابلس میں ناگاہ
اُٹھا ستم و جفا کا طوفاں

ہمدردیٔ اہلِ دیں نے آخر
جوہر ترے کر دئیے نمایاں

جمعیت و صبر کا سراسر
دامن ہوا چاک تا گریباں

پھیلے وہ بہ شکلِ سیلِ آتش
دل میں ترے جو شرر تھے پنہاں

ڈالا یہ تری پکار نے غل
جی اُٹھے وہ مردے جو تھے بے جاں

جو دل غمِ قوم سے تھے بے حس
چلنے لگیں اُن دلوں پہ چھریاں

وہ بن گئے آپ اپنے رہزن
جو مال کے اپنے تھے نگہباں

اسلام کی سمجھے اب صداقت
جو نام کے تھے فقط مسلماں

ہاں اس میں نہیں مبالغہ کچھ
سنتا بھی ہے اے ظفر علی خاں

نازاں ہے وہ درسگاہ تجھ پر
تعلیم پہ جس کی تو ہے نازاں

کاش ایسے جنے سدا وہ فرزند
جو قوم کے درد کے ہوں درماں

سوزِ غمِ دینِ حق سے جن کے
سینے ہوں کباب، دل ہوں بریاں

جو ملک و وطن کے ہوں فدائی
جو قوم کے نام پر ہوں قرباں

مشرق میں ہوں دردِ دل سے بے چین
مغرب میں سنیں جو رنجِ اخواں

پنجاب کو تجھ پہ ہو اگر فخر
ہے اس کو یہ فخر و نازشایاں

زندہ ہے وہ ملک اور ملت
ہوں زندہ دل ایسے جس میں انساں

بابائے صحافت

عبدالمجید سالک
سید عابد علی عابد

عبدالمجید سالک:

مولانا ظفر علی خان کی موت برصغیر کے ایک ادبی و سیاسی عہد کی موت ہے۔ وہ عہد مرگیا جس میں اُردو صحافت انشا پردازی کے بدیع المثال کمالات کا نمونہ بن گئی تھی۔ وہ عہد مرگیا جس میں ایک جلیل القدر انشا پرداز دوسرے ادبی مشاغل سے قطع نظر کر کے اپنے کمالِ فن کو محض آزادیٔ وطن کے حصول کے لئے وقف کئے ہوئے تھا۔ مولانا ظفر علیخاں اُن خوش نصیب انسانوں میں سے تھے جنہوں نے ہندوستان میں غیر ملکی اقتدار کو اس وقت للکارا جب اس پر دنیا بھر میں سورج غروب نہ ہوتا تھا، جنہوں نے غلام و محکوم ہندوستانیوں کے دلوں سے غیر ملکی حکمرانوں کی دہشت بالکل اُڑا دی، جنہوں نے چالیس سال مسلسل جدوجہد کر کے اس وقت دم لیا جب غیر ملکی اقتدار کا چراغ بُجھ گیا۔ اُنہوں نے اپنی آنکھوں سے استعمار کو نابود و معدوم ہوتے دیکھا۔ اور پھر ایک آزاد و مستقل اسلامی حکومت کے جھنڈوں کو لہراتے ہوئے دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کیں۔ مولانا ظفر علی خاں کی زندگی پر سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو یہ زندگی جدوجہد، مسلسل قربانیوں اور پے در پے ہنگامہ ہائے پیکار سے معمور دکھائی دے گی۔ شاید ملک بھر میں کم ایسے لوگ ہوں گے جو اس تسلسل و تواتر کے ساتھ غیر ملکی تسلط کے خلاف معروفِ کارزار رہے۔ مولانا ظفر علی خاں کے آتش بار مضامین، اُن کی دلچسپ و دلآویز نظمیں، اُن کی کتابیں اُس وقت تک زندہ رہیں گی جب تک اس سرزمین پر زبانِ اُردو کا پرچم لہراتا رہے گا۔ اور انہی ادبی کارناموں کی وجہ سے اُردو کا دامن بھی ابدیت سے وابستہ رہے گا۔ اُن کے ادبی رسالے "دکن ریویو" "پنجاب ریویو" "ستارۂ صبح" تھے، جن کے پرانے پرچے آج بھی اہلِ نظر کو ملتے ہیں تو وہ اُنہیں اپنی آنکھوں پر رکھتے ہیں۔ اور اُن کے اخبار نے تو لاکھوں انسانوں کے قلوب میں جوش و خروشِ ملی و اسلامی کے آفتاب روشن کر دیئے تھے۔ اُن کے معاصر مولانا محمد علیؒ کا "مرینڈ" کے ذریعہ انگریزی دانوں کے دماغوں کو منور کر رہے تھے، مولانا ابوالکلام آزاد کا "الہلال" عربی و فارسی جاننے والوں کے لئے نعمتِ عظمیٰ تھا، لیکن ظفر علی خاں کا "زمیندار" عامۃ المسلمین کا اخبار تھا۔ جن لوگوں نے مولانا ظفر علی خاں کی خطابت کے کمالات دیکھے ہیں اور موچی دروازے کے باہر ہزارہا انسانوں کے اجتماع میں اس شیر کو دھاڑتے سنا ہے، وہ جانتے ہیں کہ اُن کے فقرے دلوں کے خرمن پر شعلہ ہائے بے پناہ کی طرح گرتے تھے۔ اور سُننے والوں کو اسلام و وطن پر جان و مال کی انتہائی قربانیوں پر آمادہ کر دیتے تھے۔ آہ! اب کوئی ظفر علی خاں پیدا نہ ہوگا، کیونکہ مخلصین اور مجاہدین کا یہ نمونہ اب ختم ہو گیا۔ آسمان ہزار گردشیں کرے، زمین آفتاب کے گرد لاکھوں چکر لگائے لیکن اُن لوگوں کی مثال پیدا کرنے سے عاجز رہے گی جنہوں نے دین و وطن کے لئے اپنا سب کچھ کھو دیا۔ اور اپنے آپ کو برباد کر دیا تاکہ وطن آباد و آزاد ہو۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرمائے اور ہمیں اُن کی مثال کی پیروی کی توفیق دے:

ثقافتی سرگرمیاں

مسرقی و معربی با کستان کی
ںقافتی انجمن کا کراچی میں
ایک اجتماع
جناب حسین سہید سہروردی
بھی موجود ہیں

پاک ایران ثقافتی
مجلس کا سپاسنامہ'
ہرایکسیلنسی
سفیر ایران اور
ان کی اہلیہ' محترمہ
نے معزز مہمانوں
سے فردا فردا
مصافحہ کیا

پاک ایران ثقافتی مجلس کی سرپرست
میں مشرقی پاکستان کے عوامی
رقص کا ایک مظاہرہ

کراچی میں
ایک امریکی فنکار ،
جیروا نر ، کی تصاویر
کی نمائش

ماہ نو کراچی جنوری ۱۹۵۷ء

عابد علی عابد:

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مولانا ظفر علی خاں مرحوم کی وفات کی خبر کی توقع نہ تھی، وہ مدت سے بیمار چلے آ رہے تھے، اور اُن کے نیازمندوں کو اُن کی صحت کی بحالی کے متعلق مایوسی ہو چکی تھی۔ لیکن اُس کے باوصف جب یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے آخر اس دنیا کو خیرباد کہا تو حرمان و اندوہ کا احساس ایسا ہی شدید ہوا گویا اُن کی موت بالکل خلافِ توقع تھی۔

مولانا ظفر علی خاں یوں تو گوناگوں صفات کے بزرگ تھے۔ غیر زبانوں سے ترجمہ اُردو میں ایسا رواں اور شستہ کرتے تھے کہ اصل، نقل کا مُنہ دیکھتی رہ جاتی تھی۔ مقرر ایسے شعلہ بیاں تھے کہ روتوں کو ہنساتے اور سوتوں کو جگاتے تھے۔ محقق ایسے پائے کے تھے کہ اُنہوں نے جو علمی مقالات لکھے ہیں گویا پتھر کی لکیر ہیں۔ صحافت میں اُن کو یہ مقام حاصل تھا کہ سب صحافی اُن کو اپنا امام تسلیم کرتے تھے۔ لیکن مجھے اُن کی جس خوبی نے بہت متاثر کیا وہ یہ تھی کہ انہوں نے نظم کو سیاسی اور معاشرتی کوائف کے اظہار اور اُن پر تبصرے کا ذریعہ بنایا اور اس میں ایسی بے مثال کامیابی حاصل کی کہ اب تک گویا وہ اپنی نظیر آپ ہے اور اُمید نہیں کہ اس سلسلہ میں کوئی اُن کا مثیل جلدی ظاہر ہوگا۔

بات یہ ہے کہ مولانا بے حد طباع، ذہین اور نکتہ سنج بزرگ تھے۔ اُن کا مطالعہ وسیع تھا، اردو ادبیات اور اس کی روایات پر نظر بہت گہری تھی، محاورہ اور روزمرے کو جیسا وہ جانتے اور برتتے تھے وہ انداز گویا انہیں سے مخصوص ہے۔ اس کے ساتھ طبیعت میں ظرافت کا جوہر تھا۔ چنانچہ جب انہوں نے اپنی نظموں میں سیاسی کوائف کا بیان کیا تو اپنی طبیعت داری سے پورا فائدہ اٹھایا، بولتے ہوئے قافیے استعمال کئے، کہیں ہلکی ہلکی مزاح کی چاشنی دی، کہیں طنز اور بذلہ سنجی کے جوہر دکھائے، فصاحت کے اصول کو مدنظر رکھا تو ایسی نظمیں وجود میں آئیں کہ لوگ پڑھتے تھے اور چٹخارے لیتے تھے۔ اُن کے اخبار کی مقبولیت کی ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس میں التزاماً اُن کی نظمیں شائع ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی معاصرانہ نوک جھونک ذرا بے باکی کی حدود میں داخل ہو جاتی تھی، لیکن مولانا کا ذوقِ سلیم اُن کے آڑے آتا تھا اور وہ کوئی ایسی بات نہ کہتے تھے جو عامیانہ اور بازاری ہو۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ مولانا نے کسی مسئلہ پر نظمیں لکھنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، معاصروں کی اکثریت اُن کے خلاف ہے لیکن وہ ہیں کہ لڑ رہے ہیں اور ہنس ہنس کے حریفوں کے وار سہتے ہیں۔ موقع پاتے ہیں تو ایسا جرکہ دیتے ہیں کہ حریف پریشان ہو کر ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔

اُن کی سیاسی نظمیں بے شک بہت بلند مرتبہ شعری تخلیقات نہیں ہیں لیکن مولانا نے اپنی منظومات کے ذریعہ یہ تو ثابت کر دیا کہ اُردو میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ حالاتِ حاضرہ پر نظم میں تبصرہ کیا جا سکے۔ اور تبصرہ بھی ایسا کہ سُننے والے نظم کی برجستگی اور روانی دیکھ کر دل تھام کر رہ جائیں۔

نہایت افسوس ہے کہ جس شیر بیشۂ صحافت کے نعرے نظموں کے رُوپ میں عمر بھر ہمارے کانوں میں گونجتے رہے وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا یوں کہنا چاہیئے کہ اُن کی خاموشی سے گویا نظم کی ایک خاص صنف کو چُپ لگ گئی۔ کیونکہ جیسا ملکہ مولانا کو حاصل تھا اس کا عشرِ عشیر بھی کسی میں آجکل نظر نہیں آتا۔

کس قدر تاسف کا مقام ہے کہ آہستہ آہستہ وہ تمام لوگ رخصت ہو رہے ہیں جن سے ادب اور صحافت کی دنیا روشن تھی اور اُن کی جگہ لینے والا بظاہر کوئی نظر نہیں آتا۔ مولانا کی وفات ایک ایسا ملی حادثہ ہے جس کے اثرات بہت دیرپا ہونگے۔ اور جن کا شعور ہمیں بتدریج ہوگا کہ اس وقت تو ملی نقصان کے تاثر پہ ذاتی حرمان و تاسف کا عنصر غالب ہے۔

(بشکریہ ریڈیو پاکستان لاہور)

"یادِ ظفر علی خاں"

(۱۹۵۶ء)

عشرت رحمانی

"میانہ قد، گندمی رنگ، چھریرا بدن، آنکھیں روشن اور متحرک، آواز بلند اور باوقار۔ بولنے میں روانی اور بیباکی، نظم و نثر لکھنے میں پنجاب کے پانچوں دریاؤں سے زیادہ رواں، قادر الکلام لیکن قادر المزاج نہیں۔ بھبک سے اُڑ جانے والی بارود ہیں۔ ان کی بول چال میں پنجابی لہجہ اور تحریر میں پنجابی اثر بالکل نہیں ہوتا، مگر اُن کی اُردو عرب سے بن کر آتی ہے۔ اور فارس کے راستے یہاں پہنچتی ہے۔ ہجو خوب لکھتے ہیں۔ ترجمہ کرنے میں اُن کی کوئی برابری نہیں کر سکتا۔ قادیانی ہوتے تو اپنی بے نظیر اور دل و دماغ پر نقش ہو جانے والی نظموں کو وحی اور الہام کہتے۔ ہندو ہوتے تو کسی بنئے کو کنجوس نہ رہنے دیتے۔ انگریز ہوتے تو شاہ خرچی سے بیچش اقوام کا دیوالہ نکال دیتے۔ قیامت کے روز اپنی نعتوں کے باعث بخشے جائیں گے۔"

یہ تھے ظفر علی خاں" جن کا "قلمی چہرہ" حضرت خواجہ حسن نظامیؒ نے اپنے مخصوص انوکھے انداز میں لکھ کر پیش نہیں کیا، بلکہ اُن کی عظیم سیرت، تحریر و تقریر اور مکمل شخصیت کی دلکش و پُر معنی تصویر کھینچدی ہے۔ ظفر علی خاں کی شخصیت درحقیقت ایک ادارہ کی حیثیت رکھتی تھی جس کے بہت سے پہلو تھے: بابائے صحافت، شاعرِ ملت، مبلغ و خطیب، ادیب، فاضل، مردِ مجاہد۔ لہذا ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء کو ظفر علی خاں نے وفات نہیں پائی، ایک عظیم ادارہ ختم ہو گیا۔ اُن کی زندگی مختلف قومی تحریکات کا منبع تھی، جن سے حیاتِ تازہ کی روشنی نمودار ہوئی۔

قصبہ کرم آباد (پنجاب) میں پیدا ہونے والا یہ بطلِ حریت جب ابتدائی تعلیم سے فراغت حاصل کر کے ایم۔ اے۔ او کالج علیگڈھ کی آزاد اور روشن فضا میں تربیت حاصل کر رہا تھا تو سرسیدؒ نے اس ہونہار فرزندِ وطن کی غیر معمولی صلاحیتوں کا اندازہ کر کے فرمایا تھا۔ "وہ ان میں ایک روشن مستقبل کے آثار دیکھتے ہیں"۔ جسکی تائید محسن الملک مرحوم نے بھی کی تھی۔

علیگڈھ کی تعلیم سے فارغ ہو کر ظفر علی خاں نے میدانِ صحافت میں قدم رکھا، سرسید، محسن الملک، شبلیؒ اور حالیؒ کی آنکھیں دیکھیں۔ اور اس دور میں جبکہ مسلمانوں میں تربیت کی کمی تھی، اخبارات پر آزادی کے وہ جوہر دکھائے کہ اُن کی دھوم مچ گئی اور بالآخر اُن کی شخصیت ایک مکتبِ صحافت کی حیثیت اختیار کر گئی۔

ظفر علی خاں نے تحصیلِ علوم کے بعد ریاست حیدرآباد دکن میں وزارتِ داخلہ کے اسسٹنٹ سکریٹری کے عہدہ کا چارج لیا۔ کچھ عرصہ بعد ریاست حیدرآباد میں اطالوی رقص و سرود کی ایک گشتی کمپنی آئی۔ جس نے حیدرآباد کے خواص و عوام کے دل و دماغ پر عریاں رقص کے مظاہروں سے جادو کا اثر کیا۔ ریاست کے ثقہ طبقہ کو یہ عریانی خلافِ تہذیب اور اقتصادی نقطۂ نظر سے مضر معلوم ہوئی۔ ظفر علی خاں گو ابھی مولانا نہیں کہلاتے تھے لیکن بہرکیف مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ سرسید کے قول کے مطابق انہوں نے "ملک و قوم کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے" سرکاری عہدیدار ہونے کے باوجود مہذب طبقے کی ہمنوائی فرض سمجھی اور اس عریانی و فحاشی کے خلاف احتجاج کیا۔ ریاست کے رزیڈنٹ سر مائیکل اوڈوائر نے حکومت ہند کے "محکمۂ سیاسیات" کو ظفر علی خاں کے خلاف رپورٹ بھیجی۔ ان مخالف اثرات اور ناگوار حالات کے ماتحت ظفر علی خاں نے ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کر کے آزاد صحافت نگاری کی طرف رجوع کیا اور "دکن ریویو" کے حلقۂ ادارت میں شامل ہو گئے۔ مختصر مدت میں دنیائے صحافت نے اُن کا لوہا مان لیا۔ اس عرصہ میں کئی کتابوں کے ترجمے بھی کئے۔ "ڈراما جنگ روس و جاپان" بھی اسی زمانے میں لکھا۔ اور شعر و ادب کے میدان میں رفتہ رفتہ اپنی جودتِ طبع و جولانیٔ فکر کی بدولت نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ مولانا ادبی و صحافی دنیا میں اپنی بے باک و دلکش طرزِ تحریر کے سبب بہت جلد بلند مرتبت تسلیم کئے جانے لگے۔ ۱۹۰۶ء میں شدھی اور سنگٹھن کی ملک گیر سرگرمیوں کو روکنے کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد، آغا حشر، خواجہ حسن نظامی اور مولانا ظفر علی خاں تبلیغی سرگرمیوں میں پیش پیش نظر آئے۔ ۱۹۰۹ء میں اُن کے والد ماجد مولانا سراج الدین نے وفات پائی اور مولانا ظفر علی خاں کو اپنے وطن کرم آباد آنا پڑا۔ ان کے والد نے ۱۹۰۳ء میں کرم آباد سے ایک ہفتہ وار اخبار "زمیندار" جاری کیا تھا جو پنجاب کے زمیندار طبقہ کا واحد نمائندہ اور ساہوکاری قیود و بندش کے خلاف عوام کے حقوق کا نگراں تھا۔ اب ظفر علی خاں کو اس ورثہ کی ذمہ داریاں بھی سنبھالنی پڑیں۔ چنانچہ انہوں نے "زمیندار" کی ادارت اپنے ذمہ لیکر اس کو کرم آباد سے لاہور منتقل کر لیا۔ لیکن اُن کی جولانیٔ افکار کے لئے ہفتہ وار اخبار کا دامن محدود تھا اس لئے ۱۹۱۱ء میں "زمیندار" روزنامہ ہو گیا۔ اور اب صحیح معنوں میں مولانا کو اپنی آتش نوائیوں اور شوخ بیانیوں کے کمالات دکھانے کا موقع ملا۔ "زمیندار" اُردو کا پہلا روزنامہ تھا جس میں مولانا نے دلکش ادب کے گلہائے رنگین

کھلائے اور ایک لطیف طرزِ صحافت کا آغاز کیا۔ ملک میں "زمیندار" کے اندازِ فصاحت اور حق گوئی و بے باکی کی دھوم مچ گئی۔ مولانا کا حقیقت نگار قلم تھا جس نے سب سے پہلے برطانوی استعمار کے خلاف کمال جرأت و دلیری سے تحریک اور پنجاب کی سرکش قوتوں کو نیچا دکھانے اور اُن کے زعمِ باطل کا خاتمہ کرنے کے لئے جہاد کیا۔

۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کے آغاز پر مولانا نے "زمیندار" میں ہر ممکن سعی و جدوجہد سے "تحریکِ نجات" جاری رکھی۔ اس طرح ملک میں بیداری و آزادی کے شعور کو اُن کی اولوالعزم مساعی نے اُبھارا۔ ہندوستانی پریس پر اس دوران میں جو پابندیاں عائد کی گئیں اُن کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے مولانا انگلستان گئے اور ہندوستانی صحافت کی "آزادیٔ اظہار" کے لئے حکومتِ برطانیہ سے پرزور مطالبہ کیا۔ اب مولانا کی مصروفیات کے لئے صرف ایک میدان نہ تھا۔ صحافت کے علاوہ تبلیغ مذہب شعروادب اور سیاست کی اہم ذمہ داریاں بھی انہوں نے سنبھال لی تھیں۔

۲۱-۱۹۲۲ء تک مولانا نے شعلہ بیانی سے شدھی اور سنگھٹن کی مہاسبھائی تحریکوں کو ناکام بنایا اور اس طرح انگریزی سامراج کے آہنی بتوں کو بھی توڑنا شروع کر دیا۔ سامراجی استبداد مولانا کی حق گوئی اور آتش نوائی سے گھبرا اُٹھا۔ جنگِ عظیم سے پہلے ۱۹۱۳ء میں مچھلی بازار کانپور کی مسجد کا قضیہ مسلمانانِ کانپور کے قتل و غارت کا موجب بن کر ملک میں عام ہنگامہ برپا کر چکا تھا۔ اس سلسلہ میں مولانا نے اپنی مخصوص تحریر و تقریر کے ذریعہ برطانوی اقتدار کو کھلا چیلنج دیکر ثابت کر دیا تھا کہ "مسلمانوں میں بیدار مغز جوہر قابل کی کمی نہیں۔"

مولانا نے اب کھلم کھلا میدانِ سیاست میں داخل ہو کر صفِ اوّل میں جگہ حاصل کر لی تھی۔ یہ عاشقِ رسولؐ و شیدائے دینِ مبین ہر ایثار و قربانی کے لئے سربکف نظر آتا تھا۔ خلافتِ عثمانیہ ترکی کی امداد کے لئے جنگِ طرابلس و بلقان کے موقع پر برِ صغیر سے خلافت کمیٹی کا جو وفد ۱۹۱۲ء میں روانہ ہوا اس میں ظفر علی خاں پیش پیش تھے۔ ترکی کی مالی امداد کے لئے جو فنڈ جمع کیا گیا اس کے لئے چندہ کی فراہمی میں شب و روز سرگرم کار رہتے۔ یہ سرگرمیاں حکومتِ وقت کو کھٹک رہی تھیں کہ اسی اثنا میں اُن کا قدیم حریف سرمائیکل اوڈوائر، جو حیدرآباد کے زمانے سے اُن سے پرخاش رکھتا تھا، پنجاب میں لفٹنٹ گورنر کی حیثیت سے مامور ہو کر نازل ہوا اور مولانا کی تاک میں رہا۔ بالآخر اس نے مولانا کو سیاسی اسیر قرار دے کر پانچ سال قید بامشقت کی سزا دلا دی۔

مولانا خندہ پیشانی سے یہ سخت سزا بھگتنے کو تیار رہتے، لیکن جیل جاتے وقت انہوں نے جن حسرت ناک لہجہ میں اپنی ایک تکلیف دہ آرزو کا اظہار کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے دل میں زبانِ اُردو کا کتنا درد اور والہانہ عشق تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا:-

"مجھے قیدخانہ کی تکلیف اور عزیزوں سے جدائی کا اتنا غم نہیں۔ صرف رنج اس بات کا ہے کہ کہیں میری عدم موجودگی میں میرا بچہ (مولانا اختر علی خاں)، دوہنہ بھول جائے۔"

اور حقیقت یہ ہے کہ ظفر علی خاں کی اُردو (تحریر و تقریر دونوں میں) اہلِ زبان کا انداز رکھتی تھی۔ انہوں نے درست کہا ہے کہ:

میں نے ادب کی بزم کو رخشندہ کر دیا
دہلی و لکھنؤ کا ہے میری زباں میں لوچ

مولانا عمر بھر اعلائے کلمۃ الحق کے لئے مصروفِ جہاد رہے۔ سیاست کے میدان میں قدم رکھا تو پہلے انڈین نیشنل کانگریس میں شریک ہو کر ہندو مسلم رہنماؤں کے دوش بدوش تحریکِ آزادی میں سرگرمِ عمل رہے۔ گاندھی جی نے مولانا کے سیاسی تدبّر و استقلال کے بارے میں جن الفاظ میں رائے زنی کی تھی، اس سے اُن کے عزم و ثبات کا اندازہ ہوتا ہے:-

"میں مولانا ظفر علی خاں کی عزت کرتا ہوں۔ یہ اپنی دھن کے پکے ہیں۔ انہوں نے دیش کے لئے بڑی بڑی کٹھنائیں جھیلی ہیں۔"

یہ حقیقت ہے کہ مولانا نے تن من دھن سے آزادیٔ وطن کی خدمت کی۔ وہ ہر محاذ پر ایک بے باک سپاہی اور بے خوف مجاہد کی طرح سربکف رہے۔

کراچی کانگریس کے تاریخی اجلاس منعقدہ ۱۹۳۱ء میں نمازِ مغرب کا وقت تھا۔ جلسہ کی کارروائی زور شور سے جاری تھی۔ مولانا ظفر علی خاں نے صدر سے درخواست کی کہ نماز کے لئے اجلاس ملتوی کیا جائے۔ ان کی تجویز منظور نہ ہوئی۔ اس مردِ مومن نے اس رویہ کو اسلام دشمنی و مسلم آزاری سے تعبیر کیا۔ فوراً اُٹھ کر پنڈال سے باہر چلے گئے، نمازِ مغرب ادا کی اور ہمیشہ کے لئے کانگریس سے منہ موڑ لیا۔ اس واقعہ نے اُن کے عزائم کا رخ ہی بدل دیا۔ چنانچہ اس وقت سے مسلم لیگ میں شامل ہو کر اسلامیانِ ہند کی جداگانہ آزادی کے لئے سرگرمِ کار ہو گئے۔ پنڈت نہرو نے ۱۹۳۶ء میں مولانا کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے جن الفاظ میں خراجِ عقیدت ادا کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کانگریس جماعت اپنے کراچی اجلاس کے رویہ اور مولانا کی جدائی پر متاسف تھی۔ پنڈت نہرو نے کہا تھا:-

"ہمارے بہت سے ساتھی سیاسیات میں مختلف راستے اختیار کر کے چلے گئے۔ کچھ بھی ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ مولانا ظفر علی خاں غیر ملکی حکومت کے خلاف بڑی جوانمردی سے ٹھہرے رہے ہیں۔"

مولانا کے اوصاف اور مجاہدانہ اولوالعزمیوں کا اغیار نے بھی لوہا مانا۔ ہندو لیڈروں کے اظہارِ خیال پر مولانا شوکت علیؒ نے فرمایا تھا:-

"ظفر علیخاں نے جو قومی و ادبی معرکے سر کئے ہیں اس کا اعتراف دشمنوں کو بھی ہے۔"

۴۶-۱۹۴۵ء میں متحدہ ہند کی مرکزی اسمبلی کے رکن ہوئے۔ اس وقت غلبۂ مرض نے اُن کو نہاصا ضعیف کر دیا تھا، زیادہ بولنے کی طاقت نہ تھی لیکن اجلاس کی شرکت میں پوری پابندی کا لحاظ رکھتے۔ اور بعض اہم مسائل زیرِ بحث میں لکھوا کر حصہ لیتے۔

مولانا کے مقتدر سیاسی معاصرین و مخلصین میں رئیس الاحرار مولانا محمد علیؒ، بابائے خلافت مولانا شوکت علیؒ، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ مسلم لیگ کی تنظیم اور قیامِ پاکستان کی تحریک میں مولانا کی قیادت نے کارہائے عظیم انجام دیئے۔ قائد اعظمؒ نے ۱۹۳۷ء میں مولانا کو اپنا دستِ راست تصور کر کے فرمایا تھا۔ "مجھے آپ اپنے صوبے میں مولانا ظفر علی خاں جیسے دو چار بہادر آدمی دے دیں میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پھر مسلمانوں کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔" یہ ایسا اعترافِ حقیقت ہے جو مولانا کی عظیم ترین سیاسی زندگی کا نہایت مختصر مگر نہایت مکمل خاکہ ہے۔ اس سے اُن کی مخلصانہ قیادت، بے لوث صداقت اور سیاسی تدبر پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ مولانا نے خدمتِ وطن اور حفاظتِ دین و ناموسِ رسولؐ کے لئے بڑی بڑی کٹھنائیاں جھیلیں، بھاری بھاری قربانیاں دیں اور کبھی پیشانی پر بل نہ آنے دیا۔ "زمیندار" اُن کی آتش بیانی اور بے باک معرکہ آرائیوں کی بدولت برطانوی سامراج کا ہمیشہ موردِ عتاب رہا۔ ۱۹۱۱ء سے لے کر ۱۹۴۶ء تک مسلسل "زمیندار" کی ضمانتیں ضبط ہوئیں لیکن مولانا کے آزاد و بے باک اندازِ بیاں میں بجائے نرمی و کمزوری کی جگہ راستی کی تلخی و درشتی بڑھتی ہی رہی۔ صحافت کے مکتب کا یہ اُستادِ کامل اُردو صحیفہ نگاروں کا مرشدِ اولیں تھا، جس کی زیرِ تربیت برصغیر کے مقتدر صحافی حضرات نے زانوئے ادب تہ کیا۔ عہدِ حاضرہ کے اساتذۂ فن میں بالخصوص مولانا نیاز فتحپوری، مولانا عبدالمجید سالکؔ، مرتضیٰ خاں میکش جیسے مستند ماہرین مولانا ظفر علی خان کے تلامذۂ راشدین میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر حضرات میں۔ مولانا صہابت جھنجھانوی، مولانا وحیدالدین تسلیم، مولانا چراغ حسن حسرت، مولانا عبداللہ عمادی وغیرہم کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ غرضیکہ اخبار "زمیندار" اور مولانا ظفر علی خاں کو اُردو صحافت کی ایک عظیم تاریخ تسلیم کیا جاتا ہے۔ مولانا نے ماہ جنوری ۱۹۵۳ء میں "زمیندار" کی گولڈن جوبلی میں شرکت فرماتے ہوئے لاہور کے تمام سربرآوردہ صحافیوں، اربابِ علم و ادب اور احبابِ خصوصی کو مخاطب فرمایا اس وقت حاضرین پر اُن کی عظمت کا اثر ناقابلِ بیان تھا۔ گو اس زمانے میں مولانا نے اپنی ضعیفی اور مسلسل علالت کے سبب بمشکل چند مختصر الفاظ ادا کئے لیکن اُن کے چہرے پر فخر و کامرانی کی جو جھلک دکھائی دیتی تھی اس کے اثرات ہر دل میں کارفرما تھے۔ اس جلسہ میں مولانا بیحد مسرور نظر آ رہے تھے۔ اُن کے خاموش تبسم و بشاشت سے حاضرین اُن کی علمی عظمت و عزمِ راسخ کی یاد تازہ کر کے شاداں و فرحاں تھے۔ بعض ارکینِ ادارت میں مولانا نے تحفے بھی تقسیم کئے اور اس جلسہ کے بعد گوشہ نشیں ہو گئے۔ پھر کسی جلسۂ عام میں شرکت نہ کر سکے، لیکن اس پیرانہ سالی اور شدائدِ امراض کے باوجود وہ بیٹھے بیٹھے اور لیٹے لیٹے کبھی کبھی "زمیندار" کے لئے مختصر شذرے لکھواتے اور اکثر کسی نہ کسی اہم مسئلہ پر دوسروں کے لکھے ہوئے شذرات سُن کر اُن میں ترمیم و تنسیخ کر دیتے۔

مولانا ظفر علی خاں ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے برصغیر پاک و ہند کے اکابرین میں ایک منتخب ہستی تھے۔ ترجمہ میں جو درک مولانا کو حاصل تھا وہ بہت کم دیکھنے میں آیا۔ وہ مستند صاحبِ طرز نثر نگار تھے اور نہایت فصیح و سادہ اندازِ نگارش کے مالک، اُن کے قلم میں بلا کی روانی اور بیان میں حد درجہ شوخی و دلکشی تھی۔ دو درجن کتب اُن سے یادگار ہیں، ان میں زیادہ قابلِ ذکر یہ ہیں:- (۱) سیرِ ظلمات (۲) خیابانِ فارس (۳) جنگل میں منگل (۴) اسرارِ دربارِ لندن (۵) ڈراما جنگ روس و جاپان (۶) معرکۂ مذہب و سائنس (۷) نازلی بیگم و دیگر افسانے۔ ان کے علاوہ انگریزی مقالات کا ایک مجموعہ اور علامہ اقبالؒ کے انگریزی خطبات کا اُردو ترجمہ بھی اُن کی معرکہ آرا تالیفات میں شامل ہیں۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علیؒ فرماتے ہیں:-

"ظفر علی خاں صحافی سے زیادہ ادیب ہیں۔ اُن کے کلام میں جو تلخی ہے وہ سیاست کی ہے اور جو چاشنی ہے وہ ادب کی ہے۔"

مولانا ظفر علی خاں کے شاعرانہ کمالات کا تذکرہ کرتے ہوئے سب سے پہلے اُن کے استاد حضرت فصیح الملک داغؔ دہلوی کی صائب رائے ہمارے سامنے آتی ہے۔ ارشاد ہے:

"ظفر علی خاں میرے شاگردوں میں سے ہیں۔ پنجابی شہزادے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ انہیں نظم و نثر دونوں پر قدرت حاصل ہے۔ یہاں نوجوانوں میں وہ سب

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

اردو کی دو مقبول مثنویاں

منیر فاروقی

اُردو مثنویات کا رشتہ بھی دوسری اصنافِ سخن کی طرح فارسی سے ہوتا ہوا عربی تک پہنچتا ہے لیکن ان میں نہ تو عربی (رجز وغیرہ) کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں اور نہ فارسی کے۔ اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ چند ایک کو چھوڑ کر مقامیت بھی نمایاں نہیں۔ اکثر مثنویوں میں بنیادی حیثیت جنوں اور پریوں کو ہی حاصل ہے۔ قصے کی دلچسپی انہی سے قائم کی جاتی ہے۔ یہ مثنویاں جس زمانے میں لکھی گئیں اس وقت عوام کے اعتقادات میں یہ بات تھی کہ جنوں اور پریوں کا وجود ہے اور وہ انسانوں کی شکل میں نمودار ہو کر روزمرہ کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لئے مثنوی نگاروں نے فوق الفطرت عناصر کو ہی اپنی مثنویات میں خاص طور پر جگہ دی۔ ان مثنویات کو پڑھ کر جہاں ایک طرف عوام کے ضعیف عقائد کا احساس ہوتا ہے وہیں اس دور کی روحانی و مادی پستی کا تصور بھی قائم کرنا پڑتا ہے۔ اِن قصوں میں جو کردار بھی نظر آتے ہیں وہ عجیب و غریب خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ اُن کا وجود زمینی کم نظر آتا ہے اور تصوراتی زیادہ۔ وہ اس دور کے عوام اور مصنف دونوں کے اوہام کی تصویر ہوتے ہیں۔ ان میں زندگی کی تڑپ اور کائنات کو زیر کر لینے کی خواہش شاذ ہی ہوتی ہے (نثری داستانوں کا ذکر نہیں)۔ یہ مرکزی طور پر عشق میں ہی ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں اور اس میں صحت مند نظر نہیں آتے۔ اُن کی بیماری (ABNORMALITY) اس بیمار معاشرے کی جھلک دکھاتی ہے جو ۱۷۰۰ء سے مسلسل زوال پذیر تھا جب کہ عام زندگی میں بھی صحت مند اقدار پیشِ نظر نہ تھیں، بقول میرؔ ؎

ہر طرف ظلم ہو رہا ہے یاں ایک بستا ہے ایک مرتا ہے

عام طور پر ہمارے شعراء میں بھی سہل انگاری کا مادہ بہت تھا۔ وہ چند مروجہ خیالات و عقاید کو موزوں کر دینے سے ہی "زندگی حاصل کر لیتے تھے"۔ "فن میں ڈوبنا" اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ غزل جیسی لطیف صنفِ ادب کی بھی شاہ نصیرؔ، ذوقؔ اور ناسخؔ کے ہاتھوں خوب گت بنتی رہی۔ مثنوی میں تو اور بھی اُن کا سستا پن ظاہر ہو جاتا ہے۔ میرؔ یا مومنؔ اپنی مثنویات کی وجہ سے زندہ نہیں ہیں۔ یوں بھی ہمارے قدیم شعراء کو جذبات پر اتنی گرفت نہ تھی کہ وہ اُن کا ارتکاز کر سکتے۔ ان کے ہاں تو ایک اُبال آتا تھا، آیا اور گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک کے لئے بھی اپنے تاثر کو ایک سطح پر قائم نہیں رکھ سکتے تھے۔ شاید اسی لئے کوئی طویل نظم یا مثنوی کسی شاہنامے یا سکندر نامے کا جواب نہ بن سکی اور نہ کوئی عشقِ حقیقی میں اتنا گہرا جا سکا کہ وہ "قرآن عجم" کا جواب لکھ سکتا۔ ہمارے ادب کے بہتے ہوئے ساگر میں چند لہریں ہیں جو "سورج" کی چمک سے ہی نظر آتی ہیں اور یہی چند لہریں ہیں جو اُردو ادب کی طرف اُٹھتی نگاہوں کو مایوس نہیں لوٹنے دیتیں۔ اِن لہروں میں سے "سحر البیان" اور "گلزار نسیم" سے یہاں بحث ہے۔ کہنے کو یہ ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں بھی ہیں اور ایک ہی تصویر کے دو رُخ بھی، لیکن دونوں میں بنیادی فرق ہے جس کی وجہ سے اِن کا الگ الگ مقام ہے۔

آج تک اِن مثنویوں کو محض اندازِ بیان ہی کی وجہ سے دیکھا گیا ہے اور یہ مثنویاں ہی کیا ۔۔ ہمارے ہاں تو کافی عرصے تک پورے ادب کو صرف اندازِ بیان ہی کی وجہ سے پرکھا جاتا رہا ہے۔

"سحر البیان" کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں کلام کی سادگی اور بے تکلفی کا لطف آتا ہے اور "گلزار نسیم" میں باریک بینی اور معنی آفرینی کا رنگ ہے۔ "میر حسن کے اشعار کا بیساختہ پن اور سادہ پن دل میں عجیب کیفیت پیدا کرتا ہے" اور نسیم کے ہاں "الفاظ کی شوکت، بندش کی چستی، استعاروں کی نزاکت، تشبیہوں کی بیچیدگی نظر آتی ہے"۔ اور پھر اس سے بڑھ کر ان دونوں فن کاروں کے بارے میں یوں کہا جاتا ہے کہ "میر حسن سخن آفریں ہیں اور نسیم معنی آفریں"۔ میر حسن محاورہ اور روزمرہ کے بادشاہ ہیں، استعارہ تشبیہہ نسیم کا حصہ ہے اور یہ کہ جو سوز و گداز میر حسن کے کلام میں ہے وہ نسیم کے کلام میں نہیں اور بات یوں ختم کی جاتی رہی ہے کہ دہلی کے شعراء کے کلام میں جو درد پایا جاتا ہے وہی درد میر حسن کی مثنوی میں بھی ہے۔ جب بحث اور آگے بڑھتی ہے تو میر حسن کو دہلویت کے چوکھٹے میں بند کر کے نسیم کو لکھنویت میں محدود کر دیا جاتا ہے اور اس طرح اُردو کی یہ دو قابلِ قدر مثنویاں دو سکولوں میں بٹ کر صرف اپنے اپنے حلقوں تک محدود ہو جاتی ہیں اور ایک عرصہ تک تو اس حد بندی نے اتنی شدت پکڑی کہ "گلزار نسیم" کو صرف ہندو حلقوں تک محدود کر دیا گیا یہاں تک کہ معرکۂ چکبست و شرر اُٹھ کھڑا ہوا اور بے چارے نسیم پر یہاں تک الزام لگایا گیا کہ "گلزار نسیم" دراصل پنڈت دیا شنکر نسیم کی لکھی ہوئی نہیں بلکہ اُن کے استاد

خواجہ آتش نے اُنہیں لکھ کر دے دی تھی اور لطف یہ ہے کہ خود معترض ہی دو تین بحثوں کے بعد یہ فرمانے لگے کہ اس مثنوی میں اتنی خامیاں ہیں جتنی کسی بھی اور فن پارے میں نہیں"۔ اور اپنے پہلے اعتراض کو یوں نبھایا کہ جو حصے اس مثنوی میں اعلیٰ ہیں وہ تو آتش کے لکھے ہوئے ہیں اور جو قابلِ گرفت ہیں وہ پنڈت نسیم کے ہیں کیونکہ وہ ہندو تھے۔ یہ کہنا کہ گلزار نسیم اگر خواجہ آتش کی لکھی ہوئی ہوتی تو ایک بلند پایہ مثنوی ہوتی لیکن چونکہ ایک ہندو کی لکھی ہوئی ہے (خواہ وہ بھی لکھنوی ہی کیوں نہ ہو) ایک اعلیٰ پیمانے کی مثنوی نہیں معترض کی اُردو زبان و ادب کے ساتھ ناداں دوستی کی غمازی کرتا ہے۔

اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ میرحسن اور پنڈت نسیم اپنی اپنی مثنویوں کی وجہ سے زندہ ہیں۔ میرحسن نے اور بھی بہت سی مثنویاں لکھیں۔ وہ ایک اچھے غزل گو بھی ہیں۔ اسی طرح نسیم بھی غزل کہتے تھے۔ چکبست لکھنوی نے ہمعصر غزل گو شعراء سے اُن کا موازنہ نہ کرا کے اُن کی بہت سی خوبیوں کو اُجاگر کیا ہے لیکن یہ دونوں فن کار زندہ اپنے انہی شاہکاروں کی وجہ سے ہیں۔ بحیثیتِ مجموعی "سحرالبیان" کا مرتبہ "گلزار نسیم" سے بلند ہے بظاہر یہ ایک بہت بڑا دعویٰ نظر آتا ہے اور ویسے بھی ادب میں کسی ایک فنکار پر دوسرے کو فضیلت بخشنا بہت ہی قابلِ گرفت بات ہے لیکن آیندہ کی بحث میں جو چند باتیں واضح کی گئی ہیں اُن کی روشنی میں یہ بات واضح انداز میں یہاں پر کہنی مناسب معلوم ہوتی ہے۔ یوں بھی اگر دو فن کار ایک ہی موضوع پر ایک ہی صنفِ ادب کے ذریعہ طبع آزمائی کریں تو ظاہر ہے کہ ایک اپنی فطری صلاحیتوں اور فنی ریاض کی بنا پر یقیناً دوسرے فن کار سے بہتر صورت میں عہدہ برآ ہو سکیگا۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ نسیم کو "سحرالبیان" کی مقبولیت دیکھ کر ہی مثنوی لکھنے کا خیال ہوا تھا اور انہوں نے چکبست کے الفاظ میں "سحرالبیان" کا جواب ہی لکھا تھا۔

بنیادی طور پر دونوں مثنویوں کا موضوع عالمِ خیال کی باتیں کرنا ہی ہے جو اس زمانے کی معاشرت کا جزو تھیں۔ فوق الفطرت باتوں پر یقین رکھنا اس معاشرت کے بدیہیات میں سے تھا اور فوق الفطرت باتیں ہی ان دونوں مثنویوں کی بنیاد ہیں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ ایک کے ہاں فوق الفطرت باتوں کے ساتھ معاشرت کی عکاسی بھی آگئی ہے اور دوسرے کے ہاں فوق الفطرت ہی چھایا ہوا ہے۔

"سحرالبیان" ۱۷۸۵ء میں مکمل ہوئی۔ یہ میرحسن کی آخری مثنوی ہے۔ اس سے پہلے اُنہوں نے کئی اور مثنویاں بھی لکھی تھیں لیکن یہ بات خیال انگیز ہے کہ اس مثنوی کو میرحسن نے سب سے آخر میں لکھنا شروع نہیں کیا تھا۔ البتہ سب سے آخر میں مکمل ضرور ہوئی ورنہ ایسے بہت سے شواہد ہیں جن کی بنا پر یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اُنہوں نے اس مثنوی کو اپنی جوانی ہی میں شروع کر دیا تھا اور آہستہ آہستہ اس کی تکمیل کرتے رہے اور پھر کاٹ چھانٹ کے بعد اس کو آخری شکل ۱۷۸۵ء میں یعنی مرنے سے کوئی دو برس پہلے دی۔ مثنوی کے آخر میں کہتے ہیں ؎

فدا مصحف... دل ہے یہ جب — کہ دریا سخن کا دیا ہے عجب

زبس عمر کی اس کہانی میں صرف — تب ایسے یہ نکلے ہیں موتی سے حرف

جوانی میں سب ہو گیا ہوں میں پیر — تب ایسے ہوئے ہیں سخن بے نظیر

نہیں مثنوی ہے یہ اک پھلجھڑی — مسلسل ہے موتی کی گویا لڑی

نئی طرز ہے اور نئی ہے زباں — نہیں مثنوی ہے یہ سحرالبیاں

رہیگا جہاں میں مرا اس سے نام — کہ ہے یادگارِ جہاں یہ کلام

ہر اک بات پر دل کو میں خوں کیا
تب اس طرح رنگیں یہ مضموں کیا

میرحسن نے اپنے حق میں جو تعلّی رطب اللسانی کی ہے یہ بے وجہ نہیں۔ "گلزار نسیم" اس کے کوئی پچیس سال بعد ۱۸۴۲ء میں لکھی گئی۔ نسیم کے زمانے میں لکھنویت اور دہلویت دو اصطلاحوں کا بڑا زور تھا اور ایک سکول دوسرے پر سبقت لے جانے کی پوری کوشش کرتا تھا۔ میرحسن چونکہ دہلوی تھے اور باوجود اس امر کے کہ "سحرالبیان" لکھنؤ میں مکمل ہو کر سامنے آئی اُسے دہلی سکول ہی میں رکھا گیا۔ نسیم کے احباب نے اس کی مقبولیت دیکھ کر انہیں ایک اور مثنوی لکھنے کی ترغیب دلائی۔ اس مثنوی کا قصہ "گل بکاؤلی" کے نام سے پہلے سے نثر میں موجود تھا۔ جب پنڈت نسیم اپنی مثنوی کو استاد کے پاس لیکر گئے تو انہوں نے اس کی طوالت دیکھکر کہا کہ اس کو یا تو اصلاح دیتے وقت میں دیکھوں گا یا تم اور کوئی نہ دیکھ سکے گا۔ بہتر ہے اس میں اختصار کرو۔ چنانچہ اُنہوں نے یہاں تک اختصار کیا کہ بعض جگہ کیا، بلکہ اکثر جگہ، ابہام پیدا ہو گیا ہے جس

کی وجہ سے مولانا حالی نے بھی اس مثنوی کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں دی ۔

میر حسن نے دہلی کے اس ماحول میں آنکھ کھولی، جو اورنگ زیب کی وفات کے بعد کبھی بھی عضویاتی ربط قائم نہ رکھ سکا تھا۔ کبھی مرہٹوں کی شورشیں، کبھی احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ کی قتل و غارت گری، کبھی غلام قادر روہیلہ کی چیرہ دستیاں، کبھی جاٹوں کی لوٹ مار بلائے جاں تھی۔ میر حسن جب اپنے والد میر ضاحک کے ساتھ فیض آباد جا کر آباد ہوئے تو وہ بارہ برس سے کچھ اوپر تھے۔ ان کے اس خارجی ماحول کا اثر ان کی داخلی زندگی پر ہونا یقینی تھا۔ ان کے مزاج میں بھی اسی طرح کے عقائد و نظریات رس بس گئے تھے، جو دہلی کی اس سوسائٹی کے تھے جبکہ یاس و نا امیدی ہر طرف چھائی ہوئی تھی یا زندگی کو چند روزہ جان کر زندگی سے گریز، فرار اور ہوائی قلعوں میں پناہ ڈھونڈنا تھا یا پھر غرقِ مئے ناب اولیٰ" اور محمد شاہ رنگیلے کی زندگی کے عام زندگی پر اثرات۔ میر حسن نے ہلکی ہلکی سی کسک، میٹھا میٹھا درد اور پھر رنگینی و رعنائی اس سوسائٹی سے حاصل کی۔ نوجوانی میں انہوں نے فیض آباد کی مجلسی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور شاہی ملازمت میں اخاص کر بہو بیگم کی اس کیفیتی کے خاص عہدیدار ہونے کی وجہ سے جو شاہی بول چال وغیرہ کو قلمبند کیا کرتی تھی) انہیں رنگینی و رعنائی کے ساتھ ساتھ زبان پر بھی عبور حاصل ہوا ۔

اس کے برخلاف پنڈت نسیم نے لکھنؤ کے اس ماحول میں آنکھ کھولی جو شاہانِ اودھ کے زیر اثر خوشحال تھا اور جس میں زندگی کا کوئی بہت بڑا نصب العین پیش نظر نہ ہونے کی وجہ سے کاہلی، سستی اور جمود طاری ہونا لازمی تھا۔ عظیم ادب کی تخلیق بھی پُرامن معاشرے میں ہی ہوتی ہے ۔ جب کہ معاشرہ ایک ایسی منزل پر پہنچ چکا ہو جہاں سے پھر اس کا زوال شروع ہو جائے، اسی موڑ پر عظیم ادب کی تخلیق ہوتی ہے جیسے مثلاً ورجل کی تخلیقات، لیکن سستا ادب بھی ایسے ہی معاشرے میں تخلیق ہوتا ہے جو پُرامن ہو لیکن انتہائی پستی تک پہنچ چکا ہو جب کہ اس میں کسی بھی قسم کے بھنور نہ آرہے ہوں، جیسے کہ لکھنؤ کی اس پرتکلف سوسائٹی میں جس میں پنڈت نسیم نے آنکھ کھولی۔ لکھنؤ کا یہ پُرتکلف ماحول صناعت اور رعایتِ لفظی پر جان دیتا تھا۔ آج وہ رنگین آئینہ بھی لکھنؤ کی زوال پذیر مجلسی زندگی کی غلاظت اور سستا پن ہماری نگاہوں سے نہیں چھپاتا جو اس وقت کی سوسائٹی کے بہت سے عیوب کو ان کی اصل حیثیت سے سامنے آئینے میں آڑے آئے ہوئے تھا۔ پنڈت نسیم کی زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ ان کی اس سوسائٹی سے وابستگی عشق کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ جو اشارے اوپر کئے گئے ہیں ان سے میر حسن اور پنڈت نسیم کا فرق ذہن میں آجاتا ہے۔ دونوں کے مزاج، دونوں کے ماحول اور نسلی اثرات کی وجہ سے قطعاً مختلف تھے۔ پنڈت نسیم کے معاشرہ میں آورد و تصنع کا عمل دخل ہے اور "گلزار نسیم" کے بارے میں بھی کچھ یہی بات کہی پڑتی ہے۔ اس کے برخلاف "سحر البیان" میں مقابلتاً زیادہ فطری ماحول نظر آتا ہے مثلاً شہزادہ بے نظیر ایک کنوئیں میں پری ماہ رخ کی قید بھگت رہا ہوتا ہے اور بدر منیر کو اس بات کا پتہ نہیں۔ ادھر نجم النساء کی باتیں آگ پر تیل کا کام کرتی ہیں، مسلسل انتظار و اضطراب کی وجہ سے میر حسن نے بدر منیر کے ہجر کے لمحات کی یوں عکاسی کی ہے :

دوانی سی ہر سمت پھرنے لگی — درختوں میں جا جا کے گرنے لگی
ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب — لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب

خفا زندگانی سے ہونے لگی — بہانے سے جا جا کے سونے لگی
تپِ غم کی شدت سے یہ کانپ کانپ — اکیلی لگی رونے منہ ڈھانپ ڈھانپ

نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا — نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا پھر نہ اٹھنا اسے — محبت کا دن رات گھٹنا اسے

کہا گر کسی نے کہ بی بی چلو — تو اٹھنا اسے کہہ کے ہاں جی چلو
کسی نے جو کچھ بات کی بات کی — نہ دن کی خبر تھی نہ کچھ رات کی

کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے — کہا خیر بہتر ہے منگوائیے
نہ کھانے کی سدھ اور نہ پینے کا ہوش — بھرا دل میں اس کے محبت کا جوش

جو آ جائے کچھ ذکرِ شعر و سخن — تو پڑھنا یہ دو تین شعرِ حسن

آگے چل کر اپنی غزل دی ہے اور بعد میں تبصرہ فرمایا ہے ؎

غزل یا رباعی دیا کوئی فرد — اسی ڈھب کی پڑھنا کہ ہو جس میں درد
سو یہ بھی جو ناگہ نکلے کہیں — نہیں تو کچھ اس کی بھی خواہش نہیں

سبب یہ کہ دل سے تعلق ہے سب — نہ ہو دل تو پھر بات بھی ہے غضب
گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل — کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

اب اسی طرح کا ایک موقع "گلزار نسیم" میں سے لیجئے۔ جمیلہ جب شہزادہ تاج الملوک کو دریائے طلسم میں ڈال دیتی ہے تو بکاؤلی کے ہجر کی گھڑیاں یوں بیان کی گئی ہیں ؎

کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں — آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں
جامے سے جو زندگی کے تھی تنگ — کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ

یک چند جو گذرے بے خور و خواب — زائل ہوئی اس کی طاقت و تاب
صورت پہ خیال رہ گئی وہ — ہیئت میں مثال رہ گئی وہ

آنے لگے چھیٹے بیٹھے چکر — فانوسِ خیال بن گیا گھر

اس کی پاسبان پریاں اس کو سمجھاتی ہیں کہ ؎

رحم اپنی جوانی پر ذرا کر

اور یہ کہ ؎

غم راہ نہیں کہ ساتھ دیجئے دکھ بوجھ نہیں کہ بانٹ لیجئے

بکاؤلی پر اُن کے تسلی آمیز جملوں کا اثر اُلٹا ہوتا ہے، اس کی سیمابی کیفیت پہلے سے بدتر ہو جاتی ہے۔ وہ جھنجھلاتی ہے اور انہیں غصہ میں ڈانٹتی ہے کہ ؎

رنجور جو ہوں میں تو تمہیں کیا مجبور جو ہوں میں تو تمہیں کیا

اور پھر پنڈت نسیم کی غزل پڑھنے لگ جاتی ہے۔ ان دونوں اقتباسات سے یہ دکھلانا مقصود نہیں اور نہ اس میں کوئی حقیقت ہی ہے کہ "پنڈت نسیم ہجر کے لمحات کی عکاسی نہ کر پائے"۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جو تصویر میر حسن کے اشعار کو پڑھ کر سامنے آتی ہے وہ نسیم کے اشعار سے نہیں آتی۔ مولانا حالی نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ مصنف یعنی نسیم کو ہجر کے لمحات کی عکاسی کرنا مقصود ہی نہیں تھا۔ انہیں تو یہ بتانا تھا کہ بکاؤلی کپڑوں کے عوض رنگ بدلتی تھی اور کھانے کی جگہ قسمیں اور پینے کی جگہ آنسو پیتی تھی۔ مولانا حالی نے "گلزار نسیم" پر اور بھی کئی ایک اعتراضات کئے ہیں جن کے بارے میں مولانا شبلی نے کہا تھا کہ حالی نے "گلزار نسیم" پر تنقید کرتے وقت کچھ زیادتیاں کی ہیں۔ ایک دو اقتباسات اور دیکھنے سے میر حسن اور نسیم کے بارے میں کوئی واضح طور پر رائے قائم کرنے میں مدد ملے گی:

"سحر البیان" میں جب شہزادہ بے نظیر غائب ہو جاتا ہے اور اس کو ماہ رُخ پری اُٹھا کر لے جاتی ہے اور محل میں ڈھنڈیا پڑتی ہے تو اس افراتفری کے عالم کی میر حسن نے یوں تصویر کشی ہے:-

کھلی آنکھ جب ایک کی واں کہیں تو دیکھا کہ وہ شاہزادہ نہیں
نہ ہے وہ پلنگ اور نہ وہ ماہرو نہ وہ گل ہے اس جا نہ وہ اس کی بو
کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی
کوئی بلبلاتی سی پھرنے لگی کوئی ضعف کھا کھا کے گرنے لگی
کوئی سر پہ رکھ ہاتھ دلگیر ہو گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو
کوئی رکھ کے زیرِ زنخداں چھڑی رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی
رہی کوئی انگلی کو دانتوں میں داب کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب
کسی نے دیئے کھول سنبل سے بال طمانچوں سے جوں گل کئے سرخ گال
سُنی شہ نے القصہ جب یہ خبر گرا خاک پر کہہ کے ہائے پسر
کلیجہ پکڑ ماں تو بس رہ گئی کلی کی طرح سے چٹک رہ گئی
ہوا گم جو یوسف پڑی یہ جو دھوم کیا خادمانِ محل نے ہجوم

اور پھر بادشاہ اُس جگہ جاتا ہے جہاں بے نظیر سوتا تھا تو اس کی حالت کی عکاسی یوں کی گئی ہے:-

مرے نوجواں میں کہاں جاؤں پیر نظر تو نے مجھ پر نہ کی بے نظیر
عجب بحرِ غم میں ڈبویا مجھے غرض جان سے تو نے کھویا مجھے

یہاں پر یہ اعتراض بھی کیا جا سکتا ہے کہ میر حسن نے محلاتیوں، خواصوں اور اردا بیگنیوں وغیرہ کی جو اضطراری کیفیت دکھائی ہے اسکے مقابلے میں باپ کی حالت غیر کچھ بھی نہیں، حالانکہ بادشاہ یا ملکہ کو جو بے نظیر سے پیار تھا وہ اُن سے کئی گنا زیادہ تھا، یہاں تک کہ قصّے کے شروع میں اس بات پر خاصا زور دیا گیا ہے کہ بادشاہ لاولد نہ ہونے کی وجہ سے اتنا مایوس ہوتا ہے کہ تخت و تاج سے ہی الگ ہو جانا چاہتا ہے اور یہاں اس کے وارثِ تخت اور اتنے چہیتے کا غائب ہو جانا اس کے اوپر کوئی ایسا اثر نہیں چھوڑتا یا یہ اثر اس خوش اسلوبی سے بیان نہیں کیا گیا جتنا کہ تقاضا تھا اور پھر جبکہ نوکروں چاکروں پر اس کا اثر کہیں کامیابی سے دکھایا گیا ہے۔ یہاں پر بادشاہ کا بین مصنوعی اور کھوکھلا سا نظر آتا ہے:

اب یہی موقع "گلزار نسیم" میں دیکھئے۔ موقع وہ ہے جہاں گل بکاؤلی غائب ہو جاتا ہے شہزادہ تاج الملوک اُسے چرا لاتا ہے اور گل بکاؤلی کی یہاں وہی اہمیت ہے جو "سحر البیان" میں شہزادہ بے نظیر کی۔ موقع کی اہمیت کے لحاظ سے "گلزار نسیم" کے اس منظر میں کتنی واقعیت ہے۔ ماحول اور کردار میں ہم آہنگی ہو جانے سے منظر میں فطری پن پیدا ہو گیا:-

منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی نرگس سے وہ چشم حوض پائی
دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گل جھنجھلائی کہ کون دے گیا جُل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون ہے ہے مجھے خار دے گیا کون

نرگس تو دکھا کدھر گیا گل — سوسن تو بتا کدھر گیا گل
سنبل مرا تازیانہ لانا — شمشاد انہیں سولی پہ چڑھانا

بولی وہ بکاؤلی کہ افسوس — غفلت سے یہ پھول پڑ گئی اوس
نام اس کا صبا نہ لیتی تھی میں — اس گل کو ہوا نہ دیتی تھی میں

گلچیں کا جو ہاتھ ہائے ٹوٹا — غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا
او خار پڑا نہ تیرا چنگل — مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل

او باد صبا! ہوا نہ بتلا — خوشبو ہی سنگھا، پتا نہ بتلا
بلبل تو چہک اگر خبر ہے — گل تو ہی مہک بتا کدھر ہے

یہ انداز بیان اور یہ تصویر کشی میر حسن کے بیان کے مقابلے میں کتنی جاذب اور فطری نظر آتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میر حسن نے خواصوں وغیرہ کی گھبراہٹ کی تصویر کشی کر کے ہمیں مغلوں کے شاہی محل میں پہنچا دیا ہے۔ لیکن واقعیت کا حق ادا نہیں کر سکے۔ اس کے برخلاف پنڈت نسیم نے ایک طرف تو گل کی اہمیت، دوسرے بکاؤلی کی جذبات نگاری اور پھر اس فضا کی عکاسی کی ہے جس پر سناٹا طاری ہے اور بکاؤلی کے غصہ اور پریشانی کی وجہ سے اس ماحول میں سوائے اسکے اور کوئی چھایا ہوا نظر نہیں آتا اور یہی واقعیت کا تقاضا ہے۔

مثنوی کی سب سے بڑی ضرورت اس کا تسلسل بیان ہے۔ واقعات کا ایک دوسرے سے اتنا گہرا تعلق ہو کہ قصہ کے فطری ارتقاء میں کہیں بھی جھول نظر نہ آئے "سحرالبیان" اس لحاظ سے واقعی ایک موتی کی لڑی نظر آتی ہے جس میں سے کوئی بھی موتی گرا ہوا نظر نہیں آتا، البتہ کہیں کہیں بعض موتی دوسرے موتیوں کے مقابلے میں کم پائے کے نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ خامی کچھ اتنی نمایاں نہیں۔ اس کے برخلاف "گلزار نسیم" میں تسلسل بیان کا پورا خیال نہیں رکھا گیا۔ اس میں کئی جگہ ابہام، جھول اور اشکال نظر آتا ہے۔ بعض حصے تو ایسے بھی ہیں کہ کئی بار غور کرنے سے ہی سمجھ میں آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں مولانا حالی نے چند مثالیں دی ہیں جن کا جواب چکبست نے دیا ہے۔ مگر یہ کسی بھی طرح مطمئن نہیں کرتا۔

"سحرالبیان" کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس میں موسیقیت غضب کی ہے جو "گلزار نسیم" میں کہیں نہیں۔ اس کی بڑی وجہ تو بحر کے انتخاب کی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ میر حسن کی زبان پر مہارت بھی ایک خاص وجہ بنی ہے جو انہوں نے دہلی اور فیض آباد کے قیام میں حاصل کی تھی۔ اسی بحر میں فردوسی کا شاہنامہ بھی ہے اور عام طور پر یہ بحر فارسی میں رزمیہ قصوں کے لئے مخصوص تھی کیونکہ اس میں ایک جوش، ایک ولولہ اور جذبات کو متحرک کرنے کا آہنگ پایا جاتا ہے۔ میر حسن نے اس رزمیہ بحر کو بزمیہ تمتہ کے لئے منتخب کر کے ایک ادبی جسارت کی تھی لیکن اس سے انہیں بجائے نقصان کے فائدہ ہی پہنچا اور اس سے جو روانی، موسیقیت اور جاذبیت اس مثنوی میں پیدا ہو گئی ہے وہ "گلزار نسیم" میں مفقود ہے۔ "گلزار نسیم" کی بحر مثنوی کے لئے کوئی ایسی موزوں نہیں۔ بلکہ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ یہ بحر قصہ کو بجائے آگے بڑھانے کے پیچھے لے جاتی ہے۔ بہرحال پنڈت نسیم نے اس بحر کے انتخاب سے اپنے قصہ کی جاذبیت میں بہت بڑی رکاوٹ پیدا کر دی ہے حالانکہ مثنوی کی اور بھی کئی مروجہ مترنم بحریں موجود تھیں۔

طویل نظم لکھنا بہت کٹھن مہم ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ فن کار جب اپنے فن کی تخلیق کر رہا ہوتا ہے تو وہ روزمرہ کی عام سطح سے کچھ بلند ہوتا ہے۔ اس بلند سطح پر اپنے جذبات کا دیر تک ارتکاز اتنا مشکل ہے کہ یہ ہر فن کار کے بس کی بات نہیں۔ اس کٹھن مہم سے گھبرا کر بہت سے فن کار تو سرے سے یہی نظریہ قائم کر بیٹھے کہ اچھی اور بلند پایہ طویل نظم تخلیق ہی نہیں کی جا سکتی۔ کالرج نے ایک دفعہ بڑے زور شور سے کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا۔ لیکن اس رائے سے پورے طور پر اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا میں جتنے بھی شاہکار موجود ہیں وہ طویل نظموں میں ہی ہیں مثلاً ہومر کی "ایلیڈ" "اوڈیسی"۔ ملٹن کی "پیراڈائز لاسٹ"۔ فردوسی کا "شاہنامہ"۔ نظامی کا "سکندرنامہ"۔ رومی کی "مثنوی معنوی" وغیرہ۔ ہمارے ہاں طویل نظموں کی کمی اور غزل کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ فن کار اور قاری دونوں اپنے آپ پر ٹھہراؤ نہیں پیدا کر سکتے اور اپنے جذبات کو ایک نقطے پر دیر تک مرتکز نہیں کر سکتے۔ ہمارا مزاج غزل کا مزاج ہے اور اسی کی وجہ سے غزل کے مقابلہ میں طویل نظم اتنی مقبول نہیں ہی۔ یوں بھی ہمارے فن کاروں میں سہل انگاری کا مادہ کچھ زیادہ ہی ہے۔ انہوں نے فنی تخلیقات کے لئے وہ جگر کاوی اور وہ ریاضت نہیں کی جو اس مقدس شعبہ کا تقاضا ہے اور جو طویل نظم بغیر فنی ریاض کے قارئین کے سامنے پیش کر دی جائے گی۔ اس کی مانگ بہت کم، اس کا اثر بہت محدود اور مقام بہت پست ہو گا۔ قارئین کا ادبی تخلیقات سے بنیادی تقاضا اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ وہ انہیں محظوظ کرے۔ انہیں وقتی طور پر ارتفاع بخشے، انہیں شخصیت کے محدود دائرے سے اٹھا کر آفاقیت سے ہمکنار کرے۔ اس کے لئے طویل نظم گو کو اپنی تخلیق میں ہمہ جہتی فلاح کا نظریہ (MULTI DIMENSIONAL WELL-BEING) سامنے رکھنا ہو گا تاکہ اس میں ہمہ گیر دلچسپی و جاذبیت پیدا ہو سکے۔ اسی وجہ سے کسی ادب پارے میں تنوع کا تقاضا بھی کیا جاتا ہے تاکہ ہر قسم کا قاری اپنے مزاج کے مطابق اس میں کچھ نہ کچھ پا سکے۔ اس لحاظ سے جب ہم ان دونوں مثنویوں کو دیکھتے ہیں تو بھی "سحرالبیان" کو "گلزار نسیم" پر فوقیت دینی پڑتی ہے۔ "سحرالبیان" "فنی تقاضوں کو نسبتاً

بہتر طور پر پورا کیا گیا ہے "گلزار نسیم" میں یکسانی ہے، ایک ہی سطح ہے اور دو ایک ہی ایسے مرحلے آتے ہیں جہاں مصنف اس سے نیچے اُترا ہو لیکن یہ سطح نہ تو اتنی بلند ہے اور نہ اس میں اتنی دلکشی ہے جتنی کہ "سحر البیان" میں۔ موخر الذکر میں پست مقامات بھی ہیں لیکن بلند مقامات نسبتاً زیادہ ہیں اور کبھی کبھی یہ پست و بلند مقامات ایک ہو کر بھی حسین امتزاج پیش کرتے ہیں۔ "سحر البیان" کو پڑھکر ایک کشادگی، ایک وسعت اور صحت مندی کا احساس ہوتا ہے لیکن "گلزار نسیم" کو پڑھکر ایسا احساس بہت کم ہوتا ہے۔ بارہا گھٹن سی بھی محسوس ہونے لگتی ہے۔

ایک فن پارے کو پرکھتے وقت یہ نہ بھولنا چاہئے کہ وہ کس ماحول میں لکھا گیا اور اس وقت ادب کی عام سطح کیا تھی، سوسائٹی کا رنگ کیسا تھا، اس کے مقتضیات کیا تھے، مصنف کا اپنا مزاج کیا تھا اور اس کے مزاج کو بنانے بگاڑنے میں کون سے عوامل کارفرما تھے۔ اگر یہ باتیں سامنے رکھی جائیں تو "سحر البیان" اور "گلزار نسیم" کے بارے میں مناسب اور غیر مبہم رائے قائم کی جاسکے گی۔ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ "سحر البیان" کس طرح وجود میں آئی اور اس کے مصنف کا مزاج کیا تھا۔ اسی طرح "گلزار نسیم" جس ماحول میں لکھی گئی وہ بھی ایک حد تک اپنے عہد کی خصوصیات کو لئے ہوئے ہے۔ دونوں مثنویوں کا فرق دونوں مصنفین کی معاشرت اور مزاج کا بھی فرق ہے۔ اس لحاظ سے یہ سوال بھی بڑا اہم ہے کہ حیاتِ ابدی کس مثنوی کے حصے میں آسکتی ہے؟

ادب میں ابدیت کا مسئلہ بہت متنازعہ فیہ ہے پھر بھی اتنا کہنا ضروری ہے کہ ادب ایک سماجی عمل کا اظہار ہے۔ یہاں سماجی عمل کی اصطلاح اُن محدود معنوں میں استعمال نہیں ہوئی جن میں ہمارے بعض ترقی پسند مصنفین استعمال کرتے آئے ہیں بلکہ اس سے میری مراد اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کو فنی رچاؤ کے ساتھ پیش کرنا ہے جس میں خلوص بھی شامل ہو۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی فن کار سماجی کشمکش کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہیں کہ فن پارہ اپنے وقت کی سب سے بہتر اور قابلِ قدر دستاویز ہوتا ہے، اس میں سوسائٹی کا اثر اور سماج کی عام حالت بھی چھپی ہوتی ہے اور پھر اتنا ہی نہیں، کوئی ادب پارہ اگر ایک طرف اپنے دور کی نمائندگی کرتا ہے تو دوسری طرف اپنے اندر ایسی صلاحیتیں بھی رکھتا ہے جو سوسائٹی کو بدلنے میں مدد دیں، کیونکہ ادب، تو بہر حال جذبات کی تہذیب کرتا ہے اور جس ادب پارے میں ذہنی غذا اور اخلاقی بقا کا سامان نہ ہو اس میں ہمہ گیریت نہیں آسکتی۔ "سحر البیان" میں ۱۸۵۷ء سے پہلے کے شاہی عہد اور اس کی مجلسی زندگی کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ اس زندگی میں مرکزی حیثیت بادشاہ کو حاصل ہے اس میں "کام کم اور کام کرنے والے زیادہ ہوتے تھے۔" صرف اتنا ہی نہیں بلکہ میر حسن کی دوررس نگاہ جزئیات نگاری میں اُردو مثنوی نگاری میں اپنا جواب نہیں رکھتی اور وہ بھی سُنی سنائی نہیں بلکہ اُن کا اپنا مشاہدہ اُن کے کام آتا ہے۔ "سحر البیان" کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ میر حسن نے شاہی دور کی مجلسی زندگی کے صرف انہی اجزا کو منتخب کیا ہے جن میں زیادہ چمک دمک ہے اور ان منتخب اجزا کو نمایاں تر کرنے کے لئے وہ متعلقات کے بیان سے بھی نہیں چوکتے۔ مثال کے طور پر وہ صرف اتنا کہہ کر بات ختم نہیں کر دیتے کہ بادشاہ نے ایک باغ بنوایا تھا، بلکہ باغ کی ایک ایک چیز کی عکاسی کرتے ہیں، یہاں تک کہ ہمیں مغل بادشاہوں کے بنوائے ہوئے باغات نظر آجاتے ہیں۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ اس باغ کے اندر کے محل، چور محل اور پھر محل سے تمام باتیں ایک حسین ترتیب و ترکیب سے میر حسن کے جادو نگار قلم سے آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ وہ ان سب باتوں کو محسوس کر کے کہتے ہیں، انہیں اپنے جذبات کا جزو بنا کر پیش کرتے ہیں، اپنے موضوع تک پیش رسی جذباتی ہوتی ہے فلمی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر باب سے پہلے یہ خواہش کرتے ہیں کہ ؎

مئے ارغوانی پلا ساقیا

اور ساقی کو ان کی مثنوی میں بہت اہمیت حاصل ہے، جبکہ نسیم کے ہاں خامے کو نمایاں حیثیت ملی ہے، جو اُن کی صنعت کارانہ طبیعت اور ضلع جگت میں غرق ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مثال کے طور پر میر حسن باغ کا ذکر کرتے وقت لکھتے ہیں ؎

عمارت کی خوبی، دروں کی وہ شان — لگے جس میں زربفت کے سائبان

چھتیں اور پردے بندھے زرنگار — دروں پر کھڑی دست بستہ بہار

اور پنڈت نسیم کہتے ہیں ؎

گول اس کے ستوں تھے ساعدِ حور — چلمن مژگانِ چشمِ مخمور

دکھلاتا تھا وہ مکان جادو — محراب سے در سے چشم و ابرو

اسی طرح میر حسن جب مثلاً سراپا بیان کرتے ہیں تو اُن کے محسوسات یوں الفاظ کا جامہ پہنتے ہیں ؎

سب اعضا بدن کے موافق درست — ہر اک کام میں اپنے چالاک و چست

قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام   قیامت کرے جس کو جھک کر سلام

پنڈت نسیم نے اس مضمون کو یوں بیان کیا ہے ؎

دن دن اسے ہو گیا قیامت   بوٹا سی بڑھی وہ سرو قامت
چلتی تو زمیں میں سرو گڑتے   باتیں کرتی تو پھول جھڑتے

بہر حال کسی ادب پارے کو ابدیت بخشنے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں مقامیت کو دخل ہو اور فن کار نے اپنے موضوع کو، جو اس نے زندہ ہونے کی وجہ سے اپنے گرد و پیش سے ہی حاصل کیا ہے، محسوس کر کے پیش کیا ہو، فنی تقاضوں کا احترام کیا ہو۔ مقامیت سے قطعاً یہ مراد نہیں کہ اپنے ملک یا سماج کی تاریخ بیان کی جائے۔ ایسا کرنے سے وہ مؤرخ تو بن سکتا ہے، فن کار نہیں بن سکتا۔ فن کار تو خونِ جگر کی آمیزش سے اپنے فن کو تقویت بخش سکتا ہے اور نغمہ نے میں سرودِ رے آنے کی وجہ نے نماز کا دل ہے، چوب نے تو نہیں :

مؤرخ اور فن کار میں نمایاں فرق یہ بھی ہوتا ہے کہ مؤرخ کو صرف واقعہ بیان کرنا پڑتا ہے، لیکن فن کار کو اس واقعہ سے جو تحریکِ جذبات ہوتی اس کو بھی لینا ہے۔ پھر اپنے جذبات پر اسے گرفت بھی رکھنی ہے اور فنی علیحدگی بھی قائم رکھنی ہے۔ تب جا کر وہ اپنے تجربے یا واقعے کا ابلاغ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی اچھے فن پارے کی سب سے بڑی خوبی یہی تزردی گئی ہے کہ اس پر، مقامیت کے ساتھ ہی ساتھ حقیقت بھی ہو۔ اس کے لئے فن پارے کو تاریخی ارتقاء کی نہج پر بھی رکھنا ہوگا اور اس کا زمان و مکان کی قید سے بھی آزاد ہونا ضروری ہے تاکہ وہ ہر قسم کے قاری کو ہر دور میں متاثر کر سکے اور کسی خاص قسم کا قاری یا کوئی خاص دور ہی اس سے متاثر نہ ہو۔ اس لحاظ سے جب "سحر البیان" اور "گلزارِ نسیم" کو دیکھتے ہیں تو ہمیں "سحر البیان" میں "گلزارِ نسیم" کے مقابلے میں ایسے عناصر زیادہ ملتے ہیں جو اسے حیاتِ ابدی بخش سکتے ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ "سحر البیان" میں روحِ عصر ہے، فوق الفطرت عناصر مصنف کی نظر میں بنیادی حیثیت رکھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کو مقامی آب و رنگ دے کر اور نئے رچاؤ کے ساتھ پیش کرنے سے اُن کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے۔ اور آج کا قاری فوق الفطرت باتوں پر اتنی نگاہ نہیں رکھتا جتنی کہ بھر پور تاثر کی اور قصہ کو پیش کرنے کے فن کی، جس میں میر حسن یقیناً کامیاب رہے ہیں :

اس کے علاوہ زبان کی پاکیزگی اور نفاست کو انہوں نے خوب قائم رکھا ہے، جس کی وجہ سے اُن کے کئی اشعار ضرب المثل بن گئے ہیں۔ یہ بات "گلزارِ نسیم" میں نہیں، حالانکہ ایک حد تک وہ بھی اپنے دور کی عکاسی کرتی ہے۔ "گلزارِ نسیم" میں اپنے دور کے اوہام کی ایک دھندلی اور بے ربط سی تصویرکشی ہے اور آج کے قاری کو تو ذہن پر بار ڈال کر، ان بے ربط اوہام کے مجموعوں کو ترتیب دے کر، اس دور کے عقائد پر نگاہ رکھنی پڑتی ہے تب کہیں جا کر "گلزارِ نسیم" کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم "باغ و بہار" اور "فسانۂ عجائب" کو پیشِ نظر رکھیں تو ان دونوں کا تعلق بھی ان ہی دو مثنویوں کا سا ہے۔ "گلزارِ نسیم" میں انسان طوطا بھی بن سکتا ہے اور حوض میں غوطہ لگا کر عورت بھی بن سکتا ہے اور پھر دوبارہ دوسرے حوض میں غوطہ لگانے سے اپنی اصلی صورت پر واپس بھی آ سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جادو کے درخت سے ایک چھڑی لے کر وہ ایک دیو تو کجا دیووں کی پوری فوج کو بھی شکست دے سکتا ہے اور پھر حسن آراء کو ہوا میں اُڑا کر اسکے گھر بھی پہنچا سکتا ہے۔ بکاؤلی سرسوں کا دانہ بھی بن سکتی ہے اور کھیت میں اُگ بھی سکتی ہے اور پھر دہقان کے گھر میں پیدا ہو کر بھی بکاؤلی ہی رہتی ہے، جس سے ایک طرف مصنف کے مسئلہ تناسخ پر عقیدہ کا اظہار ہوتا ہے، تو دوسری طرف اس دور کی ذہنی معصومیت اور بھولپن کا بھی پتہ چلتا ہے۔ "گلزارِ نسیم" میں کتنی ہی باتوں کو بغیر کسی وجہ و جواز کے منوانے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی باتوں میں معاشرے کی سچی عکاسی نہیں۔ نسیم نے اپنے دور کو زندگی نہیں بخشی اور نہ ہمارے سامنے "گلزارِ نسیم" کو پڑھ کر اس دور یا کسی بھی دور کی جیتی جاگتی صورت ہی سامنے آتی ہے۔ برخلاف اس کے "سحر البیان" کو پڑھ کر پھر بھی ہم اودھ کے اس ماحول میں اپنے آپ کو کچھ دیر کے لئے پاتے ہیں جو یقیناً کبھی ہمارے ذہنوں پر حاوی تھا، جس میں زندگی تھی، تڑپ تھی، قربانی تھی، حسن تھا اور جس کی صحت مند روح آج بھی ہم میں موجود ہے :

"گلزارِ نسیم" کے حامی آج تک یہ بھی کہتے چلے آئے ہیں کہ اس مثنوی میں زبان کی صفائی یعنی ہیئت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ یہ بات اتنی ہی گمراہ کن ہے جتنے "گلزارِ نسیم" کے بعض نسخے۔ کسی فن پارے کی شکل صرف ہیئت سے ہی نہیں ملتی بلکہ در اصل موضوع ہی کسی فن پارے کو صورت بخشتا ہے اور ہر اچھا موضوع اپنے ساتھ اچھی ہیئت بھی لاتا ہے بشرطیکہ فن کار نے میر حسن کی طرح ہر بات پر اپنے دل کو خون کیا ہو اور برسوں کی ریاضت کے بعد اپنے فن پارے کو سامنے لایا ہو :

بہر حال "گلزارِ نسیم" میں "سحر البیان" کے مقابلے میں بہت کم باتیں ایسی ہیں جو اس کو زندہ رکھیں۔ "سحر البیان" میں زندگی ہے، توانائی ہے، وسعت ہے، تنوع ہے اور میر حسن کو یہ بات کہنے کا حق حاصل ہے کہ ؎ نہیں مثنوی ہے یہ اک پھلجھڑی — الخ — "سحر البیان" کی فضا میں ایک آہنگ نظر آتا ہے لیکن "گلزارِ نسیم" میں کئی جگہ بے آہنگی کا احساس ہوتا ہے اور سچ بات تو یہ ہے کہ "گلزارِ نسیم" کوئی ایسی فضا قائم بھی نہیں کر پاتی جس سے تھوڑی دیر کے لئے ہم ارتفاع محسوس کر سکیں :

مناجات

یوسف ظفر

کہاں سے لاؤں زباں میں وہ ندرتِ اظہار
جو تیری شان کے شایاں ہو حسنِ جانانہ
کہاں سمائے گا میرے بیاں میں تیرا کرم
کہ میرا کاسۂ الفاظ ہے گدایانہ

یہ جن کے ظرف میں ہے بوئے حرص و دردِ ہوس
یہ جن کی ساخت میں مٹی ہے مُردہ صدیوں کی
یہ جام اور ترا بادۂ جمال و جلال!
یہ لفظ اور حکایات تیرے پیاروں کی!!

مرے سجود میں مطلب، مری وفا میں غرض
مری نگاہ، زبانِ تقاضہ ہائے بشر
مرا خیال اسیرِ گماں، رہینِ خودی
مرا خلوص، مری حسرتوں کا دست نگر

تجھے پکاروں تو کیسے، تجھے کہوں بھی تو کیا
کہ تو حدود و تعین میں آ نہیں سکتا
ترے فراق سے ہے میری زندگی، یعنی
میں تیرے وصل کی جنّت کو پا نہیں سکتا

نہ تیری حمد کا یارا، نہ ہے ثنا کی مجال
کہ استعارہ و تشبیہ کا مقام نہیں
خوشا نصیب کہ ہوں درخورِ نظر ساقی!
نظر اٹھا کہ مری دسترس میں جام نہیں

سکھا مجھے وہ زباں جو ملی ہے پھولوں کو
انھیں نصیب تری بوئے دلبری کیوں ہے
وہ لفظ دے جو لرزتے ہیں دامنِ شب پہ
یہ جان لوں کہ ستاروں میں روشنی کیوں ہے

بیاں جو آبِ رواں کو دیا ہے، دے مجھکو
کہ میں سکوت کے دامن میں تجھ کو یاد کروں
عطا ہوئی ہے سحر کو جو آنکھ، دے مجھکو
کہ میں صباحتِ گلشن میں تجھ کو یاد کروں

خموشِ کوہ و بیاباں ترے تصور میں
سکوتِ ارض و سما عالمِ خیال میں ہے
مری زباں پہ نہ جا، میرے دل پہ ارزاں کر
وہ زیر و بم جو ترے نغمۂ جمال میں ہے

حسینۂ یونان

جعفر طاہر

گری چار دیوارِ تن ٹوٹ کر، حارسانِ حصارِ سیہ لڑکھڑائے
فرو خفتگانِ مبارز طلب کی صداؤں سے کوہ ودمن کپکپائے
وہ ابرِ گراں دود کے سرد سینے پہ لہرا گئیں بجلیوں کی زبانیں
کڑکتی کمانیں، چمکتی سنانیں، چکاچاک چاک چک چٹختی چٹانیں

کہیں سیفِ خارا شگن کی شعاعوں سے تیرہ نہادانِ شب تھرتھرائے
ترازوئے پولادِ سنجاں جو برسے، زبوں دیولاخوں میں جو نچال آئے
گریں کٹ کے یک بارہ پرنیاں کی طرح پھیلتی ظلمتوں کی ردائیں
شکستہ مزاروں، حصاروں، مغاروں میں سہمیں سیہ بخت سرپلائیں

وہ پرتابیانِ پرِ صید دُنبہ کا رُنے بڑھ کے بابِ بلارک کو توڑا
سپاہِ سبک دست نے ایک بھی دشمنِ زاغ دش کو سلامت نہ چھوڑا
شبِ شبہ گوں کے دُھندلکے چھٹے، وحشتوں کے پھریرے پھٹے پھڑپھڑائے
گھٹاؤں کے طوفاں گھٹے، ابرِ تیرہ کے دھبّے مٹے، بجر و بر کنکنائے

اٹھا حا سدِ سنگ رو کا جنازہ، شگفتہ دلانِ فلک مسکرائے
علم ہائے رخشاں، درفشِ درخشاں، سرِ طارمِ آسماں لہلہائے
برسنے لگے بورۂ زرگراں کی طرح ناچتی نرم کرنوں کے جھالے
کراں تا کراں ساقیانِ خجستہ لقا نے فضاؤں میں ساغر اچھالے

اُدھر خسروِ خاوراں نے جنونِ جنادل جگر کو سزائیں سنائیں
ادھر اک نئی شان سے شہرِ جاں جگمگایا، درخشانیاں جھجھمائیں
سراپردۂ چار میں سے کوئی روشنائے جواں زیرِ لب مسکرائی
بہکتے اُجالوں کے ہمراہ نوشابۂ خاک بھی جھوم کر گنگنائی

بہا سیلِ طرّارِ انوار بنکر، سیہ بخت صدیوں کا سنگیں اندھیرا
وہ سایہ پرستوں کی سونی جبینوں پہ جاگا سہانا سہانا سویرا

نگارانِ زیبا نظر کے لبِ نازپر کوئی حرفِ گراں تک نہیں تھا
رُخِ گرد آلودِ گردوں پہ تپتے ہوئے آبلوں کا نشاں تک نہیں تھا

درختوں نے لہرا کے انگڑائیاں لیں تو سمٹی ہوئی ڈالیاں لہلہائیں
حیادار کلیوں نے بندِ قبا کھول کر خواب آلودہ آنکھیں اٹھائیں
اُبھرنے لگے شاخ در شاخ ننھے پرندوں کے سہمے ہوئے آشیانے
ڈھلے شبنموں میں ستاروں کے موتی تو موجِ ہوا بن کے اٹھے ترانے

وہ طاؤس دیرساں ہوئے رقص فرما، چمن در چمن شوخ مُرغار بولے
وہ شمشاد قامت حسینوں کے انبوہ، آہو مزاجوں کے دلشاد ٹولے
کہیں مرمریں معبدوں میں سحر گاہ بجلی بداں دیویاں مسکرائیں
گرانڈیل، رونڈے پجاری زئیس کی حضوری میں ہمراہ کے گردن جھکائیں

حسینانِ دیبنس جبیں نے اپالو کی توصیف میں نو بہ نو گیت گائے
کسی کامنی نے جو گنبد ھرب گایا تو آکاش پر دیوتا کلکلائے
سُریں جیسے آہو طرارے بھریں، انترا جیسے کوئی ابھرتی جوانی
جو سہرتان تلوار بن بن کے پلٹے تو ہوں تان کپتان بھی پانی پانی

قدِ ناز جیسے شجاعت شعارانِ خود سر کے میداں میں نیزے گڑے ہوں
سرِ شام جلتی فصیلوں پہ شعلوں کے مینار جیسے ابھرتے گئے ہوں
بدن مرغزارِ عدن کی طرح آبشاروں کی مانند پر نور یا نہیں
وہ گردن کا ڈورا جو دیکھیں تو بیدھ جائیں ہنستے ہوئے موتیوں کی نگاہیں

شفق رنگ چہروں پہ خورشید قرباں، سنہری سبو چوں کی مانند سینے
دو چپوں کی لہروں میں وہ ڈوبتے، ڈولتے، ڈگمگاتے ابھرتے سفینے
کسے تاب یہ چاند سے قفل توڑے یہ دُرجِ زرِ شت افشار لوٹے
ادھر سے بچے بھی تو یہ کیسے ممکن کہ زلفوں کی زنجیرِ جادو سے چھوٹے

حنائے سرِ ناخن نازکی آتشِ بے زبانہ سے عالم فروزاں
وہ سو عذر خواہانہ انداز بن بن کے آنکھوں میں سرمے کی تحریر خنداں
کوئی سینۂ شہد گوں عمر فرسا کو دیتا ہوا عشرتوں کے پیالے
سرِ فرقِ مہتاب سائے نظر سوز ہالے، نرالے نرالے اجالے

کفِ مرمریں کی لکیروں سے کتنے جزیروں کو جاتی ہوئی پاک راہیں
وہ راہیں کہ جن کے خم و پیچ میں تند بادِ اجل، بیکراں عیش گاہیں
کہیں سیم لاخوں کے ہر چاکِ سیمیں سے چھنتی ہوئی چاندنی کا گماں ہو
شبِ ماہ میں برف کے نقرئی جسم سے پھوٹ کر جیسے چشمہ رواں ہو

سمندر کے نیلے کناروں پہ کتنے محل، قصر، ایواں، شبستاں، گلستاں
گلستاں کہ جن میں بتانِ قیامت قدم، رنگ ریزاں، خراماں خراماں
چٹانوں ڈھلانوں کے دامن میں پھیلے ہوئے دو رنگ مرغزارِ صفا
یہ دامانِ زریں کمر کے جلو میں جواں بیگمیں محوِ سیر و تماشا

کہیں قاربوں، کشتیوں، زورقوں بجروں میں بیٹھی ہوئی نازنینانِ عریاں
دمکتا ہوا تند سینوں کا سونا، صدف رنگ ہاتھوں کا بلور تاباں
وہ خانہ فروشانِ دولت بڑی عاشقانہ ادا سے نگیں جھینپ جائیں
مگر بانوانِ ستارہ نظر اپنی عریانیوں سے نہ کچھ خوف کھائیں

بنِ کوہ میں خیل در خیل بانکے جیالے جواں ہمتیں آزمائیں
وہ ہاتھوں میں زیتون کی سبز شاخیں لئے مرغزاروں میں دوڑیں لگائیں
کہیں تیر انداز رہ رہ کے اپنے ہدف ہائے فرضی پہ باندھیں نشانے
لگے دمبدم اپنے یاروں کو پیکان کا کل ریا کے کرشمے دکھانے

کبھی شغلِ پنجہ کشی تو کبھی کشتیوں کے اکھاڑوں میں طوفاں اٹھائیں
کبھی کمہ بازی میں ٹکر جو ماریں پہاڑوں کی پہنائیاں کانپ جائیں
زنانِ قوی دست وپا اک طرف زور بازو دکھائیں جو ترمن فگنی میں
تو حورانِ آراستہ دوسری سمت مشغول و مصروف نیزہ زنی میں

کہیں طفلِ نوزاد پر صاحبانِ خرد اپنی پرہول آنکھیں جھکائے
یہی فکر جیسے کبھی ہو کوئی کمزور و بیمار بچہ پنپنے نہ پائے
قضا را کمیٹی کے معیارِ صحت پہ اترا نہ پورا جو معصوم کوئی
پہاڑوں سے نیچے اسے پھینک آئے، کوئی آنکھ بچے کے غم میں نہ روئی

حکومت کا یہ حکم تھا بانوانِ حسیں ٹبلکوں سے ملیں بے تحاشا
اور اس اختلاطِ یگانہ سے ہوگی گھروں میں تنومند اولاد پیدا
یہ آئین بزرگانِ دولت وطن کی نگاہوں میں مردان والا حشم تھے
سپاہی تھے سلطان و حاکم تھے لیکن، نہ اہلِ خبر تھے نہ اہلِ قلم تھے

یہ اسپارٹا تھا، یہ اسپارٹا کے حسینوں مکینوں کی تھیں داستانیں
وہ پرپیچ کوچے، وہ پرتاب گلیاں وہ بانکے مکاں، جگمگاتی دکانیں
عروسانِ زیبندہ رفتار کے جگمگھٹے چلبلی چاند پریوں کے میلے
ادھر ایک لنگر گسستہ سفینہ جھپٹتی ہوئی تند موجوں کے ریلے

بساطِ بلاخیز بحر رواں پر ابھرتے جنازوں کی لانبی قطاریں
فرو ماندگانِ اجل کے یہ بس میں نہیں تھا کہ اب ناخدا کو پکاریں
ادھر میگھ شالوں میں لپٹے ہوئے کوہساروں کی پیشانیاں جگمگائیں
ادھر اک سفینے کی ٹوٹی ہوئی ہڈیاں سیلِ دنداں سیہ نے چبائیں

شبِ تیرہ و تار میں پنجۂ مرگ سے کوئی بچنے نہ پایا جہازی
نہ کام آئی گردوں شناسی، نہ رسمِ سمندر نوازی نہ حیلہ طرازی
نہ وہ آہنیں دوشِ ملاح باقی نہ کوئی امیرِ عناں تاز باقی!
نہ غوغائیانِ گرفتہ جگر کی ہواؤں کی لہروں پہ آواز باقی!

کسی فصلِ پر کاٹ ندہ کی طرح بکھر گئیں جری کی پراگندہ لاشیں
کسی فرش پر جیسے چھلکوں کے انبار، ڈھیریں نچوڑی ہوئی زرد قاشیں
لٹے بکھر کر ریشہ ریشہ رہے مات بحرِ سیلِ طوفاں سے لیکن کہاں رستگاری
ادھر چند مجبور و ناکام انساں ادھر تشنۂ خوں اجل کا شکاری

نہ مستول و سکان و سیمیں شقیقہ، نہ وہ بادبانوں کے مخمور سائے
یہ سب کچھ فقط نقشِ بر آب تھا نقش بر آب پر کون آنسو بہائے؟
نواحی نشینانِ مغرور و مسرور نے سازِ عیشِ خرد سوز چھیڑا
مجھ کو کنارے سلامت نہ پہنچا جواں سال و جانباز نیریس کا بیڑا

تابِ نظّارہ

جمیل نقوی

زیست کی اس قلیل فرصت میں
کہیں امید کی ذرا سی کرن
پھوٹتی ہے تو شاعرِ فطرت
اپنی فرصت کے چند لمحوں کو
جذبۂ سرخوشی میں اُلجھا کر
چاہتا ہے کہ جس قدر ممکن
ہو سکے، مستفید ہو جائے

کس کو معلوم ہے کہ دورِ فلک
پھر یہ موقع عطا کرے نہ کرے

انقلابات سے زمانہ کے
کتنی آباد محفلیں اُجڑیں
کتنے رنگین خواب ٹوٹ گئے
کتنے روشن چراغ لَو دے کر
رات کی تیرگی میں ڈوب گئے
کتنے منظر فضا میں لہرائے
جن کی رنگینیوں کے افسانے
آج بھی ہیں گلوں کے سینوں میں

یہ فضائیں، یہ آسمانِ کبود
یہ ستارے، یہ کہکشاں، یہ نجوم
چودھویں رات کا جواں مہتاب
رات کی پُرسکون وادی میں
چاندنی کا طلسم بُنتے ہیں
وقت کی سست رو ندی کا خرام
روح کو لوریاں سُناتا ہے
نیم خوابیدہ زندگی کا شعور
سرد نغموں میں ڈوب جاتا ہے

لیکن احساس سو نہیں سکتا
دل کی بے تاب آرزوؤں کو
بے خودی میں سمو نہیں سکتا
دل کو رہ رہ کے گدگداتا ہے
شوق کو منزلیں دکھاتا ہے
جاگ اٹھتی ہے روحِ خوابیدہ
شوقِ نظّارہ چونک پڑتا ہے
اور میٹھی اداس خاموشی
چھیڑ دیتی ہے اک نیا نغمہ ــــ
"کون جانے کسے خبر ہے جمیل
زیست کی اس قلیل فرصت میں
آنکھ کو کب ہو تابِ نظّارہ"

جیب کترا

غلام عباس

دسمبر کا مہینہ۔ شام کا وقت، لاہور کی مال روڈ اپنی پوری رعنائی پر تھی۔ سڑک پر موٹروں اور تانگوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ اور مال روڈ کے دونوں طرف کی پٹریوں پر پیدل چلنے والوں کا وہ ہجوم کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ ہوا میں خنکی خاصی بڑھ گئی تھی۔ امیر امرا قیمتی گرم ملبوسات میں اور غریب غربا میلے پھٹے کپڑوں میں اپنے جسموں کو ڈھانپے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلے جا رہے تھے کہ اچانک ایک خوش پوش اور بھاری بھرکم شخص کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے کوٹ کی جیب میں کوئی چیز سرک رہی ہے۔

اس شخص نے جلدی سے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا اور ایک ننھا سا سردی سے ٹھٹھرا ہوا ہاتھ اپنی مضبوط انگلیوں کی گرفت میں جکڑ لیا۔ اس کے ساتھ ہی پیچھے سے درد و کرب کی ایک چیخ سنائی دی اور چور سامنے آ گیا۔

یہ ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔ تن پر چیتھڑے لٹکائے۔ ایسا لاغر کہ ہڈیاں جلد سے باہر نکلی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ چہرہ ہلدی کی طرح پیلا ہو رہا تھا۔ اس معزز شخص نے اس کا ہاتھ ایسی سختی سے پکڑ رکھا تھا کہ مارے ہیبت کے اس کی گھگھی بندھ گئی تھی۔ امیر آدمی نے چلا کر کہا۔

"پاجی کہیں کے۔ اس چھوٹی سی عمر میں تو لوگوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ ٹھہر جا۔ تجھے ابھی پولس کے حوالے کرتا ہوں۔"

لڑکے نے ہاتھ چھڑانے کی ذرا کوشش نہ کی۔ زور زور سے کانپے جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا اب دم نکلا، اب جان نکلی۔ ہوا اب کیا ہو جائے گا۔ اتنے میں لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے۔ پل بھر میں تماشائیوں کا خاصا مجمع ہو گیا۔

وہ شخص لڑکے کو گھسیٹتا ہوا چند قدم چلا۔ مجمع بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اس پر وہ شخص گھبرا سا گیا۔ فطرتاً نیک دل اور بھلا آدمی تھا۔ چلتے چلتے اپنے دل میں غور کیا کہ میری اور اس لڑکے کی حالت میں کتنا فرق ہے۔ میں ایسا تنومند، بانات کا ایسا قیمتی سوٹ پہنے ہوئے۔ یہ دبلا پتلا ننھا سا۔ تن پر چیتھڑے لٹکائے۔ اس کے خلاف مدعی بننا کسی ذلت کی بات ہے۔ مگر ظاہر میں ڈپٹ کر بولا۔ "چل تجھے تھانے لے چلتا ہوں۔"

ایک تانگے والے کو آواز دی۔ لڑکے کو گھسیٹ کر تانگے کی اگلی سیٹ پر بٹھایا اور خود پیچھے بیٹھا۔ ابھی تک لڑکے کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ تانگہ چلا اور تماشائیوں کے ہجوم سے نجات ملی تو اس نے لڑکے پر سوالوں کی بوچھار کر دی:

"سچ سچ بتا تیرا نام کیا ہے؟ عمر کیا ہے؟ تیرا باپ کیا کرتا ہے؟۔ تو نے لوگوں کی جیبوں سے مال اڑانے کا یہ دھندا کب سے شروع کر رکھا ہے؟"

لڑکے نے کسی بات کا بھی جواب نہ دیا۔ وہ زور زور سے سسکیاں لینے لگا۔ اس پر اس شخص کے دل میں خوف پیدا ہوا کہ کہیں روتے روتے لڑکے کا دم ہی نہ الٹ جائے۔ پچکارتے ہوئے بولا:

"روؤ نہیں۔ جواب دو۔"

لڑکے نے ہچکیاں لے لے کر کہنا شروع کیا۔

"نو برس کا ہوں۔ (معلوم چھ کا ہوتا تھا) دو سال ہوئے ابا مر گئے۔ . . . . . . امی بیمار ہیں . . . . . کام نہیں کر سکتیں . . . . ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہیں . . . . . اور ننھیاں رو رہی ہیں۔"

"ننھیاں کون؟"

"میری ننھی بہنیں، تین ہیں، پانچ تھیں۔ دو مر گئیں... میرا نام جمن ہے۔"

اب اس معزز شخص نے لڑکے کا سکڑا ہوا ہاتھ چھوڑ دیا اور غور سے اس کے زرد چہرے کو تکنے لگا۔ روتے روتے لڑکے کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ اور آنسوؤں سے اس کے گالوں کا میل اتر رہا تھا۔ اس شخص نے پھر پوچھا۔ "تمہاری ماں کہاں رہتی ہیں؟"

جمن نے ایک جگہ کا نام لیا۔ جہاں غریب غربا بستے تھے۔ یہ جگہ زیادہ دور نہ تھی۔ اس شخص نے کوچوان سے اس علاقے کی طرف چلنے کو کہا۔ تھوڑی دور پر تھانہ نظر آیا۔ مگر تانگہ وہاں نہ رکا۔ اس سے جمن کو کسی قدر اطمینان ہو گیا اور اس نے رونا بند کر دیا۔ اب اس شخص نے پھر جمن سے پوچھ گچھ شروع کر دی: "تم کب سے لوگوں کی جیبیں کاٹ رہے ہو؟"

"آج پہلی بار ہے۔"

"یہ کام تمہیں کس نے سکھایا ہے ؟"

"بندو نے سکھایا تھا ۔"

"بندو کون ؟"

"لونڈا ہے میری عمر کا مگر ہے بڑا تیز۔ اس نے ایک شرابی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر مجھے دکھایا کہ یوں جیب کاٹتے ہیں۔ پر شرابی کی جیب میں کچھ تھا ہی نہیں۔ آج میں نے بھی ایسا ہی کیا ۔ بس آج ہی ۔ (رو کر) سرکار ۔ کل ہم نے ایک پیسے کے چنوں سے پیٹ بھرا تھا ۔ آج ایک پیسہ بھی نہ تھا ۔ اور نھیاں رو رہی ہیں ۔ اور مکان والا ہمیں مکان سے نکال رہا ہے ۔ آج صبح کو میں نے ایک پان والے سے ہاتھ جوڑ کر کہا ۔ مجھے دو چار ڈبیاں سگرٹ کی اور کچھ پان دے دو ۔ بیچ کر پیسے دے دوں گا ۔ اس نے میرے گال پر تھپڑ مارا ۔ پھر میں نے بھیک مانگی ۔ پھر کسی نے کچھ نہیں دیا ۔ پھر میں نے آپ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور آپ نے مجھے پکڑ لیا ۔ آپ مجھے تھانے تو نہیں لے جائیں گے سرکار ۔ میں پھر ایسا کبھی نہیں کروں گا ۔ امی کو خبر ہو گئی تو وہ میری ہڈیاں ہی توڑ ڈالیں گی ۔ (ہاتھ جوڑ کر) کیوں حضور آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں تھانے میں تو نہیں ۔ ؟"

"نہیں"۔ اس معزز شخص نے جواب دیا ۔ "میں پہلے تمہارے گھر جا کر دیکھوں گا کہ جو کچھ تم نے کہا ہے ۔ سچ ہے یا جھوٹ ۔ اس کے بعد میں اس بات کا فیصلہ کروں گا" ۔

اب دونوں خاموش تانگے میں بیٹھے چلے جا رہے تھے ۔ گو کبھی کبھی جمن ایک آدھ سسکی بھر لیتا تھا مگر اس خیال سے کہ میں تانگے میں سوار ہوں اس کے سوکھے سے چہرے پر خوشی کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ رہی تھی ۔ ادھر وہ معزز شخص ایک گہرے سوچ میں ڈوبا ہوا فطرت انسانی کی بلندیوں اور پستیوں کے عقدے حل کرنے میں مصروف تھا ۔

تانگہ اب ایک ایسے مقام سے گذر رہا تھا جس سے یہ صاحب نصیب شخص جو بچپن ہی سے کوٹھیوں میں رہنے کا عادی تھا بالکل ناواقف تھا ۔ کئی موڑ گذرنے کے بعد تانگہ ایک نہایت بوسیدہ اور گندے احاطے کے سامنے پہنچ کر رک گیا ۔ کوچوان نے خیر خواہی جتانے کے لیے دبی آواز میں اس معزز شخص سے کہا :

"جلد لوٹ آئے گا ۔ سرکار ۔ یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا ٹھیک نہیں"۔

وہ معزز شخص لڑکے کے ساتھ احاطے کے اندر پہنچا ۔ احاطے میں چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں جن کے دروازوں پر بوسیدہ ٹاٹ کے پردے پڑے ہوئے تھے ۔ ان پردوں کی آڑ میں سے عورتیں اور بچے پھٹے پرانے پیوند لگے کپڑے پہنے جھانک رہے تھے ۔ ہر ایک کو یہ دھن لگی تھی کہ دیکھیں یہ امیر آدمی کس کے یہاں آیا ہے ۔ اس شخص نے تاسف کے ساتھ دل میں کہا ۔ بھلا ان فاقے کے مارے لوگوں سے کسی کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے" !

جمن کی رہبری میں اس شخص نے احاطے کا بدبودار اور گندہ راستہ طے کیا اور ایک کوٹھری میں داخل ہوا جس کی نظیر آج تک اس کی نظروں سے نہ گذر رہی تھی ۔ چھت مکڑی کے جالوں سے ، اور دیواریں دھوئیں سے سیاہ ہو رہی تھیں ۔ کچے فرش پر دو بوسیدہ اور جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی چٹائیاں بچھی تھیں ۔ مٹی کے تیل کی ایک خالی بوتل جس کا گلا ٹوٹ گیا تھا ۔ ایک نجانے کن وقتوں کی سراحی جس پر سیاہ کائی جمی تھی ۔ اور مٹی کا ایک ٹوٹا ہوا پیالہ ۔ یہ تھی اس گھر کی ساری کائنات ۔ چوطھا راکھ سے بھرا ہوا تھا گویا اس میں کوئلہ یا اپلا نام کو نہ تھا ۔ ایک کریہہ المنظر بڑھیا چٹائی پر گھٹنوں کے بل بیٹھی میلی کچیلی دھجیوں کو سی رہی تھی ۔ دوسری چٹائی پر ایک بچی لیٹی ہوئی تھی ۔ اس کا چہرہ موم کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا ۔ جیسے جسم میں جان ہی نہ ہو ۔ ایک کونے میں پانچ برس کی ایک دبلی پتلی بچی کوڑے کے گندے پروں ٹھیکروں اور ایک بے سر کی گڑیا سے کھیل رہی تھی ۔ ایک طرف ایک اس سے بھی چھوٹی اور لاغر بچی زمین پر بیٹھی روٹی کے ایک سوکھے ٹکڑے کو چوس رہی تھی ۔ اس تیز سردی میں بڑھیا اور ان بچیوں کے تن پر گرم کپڑے کا ایک تار بھی نہ تھا ۔ بڑھیا کے بال پریشان اور دھول میں اٹے ہوئے تھے ۔ معلوم ہوتا تھا برسوں سے تیل نصیب نہیں ہوا ۔ اس معزز شخص کو دیکھ کر اس نے جلدی سے ایک میلا اور پھٹا سا دوپٹہ اپنے سر پر ڈال لیا ۔

اس منظر کو ، جسے شام کے دھندلکے نے اور بھی بھیانک بنا دیا تھا ، دیکھ کر اس شخص کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ۔ غربت انسان کو پستی کی کس حد تک پہنچا سکتی ہے ، اس کا مشاہدہ آج زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے کیا تھا کانپ اٹھا ۔ مارے شرم کے گڑا جاتا تھا ۔ تانگے میں بیٹھے بیٹھے اس نے سوچا تھا کہ پہنچوں گا تو بڑھیا کو اچھی اچھی نصیحتیں کروں گا ۔ کہوں گا ۔ بڑی بی ۔ لڑکے کو کسی کام میں لگاؤ ۔ نہیں تو آوارہ پھر کر جیل کی ہوا کھائے گا ۔ پر اب ایک لفظ بھی یاد نہ آتا تھا ۔ ادھر بڑھیا بڑی حیرانی سے اس کا منہ تک رہی تھی ۔

آخر اس شخص نے بڑی مشکل سے رک رک کر بڑھیا سے کہا :

"معاف کرنا ..... پریشان ہونے کی بات نہیں ..... لڑکا بتا دے گا ..... ایسے ہی بھول ہو گئی ..... یہ قبول کر دو"

بڑھیا کی جھولی میں دس روپے کا نوٹ پھینک - تیز تیز قدم اٹھا - وہ معزز شخص احاطے سے نکل آیا۔ سخت گھبرایا ہوا تھا - تانگہ چلا تو جان میں جان آئی - ذرا سی دیر میں تانگا اسے پھر اس کی عیش و کامرانی کی دنیا میں لے آیا۔

ادھر اس کوٹھری میں حیرت زدہ بڑھیا جمن سے اصل ماجرا پوچھنے کی کوشش کر رہی تھی جمن ایک ہی شریر - ماں کو اس الجھن میں دیکھ کر وہ مزے لے رہا تھا - آخر کار جب بڑھیا حقیقت سے آگاہ ہوئی تو رو رو کر آسمان سر پر اٹھانے لگی :

"یہ تو نے کیا کیا - نامراد، کیا تقدیر میں یہی لکھا تھا کہ تو لوگوں کی جیبیں کاٹے (سسکی لے کر) تیرا باپ بہشتی - بھوکوں مرجاتا مگر غیر کے پیسے کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا - ہم لاکھ غریب سہی مگر ہیں تو شریف - اور تو ...... اپنے باپ کے نام کو بٹہ لگا رہا ہے - ہائے اللہ میں کیا کروں - اللہ اب یہاں تک نوبت پہنچی کہ میرا جمن جیبیں .... (اچانک غصے میں آکر) کیوں بے منڈی کاٹے تجھے یہ کیا بیٹھے کا روگ لگ گئی تھی - سن رکھ اگر پھر کبھی ایسا کام کیا تو تیرا قیمہ کر دوں گی" مگر جمن ہنس رہا تھا :

"برا کیا ہوا - دس کا نوٹ دے گیا - اور پھر ہم نے تانگے کی سیر بھی کی :

"اور جو سپاہی کے حوالے کر دیتا تو ...... جیل میں پڑا سڑتا"

"اس کی تم فکر نہ کرو امی - بندو نے مجھے یہ ترکیب بتلائی ہے - وہ کہتا ہے - امیر آدمی جیل خانے میں نہیں ڈلوایا کرتے - بندو کو اس کے باپ نے یہ دھندا سکھایا ہے کہ جب تم کسی ایسے آدمی کو دیکھو جو بہت بڑھیا کپڑے پہنے ہوئے ہو اور چہرے سے کوئی بڑا آدمی معلوم ہوتا ہو تو اس کی جیب میں ہاتھ ڈال دو - وہ تمہیں پکڑے گا - تم کہنا - تین دن سے گھر میں فاقہ ہے - بس وہ تمہیں ساتھ لے کر تمہارے گھر جائے گا اور تمہیں روپے دے گا - اس میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں - بہت ہوگا تو ایک آدھ تھپڑ پڑ جائے گا ننھے بچوں کو جیل خانے میں کوئی نہیں ڈلواتا - بندو چار مہینے سے یہی کسب کر رہا ہے - کسی اٹھوارے اسے دس مل جاتے ہیں کسی اٹھوارے پندرہ - اس کا باپ بیماروں کا سا ڈھونگ رچائے سارا دن کھاٹ پر پڑا رہتا ہے - جب بندو کسی امیر آدمی کو لے کر آتا ہے تو اس کا باپ جھوٹ موٹ اٹھنے کی کوشش کرتا ہے کہ لاٹھی سے بندو کی خوب خبر لے، مگر کمزوری سے اٹھا نہیں جاتا اور وہ گر پڑتا ہے - پھر وہ کانپتی ہوئی آواز میں امیر آدمی سے کہتا ہے - "بے ایمان نہیں ہوں سرکار - مزدوری کرتا تھا - بیمار ہو گیا - بس ایسی ہی باتیں بنا دیتا ہے - اس پر وہ آدمی ترس کھا کر کچھ نہ کچھ اس کے باپ کو دے جاتا ہے .... اور ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا - اس امیر آدمی نے آکر دیکھ لیا کہ میں نے جو کچھ کہا وہ سچ تھا - بس اب تو ہم بھی یہی دھندا کریں گے"

"نہیں رے نہیں" بڑھیا نے جھڑک کر کہا - "یہ کام پھر کبھی نہ کیجو - اللہ میاں خفا ہوں گے اور پھر سرکار بھی جیل خانے بھیج دے گی - کان پکڑ پھر کبھی نہیں کروں گا"

جمن نے کچھ جواب نہ دیا -

دس روپے مل جانے سے چولھا بھی سلگا - ہنڈیا بھی چڑھی اور مالک مکان کو بھی کچھ دے دیا گیا - لیکن ہفتے ہی بھر میں یہ لوگ کوڑی کوڑی کے محتاج ہو گئے - اب کے ایک پیسہ بھی نہ تھا کہ چنے چبا کر ہی پیٹ بھرتے - جمن کنجڑوں کی دکانوں کے آگے سے سبزیوں کے ڈنٹھل وغیرہ اٹھا لایا اور اسے نمک مرچ لگا کر سب نے پیٹ کی آگ بجھائی - دوسرے دن جمن نے بڑی دلیری کے ساتھ اپنی ماں سے کہا : "اماں - لو میں چلا"

بڑھیا اس کا مطلب سمجھ گئی اور چلا کر بولی :

"جمن بیٹے ٹھہر - تجھے قسم ہے ٹھہر"

مگر جمن نہ ٹھہرا اور بھاگ کر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا - بڑھیا بے چاری قسمت کو رو کر بیٹھ گئی - کوئی گھنٹہ بھر کے بعد بڑی لڑکی نے کہا :

"امی جان - بی ہمسائی نے یہ بچے ہوئے کوئلے دئے ہیں تم کہو تو آگ سلگا لوں ، ہاتھ پاؤں ٹھٹھرے جا رہے ہیں -"

بڑھیا سوچ میں پڑ گئی :

لڑکی نے پھر کہا : "اماں کہو - کیا کہتی ہو"

بڑھیا نے جواب میں پھر پس و پیش کی - آخر اس نے دبی زبان سے رک رک کر کہا :

"نہیں بیٹی - آگ نہ جلاؤ - کیا جانیں اس دن کی طرح تمہارا بھیا آج بھی کسی امیر آدمی کو ساتھ لے آئے"

اور امیر آدمی کے انتظار میں گھر کی حالت کو اور بھی اندوہناک بنانے کے لئے وہ زمین پر بیٹھ گئی - گود میں لاغر اور زرد رو بچی کو بٹھا لیا اور چیتھڑوں کی سلائی میں مصروف ہو گئی ؞ (ماخوذ)

"ماہِ نو"

کا

شمارۂ خاص

(مارچ ۱۹۵۷ء)

تاریخی سال ———— تاریخی پیشکش

جو

پاک وہند کے متعدد نامور اہلِ قلم کے مایۂ ناز فن پاروں پر مشتمل ہوگی

"جمہوریۂ اسلامیہ پاکستان" کی پہلی سالگرہ کے موقع پر

مارچ ۱۹۵۷ء

میں بروئے کار آرہا ہے

(سالِ رواں سے ہمارا شمارۂ خاص اگست کے بجائے مارچ ہی میں شائع ہوا کرے گا)

مندرجات کا مفصل اعلان آئندہ اشاعت میں ملاحظہ فرمائیں

ایجنٹ اور مشتہرین حضرات

اس اعلان کے مدِنظر اپنی مطلوبہ تعداد (خاص نمبر مارچ ۱۹۵۷ء) سے فوری طور پر مطلع فرمائیں۔ اور مشتہرین حضرات بھی اپنے اشتہارات کی بکنگ کے لئے جلد از جلد متوجہ ہوں کیونکہ یہ شمارہ خاص اہتمام سے شائع کیا جارہا ہے اور عنقریب طباعت کے لئے بھیج دیا جائے گا۔

(ادارہ)

پشتو رومان

شہی، تور دلئی

رضا ہمدانی

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہندوستان میں مغل شہنشاہ اکبرِ اعظم کا طوطی بول رہا تھا سارے برِ عظیم میں اس کا سکہ رواں تھا مغل پھریرا ہمالہ کی سب سے اونچی چوٹی پر لہرا رہا تھا اور ہر طرف مغل آرٹ، قوت اور تلوار کے چرچے تھے۔

انہیں دنوں ملک کے اس پار پشتونوں کے دو مشہور قبیلوں یوسف زئی اور مندڑ میں باہمی رقابت چل رہی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ معمولی معمولی باتوں پر خون کی ندیاں بہہ جاتی تھیں۔

یوسف زئی قبیلے کے دو چچیرے بھائی تور دلئی اور شنور کی آپس میں بڑی دوستی تھی۔ وہ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ سارے قبیلے میں ان کا اتحاد ضرب المثل بن گیا تھا۔ چچیرے بھائیوں میں اتنی دوستی تربوروں میں ایسا اتفاق — لیکن یہ سلسلہ زیادہ دن نہ چل سکا اور جلد ہی ان کی دوستی دشمنی میں بدلنے لگی جیسے ان کی محبت کو زمانے کی نظر کھا گئی — والدین کی وفات کے بعد زمین کی تقسیم نے ان کے خلوص کو کچلا دیا اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف مخالفانہ جذبات ابھر آئے۔

تور دلئی کو شکار سے بڑی رغبت تھی، اس کا زیادہ وقت اپنے ساتھیوں کے ساتھ شکار کی تلاش میں جنگلوں اور پہاڑوں میں گزرتا، اس کی طبیعت میں آوارگی تھی، گاؤں میں اس کا جی نہ لگتا۔

ایک دن جب وہ شکار کی تلاش میں تھے اچانک ان کے راستے میں ایک ایسی چراگاہ آگئی جو مندڑ قبیلے کی ملکیت تھی تور دلئی کے لئے اسے عبور کرنا ناگزیر تھا اس کے ساتھیوں نے چراگاہ میں داخل ہونے پر لوٹ جانے کو ترجیح دی، انہیں معلوم تھا کہ مندڑوں کی چراگاہ میں قدم رکھنے کا مطلب قبیلے کو جنگ کی دعوت دینا ہے لیکن تور دلئی نے ساتھیوں کے مشورے پر عمل نہ کیا اور کہا "دیکھا جائے گا"۔

جب مندڑوں کو ان کے چرواہے نے یہ خبر دی کہ یوسف زئیوں نے ہماری چراگاہ پر ہلہ بول دیا ہے تو ان کی تلواریں نیام سے تڑپ کر باہر نکل آگئیں۔ قبیلے میں جنگ کا نقارہ بج گیا۔ بچہ بچہ مسلح ہو کر چراگاہ کی طرف لپکا۔ عورتوں نے گھر کا کام کاج چھوڑ کر پانی کے مشکیزے کندھوں پر ڈال لئے — "یوسف زئیوں کی یہ جرأت کہ مندڑوں کے منہ آئیں، انہیں مزہ چکھا دیا جائے گا"۔

مندڑوں کی چراگاہ آن کی آن میں انسانوں کے خون کی جھیل بن گئی۔ تور دلئی کے چند ساتھی آخر کب تک مقابلہ کرتے، مندڑوں کے لاؤ لشکر نے انہیں کاٹ کر رکھ دیا۔ تور دلئی زخموں سے چور ہو چکا تھا، پیاس کی شدت سے اس کی زبان پر کانٹے پڑ چکے تھے۔ دشمنوں کے ہجوم میں وہ کس سے پانی مانگتا۔ وہ تو اس کے خون کے پیاسے تھے۔ اتنے میں ایک عورت کندھے پر مشکیزہ ڈالے اس کے قریب سے گزری۔ تور دلئی کے منہ سے بے اختیار نکلا "پانی"— اور جب عورت نے اسے پانی کا مشکیزہ دیا تو اس حسین و جمیل دوشیزہ سے آنکھیں چار ہوتے ہی تور دلئی کے ہاتھوں سے مشکیزہ گر کر زمین پر آ رہا۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور نظریں دوشیزہ کے چہرے پر گڑ گئیں۔

"کیا بات ہے اجنبی! تمہارے ہاتھوں میں مشکیزہ تھامنے کی قوت نہیں تو تلوار کیسے چلاؤ گے۔ یوسف زئی ہو نا" دوشیزہ نے طنز کا ایک نشتر چبھوتے ہوئے تور دلئی سے کہا۔

"کوئی بات نہیں خاتون"— تور دلئی نے چونک کر کہا

"یہ لو اور پانی — میری طرف دیکھنے سے بہتر ہے کہ تم پانی پی لو۔ مندڑ اپنے دشمن کو پیاسا نہیں دیکھ سکتے"۔

"پانی تو پی چکا ہوں لیکن پیاس اتنی بڑھ گئی ہے کہ اب اسے دریا بھی نہیں بجھا سکتا"۔

"اگرچہ مجھے یوسف زئی کے نام سے نفرت ہے لیکن میں اس دشمن کی بھی قدر کرتی ہوں جس کی پیٹھ پر زخم نہ ہو، اسی لئے میں نے تجھے بہادر جان کر پانی دیا لیکن تیری باتوں سے تو بزدلی کی بو آرہی ہے"

"میں یوسف زئی قبیلے کا شیر دل جوان ہوں، اپنے قبیلے کی آن پر کٹ مرنے والا۔ میں منڈروں کے ان گیدڑوں کو خاطر میں نہیں لاتا جنہوں نے جھاڑیوں میں چھپ کر ہم پر حملہ کیا۔ میرے تیر میں ہزاروں منڈروں کے سینے چھلنی کرنے کی قوت ہے لیکن آج میں تیری پلکوں کے تیروں کا مقابلہ نہیں کر سکتا"

"نوجوان ہوش میں آؤ۔ یہ جنگ کا میدان ہے اس میں تلوار چلتی ہے، ٹپے نہیں گائے جاتے۔ اگر ٹپے ہی گانے ہیں تو اپنے حجرے میں بیٹھ کر گانا۔"

"جنگ اور محبت دونوں نے ایک دوسرے کو جنم دیا ہے۔ میری آنکھوں میں تیرے لئے محبت کی چراگاہیں آباد ہیں۔ کیا میں تیرا نام دریافت کر سکتا ہوں"

"میرا نام منوّر ہے۔ تم کتنے بے خبر ہو نوجوان۔ مجھے نہیں جانتے، میں منڈروں کے سردار مستجاب خاں کی اکلوتی بیٹی ہوں"۔

جب لڑائی ختم ہو گئی تو یوسف زئی قبیلے کے سرداروں نے جرگہ جمع کیا تاکہ جنگ کے اسباب معلوم کئے جائیں اور پتہ لگایا جائے کہ یوسف زئیوں کے نوجوان اس حادثے میں کام آئے ہیں اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔

منوّر نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر اس لڑائی کا ذمہ دار توردلئی کو ٹھہرایا۔ جرگے نے فیصلہ دیا کہ توردلئی کی وجہ سے قبیلے کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی پاداش میں اسے گاؤں سے نکال دیا جائے۔

توردلئی اپنے گاؤں کے نوجوانوں کا سردار تھا، وہ حجرے کی زینت تھا۔ اس نے گاؤں چھوڑا تو یوسف زئی قبیلے کے جوانوں کا ایک خاصا گروہ اس کے ساتھ ہو لیا اور یہ سب کے سب پہاڑوں اور جنگلوں میں رہنے لگے۔ توردلئی کو جرگے کے اس نامنصفانہ فیصلے پر بڑا دکھ ہوا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ منوّر نے کرایا ہے تو آتش انتقام کے شعلے اس کے رؤئیں رؤئیں سے نکلنے لگے اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ امن کی زندگی ترک کر کے ڈاکو بنے گا۔ جب جرگہ بے انصافی پر اتر آئے، جب بڑے بوڑھے حق تلفی کرنے لگیں تو کیوں نہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے۔ اب توردلئی بہت بڑا ڈاکو بن چکا تھا۔ اس تصور نے منوّر کی زندگی تلخ کر دی اسے توردلئی کے انتقام سے خوف محسوس ہونے لگا۔

ایک عرصہ تک توردلئی اسی دھن میں لگا رہا۔ وہ ڈاکے ڈالتا، قتل و غارت کرتا اس کے ضمیر نے اسے کبھی ملامت نہ کی۔ وہ دن دہاڑے لوٹ مار کرتا اور اپنے غاروں میں ساتھیوں کے ساتھ جشن مناتا لیکن اس عرصے میں اس کے دل میں جو چیز کانٹا بن کر کھٹکتی رہی وہ شہی کی یاد تھی۔ یہ خلش اسے ہر وقت ستاتی۔ شہی کو اپنانے کی اسے کوئی صورت نظر نہ آتی۔ اس نے چاہا کہ وہ اسے اغوا کر لائے لیکن اس نے اپنے بازوؤں میں وہ قوت نہ پائی جس سے منڈروں کا مقابلہ کر سکے اور جب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور ضبط کا یارا نہ رہا تو ایک دن خود بخود مستجاب خاں کے حجرے میں داخل ہوا۔ اسے مہمان سمجھ کر خوش آمدید کہی گئی۔ خان نے اسے چارپائی پر اپنے برابر جگہ دی اور نوکر سے کہا مہمان کے لئے تکیہ لاؤ اور لسّی کا ایک کٹورا بھی۔"

"مہمان تم کہاں سے آئے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟ ہم تمہاری مدد کرنے کا وعدہ کرتے ہیں"۔

"میں صرف آپ کے سلام کے لئے آیا ہوں مجھے توردلئی کہتے ہیں"۔

"توردلئی"۔ مستجاب خاں ایک دم چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا اور تلوار نیام سے نکال لی۔ "ڈاکو۔ چور۔ خونی۔ بتاؤ کس نیت سے یہاں آئے ہو۔ اگر تم میرے حجرے میں نہ ہوتے تو تمہیں میری تلوار سے دنیا کی کوئی طاقت نہ بچا سکتی"۔

"میں ڈاکو ہوں ملک بابا لیکن یہاں ڈاکو کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مظلوم فریادی بن کر آیا ہوں"۔

مستجاب خاں کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ تلوار نیام میں چلی گئی اور مطمئن ہو کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"ہاں کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔ ہم مظلوم کی ہر ممکن مدد کرنے کو تیار رہیں چاہے وہ ہمارا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔"

"خان بابا۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ڈاکہ زنی میرا پیشہ نہیں مجھے حالات نے ایسا بننے پر مجبور کیا۔ منوّر نے جرگے والوں کو ورغلا کر مجھے گاؤں سے نکلوا دیا، میری زمین پر خود قابض ہو گیا اور مجھے ڈاکو بننے پر مجبور ہونا پڑا"۔

"اگر تم ٹھیک کہتے ہو تو تم پر واقعی بڑا ظلم ہوا ہے میں تو آج تک اندھیرے میں تھا مجھ سے تو کچھ اور ہی کہا جاتا رہا۔ توردلئی مجھے تم سے ہمدردی ہے اور

میں تمہاری ہر مدد کرنے کو تیار ہوں"۔

"خان بابا۔ میرا آپ کے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔ میری خواہش ہے کہ اگر آپ مجھے اپنی فرزندی میں قبول کرلیں تو میں عمر بھر آپ کا احسان نہیں بھولوں گا"۔

"(خان چونک کر) ۔ ہوش کی دوا کرو تور دلئی ۔ یوسف زئی اور منڈر کا رشتہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں قبیلے کا سردار ایسی حرکت کروں تو جرگے کو کیا جواب دوں گا"۔

"لیکن خان بابا میں تو آپ ہی کے پاس رہنا چاہتا ہوں آپ کی دولت آپ ہی کے گھر رہے گی"۔

یہ سن کر مستجاب خاں ایک گہری سوچ میں غرق ہوگیا۔ ایک طرف نوجوان، بہادر تور دلئی تھا جس سے بہتر رشتہ اسے یقیناً اپنی اکلوتی بیٹی شہی کے لئے نہیں مل سکتا تھا؛ دوسری طرف قبیلے کی عزت، جرگے کا خوف، عداوت، پختو، ایسی چیزیں تھیں جن کی وجہ سے یہ رشتہ ناممکن سی بات تھی۔ اور جب ملازم لسی کا کٹورہ لے کر آیا تو مستجاب خاں نے چونک کر کہا ۔۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے تور دلئی ۔۔ تم میرے مہمان ہو میں تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا خواہ اس کے لئے مجھے بڑی سے بڑی مشکل کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے"۔

تور دلئی نے اٹھ کر مستجاب خاں کے گھٹنے چھوئے اور ڈاکہ زنی سے ہمیشہ کے لئے توبہ کر کے خان کے پاس رہنے لگا۔ وہ خوش تھا کہ اس کے دل کی مراد بر آئی۔ اپنی محبوبہ کے انگارہ ایسے رخسار اور پھول جیسے شبرنگ گیسوؤں کے ٹھنڈے سائے پا کر وہ زمانے کا سرد و گرم بھول چکا تھا۔

منور کو اس بات کا علم ہوا تو وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گیا اس نے سوچا تور دلئی کا مستجاب خاں کی لڑکی سے رشتہ طے پا گیا تو وہ بڑی طاقت پکڑ جائے گا اور اس کے لئے مستقل خطرہ بن جائے گا اس لئے بہتر یہی ہوگا کہ ابھی اور اسی وقت اس کا سر کچل دیا جائے چنانچہ وہ موقع کی تلاش میں رہا اور ایک دن جنگل میں اکیلا پا کر اپنے ساتھیوں سمیت جا کر اسے گھیر لیا۔ اکیلا تور دلئی کس کس کا مقابلہ کرتا۔ قریب تھا کہ منور کی تلوار اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتی کہ اتنے میں مستجاب خاں اطلاع پا کر اپنے آدمیوں سمیت آ پہنچا۔ چنانچہ ایک خونریز لڑائی کے بعد منور کو بھاگنا پڑا۔

شہی ۔۔ تور دلئی کی محبت کا زخم میدان جنگ سے لے کر آئی تھی اور اب تک ایک مقدس امانت کی طرح اپنے سینے میں چھپائے ہوئے تھی۔ وہ تور دلئی کو بے حد چاہتی تھی وہ جب بھی اسے دیکھتی اس کے جذبات میں جوار بھاٹا کی کیفیت پیدا ہو جاتی؛ اس کی نس نس میں رباب کی طرح ٹپے الاپنے لگتی؛ اس کا رُواں رُواں گیت گانے لگتا لیکن اس بے پناہ محبت کے باوجود ایک بات اسے گھن کی طرح کھا رہی تھی اور وہ یہ کہ تور دلئی ڈاکو رہ چکا تھا، اپنے بیگانوں کے طعنوں کے خیال سے اس کا دل کانپ جاتا اور اسے تور دلئی سے نفرت ہونے لگتی۔ پھر وہ سوچتی کہ اس کی شادی ہوگئی تو قبیلے کی عورتیں اس پہ آوازے کسیں گی، اس پر انگلیاں اٹھائیں گی اور اس کا جینا دوبھر ہو جائے گا۔ کہاں یوسف زئی ڈاکو اور کہاں منڈروں کی شہزادی ۔۔۔ سوچتے سوچتے اس کا دماغ ماؤف ہو جاتا وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکتی یہاں تک کہ وہ اپنی جان سے بیزار نظر آنے لگی ۔۔

آخر ایک دن اس نے فیصلہ کن انداز میں ماں سے کہا ۔ "ماں میں تور دلئی سے شادی نہیں کروں گی" ماں نے اٹھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بدتمیز لڑکی تجھے شرم نہیں آتی۔ یہ آج تو کیسی بہکی بہکی باتیں کرنے لگی ہے"۔

"ماں وہ چور ہے، ڈاکو ہے، خونی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یوسف زئی ہے۔ ہمارے قبیلے کا دشمن ۔ ماں ہم لوگوں کو کیا منہ دکھائیں گے"۔

"خاموش ۔ اپنے منگیتر کے خلاف زبان کھولتے تجھے حیا نہیں آئی۔ کیا اپنے باپ کے شملے کو خاک میں ملانا چاہتی ہے؟ خبردار جو آئندہ تیرے منہ سے کبھی ایسی بات نکلی۔ کہیں باپ نے سن پایا تو تیری زبان کھینچ لے گا۔ مستجاب خاں کی زبان سے نکلی ہوئی بات ہر قیمت پر پوری ہو کر رہتی ہے۔ تور دلئی یوسف زئی سہی لیکن اب وہ ہمارا ہو چکا ہے۔ اور پھر منڈروں اور یوسف زئیوں میں ایسا فرق بھی کیا ہے، دونوں چچا زاد بھائی ہی تو ہیں۔ یہ تو تربور دلی کا برا ہو جس نے انہیں ایک دوسرے کا دشمن بنا رکھا ہے ۔۔ بیٹی وہ ڈاکو نہیں، اچھے خاندان کا لڑکا ہے اس کی جائداد ہے، زمین ہے، خاندان ہے اپنے پرائے ہیں۔ یہ تو دشمنوں نے اسے کہیں کا کہیں پہنچا دیا تھا اور اب تم دیکھتی ہو وہ سب برے کام چھوڑ کر کتنا نیک بن چکا ہے"

تور دلئی جو دروازے کی اوٹ سے ماں بیٹی کی گفتگو سن رہا تھا یکایک اندر آگیا اور کہنے لگا "شہی ۔ میں ڈاکو نہیں ہوں میں نے جس دن سے مستجاب خاں کے حجرے میں قدم رکھا ہے اسی دن سے سب برے کام چھوڑ دیئے ہیں۔ میں نے تمہارے لئے سب کچھ چھوڑ دیا ہے اپنا خاندان اور قبیلہ بھی چھوڑ دیا ہے"۔

شہی کے چہرے کو شرم و حیا کے سرخ آنچل نے ڈھانپ لیا۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا اور مارے ندامت کے عرق عرق ہوگئی۔

"تور دلئی مبارک ہو نہیں ۔۔ دشمن اپنی موت آپ مر گیا" مستجاب خاں نے مکان میں داخل ہوتے ہی مسکراتے ہوئے کہا۔

"کون دشمن بابا" ـــــ تور دلئی نے حیرت سے پوچھا۔

"منور اور کون"

"وہ کیسے بابا"

"ہاشم خبر لایا ہے کہ منور نے شہنشاہ اکبر کی فوج میں نوکری کر لی ہے اور گاؤں چھوڑ کر چلا گیا ہے"۔

"خوب۔ خوب ۔کمبخت نے کانٹے بوئے تھے جو کیسے کاٹ سکتا تھا۔ مجھے اپنے گھربار اور کھیت کھلیان سے نکالا تو خدا نے اسے بھی پردیس کے جہنم میں دھکیلا۔ اب پرائی چاکری کرے گا، در در کی ٹھوکریں کھائے گا تو قدرِ عافیت معلوم ہوگی اسے"۔ تور دلئی نے نفرت بھرے انداز میں کہا :

"بیٹا اگر وہ سچ مچ گاؤں چھوڑ گیا ہے تو تمہاری شادی میں کوئی دیر نہیں، میں نے تمام انتظام مکمل کر رکھا ہے"۔

دوسرے دن منور کی بھرتی ہونے کی تصدیق ہوتے ہی تور دلئی کی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ منڈروں کے سردار کی اکلوتی بیٹی کی شادی تھی۔ ہر گھر میں مسرت کے شادیانے بجنے لگے، ہر آنگن میں "اتن ناچ" کے رومانی دائرے سبز، سرخ، اودے اور سرمئی آنچلوں کی قوس قزح بنا رہے تھے حجروں میں منڈروں کے شمشاد قد جوان گھڑے کے ساز پر ٹپے گا رہے تھے، رباب کی دھنوں کی زبان سے محبت کی داستان سرائی ہو رہی تھی۔ ڈھولک، سُرنا کی جوشیلی تانوں پر بلبلہ اور شاڈولا ناچ ناچا جا رہا تھا ـــ غرض منڈروں کی سرزمین کے چپے چپے پر یوں خوشیاں منائی جا رہی تھیں جیسے عید کا چاند نکل آیا ہو۔

شہی کے دل میں محبت کی دھڑکنیں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں جب اسے خیال آتا کہ وہ آج کل میں تور دلئی کی ہو جائے گی اور پھر وہ دونوں اپنی دنیا کے راجہ رانی ہوں گے تو اس کا چہرہ ایک لذیذ اور نشیلی گرمی محسوس کرتا اور پسینے کے قطرے اس کی چاند سی پیشانی سے پھوٹ کر ستواں ناک پر آ جاتے اور پھر سونے کے چمکتے ہوئے پیزوان میں آ کر موتی کی طرح اٹک جاتے۔

"کیا سوچ رہی ہو شہی"۔ تور دلئی کی آواز سے شہی چونک کر جھینپ سی گئی، اس نے جلدی سے دوپٹے کو سر پہ کھینچ لیا جو ڈھلک کر اس کے شانوں پر آ گرا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔ بس یونہی بیٹھی ہوں ـــ لیکن تم آج بڑے خوش نظر آ رہے ہو۔ بات کیا ہے"۔

"خوشی کا آج کیا ٹھکانہ ہے شہی۔ ایک تو تربور اپنی ہار مان کر بھاگ گیا، دوسرا مجھے میری خوابوں کی وہ ملکہ ملنے والی ہے جس نے برسوں سے میری نیند حرام کر رکھی تھی۔ شہی تم کیا جانو کہ تمہیں پانے کے تصور سے میرے دل کی کیا کیفیت ہے، یہ چند گھڑیاں میرے لئے پہاڑ بن گئی ہیں"۔

"درست ہے۔ میرے لٹیرے محبوب تمہاری خوشی بجا ہے لیکن میں سمجھی تھی کہ تم جو اتنے زیادہ خوش ہو تو شاید میرے لئے شہنشاہ اکبر کی رانی کا ست لڑا ہار لے آئے ہو"۔ شہی نے حسبِ عادت طنز کا ایک زہریلا تیر پھینکا۔

شہی کے اس طنز نے تور دلئی کو جھنجوڑ کر رکھ دیا، اس کی رگ رگ میں سوئی ہوئی یوسف زئی غیرت اور رپت ایکدم جاگ اٹھی، اس کا دماغ ہنڈولے کی طرح گھومنے لگا، اس نے دیکھا کہ وہ شہنشاہ اکبر کے محل میں کھڑا ہے، سامنے تخت پر ملکہ بیٹھی ہے، اچانک وہ جھپٹ کر تخت پر چڑھ گیا اور ایک ہی جھٹکے میں ست لڑا ہار ملکہ کے گلے سے چھین کر لے آیا۔

"تم تو سوچ میں پڑ گئے۔ خیر کوئی بات نہیں، آج نہ سہی کل لے آنا ہار، اتنی جلدی بھی کیا ہے"۔ شہی شرارت آمیز چٹکی لیتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"منڈروں کی ملکہ تو واقعی ست لڑے ہار کے قابل ہے، اب میں نے عزم کر لیا ہے کہ تیری فرمائش پوری کر کے ہی دم لوں گا اگر اس امتحان میں کامیاب نہ ہو سکا تو مجھے معاف کر دینا۔ میری شہی۔ خدا حافظ ـــ"

شہی جیسے گہری نیند سے چونک اٹھی۔ اپنے چونچلوں کا یہ خوفناک نتیجہ دیکھ کر وہ بدحواس ہو گئی ـــ "میرے سرتاج، میرے سرتاج مجھے ست لڑا ہار نہیں چاہیئے ـــ واپس آ جاؤ خدا کے لئے واپس آ جاؤ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں"ـــ وہ بے اختیار ہو کر پاگلوں کی طرح چلانے لگی ـــ لیکن آہ! تور دلئی جا چکا تھا۔

شہی کے حسین خوابوں کی مالا ٹوٹ گئی اور اس کا دانہ دانہ بکھر گیا۔ منڈروں کی بستی میں قہقہوں کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ رباب کے تار شل ہو گئے گھنگروؤں کی چھناکوں نے دم توڑ دیا۔ مستجاب خاں کا ہنستا بولتا چہرہ اداسیوں میں ڈوب گیا ـــ "کیا کر دیا تو نے ـــ شہی یہ کیا کر دیا ـــ بیوقوف لڑکی تو نے اپنے ہاتھوں اپنا سہاگ اجاڑ دیا۔ باپ کی کمر توڑ دی۔ قبیلے کی ناک کاٹ دی۔ آہ ـــ آہ ـــ" مستجاب خاں غش کھا کر گر پڑا اور جب اسے ہوش آیا تو اس کی

آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا، چہرے کی جھریاں گہری ہوگئیں، اور وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بوڑھا دکھائی دینے لگا۔

شہی ــ ڈار سے بچھڑی ہوئی کونج کی طرح اکیلی پڑی کرلا رہی تھی، وہ فراق کی آگ میں بھننے لگی۔ نورد لئی سچ مچ کا لٹیرا نکلا، اس کے اطمینان کی دولت غارت کرکے چلدیا۔ اسے ایک پل بھی آرام نہیں تھا، وہ اٹھتے بیٹھتے نورد لئی ہی کے خیال میں مگن رہتی، وہ اس کے خوابوں میں بس گیا تھا، وہ دیکھتی کہ نورد لئی دشمن کی فوج میں گھر گیا ہے اور وہ اس پر تلواروں اور تیروں کی بوچھاڑ کر رہے ہیں ــ ایک دفعہ اس نے دیکھا کہ نورد لئی اکبر بادشاہ کے قلعہ میں داخل ہوا ہی تھا کہ سپاہیوں نے اسے گرفتار کرلیا۔ وہ چیخ مار کر جاگ اٹھی۔ ماں نے تسلی دی "بیٹی نورد لئی بڑا بہادر ہے، اسے بڑی سے بڑی فوج بھی نہیں پکڑ سکتی۔ گھبراؤ نہیں، وہ جلدی لوٹ آئے گا"

ایک رات جب چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، آسمان سے تاریکیوں کے قافلے اتر رہے تھے، منڈروں کی ساری بستی نیند کے جزیرے میں اتر چکی تھی، شہی بدستور اپنے محبوب کے خیال میں کروٹیں بدل رہی تھی کہ صبح کا انتظار کر رہی تھی کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ شہی کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ خدا خیر کرے اتنی رات گئے کون آیا ہے، کہیں میرا نورد لئی نہ ہو ــ وہ سوچ ہی رہی تھی کہ منتجاب خاں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ "بھگوان داس! اس وقت تم کہاں۔ خیر تو ہے۔ آؤ بیٹھو دوست کہو کیا بات ہے، خیریت تو ہے نا" ؟ منتجاب خاں نے گھبراہٹ کے عالم میں اپنے دوست سے پوچھا جو اٹک کے قلعہ سے آیا تھا۔

"گھبراؤ نہیں خان" ــ بھگوان داس نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"لیکن تمہارا چہرہ تمہارے دل کا ساتھ نہیں دے رہا۔ وہ کوئی ایسی بات کہنا چاہتا ہے جو تم چھپانے کی کوشش کر رہے ہو دوست، جلدی کہو ــ خدا کے لئے دیر نہ کرو، میں بری سے بری خبر سننے کو تیار ہوں"۔

"خان نورد لئی کو شہنشاہ کے سپاہیوں نے گرفتار کرلیا ہے"

"وہ کیسے ــ کیا کیا تھا اس نے"

وہ شاہی محل میں نقب لگا رہا تھا شہنشاہ نے اسے موت کی سزا دے دی۔"

بھگوان داس نے دھڑکتے دل اور آبدیدہ آنکھوں سے یہ بات کہی۔ شہی یہ سنتے ہی چیخ مار کر بیہوش ہوگئی۔ گھر میں واویلا مچ گیا ــ بھگوانداس نے پوچھا یہ شور کیسا ہے اور چیخ کس کی تھی؟

"بدنصیب شہی کو غش آگیا ہے ــ وہ نورد لئی کی منگیتر ہے۔ کاش یہ اسے ست لڑے ہار کا طعنہ نہ دیتی"! شکستہ دل منتجاب خاں نے دل تھام کر بمشکل یہ فقرے ادا کئے۔

"شہی ــ میری بھتیجی" ــ بھگوان یہ کہہ کر اٹھا اور دوڑ کر شہی کے پاس پہنچا اور اس کے سر پہ پیار کرتے ہوئے بولا ــ "بیٹی گھبراؤ نہیں ــ بھگوانداس اپنی بیٹی کے لئے پہاڑ سے بھی ٹکر لے گا"

شہی نے آنکھیں کھولیں۔" بھگوان کاکا مجھے نورد لئی کے پاس لے چلو"۔

بیٹی تمہارا جانا ٹھیک نہیں۔ میں خود ہی سب کچھ ٹھیک کرلوں گا۔ میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک تمہارے نورد لئی کو تمہارے پاس پہنچا نہ دوں" ــــ والدین نے بھی بہتیرا سمجھایا لیکن شہی مچل گئی کہ میں ضرور جاؤں گی اور جب صبح ہوئی تو بھگوانداس، شہی اور منتجاب خاں تینوں نے رخت سفر باندھ لیا لیکن بھگوان نے منتجاب کو ساتھ جانے سے روک دیا اور وہ شہی کو لے کر روانہ ہوگیا۔

اٹک کا خونخوار دریا پار کرکے دونوں شہنشاہ اکبر کے فولادی قلعہ میں پہنچے جہاں پہنچکر انہیں معلوم ہوا کہ کل نورد لئی کو زمین میں گاڑ کر اس پر خونخوار کتے چھوڑے جائیں گے۔

یہ سنتے ہی شہی کا سر چکرانے لگا، قریب تھا کہ وہ غش کھا کر گر پڑے۔ لیکن بھگوان داس نے اسے سنبھالا دیا ــ "بیٹی۔ تمہارے سینے میں پٹھان عورت کا دل ہے۔ تم منتجاب خاں کی بیٹی اور منڈر قبیلے کی شہزادی ہو، تمہیں دلیری کے ساتھ ہر مصیبت کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ بدحواس ہونے سے ہم نورد لئی

کی زندگی نہیں بچا سکیں گے، اس کے لئے کوئی تدبیر سوچنی پڑے گی "۔

بھگوان کے ذہن میں فوراً ایک تدبیر آئی، وہ شاہی کتوں کے نگہبان کے پاس پہنچا لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ " اکبر اعظم کے حکم کو ٹالنا میرے بس کی بات نہیں ــــ بھگوان ہوش کی باتیں کرو" اس جواب سے بھگوان کو بڑی مایوسی ہوئی لیکن اس نے حوصلہ نہ ہارا ــــ وہ گھر جا کر اپنی بہو کے کنگن لایا اور کتوں کے نگہبان کے آگے ڈال دئے ÷

اگلے دن جب نور دلی پر خونخوار کتے چھوڑے گئے تو وہ بڑی تیزی سے اس کی طرف لپکے لیکن قریب پہنچ کر اسے سونگھنے لگے اور سونگھ کر واپس چلے گئے۔ تماشائی حیران تھے۔ ان کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا۔ یہ خبر سن کر اکبر کو بھی بڑا تعجب ہوا اور اس نے غصّے میں آکر حکم دیا کہ شاہی فیل خانے کے مست ہاتھی سے مجرم کو کچلوا دیا جائے۔ اس نئے حکم نے بھگوان کا خون بھی خشک کر دیا۔ لیکن اس نے اپنی کوشش جاری رکھی، وہ شاہی مہاوت کے پاس پہنچا لیکن وہ نہایت سرد مہری سے پیش آیا ــ بھگوان مغموم ہو کر گھر آیا اور اٹواٹی کھٹواٹی لے کر پڑ رہا۔ لیکن اس کی بہو بولی "بابا ــــ نہی کے لئے ہم سب کچھ کریں گے۔ مہاوت کی بیٹی میری منہ بولی بہن ہے۔ میں ابھی جا کر اس سے کہتی ہوں کہ اپنے ابا سے کہہ کر نور دلی کو بچالے "۔

شہر میں ڈونڈی پٹ گئی۔ لوگ جوق در جوق میدان میں جمع ہونے لگے۔ "کتوں سے تو بچ گیا لیکن ہاتھی بڑا ظالم ہے، یہ نہیں چھوڑے گا بچارے کو ــــ"

اتنے میں ایک مست و خونخوار ہاتھی چنگھاڑتا، کف اڑاتا ایک طرف سے نمودار ہوا۔ لوگ سہم گئے، سب کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ فیلِ مست نے نور دلی کے پاس آکر اپنا خوفناک پاؤں اٹھایا، لوگوں نے آنکھیں بند کر لیں، ہاتھی نے پاؤں زمین پر مارا، زمین دہل گئی۔ لوگوں نے سمجھا نور دلی کا نام و نشان تک نہ رہا ہوگا لیکن وہ زندہ و سلامت موجود تھا ــ لوگوں نے کہا یہ شخص ضرور کوئی جادوگر ہے۔ شہنشاہ نے سنا تو برہم ہو کر کہا اسے ہمارے حضور پیش کیا جائے۔ نور دلی کا نمبر دار، منور شہنشاہ کے حفاظتی دستے میں شامل تھا ÷

شہنشاہ نے نور دلی پر غضب آلود نگاہ ڈالی اور منور سے مخاطب ہو کر بولا۔ "کیا یہی وہ باغی ہے جس نے مابدولت کے مقابلے میں منڈروں کی مدد کی اور تمہارے گاؤں پر ڈاکے ڈالے؟"

منور نے کہا "جی حضور"ــ پھر شہنشاہ نے نور دلی سے کہا ــ "اے بدبخت تو نے شہنشاہِ ہند کی حرم سرا میں داخل ہونے کی کیسے جرأت کی۔ کیا تجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ جرأت کتنی مہنگی پڑے گی"ــ شاہ کی گرجدار آواز گونج رہی تھی۔ دربار پر مہیب سناٹا طاری تھا ÷

"رحم، رحم، ان داتا"ــ دور سے بھگوان، نہی اور رتنا کی آوازیں آئیں جنہیں چوبداروں نے اندر آنے سے روک دیا تھا۔ "فریادیوں کو حاضر کیا جائے" ان داتا نے حکم دیا ÷

"ان داتا نور دلی کی جان بخشی کی جائے ورنہ اس دوشیزہ کا سہاگ لٹ جائے گا" بھگوان نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔ "ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس نے ہمارے ناموس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ اس نے حرم میں داخل ہونے کی گستاخی کی، اس کی سزا اسے ضرور ملنی چاہیے"۔ شہنشاہ نے گویا اپنا آخری حکم سنا دیا ÷

"بھائی منور ــ نور دلی تمہارا چچازاد ہے۔ وہ تمہارا اور تم اس کے وارث ہو، شہنشاہ تمہاری بات مانتا ہے، اپنے بھائی کی جان بخشی کرا دو۔ میں تم سے بھیک مانگتی ہوں"۔ نہی نے منور کے سامنے اپنا دامن پھیلاتے ہوئے کہا ÷

دوسرے ہی لمحے منور شاہ کی خدمت میں کورنش بجا لایا اور زمین بوس ہو کر نور دلی کی جان بخشی چاہی۔ "تعجب ہے کہ تم اپنے دشمن کی جان بچانا چاہتے ہو"۔

"ان داتا! بجا فرماتے ہیں لیکن اس کی اور میری دشمنی قبائلی دشمنی ہے جو اپنے وطن تک محدود ہے، وہاں میری تلوار اس کا خون پینے کو بیقرار رہتی ہے لیکن یہاں یہ میرا مہمان ہے، اس لئے مجھے میرا قومی فرض مجبور کر رہا ہے کہ میں اس کی جان بچاؤں"۔

"لیکن مابدولت کا حکم ناطق ہے۔ اس پر کوئی قلم بھی خطِ تنسیخ نہیں کھینچ سکتا۔ ہم تمہاری سفارش کو بے محل قرار دیتے ہوئے حکم دیتے ہیں کہ تمہیں ہی اپنے اس مہمان کا خون بہانا ہوگا" ÷

"ان داتا ــ میرے خون میں ابھی غیرت و حمیت کے شرار موجود ہیں، پردیس میں میری تلوار اپنے بھائی کے خون سے رنگین نہیں ہو سکتی اور نہ میری موجودگی ہی میں کوئی دوسرا شخص اس کا خون بہا سکتا ہے ــــ ظلِ الٰہی مجھے اپنی اس گستاخی کا انجام معلوم ہے لیکن میں مجبور ہوں کیونکہ یہ میرے قومی وقار کا

سوال ہے۔ میں آخری مرتبہ درخواست کرتا ہوں کہ توردلئی کو چھوڑ دیا جائے اور جس جرم میں اسے قتل کی سزا دی گئی ہے وہ ست لڑا ہار اس پٹھان دوشیزہ کو عنایت کیا جائے اس کے عوض میرا سر حاضر ہے" ــــــ

منوّر نے شاہی رعب و جلال کی آخری حدوں کو چھو لیا تھا۔

"تمہاری یہ جرأت قابلِ مذمت ہوتے ہوئے بھی ما بدولت کو پسند آئی اس لئے ہم حکم دیتے ہیں کہ توردلئی کو رہا کر دیا جائے اور ملکہ کا ست لڑا ہار اس پٹھان دوشیزہ کو پہنا دیا جائے۔ اور اس کے بدلے منوّر کو اسی وقت بر سرِ عام تختۂ دار پر کھینچ دیا جائے"۔

شہی اور توردلئی نے منوّر کے پاؤں پکڑ لئے ــ" منوّر بھائی یہ تو نے کیا کیا ہم قبیلے کو کیا منہ دکھائیں گے"۔

منوّر نے دونوں کو گلے لگا لیا ــ" شہی بہن تیرا سہاگ تجھے مبارک ہو، شکر ہے اللہ نے مجھے تمہارے سامنے سرخرو کیا۔ توردلئی بھائی مجھے معاف کر دو۔ میں نے تم پر بڑے ظلم کئے۔ میرا خون اگر میرے گناہوں کا کفارہ ہو سکے تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔ امید ہے اب تمہارے دل میں میری طرف سے کوئی کدورت نہ ہوگی"۔

بھگوان اور للتا نے اپنے مہمان کو آنسوؤں کے ہجوم میں الوداع کہی۔ کشتی اٹک کی تند و تیز موجوں پر بہے جا رہی تھی۔ خیرآباد پہنچ کر وہ کشتی سے اترے اور پیدل چل پڑے۔ شب کے ان پر والوں کو اکوڑے کے قریب ایک جنگل میں رات بسر کرنی پڑی۔ نصف شب کے قریب شہی کو پیاس محسوس ہوئی۔ سنسان جنگل کی وحشتناک ویرانی، گھپ اندھیرا اور پانی کی تلاش ــ بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔ تلاش کرتے کرتے ایک طرف پہاڑی کے دامن میں خانہ بدوش کوچیوں کے خیمے نظر آئے۔ توردلئی نے اس طرف کا رخ کیا۔ خیموں کے قریب پہنچا تو کوچیوں کے خونخوار کتے بھیڑیوں کی طرح اس پر لپکے ــ کتوں کا شور سن کر کوچی بیدار ہوئے اور سمجھے شاید ڈاکوؤں نے حملہ بول دیا ہے وہ تلواریں سونت کر نکل پڑے اور اندھیرے میں بیسیوں تلواریں توردلئی پر ٹوٹ پڑیں۔

ادھر پیاس کی شدت سے شہی کا برا حال ہو رہا تھا، جب کافی دیر گذر گئی اور توردلئی نہ لوٹا تو وہ مجبور ہو کر اس کی تلاش میں نکلی۔ سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ کوچیوں کے خیموں کو دیکھ کر وہ اس طرف چل پڑی۔ اور جب خیموں کے نزدیک پہنچی تو توردلئی کی لاش کو خون میں نہایا ہوا پایا۔ وہ توردلئی کہہ کر اس کی لاش سے چمٹ گئی اور زار و قطار رونے لگی۔

"توردلئی؟ ــ ڈاکو توردلئی؟" ــ کوچیوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں، وہ دوڑے دوڑے آئے۔ شہی کو لاش سے جدا کیا لیکن آہ وہ بھی اپنے محبوب کے پاس جا چکی تھی!

خانہ بدوشوں کے اس چھوٹے سے ہنستے کھیلتے جزیرے پر یک لخت افسردگی چھا گئی۔ اچانک اور ناحق دو انسانوں کا خون بہہ جانے پر سارا قافلہ پریشان تھا، وہ ان لاشوں کو دفنانے کے متعلق سوچ ہی رہے تھے کہ شہنشاہ اکبر کے سپاہیوں کی بھاری جمعیت ایک جنازہ اٹھائے ہوئے ادھر سے گزری اور جب انہیں پتہ چلا کہ توردلئی قتل ہو چکا ہے اور شہی مر چکی ہے تو وہ ان کی لاشیں بھی اپنے ساتھ ہی لیتے گئے۔

منڈر اور یوسف زئی قبیلوں کو اس مشترک المیئے نے ایک صف میں کھڑا کر دیا، دونوں کی ہری بھری فصل ایک ہی بجلی نے پھونکی تھی۔ دونوں کے دل ایک ہی سیخ میں پروئے گئے تھے، دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے ــ محبت، غیرت اور حمیت کے ان تینوں شہیدوں کو اسی سرسبز و شاداب چراگاہ میں دفن کر دیا گیا جسے ہزاروں منڈروں اور یوسف زئیوں کے خون نے سینچا تھا۔

افسانہ:

نبّو

کمال پاشا

یوں تو اس کا پورا نام نبی شیر خاں تھا لیکن سب اسے نبو کہکر پکارتے تھے۔ پہلے وہ سخت قسم کا جھگڑالو تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر لڑ بیٹھتا تھا۔ لیکن ایک چیز جو اسکے کردار میں زیادہ نمایاں تھی یہ تھی کہ کسی کمزور کی حق تلفی ہوتے دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھتا اور وہ مردانگی کے تمام مراحل طے کر جاتا۔ تھانہ، کورٹ اور جیل اس کے لئے گھر آنگن تھے۔ سب ہی لوگ اُسے چاہتے تھے کہ محلے کی "عزت" اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی۔ اس لئے ضمانت اور رہائی اس کے لئے معمولی چیزیں تھیں۔ محلے کے چھوٹے بڑے سب ہی اسے "محلے کی ناک" سمجھتے تھے۔ کبھی کبھار اس کے محلے سے میرا گذر ہوتا تھا لیکن جب بھی ادھر سے گذرتا تو اسے کسی کے جھگڑے کی رُوداد سنتے پاتا۔ ایسی روداد سنتے وقت اُس کی کافی آؤ بھگت ہوتی۔ یہ دیکھکر میں اکثر مسکرا دیتا۔ وہ میری مسکراہٹ کو سمجھتے ہوئے بڑے پیارے انداز میں کہتا "بھیّا۔ محلے میں رنگ ہے اپنا۔"

ایک دن اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ تارپورے والے جانو نے اُسے چوک کے ہوٹل کے سامنے ہاکی اسٹک سے اس قدر مارا کہ اس کا تمام جسم ایک ہفتے تک تختے کے مانند اکڑا رہا۔ میں اسے دیکھنے گیا تو اس کے ہاتھ پاؤں کے جوڑوں پر سخت قسم کی نیلاہٹ تھی — اور چہرے پر ایک دردناک خاموشی۔ درد کی شدت سے نچلا ہونٹ بھینچے اس نے مجھے بتایا "جانو جب پندرہ برس کا تھا۔ میں نے کسی وجہ سے اس کو اتنا پیٹا تھا کہ اس کے جبڑے، دانت، ہونٹ سب خون آلودہ ہو گئے تھے۔ اس دن پٹتے ہوئے اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ میرے اس حملے کا منہ توڑ جواب دے گا۔ اور آج تین سال بعد اس نے اپنی قسم پوری کی ہے۔"

مجھے یقین تھا صحت مند ہوتے ہی وہ جانو سے ضرور نبٹے گا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ دوسرے ہفتے وہ بیڑی کے کارخانے میں ملازم ہو گیا۔ اسکے ماں باپ بیحد خوش ہوئے کہ لڑکا سیدھے رستے پر آ گیا ہے۔ نبو بھی اپنے ماں باپ کا کسی حد تک فرمانبردار تھا۔ اس نے سوچا چلو کسی بہانے تو ماں باپ کی جھڑکیوں سے نجات ملی۔ کارخانے میں ملازم ہونے کے بعد وہ مجھے بہت کم نظر آیا۔ دو تین مرتبہ مجھے اس کارخانے کے سامنے سے گذرنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دیکھا وہ بڑی لگن سے کام کئے جاتا اور گنگناتا رہتا تھا۔

ایک دن مجھ سے ملا تو کہنے لگا "بھیّا، مجھے کارخانے کی ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔ سوچتا ہوں اس سے شادی رچا لوں۔"

میں نے کہا "تجھے کسی نہ کسی لڑکی سے محبت ضرور ہو جاتی ہے اور تو اس سے شادی بیاہ کی فکر کرنے لگتا ہے۔"

"مجھے معلوم تھا تم میری اس بات کو مذاق میں ٹالو گے۔ کیونکہ تم سمجھتے ہو کہ جھگڑالو نبو مجھ میں اب تک زندہ ہے جو آوارہ اور اوباش بھی تھا — سچ پوچھو تو بھیّا اس مارپیٹ کے زمانے میں اکثر میں سوچتا تھا کہ یہ چلن چھوڑ دوں اور سیدھی سادی زندگی گزاروں۔ سو جانو کے حملے نے مجھے چونکا دیا۔ اب مجھے یقین ہے ایک دن نبی شیر خاں بن جاؤں گا۔" اس نے یہ تمام باتیں مجھ سے بڑی سنجیدگی سے کہی تھیں۔ اس لئے میں خاموش ہو رہا۔ دوسرے تیسرے دن مجھے کسی کام کے سلسلے میں باہر گاؤں جانا پڑا۔ مکمل دو ہفتے کے بعد لوٹ کر آیا تو پڑوس کے ایک درزی دوست نے مجھ سے رازداری کے لہجہ میں کہا "ان دنوں نبو سکندر علی کے گھر بہت آتا جاتا رہا — جانے کیا بات ہے؟"

سکندر علی کے متعلق مجھے صرف اس قدر معلوم تھا کہ وہ بیڑی کے کارخانے کا سب سے پرانا بوڑھا مزدور ہے۔ جو معمول کے مطابق اپنی ادھیڑ بیوی کے ساتھ دوسرے مزدوروں سے بہت پہلے کارخانے پہنچ جاتا ہے۔ اس کی ایک جوان لڑکی ہے، طاہرہ۔ اس کی شادی ہو چکی ہے اور اس کا خاوند باہر گیا ہوا ہے — چونکہ طاہرہ بھی اپنے ماں باپ کے ساتھ کبھی کبھی کارخانے جاتی تھی اسلئے میں نے سوچا ہو سکتا ہے نبو اس دن طاہرہ ہی کے متعلق کہہ رہا ہو۔ لیکن جب اس کے الفاظ یاد آئے "سوچتا ہوں اس سے شادی رچا لوں" تو میں فکرمند ہو گیا۔ اپنی مصروفیات کی بنا پر میں کوئی ٹھوس رائے قائم نہ کر سکا۔ اور نہ نبو سے ملاقات ہی ہو سکی۔ ایک دن اتفاقیہ طور سے وہ مل گیا۔ اس دن والا معاملہ صاف کرنے کی نیت سے میں نے نبو سے پوچھا "آخر تم کو طاہرہ میں کیا خوبی نظر آئی جو اس سے محبت کرنے لگے۔" اس نے میری طرف یوں مسکرا کر دیکھا جیسے میں نے بڑی بچکانہ بات کی، پھر بولا "میں اور طاہرہ! کس نے کہا تم سے؟"

بھیا میں تو شادی شدہ لڑکی سے اس قسم کا رشتہ قائم کرنا پاپ سمجھتا ہوں - چونکہ میری کوئی بہن نہیں ہے، اس لئے میں طاہرہ کو بہن سے زیادہ عزیز سمجھتا ہوں ؎"

"کون ہے پھر؟" میں نے دریافت کیا - تب اس نے کہا "کل دکھاؤں گا"

دوسرے دن وہ مجھے کارخانے لے گیا - کئی سو مزدور قطار در قطار جھکے بیٹھے بہت تیزی سے انگلیاں تھرکا رہے تھے - گمان ہوتا تھا کہ مشینی پرزے ہیں - بوڑھے، جوان، بچے، عورت، مرد، ہر ذات ہر مذہب کے مختلف رنگ اور مختلف نسل کے نہ ان میں کوئی تنگ نظری تھی نہ ذات پات کا سوال سب ایک تھے - ایک دوسرے کی طرف مسکرا کر دیکھتے - کوئی گیت گنگنانے دو چار باتیں کرتے - اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے - مجھے ان لوگوں کی یکجہتی بے حد پسند آئی ؎

یہاں سے نبو مجھے اس کمرے کی طرف لے گیا جہاں مسلمان پردہ دار عورتیں اپنے ننھے بچوں کے منہ میں دودھ بھری چھاتیاں دئے بڑی لگن سے بیڑیاں بنا رہی تھیں اور باتیں کر رہی تھیں - ان کی باتیں زیادہ تر گھریلو ہوتی تھیں - جب کوئی بوڑھی گنگناتی ہوئی کسی کنواری لڑکی کی طرف معنی خیز انداز میں مسکرا کر دیکھتی تو وہ کنواری لڑکی یک بیک سمٹ کر بیٹھ جاتی - میں نے اندر جانا مناسب نہ سمجھا - چنانچہ میں کمرے کی کھڑکی کے قریب کھڑا ہو گیا - نبو اندر چلا گیا - وہ تقریباً ہر عورت کے پاس کچھ دیر رکتا تھا اور تمبا کو اور دھاگہ وغیرہ دینے کے بعد آگے بڑھ جاتا تھا - ایک لڑکی کے قریب پہنچ کر اس نے مجھے اشارہ کیا - میں نے غور سے دیکھا - یہ فجو چلنے والے کی لڑکی زیتون تھی - میں نے غلط کہا کیونکہ زیتون کو لڑکی کہنا مناسب نہیں - وہ عورت تھی، اسکے ایک بچہ تھا جو اس وقت پانچ سال کا ہوگا - زیتون کے خاوند نے اسے تین سال سے چھوڑ رکھا تھا اور نہ جانے کدھر چلا گیا تھا - آج تک اس کا پتہ نہیں چلا - بیچ بیچ میں کچھ لوگوں سے معلوم پڑا تھا کہ زیتون بیوہ ہو گئی ہے - کسی نے کہا تھا زیتون کو طلاق مل گئی ہے - کسی نے کہا تھا اس کا خاوند مع اپنے خاندان کے بھاگ دوڑ کے زمانے میں لاپتہ ہو گیا ہے - اصلی حالات سے مجھے آگاہی نہیں تھی - زیتون تین سال سے بغیر خاوند کے زندگی گزار رہی تھی - محنت مشقت کرتی تھی اور خوش رہتی تھی - اس کا جسم جوان تھا، آرزوئیں جوان تھیں - لیکن اُسے جیسے اس کا کچھ پتہ ہی نہ تھا - وہ سب کچھ بھول گئی تھی - نہ اُسے شوہر کی یاد آتی تھی نہ اپنی جوانی پر ترس آتا تھا - چونکہ کارخانے کا راستہ میرے مکان کے سامنے سے ہو کر گذرتا تھا اسلئے ان تین سالوں سے میں ہمیشہ زیتون کے چہرے پر ایک ایسی مسکراہٹ دیکھتا آیا تھا جو زندگی کی نعمتوں سے بھرپور تھی - زیتون کو ایک نظر دیکھنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ وہ نبو کے لئے بہترین بیوی ثابت ہو سکتی ہے۔ زیتون کی ماں گو بوڑھی ہو چکی تھی لیکن محنت مشقت کی وجہ سے وہ ادھیڑ عمر کی معلوم ہوتی تھی - وہ اپنے بڑے بیٹے اور بہو سمیت کارخانے میں بیڑیاں بناتی تھی - زیتون کا باپ فجو کارخانے کے مزدوروں کے لئے گھر سے چائے بنا کر لاتا تھا اور دو پیسے ایک آنے کے حساب سے ان میں بیچتا تھا - کارخانے کے تقریباً سب ہی مزدور اس کی چائے بڑے چاؤ سے پیتے تھے - اس طرح فجو روزانہ ایک ڈیڑھ روپیہ پیدا کر لیتا تھا اور باقی وقت اپنی بیوی کے کام میں ہاتھ بٹاتا تھا ؎

زیتون کا ایک چھوٹا بھائی تھا، نازو، وہ اکثر شراب پیتا تھا، ماں کا لاڈو اور باپ کا پیارا تھا، اور پھر شادی شدہ تھا، مہینے میں کچھ دنوں تک باپ کے ساتھ چائے بیچتا - سنک آتی تو چھوڑ دیتا اور پی کر دن بھر اپنی عورت کے ساتھ گھر پر پڑا اول فول بکتا رہتا - صرف نازو کی بیوی گھر پر ہوتی تھی - باقی سب افراد بیڑیاں بناتے تھے - اس طرح بہت اچھی طرح گذر ہو جاتی تھی ؎

اتوار کے دن نبو کو چھٹی رہتی - اس دن وہ بڑا جذباتی ہو جاتا - چائے کی کئی پیالیاں پی جاتا، لیکن اس کی طول طویل باتوں کا سلسلہ مشکل سے ختم ہوتا - ایسے ہی ایک اتوار کو اس نے مجھ سے کہا "میں زیتون سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں ؎"

میں نے اس لمحے سوچا، جس زیتون نے تین سال خاموشی اور بے حسی سے گذار دئے اب وہ کیا شادی کرے گی؟ لیکن نبو نے مجھے بتلایا کہ زیتون اسے شدت سے چاہتی ہے - اکثر گھر سے میٹھی روٹیاں اور نئے پکوان لاتی ہے اور زبردستی کھلاتی ہے - اس سے پہلے زیتون کی مرضی شادی کے خلاف تھی، بیچ میں اس نے دو تین پیغام نامنظور کئے - لیکن اب وہ کہتی ہے کہ صرف مجھ سے شادی کرے گی - اور اگر یہ نہ ہوا تو اس کا کہنا ہے کہ وہ تمام عمر بیوگی میں گذار دیگی ؎

دوسرے دن نبو نے سکندر علی کے گھر والوں کے ذریعے پیغام بھجوایا - زیتون کے والدین اور بھائی فوراً رضامند ہو گئے - اسی دن سڑک کے نکڑ پر نازو نے میرا بازو تھام کر شراب کے نشے میں جھومتے ہوئے کہا "کمال صاحب ــــ آپ کا دوست نبو، دیوتا ہے دیوتا - قسم اللہ کی، اس نے میری بہن کی زندگی بنا دی - ورنہ کون ایسا مائی کا لال ہے جو اُس عورت سے شادی کریگا - نہیں میں بھول گیا، میری بہن سے شادی کرے گا، جس کے پہلے خاوند کا ایک بچہ ہو اور بچاری بیوہ ہو ــــ ؎"

اس دن کے بعد زیتون کبھی میرے مکان کے سامنے والے رستے سے نہیں گذری ؎

نبو کو بڑی خوشی ہوئی کہ اس کا پیغام منظور ہو گیا - لیکن میں نے دیکھا

سندھ میں فن تعمیر کا ایک عمدہ نمونہ
(مزار حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رح)

خوشیوں سے تمتماتے ہوئے اس چہرے پر یاس کے گہرے سائے بھی موجود تھے۔ اس نے کبھی مجھ سے اپنے دل کی بات نہیں چھپائی۔ اسلئے اس نے بغیر کسی تمہید کے کہنا شروع کیا "پاشا بھائی۔ میرا دماغ کام نہیں کرتا، میرے ماں باپ اس نکاح سے بہت ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے صاف کہہ دیا ہے کہ زیتون میری بیوی نہیں بن سکتی۔ کیونکہ اس کے پانچ سال کا ایک بچہ ہے۔ اس کا مرد جانے مرگیا ہے یا زندہ ہے۔ اس کی ماں دن دہاڑے برقعے اڑاتی کارخانے جاتی ہے۔ بڑا بھائی اپنی بیوی کے ساتھ بیڑیاں بناتا ہے۔ تاڑ و شراب پیتا ہے۔ باپ چائے بیچتا ہے تم ہی بتاؤ میں کیا کروں"؟

بجائے اس کے کہ میں نبو کی پریشانی کو دور کرتا اور تسلی دیتا مجھے اسکی موٹی عقل پر بڑا غصہ آیا۔ مجھے اس وقت اکثر غصہ آتا ہے جب کوئی سمجھدار آدمی دوسروں سے دب کر اپنا فیصلہ بدل دیتا ہے۔ یا سچائی اور نیکی سے منہ موڑ لیتا ہے۔ میں نے نبو کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا۔ پر وہ سہم گیا، کیونکہ وہ واقعی پریشان تھا اور وہ اس کی زندگی کا ایک اہم موڑ تھا۔ اسلئے میں نے نہایت ملائمت سے سمجھاتے ہوئے اس سے کہا "ایک طرف ماں باپ ہیں جنہوں نے زندگی دی ہے، بچپن سے لاڈ پیار سے پالا ہے کہ لڑکا جوان ہوکر اپنا رہے گا، دوسری طرف زیتون ہے، اس کی زندگی ہے، اس کا پیار ہے، خلوص ہے، وعدے ہیں ـــــ اگر والدین کے خیالات کے مطابق تمہارے قدم ڈگمگائے تو زیتون کے اندر کی وہ عورت جو تین سال بعد ہزاروں تمنائیں لیکر جاگی ہے دوبارہ مرجائے گی اور اس کے ذمہ دار تم ہوگے، تمہارے ماں باپ نہیں، تمہارا سماج نہیں۔ چٹان کی طرح اٹل اور مضبوط رہنے سے سماج کا دھارا بدل سکتا ہے، ماں باپ کے خیالات بدل سکتے ہیں، یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ تمہیں ماں باپ کی محبت آج نہیں تو کل ضرور ملے گی لیکن زیتون سی عورت زندگی بھر نہیں ملے گی"۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

تیسرے دن تھے روز نبو کا نکاح ہوگیا۔ اس کے نکاح میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ اس کے ماں باپ اور رشتے دار ناراضگی کے سبب نہیں آئے تھے۔ منڈپ میں زیتون کا باپ تھا، اس کے دو بھائی تھے، محلے کے چند سمجھدار لوگ تھے، زیتون کی ماں تھی، اڑوس پڑوس کی کچھ عورتیں تھیں، جن میں سے بیشتر کارخانے میں کام کرتی تھیں۔ نبو تھا، زیتون تھی، ان کا باہمی خلوص اور پیار تھا، نہ تاروں کی سیج تھی نہ چاندی کی پالکی، نہ شہنائیوں کی گونج تھی نہ شادیانوں کی آواز، نہ آتش بازی تھی نہ باراتیوں کا ہجوم، نہ قہقہوں کا سیلاب نہ مسکراہٹوں کا طوفان۔ بس ڈھولک کی ٹھنک ٹھنک تھی اور اس کے ساتھ ابھرتے ہوئے معمولی گیت، بھونڈے اور کھُردرے گلوں سے نکلتے ہوئے گیت۔ جن میں اچھوتے سُر تھے اور ایک عجیب نیاپن!

یوں نبو اور زیتون کا نکاح ہوا۔ رات گزری، پو پھٹی اور صبح ہوئی۔ میں رات کے کئی گھنٹوں تک ایک عجیب خوشی کے احساس سے میں جاگتا رہا تھا اس لئے آنکھ دیر سے کھلی۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد جب میں باہر آیا تو جو کچھ اپنے کانوں سے سنا اس سے ایکا ایکی میرا دماغ گھوم گیا "نبو جو ہمارے محلے کی ناک تھا، کل مرگیا!"

اسی لمحے مجھے یاد آیا۔ ایک دن نبو نے مجھے کہا تھا "وہ بھی شیر خاں بن جائے گا۔" اور چونکہ آج وہ بھی شیر خاں بن گیا تھا، اس لئے یہ افواہ سو فیصدی صحیح تھی!

آج اس واقعے کو ٹھیک دو سال گزرے ہیں۔ نبو اپنے ماں باپ کے یہاں ہے۔ وہیں اس کے پاس زیتون بھی ہے۔ اس کے پہلے خاوند کا بچہ بھی ہے جو اب سات سال کا ہوگیا ہے۔

زیتون کا نبو سے بھی ایک لڑکا ہے، ٹھیک نبو کی طرح ضدی، نٹ کھٹ اور جھگڑالو۔ دادا دادی اس ضدی بچے سے بے حد پیار کرتے ہیں۔

غزلیات

حامد اللہ افسر

عکس ہے بے تابیوں کا دل کی، ارمانوں میں کیوں؟
میزباں شامل ہوئے جاتے ہیں مہمانوں میں کیوں؟

فصلِ گل کا ہو گیا ناصح پہ بھی شاید اثر
عقل کا مارا کوئی آئے گا دیوانوں میں کیوں؟

شاید اب اپنوں کے دل میں کوئی گنجائش نہیں
کچھ کشش سی ہوتی ہے محسوس بیگانوں میں کیوں؟

ہو گئے دیوانے رخصت بستیوں کی سمت کیا
چھا گئیں ویرانیاں سی پھر بیابانوں میں کیوں؟

کیا بتوں کو اپنے دل میں پھر چھپا کر لے گئے
ہیں خدا والوں کے چرچے اب صنم خانوں میں کیوں؟

دل کی اس بے رونقی کا ذکر جانے دیجئے
ہو رہی ہیں بستیاں تبدیل ویرانوں میں کیوں؟

ہے رقابت جز و لازم مہر و الفت کا اگر
اجتماعی عشق پھر ہوتا ہے پروانوں میں کیوں؟

کیا کسی کٹیا کے اندر جاگ اٹھی ہے زندگی
کھلبلی سی پڑ گئی محلوں میں ایوانوں میں کیوں؟

کوئی اتنا پوچھ لیتا جا کے شیخ وقت سے
وصف پیمانوں کے آجاتے ہیں فنجانوں میں کیوں؟

بیخ کن تھے جو ستم رانوں کے کل تک اے ندیم
ہو رہا ہے اب شمار ان کا ستم رانوں میں کیوں؟

امن کے خواہاں ہیں جب افسر جہاں والے تمام
کشمکش رہتی ہے پھر اتنی جہانبانوں میں کیوں؟

روش صدیقی

ہم چلے، تیرے تغافل کو خبر ہو کہ نہ ہو
شمع خاموش ہے، ہنگامِ سحر ہو کہ نہ ہو

کب سے بیٹھا ہوں، سرِ جادۂ فرقت اے دوست!
سوچتا ہوں یہ تری راہگزر ہو کہ نہ ہو

عشق کے دامنِ صد چاک کی زینت کیلئے
ایک آنسو ہی بہت کچھ ہے، گہر ہو کہ نہ ہو

زندگی تیرے تغافل پہ مٹی جاتی ہے
یہ تغافل بھی کہیں بارِ دگر ہو کہ نہ ہو

ہر قدم پر کششِ جادۂ الفت ہے فزوں
گامزن ہوں کوئی انجامِ سفر ہو کہ نہ ہو

دل میں نشتر سے اترتی ہیں نگاہیں میری
آسمانِ مہ و انجم پہ گزر ہو کہ نہ ہو

لمحہ لمحہ رخِ قدرت ہے برافگندہ نقاب
اب بھی تسکینِ اسیرانِ نظر ہو کہ نہ ہو

ہاں ترے وعدۂ فردا کا یقیں ہے مجھ کو
ہمنوا، سلسلۂ شام و سحر ہو کہ نہ ہو

کب ہمیں شکوۂ دوراں تھا کہ ہو آج روش
یوں طلسمِ غمِ دوراں سے مفر ہو کہ نہ ہو

عبدالحمید عدم

فقیر کس درجہ شادماں تھے، حضور کو کچھ تو یاد ہوگا
حضور کس درجہ مہرباں تھے، حضور کو کچھ تو یاد ہوگا

وہ میکدہ تھا صنمکدہ تھا کہ بابِ جنت کھلے ہوئے تھے
تمام شب آپ ہم کہاں تھے، حضور کو کچھ تو یاد ہوگا

وہاں بہاروں کے زمزمے تھے وہاں نگاہوں کے جمگھٹے تھے
وہاں ستاروں کے کارواں تھے، حضور کو کچھ تو یاد ہوگا

پہن کے پھولوں کے تاج سر پر حسین و شاداب مسندوں پر
سبو بکف کون حکمراں تھے، حضور کو کچھ تو یاد ہوگا

مراحلِ راحت و اماں تھے، مسائلِ ماہ و کہکشاں تھے
مشاغلِ حرف و داستاں تھے، حضور کو کچھ تو یاد ہوگا

اگرچہ شوق و طلب تھے بے ساختہ ہم آغوشیوں پہ مائل
کئی تکلف بھی درمیاں تھے، حضور کو کچھ تو یاد ہوگا

لطیف شامیں طبیعتوں کے خمیر سے خوب آشنا تھیں
حسیں سویرے مزاج داں تھے، حضور کو کچھ تو یاد ہوگا

نظر کی حد تک محیط تھا سلسلہ چٹکتے ہوئے گلوں کا
گلوں میں پریوں کے گھر نہاں تھے، حضور کو کچھ تو یاد ہوگا

عجیب سانچے کی کشتیاں بہہ رہی تھیں لہروں کے زیر و بم پر
عجیب صورت کے بادباں تھے، حضور کو کچھ تو یاد ہوگا

الوہیت آپ اس حسین اتفاق پر مسکرا رہی تھی
صنم خداؤں کے میہماں تھے، حضور کو کچھ تو یاد ہوگا

جو واقعے تھے وہ گونجتے زمزموں کی مانند موجزن تھے
جو خواب تھے سروِ بوستاں تھے، حضور کو کچھ تو یاد ہوگا

کہیں کہیں سلسبیل و کوثر کی جوت موجود تھی زمیں پر
کہیں کہیں عرش و آسماں تھے، حضور کو کچھ تو یاد ہوگا

شبِ محبت حضور کے کاکلوں کے کھلنے کے سلسلے میں
عدم کے اصرار کیا جواں تھے، حضور کو کچھ تو یاد ہوگا

ادا جعفری

اشک آنکھوں سے آج کترائے
کیسے کیسے چراغ کجلائے

عشرت و غم نے پھیر لیں آنکھیں
اب تری یاد آ کے بہلائے

جب نگاہوں نے ساز چھیڑ دیے
غمِ دوراں کے نقش سنولائے

جب تری یاد کے کنول مہکے
خشک آنکھوں نے رنگ برسائے

دے اٹھے لو چراغ مژگاں کے
آپ کی یاد تھی کہ آپ آئے

رہگزاروں کے دل دھڑک اٹھے
سخت جانوں کے قافلے آئے

پھر افق پر دھواں دھواں سا ہے
پھر تمنا کے مرحلے آئے

عشق برباد و شرمسار سا ہے
حسن مغرور آج پچھتائے

ضمیر اظہر

گنگناتی ہوا سویرے کی
سانس تیرا صدا سویرے کی

سادہ و صاف پھول سا چہرہ
نکھری نکھری حیا سویرے کی

خواب گوں، خواب گوں نگاہوں میں
سو رہی ہے ضیا سویرے کی

تیری زلفوں کی یاد میں کھو کر
جھومتی ہے گھٹا سویرے کی

دیکھ کر گلستاں میں تیرا خرام
تھم گئی ہے ہوا سویرے کی

جانبِ دل لپکتی آتی ہے
روشنی دودھیا سویرے کی

شامِ غم کا جواز ہے اظہر
اُجلی اُجلی فضا سویرے کی

مشفق خواجہ

کون سی ظلمتوں میں چھپی ہے تو میرے خیالات کی وادیوں کی سحر
میں نے دیکھا تجھے منزلوں منزلوں میں نے ڈھونڈا تجھے رہگذر رہگذر
عمر بھر دیکھتے ہی رہے حسنِ چشمِ توجہ پسِ پردۂ بے رخی
ہم مسافر تھے وہ جن کو توفیقِ منزل شناسی ہوئی راستہ بھول کر
اے افق پر بکھرتی ہوئی لالہ گوں روشنی کے حسیں، دلنشیں دائرو!
ہم اندھیروں کے گرداب میں مبتلا بےکسوں پر عنایت کی کوئی نظر
کون تھا جو مرے ذہن کے آئینے میں خود اپنے ہی جلوے کبھی دیکھتا
ہر قدم پر ملیں مجھ کو تنہائیاں ورنہ کہنے کو تھے ان گنت ہم سفر
قربتوں کی تمنا ہیں یہ بھی ہوا فاصلے خود بخود ختم ہوتے رہے
تیری یادوں سے ایسا تعلق رہا، اصل کا ہو گماں جیسے تصویر پہ
دشت در دشت آوارگی کا جنوں، شہر در شہر رسوائیوں کا فسوں
اس پہ بھی اہلِ دل یہ سمجھتے رہے ہیں ۔۔ ترے درد کی بات ہے مختصر
اک تصور کی دنیا کے سیاح تھے، یا کسی دیومالا کے کردار تھے
کھو کے تیرے خیالوں میں ہم چاند تاروں کو تسخیر کرتے رہے رات بھر
منزلِ شوق نزدیک آتی رہی، مرحلے غم کے آسان ہوتے رہے
جانے کس وادیٔ خواب میں لے گیا تیری یادوں کا اک لمحۂ مختصر
تجھ کو میرے تصور نے تخلیق کر کے نگاہوں کو حیرت میں گم کر دیا
سینکڑوں مختلف راستے ہیں جہاں زندگی آ گئی آج اس موڑ پہ
ہجر کی اولیں منزلوں میں پریشانیٔ دل کا باعث وہ جلوے ہوئے
جو ترے قرب کی آخری ساعتوں سے چرا کے گئے تھے بہ فیضِ نظر!
ہر روش پر اندھیرے مسلط رہے ہر قدم پر ملیں مجھ کو تاریکیاں
جانے کس روشنی کی تمنا لئے میں خیالوں میں کھویا رہا عمر بھر
یہ پریشانیاں کب تلک، دل کی ویرانیاں کب تلک، ہم سفر ساتھیو!
آنے والی خوشی کی کوئی بات چھیڑو ذرا ۔۔۔ تاکہ ہو راستہ مختصر
تیری یادوں کی رعنائیوں کا شبستاں ہی تھا کوئی شہرِ اجل تو نہ تھا
سوچتا ہوں کہ آخر غمِ زندگی کو ملا کیا مرا راستہ روک کر
مشفق اہلِ تمنا کے یہ قافلے کون سی وادیوں سے گزرنے لگے
بدگماں بدگماں سا ہر اک راہرو، اجنبی اجنبی سی ہر اک رہگذر

ہمارے صحرائی نغمے

حامد علی خاں

مغربی پاکستان کے نقشہ میں جنوب مشرق کی سرحد سے متصل ضلع تھرپارکر کا علاقہ لگا ہوا ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے یہ ریگستان تھرپارکر کا ایک حصہ ہے۔ اس ضلع کی تحصیلیں سب ریگزار ہیں۔ شتر مرغ کی چونچ کی طرح بھارتی علاقہ میں گھسا ہوا تحصیل نگرپارکر کا علاقہ اب بھی کئی تاریخی آثار اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ دیکھئے یہ قصبہ نگرپارکر کے تالاب سے لگی ہوئی ایک تاریخی مسجد ہے جو سندھ کے حکمراں میروں کے زمانہ سے تعلق رکھتی ہے، یہ تالاب بھی عرصۂ قدیم سے چلا آتا ہے، اسی تحصیل میں بدھ مت کے مندر بھی پائے جاتے ہیں، نگرپارکر تحصیل کا علاقہ ریگستان نہیں بلکہ پہاڑی اور بنجر میدانی خطوں پر مشتمل ہے، یہاں کے لوگ فطری طور پر جفاکش اور جغرافیائی مجبوری کی وجہ سے خانہ بدوش ہیں۔ یہاں پارکری زبان بولی جاتی ہے جس میں گجراتی، مارواڑی اور سندھی کی آمیزش ہے۔ یہ پارکری بھی خوب ہے، لیجئے آپ ایک لوک گیت سنتے چلئے، محبت کے جذبوں سے کس انسان کا دل عاری ہے؟ انسان خواہ وہ مرغزاروں کا رسیا ہو یا ریگزاروں کا باسی، اپنے جذبات میں کتنی آفاقی ہم آہنگی رکھتا ہے۔ ایک پارکری نوجوان ایک حسینہ کو دیکھ کر یوں مدح سرائی کرتا ہے:

تیری کمر چیتے کی طرح ہے اور آنکھیں ہرن کی مانند۔
اے لڑکی تو کتنی خوبرو ہے!
وہ حسن ہی کیا جو مغرور نہ ہو!

حسینہ کا جواب سنئے:

اے نوجوان! تو میری آرزو نہ کر
مجھے وہی پا سکتا ہے جو نصیبے والا ہو۔

پارکری کی جھلک آپ نے دیکھی۔ اب آگے بڑھئے، یعنی مغرب کی طرف۔ یہ اسلام کوٹ کا قدیم اور تاریخی قصبہ ہے، یہاں بھی بدھ مت کے زمانے کے آثاروں میں ایک بڑا مندر ہے۔ آجکل یہ گاؤں مویشیوں کی تجارت کے لئے مشہور ہے، لیکن ہمیں آگے جانا ہے۔ اب ہم مٹھی پہنچ گئے، واہ، ارے! یہ تو اچھا خاصا شہر ہے، تعجب ہے کہ ریگستان میں بھی اتنی بڑی بستی ہو سکتی ہے، اس کی آبادی دس ہزار ہے، ہر طرف شہری تمدن کی برکتیں ہیں، ہوٹلوں میں ریڈیو بج رہے ہیں، سڑکوں پر گہما گہمی ہے۔ اخاہ! یہاں پان بھی مل جاتا ہے، بھئی نگرپارکر میں تو پان، برف اور لیمن کو ترس گئے، مٹھی میں تو سب کچھ موجود ہے، شہر کے باہر نکلنے سے ہی پتہ چلے گا کہ ہم ریگستان میں ہیں ورنہ شہر میں تو اس کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ مٹھی اس ریگستانی علاقہ کی دوسری اہم تحصیل ہے، یہاں ڈھاٹکی زبان بولی جاتی ہے، یہ مارواڑی اور ہندی کا مرکب ہے، سندھی نے بھی اپنا اثر جما لیا ہے لیکن یہ پارکری کی طرح مشکل نہیں۔ "تو کتھے جائیں تھو؟" آپ سمجھ تو گئے ہوں گے پوچھا جا رہا ہے "تو کہاں جا رہا ہے؟" اب لگے ہاتھوں ڈھاٹکی میں ایک صحرائی گیت کے بول سن لیجئے:

ساگر پانی بھروا جاؤں   مارو ڈیورو روٹھو جائے

شاید آپ نہ سمجھے ہوں۔ دیور اور بھاوج کی چھیڑ چھاڑ تو مشہور ہی ہے، لیکن بھاوج کو گھر کے کام کاج کی ذمہ داری بھی تو ہوتی ہے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ دن بھر ہنسی مذاق میں لگی رہے۔ اس لئے گاگرے کر پانی بھرنے جانا ہی پڑتا ہے (برسات کا پانی جس گڑھے میں جمع ہو جاتا ہے اسے یہاں ساگر کہتے ہیں) ذرا دیر ہو گئی تو دیور نے آکر بھاوج نے فریاد کی:۔

سامنے کی حویلی والا
آج میرا پیچھا کر رہا تھا

یہ گویا دیور کے دل کو بھی حمایت کا جذبہ ابھارنے کی ترکیب تھی تاکہ اکیلا نہ جانا پڑے ۔

مٹھی کی سیر کر چکے ۔ اب شمال کی طرف چلئے تیس میل اونٹوں پہ طے کرنے ہیں، کبھی اس ٹیلے پہ چڑھ رہے ہیں تو کبھی اُس پر سے اتر رہے ہیں، لیکن پھر بھی سامنے کوہ نما ریت کے ٹیلوں کا لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا ہے ۔ کوئی بات نہیں، شام تک اپنی منزلِ مقصود یعنی چھاچھرو پہنچ جائیں گے ، ہاں یہ تیسری ریگستانی بستی ہے جس کی ہم سیر کریں گے ۔ اگر مٹھی سمٹی تھی تو چھاچھرو بھی چھاچھرو ہی ہے ۔ اتنی عالیشان عمارتیں اور ریگستان میں ! یہ ہائی اسکول ہے، ادھر تحصیلدار کا دفتر ہے، اس سے متصل پولس کوارٹرز ہیں اور اب یہ بستی شروع ہوگئی ۔ یہاں بھی صدر ، شاہی بازار سب کچھ موجود ہیں اور پاکستان بننے کے بعد سے یہاں کی رونق اور آرائش روز افزوں ہے ۔ لیکن ہمیں تو یہاں کے عوامی گیت سننے ہیں ، اچھا آیئے منگن ہاروں (فقیر، گداگر) سے گیت سنیں گے اور ان کی عملی ترجمانی بھی دیکھیں گے ۔ یہ دیکھئے اب تماشا شروع ہوا چاہتا ہے، باجرے کی ڈالیاں جو زمین میں جمائی گئی ہیں، ان سے مراد باجرہ کا کھیت ہے، یہ اونچی جگہ مچان کی علامت ہے ۔ اے لو ، دوشیزہ نے مچان پر چڑھ کر رکھوالی شروع کر دی ۔ اور پرندے اڑا رہی ہے ۔ ادھر دیکھنا اس سمت سے کوئی گھوڑا سوار آ رہا ہے، کوئی مسافر معلوم ہوتا ہے ، دوشیزہ کی طرف دیکھ رہا ہے ، وہ یہاں رک کیوں گیا؟ شاید کچھ کہنا چاہتا ہے ۔ ہاں ہاں ، وہ دیکھو کچھ اس کے ہونٹ ہل رہے ہیں :

"اے دوشیزہ ! مچان پر چڑھ کر پرندوں کو اڑا ، ضرور اڑا اپنی کھیتی کی بے شک رکھوالی کر ۔
لیکن ایک راہی کو باجرے کا خوشہ بھی کھلا دے ۔"

دیکھئے غیور لڑکی کیا جواب دیتی ہے ۔ ذرا دیہاتیوں کے استعاروں پر بھی غور کیجئے :

"اے نوجوان ! دھیان لگا کر میری بات سن ۔
سبز ڈنٹھل اتنا رس بھرا ہے کہ ناخن لگنے سے ابل پڑتا ہے ۔
میرے منگیتر نے بھی مجھ کو ابھی تک نہیں چھوا ۔
تو میں تیرے پاس کس طرح آ سکتی ہوں "

سرپٹ گھوڑا دوڑاتے ہوئے مسافر آگے بڑھ گیا ۔ ارے ! یہ بڑھیا کہاں سے ٹپک پڑی ؟ شاید کسی درخت کی اوٹ میں کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی، دیکھنا ، وہ کچھ بتلا رہی ہے :

"ہائیں ! یہ تو تیرا منگیتر تھا ۔
تجھے دیکھنے آیا تھا ۔
تیری آزمائش کرنے کے لئے آیا تھا ۔"

اب لڑکی کا ردِ عمل ملاحظہ ہو، کس میٹھے انداز میں گا رہی ہے :

"راستہ پرانا ہے لیکن نقشِ قدم بالکل نئے ہیں ۔
نوجوان گھوڑے پر تیزی سے چلا جا رہا ہے ۔
کوئی بتلائے ! میں اس کے پاس کیسے پہنچوں ؟"

یہ تو تھا چھاچھرو ۔ اب اور آگے بڑھئے ۔ بس یہ آخری مرحلہ ہے ۔ پھر ہم اپنا سفر ختم کر دیں گے ۔ اب عمر کوٹ کے لئے رختِ سفر باندھئے ، وہی عمر کوٹ جو اکبر اعظم کی جنم بھوم ہے ، جو عمر ماروی کی لازوال داستان سے اور بھی مشہور ہو گیا ہے ۔ اس رومان کو شاہ لطیف کی زبان سے سنئے ۔ دو آتشہ کے سے مزے آ جائیں گے ۔ کیا آپ وہ مکالمہ بھول گئے جس میں عمر نے ماروی کو طعنہ دیا تھا کہ :

"تیرا دیس تو ویران ریگستان ہے ، بھوک اور مفلسی کے سوا وہاں کیا رکھا ہے ۔"

ماروی نے جواب دیا تھا :

"کئی سال کے قحط کے بعد اگر ایک بار بھی بارش ہو تو ہمارے سارے آلام دور ہو جاتے ہیں ۔"

(باقی ص ۴۷ پر)

اِسمال

ڈاکٹر محمد باقر

تہران کے نچلے طبقے کے لوگ "اسمٰعیل" کو "اسمال" پکارتے ہیں۔ اور یہی "اسمال" حسین مدنی کی اس داستان کا ہیرو ہے جس کے متعدد ایڈیشن اب تک شائع ہو کر چند لاکھ کی تعداد میں فروخت ہو چکے ہیں۔ داستان کا یہ مرکزی کردار تہران کے ایک عقب ماندہ حصے کا رہنے والا تیس سالہ نوجوان ہے جس نے اِن تیس سالوں میں سے ایک تہائی عمر کُنجِ زنداں میں بسر کی ہے۔ وہ ایک جاہل شخص ہے جو بات بات پر لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور تہرانی اصطلاح کے مطابق "یکہ بزن" ہے۔ اڑوس پڑوس کے لونڈے اُسے خوب پہچانتے ہیں اور جُوا کھیلتے ہوئے اُسے دھوکا دینے کی کوشش نہیں کرتے، کیونکہ وہ ہر وقت ایک چمکتا ہوا "ضامندار" (چاقو) اپنے پاس رکھتا ہے جو کھٹ سے کھل جاتا ہے اور مزاحم ہونے والے کی گردن کی طرف بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب کسی "کافہ" یا رستوران میں داخل ہوتا ہے تو ہر طرف سے صدا بلند ہوتی ہے:

"خوش آمدین ..... بفرما (تشریف رکھیئے) آقائی اسمال خان"

داستان زمانۂ جنگِ جہانگیر دوم میں شروع ہوتی ہے۔ اسمال خان پیشے کے لحاظ سے موٹر ڈرائیور ہے۔ اس جنگ نے ایران میں قحط ڈال کر مفلسی اور بے زری کو فروغ دیا۔ اسمال اپنے محبوب شہر اور اس کی محبوب ترین گلیوں کو فاقہ مستی کے ہاتھوں مجبور ہو کر چھوڑتا ہے اور اپنے ہزاروں ہم وطنوں کی طرح ایران کے جنوبی علاقے میں جا کر ایک امریکی مرکز میں "نوم نویسی" (نام نویسی = نام لکھانا، بھرتی ہونا) کرتا ہے۔ چار مہینے امریکی لاریاں چلاتا ہے اور بالآخر "شوفر کوپنی"[1] (راشن والا ڈرائیور) کا لقب پاتا ہے۔ چونکہ آدمی خوش مشرب اور درویش مسلک ہے، اس لئے امریکنوں سے بہت جلد گھل مل جاتا ہے اور ایک دو لفظ انگریزی کے بھی سیکھ جاتا ہے۔ لیکن امریکی یا انگریزی اطوار کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مثلاً "ودکا" (ایک قسم کی شراب) کی بوتل کو اگر وہ مُنہ سے لگا کر نہ پیئے تو اُسے لطف نہیں آتا اور فرصت کے اوقات میں اگر وہ دوستوں سے "شش قاپ"[2] نہ کھیلے تو اس کی تسکین دور نہیں ہوتی۔

ایک دن نصیب اسمال خان کو گویا ڈھونڈتا ہوا آ نکلا۔ بات یوں ہوئی کہ اسمال ایک امریکی بحری سپاہی کا دوست بن گیا اور ہر شام شط العرب کے کنارے بیٹھ کر یہ ایک دوسرے کی سلامتی کے لئے کئی "چتول" (پیگ) خالی کر دیا کرتے تھے۔ اور اکثر یوں ہوتا کہ اسمال اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا شراب کا بل خود ادا کرتا۔ اسمال کا ایک اور رفیق "اکیپ" (جگری دوست) جعفر تھا جو انگریزی اچھی طرح جانتا تھا اور اکثر اسمال کے مترجم کے فرائض سرانجام دیا کرتا۔ اس شام جب اسمال اور اس کا امریکی دوست ویلیام (ولیم) ودکا کے تین تین پیگ پی چکے تو اسمال نے اپنے ایک جھگڑے کا قصہ سُنانا شروع کیا جو بالآخر اسمال کے جیل جانے پر ختم ہوتا تھا۔ ویلیام جعفر کی وساطت سے اسمال کے بیانات سُن کر ہنستا رہا اور جب وہ ایک دوسرے کی سلامتی کے لئے پیگ پی چکے تو ویلیام نے کہا:

"باوجود اس کے کہ ایران کا ماحول امریکہ سے بہت مختلف ہے، میں نے
تمہاری لذت آفریں باتوں کو سُننے کی عادت ڈال لی ہے، لیکن
امریکہ بھی ایک دیدنی ملک ہے اور جب تک تم اُس کی آسمان
خراش (SKYSCRAPER) عمارتوں کو نہ دیکھ لو اس
وقت تک تم صحیح طور پر اُن کی داد نہیں دے سکتے۔"

ویلیام نے امریکہ کے مرد و زن کی آزادی اور "مُو خُرمائی" (سنہرے بالوں والی) حسین عورتوں کی بھی بہت تعریف کی۔ پھر ایک ذاتی رُومان بیان کی۔ یہاں تک کہ اسمال، امریکہ کی سیر کرنے کے لئے بیتاب ہو گیا اور ویلیام سے پوچھنے لگا: "دوست کوئی ایسی صورت بھی بتاؤ کہ ہم بھی تمہارے ملک کی سیر کر سکیں۔" ویلیام نے وعدہ کیا کہ میں جب رُخصت پر امریکہ واپس جاؤں گا تو جہاز میں ملازمت دلوا کر تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔ چنانچہ اس وعدہ کی تکمیل کی گئی۔ اس عرصہ میں اسمال کا پاسپورٹ اور دیگر کاغذات تیار ہو گئے اور جب ویلیام کا جہاز بندر شاپور سے امریکہ روانہ ہونے کے لئے تیار ہوا، تو اسمال اُس پر ملازم ہو چکا تھا۔ جہاز لنگر اُٹھانے کے قریب تھا کہ اسمال نے اپنے یارِ غار جعفر کو خدا حافظ کہنے کے لئے ایک طرف بلا کر کہا:

"جعفر جون مرگِ من غصہ نخوری جا۔ ہر یدی ہر خوبی از ما دیدی

---

[1] کوپن = راشن کارڈ۔ [2] ایک قسم کا جُوا

صلالمون کن، از قوال من انہ آقا ابراہیم وشہدی رجب واصغر وہمۂ بچہ ہا خداحافظی کن۔ راستی "بیست چوب" بہ خا چیک عرق فروش بدہکارم۔ بہش بدہ بعد باہم حساب میکنیم، ہر وقت ہم با بچہ حارہتین کافہ گلشن یادی از ما بکنین۔ بہ "ملوکی" ہم از قوال من بگو "نسناس" انقدرہ بمن جفا کردی تا منو از عشق خودت بہ "لنگہ دنیا" فرستادی! خلاصہ دیگہ "خص" شیم۔ قربون تموم بچہ ھای "با معرفت دار تہرون" "عزت زیادہ" وای! دائی!"

یہ وہ تہرانی فارسی ہے جو آسمال اپنے بقول "تہرونی" انداز میں بولتا ہے۔ اس کی صحیح یا کتابی شکل یہ ہوگی :

"جعفر جان بمرگ من غصہ نخوری۔ ہر بدی ہر خوبی از ما دیدی حلالمان کن۔ از قول من از آقا ابراہیم ومشہدی رجب واصغر وہمۂ بچہا خداحافظی کن۔ راستی "بیست چوب" بہ خاچیک عرق فروش بدہکارم با دبدہ بعد باہم حساب میکنیم، ہر وقت ہم با بچہ ھاروی کافہ گلشن یادی از ما بکنی۔ بہ "ملوکی" ہم از قول من بگو "نسناس" آنقدر بمن جفا کردی تا مرا از عشق خودت بہ "لنگہ دنیا" فرستادی! خلاصہ دیگر مرخص میشوم! قربان تمام بچہ ھای "با معرفت دار تہران"۔ "عزت زیادہ۔ یا علی!"

اس کا ترجمہ کچھ یوں ہوگا :۔

"پیارے جعفر! تمہیں میری قسم تم نہ کھانا۔ ہم نے تم سے جو اچھا برا سلوک کیا ہے اُسے بخش دینا۔ میری طرف سے آقا ابراہیم، مشہدی رجب، اصغر اور تمام لونڈوں کو خدا حافظ کہنا۔ سچی بات یہ ہے کہ اس عیسائی شراب فروش کا میں "بیست چوب"[1] کا قرضدار رہتا ہوں۔ اُسے یہ ادا کر دینا، پھر ہم بعد میں حساب کریں گے۔ جب تم لونڈوں کے ساتھ گلشن کیفے میں جاؤ تو ہمیں یاد کر لیا کرنا۔ ملوکی (محبوبہ) سے میری طرف سے کہنا۔ نسناس[2]، تم نے میرے ساتھ اس قدر جفا کی ہے کہ مجھے اپنی محبت سے بھگا کر تم نے "لنگہ دنیا"[3] بھجوا دیا ہے۔ مختصر یہ کہ اب میں رخصت ہوتا ہوں۔ تہران کے تمام عقلمند لونڈوں کے قربان۔ اللہ تعالیٰ تمہاری عزت بڑھائے۔ خدا حافظ!"

اس ایک "خداحافظ" میں آقای حسین مدنی نے جذبات اور خلوص کی ایک دنیا بھر دی ہے۔ آسمال ایک طرف اپنے جانی دوست کو صبر کی تلقین کر رہا ہے۔ دوسری طرف تہران کی یادیں اُسے ستاتی ہیں تو وہ کبھی اپنے رفقائے کار کو سلام بھیجتا ہے، کبھی گلشن کیفے کو یاد کرتا ہے اور کبھی اُس محبوبہ کا شکوہ کرتا ہے جس کی محبت میں ناکام ہو کر وہ امریکہ کے لئے رختِ سفر باندھ لیتا ہے۔ اور اس پریشانی کے عالم میں اُسے وہ عیسائی بادہ فروش بھی یاد آتا ہے جس سے شراب اُدھار پی کر وہ غم روزگار سے نجات پا رہا ہے۔

چند لمحوں کے بعد جہاز بندر شاہ پور سے روانہ ہوتا ہے اور اس کتاب کا ہیرو آسمال اپنے آپ کو ایک بالکل نئی دنیا میں پاتا ہے۔ داستان روزمرہ کے واقعات کے مجموعہ کی شکل میں آگے بڑھتی ہے اور جا بجا یہ صورتِ حالات پیدا ہوتی ہے کہ آسمال خواہ مخواہ اپنے لئے اسبابِ مصائب تلاش کر لیتا ہے اور مشکلات سے "آ بیل مجھے مار" کہہ کر لپٹ جاتا ہے۔ ولیام حسب توفیق اور حسب موقع اس کی مدد کرتا ہے اور اُسے معمول کے مطابق رفتار و کردار پر آمادہ کرتا ہے۔ لیکن آسمال صرف ایک جاہل اور احمق شوفر ہی نہیں، بسا اوقات وہ اپنی غیر معمولی شجاعت اور جرأت کا ثبوت بھی دیتا ہے۔ اور ایک آن گھڑ فلسفی کی طرح حالات کا جائزہ لے کر بڑے دقیق معاشرتی نکات بھی بیان کرتا ہے اور ان نکات کو بیان کرتے ہوئے وہ طنز و مزاح کے تیر و نشتر ہر طرف پھینکتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے مفکر اس کی منطق کے سامنے عاجز آ جاتے ہیں۔

جہاز چلتا ہوا پہلی مرتبہ حبشیوں کے ایک جزیرہ پر لنگر انداز ہوتا ہے۔ ان حبشیوں کے سردار کی اجازت سے جہاز کے مسافر جزیرہ پر جنگلی مرغ کے شکار کے لئے نکلتے ہیں۔ آسمال کی پارٹی میں ولیام، جہاز کا ایک اور ملازم جمس (جیمسز) دو اور آدمی اور ایک عورت شامل ہے۔ ان میں سے کچھ آدمیوں کے پاس بندوقیں ہیں لیکن آسمال کے پاس صرف اپنا ضامن دار (چاقو) ہے۔ بندوقوں والے مرد آگے آگے چل رہے ہیں، آسمال حسبِ عادت ایک سو قدم پیچھے عورت کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے اور اُس سے باتوں میں مشغول ہے۔

"تہران میں میری ایک نشمہ تھی۔ آپ سے اس کی شکل بہت ملتی جلتی تھی نشمہ سے میری مراد دوست ہے۔ تمہاری جان کی قسم اس کی نظیر نہیں تھی......
ایک دن میں تین دفعہ اُس کے لئے مرا۔ کیا بتاؤں کہ وہ کیسی گڑیا تھی۔ میں نے تین چار دفعہ اس کے لئے چاقو کھایا، لیکن بالآخر وہ مجھے چل دے کر ایک اور آدمی کے ساتھ بھاگ گئی اور اُس سے متحد ہو گئی۔ تیرے بالوں کی قسم! میں اُس سے اس قدر بیزار ہوا کہ میں نے اس بے ایمان کو چھوڑ ہی دیا۔ اور پھر اس کی طرف بالکل اعتنا نہ کی۔ تہران میں میری نشمہ چاہنے

---

[1] ایرانی جہلا کے ہاں یہ دستور ہے کہ وہ جتنا اُدھار لیتے ہیں۔ اس کے لئے نشان ایک لکڑی پر لگا دیتے ہیں جسے "چوب" کہتے ہیں۔ ان نشانات کو گن کر پھر قرضہ ادا کرتے ہیں۔ [2] لفظی معنی بندر کے ہیں۔ یہاں پیار کی گالی میں استعمال ہوا ہے۔ مراد ظالم یا جاہل۔ [3] "YANKEE WORLD" (امریکہ) کی تحریف کر کے ایرانی جہلا یوں بولتے ہیں۔ مراد امریکہ ہے۔

دالیاں تھیں۔ اب ہم اس اجنبی مملکت میں پہنچ گئے ہیں۔ بہتر ہے کہ اب
صرف ایک کی ہی خواہش رکھیں۔"

آسمال یہ رومانی داستان سُنا تا جا رہا تھا کہ عورت نے ایک چیخ ماری اور آسمال کے گلے سے لپٹ کر ایک طرف اشارہ کرنے لگی۔ آسمال نے اُس طرف دیکھا تو ایک دفعہ تو اُس کا رنگ بھی اُڑ گیا۔ ایک مگرمچھ سمندر سے نکل کر اُن کی طرف بڑھ رہا تھا لیکن آسمال جلد ہی سنبھل گیا۔ اُس نے عورت کو اپنے آپ سے الگ کیا پھر تین چار مرتبہ اُچھلا کودا اور جب مگرمچھ اُس پر حملہ کرنے لگا تو اُس نے نہا مندار نکال کر اس کی پشت میں بھونک دیا۔ مگرمچھ نے درد کی شدت سے بیتاب ہو کر ایک دفعہ پھر حملہ کرنا چاہا، لیکن آسمال نے پھر ایک دفعہ نہامندار اُس کے پہلو میں پیوست کر دیا۔ مگرمچھ نے آرے کی مانند دہاں کھولا اور آسمال نے ایک پتھر اُٹھا کر اس کی طرف پھینکا۔ اتفاق سے یہ پتھر اُس کے کھلے ہوئے جبڑوں میں جا لگا اور وہ کچھ دیر تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ جمس اور ولیام عورت کی چیخیں سُن کر دوڑے دوڑے آئے تو انہوں نے دیکھا کہ آسمال نے اسلحہ کے بغیر مگرمچھ کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے اور وہ اِسے رسی سے باندھ کر جہاز پر لے آئے۔

جہاز نے لنگر اُٹھایا۔ تو تھوڑے ہی عرصہ کے بعد سمندر میں طوفان آ گیا، اِس طوفان کے زمانے میں جب ہر ایک جہازی اور مسافر سہما ہوا تھا، آقائے آسمال سارے جہاز میں دندناتے پھرتے تھے اور اسی دوران میں اُنہیں معلوم ہوا کہ جزیرہ میں اُن کے ساتھ جو خانم تھیں وہ جہاز کے ملوان (کپتان) کی بیوی ہیں۔ جزیرہ کی آشنائی ذرا اور بڑھی تو خانم نے اُن کی طرف مزید ملتفت ہونا شروع کر دیا اور ایک دن جبکہ وہ خانم کے ساتھ اُس کے کمرے میں بیٹھے ہوئے کوکو پی رہے تھے، تو اُس کے خاوند کے آ جانے پر آپ کو پلنگ کے نیچے چھپکر جان بچانی پڑی۔

جہاز چند دنوں کے بعد حبشیوں کے ایک اور جزیرہ پر لنگر انداز ہوا۔ یہاں آسمال ایک فرنگی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو کر اُسے حبشیوں کے چنگل سے آزاد کرانے میں کامیاب ہوا۔ اس لڑکی کا نام ماریا تھا۔ بظاہر وہ بھی آسمال کی محبت کا دم بھرتی تھی۔ جب ولیام، ماریا اور آسمال تینوں جزیرہ سے واپس جہاز پر پہنچے تو وہاں اُن کا ایک اور کارگر دوست جمس اُن کا انتظار بیتابی سے کر رہا تھا۔ اس نے آسمال کے کان میں آہستہ سے کہا: "معلوم ہوتا ہے کہ تیر کمان سے بڑا اچھا شکار مار کر لائے ہو"۔ لیکن آسمال اس قسم کے امریکی مذاق کا عادی نہ تھا۔ اس نے جمس کو ڈانٹ دیا اور کہا: "یہ میری محبوبہ ہے، تمہیں اسکے ساتھ احترام سے پیش آنا چاہیئے۔ جمس نے فوراً لڑکی کے ہاتھ کو بوسہ دیتے ہوئے کہا: "خاتونِ محترم! بندہ کو جمس کہتے ہیں۔ میں آپ سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں"۔ لیکن ابھی آخری کلمہ وہ ادا نہ کرپایا تھا کہ آسمال نے اس کا کالر پکڑ کر ایک کشیدہ آبدار (طمانچہ) رسید کیا۔ جمس لڑکھڑایا اور اتنے میں اسمال نے کوٹ اتار کر زمین پر پھینک دیا اور پھر گھونسوں اور لاتوں سے جمس کی خوب مرمّت کی۔ چند مسافر ہاؤ ہو سُن کر جمع ہو گئے اور انہوں نے آسمال کو بڑی مشکل سے ہٹا کر پیچھے کیا، لیکن آسمال ابھی تک اس بار مارے غصہ سے لال پیلا ہو رہا تھا کہ جمس نے آسمال کی محبوبہ کے ہاتھ کو بوسہ کیوں دیا ہے اور کہہ رہا تھا:-

"بے ایمان! میری محبوبہ کا ہاتھ چومتے ہو؟ اب سمجھے کہ میں اُن بے
غیرتوں میں سے نہیں ہوں، اس دفعہ تو میں نے تمہیں معاف کر دیا
ہے۔ مگر پھر تم نے کبھی یہ کام کیا تو تمہارا پیٹ پھاڑ دوں گا۔
فوراً دور ہو جا - بدمعاش کہیں کا۔"

دنگا تو ختم ہو گیا لیکن سہ پہر کو جب آسمال اور ولیام اپنے کمرے میں پہنچے تو وہاں ایک خط اُن کے نام رکھا ہوا تھا۔ ولیام نے خط کھولا تو اس میں لکھا ہوا تھا: "آپ دونوں جزیرہ پر ۳۶ گھنٹے بدون اجازت گھومتے رہے ہیں اور آپ کی اِس حرکت کی وجہ سے جہاز دو گھنٹہ لیٹ ہو گیا ہے۔ پھر آپ جہاز کے قانون کے خلاف ایک عورت جہاز پر لے آئے ہیں اور آپ نے جہاز کے ایک ملازم جمس کو بھی پیٹا ہے۔ اس لئے آپ کو ۲۰ ڈالر جرمانہ کیا جاتا ہے۔ جرمانہ کا بل اس خط کے ساتھ ہے۔ علاوہ ازیں آپ کو خزانچی کے پاس جا کر ۲۰ ڈالر نیویارک تک ایک آدمی کے ٹکٹ کے لئے فوراً جمع کرانے چاہئیں۔ عدم تعمیل کی صورت میں جرمانہ دگنا کر دیا جائے گا۔"

آسمال نے خط سننے کے بعد سر کو ایک جھٹکا دیا اور بولا: "یہ ٹکٹ کے لئے ۲۰ ڈالر کا مطالبہ تو میں منظور کرتا ہوں، لیکن یہ جو دوسرے ۲۰ ڈالر ہیں اِن کا تعلق تم سے بھی ہے۔ چلو آؤ چلیں، دام ادا کر دیں۔"

خزانچی کے پاس پہنچکر آسمال نے جرمانہ کا بل میز پر رکھ دیا اور بولا: "جناب خزانچی صاحب! ٹکٹ کے ۲۰ ڈالر تو ٹھیک ہیں۔ لیکن ازراہِ کرم یہ فرمائیے کہ یہ دوسرے ۲۰ ڈالر کیسے ہیں؟" خزانچی نے جواب دیا: "۱۵ ڈالر ۳۶ گھنٹوں کی غیر حاضری، ۱۰ ڈالر عورت کو خلافِ قانون جہاز پر لانے اور ۵ ڈالر جمس کو زدوکوب کرنے کا جرمانہ"۔

آسمال نے کچھ دیر سوچ کر کہا: "حضور اس آخری پانچ ڈالر میں سے کچھ رعایت کر دیں"۔ خزانچی نے جواب دیا: "یہ جرمانہ تو قانون کے عین مطابق ہے اور یہ پانچ

ڈالر سے کم نہیں ہو سکتا"۔ اس پر آسمال نے فوراً ایک طمانچہ خزانچی کے مُنہ پر مارا اور پھر دو چار گھونسے اور لاتیں بھی رسید کیں اور پھر نہایت اطمینان سے کہا: "پانچ ڈالر کا ایک اور بل بھی عنایت فرمائیے"۔

الغرض اسی طرح کے حادثات سے دوچار ہوتے ہوئے ویلیام اور آسمال نیویارک کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوتے ہیں اور جہاز سے دونوں کو چند ہفتوں کے لئے رخصت ملتی ہے۔ سب سے پہلے یہ دونوں مسافر نیویارک کے ہوٹل والڈورف آسٹوریا میں جاکر مقیم ہوتے ہیں۔ پروگرام یہ طے ہوتا ہے کہ ویلیام اپنے بیوی بچوں سے ملنے کے لئے کیلیفورنیا جانا چاہتا ہے لیکن اس سے پیشتر وہ آسمال کو نیویارک کی سیر کرانا چاہتا ہے۔ نیویارک پہنچتے ہی گمرک (کسٹم) پر یہ حادثہ ہوتا ہے کہ آسمال کی راستے کی محبوبہ ماریا دفعتہً گم ہو جاتی ہے بعد میں اخبارات کی اطلاع سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک خطرناک جاسوس تھی۔

نیویارک میں آسمال کو ہر ایک چیز اپنے ملک سے مختلف نظر آتی ہے وہ حمام میں پہنچتا ہے تو اس لنگ کا مطالبہ کرتا ہے جسے باندھ کر ایرانی استحمام کرتے ہیں۔ کھانے کی میز پر بیٹھتا ہے تو اُسے تہران کے کلہ پاچہ (سر اور پائے) اور نان سنگک (گرم پتھروں پر پکی ہوئی روٹی) یاد آتی ہے اور بالآخر اسی ہوٹل میں اُس کی ملاقات ایک اور معمر ایرانی حاجی عبدالرسول اصفہانی سے ہوتی ہے۔ یہ حاجی صاحب دوبار حج سے مشرف ہو چکے ہیں۔ باقاعدہ نماز پڑھتے ہیں اور اوراد و وظائف کا شغل بھی جاری ہے، لیکن اور کئی ملکوں کے حاجیوں کی طرح اُن کے اعمال بھی تعجب انگیز ہیں۔ آسمال امریکہ میں اپنی آمد کی وجہ بیان کر کے جب حاجی صاحب سے اُن کی مسافرت کی وجہ دریافت کرتا ہے تو آپ فرماتے ہیں: "جنگ شروع ہوئی تو میں نے ایک بہت بڑے انبار میں جنس خرید کر جمع کرلی۔ دو تین مہینے کے بعد ایک تومان پر دس تومان منافع حاصل کیا، لیکن تمہیں معلوم ہی ہے کہ کام کرنے والے کو ایک تومان پر سو تومان کمانا چاہئے، ورنہ مزدوری بھی حاصل نہیں ہوتی۔ مختصر یہ کہ میں نے سات آٹھ مہینوں میں پانچ ہزار تومان جمع کر لئے لیکن بقول شاعر:

کجا کفاف دہد بادہ ہائے مستیٔ ما

پھر میں نے کچھ اور ہیر پھیر کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں پچاس ہزار تومان بنالئے۔ بعد میں خیال آیا کہ مملکت کی وضع خوب نہیں، اس لئے بیماری کے عنوان سے پاسپورٹ بنوالیا اور اب یہاں چلا آیا ہوں۔ خیال ہے کہ جنگ کے اختتام تک یہیں رہوں گا"۔

آسمال ہنستا ہوا حاجی صاحب سے رخصت لیکر چلا آیا اور نیویارک کی سیر کرنے لگا۔ یہاں اس نے مجسمۂ آزادی سے لیکر نیویارک کے تمام عجائب گھر، تھیٹر اور سرکس دیکھ ڈالے۔ اس عرصہ میں اس کی ملاقات ایک اور نوجوان ایرانی سے بھی ہوئی جو ایک ثروت مند تاجر کا لڑکا تھا اور تعلیم حاصل کرنے کے لئے نیویارک پہنچا ہوا تھا، لیکن یہاں آکر وہ سراسر امریکی بن گیا تھا۔ اس کا نام حمید خاں تھا۔ وہ امریکنوں کے انداز میں باتیں کرتا اور رفتار و کردار میں اُن کی نقالی کرتا۔ آسمال نے اپنے خاص جاہلانہ انداز میں اس کی خوب خبر لی اور پھر چند دن بعد نیویارک میں قیام پذیر ہو کر یہ ویلیام کے ساتھ کیلیفورنیا چلا گیا۔

کیلیفورنیا سے آسمال ہالی وڈ پہنچتا ہے اور وہاں ایک فلم میں حصہ لیتا ہے اور پھر نیویارک چلا آتا ہے۔ نیویارک میں وہ حمید خان کی وساطت سے ایک ایرانی لڑکی سے ملتا ہے جو ایران سے ایک امریکی سے شادی کرنے کے خیال سے بھاگ آئی ہے۔ یہ لڑکی تہران میں کسی وقت آسمال سے مل چکی ہے، چنانچہ آسمال بزور امریکی سے یہ لڑکی چھین لیتا ہے اور شادی کرنے کے خیال سے اُسے نیویارک سے لیکر تہران واپس چلا آتا ہے اور وہاں آکر اُس سے نکاح کر لیتا ہے۔ تہران میں اس کے قدیم دوست اور ساتھی اس کا استقبال ہوائی اڈے پر کس طرح کرتے ہیں، اس کی تفصیل بذاتِ خود ایک داستان ہے، لیکن میں نے بیشتر تفاصیل طوالت کے خوف سے نظر انداز کر دی ہیں۔ البتہ اُن فلسفیانہ مقامات کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے جہاں مصنف نے آسمال کی وساطت سے جذبۂ حُبِّ وطن، فسادِ معاشرۂ ایران، خارجیوں (بیرونی قوموں) کے استحصال اور امریکنوں کے اخلاق کے نمونے پیش کئے ہیں اور یہ واضح کیا ہے کہ جہاں ایک طرف مشرقی ممالک اپنے عیوب و نقائص کی وجہ سے سربلندی حاصل نہیں کر سکتے، وہاں مغربی ممالک میں بھی ہر ایک چیز ایسی نہیں کہ مشرق والے بے سوچے سمجھے اسکی نقالی شروع کر دیں۔

اسی طرح اس سرکس میں جب شیر سدھانے والی عورت اپنا سر شیر کے مُنہ میں دے دیتی ہے تو آسمال تبصرہ کرتا ہے، "تمہارا کیا خیال ہے، اگر یہ شیر اس عورت کو کھانا چاہیں تو کھا نہیں سکتے؟ مولا کی قسم، ان کے لئے اسے کھا جانا پانی پینے کے برابر ہے، لیکن اصل بات یہ ہے کہ اس کا موقع نہیں"۔

ہالی وڈ میں ایک یہ لطیفہ ہوتا ہے کہ ایک ڈائریکٹر کی سکریٹری لانا جب آسمال کو عظیم الشان اور بلند و بالا پہاڑ دکھاتی ہے تو یہ کہنا بھول جاتی ہے کہ یہ مصنوعی ہیں۔ چنانچہ آسمال دوڑ کر فرطِ شوق سے ان پہاڑوں کی بلندیاں طے کرنے لگتا ہے اور کاغذ اور گتے کے پہاڑ اس کے بوجھ سے چرمُر ہو کر گر پڑتے اور وہ ان میں پھنس جاتا ہے!

الغرض اسی طرح کے کئی اور موقعے ہیں جہاں آسمال اپنے جاہلانہ فلسفے سے بڑے بڑے نکات پیدا کرتا ہے اور ان سے بڑے اہم اخلاقی و سیاسی نتائج

اخذ کرتا ہے۔ اِن تمام بیانات میں جہاں اپنی عقب ماندہ معاشرت اور ملّی فسادات کے متعلق طنز و مزاح کی باتیں کہی ہیں، وہاں خارجیوں کی پُر فریب ریشہ دوانیوں کو بھی بے نقاب کیا ہے ؛

کتاب کی زبان کے کچھ نمونے پیش کئے گئے ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تہران کے عوام میں جو زبان مقبول ہے اس کی شکل کیا ہے۔ تلفظ کی تبدیلی کے علاوہ اس میں مقامی اصطلاحات، لغات اور امثال کی فراوانی ہے اور لسانی اعتبار سے یہ ایسا سرمایۂ زبان ہے جس کے متعلق فارسی کی کتابیں اور لغات اب تک خاموش تھے۔ حسین مدنی نے پہلی مرتبہ اس قیمتی ذخیرہ کو نہایت کامیابی سے سفینۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ یہ ذخیرہ خالص علمی تحقیق کا متقاضی ہے۔ فی الحال صرف ایک دلچسپ اطلاع پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جس وقت آقائی حسین مدنی "اسمال در نیویورک" کی تین جلدیں لکھ کر فارغ ہو چکے اور "اسمال در ہندوستان" لکھ رہے تھے (یہ کتاب بھی اب شائع ہو چکی ہے) تو راقم نے "اسمال در نیویورک" کے متعلق اُنہیں مبارکباد دیتے ہوئے کہا: "آپ نے امریکہ کی سیاحت سے خوب فائدہ اُٹھایا۔" آپ نے ایک لحظہ خاموش رہ کر کہا: "لیکن میں تو کبھی امریکہ نہیں گیا!" ؛

●

ہمارے صحرائی نغمے ——— بقیہ : ص ۴۲

یہاں کی ہر لڑکی ایسی ہی غیور اور خود دار ہوتی ہے۔ اب اس سامنے والی دوشیزہ ہی کو دیکھ لیجئے۔ ڈھکسی اور پر رکھی ہوئی ہے۔ یہ نوجوان جو اس سے مخاطب ہے اسے اپنی جانب راغب کرنا چاہتا ہے، صاف لفظوں میں پھر بھی نہیں کہہ سکتا کس طرح علامتی طور پر اپنے رقیب کے معاملہ میں اپنے حسن کی برتری جتا رہا ہے

"صندل کے درخت کی باڑ لگا
اے پگلی! نیم کی باڑھ میں کیا رکھا ہے
صندل کی خوبی تو نہیں جانتی،
پھل توڑ کر مزہ چکھ لے"

لیکن لڑکی پر کوئی داؤں نہیں جمتا۔ وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہے، جواب سنئے:

میرا دل تو نیم کے ساتھ ٹھک گیا ہے
اگر کڑوا بھی ہو تو میں اسی کو چکھوں گی!

ماروی کی روح اب بھی ان دوشیزاؤں میں سرایت کی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ عمرکوٹ ہے۔ ریگستان اور سبزہ زار کے درمیان حدِ فاصل بستی کے ایک طرف لہلہاتے کھیت ہیں، کھیتوں کے کنارے پرانا قلعہ اور بستی ہے، دوسری طرف اونچے نیچے ریگستانی ٹیلے، دیکھنا! وہ اس ٹیلے پہ ایک چرواہا الغوزہ پر سُر ماروی کی دُھن الاپ رہا ہے۔ کتنا دلکش ہے یہ نغمہ! سنتے جائیے ..... سنتے جائیے ....! ؛

خوشبو ——— بقیہ : ص ۵۳

مقام پر ایک چادر ڈال کر پھیلا دئے جائیں۔ صبح تک اِن پھولوں کی دیکھ بھال اس طرح کی جائے کہ اگر پھول ذرا بھی کملانے لگیں تو اُن کو فوراً تلوں سے علیحدہ کر لیا جائے اس لئے کہ کملا جانے کے بعد اُن کی خوشبو میں فرق آجاتا ہے اور یہ فرق فوراً تلوں کو متاثر کرتا ہے۔ دوسرے دن اِن تلوں کو دھوپ میں پھر خشک کیا جائے تاکہ اُن میں دوبارہ قوّتِ جاذب پیدا ہو جائے۔ الغرض اس عمل سے تلوں کو اتنی بار بسایا جائے کہ اُن کا شکم پھولوں کی خوشبو سے بھر جائے۔ اب اِن معطر تلوں کو کولہو میں پِلوا لیجئے، تیل حاصل ہو جائے گا۔ اِن تلوں کا پھوک کھلی کہلاتا ہے۔ یہ بھی کارآمد چیز ہے۔ اُبٹنے میں ڈالی جاتی ہے۔ کولہو کی ایک گھانی میں تقریباً نو سیر تیل نکلتا ہے ؛

خوشبو

سیّد یوسف بخاری

قدرت نے انسان کو جو ظاہری اور باطنی حواس بخشے ہیں ان میں دیکھنے اور سونگھنے کی بھی دو قوتیں ہیں۔ چنانچہ پھولوں کی رنگینی اور خوشبو سے محبت کرنا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ ابتدا میں انسان درختوں کی چھالوں اور جڑوں یا گل و برگ سے خوشبو حاصل کرتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ پھولوں اور خوشبوؤں کا محقق اور موجد ہو گیا۔ اس نے پھولوں سے عرق کشید کئے، عرق سے روح حاصل کی اور عطر اور مختلف بخورات وغیرہ ایجاد کئے۔ ان کا پہلا مبصر اور موجد کون تھا، یہ ابھی تحقیق کرنا محال ہے۔ مشہور ہے کہ عطرِ گلاب جہانگیر بادشاہ کی ملکہ نور جہاں کی ایجاد ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ مغل بادشاہوں اور ان کی بیگمات کو رنگ و بو سے عشق تھا۔ آئینِ اکبری میں ابوالفضل نے اکبری عہد کے اُن دلکش مرکبات کی ایک منتخب فہرست پیش کی ہے جو طرح طرح کے خوشبودار پھولوں اور مختلف مشمومات کے امتزاج سے تیار کئے جاتے تھے۔ ان مرکبات میں کئی خود اکبر کے ایجاد کردہ تھے ؎

خوشبو کی یوں تو آج تک کوئی مخصوص تاریخ مرتب نہیں ہوئی لیکن مختلف تاریخی کتب میں اس کے متعلق کافی خام مواد ملتا ہے۔ چنانچہ تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ افریقہ کی وحشی اقوام میں خوشبو کا استعمال موجود تھا وہ لوگ اپنے جسموں پر مختلف اقسام کے روغن ملا کرتے تھے۔ اسی طرح قدیم مصری تہذیب میں بھی خوشبو کا عام رواج تھا۔ اہلِ مصر خوشبوؤں کے ذریعہ اپنی لاشوں کو محفوظ کرتے تھے۔ ہزاروں برس گزرنے کے بعد جب لاشوں کو تابوتوں میں سے نکال کر دیکھا گیا تو وہ نہ صرف صحیح و سالم نکلیں بلکہ اُن مردہ اجسام سے خوشبوئیں پھوٹ رہی تھیں۔ الغرض جب مصری تہذیب اپنے شباب پر تھی تو مصریوں کی دولت کا اکثر و بیشتر حصہ کھنچ کھنچ کر عرب اور بالخصوص ایران جاتا تھا، کیونکہ یہ دونوں ممالک اہلِ مصر کو مختلف خوشبودار پھول اور برگ و بیخ کافی مقدار میں بھیجتے تھے ؎

مصریوں کے بعد یہودیوں میں بھی خوشبو کا رواج ہوا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں خوشبوؤں کی تجارت کافی عروج پر تھی۔ اسی طرح عیسائی اقوام بھی مشمومات کی شائق اور گرویدہ تھیں۔ انجیل کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں بالوں کا گھونگریالہ بنانا، سرمہ لگانا اور خوشبو کا استعمال ان کی معاشرت میں داخل تھا ؎

اہلِ عرب جو کیمیا کے موجد ہیں سب سے پہلے انہوں نے خوشبودار جڑی بوٹیوں سے مختلف عرق تیار کئے۔ چنانچہ عرقِ گلاب انہی کی ایجاد ہے۔ عربوں کے اس شوقِ ایجادات کو یونانیوں نے فروغ دیا۔ انہوں نے جڑی بوٹیوں کے علاوہ برگ و بار کی بھی چھان بین کی اور متعدی امراض کا علاج مشمومات کے ذریعہ شروع کیا۔ ایک دفعہ جب طاعون پھوٹا اور اموات کی تعداد سینکڑوں اور ہزاروں تک پہونچنے لگی تو اس وقت اس کا علاج خوشبو تجویز کیا گیا۔ ہر گھر میں بخورات کا استعمال کیا گیا جس کے نتیجہ میں طاعون کی وبا دور ہو گئی۔ اسی طرح ملکہ الزبتھ بھی دارچینی کا ایک مرکب روزانہ استعمال کرتی تھی تاکہ متعدی امراض سے محفوظ رہے ؎

خوشبو کا مسئلہ جنسیات سے بھی گہرا تعلق رکھتا ہے۔ خوشبو سے دماغ میں ایک لطیف ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ افسردہ اور مضمحل عناصر یک بیک کروٹیں لیکر ایک نئی زندگی پاتے ہیں اور سرور کی دعوت دیتے ہیں، وہ دعوت جس پر افزائشِ نسلِ انسانی موقوف ہے ؎

بعض اصحاب عطر لگانے کے بعد دردِ سر کی شکایت کرتے ہیں۔ عطر خراب ہو تو دوسری بات ہے لیکن خوشبو تصور وا نہیں۔ نازک اور ضعیف مزاج لوگوں کو چاہئے کہ وہ تیز و تند مشمومات اختیار کرنے کی بجائے سُبک اور بھینی بو باس والے عطریات استعمال کریں ؎

خوشبو کی دولت سے پاکستان بھی خوب مالامال ہے۔ کشمیر سے کئی لاکھ پونڈ خوشبودار پھول اور مختلف جڑی بوٹیاں مختلف ممالک میں بھیجی جاتی ہیں۔ بھارت میں قنوج، جونپور، غازی پور، سکندرہ پورا اور بلیا پھولوں کے لئے کافی مشہور ہیں۔ گلیوں اور کوچوں میں جہاں تیل اور عطر کشید کرنے کے کارخانے قائم ہیں جس طرف بھی نظر ڈالو پھولوں کے ایسے انبار دکھائی دیں گے جن کو تیل اور عطر کشید کرنے کے بعد باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ پھر بھی وہ راہ گیروں کی مشام نوازی کرتے

ہی رہتے ہیں ÷

پاکستان میں خوشبو کا عام اور قدیم رواج ہے۔ ہمارے ہاں لوگ خوشبو صرف سونگھتے اور لگاتے ہی نہیں بلکہ مذہب و معاشرت کے تقریباً ہر شعبہ میں اسی کا استعمال ہے۔ یہاں تک کہ مرنے کے بعد بھی خوشبو ساتھ رکھی جاتی ہے۔ ہندوؤں میں پھول اور مختلف مشمومات دیوی دیوتاؤں کا مقدس چڑھاوا ہیں۔ روزمرہ کی پوجا پاٹ کے علاوہ ان کی خاص عبادت "ہَون" میں بے تحاشا خوشبوئیات جلائی جاتی ہیں۔ ہولی، دیوالی، جنم اشٹمی کے مذہبی تہواروں اور متبرک اشنانوں کے موقعوں پر خوشبودار رنگ، پھول، صندل، سیندور اور دیگر خوشبوؤں کو طرح طرح سے کام میں لایا جاتا ہے۔ شادی یا لگن کی رسومات میں بھی پھولوں اور مشمومات کو مذہبی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ زیوراتِ گل کے علاوہ جو دولہا دولھن پہنتے ہیں "منڈھا" (منڈپ جس کے نیچے دولہا دولھن کو پھیروں کے واسطے بٹھایا جاتا ہے) بھی ہرے ہرے پتوں اور خوشبودار پھولوں سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ اس وقت دولہا دولھن کی پیشانی اور رخساروں سے ٹھوڑی کے نیچے تک جو لکیر (رولی) سے کھینچی جاتی ہے اسے "مروٹ" کہتے ہیں۔ یہ بھی مختلف خوشبویات ہی سے تیار کی جاتی ہے۔ مرنے کے بعد امیروں اور بڑے لوگوں کے مردے اکثر صندل کی لکڑیوں سے پھونکے جاتے ہیں۔ چوبِ صندل کے علاوہ دیگر خوشبوئیں بھی کام میں لائی جاتی ہیں۔ ستی ہونے والی عورتیں بھی ستی ہونے سے قبل لازمی طور پر پہلے نہاتی تھیں، پھر بناؤ سنگھار کرکے خوشبو لگاتی تھیں ÷

مسلمانوں میں خوشبو کا استعمال سنتِ رسولؐ ہے۔ حضرت عمرؓ کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: "اگر میں کوئی تجارت کرتا تو وہ خوشبو کی ہوتی"۔ سلطان صلاح الدین کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ جب بیت المقدس فتح کیا تو سلطان نے مسجدِ عمرؓ کو عرق گلاب سے غسل دیا تھا۔ شاید اسی روایت کی تقلید میں اکثر اولیاء اللہ کے مزارات کو اب تک عرق گلاب سے غسل دیا جاتا ہے اور غلافوں کو عطر سے معطر کرتے ہیں ÷

اسی ضمن میں حنوط اور ارگجے کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے ملتے جلتے دو مرکب مشمومات ہیں۔ "حنوط" عرق گلاب، کافور، صندل، مشک اور زعفران پر مشتمل ہوتا ہے۔ اسے غسل کے بعد میت کے جسم اور کفن پر لگاتے ہیں۔ غسل سے قبل اس کے سرہانے صندل یا لوبان کی دھونی اور اگر کی بتیاں سلگائی جاتی ہیں۔ "ارگجا" ـــــ "ارگجا" میں برادۂ صندل، مشک، کافور اور عنبر ہوتا ہے۔ عام دستور کے مطابق فاتحہ سوم کے روز کام میں لایا جاتا ہے۔ تدفین کے وقت بھی لوگ قبر میں پھول اور عرق گلاب ڈالتے ہیں۔ عام دنوں میں ہر جمعہ کو سال کے سال عیدین کے موقع پر، وعظ اور میلاد کی محفلوں میں اور محرم کی پُرسوز مجالس میں بھی پھولوں اور خوشبوؤں کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے ÷

شادی بیاہ کے موقعوں پر پھولوں اور خوشبوئیات کا بکثرت استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ شادی کی رسومات میں مہندی، اُبٹنا، سہاگ پُڑا اور عطر سہاگ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ مہندی ایک درخت کے پتے ہیں جس کو پیسنے کے بعد دلھنوں کے ہاتھ پیروں پر لگایا جاتا ہے۔ عام عورتیں اور بعض مرد بھی اسے لگاتے ہیں۔ اسکے استعمال سے ٹھنڈک ہوتی ہے اور جلد کا رنگ سرخ، خوشنما اور خوشبودار ہو جاتا ہے۔ اُبٹنا اصل میں جَو کا بُھنا ہوا آٹا یا کھلی ہوتی ہے جس میں ہلدی، چھیل چھبیلا، ناگرموتھا، بچ، بالچھڑ، تیزپات، پوست نارنگی جیسی خوشبودار اشیاء شامل کی جاتی ہیں، ان سب کو پہلے پانی میں گوندھتے ہیں اور پھر چنبیلی کے تیل میں آمیز کرکے دولہا دلھن کے جسم پر ملتے ہیں۔ ساچق کی رات کو تمام مہمانوں اور گھر والوں کے درمیان اس اُبٹنے سے خوب ہولی کھیلی جاتی ہے۔ اُبٹنے سے رنگ خوب صاف ہوکر نکھر جاتا ہے۔ سہاگ پُڑا، سرخ ریشمی کاغذ کا ایک بڑا پُڑا ہوتا ہے جس پر گوٹا کناری کے پھول ٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔ امیر امراء اسے چاندی کا بنواتے ہیں۔ اس پُڑے میں چھیل چھبیلا، ناگرموتھا، بالچھڑ، چھوٹی الائچیاں، کپور کچری، لونگ، بیج چنبہ، ہلدی، جوز، جوتری، تیزپات، صندل، زعفران، مشک دانہ اور مستی کی پڑیاں ہوتی ہیں۔ مستی میں بل کھڑی، لوچن، کسیس اور دو تین خوشبوئیں ہوتی ہیں۔ ان مشمومات کو ریت رسم کے موقع پر دولہا دلھن اور سات سہاگنوں سے حصولِ خوشبو اور نیک شگون کے لئے دلھن کی مانگ میں بھرواتے ہیں۔ اس سہاگ پڑے کے ساتھ سہاگ کا عطر، خوشبودار تیل اور عرقِ گلاب بھی ہوتا ہے۔ سہاگ کا عطر کم و بیش اُنہی خوشبوئیات پر مشتمل ہوتا ہے جو سہاگ پڑے میں ہوتی ہیں۔ اس کی خوشبو نہایت بھینی اور مست کن ہوتی ہے۔ اسے عطرِ مجموعہ بھی کہا جاتا ہے ÷

ماکولات اور مشروبات میں خوشبو کا استعمال: کھانے اور پینے کے متعدد طریقے ہیں۔ پہلے ماکولات کو لیجئے جن سے بادشاہوں اور ان کے وزراء و امراء کے دسترخوان ہمیشہ پُر رہتے تھے اور آج بھی کم و بیش آراستہ کئے جاتے ہیں۔ یہ

کھانے، روٹی، سالن، پکوان، مٹھائی، اچار اور مربہ وغیرہ پانچ اقسام پر مشتمل ہیں۔ طعام کا حسبِ ضرورت معطر ہونا بھی ضروری ہے۔ اس مقصد کے لئے صاحبِ فنِ رکابداران ماکولات کی تیاری میں لونگ، فلفل سیاہ، الائچی کلاں، زیرہ، کشنیز، اجوائن، میتھی، چوب زرد اور ہینگ جیسے خوشبودار مسالوں کے علاوہ مشک، زعفران، الائچی خورد، دار چینی، جوز، جوتری، تیزپات، گلاب اور کیوڑہ وغیرہ مشمومات استعمال کرتے تھے۔ تیاری کے بعد ان پر ورقِ طلا و نقرہ لگا کر گلاب اور کیوڑہ بھی چھڑکا جاتا تھا اور دسترخوان پر گلدانوں میں شگفتہ اور خوشبودار پھول رکھے جاتے تھے۔ کچھ عرصہ ہوا ایک شادی کی تقریب میں اُجڑی ہوئی دِلّی کے ایک دل جلے اور من چلے صدیق نامی باورچی نے فنِ رکاب داری کا ایک نادر نمونہ پیش کیا تھا۔ دعوت کے کھانوں میں اتفاق سے زردے کی کچھ کمی پڑ گئی۔ رات کے گیارہ بارہ بجے کا وقت، بازار بند، دوکانیں بند۔ کھانا کھلانے کا دور جاری، کھڑے کھڑے کیا انتظام ہوتا۔ صاحب خانہ گھبرائے۔ صدیق بولا، سرکار ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔ چاول اور زعفران تو موجود ہی ہے۔ گھر سے صرف ایک سیر سوا سیر گھی لا دیں۔ دس سیر چاولوں کی ایک دیگ کا پکانا ہی کیا۔ ہاتھ کے ہاتھ ابھی تیار کئے دیتا ہوں۔ صاحب خانہ فوراً گھی لے آئے۔ تھوڑی دیر بعد باورچی صاحب نے اس گھی سے زعفران کا بگھار دیکر چاول اُن کے حوالہ کئے۔ مہمانوں نے جب اُن چاولوں کو کھایا تو الٹا گھی زائد بتایا اور بے تحاشا تعریف کی۔ اس طرح میاں صدیق نے ادھر تو مہمانوں کو خوش کیا اور ادھر صاحبِ خانہ کی لاج رکھی۔

یہاں سفرنامہ ابن بطوطہ کے دو تین اقتباسات یقیناً دلچسپ ہوں گے، سلطان محمد تغلق کے دربارِ عام کے دسترخوان کی کیفیت ملاحظہ ہو:

"کھانے سے پہلے شربدار طلائی و نقرئی ظروف میں خوشبودار شربت پلاتے ہیں۔ شربت کے بعد کھانا شروع ہوتا ہے۔ کھانے کے بعد قلعی کے پیالوں میں نبیذ پلائی جاتی ہے۔ آخر میں پان چھالیہ لاتے ہیں۔ ہر مہمان کو ایک لپ بھر چھالیہ اور پندرہ پانوں کا بیڑہ دیا جاتا ہے جس پر سرخ ریشمی دھاگہ بندھا ہوا ہوتا ہے۔"

آگے چل کر جزیرہ سلیمان امیر البحر جزائر مالدیپ کی دعوتوں کا حال اس طرح پیش کرتا ہے:

"کھانا کھانے کے بعد یہ لوگ مختلف خوشبوؤں سے معطر کیا ہوا ناریل کا شہد پیتے ہیں، یہ شہد کھانے کو خوب ہضم کرتا ہے۔ پھر کھانا آیا۔ کھانے کے بعد پان چھالیہ لائے۔ اس کے بعد ایک طشتری میں مقاصری صندل آیا۔ جب کوئی جماعت کھانا کھا چکتی ہے تو اس کو صندل پیش کیا جاتا ہے۔"

طوالسی[1] کی ملکہ اردجا کی ملاقات اور خاطر داری کے متعلق لکھتا ہے۔

"وہ تخت صندل کی لکڑی کا بنا ہوا تھا جس پر سونے چاندی کے پترے جڑے ہوئے تھے۔ اس تخت پر سونے کے برتن مٹکوں، خموں اور لوٹوں کی شکل کے رکھے ہوئے تھے۔ ناخدا نے مجھے بتایا کہ ان سب میں شربت ہے جو شکر اور مختلف خوشبوؤں پر مشتمل ہے۔ اس کو کھانے کے بعد پیتے ہیں۔ یہ مفرح، شیریں اور ہاضم ہوتا ہے۔ اشتہا اور قوت باہ کو بڑھاتا ہے اور منہ کی بدبو کھوتا ہے۔ پھر ملکہ نے حکم دیا کہ مجھے تحائف پیش کئے جائیں۔ ان تحائف میں چند پارچہ جات قیمتی، دو ہاتھی، دو جاموش (ارنا بھینسا)، چاول اور گلاب کے چار رطل تھے۔ اس کے علاوہ چار بڑے بڑے مرتبان بھی دئے گئے جن میں ادرک، لیموں، مرچ اور آم کا اچار تھا۔"

ان اقتباسات سے واضح ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری مطابق چودہویں صدی عیسوی میں مشروبات میں کون کون سی چیزیں شامل تھیں اور ان میں خوشبو کو کس قدر دخل تھا۔ قبل و مابعد غدر بھی بادشاہوں، نوابوں اور امرائے شہر کے آبدار خانے ہوا کرتے تھے۔ اس زمانے میں برف نہ تھی جس کے بغیر موسم گرما میں پانی کا ٹھنڈا کرنا ایک بہت ہی دشوار امر تھا۔ اس مقصد کے لئے دیگر انتظامات کے علاوہ مٹی کے کورے ظروف میں پانی بھر کر رکھا جاتا تھا۔ پھر ان پر آب آلودہ سرخ کپڑے، کپڑوں پر مونیا اور چنبیلی کے گجرے ڈالے جاتے تھے۔ آجکل بھی اس عمل کے علاوہ تشنگی رفع کرنے کے لئے گرمیوں میں مختلف شربتوں اور ٹھنڈائیوں میں عرق گلاب، کیوڑہ، بید مشک، تخم ریحاں، فالزہ اور تخم بالنگو ملا کر پیتے ہیں۔ جسمانی طور پر ٹھنڈک اور فرحت حاصل کرنے کے لئے غسل کے پانی کو بھی عطر سے معطر کیا جاتا ہے۔ عورتیں پھولوں کی بالیاں اور مرد کنٹھے پہنتے ہیں۔ ٹیسو کے خوشبودار پھولوں اور ملاگیری صندلی رنگوں سے عورتیں اپنے دوپٹے رنگتی اور اوڑھتی ہیں۔ تکیوں اور

---

[1] طوالسی: ملک چین کے صوبہ ٹانکن اور کاٹن کے درمیان ایک صوبہ کوئنسی ہے جو سمندر کے ساحل پر جزیرہ ہینان کے سامنے واقع ہے۔

سیجوں پر پھولوں کی چادریں بچھائی اور عطر میں بسائی جاتی ہیں۔

ماکولات اور مشروبات کے ضمن میں ابن بطوطہ نے پان چھالیہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ حضرت امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمۃ نے بھی پان کی تعریف فرمائی ہے ؎

نادرہ برگے چو گل ہندوستان — خوب تریں میوۂ ہندوستاں
گرسنہ را گرسنگی کم شود — سیر خورد گرسنہ در دم شود

پان بجائے خود ایک خوشبودار برگ ہے۔ اس کے کھانے سے منہ صاف اور خوشبودار ہو جاتا ہے۔ اگر اعتدال کے ساتھ کھایا جائے تو اس کا چونا دانتوں کی جڑوں کو بھی مضبوط کرتا ہے۔ سخت تشنگی اور بھوک کے عالم میں یا اس کے برعکس حالت میں استعمال کیا جائے تو عارضی طور پر بیقراری دور ہو جاتی ہے۔ پان سے متعلق دوسری چیز کتھا ہے جو بجائے خود نہایت کڑوی، کسیلی اور بدمزہ چیز ہے۔ پان میں اسے صرف چونے کی تیزی مارنے اور اچھا رنگ پیدا کرنے کی غرض سے استعمال کیا جاتا ہے۔ کتھے کی کڑواہٹ اور کسیل پن دور کرنے کے لئے زمانہ قدیم میں صرف کافور اور مشک کی آمیزش کی جاتی تھی لیکن یہ طریقہ مفید ثابت نہیں ہوا۔ اس سے صرف خوشبو پیدا ہو گئی اور تلخی کم و بیش اپنی جگہ قائم رہی۔ اب سے ۳۰ یا ۴۰ برس پہلے اہل لکھنؤ نے ایسی جدت سے کام لیا کہ کتھا کی ساری خرابی دور ہو گئی۔ ساتھ ہی ساتھ لطیف اور خوش رنگ بھی ہو گیا۔ ترکیب یہ ہے کہ ایک تسلے میں کچھ راکھ بھر کر اس پر ایک خشک کپڑا ڈالتے ہیں۔ اس کپڑے پر جوش کردہ کتھے کو رقیق حالت میں چاروں طرف پھیلا دیتے ہیں۔ اب اس پر بار بار پانی چھڑکتے ہیں۔ اس پانی کی مدد سے کتھے کی سرخی، جو فی الاصل کتھے کا تلخ جوہر ہوتا ہے، آہستہ آہستہ کپڑے کے نیچے راکھ میں جذب ہو جاتی ہے۔ اس عمل سے کتھا اپنی تلخی اور رنگ کھو کر نہایت سفید اور عمدہ نکل آتا ہے۔ شوقین مزاج اس میں کیوڑہ، مشک اور عنبر بھی ڈالتے ہیں۔ پھر خشک کر کے کام میں لاتے ہیں۔

کتھے کی بہ نسبت چھالیہ تمام تر کسیلی نہیں ہوتی۔ اس کا مغز نہایت لطیف، خوش مزہ اور رُسباک ہوتا ہے۔ البتہ اس کا بالائی اور بالائی سے زائد نیچے کا حصہ کسیلا ہوتا ہے۔ اس کو دور کرنے کے لئے پہلے تو صرف اس عمل پر اکتفا کیا گیا کہ چھالیہ کی ڈلیوں کو دودھ میں جوش دے کر سکھا لیا، جس سے اس کی تلخی اور خشکی دور ہو گئی اور ذائقہ لطیف ہو گیا۔ بعد ازاں یہ جدت کی گئی کہ اصل چھالیہ کے بالائی اور زیریں حصہ کو کاٹ کر اس کی دو رخی خوشنما کٹوریاں سی بنا لیں، پھر انہیں کتھے میں ڈال کر اتنا پکایا کہ وہ کتھا ان کٹوریوں میں اچھی طرح جذب ہو جائے۔ اب اگر خوشبو مقصود ہوئی تو اسے عرق کیوڑہ میں بسا لیا۔ اس ترکیب سے کتھا لگانے کی زحمت بھی جاتی رہی اور چھالیہ ملائم اور خوشبودار ہونے کے علاوہ ذائقہ دار بھی ہو گئی۔

الائچی ایک خوشبودار پھل ہے جسے پان کے ہمراہ بھی کھایا جاتا ہے۔ لکھنؤ میں ان الائچیوں کے ساتھ مختلف جدتیں کی گئیں۔ الائچیوں کے چھلکوں میں خوشبودار رنگ بھر دیا گیا تاکہ پان کے ساتھ ان الائچیوں کو کھانے سے منہ اور بھی زیادہ سرخ ہو جائے۔ عورتوں کے لئے ان الائچیوں میں رنگ کی بجائے مسّی بھرنے لگے تاکہ ان کے لب و دہن خود بخود مسّی آلودہ اور معطر ہو جائیں۔ خاص موقعوں پر اظہارِ تکلف کے لئے ان الائچیوں پر سونے چاندی کے ورق لگانے لگے۔ اس الائچی کے متعلق لال قلعہ دہلی کی ایک رسم کا حال بیان کرنا بھی خالی از لطف نہ ہو گا۔ بیگمات قلعہ جب کسی نواب زادی کو اپنی دینی بہن بنانا چاہتی تھیں تو وہ ایک دوسرے کو الائچی کے دانے کھلاتی اور کھاتی تھیں۔ چنانچہ مشہور ہے کہ مرزا فخرو ولیعہد بہادر کی والدہ نے ایک نواب زادی سکینہ بیگم کو "الائچی بہن" بنایا تو اس خوشی میں اُن کو ایک گاؤں بخشا گیا جو آج تک الائچی پور کے نام سے مشہور ہے۔ یہ گاؤں پرگنہ لونی تحصیل غازی آباد، ضلع میرٹھ میں واقع ہے۔

پان کے لوازمات میں آخری چیز زردہ یا تمباکو کو بھی خاص دخل ہے۔ تمباکو ہند اور پاکستان میں ایک مدت دراز سے پان کے ہمراہ پتی کی صورت میں خشک کھانے کا رواج چلا آتا ہے۔ تمباکو کی بدبو اور کڑواہٹ کو لطافت اور خوشبو سے بدلنے کے لئے اہل لکھنؤ اور مراد آباد نے تمباکو کی پتی اور ڈنٹھلوں کو ابال کر اس کے عرق میں خوشبوؤں کو شامل کیا اور اُسے کوٹ پیٹ کر دانہ دار بنایا، جس کی بدولت پتی کے تمباکو کا رواج اب تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ منشی سید احمد حسین لکھنوی نے اس سلسلہ میں ایک اور قابل تعریف ایجاد قوام کی صورت میں پیش کی۔ تمباکو کے پتوں اور ڈنٹھلوں کا پہلے عرق نکالا، پھر اُسے اتنا گاڑھا کیا کہ وہ بالکل نئی سا بن گیا، اب اس میں مشک و زعفران، کیوڑہ اور دیگر خوشبوئیں ملا کر اسے نہایت لطیف اور معطر قوام بنا لیا۔ مقدار کے مطابق اسی قوام کی ننھی ننھی گولیاں اور ان گولیوں پر ورق نقرہ و طلا چڑھا کر انہیں اور بھی خوشنما بنا دیا۔ آخر میں قوام سے بالاتر ایسی مدبّر معطر پتی ایجاد کی جس کی لذت پے در پے پیکیں تھوکنے کے باوجود آخر تک زائل نہیں ہوتی اور پان کا ذائقہ برقرار رہتا ہے۔ تمباکو حقہ کے ذریعہ پیا بھی جاتا ہے، جو خاص اہل دہلی کی قدیم ایجاد ہے۔

حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ نے حقہ کے متعلق کیا خوب پہیلی فرمائی ہے :

باہنی واکی جل بھری ۔۔۔ اور اوپر جاری آگ
جب ہی بجائی بانسری ۔۔۔ نکسو کا رو ناگ

تمباکو کے خمیرہ کے ساتھ ہیں خوشبو کے طبی استعمالات کی یاد آتی ہے ۔ اگرچہ مشروبات کے ضمن میں ہم عرق گلاب، کیوڑہ اور بیدمشک وغیرہ کا ذکر کر چکے ہیں لیکن اُن عرقوں اور شربتوں کے علاوہ دیگر مرکب ادویات میں بیسیوں ایسے روغن، خمیرے، معجونیں، کشتے، سفوف، خضاب، مرہم اور طلاجات ہیں جن میں بہت سی مشمومات استعمال کی جاتی ہیں ۔

انہی خوشبوؤں کو کئی طرح سے جلاتے بھی ہیں ۔ مثال کے طور پر جن نفیس مزاجوں کو گیس یا بجلی کی تیز اور چندھیا دینے والی روشنی اور مٹی کا بدبودار تیل ناپسند ہے وہ بلّوری فانوسوں میں یا تو موم اور کافوری شمعیں روشن کرتے ہیں یا پھر روغنِ گلاب جلاتے ہیں جس کی روشنی نہایت ٹھنڈی اور خوشگوار ہوتی ہے ۔ کسی کا شعر ہے ؎

اللہ رے ہمارا تکلف شبِ وصال ۔۔۔ روغن کے بدلے عطر جلایا گلاب کا

خوشبوئیں جلانے کی ایک دوسری صورت بخورات (دھونی) کی بھی ہے ۔ معمولی دھونی اگر کی بتیوں اور لوبان کے جلانے سے حاصل ہو جاتی ہے ۔ اگر اس سے زیادہ درکار ہو تو انگیٹھیوں میں مختلف شمیم انگیز مسالے ملائے جاتے ہیں ۔ شہنشاہ اکبر کے محل میں سونے اور چاندی کی ایسی کئی انگیٹھیاں تھیں جن میں عود و عنبر کے علاوہ روح افزا، کشتہ، بخور، اور فتیلہ وغیرہ کئی مرکب مشمومات ٹکیوں اور قرصوں کی صورت میں جلائی جاتی تھیں ۔

ابن بطوطہ اپنے سفرنامہ میں سلطان محمد تغلق کے دیوان خانے کی ایک انگیٹھی کا اس طرح تعارف کراتا ہے :۔

" عید کے دن بڑی انگیٹھی باہر نکالتے ہیں ۔ وہ شکلِ بُرج خالص سونے کی ہے اور مختلف ٹکڑوں پر مشتمل ہے ۔ جب اُسے کام میں لانا ہو تو یہ ٹکڑے مل کر انگیٹھی بن جاتے ہیں ۔ اس میں تین خانے ہوتے ہیں اتنے بڑے بڑے کہ اُن میں فراش داخل ہو کر عود، الائچی اور عنبر جلاتے ہیں جس کی خوشبو سے تمام دیوان خانہ مہک اُٹھتا ہے ۔ غلاموں کے ہاتھوں میں سونے اور چاندی کے گلاب پاش ہوتے ہیں وہ حاضرینِ دربار پر گلاب اور پھولوں کے عرق چھڑکتے ہیں ۔"

بدر چاچ نے بھی ایک قصیدہ سلطان تغلق کے جشن کی تعریف میں لکھا تھا ۔ اس میں بھی اس طلائی انگیٹھی کا ذکر ملتا ہے :

زاں چار گوشہ مجمرِ زریں میانِ صحن ۔۔۔ کز بوئے او مشامِ ملائک معطر است
دُودش سوادِ دیدۂ حورانِ جنّت است ۔۔۔ عطرش بخارِ غالیۂ حوضِ کوثر است

بخورات کے اِن دلکش مرکبات کے علاوہ اکبر بادشاہ نے اور بھی کئی مرکبات ایجاد کئے تھے ، مثلاً سنوک سر دھونے کے لئے ۔ اُبٹنا ہاتھوں کے واسطے ۔ ارگجا اور گلِ کامہ جسم کی مالش کے لئے ۔ غسول آبِ غسل کو مفرح اور معطر بنانے کے لئے ۔ عبیر مایہ اور عبیر اکسیر کپڑوں پر چھڑکنے کے لئے تاکہ اُن میں مہک پیدا ہو اور کیڑوں سے محفوظ رہیں ۔ "آئینِ اکبری" میں ان تمام مرکبات کی مشمومات، اوزان اور بنانے کی ترکیبیں نام بنام الگ الگ تحریر کی ہیں لیکن ہم بخوفِ طوالت انہیں یہاں حذف کرتے ہوئے صرف وہ جداول پیش کرتے ہیں جو اُن تمام مشمومات، گلہائے خوش رنگ اور خوشبو کو ظاہر کرتی ہیں ۔ ان مرکبات کے اجزائے ترکیبی ہیں ۔

جدول مشمومات (۱) عنبر اشہب (۲) زباد (۳) مشک (۴) عود ہندی (اگر) (۵) چوہ (۶) کافور بھیم سینی (۷) مید (۸) زعفران (۹) زعفران گندی (۱۰) زعفران کشمیری (۱۱) صندل (۱۲) نافۂ مشک (۱۳) کلنبک (۱۴) سلارس (۱۵) عنبر لادن (۱۶) کافور چینبہ (۱۷) عرق بیدمشک (۱۸) عرق گلاب (۱۹) عرق فتنہ (۲۰) عرق بہار (۲۱) عرق چنبیلی (۲۲) بیخِ بنفشہ (۲۳) برگ ماج گجراتی (۲۴) سگندہ کوکلا (۲۵) لوبان (۲۶) الک (مہندی چھڑ) (۲۷) دوالک (چھڑیلہ) (۲۸) گینمہ (۲۹) سُعد (مونتھ) (۳۰) اکنلی (۳۱) زرنباد (۳۲) اظفار الطیب ۔

جدول گلہائے خوشبودار سیوتی (رنگ نباتی) چنبیلی (سفید اور زرد) رائے بیل (سفید قمری) مونگرا (سفید) چنپہ (زرد) کیتکی (سفید مائل بہ زردی) کیوڑہ (سفید مائل بہ زردی) چلتہ (سفید) گلال (سفید) تسبیح گلال (نباتی) بولسری (سفید پتیاں) سنگار ہار (پتی سفید ڈنڈی زرد) کوزہ (سفید) پاڈل (سفید و زرد) جوہی (نباتی) نواری (سفید) نرگس (سفید و زرد) گل شگوفہ (بنفشئی) گل کرتہ (سفید) کیورہ بیل (سفید قمری) گل زعفران (بنفشئی)

جدول گلہائے خوش رنگ گل آفتاب (زرد) گل کنول (سفید کبود) جعفری (زرد نارنجی) گڑاھل (سرخ و زرد) رتن منجنی (سرخ آتشیں) گیسو (سرخ آتشیں) کنیر (سرخ و سفید) کدم (زرد و سفید) ناگ کیسر (سفید زردی مائل) سرپن (سفید خطہائے سرخ و زرد) سری کھنڈی (سفید مائل بہ زردی بیرون سرخ) گل حنا (سفید سرخ و زرد) دوپہریا (سرخ) بھوئن چنپا (شفتالو) سدرسن (زرد) سینبل (سرخ) رتن مالا (زمرد) سوسن (زرد) گل مالتی (زرد) کرن پھول (زرد زریں) کریل (سرخ و سفید) جیت (زرد سرخ سیاہی مائل) چنبیلی (سفید) لاہی (زرد) گل کرونده (زرد) دھنتر (مانند گل نیلوفر) کنگلائی (سرخ و زرد) سرس (سبز مائل بہ زردی) سن (زرد) ۔

مذکورہ بالا مشہور اقسام کے علاوہ بے شمار گل و برگ اور بیج ہیں جن کو ضبط تحریر میں لانا دشوار ہے۔ تزک بابری، تزک جہانگیری، اقبال نامہ جہانگیری اور سفر نامہ ابن بطوطہ میں بھی ان کا بہت کچھ ذکر ملتا ہے۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ حکماء ہند کی تحقیق کے مطابق اگر ہر درخت کی صرف ایک پتی توڑ کر جمع کی جائے تو ان پتیوں کا وزن "اٹھارہ" بار اعم یعنی ۹۶ من رائج الوقت وزن کے برابر ہوگا۔ نیز یہ کہ ایک درخت کی زندگی دو گھڑی سے کم اور دس ہزار برس سے زائد نہیں ہوتی اور کوئی درخت ایک ہزار "جوجن"[1] سے زیادہ بلند نہیں ہوتا۔

ہمارا یہ مضمون نامکمل رہیگا اگر ہم مشمومات کے ضمن میں عطریات پر کچھ مزید روشنی نہ ڈالیں۔ فی الحقیقت حکماء نے خوشبوؤں کو پانچ صورتوں میں پیش کیا ہے پہلی صورت عرق کی ہے۔ دوسری روح کہلاتی ہے، تیسری روغن ہے، چوتھی عطر اور پانچویں بخورات کے سلسلہ میں سفوف اور اس کے متعلقات میں قرص اور بتیاں ہیں۔ ان تمام اقسام میں گھٹیا اور بڑھیا اصلی اور نقلی کا بنیادی فرق علیحدہ رہا۔ یہ اشیا اپنی جگہ خود یہ بتائیں گی کہ ان کے اجزائے ترکیبی اور ان اور کیمیاوی عمل بہ صحت اختیار کی گئی ہے یا نہیں اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے وہ دو چار روپے تولہ کی ہیں یا سو دو سو روپے تولہ کی۔

جہاں تک سفوف سازی کا تعلق ہے وہ صرف کوفتن، بیختن اور آمیختن پر منحصر ہے۔ پھر اس سفوف کو خواہ قرصوں کی شکل میں ڈھال لیجئے یا تیلیوں پر چپکا کر خوشبودار بتیاں بنا لیجئے۔ بقایا چیزوں میں عرق، روح، روغن اور عطریات ہیں۔ ان سب کو کشید کیا جاتا ہے۔ کشید کرنے کا عمل اہل فن کے نزدیک آسان اور انجان لوگوں کے لئے کافی مشکل ہے۔ آپ نے شاید عطاروں کو ایک نلکی کے ذریعہ دیگ اور بھبکہ سے عرق نکالتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ کشید کردہ عرق کو جب بار بار کشید کیا جاتا ہے تو وہ اس کی "روح" کہلاتا ہے۔ بس یہی صورت عطر کشید کرنے کی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عطاروں کی دیگ کا بھبکا خالی ہوتا ہے۔ اور عطر سازوں کے بھبکے میں ہمیشہ صندل رہتا ہے۔ اس لئے کہ ہر عطر کی زمین روغن صندل پر قائم کی جاتی ہے۔ دیگ میں پسندیدہ پھول اور خوشبوئیں اور ان کے وزن سے چار گنا زائد معمولی صاف پانی ہوتا ہے۔ دیگ کو دم پخت کرنیکے بعد اس کے نیچے آگ جلاتے ہیں۔ شدت حرارت کے باعث دیگ کی بھاپ قرمبیق (نلکی) کی راہ سے جس کا ایک سرا دیگ میں اور دوسرا بھبکہ میں ہوتا ہے، خارج ہو کر بھبکہ میں پہنچتی ہے، جس کے نیچے ٹھنڈے پانی کا خزانہ ہوتا ہے۔ یہ پانی گرم ہونے پر بار بار بدلا جاتا ہے تاکہ وہ گرم گرم بھاپ جس میں پھولوں اور خوشبوئیات کا جوہر (چکنائی) ملا جلا ہوتا ہے۔ بھبکہ میں پہنچکر خنکی کے باعث منجمد ہو جائے۔ چونکہ پانی تیل کو قبول نہیں کرتا اس لئے وہ چکنا جوہر منجمد حالت میں صندل کے تیل پر تیرنے لگتا ہے۔ اسی جوہر کو ہم عطر کہتے ہیں۔ اس جوہر کو روئی کے پھویوں سے جذب کر کے شیشوں اور کنٹروں میں بھر لیتے ہیں۔ اگر اس عطر کو زیادہ خوشبودار اور قیمتی بنانا ہو تو از سر نو تازہ پھولوں اور دیگر مسالہ جات کے ساتھ حسب معمول کشید کرنا پڑتا ہے۔ جتنی مرتبہ یہ عمل کیا جائے گا اسی قدر قیمتی اور خوشبودار عطر برآمد ہوگا۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عطر کی تعمیر مزاج میں صندل کا کوئی دخل نہیں۔ عطر کا مزاج ہمیشہ پھولوں اور دیگر مشمومات کے مزاج پر قائم ہوتا ہے جیسے عطر حنا اور موتیا کا مزاج گرم ہے اور گلاب، کیوڑہ اور چنبیلی کا سرد۔ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ صرف وہی عطر سڑے گا جس کی تعمیر پانی پر کی گئی ہو یا بے احتیاطی کے باعث اس میں پانی یا گرد و غبار چلا گیا ہو۔

تیل کشید کرنے کا طریقہ بہت آسان ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ تیل تلوں میں سے نکلتا ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ اگر ایک من تل ہوں اور چار من پھول تو بیس سیر کے قریب نہایت عمدہ تیل نکلے گا۔ طریقہ یہ ہے کہ پہلے تلوں کو دھوپ میں خوب خشک کر لیا جائے، رات کو وہ تمام تل تازہ پھولوں میں گڈمڈ کر کے کسی خشک

(باقی ۷۲ پر)

[1] "جوجن" اکبری عہد کا بلندی ناپنے کا پیمانہ۔

ہماری ڈاک

محبی خاور صاحب،

ماہ اکتوبر کا "ماہ نو" ویسے اپنی گوناگوں رنگینیوں اور لطافتوں سے بھرپور ہے، لیکن جناب ضمیر جعفری کے فکاہیہ مضمون "پروفیسر طاؤس" میں نہ جانے کونسی ایسی بات تھی کہ میری توجہ ایک دم سے ادھر مبذول ہوگئی۔ میں نے مضمون کو شروع سے آخر تک پڑھا، دلچسپی بڑھتی گئی اور ساتھ ہی ساتھ ذہن میں بہت سے خیالات پیدا ہوتے گئے۔ جعفری صاحب نے اپنے فکاہیہ مضمون میں پروفیسر طاؤس کا جو کردار پیش کیا ہے، وہ محض خیالی نہیں، حقیقی ہے۔ اس کی حیثیت علاقائی ہے کیونکہ ہمارے معاشرہ میں ایسے کرداروں کی کمی نہیں ہے۔ ہم ادب میں ایسے ڈھنڈورچیوں کو جانتے ہیں جن کو اس بات پر فخر ہے کہ وہ نیا ادب نہیں پڑھتے۔ انہیں صرف پرانے ادب، پرانی شخصیتوں اور روایتوں سے پیار ہے۔ "پروفیسر طاؤس" کی طرح ان ڈھنڈورچیوں کو بھی اس بات کی شکایت ہے کہ "نئی سائنسی ایجادات نے زندگی کو آسان کر دیا ہو تو کر دیا ہو مگر وہ چیز چھین لی ہے جس کو زندگی کا جوہر یا شہرت کہتے ہیں" یا یہ کہ دورِ حاضر میں اربابِ کمال کا فقدان ہے۔ ایسے لوگ دراصل زندگی کی برق رفتاریوں سے خوف زدہ ہیں۔ ان کا ذہن نئے حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ جعفری صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے بذلہ سنجی سے گزر کر بھرپور طنز اور حقیقت نگاری کا حق ادا کیا ہے۔

اتفاق سے اسی شمارہ میں محترمی اسد ملتانی صاحب کا ایک خط شائع ہوا ہے جس کے بین السطور دلچسپی سے خالی نہیں۔ اسد صاحب کو شکایت ہے کہ "زمانۂ قریب کے ان مرحومین کو دیکھ کر جب موجودہ دور پر نظر دوڑائی جائے تو قوم میں ایک عمومی ذہنی انحطاط کا پورا پورا الیقین ہو جاتا ہے۔" یہ احساس تمام تر اندازِ نظر اور رجحانِ طبع پر موقوف ہے۔ اگر موجودہ دور کے ادب، حالات اور انسانوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آج کی زندگی اور ادب میں اچھی خاصی حرکت ہے۔ فطرت کی تخلیقی صلاحیتیں کبھی سلب نہیں ہوتیں۔ کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون۔ پھر فطرت کو آج تخلیق سے معذور کیوں سمجھ لیا جائے؟ نئے ادب میں بھی کتنی ہی بلندیاں ہیں اور نئے ادیبوں میں بھی چکاچوند پیدا کرنے والے جوہر۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم ماضی ہی کے دھندلکوں میں کھوئے رہیں اور اس صبحِ فروزاں کی طرف رجوع نہ کریں جو حال اور مستقبل کا حصہ ہے؟

مخلص

یونس احمر

مدیر محترم، آپ کی خدمتِ عالی میں چند منتخب رباعیات جو غیر مطبوعہ ہیں ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ جناب والا ذرّہ نوازی سے کام لیتے ہوئے انہیں اپنے مؤقر جریدہ 'ماہِ نو' کراچی میں شائع فرمائیں گے۔ یہاں یہ ذکر کرنا بیجا نہ ہوگا کہ میں نئی پود کا ایک مشہور شاعر ہوں اور میرا کلام مختلف رسائل و اخبارات میں اکثر شائع ہوتا رہتا ہے ــــ میری یہ دلی تمنا ہے کہ کم از کم ایک مرتبہ 'ماہ نو' کراچی میں، ضرور میرا کلام شائع ہو۔

دوزخ میں بھلا کس کو جلانا ہے اسے
جنّت کو بہر حال بسانا ہے اسے
اس واسطے وہ ہم سے کراتا ہے گناہ
محشر میں کرم اپنا دکھانا ہے اسے

گرمی بھی گزر گئی نہیں آئے بالم
سردی بھی گزر گئی نہیں آئے بالم
افسوس کہ سہتے سہتے گرم و سردِ عالم
ہستی بھی گزر گئی نہیں آئے بالم!

کہتے ہیں کہ جنّت میں نگاریں ہوں گی
شیر و شراب کی جوئباریں ہوں گی
لیکن یہی سب کچھ جو یہاں مل جائے
دنیا ہی میں جنّت کی بہاریں ہوں گی!

نیرنگیٔ ادیان نظر آتی ہے
دنیا تری شیطان نظر آتی ہے
جب جنگ کے اسباب پہ کرتا ہوں نظر
ذہنیت انسان نظر آتی ہے

دانا اکبر آبادی

مولوی ابوالجلال ندوی کا مضمون "قدیم مہریں" پڑھ کر منصور احمد مرحوم و مغفور کا "ادبی دنیا" یاد آ گیا۔ اس دریافت پر ادارہ "ماہِ نو" مبارکباد کا مستحق ہے۔

ایس۔ ایم۔ اکبر، راولپنڈی

"یادِ ظفر علی خاں" ۔۔۔۔۔ بقیہ صفحہ ۱۲

سے آگے ہیں۔ اپنی نظم و نثر میں کہیں بھی ٹھوکر نہیں کھاتے۔ پنجاب نے ظفر علی خاں اور اقبال پیدا کر کے اپنے ماضی کی تلافی کر دی"۔

یہی ابتدا اور آخر میں مولانا سید سلیمان ندوی کی رائے تھی کہ "اردو ادب نے تین کامل الفن اُستاد پیدا کئے ہیں، محمد رفیع سودا، اکبر الٰہ آبادی، ظفر علی خاں۔"

مولانا ظفر علی خاں کے کلام میں واقعی سودا کی پختگی، روانی، الفاظ کا دروبست، تراکیب کی چستی اور فصاحت و بلاغت سب ہی اوصاف موجود ہیں۔ اُن کی نظموں میں جو دھوم دھام ہے اور ہجو ملیح کے جو نشتر چھپے ہیں، وہ اس دور کے کسی شاعر کے کلام میں نہیں ملتے۔

مولانا ظفر علی خاں کی شاعری کے موضوعات خاص ہیں عظمتِ اسلام، عشقِ رسولِ کریمؐ، حب الوطنی، خلوص و صداقت، انسانیت اور اصلاحِ اعمال و فلاحِ قوم زیادہ نمایاں ہیں۔ ان کے کلام کی ہر صنف میں مبالغہ و تصنع اور حشو و زوائد کا کہیں نام نہیں۔ جذبات میں انتہائی خلوص اور بیان میں غضب کی روانی و بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ ان کی سب سے بڑی اور انفرادی خصوصیت نئی زمینوں اور نئے قافیوں کی ایجاد ہے۔ غزل گوئی سے زیادہ انہوں نے نظم میں ید طولیٰ حاصل کیا اور ہر نظم کے لئے نئی زمین اور نئے قوافی تراشے۔ وہ ادائے مطلب کے لئے کسی دشوار سے دشوار قافیہ سے عاجز نظر نہیں آتے۔ مولانا کی ولولہ انگیز شاعری اپنی نظیر آپ ہے نثر کی طرح وہ مکتبۂ نظم کے بھی صاحب طرز ہیں۔ قوافی کی مشکل پسندی کا انداز ضرب المثل ہے۔ ایک نظم "منصوفانہ کنکوے بازی" میں فرماتے ہیں ؎

کرلیا میں نے انتظام ڈور کا اور پتنگ کا
چاہیئے مجھ کو اب فقط ایک پیالہ بھنگ کا

حلقۂ گردنِ نیاز بن گئے گیسوئے دراز
تنگ ہوا ہے سلسلہ شرع کے پاہنگ کا

کشورِ نور پر کیا خیلِ ظلام نے خروج
ڈالدیا ہے شیشہ سے سنگ نے ڈھنگ جنگ کا

وہم ہوا ہے سرنگوں عقل ہوئی ہے سرفراز
آئینہ کو نہیں رہا وسوسہ کچھ بھی زنگ کا

الفاظ و معانی کا اہتمام اور شان مولانا کے کلام کی خصوصیاتِ خاصہ میں شامل ہے۔ ایک قطعہ "طریقت کا کلام اللہ" ملاحظہ ہو:۔

کلام اللہ کی میں بھی تلاوت روز کرتا ہوں
مگر اس کے مصنف ہیں ابو اللیث سمرقندی

مری آنکھوں میں نقشِ مانی و بہزاد پھرتا ہے
مرا مسلک ہے ارژنگی مرا مشرب ہے پاژندی

دکھا دو جلوہ کثرت کا مجھے وحدت کے پردوں میں
کہ شرعِ مصطفےٰ کی ہو سکے مجھ سے بھی پابندی

مندرجہ بالا نظم اور قطعہ میں اصلاحِ عقائد کی طرف پُر زور اشارات ہیں اور ایک نظم "سنگٹھن کی چکی" اور شدھی کی چھلنی" جو مہاسبھائی تحریک شدھی کے دوران میں کہی گئی تھی، اس کے تیور اور الفاظ و قوافی کی آن بان قابلِ دید ہے ؎

صلاحیں کر رہے ہیں سنگھٹنے بیٹھ کر باہم
کہ بھارت کے سپوت اور مالوی جی کے بھگت بنئے

مسلماں گر اٹھائیں سر تو برسا دیجئے اینٹیں
اب اس میں خواہ ہوں اجمیرئیے یا ہوں سہارنیئے

مسلمانوں سے کہتے ہیں یہ شردھانند کے چیلے
کہ کچھ دن آپ بھی تو تختۂ مشقِ جفا بنئے

ہے چکی سنگٹھن کی آسرا شدھی کی چھلنی کا
جو گیہوں کی طرح پسئے تو آٹے کی طرح چھنئے

مولانا کی اسی بے پناہ طرز سے مخالفین پناہ مانگتے تھے۔

اسلام کی حقانیت اور مسلم کی فطرتِ آزاد کی عظمت کا بیان عجیب انداز میں فرماتے ہیں ؎

عجب انصاف ہے کالے کی تو گردن جھک جائے
لیکن اونچا رہے ہر حال میں سر گورے کا

فقط اسلام ہی دنیا میں ہے طاقت ایسی
ناطقہ تنگ جو کر سکتی ہے ہر گورے کا

اسی اللہ کے بندے کو مسلماں سمجھو
ڈگرے کا ہو جسے خوف نہ ڈنڈ گورے کا

غیر سیاسی شاعری کی مثال ایک نظم "بچھڑی ہوئی دلہن کی یاد" کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

ہاتھ بھی آیا مگر چھن بھی گیا دا حسرتا — گوہرِ نایاب دریائے عمیقِ زندگی
شمعِ داغِ دل سے روشن ہے شبستانِ فراق — آئی اور تڑپا گئی یادِ رفیقِ زندگی
کردیا ساری تمناؤں کو اس نے غرقِ خوں — روز کھلواتا ہوں فصد باسلیقِ زندگی
چند ٹکڑے چاند کے باقی ہیں اس کی یادگار — ہے انہی کے دم سے اب لطفِ حقیقِ زندگی

مولانا کے مجموعۂ کلام میں (۱) بہارستان (۲) نگارستان اور (۳) چمنستان شائع ہوئے جو صرف منتخب کلام پر مشتمل ہیں۔

مولانا بیحد پابندِ وضع اور سنجیدہ عادات و اطوار میں راسخ تھے۔ لاہور کے قیام کے آغاز سے لیکر جب تک چلنے پھرنے کی طاقت رہی علی الصبح لارنس گارڈن کی سیر اُن کے معمولات میں شامل تھی اور قائم رہی۔ اسی دوران میں جب بھی کسی شخص کو مولانا سے کسی اہم کام کے سلسلہ میں ملاقات کرنا ہوتی اور اپنی گوناگوں مصروفیات کے سبب دن کے اوقات میں کہیں نہ مل سکتے تو وہ آسانی سے لارنس گارڈن میں چلا جاتا جہاں ہر موسم اور ہر حالت میں انہیں وقتِ مقررہ پر چہل قدمی کرتے دیکھ سکتا۔ حیدرآباد سے پنجاب آئے تو ان کے لباس میں ترکی ٹوپی شیروانی، اچکن اور پاجامہ شامل تھا اور آخر وقت تک یہی وضع قائم رہی۔ البتہ بیرونی ممالک میں سوٹ اور ہیٹ کا بھی استعمال کیا۔ مولانا جوانی سے لیکر پیرانہ سالی تک تیز رفتار واقع ہوئے تھے، اور زندگی کے ہر عمل میں ان کا یہی انداز تھا۔ صبح کی سیر کے دوران میں ان کی رفتار اتنی تیز ہوتی کہ معمولی رفتار کا انسان ان کا ہمرکاب نہ ہو سکتا یا اسے ان کے ساتھ دوڑنا پڑتا لیکن اس بادپا مردِ غازی کو میں نے ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۳ء میں کوہ مری میں دیکھا جبکہ وہ طویل علالت اور ضعف پیری سے مجبور و معذور تھے۔ اپنی کوٹھی سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے برآمد ہوتے اور بہ ہر سڑک پر بدشواری سست خرام نظر آتے۔ ان کے بھائی غلام حیدر صاحب ان کو سہارا دئے ہوئے تھے۔ لیکن مولانا کے تیور بتاتے تھے کہ ان کو یہ سہارا گوارا نہیں اور حوادثِ زندگی سے سخت بیزار ہیں۔ تاہم معمولات کی پابندی میں فرق نہ آنے دیتے اور سخت مجبوری کے باوجود صبح کی سیر ناغہ نہ ہونے دیتے۔ اسی طرح موسمِ گرما میں بالالتزام کوہ مری ضرور جاتے اور سارا موسم ہر سال وہیں گزارتے۔

رفتہ رفتہ مرض نے زیادہ شدت اختیار کی اور آخر کار ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء کو یہ مردِ مومن، بندۂ خدا جو عمر بھر حق گوئی و بیباکی کو مسلکِ حیات بنائے رہا "اللہ، اللہ" پکارتا۔ اللہ کو پیارا ہوا اور حیاتِ تازہ کا طلبگار ابدی نیند سو گیا۔ ؏ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

حقیقت یہ ہے کہ ظفر علی خاں ایک پیکرِ حرکت و عمل۔ اور اسلامی ہند کی قومی تحریکات کی روحِ رواں تھے۔ مولانا مرحوم و مغفور نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ علمی ادبی انساحی اور سیاسی مصروفیات میں بسر کیا۔ وہ ہر میدان کے سپہ سالار اور ہر نیستاں کے شیر کی حیثیت رکھتے تھے۔ بقول مولانا ابوالکلام ؎

"ظفر علی خاں تحریکوں کی عمارت اٹھانے میں کمال رکھتے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو ہمیشہ راہ و منزل سے بے نیاز ہو کر چلتے ہیں۔"

لیکن صحت کی ناسازی نے گزشتہ دس سال سے عملی زندگی سے کنارہ کشی پر مجبور کر دیا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ، زبان میں لکنت، مگر دماغ حاضر، اسی عالم میں "زمیندار" کے دفتر جاتے دیر تک بیٹھتے افتتاحیہ ضرور سنتے اور بعض تبدیلیاں کراتے۔

لاہور کے جن اصحاب نے مولانا کو عام جلسوں میں آتش فشاں دیکھا ہے اور جہاں وہ مشکل سے مشکل موقع پر اپنی پُر مغز تقریر میں گھنٹوں فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے سنے گئے۔ جب انہوں نے ۱۹۴۹ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کی اردو کانفرنس کے اجلاس میں ان کی آخری تقریر سنی تو حاضرین میں ہر شخص آبدیدہ تھا اور اس شیر دل مجاہد کی گرج کو یاد کر کے ان کی ماضی کی عظمتوں میں گم نظر آتا تھا۔ مولانا کے آخری الفاظ یہ تھے:

"ہمارا قافلہ منزلِ مقصود تک پہنچ چکا ہے۔ اس کے بعد تم نے راہ پیمائی تو ہے مگر قوت راہ پیمائی نہیں۔ اب ہم راستہ میں بیٹھ کر چلنے والوں کی برق رفتاری کا تماشہ دیکھنے کے قابل رہ گئے ہیں، جو ہمیں عہدِ ماضی کی یادگار سمجھ کر تماشہ سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو تماشائی۔ دنیا چڑھتے ہوئے سورج کی پوجا کرتی ہے، ڈوبتے ہوئے آفتاب کو کون پوچھتا ہے۔ اور ہم تو ڈوبتے ہوئے ستاروں کی طرح دنیا پر نظر ڈال رہے ہیں۔"

یہ مولانا ظفر علی خاں کی عظمت و جلال کی مکمل داستان تھی جو انہوں نے اپنی زبانی ہمیں یاد دلائی۔ اور آخر آج یہ خورشید ادب و صحافت غروب ہو گیا۔ لیکن مولانا ظفر علی خاں اپنے کردار و گفتار کی روشنی میں زندہ ہیں اور ان کی عظیم شخصیت تا ابد تابندہ رہے گی۔

چاٹگام کی پہاڑیاں
خاص خاص اقسام
طباعت کا کاغذ۔
سفید، سبز، سرخ، نیلا وغیرہ۔
لکھنے کا کاغذ۔ چکنا نفیس اور
نفیس تر قسم کا سفید اور رنگین۔
سفید اور رنگین کارڈ۔
بینک اور بانڈ کے کاغذ ہر رنگ میں
سفید و رنگین کارٹرج ۔
ڈرائنگ ۔
کرافٹ سادہ، دھاری دار۔
ڈپلیکیٹنگ پیپر
ایم جی کور ہر رنگ میں
ایم جی۔ مینلا۔
سفید اور رنگین جاذب
لپیٹنے کا براؤن کاغذ دھاری دار
آبی نشان کا پیپر سادہ
مصنوعی آرٹ ۔
پوسٹر سفید اور رنگین۔
پیچ ہاکس کے لئے۔
پاکستانی کاغذ کی صنعت کا مرکز
چاٹگام کے سرسبز و شاداب پہاڑوں کی آغوش میں اور خوبصورت کرنافلی دریا کی نیلگوں سطح پر جھلکتی ہوئی ایشیا کے سب سے
بڑے کاغذ کے کارخانہ کی سربلند عمارت۔ پاکستان کے ترقیاتی منصوبوں کی ایک زندہ جاوید مثال معلوم ہوتی ہے۔ قدرت
کی حسین و دلآویز گلکاری کے ساتھ ساتھ انسانی صنعت کاری کا خوشگوار امتزاج ایک دلچسپ منظر پیش کرتا ہے
اس پُرفضا ماحول میں پاکستان کی روز افزوں تعلیمی اور صنعتی ضروریات کے لئے کاغذ تیار کیا جاتا ہے تاکہ علم کی روشنی
ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل سکے اور قوم کی خوشحالی میں اضافہ ہو۔
یہ کارخانہ ملکی ضروریات اور برآمد کی غرض سے سالانہ ۳۰ ہزار ٹن مختلف
قسم کا لکھنے کا کاغذ۔ طباعت کا کاغذ اور اشیاء کے باندھنے کا کاغذ تیار کرتا ہے۔
پوری قوم کی کاغذ کی ضروریات
کرنافلی پیپر ملز لمیٹڈ چندر گونا مشرقی پاکستان
سے پوری ہوتی ہے
قائم کردہ۔ پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

سیدھی پیٹھ
اور
مضبوط اعضاء کے لئے
اپنے
ننھے بچّہ کو یہ خالص دودھ
دیجئے
OSTERMILK
MODIFIED MILK FOOD FOR INFANT FEEDING

"ماہِ نو" میں مضامین کی اشاعت کے متعلق شرائط

۱۔ "ماہِ نو" میں شائع شدہ مضامین کا مناسب معاوضہ پیش کیا جائیگا۔

۲۔ مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

۳۔ ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔

۴۔ ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے

۵۔ مضمون کے ناقابل اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

۶۔ ایڈیٹر مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

ان کی تندرستی اہم ہے
اسی وجہ سے میں ہمیشہ ڈالڈا
سے کھانا تیار کرتی ہوں
اتنے ہی وٹامن جتنے کے اصلی گھی میں
اب ڈالڈا برانڈ وناسپتی میں بہت
زیادہ غذائیت ہے۔ ڈالڈا کے ہر اونس
میں وٹامن اے کی اتنی ہی مقدار موجود ہے
جتنی کے اچھے اور خالص گھی میں ہوتی ہے۔
ڈالڈا میں وٹامن ڈی بھی موجود ہے۔ آپ کے
بچوں کی صحت مند پرورش کے لئے ان کی
غذا میں ان دونوں وٹامن کی موجودگی ضروری ہے
ہمیشہ محفوظ اور پاک و صاف
ڈالڈا برانڈ وناسپتی کو عمدہ بناتی تیلوں سے تیار کر کے
حفظان صحت کے اصولوں کے تحت سربمہر اور ہوا بند ڈبوں میں
بھرا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ تازہ اور صاف ستھرا ہے۔ اپنے تمام
کھانے ڈالڈا سے
تیار کیجئے۔ اور اپنے گھر والوں
کو صحت مند رکھئے۔
ڈالڈا
ڈالڈا برانڈ وناسپتی
کھانوں کو بہتر بناتا ہے
HVM. 18—193 UD

تندرست لوگ
ہرروز لائف بوائے صابن سے نہاتے ہیں
یہ روزمرّہ* کی گندگی کے جراثیم کو دھوڈالتا ہے
* آئے دن ہمیں گندگی سے واسطہ پڑتا ہے جس میں جراثیم ہوتے ہیں۔ ان جراثیم سے ہمیں بیماریوں کا خطرہ رہتا ہے۔ اسی لئے بہت سے تندرست لوگ ہرروز اپنی صحت کی حفاظت لائف بوائے صابن سے نہاکر کرتے ہیں کیونکہ یہ میل کے ساتھ جراثیم بھی دھوڈالتا ہے۔ اور اس کے غسل سے جسم میں شگفتگی وتازگی پیدا ہوتی ہے!
LIFEBUOY
SOAP

"پاکستان"

۱۹۵۵-۵۶

ملکی ترقیات کا ایک مختصر جائزہ
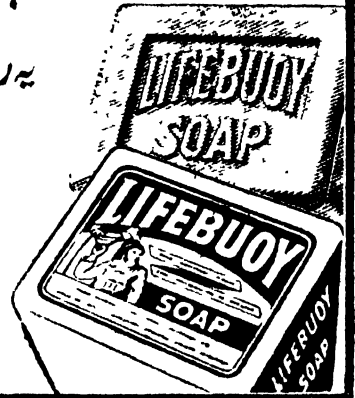
"ادارۂ مطبوعات پاکستان" نے یہ باتصویر کتابچہ پاکستان کے آٹھویں جشن استقلال کی تقریب پر شائع کیا تھا - اس میں ملک کی ہرجہتی رفتار ترقی کا ایک سیر حاصل جائزہ پیش کیا گیا ہے - اہم اعداد و شمار، حقائق اور ملکی ترقی کی کیفیتیں الگ الگ موضوعات کے تحت درج کی گئی ہیں - تاکہ مختلف ملکی سرگرمیوں کی تفصیل، اقتصادی و معاشی ترقی کی رفتار صنعت و تجارت، فوج، تعلیم، صحت اور دیگر شعبوں میں پاکستان کی ترقی پذیر رفتار عمل کا خلاصہ سامنے آجائے -

ملک کی ترقی کی خاص خاص تصویریں- متن کی ضخامت ۸۰ صفحات

دیدہ‌زیب سرورق قیمت صرف آٹھ آنے

ملنے کا پتہ:-

ادارۂ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی

ہماری نئی پیشکش

"مغربی پاکستان"

مغربی پاکستان جغرافیائی، تاریخی اور تہذیبی اعتبار سے ایک وحدت ہے۔ مگر نظم ونسق کے اعتبار سے وہ کئی حصوں میں تقسیم رہا ہے۔ اب ان خارجی و مصنوعی حدبندیوں کو دور کیا جا رہا ہے اور ایک نئی انتظامی وحدت تشکیل پا چکی ہے۔ اس کتابچہ سے معلوم ہوگا کہ مغربی پاکستان کے جغرافیائی، سماجی اور ثقافتی اشتراک کی ملی جلی قدریں کیا ہیں اور ان کا تاریخی ارتقا کسطرح ہوا ہے۔ مغربی پاکستان کے دریاؤں، [illegible] دستکاریوں، تجارت، زراعت، ادب اور رسوم سب پر سرسری نظر ڈالی گئی ہے۔ ضخامت ۶۴ صفحات، قیمت صرف دس آنے۔

ملنے کا پتہ:

ادارۂ مطبوعات پاکستان

پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی

انتخاب کلام مسلم شعرائے بنگال

پچھلے چھ سو سال میں مشرقی پاکستان کے مسلمان شعراء نے بنگالی ادب میں جو بیش بہا اضافے کئے ہیں ان کا ایک مختصر، مگر سیر حاصل، انتخاب عہد قدیم سے لے کر معاصر شعراء تک پیش کیا گیا ہے۔ یہ ترجمے پروفیسر احسن احمد "اشک" اور جناب یونس احمر نے براہ راست بنگالی سے اردو میں کئے ہیں۔

ضخامت ۲۰۰ صفحات

کتاب مجلد ہے۔ کارچہ کی جلد۔ طلائی لوح

قیمت ساڑھے چار روپے

سادہ جلد کی یہی کتاب: چار روپے

علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ:

ادارۂ مطبوعات پاکستان

پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳، کراچی نے شائع کیا۔ مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ۔ کراچی
مدیر: رفیق خاور

ماہ نو
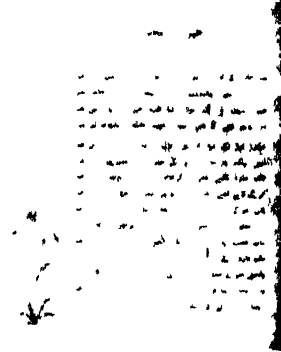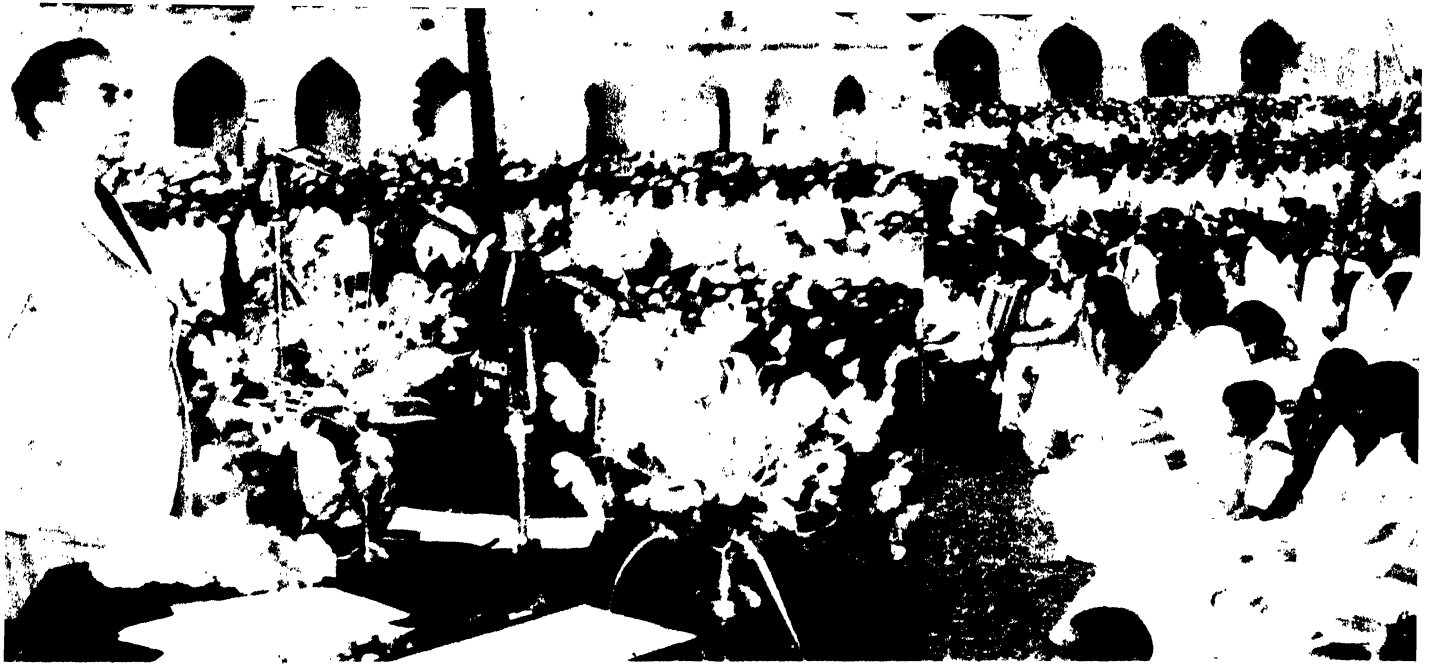
وزیر اعظم پاکستان کا ڈھاکہ میں طلبا سے خطاب

ثقافتی سرگرمیاں

مسٹر چو این لائی وزیر اعظم چین کراچی میں ایک تمثیل ملاحظہ کر رہے ہیں

جناب میر غلام علی تالپور وزیر داخلہ
ربانی اسکول آف فائین آرٹس کا

کوکوگولڈ
غذائیت سے بھرپور
ویکیوم ریفائنڈ
خالص
ناریل کا تیل
لذیذ
اور صحت بخش
کھانوں کی
تیاری کیلئے
COCOGOLD
کوکوگولڈ
VACUUM REFINED
Untouched by Hand
COOKING PURPOSES
پاکستان آئیل پراڈکٹس - رام بھارتی روڈ - کھوڑی گارڈن - کراچی
NATIONAL
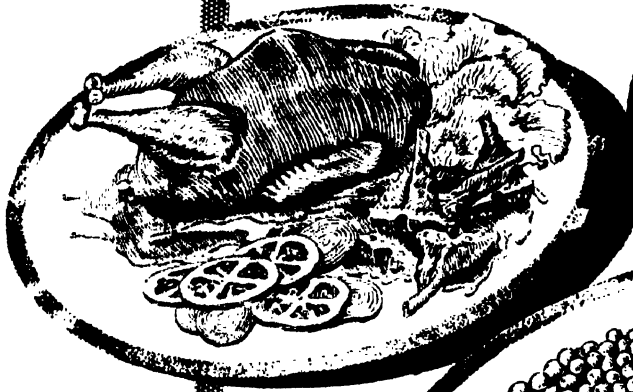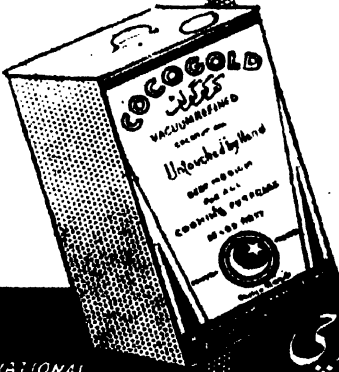
LIFEBUOY
SOAP
LIFEBUOY
SOAP
LIFEBUOY
SOAP
تندرست بچے باقاعدہ لائف بوائے صابن
سے نہاتے ہیں
یہ آئے دن* کی گندگی اور اس کے جراثیم بھی دھوڈالتا ہے!
* آئے دن ہمیں گندگی سے واسطہ پڑتا ہے، جس میں جراثیم ہوتے ہیں، اور جن سے ہمیں بیماریوں کا خطرہ رہتا ہے۔ اسی لئے تو بیشمار لوگ اپنی صحت کی حفاظت لائف بوائے صابن کے باقاعدہ غسل سے کرتے ہیں جو گندگی اور اس کے جراثیم بھی دھوڈالتا ہے
—اور تازگی اور شگفتگی کا صحتمندانہ احساس دلاتا ہے۔

ماہِ نو

جلد ۹ ——— شمارہ ۱۱

فروری ۱۹۵۷ء

مدیر: رفیق خاور

نائب مدیر: ظفر قریشی

سالانہ چندہ

ساڑھے پانچ روپے

فی کاپی ——— آٹھ آنے

ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان

پوسٹ بکس ۱۸۳، کراچی

اداریہ:	آپس کی باتیں		
بہ یادِ امیرؒ:	ذکرِ جمیل	اعجاز [illegible]	-
	نعرۂ مستانہ (نظم)	جوشؔ ملیح آبادی	۱۰
بہ یادِ غالبؔ:	غالبؔ	صلاح الدین خدا بخش مرحوم	۱۲
مقالات:	بچوں کی مصوری	سیّد امجد علی	۳۲
	قدیم توشے خانے اور وضعداریاں	اکرام الدین قدوائی	۴۶
	نصیر خاں (وادیٔ بلوچستان کی قدیم تاریخ)	خلیل صحافی	۴۲
نظمیں:	ہم نفس	ہادیؔ حسین	۱۷
	آنچ	انجم رومانی	۱۷
	رات	انور علی انورؔ	۵۰
	محرومی	سعادت نظیرؔ	۵۰
	دوہے (پنجابی سے)	حامد شاہ عباسی، ہاشم شاہ — مترجمہ: شفیع عقیل	۴۹
افسانے:	تحفہ	عنایت اللہ	۱۸
	لالہ	آنسہ منہاج محمود	۲۳
	آسیب زدہ گھر	احمد سعید	۲۸
غزلیں:		سیّد ذوالفقار علی بخاری	
		یوسف ظفر • ابنِ انشا • جمیل الدین عالیؔ	
		سلیم احمد • ادیبؔ سہارنپوری • نظرؔ حیدرآبادی	
		حبیب جالبؔ • محب عارفی	۳۸ - ۴۱
ہماری ڈاک:			۵۱
نقد و نظر:		ر۔ خ	۵۲

سرورق: شاہی مسجد سے لاہور کا نظارہ — رنگین عکس: محمد خ[illegible]

آپس کی باتیں

اس سال حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی یوم پیدائش کی چودھویں صد سالہ سالگرہ واقع ہو رہی ہے اور یہ ملت اسلامیہ اور خاندانِ نبوت کے تمام پروانوں کیلئے نوید مسرت ہے۔ جو ہستی با برکات دینی و دنیوی ہر اعتبار سے جناب رسالتمآبؐ سے اس قدر قریب اور انا مدینۃ العلم و علی بابھا کی مصداق ہو اسکے سامنے جبینِ عقیدت خود بخود جھک جاتی ہے۔ قرونِ اولیٰ کے صفِ اول کے مجاہدین میں جو نہ صرف اسلام کے حدی خواں تھے بلکہ گوناگوں فضائل سے آراستہ تھے ان کی شخصیت ایک نمایاں وقار کی حامل ہے وہ محض تلوار ہی کے دھنی نہ تھے، علم کے دھنی بھی تھے۔ اور تاریخ انہیں علم و عرفان، تہوّر و شجاعت اور تدبّر و سیاست جیسے بوقلموں اوصاف کے لئے یاد رکھتی ہے۔ اسی لئے آج چودہ سو سال بعد بھی ان کی شمع محبت سب دلوں میں روشن ہے اور ان کے یوم پیدائش کی تقریب مبارک کو شایانِ شان اہتمام سے منانے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ ہم اس موقع پر جناب امیرؓ کی خدمت اقدس میں شاعرِ انقلاب جناب جوش ملیح آبادی کا ایک تازہ ہدیہ عقیدت اور ان کے فضائل کے بارے میں آغا محمد سلطان مرزا صاحب کا ایک بصیرت افروز مضمون پیش کر رہے ہیں۔ یہ شمارہ روضۂ مبارک اور مسجد کوفہ کی تصاویر سے بھی مزین ہے ÷

یہ ایک خدا ساز اتفاق ہے کہ مرزا غالب کی برسی بھی قریب قریب اسی زمانہ ہی میں واقع ہو رہی ہے جنہیں جناب امیرؓ کے ساتھ والہانہ محبت تھی۔ مشرق کے اس مایۂ ناز شاعر کے متعلق ان کی برسی پر بالالتزام مضامین شائع کئے جاتے رہے ہیں۔ چنانچہ اس بار نامور نقاد صلاح الدین خدابخش مرحوم کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔ یہ مضمون تیس چالیس برس پہلے رسالہ "ایسٹ اینڈ ویسٹ" میں شائع ہوا تھا اور اگرچہ انگریزی خوانوں کے لئے لکھا گیا، اردو خوانوں کے لئے بے مزا نہیں۔ گو بعض امور مثلاً غالب کے کلام اور خطوط کی تاریخ وار ترتیب میں شیخ محمد اکرام، مولوی مہیش پرشاد آنجہانی اور دیگر محققین کی کوششوں سے بہت کچھ کام ہو چکا ہے، پھر بھی تحقیق کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور تنقید کے ضمن میں ہر وقیع آواز [illegible]

لاہور میں پہلی اورینٹل کانفرنس کا انعقاد ہماری قومی زبانوں، ادب اور مشرقی السنہ و علوم کے ساتھ گہرے شغف کا آئینہ دار ہے جن پر ہماری تہذیب و تمدن کی بنیادیں استوار ہیں۔ جن کی نشو و نما ہماری قومی زندگی کے صحیح نہج پر ارتقا کرنے کی ضامن ہے اور ہمارے روشن مستقبل کی ضامن۔ اس سے قطع نظر اس قدر وسیع پیمانہ پر جو کل برصغیر کو محیط تھا، کانفرنس کا انعقاد اقوام مشرق کی اس روز افزوں ذہنی آزادی، خود اعتمادی اور نشاۃ ثانیہ کی علامت ہے جو کسی اور قوم، تہذیب یا تمدن سے اثر پذیر ہوئے بغیر اپنی ہی صلاحیتوں پر نشو و نما پاتے ہیں۔ کانفرنس میں مشرقی السنہ اور پاکستان کی علاقائی زبانوں کی توسیع و ترقی، سائنسی اصطلاحات وضع کرنے اور دائرۃ المعارف کی ترتیب و تدوین کے بارے میں جو تجویزیں اور تدبیریں کی گئی ہیں ان کے نتائج یقیناً بہت دور رس ہیں اور ہماری قومی زندگی کو زیادہ سے زیادہ توانا اور بلند بال بنانے کے لئے نہایت اہم اقدامات ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ اس سلسلہ میں اور بھی تیزی اور سرگرمی سے قدم آگے بڑھایا جائے گا ÷

نیا سال ہماری اوّلین جنگ آزادی کی یادگار کا سال ہے۔ اور یوں بھی اس کے ساتھ کتنی ہی یادیں وابستہ ہیں جو آج ہماری آزادی اور فخر و کامرانی کے زمانے میں بے اختیار اُن پاکیزہ روحوں، ان زندۂ جاوید ہستیوں، ان گوناگوں تحریکوں اور اُن شاندار کارناموں کی طرف رجوع کرتی ہیں جنہوں نے مل جل کر ہماری دوسری جنگ آزادی کو کامیاب بنایا اور آج ایک زندہ روح بن کر ہماری کل زندگی میں کارفرما ہیں۔ ہماری موجودہ حیات درحقیقت انہی روحوں، انہی ہستیوں، انہی تحریکوں کا فیضان اور ان ہی خوابوں کی اَن مٹ تعبیر ہے اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی پہلی جنگ آزادی کی یادگار منائیں اور اس اہتمام سے جو اس کے شایانِ شان ہے۔ لہٰذا ادارہ نے فیصلہ کیا ہے کہ مئی، ۵۷ء کا شمارہ اس تقریب کے لئے وقف ہو، اس میں ہماری تاریخ کے مٹے ہوئے نقوش کو پھر اُجاگر کیا جائے اور اس روح کو زور شور سے ابھارا جائے جو ہمارا سرمایۂ حیات ہے۔ یہ ایک قومی خدمت ہے اور اس میں ہم اہل قلم سے پورے اشتراک کی توقع کرتے ہیں ÷

اس شمارۂ خاص سے پہلے مارچ میں ماہِ نو، جمہوریہ پاکستان کی تاسیس کی پہلی سالگرہ منا رہا ہے۔ جیسا کہ پہلے اعلان کیا گیا، آئندہ ماہِ نو کا شمارۂ خاص اگست کے بجائے مارچ ہی میں شائع ہوا کرے گا۔ یہ شمارۂ خاص اس وقت زیر ترتیب ہے اور ہمیں امید ہے کہ اپنی گوناگوں دلچسپیوں اور جلوہ سامانیوں کی بدولت اپنے قدردانوں سے پہلے سے بڑھ چڑھ کر داد حاصل کرے گا ÷

ذکرِ جمیل

آغا محمد سلطان مرزا

خراب آباد عالم میں ہزاروں کارواں آئے اور چلے گئے لیکن ایسا مجمع صفات جو حضرت علی میں تھا کسی میں نہیں پایا جاتا۔ یہ واقعی ایک معجزہ تھا کہ بظاہر ایسی متضاد صفات ایک شخص میں جمع ہوں جیسے کہ جنگجوئی اور نبرد آزمائی کے ساتھ حلم و رافت جس کو میدان جنگ میں عمرو ابن عبدود، مرحب و عنتر کے ساتھ مصروف پیکار پاتے ہیں اسی کو منبر فصاحت و بلاغت پر بلبل ہزار داستان کی طرح چہکتا ہوا دیکھتے ہیں۔ شجاعت کے ساتھ رحمدلی، سیاست و حکمرانی میں خوف خدا، سخاوت کے ساتھ مساوات، مصائب و آلام میں صبر، ایام فرحت و فراوانی میں زہد و ریاضت، ہر حال میں تسلیم و رضا، اسلام کی مدد اور اس کے قیام میں جدوجہد آپ کی حیات کا مقصد، یہ ہیں وہ صفات جو حضرت علی کی ذات میں جمع تھیں۔ جناب رسول خدا نے فرمایا تھا کہ جو شخص چاہتا ہے کہ دیکھے اسرافیل کو ان کی ہیبت میں، میکائیل کو ان کے رتبہ میں، جبریل کو ان کی جلالت میں، آدم کو ان کے علم میں، نوح کو ان کے فہم میں، ابراہیم کو ان کی صفت خلیل اللہی میں، یعقوب کو اس قرب خداوندی میں جو صابر کو رنج و غم و مصیبت میں حاصل ہوتا ہے، یوسف کو ان کے جمال میں، موسیٰ کو ان کی صفت کلیمی میں، ایوب کو ان کے صبر میں، یحییٰ کو ان کے زہد میں، عیسیٰ کو ان کی طریقت میں، یونس کو انکی پرہیزگاری میں اور محمدؐ کو ان کے جسم و خلق میں تو اسے چاہیئے کہ علی کو دیکھے کیونکہ اس میں انبیاء کی صفات میں سے نوے صفات جمع ہوئی ہیں جو اس کے سوا کبھی اور کسی میں جمع نہیں ہوئیں۔ علامہ شیخ سلیمان مفتی اعظم قسطنطنیہ نے اپنی کتاب ینابیع المودہ مطبوعہ سنہ ۱۳۰۱ ہجری بمقام اسلامبول کے باب الاربعون میں اس حدیث کی تصدیق و توثیق کی ہے اور اس باب کا عنوان قائم کیا ہے: کون علی شبیہاً بالانبیاء علیہم السلام وکون فضائلہ کثیرۃ لاتحصی۔ اس ہی مضمون کو تشریح و تفصیل کے ساتھ علامہ ابن ابی الحدید نے اپنی کتاب شرح نہج البلاغہ کے جزو اول ص ۹ لغایۃ ۱۰ میں بیان کیا ہے۔

انسان کی زندگی ایک جو رواں ہے کہ جس کے ٹکڑے نہیں کئے جاسکتے۔ یہ مغربی تہذیب کی کم فہمی ہے جس نے انسان کی ایک زندگی کے علیحدہ ٹکڑے کر دئے کہ یہ پرائیویٹ زندگی ہے، یہ پبلک زندگی ہے، یہ مذہبی زندگی ہے، یہ ادبی زندگی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ورنہ انسان جیسا اپنے گھر میں ہے ویسا ہی باہر ہوگا۔ اگر گھر میں وہ اپنے بیوی بچوں پر ظلم کرتا ہے تو باہر عادل اور رحمدل نہیں ہوسکتا۔ اگر پبلک میں وہ مکار، دغاباز، بدعہد اور کاذب ہے تو اپنے معاملات میں بھی وہ ایسا ہی ہوگا۔ جناب امیر علیہ السلام کی زندگی میں اس قاعدہ کی تشریح نہایت نمایاں ہے۔ ہر وقت، ہر جگہ، ہر موقعہ پر آپ کا محرک عمل اور مقصد زندگی ایک ہی تھا یعنی تسلیم و رضا بقضاء الہٰی کے ساتھ نشر و اشاعت و تعلیم و تلقین دین الہٰی۔ وہ شخص آپ کی سیاست کو ہرگز نہیں سمجھ سکتا جو آپ کے اس مقصد کو محرک فعل و عمل نہیں سمجھتا۔ یورپین مصنفین اسلام کے اصول اور اسلام والوں کے افعال کو اپنے مغربی معیار سے جانچتے رہے ہیں۔ اس شخص کو آپ کیا کہیں گے جو ریشمی کپڑوں کو مساحت کی جریب سے ناپتا ہے۔ بعض یورپین علماء کی رائے میں علی ملکی سیاست سے بے بہرہ تھے کیونکہ پہلے تو خلافت کھو بیٹھے اور جب خلافت ملی تو معاویہ کو بے وقت اور بے موقعہ معزول کرنے کی کوشش میں صریح سیاسی غلطی کے مرتکب ہوئے۔ کسی سیاست یا تحریک کی کامیابی اور ناکامیابی کا فیصلہ کرنے سے پہلے دیکھنا چاہیئے کہ اس سیاست یا تحریک کا مقصد کیا تھا۔ اور اپنے فیصلہ کا انحصار مقصد کے آخری حصول یا فقدان پر رکھنا چاہیئے۔ علی کا مقصدِ زندگی اور سیاست اسلام کی حفاظت اور اس کی اشاعت تھی نہ کہ حصولِ حکومت و اقتدار۔ اور وہ اپنے اس مقصد میں ایسی اچھی طرح کامیاب ہوئے کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر علی نہ ہوتے تو اسلام نہ ہوتا۔

حضرت علی کی کتاب حیات میں بہت سبق ملتے ہیں: صبر فی المکارہ، تقویٰ، زہد، تسلیم و رضا، خلوص فی الدین، خشیۃ اللہ، عبادت،

تضرع وزاری، شجاعت، رحم، عدل، سخاوت، سیاست صحیحہ، فلسفۂ الہیات اور فلسفۂ اخلاقیات وغیرہ۔ شیخ محمد عبدہ مفتی مصر نے اپنی شرح نہج البلاغہ میں سچ کہا ہے کہ بلاغت و فصاحت زبان عربی کے سیکھنے اور علوم و فقۂ اسلام کے سمجھنے کے لئے حضرت علی کے ان خطبوں سے بہتر باستثناء کلام الٰہی اور کوئی کتاب نہیں ہے۔

تمام شعوب حیات علویہ کا بیان میری حد امکان و لیاقت سے باہر ہے۔ یہاں ہم آپ کے فلسفۂ اخلاقیات کے چند کلمات بیان کرتے ہیں۔ اور وہ شیخ محمد عبدہ کی شرح نہج البلاغہ کے حوالے سے ہوں گے۔

آپ نے تعلیم و نصائح کا یہ اصل اولین مقرر فرمایا ہے کہ جو شخص دوسروں کی تعلیم اپنے ذمہ لیتا ہے یا ان کو نصیحت کرتا ہے تو اُس کا فرض ہے کہ پہلے وہ خود اس تعلیم یا نصیحت پر عمل کر لے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں تم کو کوئی نصیحت نہیں کرتا لیکن یہ کہ پہلے میں خود اس پر عمل کر لیتا ہوں۔

خداوند تعالیٰ کی قضا و قدر پر خوشی و اطمینان قلب کے ساتھ صبر کرنا، دنیا کے عیش و عشرت و طول امل کو بے حقیقت سمجھنا، دنیا کی زندگی کو محض آخرت کے عیش و تنعم کا ایک ذریعہ قرار دینا، خدا کی خوشنودی کو اپنے ہر فعل کا مقصد قرار دینا' یہ ہے حضرت علی کے فلسفہ کا لب لباب۔ آپ سے بہت سے خطبے ہیں جن میں لوگوں کو دنیا کی حقیقت سے آگاہ کیا گیا ہے۔ جو شخص چاہتا ہے کہ وہ دنیا کو اس کے حقیقی رنگ میں دیکھے اُسے چاہیئے کہ وہ سب خطبے پڑھے۔ ہم یہاں فقط ایک خطبہ کا خلاصہ لکھتے ہیں، آپ فرماتے ہیں:-

"اے خدا کے بندو! دنیا کی روش باقی رہنے والوں کے ساتھ بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ اس کی روش تم سے پہلے گزر جانے والوں کے ساتھ تھی۔ زندگی کا جو حصہ گزر گیا وہ پھر واپس نہیں آتا۔ اور جو اب ہے وہ ہمیشہ باقی رہنے والا نہیں ہے۔ آنے والوں کے ساتھ دنیا کی رفتار ویسی ہی ہے جو اس سے پہلے گزرنے والوں کے ساتھ تھی۔ اس کے مصائب مسلسل ہیں اور اس کے حوادث ایک دوسرے کے معین و مددگار ہیں۔ پس سمجھ لو کہ تم قیامت میں حاضر ہو۔ کیونکہ زمانہ تم کو ہنکائے لئے جا رہا ہے پس جس نے اپنے تئیں ماسوا یعنی دنیا کی آرائشوں میں مشغول کر لیا وہ بدبختی کی تاریکی میں سرگرداں ہو گیا۔ گمراہ کرنے والے شیطان نے اس کے کردار بد کو اس کی نگاہ میں خوشگوار بنا دیا۔ جنت انجام ہے ان کا جنھوں نے تقویٰ میں سبقت کی۔ اور دوزخ انجام ہے ان کا جنھوں نے اس میں تقصیر کی۔

بندگانِ خدا! تقویٰ عزت و ارجمندی کا مضبوط قلعہ ہے۔ اور فسق و فجور ذلت و رسوائی کا ایسا مضبوط گھر ہے کہ جو اپنے رہنے والوں کو بلا و سختی سے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ تقویٰ کے ذریعہ سے گناہوں کے زہر کو دور کیا جا سکتا ہے اور یقین کے ذریعہ سے بلند مرتبہ بھی بہشتِ جاوید حاصل کر سکتا ہے۔

بندگانِ خدا! خدا سے ڈرو۔ اس نے تمہارے لئے دینِ حق آشکارا کر دیا ہے اور اس کے راستوں کو روشن کر دیا ہے۔ اس عالم باقی کے لئے توشہ مہیا کرو تمہیں توشہ بتا دیا گیا ہے۔ اور کوچ کا حکم دے دیا گیا ہے۔ اور سفر کے لئے آمادہ کر لیا گیا ہے۔ پس تم اُس کارواں کی طرح ہو جس نے چند لمحوں کے لئے کمر کھولی ہے۔ تم نہیں جانتے کہ کب تمہیں کوچ کرنے کا حکم دے دیا جائے۔

خبردار! دنیا سے اس شخص کو کیا مطلب ہے جو آخرت کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور مال سے اسے کیا واسطہ جو جلد ہی چھین لیا جائے گا اور صرف اس کا حساب کتاب ہی باقی رہ جائے گا۔

آج کا دن ان تمام باتوں کے ساتھ جو اس میں ہیں گزر جائے گا۔ اور کل کا دن تیزی کے ساتھ نمودار ہو جائے گا۔ گویا تم میں سے ہر شخص زمین کے نیچے تنہا مکان اور کنج لحد میں پہنچ چکا ہے۔ کتنا ہولناک ہے وہ تنہائی کا گھر، وہ منزلِ وحشت۔ اور مسافرت کا تنہا مقام۔ گویا حشر کی گونج تم تک پہنچ چکی ہے۔ قیامت تم پر طاری ہے۔ اور تم فیصلہ اعمال کے لئے نکل آئے۔ باطل تم سے دور ہو گیا۔ علتیں مضمحل ہو گئیں، حقائق تم پر ثابت ہو گئے۔ امور قضا نے تم کو اپنے مصادر تک پہنچا دیا۔ پس عبرت سے نصیحت حاصل کرو۔ اور انقلابِ روزگار سے عبرت کا سبق لو۔ عذاب الٰہی سے ڈرانے والی چیزوں سے نفع حاصل کرو۔"

(ترجمہ خلاصہ خطبہ ۱۵۳)

مسا   ل حسب علی   ہ اللہ دعا

مسجد سوید
(مامت نہ حسب علی ر ب)

بیرونی منظر

اندرونی منظر

موت سے آپ اس طرح ڈراتے ہیں:

"قسم بخدا موت بہت اہم اور بزرگ شے ہے۔ کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ جس کو یہ پکارتی ہے اسے سننا پڑتا ہے۔ جس کو یہ ہنکاتی ہے اسے جلدی کرنی پڑتی ہے۔ تیرے لئے لوگوں کی اطاعت تجھکو دھوکہ میں نہ ڈالے۔ تو نہیں دیکھتا کہ تجھ سے پہلے کتنے لوگ تھے جنھوں نے مال واز جمع کیا تھا۔ نقیری، مفلسی سے دور بھاگتے تھے۔ مآل کار کو بھولے ہوئے بڑی بڑی آرزوئیں لئے بیٹھے تھے۔ اور موت کو بہت دور سمجھتے تھے۔ لیکن کسی طرح ان کو موت نے آن کر دبوچ لیا۔ اور اُن کو اُن کے وطن سے نکال باہر کیا۔ اُن کی جائے امن میں جاکر ان کو پکڑ لیا۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا کہ کثرت خواہشات رکھتے تھے۔ مضبوط گھر بناتے تھے۔ مال جمع کرتے تھے۔ حکومت کرتے تھے کس طرح وہ قبر میں ڈال دئے گئے جو انھوں نے جمع کیا تھا وہ برباد ہوگیا۔ اُن کا مال اُن کے وارثوں کے پاس چلا گیا۔ اُن کی بیویوں پر دوسروں نے قبضہ کرلیا۔ اب وہ نیکی میں زیادتی نہیں کرسکتے اور بدی سے پرہیز نہیں کرسکتے (یعنی اب ان میں قوت عمل نہیں رہی) جس نے تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کی، خیر و نیکی میں دوسروں سے بڑھ گیا وہی رستگار ہوا۔ پس غنیمت جانو اس مہلت کو اور پرہیزگاری اختیار کرو اور وہ کام کرو جن سے بہشت نصیب ہو۔ کیونکہ یہ دنیا تمہاری اقامت ہے اور ہمیشہ رہنے کے لئے نہیں بنائی گئی۔ بلکہ یہ تو گزرگاہ ہے کہ یہاں سے توشہ لیکر دائمی قرارگاہ کی طرف چلو۔ پس کوچ کرنے کے لئے جلدی کرو۔ اور سفر کے لئے اپنے مرکبوں کو تیار رکھو" نہج البلاغہ خطبہ ۱۳۸۔

اقلیت اور اکثریت کے مسئلہ کو قرآن شریف کے اصول کے مطابق اس طرح حل فرماتے ہیں:

اَیُّهَا النَّاسُ لَا تَسْتَوْحِشُوْا فِیْ طَرِیْقِ الْهُدٰی لِقِلَّةِ اَهْلِهٖ فَاِنَّ النَّاسَ قَدِ اجْتَمَعُوْا عَلٰی مَائِدَةٍ شِبْعُهَا قَصِیْرٌ وَّجُوْعُهَا طَوِیْلٌ۔

ترجمہ فیض الاسلام۔ اے مردم در راہِ ہدایت و رستگاری از جہت کمی پیروانِ آن (و بسیاری مخالفین) نگراں نباشید زیرا مردم گرد آمدہ اند بر سر خوانی کہ سیری آن اندک و گرسنگیش بسیار است (بزینت و آرائش دنیا دل بستہ اند کہ بزودی فانی میشود بعلاوہ دلبستگی و بیروی نکردن از حق در قیامت بعذاب و گرفتاری بے پایان مبتلا میگردند)

موجودہ کمیونزم کا دراصل مقصد وہی ہے جو اپنے منہ میاں مٹھو بننے والی آزاد دنیا کا۔ یعنی رعایا کو حکومت کا دست نگر بنانا۔ آزاد دنیا نے دولت کے اثرات کو پھیلا کر لوگوں کو اپنا دست نگر بنا لیا ہے۔ اور کمیونزم نے دولت پر اور دولت کی پیدا کرنے والی فیکٹریوں پر خود حکومت کا قبضہ کردیا۔ اور اب حکومت لوگوں سے پورا کام لیکر اور اپنی دولت کے ذرائع مضبوط کراکر ان کو بقدر کفاف دیتی ہے۔ حکومت کو جماعت (COMMUNITY) کا نام دیکر کہتے ہیں کہ ہمارے یہاں تمام دولت اور تمام ذرائع دولت جماعت کے ہیں۔ جماعت کے کیا ہیں، حکومت کے ہیں ان کا دوسرا کلمۂ فخریہ ہے کہ ہمارے یہاں سب کو روزی ملتی ہے۔ کوئی بے روزگار نہیں رہتا۔ ہر ایک شخص کی قوت و طاقت پر خود قبضہ کرلیا۔ اس کا سارا خون چوس لیا۔ اب بقدر کفاف دیدیا تو کیا دیا۔ بلکہ اس کو ایسا اپنا دست نگر بنالیا کہ وہ تو اب حکومت سے مطالبہ بھی کرنے کے قابل نہیں رہا۔ اس کی ساری آزادئ عمل پر قبضہ کرکے غلاموں کی طرح اس کے آگے روٹی ڈالدی۔ کمیونزم دراصل غلامی کا دوسرا نام ہے۔ اس غلامی میں مساوات پیدا کرکے کس بات پر فخر کیا جارہا ہے۔ اس مساوات کے یہ معنی ہیں کہ سب کے پر کاٹ دئے اب کسی کو شوقِ پرواز نہ رہا۔ سب مساوی ہوگئے۔

جناب امیر علیہ السلام نے اس مسئلہ کو کس خوبی سے حل کیا ہے۔ جن لوگوں میں طاقت اور ہمت ہے انھیں آگے بڑھنے اور دولت جمع کرنے سے روکا بھی نہیں اور وہ اصول قائم کردیا کہ کوئی بھوکا بھی نہ رہے۔ آپ فرماتے ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ سُبْحَانَهٗ فَرَضَ فِیْ اَمْوَالِ الْاَغْنِیَاءِ اَقْوَاتَ الْفُقَرَاءِ: فَمَا جَاعَ فَقِیْرٌ اِلَّا بِمَا مُتِّعَ بِهٖ غَنِیٌّ وَاللّٰهُ تَعَالٰی سَائِلُهُمْ عَنْ ذٰلِكَ۔

یَا جَابِرُ مَنْ كَثُرَتْ نِعَمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ كَثُرَتْ حَوَائِجُ النَّاسِ اِلَیْهِ، فَمَنْ قَامَ لِلّٰهِ فِیْهَا بِمَا یَجِبُ فِیْهَا عَرَّضَهَا لِلدَّوَامِ

(۱۔ آثار صفحہ ۵۵)

نعرۂ مستانہ

سازِ وِلا پہ کون غزلخواں ہے یا علیؑ — ہر ذرّہ کائنات کا رقصاں ہے یا علیؑ

تیری ہر ایک سانس تری ہر نگاہ میں — گنجِ حدیث، دولتِ قرآں ہے یا علیؑ

تیری تجلیوں کے تموج سے آج بھی — اس تیرہ خاکداں میں چراغاں ہے یا علیؑ

اب بھی ترے حسین کے گل رنگ خون سے — یہ خارزارِ دہر گلستاں ہے یا علیؑ

اب بھی ترے چراغ کے انوارِ غیب سے — ہر شامِ تیرہ صبحِ درخشاں ہے یا علیؑ

تیرے جمال اکبر و قاسم سے یہ زمیں — بازارِ مصر و گوشۂ کنعاں ہے یا علیؑ

جو آندھیوں کی زد پہ جلی تھی لبِ فرات — اس وقت بھی وہ شمع فروزاں ہے یا علیؑ

جس پیاس نے بجھائی تھی ایماں کی تشنگی — وہ پیاس اب بھی چشمۂ حیواں ہے یا علیؑ

شکرِ خدا کہ سروِ گلستانِ فاطمہ — اس جادۂ نفس پہ خراماں ہے یا علیؑ

ہاں تیرا نام، تیرا تصور، ترا خیال — افسانۂ حیات کا عنواں ہے یا علیؑ

تجھ سے نہ کیوں ہو لرزہ براندام اہرمن — تو خلوتیِ حضرتِ یزداں ہے یا علیؑ

محرابِ آب و رنگ میں تیری زبان کا — اک ایک حرف لولو و مرجاں ہے یا علیؑ

تو جس کا ناخدا ہو وہ خس کا سفینہ بھی — فرماں روائے کشورِ طوفاں ہے یا علیؑ

جوشؔ ملیح آبادی

تیری وہ شان ہے کہ ترا ہر گدائے راہ — سلطانِ عصر و خسروِ دوراں ہے یا علیؑ

جس خاک پر رمائے ہیں دھونی ترے فقیر — وہ خاک رشکِ تختِ سلیماں ہے یا علیؑ

تیرا وجود اشارہ سوئے وجہ ذی الجلال — تو مشعلِ حریمِ رگِ جاں ہے یا علیؑ

تیرے نقوشِ فکر سے زلفِ حیات پر — تابندگیٔ موجۂ افشاں ہے یا علیؑ

رنگِ شگافِ کعبہ و چینِ قبائے حور — کس کا یہ حسنِ چاکِ گریباں ہے یا علیؑ

رہتا ہے ابرِ قبلہ کے آغوش میں وہ رند — جس پر کہ تیرا سایۂ داماں ہے یا علیؑ

غلطاں ہے دل میں یوں تری ساقی گری کا رنگ — ہر جادہ کوئے بادہ فروشاں ہے یا علیؑ

کہتا ہوا یہ ناز سے کوثر پہ آؤں گا — فدوی امیرِ بادہ پرستاں ہے یا علیؑ

تیری نسیمِ فیض کی موجِ لطیف میں — نازِ خرامِ ابرِ بہاراں ہے یا علیؑ

بندے کو تیرے عشق نے بخشی ہے وہ نگاہ — کونین زیرِ جنبشِ مژگاں ہے یا علیؑ

ہاں زندہ باد گردشِ مینا و ردِ شمس — ہر صبح کو یہ نعرۂ مستاں ہے یا علیؑ

تیرا ہی یہ کرم ہے کہ یہ جوشؔ وہم سوز
اس کفر پر بھی مشعلِ ایماں ہے یا علیؑ

غالب

صلاح الدین خدا بخش مرحوم

ادب قومی زندگی کا آئینہ ہے اور قومی زندگی مختلف اثرات کا نتیجہ جن میں سے کچھ پر تو انسان کو قابو ہوتا ہے اور کچھ پر نہیں ہوتا۔ آب و ہوا، طبعی حالات، سیاسی آزادی یا غلامی کے اثرات۔ یہ اور ان کے علاوہ بہت سے دوسرے اثرات بھی اتنے نمایاں ہوتے ہیں کہ وہ توجہ میں آئے بغیر نہیں رہتے۔ مثلاً مشرق میں شاعری کی بعض اقسام کبھی جڑ نہیں پکڑ سکیں۔ مشرق سمندر کی شاعری سے ناآشنا ہے، ایسی شاعری سے جو ہم ہائین، یا سوئنبرن، یا تھیوڈور واٹس ڈنٹن میں پاتے ہیں۔ مشرق آزادی کے ان بلند آہنگ نغموں سے بھی ناواقف ہے جنہیں ہم ملٹن، یا کالنز، یا شیلے یا وکٹر ہیوگو میں پاتے ہیں۔ ہمارے یہاں نیکی اور خوبصورتی کی بھی عین اس طرح سے پرستش نہیں ہوتی جو کیٹس کی شاعری کا خصوصی پہلو ہے۔ ہمارے یہاں وہ مسرت افزا امید اور ناقابلِ تسخیر رجائیت بھی نہیں پائی جاتی جو براؤننگ اور ٹینی سن کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ نہ ہم میں کوئی ایسی چیز ہے جس کا مقابلہ اس وجد آفریں پرستش سے کیا جا سکتا ہے جو ورڈزورتھ کا مسلک تھا۔

مشرق میں مظاہر فطرت، سیاسی آزادی یا حسن کی پرستش وہ کیفیت حاصل نہیں کرتی جیسی مغرب میں۔ برخلاف اس کے انسان اور اس کا مقدر شاعری کی جدوجہد کا چہیتا موضوع رہا ہے۔ اس کی تمام قوتیں، اس کا آرٹ، اس کی ذہانت صرف اسی ایک موضوع پر مرکوز رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس میں وہ لطافت، تنوع اور وسعت نہیں پاتے جو ہمیں یورپی شاعری میں ملتی ہے، اور اسی لئے اس میں جدت کا فقدان ہے جس کے بارے میں یورپی مصنف ہمیں طعنہ دیا کرتے ہیں۔ تاہم ہمارے شعرا اپنے حلقہ میں بلند پایہ اور عدیم المثال ہیں۔

مشرقی انسان اپنی طبعی سرشت کی وجہ سے پُراسرار اور اداس ہے۔ بجائے خیالی اور قسمت پر شاکر ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ اس کا مذہب عقیدۂ قضا و قدر کی تعلیم دیتا ہے بلکہ وہ اپنی زندگی میں یہی دیکھتا ہے اور ماضی کے واقعات میں یہی سبق پڑھتا ہے کہ زندگی میں کوئی ثبات نہیں، وقتی وبائیں بیک جنبش ہزارہا انسانی جانوں کو بہا لیجاتی ہیں، بادشاہوں کا لاابالی مزاج آناً فاناً ان کے ہم جنسوں کو یا تو سربلند کر دیتا ہے یا ذلیل بنا دیتا ہے۔ ہر قدم پر انسانی کوششوں کی حماقت اور انسانی خواہشات کی بے اثری کا احساس ہوتا ہے۔ وہ زندگی کو جوا سمجھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہماری شاعری کا نمایاں عنصر تسلیم و رضا، افسردگی اور توکل ہے۔ زندگی سے تنگ آنے کے بعد انسان اپنی افتادِ طبیعت کے خلاف تصوف سے دل بہلانے لگتا ہے۔ اسی لئے تصوف کا رنگ پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگی جاتی ہیں، اسی لئے انسانی جدوجہد کے رائگاں ہونے اور انسانی عزائم کی بے بسی پر ماتم کیا جاتا ہے۔ یہ ایشیائی روح ہے جس سے بسا اوقات ہم اپنی شاعری میں دوچار ہوتے ہیں، ہمیں اس میں عمیق حزن اور گہری افسردگی کا پتہ ملتا ہے۔

زندگی سے بیزاری اور نفرت کا احساس، دنیوی خواہشوں اور خوشحالی کی دنیوی آرزوؤں کے قطعی کھوکھلا ہونے اور باری تعالیٰ کی نیکی اور انصاف پسندی کے خلاف بغاوت کا احساس اور افسردگی، حزن کی جانب مشرقی مصنفین کے قدرتی رجحان سے قطع نظر ایک اور سبب بھی تھا، ایک امدادی سبب جس نے ہندوستان میں اس رجحان کو گہرا کرنے اور اس پر زور دینے کا میلان پیدا کیا۔ ۱۹ ویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں کا ستارہ غروب ہو گیا تھا، مسلمانوں کی شان و شوکت اور عظمت ختم ہو چکی تھی، لہٰذا جو لوگ اس دور میں زندہ تھے اور لکھتے لکھاتے تھے، وہ بیچارگی، افسردگی اور بیزاری کے احساس کو مکمل سے دور کر سکے یا اس قسمت اور تقدیر کے خلاف جس نے انہیں مفتوح، مغلوب اور زخمی کر کے زمین پر پٹخ دیا تھا۔ انسانی امیدوں کے کھوکھلے پن اور کشمکش کی بیچارگی کے تخیل کا کامیابی سے مقابلہ کر سکے۔

جو لوگ مایوسی اور حزن کی اس فضا میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے، دنیا ان کی نظروں میں ایک خشک، بے برگ و گیاہ ویرانہ تھی اور زندگی ایک ناقابلِ برداشت

---

[1] اقبال، نذرالاسلام اور بعض دیگر جدید شعرا کے بعد یہ کہنا مشکل ہے۔ حسن اور رجائیت کا فقدان بھی اب محلِ نظر ہے۔ (مدیر)

بارے یہ محض شاعرانہ رجز نہ تھا جس نے سودا کو یہ کہنے پر اکسایا تھا:

میں جوں طاؤس آتش رنگیں ہی بہار آئے
نہ با صحرا سرے دارم نہ با گلزار سودائے
بہر سو می روم از خویش می جوشد تماشائے

اور نہ یہ محض تخیل کی پرواز تھی جس نے میر تقی سے ذیل کی مایوس کن رباعی لکھوائی:

ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے
خونابہ کشی مدام کی ہے ہم نے
یہ مہلت مختصر کہ جس کو کہتے ہیں عمر
مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

یا پھر ناسخ کا یہ شعر:

بے قدر رکھا کلفتِ ایام نے مجھ کو
گوہر تو ہوں لیکن ہوں نہاں گرد کی تہ میں

نہیں، ان کی زندگیاں ایک زبردست المیہ بلوس تھیں اور یہ افسردہ غمگین نظمیں ان کی باطنی زندگی کا اظہار و انکشاف تھے۔ ان کی طوفانی فطرت کی گہرائیوں میں ایک کشمکش، ایک بے صبری، ایک بے چینی، ایک افسردگی تھی جو آخر دم تک قائم و برقرار رہتی ہے اور ایک گہرے حزن کا نقش چھوڑ جاتی ہے۔ میر حسن کی مثنوی میں بھی باوجود اس کی روشنی اور رسا پن کے، اس کے پُر مسرت، مزاحیہ خد و خال کے، افسردگی کا ایک گہرا دھارا بہتا ہے جسے ایک صاحبِ نظر قاری نظر انداز نہیں کر سکتا۔ حزن و افسردگی کا یہی احساس ہے جو انیس اور دبیر میں بلند انداز میں جلوہ گر ہوا ہے۔ اس زمانے جو سرتا سر حزن و افسردگی کے جذبہ سے سرشار تھی، ہمارے اہلِ قلم کے خیالات و جذبات کو بہت بڑی حد تک متاثر کیا ہے۔ وہ ایک ہی جست میں پریشانی سے مسرت تک جا پہنچتے ہیں اور پھر مسرت سے زیادہ گہری پریشانی کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ یہ کسی مردم بیزار شخص کی ملول اور نفرت انگیز اداسی اور افسردگی نہیں ہے، بلکہ ایک ایسی فطرت کا پاکیزہ دبا ہوا غم ہے جس میں کشمکش اور بغاوت ختم ہو چکی ہو اور جو مسرت بخش رضامندی کے ساتھ قدرت کے اٹل اور ناقابلِ تنسیخ فیصلہ کو تسلیم کرتی ہو۔ یہ شاپنہر کا حزن نہیں بلکہ اسے ہائن کا حزن قرار دینا چاہیے۔

ایک شاعر کے مقاصد اور فرائض کیا ہیں؟ کیا ہمارے شاعر وہ مقاصد اور فرائض پورا کرتے ہیں؟ وہ کیا چیز ہے جو سچے شاعر کو لافانی بنا دیتی ہے؟ وہ کیا بات ہے جو اس کی تصنیف کو جاوداں بناتی ہے اور وقت اور تقدیر کے انقلابات، عارضی طور و طریق اور رسم و رواج کی پامال راہوں سے نکال کر باہر لے جاتی ہے؟ وہ کیا راز ہے جو اس کی تصنیفات کو نہ کم ہونے والا نکھار اور لازوال حسن عطا کرتا ہے؟

اسٹاپ فورڈ بروک لکھتا ہے کہ "جو شاعر رنج و خوشی کا اظہار کرتا ہے وہ ان تمام اشخاص کے ساتھ جو رنج و غم محسوس کرتے ہیں، ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ پھر وہ جب بنی نوعِ انسان کے ساتھ اپنے بھائی چارے سے آگاہ ہو جاتا ہے اور یہ آگاہی اس سے زیادہ ہے جو شخص انسان کی خوشی کے ساتھ ہمدردی کر کے حاصل ہوتی ہے، تو طاقت اور جوش اس کی شاعری میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے خیالات کا اظہار کیا جا رہا ہے، ان کے ساتھ ہمدردی کی جا رہی ہے اور ان کے دکھ کے شریفانہ اظہار کے ذریعہ ان میں طاقت پیدا کی جا رہی ہے، اور وہ شاعر کی خدمت میں اپنا ہدیۂ تشکر اور ہمدردی لوٹاتے ہیں یہاں تک کہ وہ خود ان کی محبت کی آگاہی میں بلندی پر پہنچ جاتا ہے اور فیضانِ قدسی محسوس کرتا ہے۔ پھر اس کی شاعرانہ قوت جسے انسانی محبت کے ذریعہ غذا پہنچتی ہے، ترقی پذیر ہوتی ہے۔ ایک زیادہ بھرپور جذبہ، ایک زیادہ وسیع خیالِ زندگی کا ایک ایسا شعور جس میں تخیل کے ذریعہ گہرائی پیدا ہو گئی ہو اور جو زندگی کے خیالی فلسفہ سے پیدا ہونے والی سچائی سے کہیں زیادہ سچا ہوتا ہے، خود بخود اس کی شاعری میں بس جاتا ہے اور ایسے ایسے جملے اس کی نظم میں آتے ہیں جن سے حیرت انگیز سادگی کے ساتھ وجودِ باری کے بارے میں بنیادی خیالات کا اظہار ہوتا ہے اور جذبات اس نہاں خانۂ غیب سے نکلتے ہیں جہاں قوانینِ کائنات

مرکوز رہتے ہیں "

لہٰذا شاعری انسانی مسرتوں، دکھوں اور تکلیفوں کے ساتھ ہمدردی ہے اور ان جذبات کو ظاہر کرنے کی طاقت ہے جسے اگرچہ سب محسوس تو کرتے ہیں لیکن سب اس کے اظہار کی طاقت نہیں رکھتے۔ ان نازک ترین احساسات کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی قابلیت ہمیں فطرت دیتی ہے۔ یہی وہ صفات ہیں جو ایک شاعر کو بیک وقت واعظ اور پیغمبر بنا دیتی ہیں۔ شاعری مادی فطرت کی بیرونی دنیا اور جذباتی انسان کی اندرونی دنیا دونوں کی ترجمانی کرتی ہے۔ میتھیو آرنلڈ کہتا ہے کہ شاعری بیرونی دنیا کے خصوصی حالات اور حرکات و سکنات کی ساحرانہ لطف بیان کے ساتھ تشریح کرتی ہے اور وہ انسان کی اخلاقی اور روحانی فطرت کی اندرونی دنیا کے خیالات اور قوانین کی الہامی یقین کے ساتھ ترجمانی کرتی ہے بالفاظ دیگر شاعری اپنے اندر قدرتی سحر اور اخلاقی گہرائی جیسی چیزیں رکھتی ہے وہ دونوں طریقوں سے انسان کی ترجمانی کرتی ہے، وہ اسے حقیقت کا مطمئن کرنے والا جذبہ عطا کرتی ہے، وہ اسے اس قابل بناتی ہے کہ وہ اپنے اور کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے۔

شاعر انسان کے مستقل اور ابدی جذبات سے اپیل کرتا ہے۔ جذبات جو وقت اور حالات کی تبدیلیوں سے متاثر نہیں ہوتے، جذبات جو نسل اور مذہب کی رکاوٹوں کے باوجود تمام بنی نوع انسان میں مشترک ہیں۔ زبان ترقی پذیر ہوتی ہے، مذہب بدلتا ہے، خدا تعالیٰ کا تصور زمانہ بہ زمانہ بدلتا رہتا ہے لیکن معاشی زندگی اور معاشی روابط کی نہ ختم ہونے والی تبدیلیوں، جدتوں، اختلافوں اور انسانی علم کے ذخیرہ میں لامتناہی اضافوں اور تفریقوں میں انسانی فطرت ہے کہ یکساں رہتی ہے۔ دکھ کا، تکلیف کا، زندگی کا، موت کا معما، مایوس امیدوں یا ناکام محبت سے پیدا ہونے والے غم، افلاس اور عسرت سے پیدا ہونے والی بےچینی و کرب، قسمت اور مقدر کے خلاف کی جانے والی ناکامیاب جنگ: یہ ہیں وہ موضوعات جو ہمیشہ مسرت پیدا کریں گے، دلوں کو فریفتہ کریں گے، ان میں روح پھونکیں گے اور لوگوں کو ان کے مردہ لفظوں سے زیادہ بلند مقامات پر لے جائیں گے۔ خوشی کی شاعری، دکھ درد کی شاعری انسانی دل میں تاثر پیدا کئے بغیر نہیں رہتی۔ یہ خوش بختی پُرمسرت ہے اور بدبختی کی تسکین۔

"بیٹا! زندگی ایسی ہی ہے، ایک مستقل شیون، ایک مستقل جدائی۔ ایک مستقل علیحدگی!" کس قدر پُر درد حقیقت، اور ساتھ ہی کس قدر سچی، کس قدر اثر آفریں! یہ وہ سچائی ہے جو زندگی کے سرچشمہ سے حاصل کی گئی ہے۔ لیکن کیا ہاتنؔ کی طرح صائبؔ نے وہی بات نہیں کہی؟

طومار درد و داغ عزیزانِ رفتہ است

ایں جِلدے کہ عمرِ درازاست نامِ او

اس لطافت، تازگی اور دل آویزی کا راز جو سچا شاعر اپنے اندر رکھتا ہے، اس ابدیت کا راز جو انحطاط اور موت پر حقارت سے ہنستا ہے شاعر کے احساس کی ہمہ گیری ہے، اس کے جذبات کی عمومیت ہے، زندگی کے مستقل عناصر پر اس کی مضبوط گرفت ہے۔ اگرچہ ہماری اپنی ہندوستانی شاعری ایرانی شاعری کے نمونہ پر ڈھالی گئی ہے تاہم وہ نہ تو اس کی غلامانہ نقل ہے نہ اس کا بےجان ترجمہ ہی ہے ممکن ہے خیالات یکساں ہوں لیکن اس کا طریقۂ اظہار طبع زاد، موثر اور دلفریب ہے۔ کون ہے جو میرؔ تقی، مومنؔ، ذوقؔ، آتشؔ، ناسخؔ اور سب سے آخر مگر بلحاظ اہمیت کسی سے کم نہیں، غالبؔ کے کلام میں ایک ماہر فن کی خصوصی مہارت اور سچے شاعر کا اختراعی کمال محسوس کئے بغیر رہ سکے؟ ان کی لطافت اور متانت، ان کی بلند پروازی اور رفعت۔ ان کے قہقہے اور آنسو اس قدر نازک، اس قدر پاکیزہ ہیں کہ الفاظ میں نہیں سما سکتے یا کوشش کرنے پر بھی الفاظ کا جامہ نہیں پہن سکتے۔ وہ ذہنی دیوتاؤں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جنہیں دنیا لافانی کے نام سے یاد کرتی ہے۔

غالبؔ کی غیر معمولی شاعری بلاشبہ اس سے زیادہ شہرت کی حقدار ہے جو اسے اب تک نصیب ہو چکی ہے اور یورپ کو ابھی یہ جاننا باقی ہے کہ کچھ عرصہ پہلے ۱۸۶۹ء میں ایک ایسے شخص نے انتقال کیا جس کے قصیدے انوریؔ اور خاقانیؔ کے ہم پلہ ہیں، جس کی غزلیں عرفیؔ اور طالبؔ کی غزلوں سے بڑھ چڑھ کر ہیں، جس کی رباعیاں عمر خیامؔ کی رباعیوں کے برابر رکھنے کے قابل ہیں اور جس کی نثر ابوالفضل اور ظہوری کی نثر سے زیادہ شاندار ہے (یادگار غالب، صفحہ ۱۷۸)

آخر ہمارے شاعر کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں؟ اس کی نثر اور شاعری خود نوشت سوانح عمری کے ایسے ٹکڑے ہیں جن سے ہمیں اس کی زندگی کے بارے میں بصیرت حاصل ہوتی ہے جو سراسر بیزاری اور شدید کشمکش کی زندگی تھی، جہاں تک اس کے معاصرین کا تعلق ہے، ان کی زندگی تکلیف دہ بےاعتنائی کی زندگی تھی اور جہاں تک اس کے دوستوں کا تعلق ہے، ان کی امداد میں کم التفاتی کا جذبہ کارفرما تھا۔ غالبؔ لازماً خود شناسی کا شاعر ہے۔ وہ زندگی اور زندگی کے جملہ پہلوؤں کا گیت گاتا ہے۔ وہ بادۂ ارغوانی اور جام کے گیت گاتا ہے۔ وہ اپنے دل کو اپنے قارئین کے سامنے چیر کر رکھ دیتا ہے اور خود اپنی زندگی کی تلخیوں، اپنی قسمت کی کوتاہیوں،

اپنی سراب نما امیدوں (جو کبھی پوری نہیں ہوتیں) اپنی عذاب میں ڈالنے والی فلاکتوں، اپنی ناکام کوششوں، اپنے شبہات جن میں کبھی کبھی خدا تعالیٰ کی ہستی اور ذات ۔ تب پسند کے مسرت بخش اعتقاد کی جھلک نمایاں ہو جاتی ہے، اپنی شاعری کے لافانی ہونے پر ناقابل تسخیر اعتقاد کے نغمے گاتا ہے ۔ الغرض اس کی نثر اور شاعری اس کے مختلف اور تغیر پذیر حالات کی یادداشت ہیں، اس میں کبھی پُرمسرت توقع کی کیفیت پائی جاتی ہے اور کبھی ایسی تیرگی کی جس کی تہ نہیں ملتی ؛

غالب اعلیٰ درجہ کا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجہ کا نثار بھی ہے ۔ وہ ہمارے دور کا سب سے بڑا نثر نگار ہے، اتنا بڑا کہ اس کا کوئی مدمقابل نہیں ۔ اس کی دلفریب لطافت، اس کی مسرت بخش سادگی، اس کی نکتہ سنجی اور ظرافت، اس کی دلکش روانی، اس کا ہلکا پھلکا انداز بیان، اس کی بے ساختگی اور دلربائی ۔ یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ ان سے سبقت لیجانے والا تو کیا حریف بھی پیدا نہیں ہوا ۔ یہ مبالغہ آمیز تعریف نہیں ہے، بلکہ وہ محتاط رائے ہے جو اس کے ممتاز سوانح نگار حالی پانی پتی نے قائم کی ہے ۔ اس کے علاوہ غالب کے کلام کا ایک اور پہلو ہے جس پر ہم یہاں اظہار خیال کر سکتے ہیں ۔ اس کے خیالات نہایت بلند، دقیق اور نازک ہیں اور وہ اتنے ہی خوددار ہیں جتنے کہ وہ الفاظ حسین ہیں جن میں ان کو ادا کیا گیا ہے ۔ اس کے اردو اور فارسی دیوان ادبی جواہرات ہیں، وہ صیاد پتھر، یاقوت، رمانی اور نیلم سب ایک مرکب کی صورت میں پیش کئے گئے ہیں ۔ وہ موحد تھا جس نے بہت عرصہ پہلے مذہب کے غیر ضروری عناصر سے علیحدگی اختیار کر لی تھی ۔ اس نے کوئی فرقہ وارانہ لیبل نہیں لگایا ۔ وہ اسلام کا قائل تھا، ایسا اسلام جو کٹرپن، فرقہ بندی اور تنگ خیالی سے آزاد ۔ مبرا اور منزہ تھا ۔

با من میاویز اے پدر فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

اس شعر سے ہمیں اس کی بے باک آزادی خیال کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔ اپنے ایک خط میں وہ لکھتا ہے : "میں ایک خالص موحد اور سچا مسلمان ہوں" اور وہ تھا بھی ۔ درحقیقت ایسا ہی یہی وہ روح تھی جس نے اسے دوسرے مذاہب کے بارے میں اس قدر غیر معمولی طور پر فیاض، روادار، ہمدرد بنا دیا تھا اور جس نے اس سے یہ کہلوایا :-

حرف حرفم در مذاقِ فتنہ جا خواہد گرفت
در نگاہ نازِ شیخ و برہمن خواہد شدن

یہ وہ پہلو ہے جو انتہائی نمایاں اور قابلِ اعتنا ہے جس کی رائے عامہ کے لئے انسانی مسلّمہ حقارت ۔ اگرچہ غالب ایک ایسے دور میں اور ایسے لوگوں میں رہا جو بہ حیثیت مجموعی نہ تو فاضل تھے اور نہ قابلیت کے پرکھنے والے ہی تھے ۔ ہندوستان میں اسلامی علم و فضل کا سنہری دور ختم ہو چکا تھا تاہم بلاشبہ ایسے آدمی بھی موجود تھے، معدودے چند لیکن وہ لوگ تھے زندہ ۔ اور اس کے ہمعصر جنہوں نے اس کی اعلیٰ قابلیتوں کو تسلیم کیا تھا اور اس کی ذہنی برتری کو مانا تھا ۔ یہ تھے فضل حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین خاں، عبداللہ خاں علوی، امام بخش صہبائی، مومن خاں، نواب مصطفیٰ خاں، نواب ضیاءالدین، سید غلام علی خاں، وحشت اور حالی جو اس کے سوانح نگار ہیں ۔ ان کے علاوہ بہادر شاہ اور نواب رامپور تھے جو انہیں مالی امداد دیتے رہتے تھے اگرچہ ہمیں اقرار کرنا چاہئے کہ وہ اتنی زیادہ نہ تھی کہ اس کا ذکر کیا جائے ۔ اپنی زندگی میں غالب ایسا شخص نہ تھا کہ اس کے کمال کا بالکل اعتراف نہ کیا گیا ہو، لیکن وہ اعتراف ایسا تھا جو پوری طور پر اس کی خداداد قابلیتوں کے مطابق نہ تھا ۔ قسمت ادیبوں پر غیر معمولی طریقہ سے کبھی مہربان نہیں رہی، اور اس بارے میں غالب عامِ کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھا جس [illegible] کا احساس اور اظہار غالب نے کیا ہے کونسے غیر معمولی ذہانت اور قابلیت رکھنے والے شخص نے اسے محسوس نہیں کیا ؟ کونسا غیر معمولی ذہین شخص ہے جس نے اعتراف قابلیت کے لئے اپیل نہیں کی ۔ اور اپیل کی بھی ہے تو اس میں اسے ناکامی ہوئی ۔ جیسے اس کے معاصرین نے صرف تھوڑدلی اور بخل کے ساتھ قبول کیا ہے ؟ کیا صائب نے نہیں کہا ہے ؟

بے اجل یاد کسے خلق بہ نیکی نکند
مرگِ ایں طائفہ را بر سر انصاف آرد

نہ غرور نہ خودبینی بلکہ اپنی شہرت کا یقین اور دوام ہی وہ چیز ہے جس کا اظہار ذیل کے شعر میں کیا گیا ہے، دھیما، لڑکھڑاتا ہوا نہیں بلکہ مضبوط یقین اور راسخ :-

ہم نفس

ہادی حسین

مری دمساز، میرا ساز بن جا
مرے جذبات کی آواز بن جا
مری خاموشیوں کی ترجماں بن
مری گویائیوں کا راز بن جا
لگا کر شعلۂ آواز کے پر
مرے افکار کی پرواز بن جا
اگر آواز کے پر جل کے رہ جائیں
سکوتِ زمزمہ پرداز بن جا
شکستِ تار کی جھنکار بن کر
دہانِ زخم کی آواز بن جا
مرے نقصِ بیاں کا بن تتمہ
مری تخئیل کا اعجاز بن جا
سراپا اک نوائے راز بن کر
مرے ہر راز کی غماز بن جا
مری دمساز، میرا ساز بن جا

آنچ

انجم رومانی

اندھیرے سے چاند اپنا دامن بچاتا ہوا
گزر جائے گا
اجالے میں ہم اپنے دل کو سنبھالے ہوئے
گزر جائیں گے

کہے گا کوئی ابر پارہ کہانی عجیب
کہے جائے گا
رہے گا کوئی گیت آوارہ دل کے قریب
نہ یاد آئے گا

کسی پھول کی باس منڈلائے گی آس پاس
کرے گی اداس
کسی شام کا ملگجا سا سُلگتا سماں
رہے گا جواں

تحفہ

عنایت اللہ

بیگم اکبر خاوند کی موت کے بعد ایسی بیمار ہوئی کہ چارپائی سے لگ گئی۔
اس کی محل نما کوٹھی کے سامنے سے ایک ڈاکٹر کی کار ہٹتی تھی تو دوسری آ کھڑی ہوتی تھی
دنیا بھر کے انجکشن بیگم اکبر کے کمرے میں جمع ہو گئے تھے۔ اونچی سوسائٹی میں تو
جیسے بھونچال آگیا تھا۔ تیمارداروں کا ایک ہجوم جمع رہتا تھا۔ بیگم اکبر اگر بیگم
نہ ہوتی اور کوٹھی کی جگہ جھونپڑی میں رہتی تو یہی انجکشن اور یہی ڈاکٹر اسے سراب کی
مانند دکھائی دیتے اور وہ اس دنیا سے جاڑے کی چاندنی کی طرح گذر جاتی،
لیکن وہ بیگم تھی۔ دولت مند بیوہ تھی۔ شہر میں چار کوٹھیاں کرائے پر چڑھی ہوئی
تھیں۔ چار بسیں چل رہی تھیں۔ سینکڑوں ایکڑ زمین سونا اگلتی تھی۔ بیس ایکڑ میں
پھیلے ہوئے سنگتروں اور مالٹوں کے قطار در قطار درختوں سے روپوں کی
تھیلیاں جھڑتی تھیں۔ وہ اٹھائیس برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی۔ اکبر مرحوم کے
ساتھ اسے وہی پیار تھا جو ہر ایشیائی بیوی کو اپنے شوہر سے ہوتا ہے۔ اکبر کی
موت نے بیگم کو زندہ درگور کر دیا۔ وہ زندگی نہ رہی۔ زندگی کا وہ رچاؤ نہ رہا۔
سہانے خوابوں کے لرزتے تاروں پر وہ جھولا جھولتی رہی اور اشکوں کے دھندلے
میں تصورات کے سحر سے مسحور ہوتی رہی۔ اس نے اپنے آپ کو فریب دیئے۔
تنہائیوں کو دھوکے دیئے۔ بیگم نے شب کی اداس تیرگی میں بیش قیمت فرنیچر سے
آراستہ کمرہ میں مرحوم اکبر کے پاؤں کی آہٹ بھی سنی لیکن لرزتی ہوئی ایک کراہ
اسے بار بار کہتی رہی ۔۔۔ "ناتمید! اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا"۔
اجڑے ہوئے سہاگ اور لٹے ہوئے سکون کو اس نے کہاں کہاں
تلاش نہ کیا۔ ہلکی سبز لیموں تری کار میں، محل نما کوٹھی کے تیرہ آراستہ پیراستہ
کمروں میں۔ چاندی کی جھنکار اور سونے کی چمک میں اسے وہ قرار نہ مل سکا
جو اس نے اکبر کی والہانہ محبت اور راز و نیاز میں پایا تھا۔ زندگی بے نشان
خوابوں کی دھند میں اسے وہ منزلیں دکھاتی رہی جن تک اب کوئی رستہ نہ تھا
اور زرنیلی تمنائیں ایک ایک کر کے بجھتے دیوں کی طرح دم توڑتی گئیں۔ دو برس
تنہائیوں میں دو برس گذر گئے۔ بیگم اکبر نے محبت کی تھی۔ وہ محبت کرنا جانتی
تھی اور یہ محبت اس کے رگ و ریشہ میں سمائی ہوئی تھی۔ بیوہ بیگم دو برس تک
ایک روگ کو آنسوؤں سے سینچتی رہی جو آہستہ آہستہ اس کی ہڈیوں میں اترتا
کرتا گیا اور آخر اس کی ٹانگوں کی ہڈیوں میں جم کے بیٹھ گیا۔

بیوہ جوان تھی اور حسین بھی لیکن دولت نے اسے حسین تر بنا دیا تھا۔
جوں جوں اس کا مرض بڑھتا جا رہا تھا اس کے غمخواروں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔
اس کے گرد ایک ہجوم منڈلاتا رہتا تھا۔ ان میں کنوارے بھی تھے۔ رنڈوے بھی تھے اور
دوسرے بھی۔ وہ بظاہر بیگم اکبر کے غمخوار تھے لیکن دل ہی دل میں وہ اس غم میں گھلے
جا رہے تھے کہ اتنی دولت کو کون سنبھالے گا۔ بے چاری اس عمر میں بیوہ ہو گئی ہے۔
بعض نے دبی زبان میں رفاقت کے دعوے کئے۔ بعض نے اشاروں اشاروں میں
کچھ کہہ دیا لیکن بیگم اکبر ان ہمدردیوں اور نظروں کو بھانپ گئی تھی کہ یہ نظریں
جن میں یہ لوگ پیار دھر کے لائے ہیں مجھ پر نہیں، میری کوٹھی اور دولت کو دیکھ
رہی ہیں۔" اس نے بارہا ان پھسلتی ہوئی نگاہوں کو دیکھا۔ محسوس کیا۔ کچھ کہنا چاہا
لیکن خاموش رہی۔ وہ انہیں کہنا چاہتی تھی کہ میں نے اکبر کو چاہا تھا اس کی دولت کو
نہیں۔ تو اکبر کی دیوانگی تھی کہ اس نے میری محبت کی خاطر یہ جائداد اور سب
کچھ میرے نام منتقل کر دیا تھا۔ مرحوم میری محبت کی قیمت نہ جان سکا۔ کاش!
وہ زندہ رہتا اور میں اس کے بدلے دولت کے انبار زمین میں دفن کر دیتی۔"
لیکن اونچی سوسائٹی کے آداب نے اسے کچھ کہنے نہ دیا۔

ہڈیوں کا روگ بڑھتا گیا۔ ٹانگیں نرم و نازک جسم کو اٹھانے سے انکار
کرنے لگیں اور بیگم سارا سارا دن لان میں آرام کرسی پر نیم دراز رہنے لگی۔
ڈاکٹروں پر ڈاکٹر چلے آ رہے تھے۔ تیمارداروں کی قطار دراز ہی ہوگئی۔ مریضہ کی
شگفتگی پر غموں کا سایہ پڑ رہا تھا۔ اب جوانی کو ہڈیوں کا درد چاٹنے لگا۔ ڈاکٹر
بے بس تھے۔ رفتہ رفتہ مرض اتنی دور رس بنتا گیا۔

گدھوں کا گلہ اکٹھا ہونے لگا۔ اور رال ٹپکنے لگی۔

بیگم اکبر نے اس کرب و اضطراب میں مرحوم شوہر کو رہ رہ کر پکارا۔ تصور
میں اس کا تعاقب کیا۔ ہوتی تو ویران الاؤں میں اسے بستر میں ٹٹولا اور بیگم کی
گرم آہیں ہر دکھ بن کر دن گزارتے ہوئے بگولے کی طرح دیواروں سے
ٹکراتی رہیں۔ مرحوم کی یادگار یہ دولت و جائداد اور یہ روگ تھا۔ نہ کوئی بچہ
نہ بچی۔ بس ایک تصویر تھی جو سونے کے کمرے میں انگیٹھی پر رکھی رہتی تھی جس کے گرد

ہر صبح تازہ پھولوں کا ہار اٹھنا بیگم کی زندگی کا لازمی جزو بن گیا تھا۔ بیگم اس انبوہ میں تنہا تھی اور یہ تنہائی اذیت ناک تھی۔

تیمارداروں اور غمخواروں کے اس ہجوم میں صرف ایک آدمی تھا جو بیگم اکبر کی نظروں میں جچتا تھا۔ وہ تھا اکرم۔ ایک لاکھ کے سرمایہ سے اس نے مل کھولا تھا لیکن ابھی کاروبار خسارہ میں ہی جا رہا تھا۔ چونتیس پینتیس برس کی عمر کا ہوگا اور ابھی غیر شادی شدہ تھا۔ دیکھنے میں اچھا خاصا خوبرو جوان تھا۔ ہونٹوں میں قہقہے اور آنکھوں میں دلکش مسکراہٹیں رچی ہوئی تھیں۔ بیگم اکبر کے ساتھ اس کا برتاؤ دوسروں سے مختلف تھا۔ اس کے رویہ میں غرض اور ڈپلومیسی نہیں ہوتی تھی۔ وہ جب بھی آتا مختصر الفاظ میں حال پوچھتا اور کچھ اس انداز سے باتیں کرتا کہ بیگم اکبر اسے اپنی علیل زندگی کا ناگزیر جزو سمجھنے لگ گئی۔ بعض اوقات تو اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اکرم نہیں ہوتا تو اس کی ہڈیوں کے درد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

بیگم اکبر نے عرصے سے بسوں اور جائداد کی آمدنی اور اخراجات کا حساب کتاب بھی نہ دیکھا تھا۔ جانے کتنا روپیہ آتا تھا اور کتنا جاتا تھا۔ اسے اسی قدر خیال تھا کہ جتنے بل اس کے سامنے لائے جاتے ہیں وہ بغیر پوچھے چیک کاٹ دیتی ہے۔ اکرم پہلا انسان تھا جس نے ایک دن یہ حساب کتاب چیک کیا۔ درست کیا۔ بیلنس شیٹ بنائی اور اس مقصد کے لئے تین سو روپیہ ماہوار پر ایک کلرک رکھ دیا۔ یہاں تک کہ اس نے باورچی خانہ کا بھی حساب چیک کر کے خانساماں کو ڈانٹ پلا دی۔ اکرم ہر ہفتہ عشرہ کلرک اور خانساماں کی جان کھانے لگ گیا۔

بیگم اکبر اکرم کی یہ دلچسپی دیکھتی رہی اور اس کے تصوروں میں اکبر مرحوم کی تصویر نکھر آئی۔ اس نے آہ لی اور زیر لب کہا۔ "اکبر اور اکرم میں صرف یہ فرق ہے کہ وہ اکبر تھا یہ اکرم ہے۔" اکرم اس کوٹھی میں جذب سا ہوتا جا رہا تھا۔ جوں جوں اکرم بیگم اکبر کے مریض ماحول میں سماتا جا رہا تھا بیگم کے دل میں تیمارداروں اور غمخواروں کے خلاف ناپسندیدگی نفرت کی صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔

ایک دن اس نے اکرم کو کہہ ہی دیا۔ "مسٹر اکرم! ان لوگوں سے کہئے یہاں نہ آیا کریں۔ ناحق پریشان کرتے ہیں۔" اکرم نے اس کی طرف دیکھا۔ چہرے پر وہی زیر لب تبسم اور مسکراتی ہوئی آنکھیں جیسے پوچھ رہی تھیں "کیا میرا نام بھی اسی فہرست میں ہے؟" بیگم اکبر کی آنکھوں میں دو آنسو امڈ آئے جن کے پیچھے بے بس محبت تڑپ رہی تھی۔ وہ چند ثانئے اکرم کی طرف دیکھتی رہی اور سرگوشی کے لہجہ میں کہا۔ "اکرم!" اس نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ اکرم آہستہ آہستہ اٹھا اور ہوا میں معلق اس مرمریں ہاتھ کو تھام کر کہا۔ "ناہید!" اس نے اس انداز سے کہا جیسے 'ناہید' کے لفظ کا ذائقہ چکھ رہا ہو۔ وہ بیگم کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اسے ناہید کہا تھا۔

"تم اکیلے آیا کرو۔ تم اکیلے میرے پاس بیٹھا کرو۔" بیگم اکبر کے منہ سے یہ الفاظ ایسی بے ساختگی سے نکل رہے تھے جیسے وہ الفاظ کے اس سیل کو جانے کب سے روکے ہوئے تھی اور آخر یہ سیل بند توڑ کر بہہ نکلا۔ "تم ہوتے ہو تو مجھے اکبر بھول جاتا ہے۔ میں اس درد کو بھول جاتی ہوں۔ میں بھلی چنگی ہو جاتی ہوں۔ اکرم! میرے قریب آجاؤ۔ اور قریب ......" جانے وہ کیا کچھ کہتی کہ کسی کی کار کی بریکوں کی چیخ نے یہ طلسم توڑ ڈالا۔ ابلتے ہوئے جذبات کے سرچشمہ کو جیسے کسی نے پتھر سے بند کر دیا اور دوسرے لمحہ کمرہ میں "ہیلو مسز اکبر" کی گھسی پٹی آواز گونجی جیسے کسی نے جھیل کے سکوت کو بھاری بھرکم پتھر سے تہ و بالا کر ڈالا ہو۔

چند ہی روز بعد اونچی سوسائٹی نے زلزلہ کا شدید جھٹکا محسوس کیا۔ بعض نے اپنے آپ کو فریب دیا کہ "یہ خبر صحیح ہو ہی نہیں سکتی۔"

"آخر یہ ہوا کیونکر؟"

"ڈنر تک نہ دیا۔"

"ہلکی سی گارڈن پارٹی ہو جاتی۔"

"ان سے تو جھونپڑیوں والے اچھے ہیں۔ ڈھول باجا تو بجا لیتے ہیں۔"

"یہ افواہ ہے"

"یہ جھوٹ ہے"

"یہ درست ہے"

"سنا آپ نے بھی؟"

"کیا؟"

"بیگم اکبر نے اکرم کے ساتھ شادی کر لی ہے۔"

منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ انگلیاں دانتوں تلے دب گئیں۔ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ بیشتر نے شکست خوردگی کے تلخ احساس کو دبانے کے لئے اونچی آواز میں اکرم کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا اور بیگم کو بھی رسوا کیا لیکن شادی ہو چکی تھی۔ بیگم کے پژمردہ چہرہ پر زندگی کے آثار نکھرنے لگ گئے تھے اور اب وہ آرام کرسی سے اٹھ کر بہت دیر تک لان میں ٹہلنے بھی لگ گئی تھی۔ اس لئے نہیں کہ مرض میں افاقہ ہو گیا تھا بلکہ اس لئے کہ اسے ایک سہارا مل گیا تھا جو بیگم کی نظر میں اکبر کا صحیح نعم البدل تھا۔ گم کردہ راہ کو منزل کے نشان ملنے لگے تھے۔

اس شادی سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ بیگم کی کوٹھی کی فضا میں اب کالونی کی ترکیب نہ گونجا کرتی تھیں۔ تیمارداروں کا مجمع منتشر ہو گیا۔ پانچ چھ ڈاکٹروں کی جگہ صرف ایک ڈاکٹر آنے لگا جسے اکرم نے منتخب کیا تھا اور جو ڈاکٹر تحفتاً آتے تھے انہیں چھٹی مل گئی۔ اکرم کی مل کے لئے جاپان سے مشین اور جاپانی مستری آگئے۔ سونے کے کمرہ میں اکبر مرحوم کی تصویر کے گرد پھول مرجھا کر جھڑ گئے اور کوٹھی کی فضا میں چھائی ہوئی اداسیاں ڈھل گئیں۔ اکرم نے فرصت کی تمام ساعتیں بیگم کے لئے وقف کر دیں۔ وہ مثالی شوہر ثابت ہوا۔ شادی کو ایک سال ہونے کو آگیا لیکن بیگم کی ٹانگوں سے درد نہ گیا۔ دل سے اکبر کی یاد چلی گئی۔ اور اس دل کی ہر دھڑکن میں اکرم سما گیا۔

اب اکرم نے گھر میں یہ اضافہ کیا کہ بیگم کی تیمارداری کے لئے اپنی ایک ماموں زاد بہن کو لے آیا۔ سترہ اٹھارہ برس کی اس کنواری لڑکی کی آنکھوں میں شوخی، حرکات میں چلبلاپن اور ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ چھائی رہتی تھی۔ اس حسین و دلنشین لڑکی نے آتے ہی بیگم کو اپنی ماں کی طرح سنبھال لیا اور ہر وقت اس کی دیکھ بھال اور دل بہلانے میں مصروف رہتی۔ بیگم نے اکرم اور اس لڑکی کو [illegible] کرتے دیکھا لیکن اسے اکرم پر اس قدر بھروسہ تھا کہ اس نے دل میں کسی قسم کے شک کو جگہ نہ دی۔ لڑکی کا رویہ بھی تو پیار، محبت اور دیانتداری سے لبریز تھا۔ بیگم کی علیل زندگی کا ایک مہیب خلا اکرم اور اس لڑکی نے پر کر دیا تھا۔

بیگم بدستور بیمار چلی آ رہی تھی اور اس کے بازو انجکشنوں نے چھلنی کر دیئے تھے۔ اب تو وہ اس علاج سے اکتا گئی تھی۔ ایک رات اکرم اور اس کی ماموں زاد بہن بہت دیر تک بند کمرہ میں بیٹھے رہے۔ اس رات انہوں نے راز و نیاز کی گہری باتیں کیں، اور ایک سکیم تیار کر لی۔ آسمان میں ایک ستارہ دوسرے کی طرف لپکا۔ دوڑا، آخری بار چمک کر ٹوٹ گیا۔ رات کی تاریکی اور گہری ہو گئی۔ سب کے پراسرار سناٹے میں بیگم گہری نیند سو رہی تھی۔

دوسری صبح اکرم کے شگفتہ چہرہ پر ہلکی سی افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ باتوں میں بھی کسی حد تک لڑکھڑاہٹ اور الفاظ میں ہلکا سا لرزہ تھا۔ آنکھوں میں بے چینی اور ہونٹوں کی بے کلی جیسے ایک جرم کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اکرم کے مزاج کی یہ کیفیت بیگم سے چھپی نہ رہ سکی اور اس نے اداس و مایوس نگاہوں سے اکرم کی طرف دیکھ کر کہا: "شادی کرنی ہی تھی تو کسی اچھی بھلی لڑکی سے کرتے۔ آپ نے تو اپنی بھرپور زندگی کو روگ لگا لیا ہے۔ میں تو کبھی تندرست نہ ہو سکوں گی۔"

"ناہید! کیوں ایسی باتیں سوچتی ہو۔۔۔۔" اکرم نے لپک کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور کہا: "تم زندہ رہو اور تمہاری محبت زندہ رہے۔"

"آپ نے میری خاطر اپنی امنگوں کا گلا گھونٹ دیا ہے۔۔۔۔" بیگم نے دکھی ہوئی آواز میں کہا۔ "کاش! میں ان کی قیمت دے سکتی۔" اس نے آہ لی اور گہری فکر میں ڈوب گئی۔ جانے وہ خلاؤں میں کیا دیکھ رہی تھی جو اسے نظر آیا اور اس کے علیل ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم رینگ گیا۔

"مجھے کل پتہ چلا ہے۔۔۔۔" اکرم نے کہا۔ "۔۔۔۔ کہ مری میں پولینڈ کا ایک ڈاکٹر آیا ہے جو ہڈیوں کے امراض کا ماہر ہے۔ اگر تم پسند کرو تو کل ہی مری چلے چلیں۔ ویسے بھی اس موسم میں وہاں جانا چاہیئے تھا لیکن اس ڈاکٹر کی سن کر میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہاں ضرور چلیں گے کل ہی۔ کار پہ چلا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ نوکروں کو یہیں چھوڑ دیں گے۔ وہاں اپنی کوٹھی تو ہے ہی۔۔۔۔"

"جیسے آپ کی مرضی!" بیگم نے تائیداً کہا۔

اور تیسرے روز وہ بادلوں کی اوٹ سے جھانکتی ہوئی ایک پہاڑی کے دامن میں [illegible] کی کوٹھی میں پہنچ چکے تھے۔ ساون کے بادلوں نے مری کے حسن کو دھو کر نکھار دیا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی اکرم نے بیگم کو کہا۔ "ایک دو روز آرام کر کے ڈاکٹر کو بلائیں گے۔ اور نوکروں کا بندوبست بھی ایک دو روز بعد کریں گے۔ فی الحال ہوٹل سے کھانا آجایا کرے گا۔"

"کسی وقت بلا لیں گے ڈاکٹر کو۔۔۔۔ کیا ضرورت ہے۔ میں تو اب۔۔۔۔" بیگم کہتے کہتے رک گئی اور اس کے ہونٹوں پر انوکھی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اکرم نے یہ مسکراہٹ پہلی بار دیکھی تھی۔ وہ کچھ سمجھ نہ پایا لیکن اس مسکراہٹ کے انوکھے پن کو محسوس ضرور کیا اور اس کا مجرم ضمیر اس کی ہستی میں دبک گیا۔ اس کے بعد اس نے دیکھا کہ بیگم اس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی ہے۔ ان نظروں میں بے چارگی کی جھلک نمایاں تھی اور ایک پیغام بھی تھا جسے پلکوں نے چھپا رکھا تھا۔ اکرم نے وہ دن بے چینی میں گزارا۔ وہ ہاتھوں کا رعشہ چھپانے کی خاطر ہاتھ جیب ہی میں ڈالے رہا۔ بیگم زیادہ دیر تک اسے دیکھتی رہتی لیکن اس پر پراسرار سی خاموشی طاری ہو گئی۔ اکرم یونہی غیر ارادی طور پر باہر نکل جاتا۔ برآمدے میں ٹہلتا اور چند قدم ٹہل کر پھر کمرہ میں آ جاتا۔ جب دیکھتا کہ بیگم اسے انہی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے تو وہ بے قرار ہو جاتا۔ شام کو وہ اسی کیفیت میں اٹھ ہی رہا تھا کہ بیگم نے اسے روک لیا۔

"بیٹھو نا! کہاں چل دیئے؟"

"کہیں نہیں! یونہی ذرا۔۔۔۔"

"نہیں! میرے قریب رہو۔۔۔۔" بیگم نے للچائی ہوئی پرہوس نظروں سے دیکھا۔ "اب میرے قریب ہی رہو۔ اب میں صحت یاب ہوتی جا رہی ہوں۔ دیکھو تو ذرا میرے ہاتھوں کو۔۔۔۔" وہ سہم سی گئی اور سہمے ہوئے بچے کی طرح بولی۔ "مجھ پر ہول طاری ہوتا جا رہا ہے۔ کہیں چلے نہ جانا۔"

اکرم نے محسوس کیا جیسے اس کے کردار و شخصیت کی ایک کمزور کڑی زانو سے ٹوٹ کر گر پڑی ہے اور اس کی مردانگی ریزہ ریزہ ہو گئی ہے۔ اس نے آگے ہو کر بیگم کے ہاتھوں کو تھام لیا اور اپنی انگلیاں اس کی انگلیوں میں اس طرح الجھانے لگا جیسے اپنے کردار کی کڑیاں جوڑ رہا ہو۔

"آپ کے ہاتھ کانپ رہے ہیں!" بیگم نے اس کے ہاتھوں کو دباتے ہوئے کہا۔

"ٹھنڈ سی ہے۔۔۔۔" اکرم بے خیالی میں باتیں کر رہا تھا۔ "یوں ہی کچھ۔۔۔ شاید ٹھنڈ سی ہے۔"

وہ دن گذر گیا۔ وہ رات گذر گئی۔ ایک اور دن طلوع ہوا اور گذر گیا۔ یہ دو دن اور ایک رات اکرم کے لئے بہت طویل تھے۔ وقت جیسے جم کے کھڑا ہو گیا تھا۔ بے چینی کی گھڑیاں یونہی طویل ہوا کرتی ہیں۔ شام آئی۔ اندھیرا گہرا ہونے لگا تو اکرم نے بیگم سے کہا "چلو ذرا سیر کر آئیں۔"

وہ کار میں شہر سے باہر نکل گئے اور کار ایک سنسان جگہ رک گئی۔ اکرم نے کار کی بتیاں بجھا دیں اور اکرم، بیگم اور کار سب دن کی رات کی سیاہی کا ایک حصہ بن گئے۔ دوسرے لمحے لرزتے ہوئے دو ہاتھ بیگم کی گردن کی طرف بڑھے۔ شب کی تیرگی میں گھٹی ہوئی چیخ نے ہلکا سا ارتعاش پیدا کیا۔ پھر مریض جسم کی علیل سی تڑپ۔ مرمریں نازک انگلیوں نے مردانہ کلائیوں کو پکڑ لیا لیکن موت نے ان انگلیوں کی گرفت کو ڈھیلا کر دیا اور دونوں بازو جن کا رس موت نے چوس لیا تھا رانوں پہ یوں گر پڑے جس طرح دو کچی ٹہنیاں ٹوٹ کر گرتی ہیں۔ ساون کی گھٹائیں چمکیں بجلیاں گرجیں۔ آسمان پر اکے دکے ستارے کو بادلوں نے آغوش میں چھپا لیا۔ چیل کے درختوں نے ہوا کے ساتھ مل کر سسکیاں بھریں اور قدرت کے ہنگامہ میں۔ رات کی تاریکی میں عورت کی محبت ہمیشہ کی نیند سو گئی۔

اکرم کار میں سے نکلا۔ دوسری طرف کا دروازہ کھولا۔ لاش کو اٹھایا اور تھوڑی دور جا کر ایک گہرے، بہت گہرے کھڈ میں پھینک دیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگوں کو گھسیٹتا کار میں بیٹھا۔ اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔

اس نے کار کی بتیاں جلائیں تو اسے لگا جیسے بیگم کار کے سامنے کھڑی ہے — خاموش۔ بے حس۔ آنکھیں بند۔ ہونٹ سلے ہوئے — یہ فریب نگاہ ہی سہی لیکن اکرم نے بتیاں بجھا دیں۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے محسوس کیا جیسے نرم و نازک دو ہاتھوں نے اس کی گردن دبوچ لی ہے۔ اس نے سر کو زور سے جھٹکا دیا اور ٹائی کی گانٹھ ڈھیلی کر کے بٹن کھول دیا لیکن کوئی چیز اس کے گلے میں آ کر اٹک گئی تھی جسے وہ کوشش کے باوجود نگل نہ سکا۔

اکرم نے کار سٹارٹ کی۔ بتیاں جلائیں اور تیزی سے اسٹیرنگ گھما کر کار کو اس بھیانک منظر سے نکال لایا۔ بارش شروع ہو چکی تھی۔ کار چڑھائی چڑھ رہی تھی اور سامنے موڑ تھا۔ بائیں طرف پہاڑی اور دائیں طرف گہری وادی تھی۔ اس نے دیکھا کہ بیگم دائیں طرف سڑک کے کنارے کھڑی ہے — آنکھیں اور منہ بند — بجلی زور سے چمکی۔ اس قدر شدت سے کہ اکرم کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ کھولیں تو اس کا واہمہ غائب تھا۔ دل اس طرح دھڑک رہا تھا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آ جائیگا۔ کار کی پچھلی سیٹ سے آگے ہو کر جیسے کسی نے اکرم کے کان میں کہا۔ "خون کر لینا آسان ہے لیکن اسے ہضم کرنا بہت مشکل ہے۔" اکرم گھوم کر پیچھے دیکھنے ہی والا تھا کہ اس نے اپنی آواز پہچان لی اور ایکسیلیٹر پر پاؤں اور دبا دیا۔ اس نے اپنے آپ کو حوصلہ اور دلیری دینے کی کوشش کی اور تصور میں اپنے آپ کو چار بسیں۔ کرایہ پر چڑھی ہوئی چار کوٹھیاں۔ سنگتروں اور مالٹوں کے باغات اور ایک لاکھ کا بنک بیلنس دکھایا اور اس دولت میں کھیلتی ہوئی اس نے وہ ماموں زاد بہن بھی دیکھی جو سکیم کے مطابق تیسرے روز اس کے پہلو میں پہنچنے والی تھی۔ اکرم نے صبح اسے تار دینی تھی کہ "بیگم حرکتِ قلب بند ہونے کی وجہ سے مر گئی ہے۔" اکرم نے خون میں حرارت محسوس کی اور اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ بھی آئی لیکن یہ مسکراہٹ سہم کر وہیں کہیں دبک گئی۔

کار ایک اور موڑ مڑ رہی تھی کہ اکرم کو سامنے پھر بیگم کھڑی دکھائی دی۔ یہ واہمہ محسوس ہیکل کی حد تک مجسم تھا اور بغیر پاؤں ہلائے کار کی طرف بڑھتا آ رہا تھا۔ اکرم نے ایکسیلیٹر سے پاؤں اٹھا کر بریک لگا دی۔ دیکھا کار سڑک سے ہٹ کر ایک جھاڑی کے سامنے کھڑی تھی۔ بارش تیز ہو گئی تھی۔

اکرم پسینہ میں شرابور کوٹھی میں داخل ہوا۔ اندھیرے برآمدے میں پہنچا تو اسے یوں لگا جیسے اندھیرے غار میں داخل ہو رہا ہے۔ وہ کانپ اٹھا اور بھاگ کر برآمدے کی بتی جلائی۔ وہ دروازے کا تالا کھول رہا تھا کہ

اسے سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ وہ ٹھٹھک گیا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ برآمدے کے دوسرے کونے میں بیگم کھڑی تھی۔ اکرم نے سر کو جھٹکا دیا۔ پیشانی سے پسینہ پونچھا اور رومال سے آنکھوں کو زور زور سے ملا اور کواڑوں کو دھکیل کر کمرے میں پہنچ گیا۔ کمرہ میں پہنچا تو اسے یوں لگا جیسے کمرہ کی ایک ایک چیز اس سے بآوازِ بلند پوچھ رہی ہے: "بیگم کہاں ہے؟" "ناہید کہاں ہے؟" "بیگم کو کہاں چھوڑ آئے ہو؟" ملی جلی آوازوں کا یہ شور بڑھتا گیا اور اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے لیکن یہ آوازیں بلند سے بلند تر ہوتی گئیں۔ چھت پر موسلا دھار بارش کے قطرے مہیب شور بلند کر رہے تھے اور بجلی کی گرج سے کوٹھی کے در و دیوار ہل رہے تھے۔ اکرم نے کانوں سے ہاتھ ہٹا کر منہ پر رکھ لئے اور ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا لیا جیسے یہ الفاظ اس کے منہ سے بھاگ نکلنے کو تڑپ رہے ہوں: "میں نے بیگم کو قتل کر دیا ہے۔ میں نے اسے مار دیا ہے۔ میں یہ راز سینہ میں نہ رکھ سکوں گا۔ میں کمزور ہوں . . . . نحیف ہوں . . . . . . اکیلا ہوں۔ کوئی میرے اعصاب کو کشمکش سے چھڑائے۔ میں قاتل ہوں۔ مجھے بخش دو۔ میں گنہگار ہوں۔ مجھے یہ دولت نہیں چاہئے . . . ." وہ شاید چیخ ہی اٹھتا کہ کوٹھی کے سامنے ایک موٹر آکر رکی اور دوسرے لمحہ دروازہ بھاری بھرکم دستک ہوئی۔

اکرم نے اسے بھی واہمہ ہی سمجھا لیکن دروازہ دوسری بار کھٹکا تو وہ رہی سہی ہمت کے سہارے دروازہ کی طرف بڑھا۔ ڈرتے ڈرتے ایک کواڑ کھولا۔ باہر کا منظر دیکھ کر وہ غش کھانے ہی والا تھا کہ "آپ مسٹر اکرم ہیں؟" کے الفاظ نے اسے بیدار کر دیا۔ "اوہ! آپ . . . . . ." اکرم نے حیرت زدگی میں زیرِ لب کہا۔ اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔ منہ کھل گیا اور آہستہ سے رک رک کر بولا۔ "پولیس! . . . . . پولیس! . . . . . پولیس کو کس نے بلایا ہے؟ میں نے تو نہیں بلایا تھا۔" اکرم جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔

"جی ہاں! پولیس! . . . . میں ہوں انسپکٹر خان زماں اور یہ دو کانسٹیبل ہیں . . . ." باوردی پولیس انسپکٹر نے کہا۔ "ہم راولپنڈی پولیس ہیڈ کوارٹر سے آئے ہیں۔ رستے میں موٹر خراب ہو گئی تھی ورنہ ہم جلدی پہنچ جاتے . . . . . بیگم کہاں ہیں؟" انسپکٹر نے پوچھا۔ "ان کا نام ناہید فرزانہ ہے؟ ہم ذرا انہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"اوہ بیگم!" اکرم کے پاؤں تلے زمین ہل تو رہی تھی۔ اب زمین سرکنے لگی۔ اس نے صوفہ کے غلاف کے کونے کو مضبوطی سے پکڑ لیا جیسے ڈوبتے کے ہاتھ میں تنکا آگیا ہو۔ "بیگم! جی ہاں! ان کا نام ناہید فرزانہ تھا . . . . ہے۔"

"ذرا انہیں بلا دیجئے۔"

"انہیں بلا دوں؟" اکرم کے لہجہ میں بے پناہ خوف اور حیرت تھی۔

"وہ . . . . اوہ . . . . . وہ شام کو شاپنگ کے لئے چلی گئی تھیں۔"

"کب لوٹیں گی؟"

"یہ تو مجھے بھی پتہ نہیں . . . . لوٹ ہی آئیں گی۔ ابھی آجائیں گی۔"

"تو ہم ان کا انتظار کریں گے۔"

"اگر وہ رات بھر نہ آئیں تو؟" اکرم نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن لرزتے ہوئے ہونٹوں نے مسکراہٹ کو قبول نہ کیا۔

"تو ہم رات بھر یہیں بیٹھیں گے۔" انسپکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔ "ہم انہیں دیکھے بغیر نہیں جائیں گے۔"

چھت پر بارش کا شور اندھیری فضا کے پرخچے اڑا رہا تھا۔ کمرے میں بیٹھے ہوئے چاروں آدمی خاموش گئے لیکن اکرم کی داخلی دنیا میں بے ہنگم شور برپا تھا۔ ایک خیال آتا تھا ایک جاتا تھا۔ اسے کمرے کی ہر چیز گھومتی ہوئی دکھائی دینے لگی اور کانوں میں پھر وہی چیخیں سنائی دیں۔ "ناہید فرزانہ کہاں ہے؟" "بیگم کہاں ہے؟" "تم جھوٹے ہو۔ وہ شاپنگ کے لئے نہیں گئی۔" "بیگم کہاں ہے؟" "یہ پولیس والے ہیں . . . . بیگم کہاں ہے؟"

"میں نے اسے قتل کر دیا ہے۔" اکرم کے منہ سے یہ الفاظ آم کی گٹھلی کی طرح پھسل گئے۔ "کیا کہا آپ نے؟" انسپکٹر نے صوفہ پر اچھلتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپ نے انہیں . . . ." "ہاں! ہاں!" اکرم پر دیوانگی طاری ہو گئی۔ وہ چیخ کر بولا۔ "میں نے اسے قتل کر دیا ہے۔ اس کھڈ میں جا کر دیکھو . . . . . لیکن . . . . . لیکن . . . . ." وہ کہتے کہتے رک گیا اور خلاؤں میں گھورنے لگ گیا۔ انسپکٹر نے اٹھ کر اکرم کے کندھے تھام لئے اور نرم لہجہ میں کہا:

"بولئے۔ بولئے۔ گھبرائیے نہیں۔ لاش کھڈ میں پڑی ہوئی ہے۔ آپ نے اسے قتل کر دیا ہے۔"

اکرم نے نہایت آہستہ آہستہ گردن انسپکٹر کی طرف گھمائی اور کہا۔ "مجھے یقین تھا کہ میں نے یہ قتل نہایت ہوشیاری سے کیا ہے اور کھوج نہیں چھوڑا . . . . . انسپکٹر صاحب! قتل کر لینا آسان ہے لیکن اس کا ردِ عمل سنبھالنا ناممکن ہے۔ میں نے اقبالِ جرم کر کے کچھ سکون پایا ہے۔ خدارا

مجھے اتنا بتا دیجئے کہ آپ کو اتنی جلدی کس طرح پتہ چل گیا کہ میں نے بیگم کو قتل کر دیا ہے؟" "مسٹر اکرم!" انسپکٹر نے پولیس والوں کی طرح مسکرا کر کہا۔

"آپ کے اقبالِ جرم تک ہمیں علم نہ تھا کہ آپ اپنی بیوی کو قتل کر چکے ہیں ہمیں کراچی سے آپ کی بیگم کا یہ خط ملا ہے۔ ہم اس کے متعلق پوچھنے آئے تھے۔ لیجئے آپ کو خط پڑھ کر سناتے ہیں۔ آپ کی بیگم غالباً عرصے سے بیمار تھیں اور مرض لا علاج تھا؟"

"جی ہاں!"

"یہ خط کراچی سے پوسٹ کیا گیا ہے۔ شاید وہاں سے چلنے سے ایک آدھ روز پہلے ....." انسپکٹر نے لفافہ میں سے ہلکے سبز رنگ کا کاغذ نکال کر کھولا اور دور سے اکرم کو دکھا کر پوچھا۔ "آپ بیگم کے دستخط تو پہچانتے ہونگے؟"

"جی ہاں!" اکرم نے آگے جھک کر تحریر دیکھی اور کہا۔ "یہ بیگم کے ہیڈ کا ورق ہے اور تحریر انہی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔"

"بیگم نے پولیس ہیڈ کوارٹر کو لکھا ہے ....." انسپکٹر خط پڑھنے لگا:

"میں عرصہ سے ہڈیوں کے درد میں مبتلا ہوں۔ سینکڑوں علاج کرائے لیکن افاقہ نہ ہوا۔ مسٹر اکرم نے جو میرے موجودہ شوہر ہیں میرے لئے اپنی زندگی کا آرام و سکون قربان کر کے میرا ہاتھ تھام لیا اور میری اداس زندگی کو خوشیوں سے بھر دیا۔ انہوں نے مجھے وہ محبت دی جس کے لئے میں دیوانہ ہوئی جا رہی تھی۔ امید تھی کہ میں تندرست ہو کر اکرم کی محبت و ایثار کی قیمت ادا کر سکوں گی لیکن قدرت نے یہ امید پوری نہ کی۔ مجھے اکرم کے ساتھ والہانہ محبت ہے۔ میری محبت برداشت نہیں کر سکتی کہ جس انسان کو میں دل و جان سے چاہتی ہوں اسے اپنے مریض اور معذور جسم کے ساتھ چپکائے رکھوں اور اس کی زندگی اجیرن بنائے رکھوں۔ اکرم جوان ہے اور اس کی امنگیں محض میری خاطر [illegible] ہو گئی ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اسے آزاد کر دوں وہ میری تمام تر دولت و جائداد سنبھال لے اور دوسری شادی کر لے۔ لہذا میں نے خودکشی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں مسٹر اکرم کے ساتھ کل کراچی سے جا رہی ہوں مری پہنچنے کے تین روز بعد جو کہ ہماری شادی کی پہلی سالگرہ کا دن ہوگا میں زہر کھا کر خودکشی کر لوں گی۔ میں اپنی تمام جائداد و اثاثہ مسٹر اکرم کے نام منتقل کرتی ہوں۔ وصیت نامہ کی ایک نقل احتیاطاً آپ کو بھیج رہی ہوں۔ میرے مرنے کے بعد اکرم کو پریشان نہ کیا جائے کیونکہ اپنی موت کی ذمہ دار میں ہوں۔ شادی کی پہلی سالگرہ پر اپنی جان سے عزیز میرے پاس اور کوئی تحفہ نہیں جو میں اپنے محبوب کے قدموں میں پیش کروں۔

افسانہ:

"لالہ"

منہاج محمود

جب اُجلے اُجلے دودھیا پھولوں پر سنہری دھوپ پھیل گئی تو لالہ نے اپنے پھٹے ہوئے پرانے لحاف سے سر باہر نکالا۔ کمرے کی ہر چیز جوں کی توں دھری ہوئی تھی۔ سامنے مینٹل پیس پر اس کے ابا کی تصویر اسی آن بان سے مسکرا رہی تھی۔ جیسے وہ زندگی بھر فخر سے مسکراتے رہے تھے۔ ایک کونے میں اس کی ایک نئی بیاہی ہوئی سہیلی کی دلہن بنی ہوئی تصویر رکھی ہوئی تھی۔ اس کے سرہانے ایک ہشت پہلو میز پر شیشے کی سفید صراحی اور ایک گلاس رکھا ہوا تھا۔ اس نے صراحی کو اُلٹے لیٹ کر دونوں ہاتھوں سے اُٹھایا اور گلاس میں پانی انڈیل کر پینے لگی۔ الٹے لیٹے لیٹے اسے یاد آیا۔ اسکی امی اس طرح لیٹ کر اس کے پانی پینے پر کیسا ناراض ہوتی تھیں اور وہ جھٹ سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ یخ ٹھنڈے پانی کو چھوٹے چھوٹے گھونٹوں میں پیتے وقت اسے ایک طرح کی فرحت سی محسوس ہوئی۔ پانی پینے کے بعد اس نے سیدھے لیٹ کر ایک بار پھر اپنے کمرے کا جائزہ لیا۔ ہر چیز سکون سے اپنی جگہ پر رکھی ہوئی جیسے اس کی غربت، اور اس کا مذاق اُڑا رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ تھوڑی دیر تک وہ لیٹی اپنے ابا کے متعلق سوچتی رہی جو اس کے خاندان میں ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر اس تصویر کی طرف دیکھا۔ جس کی عظمت سے وہ فخر محسوس کرتی تھی۔ اور پھر دھیرے سے جیسے خود سے سوال کیا۔ اب وہ اگلی سی عظمت کہاں چلی گئی بولو۔ اور پھر وہ اپنے سرہانے رکھے ہوئے سبز شیڈ کے لیمپ کے سوئچ کو جلدی جلدی جلانے اور بجھانے لگی۔ جیسے وہ سوال اس نے خود سے نہیں۔ اپنے ابا سے کیا ہو اور اس کے ابا اس کو گھور رہے ہوں۔ اس نے دریچوں کی طرف دیکھا جن پر بادامی رنگ کے پردے لٹک رہے اور جن کے کناروں پر اجنتا کی رنگین تصویریں منقش تھیں۔ وہ ایک گہری سانس لے کر اٹھی۔ مسہری کی پائنتی سے اپنی ملاگیری رنگ کی شال اٹھا کر اپنے گرد لپیٹی، اپنی بوسیدہ جوتیاں پہنیں اور ڈریسنگ روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ سنگھار میز کے سامنے جھک کر آئینہ میں اپنی شکل دیکھی اور ہنس پڑی۔ اُلجھے ہوئے بال، خشک چہرہ، اس نے بالوں میں کنگھی کی اور چہرہ پر بہت سارا "لا رو لا" ملا۔ پھر دیر تک آئینہ میں اپنی شکل دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد وہ خود سے مخاطب ہوئی۔ "میں لالہ ہوں لالہ۔ جو گلشنوں کی زینت بنتا ہے۔ اور پھر دھوپ میں کملا کر جھلس جاتا ہے"۔ آئینہ سے نگاہیں ہٹا کر اُس نے دریچے کے باہر دیکھا جہاں اونچی اونچی پہاڑیاں سفید برف سے ڈھکی ہوئی تھیں، جہاں برف سے پگڈنڈیاں چھپ گئی تھیں، جہاں زندگی کی ساری حرارتوں پر برف جم کر رہ گئی تھی۔ اس نے اپنے گرد لپٹی ہوئی شال کو شانوں کے اوپر سے ڈھیلا کیا اور کشن کے اوپر سے اُٹھ کر سنگھار میز کی پیچھے والی کھڑکی کھولی۔ برفیلی ہوا کے روح کو منجمد کر دینے والے جھونکے اس کے بالوں کو بکھیر کر اس کی لمبی گردن اور رخساروں کو چوم کر گذر گئے۔

اس نے ایک جھرجھری لے کر شال کو پھر اپنے بازوؤں میں کس کر لپیٹ لیا۔ اور اپنی پیشانی کھڑکی کی بھیگی ہوئی ٹھنڈی چوکھٹ پر ٹیک دی۔ اس کے جسم میں خنکی دوڑنے لگی۔ اسے اس ٹھنڈ میں ایک عجیب سا انجان لطف محسوس ہو رہا تھا۔ دیر تک وہ کھڑکی کی چوکھٹ پر ماتھا ٹیکے کھڑی رہی اور جب اس کے سارے بال ہوا سے بکھر کر پھر بے ترتیب ہو گئے اور گردن ٹھنڈ کے سبب سُن ہو گئی تو اس نے گردن اٹھا کر ان پہاڑیوں کی طرف دیکھا۔ جن پر سورج کی ننھی ننھی سنہری کرنوں سے پریاں اترا اتر کر ناچ رہی تھیں۔ اس نے لاشعوری طور پر نم نم کھڑکی کے شیشوں پر اپنی انگلیوں سے لائنیں بنانا شروع کر دیں۔ ٹیڑھی میڑھی لائنیں بناتے بناتے اس نے ایک کونے میں اصغر لکھا اور کاٹ دیا۔ پھر ایاز لکھا اس کو بھی مٹا دیا۔ شمشاد لکھا۔ تھوڑی دیر تک اس کو غور سے دیکھتی رہی پھر اسکو بھی انگلیوں سے مٹا دیا۔

جھکی جھکی نگاہوں سے وہ کھڑکی کے نیچے پھیلی ہوئی اجلی اجلی دھوپ اور مخملیں سبزے کو دیکھتی اور گنگناتی رہی۔ مسکراتی رہی۔ پھر اس نے نگاہیں اٹھا کر کھڑکی کے بھیگے ہوئے شیشے کی طرف دیکھا جس پر اس کی انگلیوں نے اَن گنت نشان بنائے تھے اُن کو دیکھتی رہی۔ پھر اپنے سر کے بالوں سے ایک ہیئر پن نکال کر اس نے اس شیشے کے ایک کونے میں بیحد چھوٹا سا نام لکھا۔ رافع اور پھر اسی جگہ شیشے پر اس نے نرم گرم گداز ہونٹ رکھ دیئے۔ اس کی گرم سانس سے شیشے پر دھواں سا پھیل گیا۔ رافع اس دھوئیں کی اوٹ میں چھپ گیا۔ اور اس کی آنکھوں میں ایک دھند سی چھا گئی۔ کھڑکی کے شیشوں کو دیکھتی ہوئی وہ غسل خانے میں چلی گئی۔ اس نے اپنی آنکھوں پر بہت سارے صابن کا جھاگ ملا اور ٹب کے ٹھنڈے یخ پانی سے اپنے چہرے اور آنکھوں پر دیر

تک پانی کے چھینٹے اُڑاتی رہی۔ ٹھنڈے پانی سے منہ دھونے کے سبب اس کے چہرے پر ایک صحت مند سرخی پھیل گئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک سی آگئی۔ لیکن اس کے ہونٹ اور زیادہ خشک ہو گئے۔ اُن پر پپڑیاں جم گئیں۔ اُس کے ہاتھوں اور اُنگلیوں پر سفید خشکی پھیل گئی۔ اس نے کُشن پر رکھی ہوئی شال پھر اپنے بازوؤں اور کمر کے گرد کس کر لپیٹ لی۔ اپنے ہاتھوں پر "لاروِلا" لگایا اور غسل خانے کا پچھلا دروازہ کھول کر وہ باورچی خانے میں داخل ہوئی جہاں خانساماں ناشتہ تیار کر رہا تھا۔

گرم گرم پوریاں دیکھ کر اس کا جی للچا گیا۔ لیکن اس کی نگاہوں میں باسی روٹی اور رات کا بچا ہوا سالن گھوم گیا۔ خانساماں نے اس کو اپنی کیتلی میں سے گڑ کی بنی ہوئی ایک پیالی چائے انڈیل کر دی۔ اس کا شدّت سے چائے پینے کو جی چاہ رہا تھا لیکن اس نے ظاہری طور پر خاصا انکار کیا لیکن خانساماں کے بیحد اصرار پر اس نے وہ پیالی لے کر اس طرف غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر اس نے پہلی بار اپنے لئے ایک عجیب سا اپنا پن اور ہمدردی پائی۔ سفید بالوں سے اَٹا ہوا اسرار اور جھرّیوں سے لپا ہوا چہرہ ــــ اس نے ایک گہری سانس لی۔ تم نے میرے ابا کی خدمت کی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ چائے پی کر وہ جلدی سے اپنے کمرے میں واپس آکر اپنی مسہری پر لیٹ گئی۔ ٹھنڈی ہوا کے سرد جھونکے اس کی نس نس میں سرایت کر گئے تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ اپنے لحاف میں دُبکی لیٹی رہی۔ پھر اس نے اپنے سرہانے سے ایک پنسل اور کاغذ اٹھایا اور بلا قصد اس پر لائنیں بنانے لگی۔ لائنیں جو زندگی کے چار راستے بن گئیں۔ جن پر اصغر۔ ایاز۔ شمشاد اور رافع کھڑے ہوئے اس کو دیکھ رہے تھے۔ اس نے ہر ایک کو غور سے دیکھا اور رافع کی طرف دیکھ کر نگاہیں جھکا لیں۔ وہ کچھ لکھنا چاہ رہی تھی۔ لیکن سردی کی وجہ سے اس کی انگلیاں ٹھٹھری جا رہی تھیں۔ وہ پڑھنا چاہ رہی تھی لیکن کسی کتاب میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے اپنی بے چارگی پر آنسو بہانا چاہے مگر بے اختیار ہنسی آگئی۔ اس کا معدہ گرم گرم چائے پینے کے لئے دل بے چین تھا لیکن وہ آسمانوں کی نیلاہٹوں میں چھپ گئی تھی۔ اس پر منوں برف گر چکی تھی۔ وہ پہاڑیوں اور برف کے درمیان دب چکی تھی۔

دوسرے کمرے سے ناشتے کے برتنوں کے کھنکنے اور بچوں کے جلدی جلدی بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ لالہ چپ چاپ لیٹی سنتی اور مسکراتی رہی۔ وہ اپنے ماضی اور حال کے متعلق جب سوچ سوچ کر تھک گئی تو اس کا دماغ شل ہو گیا تو اس کی آنکھوں میں جمی ہوئی برف پگھلنے لگی۔ اور اس چوراہے پر ایک دم برف کی بارش ہونے لگی جس کے ایک طرف ایاز دوسری طرف اصغر تیسری طرف شمشاد اور

چوتھی طرف رافع کھڑے اس کو خلوص سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے چاہا کہ اس چوراہے کو عبور کر لے لیکن اس کے قدم اس جمی ہوئی برف پر دیر تک ٹھیک سے نہ اٹھ سکے۔

اُسے اُن چاروں میں سے کسی سے عشق نہیں تھا۔ وہ عشق کے نام سے نفرت کرتی تھی۔ وہ جلد از جلد اپنی شادی کر لینا چاہتی تھی۔ وہ اپنی زندگی کی مشکلات کا خاتمہ چاہتی تھی جس نے اس کو گھیر رکھا تھا۔ اسے ان چاروں میں رافع اور شمشاد پسند تھے۔ رافع اور شمشاد اس کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔ کبھی کبھی وہ لوگ اسے اس کی ضرورت کی چیزیں لا دیا کرتے تھے۔ اُن کا آپس کا خلوص ادبی سرگرمیوں سے شروع ہوا تھا۔ ان کو لالہ کے افسانے اور اشعار پسند تھے۔ وہ اُن کو سراہتے تھے۔ وہ اس کو بہی وقت سے جانتے تھے۔ جب اس کے امی اور ابا زندہ تھے۔ وہ کتنی بشاش رہتی تھی۔ گھر سے باہر تک وہ سب کی آنکھوں کا تارہ بنی ہوئی تھی۔ اس کے ابا اور امی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے لوگ پہروں اس کی خوشامد کیا کرتے تھے۔ وقت گذر گیا تھا اس کے ابا اور امی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور اب وہ اپنے سوتیلے بھائی کے ساتھ زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کر رہی تھی۔ اس کی بھابی کو تو اس سے للّٰہی بغض تھا۔ آپ ہی آپ کی نفرت تھی۔ وہ نہیں چاہتی کہ ایک سیکنڈ بھی وہ اس کے گھر میں رہے۔ لیکن دور اندیش بھائی یہ نہیں چاہتا تھا کہ لالہ کو نکال کر وہ لوگوں کے لئے انگشت نمائی کا بہانہ بنے۔ اور پھر اس نے تو لالہ کے نام جتنا روپیہ اور زیور تھا وہ سب بینک سے نکال لیا تھا اور اب لالہ کوڑی کوڑی کو محتاج اس کی باسی روٹیوں پر پڑی ہوئی تھی۔ رافع اور شمشاد اس کی اس اُلجھی ہوئی زندگی سے واقف تھے۔ انہیں لالہ سے ہمدردی تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ ذرا ذرا سی چیزوں کے لئے ترسے اور وہ تحائف سے بدنام ہو گئی تھی۔

عشق کے الزامات لگنے کے بعد ان چاروں نے اس کے گھر کا آنا جانا بند کر دیا تھا اور ان تحائف کا سلسلہ بھی بند ہو گیا تھا جن کی اسے اشد ضرورت رہا کرتی تھی۔ رافع نے کئی بار چاہا کہ چھپا کر اسے کچھ بھیجے اور جب کبھی کچھ بھیجا تو وہ طشت از بام ہو گیا اور اس کا اتنا کہرام مچا کہ لالہ کی زندگی اور بھی اجیرن بن گئی۔

رافع لالہ کی ضرورت کو بری طرح محسوس کرتا۔ اسے لالہ سے ایک گہرا لگاؤ پیدا ہو چکا تھا۔ وہ اس کی ضروریات پورا کرنے کی دوسری صورتیں اختیار کرنے کے متعلق سوچنے لگا۔

لالہ کو افسانے لکھنے کا جو شوق تھا وہ اسے ورثے میں اپنے باپ سے ملا تھا۔ اسے بچپن سے کہانیاں لکھنے کا شوق تھا۔ اور اب مسلسل پریشانیوں اور تنہائیوں

نے اس کے شوق کو پھر اُبھار اتھا۔ لیکن اس کی افسانہ نگاری ابھی ابتدائی مراحل طے کر رہی تھی۔ اسے افسانوں کی اُجرت اب تک نہیں ملی تھی۔ انہی دنوں اس کو ایک ادبی رسالے کے مدیر نے ایک خط لکھا کہ "آپ مجھے اپنی کہانیاں بھیجئے۔ میں تعاون دیا کروں گا"۔ کچھ دیر تک وہ مارے خوشی کے کچھ سمجھ نہ سکی اور پھر وہ خود بخود مسکرانے لگی۔ وہ خوش تھی کہ اب اس کو رافع یا شمشاد کا مرہونِ منت نہیں ہونا پڑے گا۔ وہ اُن کے احسان کے بوجھ تلے کتنا دب گئی تھی۔ اب وہ سوچنے لگی تھی کہ ان کا احسان اُتارنے کی بہت سی صورتیں ہیں۔ میں پائی پائی چکا دوں گی۔ لیکن اس کے گھر والے اس سے اور بھی زیادہ بدظن رہنے لگے تھے۔ کیونکہ اب اس کے پاس پھر اس کا اپنا پیسہ تھا۔ وہ اب ذرا ذرا سی چیزوں کے لئے ترستی نہیں تھی ۔

وہ اس ہری بھری خوبصورت کوٹھی میں کتنی اُداس رہتی تھی وہ اکثر سوچتی' کیا واقعی یہ اس کا اپنا گھر ہے؟ لیکن یہ اس کا اپنا گھر کیسے ہو سکتا ہے؟ اپنے گھر میں غربت' دکھ اور پریشانیاں تو اکثر ہوتی ہیں مگر ذلتیں اور رسوائیاں نہیں ہوتی ہیں۔ وہ اس گھر میں اس لئے ذلیل کی جاتی ہے کہ یہ اس کے باپ کا گھر نہیں ہے۔ اس کا باپ مر چکا۔ دولت اس کے بھائیوں نے تقسیم کر لی۔ اس کی ماں مر گئی اور اس کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ اس کی اپنی بچی کھچی دولت پر بھی اس کے سوتیلے بھائیوں نے قبضہ جما لیا اور اب وہ ان لوگوں کی دست نگر تھی۔ جہاں روز اُسے ایک نیا عشق کرتے دیکھا جاتا۔ جہاں ہر روز اسے جھوٹ جوڑے جاتے اور جہاں اُسے ہر روز گھر سے نکال دینے کی دھمکی دی جاتی۔ جہاں اس کے افسانوں کو دماغی عیاشی کہا جاتا۔ اور وہ ہر بات کے جواب میں صرف آنسو بہا دیتی۔ لیکن گھر سے نکال دینے کی دھمکی پر گھنٹوں سوچتی کہ اگر انہوں نے واقعی نکال دیا تو کہاں جاؤں گی؟ وہ کوئی فیصلہ کئے بغیر چپ چاپ جا کر اپنے پلنگ پر لیٹ جاتی جو اسے اس کی ماں کی طرح لپک کر اپنی گود میں [illegible] لوریاں دینے لگتا اور وہ سکون سے سو جاتی ۔

لالہ نے کئی بار اپنے لئے ملازمت تلاش کی۔ لیکن وہ ملازمت کر نہ سکی' کیونکہ اس میں اُن لوگوں کی ذلت تھی جن کے گھر میں وہ رہتی تھی ۔

گھر میں وہ بوسیدہ بستر اور بوسیدہ کپڑے پہنے رہتی تھی۔ لیکن دوسروں کے سامنے وہ کبھی شرمندہ ہونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جب کبھی گھر سے باہر کسی کام سے یا کسی سہیلی کے بیحد اصرار پر اس کے گھر جاتی تو عمدہ کپڑے پہن کر سج دھج کر جایا کرتی تھی۔ اور یہ عمدہ کپڑے اس کی ماں کی یادگار تھے جس نے بڑے چاؤ اور ارمان سے لالہ کی شادی کے لئے سلوائے تھے۔ اس کی بہت ساری سہیلیاں جو متوسط زندگی گذار رہی تھیں۔ لالہ کے اس اُجلے پن اور سج دھج پر رشک کرتیں۔ اس کی باتوں کے انداز اور ذوقِ سلیم پر کڑھتی تھیں اور جلنے کی وجہ صرف یہ تھی

کہ ایسے پُر آشوب زمانے میں جب کہ لوگوں کو ایک کمرہ بھی میسر نہیں ہے وہ ہری بھری سجی سجائی ایک خوبصورت کوٹھی کے خوبصورت کمرے میں رہتی تھی۔ وہ اچھے سلیقے کے کپڑے پہن کر دوستوں سے ملتی تھی۔ وہ بے شمار ہلکے مدھم اور شوخ قہقہے لگاتی تھی۔ لوگ اُسے خوش قسمت کہتے تھے۔ اس کے قہقہے سب نے سُنے تھے۔ لیکن اُن میں جو کراہ تھی وہ کسی نے نہیں سُنی تھی۔ اس سے کوئی بھی متاثر نہیں ہوا تھا۔ مسہری کو کمرے کا وہ باسلیقہ کمرا اور سجی ہوئی مسہری سب نے دیکھی تھی لیکن پلنگ پوش ہٹا کر کسی نے نہیں دیکھا تھا کہ چادر ہے یا نہیں۔ یا تکیہ کا کیسا کثیف غلاف ہے اس کی رنگت کیسی ہے۔ اس کے وہ خوبصورت کپڑے سب نے دیکھے تھے لیکن پھٹے ہوئے پیوند لگے ہوئے ان کپڑوں کو کسی نے نہیں دیکھا تھا جو وہ پہنے رہتی تھی ۔

اس کی کھوکھلی مسرتیں سب نے دیکھی تھیں لیکن گہرے غم کوئی نہ دیکھ سکا تھا کوئی نہ محسوس کر سکا تھا اور جس نے سمجھنے کی کوشش کی تھی اس سے عشق لگایا جا چکا تھا ۔

لیکن اب کچھ دنوں سے وہ سچ مچ مسکرانے لگی تھی۔ دھیمی دھیمی جان لیوا مسکراہٹ سے ـــ کیونکہ اب ہر ماہ' اس کو ضرورت بھر کے پیسے ملنے لگے تھے۔ اس کو اپنے خیالات اور تفکرات کی اُجرت ـــ جس سے وہ اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات کو پورا کر لیا کرتی تھی۔ اس نے برسوں کے بعد ان پیسوں میں سے تیل خریدا۔ اس نے نئے جوتے لئے اور پھر کئی مہینے تک وہ پیسے جوڑتی رہی۔ اس کے بعد اس نے پائجاموں کے لئے لٹھا لیا۔ معمولی ڈوریئے کی قمیضیں بنائیں۔ جالی کے دو دوپٹے خریدے۔ وہ سوچتی اب اسے ایک پیالی گرم چائے کے لئے خانساماں کا احسان نہیں اُٹھانا ہوگا۔ اب وہ اچھی چائے کے لئے نہیں ترسے گی۔ وہ خود چائے کا سامان منگا کر چائے بنایا کرے گی۔ اب ناشتہ پر باسی روٹی اور رات کا بچا ہوا سالن بھی نہیں کھائے گی کیونکہ باسی روٹی کی سُستی سے کاہل ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن وہ اِن پیسوں سے نہ چائے کا سامان منگا سکی اور نہ ناشتے کا' وہ ان پیسوں کو حفاظت سے جوڑ جوڑ کر رکھتی رہی ـــ دکھ سہتی رہی اور مسکراتی رہی۔ کیونکہ اب اسے اُفق کے پردے سے جگمگاتا ہوا اپنا مستقبل صاف روشن نظر آنے لگا تھا۔ کیونکہ اب اس کو پہلے سے کہیں زیادہ پیسے ملنے لگے تھے ۔

انہی دنوں صغرا اور ایاز کی شادیاں ہو گئیں۔ شمشاد مزید تعلیم کے لئے امریکہ چلا گیا۔ رافع نے فوج میں ملازمت کر لی ـــ اور وہ چورا ہا بالکل سنسان ہو گیا جس کے چاروں طرف اس کے ہمدرد موجود تھے ـــ رافع نے لالہ کے ساتھ کئی بار اپنا پیغام بھیجا لیکن وہ صرف اس لئے نامنظور کر دیا گیا تھا کہ رافع ایک اعلیٰ عہدے پر تھا۔ کہیں لالہ کی پریشانیوں میں اطمینان نہ گھل جائے۔ لالہ نے

رافع کو اس دن سے نہیں دیکھا تھا جس دن سے اس پر یہ الزام لگا تھا۔ لالہ کو رافع پیار کرر ہا تھا۔۔ اس کو ذرا بھی علم نہ تھا کہ رافع کیا ہوا کہاں گیا۔ لیکن رافع کو لالہ کے متعلق ذرا ذرا معلوم تھا کہ کہاں ہے، کیا کر رہی ہے۔ اسے اس کی خوشی تھی کہ اب لالہ کو افسانوں کا معاوضہ ملنے لگا ہے۔ اب وہ اچھے افسانہ نگاروں میں شمار کی جاتی ہے۔ اسے لالہ سے لگاؤ تھا۔ وہ لالہ کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ وہ صرف لالہ کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ بالکل ایسے جیسے پجاری مندر میں رکھی ہوئی دیوی کی پوجا کرتے کرتے زندگی گذار دیتے ہیں۔ لالہ ان تمام باتوں سے لاعلم تھی۔

ہاں کچھ دنوں سے وہ رافع کے متعلق سوچنے ضرور لگی تھی کہ کاش رافع یہاں موجود ہوتا تو وہ میرے افسانوں کی اس کامیابی پر کتنا خوش ہوتا۔ اس کا یہ جذبہ اس نے ہی تو دوبارہ ابھارا تھا۔ اسی نے تو کہا تھا کہ لالہ تم بچپن میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھتی تھیں۔ اب پھر لکھا کرو۔ میرا یقین ہے کہ ان میں تم کو کامیابی ہوگی اور آج جب کہ وہ کامیاب ہو چکی تھی۔ رافع نہ جانے کہاں تھا! اور نہ جانے کس جذبے کے ماتحت اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں خشک کر کے مسکرا دیتی۔ میں کتنی پاگل ہوں ۔۔۔ کون جانے وہ کہاں ہوگا۔۔ مجھے یاد کرتا ہوگا یا بھول چکا ہوگا۔

پہاڑیوں پر سے سفید سفید برف پگھلتی گئی۔ پیڑوں میں زندگی کی نئی گرم حرارتیں آتی گئیں۔ اناروں میں سرخ سرخ شگوفے پھوٹنے لگے۔ خوبانی میں سفید سفید پھول لہرانے لگے۔ اور آڑوؤں میں گلابی گلابی پھولوں نے مسکرانا شروع کیا تو لالہ کھل اٹھی ۔۔ لالہ ان پھولوں، ان خوشبوؤں اور نرماہٹوں کو اپنے افسانوں میں زندگی کے دوش بدوش جب لانے لگی تو ایکدم سے شور اٹھا آوارہ ہے آوارہ ۔۔۔ وہ چونک پڑی۔ اس کا دماغ سنسنا اٹھا۔۔

"کیا ہوا۔۔؟" اس نے معصومیت سے مڑکر پوچھا۔

"خطوط اور رسیدیں"

"کیسے خطوط، کیسی رسیدیں۔۔؟" اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

کسی نے قریب ہی سے جواب دیا۔" وہ رسیدیں جن پر تمہارے دستخط ہیں، وہی خطوط جو تمنے ایڈیٹروں کے نام بھیجے ہیں۔ کیا تم کو وہ سب رسالے والے تھوڑی بھیجتے رہے تھے۔"

"پھر ۔۔ پھر کس نے بھیجا تھا" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔۔

"رافع نے ۔۔"

"رافع نے" اس نے زیرِ لب دوہرایا۔

"ہاں ہاں، پریشان کیوں ہوتی ہو۔ یہ خطوط دیکھو۔ یہ تصدیق سے میں تمہارے عشق کے۔ یہ رسیدیں، یہ تمہارے کارناموں کے پول ہیں۔ تم نے سب کی عزت لے ڈالی۔ تم نے اس گھر کی عزت لے ڈالی جہاں رہتی ہو۔ تم نے سب کے سکون میں زہر گھول دیا۔ تم اس لائق نہیں ہو کہ یہاں رہ سکو۔ اب اس گھر میں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ جاؤ نکل جاؤ یہاں سے ۔۔"

لالہ نے سوچتی ہوئی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ تارے مسکرا رہے تھے۔ فضا میں خوشبوئیں بکھری ہوئی تھیں اور اس کے سامنے خالی ہاتھ پھیلائے وسیع دنیا پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے سسکیاں لے کر خود سے پوچھا۔ کہاں جاؤگی لالہ۔ دوسرے لمحہ وہ گرجی، کہاں جاؤگی لالہ امیر الدین۔ تم آخر بولتی کیوں نہیں۔ بولو۔ مجھ سے کہو ڈوب مرو۔ وہ قبرستان بھی یہاں نہیں ہے جہاں ابا اور اماں سکون کی نیند سو رہے ہیں۔ کہاں جاؤگی۔۔ رافع ۔۔ اور رافع کا خیال آتے ہی وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے الماری میں سے وہ سارے خط نکالے جو اس کو شروع شروع میں رسالے والوں کی طرف سے موصول ہوئے تھے۔ اس نے اِن خطوط کو چوما۔۔ تم! رافع تم نے میرے ساتھ یہ اچھا نہیں کیا۔

دوسرے کمرے میں زور زور سے باتیں ہو رہی تھیں۔" رافع مرتا تھا اس پر۔ رسالوں کا اس کو خریدار بنایا۔ اس کی کہانیاں ٹھیک کر کر کے شائع کراتا رہا۔ اور انہی رسالوں کی مدد سے اس کو پیسے بھیجتا رہا۔ وہ تو کہو محاذ پر جانے کے بعد جو سامان اس کا گھر آیا تو اس میں سے یہ رسیدیں اور یہ خط برآمد ہوئے ہیں۔ خاندان بھر میں چھپا تھو تھو ہو رہی ہے۔" لالہ نے اپنے کان بند کر لئے۔ لیکن تم خود بخود محاذ پر کیوں چلے گئے رافع ۔۔ اس نے اپنی حالت پر آنسو بہانا چاہے۔ لالہ مجھے تم پر واقعی ترس آرہا ہے، بیچاری تم ۔۔ رافع تم سے ناامید ہو کر چلا گیا۔ اور تمہارے لئے ادبی دنیا میں جگہ بنا گیا۔ اس نے دوپٹہ سے اپنے آنسو پونچھے اور ایک بلند قہقہہ لگایا۔ مرنے سے ڈر گئیں ۔۔ ہمت سے کام لو۔ اس نے ایک اور بلند طنزیہ قہقہہ لگایا۔ ڈس لو ڈس لو لالہ اس رنگین دنیا کو ڈس لو۔ ان جگ مگ کرتے ہوئے چراغوں کو بجھا دو۔ بھری بہار ہے ان گلشنوں میں آگ لگا دو۔ اس نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ پہلے سے زیادہ خوفناک زہر میں ڈوبا ہوا۔ اور دوڑتی ہوئی ڈریسنگ روم میں جا کر آئینہ میں اپنی شکل دیکھی۔ تجھ میں کس چیز کی کمی ہے پگلی۔ کتنی پیاری شکل ہے تیری۔ دوست کی کمی نے تیری یہ درگت بنا دی۔ ہنسو لالہ کہ اب دولت تمہارے قدم چومے گی۔

لیکن اس کے دماغ پر جیسے کسی نے بھرپور ہتوڑے کا وار کیا۔ تیری خاندانی شرافت، تیرے باپ کی عزت، اس نے خود کو تسکین دینا چاہا۔ خاندان منتشر ہو گیا۔ شرافت بٹ گئی۔ باپ ختم ہو گیا، عزت لٹ گئی۔ تیرا کون ہے، کسے تیری عزت کی فکر ہے۔؟ بول کون ہے تیرا اس جہان میں۔ رافع بھی تو اس دھرتی کا ایندھن بن گیا۔

بقیہ صفحہ ۵۶ پر

افسانہ:

آسیب زدہ گھر

احمد سعید

"ڈرو مت اندر چلے آؤ۔" یہ ماسٹر جان کی آواز تھی، جو اُس آسیب زدہ مکان کے ایک کمرے سے آئی تھی۔

آج تک اس گھر میں بہت کم لوگوں کو قدم رکھنے کا حوصلہ پڑا تھا۔ یہ ایک مہیب صورت، پرانی وضع کا مکان تھا جو ایک اندھی گلی کے آخر میں واقع تھا۔ ایک دیو قامت دروازہ، اونچی اونچی سیڑھیوں اور ڈیوڑھی کے عین اوپر ایک چھوٹی سی کھڑکی، بوسیدہ دیواروں کے اُکھڑے ہوئے پلستر نے جس پر حوادثِ زمانہ نے گہرے نقوش چھوڑ دیئے تھے اُسے ایک کھنڈر نما عمارت، پیکرِ خوف بنا دیا تھا۔ اس کے آس پاس جگہ جگہ ملبے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ دیواریں کہیں کہیں سے گرنی شروع ہو گئی تھیں۔

کوئی دو سو گز لمبی گلی میں اونچے اونچے دور دیہ مکان اس تک روشنی نہیں پہنچنے دیتے تھے۔ یہ ہمیشہ نیم تاریکی میں ڈوبا سا رہتا تھا، ایک برھ کے درخت نے جس کی شاخیں اس کے اوپر چھاتے کی مانند پھیلی ہوئی تھیں اس کے سایوں کو اور بھی گہرا بنا دیا تھا اور جب زور سے ہوا چلتی تو اس کی خستہ لکڑی کی کھڑکیاں اور دروازے کہیں اندر سے کھٹکھٹاتے۔

اس مکان کی بالائی منزل پر شاید ہی کوئی ذی جان اب تک گیا ہو۔ بوڑھا برھ کا درخت گدھوں، چیلوں کا دائمی مسکن بنا ہوا تھا۔ اوپر جاتی ہوئی سیڑھیاں ایک اُلٹے کنوئیں کی مانند تھیں ـــ تاریک تاریک، جن میں صرف دوپہر کے وقت دھوپ کی بے کیف کرنیں پہنچ پاتیں اور گِدھوں، چیلوں، اور کوّوں کی ملی جلی آوازیں دوپہر کے سکوت کو توڑتیں، پھسلتی پھسلتی نچلی منزلوں تک بھی پہنچ جاتیں۔

کبھی کبھی جنگلی کبوتروں اور فاختاؤں کے جوڑے پر پھڑپھڑاتے ہوئے مکان کے اندر داخل ہوتے اور نہ جانے کہاں غائب ہو جاتے۔

ایسے مکان میں کوئی کرایہ دار دس بارہ روز سے زیادہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اگر کوئی آتا بھی تو کوئی اجنبی جسے کوئی اور جگہ ملنے کی اُمید نظر نہ آتی۔

اس کے مالک کو مرے ہوئے پچاس برس ہونے کو آئے تھے۔ وہ بے اولاد تھا لیکن خاندانی رئیس۔ اس لئے اسکی جائداد کے کئی دعوے دار پیدا ہو گئے۔ آخر لاکھوں کی جائداد کا پندرہ برس تک مقدمہ چلنے کے بعد متوفی کے منشی کے بڑے لڑکے کے حق میں فیصلہ ہوا تھا۔ وہ کیونکر؟ صرف منشی اور عدالت ہی جانتی تھی۔ لیکن اس مکان پر کسی نے اپنا حق جتانے کی کوشش نہ کی تھی۔ اس لئے یہ ہمیشہ متروک ہی رہا۔ کیونکہ یہ آسیب زدہ سمجھا جاتا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟ اندر کیوں نہیں آ جاتے۔" ماسٹر جان نے مجھے پھر آواز دی۔

ماسٹر جان ایک مشہور مصور تھا۔ وہ اپنے آپ کو لیونارڈو ڈاونچی کہا کرتا، بیک وقت آرٹسٹ اور سائنس داں۔ وہ دو برس سے اس مکان میں رہ رہا تھا۔

"میں حقیقت کی تصویرکشی کرتا ہوں۔ فطرت کا مصوّر ہوں۔ قدرت اور انسان، دونوں کی مخفی گہرائیوں کو بے نقاب کرتا ہوں۔ ..... اسی لئے اس مکان میں آیا ہوں . . . دیکھتے ہو اس مکان میں کیسی گوتھک فضا ہے"۔

"روشنی اور سائے کا کتنا امتزاج ہے اس میں . . ." ماسٹر جان نے مجھے اپنی تازہ تصاویر دکھاتے ہوئے کہا۔ اُنہیں اس نے بالائی منزل میں، مکان کی بھیانک ڈیوڑھی کے اوپر چھوٹی سی کھڑکی کے پاس، روشنی میں لگا رکھا تھا۔ صرف یہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں اس مکان کے اندر روشنی کا ایک بڑا سا دھبّہ کچھ عرصہ کے لئے جما رہتا۔ اس وقت ماسٹر جان تصویریں بنایا کرتا۔

"لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تم یہاں کس طرح رہتے ہو۔ یہ مکان تو آسیب زدہ ہے!" میں نے کہا۔

اس وقت شام کے دھندلکے تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ لیکن اس مکان پر تو ابھی سے رات چھائی معلوم ہوتی تھی۔ ماسٹر جان نے کمرہ میں وکٹورین طرز کا ایک نہایت خوبصورت پیتل کا لمپ جلا رکھا تھا۔ میرے سوال کا جواب دینے سے پہلے اس نے سگریٹ سلگایا۔ دیا سلائی کی روشنی میں اس کا پتلا دُبلا اور لمبوترہ چہرہ جس پر آٹھ روز سے شیو نہ بنانے کی وجہ سے ایک ایک انچ لمبی داڑھی اُگ آئی تھی اور اس میں جابجا سفیدی کے چھینٹے دکھائی دیتے تھے، ایک لحظہ کے لئے چمک اُٹھا۔ اس کے سر کے پریشان بال جو پتلی سی گردن اور سوکھے ہوئے جسم پر اور بھی زیادہ بکھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اس کو آسیب صورت بنا دیا تھا۔ وہ اس مکان کا جزو لاینفک معلوم ہوتا تھا۔ اس کی بھٹکی ہوئی روح!

اس نے سگریٹ کا ایک کش لگایا۔ اس کی روشنی میں اس کے باریک ہونٹوں پر ایک عجیب ناگفتہ بہ زہرخند پھیل گیا۔ اُن کا ایک کونہ طنزاً اوپر اٹھا اور پھر از خود گر گیا اور چند ایک سیکنڈ کے لئے وہ ٹھہرا سا گیا اور اس نڈر انسان کے چہرے پر ایک پُراسرار لہر

نمودار ہو کر غائب ہو گئی۔

"مجھے لوگ دیوانہ کہتے ہیں۔ ... تم جانتے ہو نا؟ ہر لیپنہ کنز یک میڈ یعنی کچھ کچھ سنکی ہوا کرتا ہے۔"

"ہاں۔ لیکن کچھ کہو بھی۔ میں نے تم سے آتی بار اس مکان کے رازے کے متعلق پوچھا ہے لیکن تم نے اب تک اسے سربستہ ہی کر رکھا ہے۔ آج تو اس کی گرہ کھول کر ہی جاؤنگا۔"

"ہمیں جس بات کی سمجھ نہیں آتی اسے ہم دیوی دیوتاؤں، تقدیر وغیرہ پر محمول کرتے ہیں۔ کئی حقائق اتنے عجیب ہوتے ہیں کہ وہ پنہاں ہونے کی وجہ سے جادو معلوم ہوتے ہیں۔"

اس شام آندھی بڑے زور سے چل رہی تھی۔ مکان کے اندر سے حیرت انگیز آوازیں آرہی تھیں جیسے کوئی مسلسل دف بجا رہا ہو یا سیٹیاں اور کبھی کبھی دبی دبی چیخوں کی آواز سنائی دیتی۔

"اس مکان کو لوگ آسیب زدہ کہتے ہیں نا!" ماسٹر جان نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ اتنے میں کسی چیز کے تڑاخ سے ٹوٹنے کی آواز آئی۔

"اوہو! ابھی کل لایا تھا۔ بیس چکر کاٹنے کے بعد ایک گاہک سے دس روپے کا بل وصول کیا تھا۔ اس سے کچھ رنگ، سگریٹ، ڈبل روٹی، انڈے اور یہ چمنی لے آیا ...... خیر۔"

"بھئی اب تو مجھے یہاں سے ڈر آنے لگا ہے۔"

"کیوں نہیں، شاید اس مکان میں اب بھی میری طرح کسی کی روح منڈلا رہی ہو۔"

"کیا مطلب؟ تو کیا یہ واقعی آسیب زدہ ہے"؟

"آسیب! وہ بھی تو ہماری ہی پیداوار ہوتے ہیں۔"

اب اوپر برساتی کے کواڑ زور زور سے بجنے شروع ہوئے اور کہیں سے اُلّو کی آواز آئی۔ تاریکی گہری ہو گئی۔ یکدم۔ جیسے شہر کی بتیاں یکدم گُل ہو گئی ہوں۔ لیمپ کی بتی پھڑ پھڑائی۔ اس کی مدھم روشنی میں چمگادڑوں نے کمرہ پر حملہ کر دیا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور لیمپ کو بجھاتا چلا گیا۔

"ادھر آؤ۔" ماسٹر جان بدستور سگریٹ کے کش لگاتا چلا گیا۔

نیچے گلی میں مدھم سا شور اٹھا۔ جان نے اُٹھ کر کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر زہر خند کی لہر دوڑ گئی۔

"وہ دیکھو! کھڑکی کی بتی پھر بجھ گئی۔"

"آج کسی کی خیر نہیں۔"

"یہ لوگ کرایہ بچانے کے لئے آسیب زدہ گھروں میں مرنے کے لئے کیوں آجاتے ہیں۔؟"

"ہاں سنا ہے یہاں کوئی دیوانہ آرٹسٹ رہتا ہے۔ اگر مرا نہیں تو پورا پاگل ہو کر نکلے گا یہاں سے۔"

اگر مر گیا تو اس کا جنازہ اٹھانے کے لئے کوئی مولوی بھی ادھر نہیں جائے گا۔ آجکل جن کون پکڑتا ہے؟"

ماسٹر جان کے چہرے کے تاثرات سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ نیچے گلی میں کھڑے لوگوں کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے ایک بار انہیں گھور دیکھا اور دیوانہ وار ہنسنے لگا۔

گلی میں بڑھتے ہوئے مجمع کو دیکھ کر دور افتادہ اور قریبی مکانوں سے کئی سر نمودار ہوئے۔ کئی دوپٹے ہوا میں لہرائے، لیکن عورتیں معاً انہیں اندر کھینچ کر دروازے بند کر لیتیں ..... اس وقت آوارہ روحیں اس مکان میں ناچ رہی تھیں! نوجوان کنوارے لڑکے اور لڑکیوں کا اس طرف دیکھنا یا اُن آوازوں پر کان دھرنا موت کو دعوت دینا تھا۔ میاں جلال دین کے نوجوان لڑکے کو کچھ عرصہ ہوا، اسی طرح ایک چڑیل چمٹ گئی تھی اور اب اسے چھوڑنے کا نام نہیں لیتی تھی۔

"اِن پاگلوں کو دیکھو۔ کہتے ہوں گے کہ میں اس مکان میں اب تک کیوں سکونت پذیر ہوں۔ .... یہاں بھوت اور چڑیلیں جو بستی ہیں۔"

"اور یہ کہتے ہیں کہ ہر روز رات کے وقت جب ساری دنیا محوِ خواب ہوتی ہے اس کی چھت پر سے لپک دھپک۔ بھاگ دوڑ کی آوازیں آتی تھیں۔"

"تم بتاؤ۔ کیا یہ سچ ہے۔ کیا اس کے بانی کو کبھی دیکھا؟ مکان بند رہنے کے باوجود اس کی چھت پر سرخ اور نیلے پرچم لہرا کر غائب ہو جاتے ہیں۔"

"سب کچھ ممکن ہے۔"

"کیا؟"

"کیا تمہیں اب بھی .....؟" ماسٹر جان نے میرے کانوں سے مُنہ لگا کر دبے الفاظ میں کہا: "تمہیں کسی کے سانس لینے کی آواز نہیں سنائی دی؟"

"نہیں۔ نہیں .... ٹھہرو۔ ہاں۔ ہاں۔ ساتھ والے کمرے سے آواز آرہی ہے۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی چیز سرعت سے گذر گئی ہو۔"

"تم یہ راز معلوم کرنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ اوپر آؤ۔"

"کیا کہا۔ بھوت پریت دکھا کر مجھے مار ڈالو گے کیا..... نہیں بابا۔"

"کئی لڑکیوں سے معاشقہ کیا ہے۔ اگر مر گئے تو کیا ہوا۔ !"

"اگر تم مُصر ہو تو چلو۔ لیکن تمہیں آگے آگے چلنا ہوگا۔ میں ویسے تو تعویذ باندھ کر آیا ہوں۔"

اتنے میں ماسٹر جان نے ایک ننھی سی ٹارچ نکالی اور بیٹھک سے باہر قدم رکھتے

ہوئے، ٹارچ جلا کر مجھے اپنے پیچھے پیچھے آنے کو کہا۔ گو میرا دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا تھا۔ لیکن میں نے ہمت باندھی۔ آج میں آسیب دیکھنے کا ارادہ کر کے آیا تھا۔

جان نے اپنی ننھی سی ٹارچ جلائی۔ اس کی زرد اور پھیکی روشنی کا چھوٹا سا دائرہ بمشکل نصف سیڑھی کو منور کر سکتا تھا۔ مجھے یوں معلوم ہوا جیسے جان روشنی کے ذریعہ راستہ ٹٹول رہا ہو۔

ہم نے سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کیا راستے میں شکستہ شہتیر اور تختے پڑے تھے۔ جا بجا چڑیوں کے ڈھانچے اور سانپ کی کینچلیاں پڑی ہوئی تھیں ایک سیڑھی پر ایک سانپ تیزی سے نیچے اترتا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر جان نے فوراً ٹارچ بجھا دی اور مجھے اوپر کھینچتے ہوئے دو سیڑھیاں ایک ہی جست میں طے کر گیا۔

"کیا مصیبت ہے۔ آج تو تم میرا یہاں سے جنازہ ہی نکلوا کر رہو گے۔"

"اگر کوئی کندھا دینے والا مل گیا تو!"

"میں اپنے موقلم سے جو اٹھاتا ہوں..... چلے آؤ۔"

ہم جوں جوں سیڑھیاں طے کرتے گئے جھینگروں اور ٹڈیوں کی آوازیں شروع ہوئیں۔ میرا قدم اچانک ایک سیڑھی سے پھسلا اور ایک شہتیر دھڑام سے نیچے گرتا سنائی دیا۔

"آدمی ہو یا زلزلہ، یا بھوت!" جان نے چہرے کی طرف ٹارچ کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا۔ "آرام سے چڑھو۔"

جان تو اس مکان کے چپے چپے، اس کے نشیب و فراز سے واقف معلوم ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے اگر اس کے پاس ٹارچ نہ بھی ہوتی تو بھی وہ میکانیکی انداز میں بڑی آسانی سے اوپر چڑھتا جاتا۔ اُسے معلوم تھا کہ راستے میں کس کس جگہ کیا پڑا ہے۔ وہ مجھے ڈرانے کے لئے بعض اوقات ٹارچ بجھا دیتا۔ ایک بار تو میرے منہ سے زور سے چیخ نکل گئی اور مجھے ساتھ والے مکانوں سے لوگوں کی آوازیں آتی سنائی دیں۔

آخر کار ہم چھت کے قریب پہنچ گئے۔ ٹارچ کی روشنی میں طلسماتی قسم کا دھواں سیڑھیوں میں سے اوپر اٹھتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ کتنی گھٹن تھی اس جگہ! اگر میں کچھ دیر اور رہتا تو یقیناً بے ہوش ہو جاتا۔

جب ہم کوٹھے پر پہنچے تو مطلع ابر آلود تھا۔ اس کی برساتی دیکھ کر میں حیران ہو گیا۔ اس کی دیواریں بالکل صاف تھیں۔ یہ مرمت شدہ تھیں۔

چھت پر ایک چھوٹی سی قبر بنی ہوئی تھی۔ یہ اوپر سے لپی ہوئی تھی۔ اس پر کسی نے پھول چڑھائے ہوئے تھے۔ اس حیرت انگیز عمارت کے بارے میں ماسٹر جان سے استفسار کرنے سے پہلے میں نے چاروں اطراف کا جائزہ لیا۔ اسی مکان کی بغل میں دوسرے مکان تھے۔ اُن کی چھتیں کھیتوں کی منڈیروں کی مانند آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ یہ مکان اندھی گلی کے آخر میں تھا۔ چنانچہ یہ اپنے دائیں بائیں طرف کے مکانوں میں ایک قسم کے پُل کا کام دیتا تھا۔ اس کی برساتی میں دونوں طرف دروازے لگے ہوئے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ اس بڑی چھت کے درمیان واقع تھی۔ اس لئے چھت پار کرنے کے لئے اس میں سے کچھ راستہ چھوڑ دیا گیا تھا۔ برساتی کے دو دروازوں کے ذریعے۔ لیکن اس مکان کی دیواریں دو دو فٹ سے زیادہ اوپر اٹھی ہوئی تھیں۔ یہاں کس قسم کے لوگ رہتے تھے' میں تصور میں نہیں لا سکتا تھا۔ مکان کی وضع قطع سے معلوم ہوتا تھا کہ یہاں آج سے پچاس برس پہلے بہت سخت پردہ کیا جاتا تھا۔ لیکن میری توجہ تو اس وقت خاص طور پر اس قبر نے اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ ایک متروک گھر میں اس قسم کا قبرستان دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ یہاں ضرور بھوت پریت رہتے ہوں گے۔ ابھی میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ماسٹر جان نے مجھے اس مکان کے دائیں طرف تیسرے مکان کو دیکھنے کے لئے کہا۔

"اس کو" قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جان نے کہا، "پہلے اس کے گرد و نواح کو بغور دیکھو۔"

جب میں نے اشارہ کردہ ایک مکان دیکھ لیا تو جان نے مجھے ایک اور مکان دکھلایا۔ یہ آسیب زدہ سے ملحقہ تھا۔ اس کی چھت قدرے نیچے تھی۔ دیوار ملا کر کوئی تین فٹ کا فاصلہ بنتا تھا۔ یعنی ساتھ والے مکان کی چھت سے آسیب زدہ گھر کی ملحقہ چھت کی دیوار کی اونچائی تین فٹ تھی۔ لیکن اتنی کم اونچائی کے باوجود کسی شخص کا اس قلعہ نما خوفناک کھنڈر جیسے مکان میں قدم رکھنے کا کسی کو حوصلہ نہیں پڑتا تھا۔ لوگ شدید گرمی میں کبھی کبھار، مجبوراً چھت پر سونے کی جرأت کرتے۔ اور سوتے بھی تو اس کی طرف پیٹھ کر کے۔

"یہ ساتھ والے مکان کو تو تم شاید جانتے ہو گے کس کا ہے؟"

"میں تو جنگ ختم ہونے کے تقریباً چھ سات برس کے بعد یہاں آیا ہوں۔ مجھے کیا معلوم۔"

"ارے گھن چکر۔ اپنے تایا کا مکان بھی نہیں جانتا؟"

"وہ ادھر کہاں آیا؟"

"اس نے جنگ میں جو بنوایا تھا۔"

"تایا حاجی رحیم بخش! اچھا۔ پھر۔ جلدی کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"تمہاری تایا زاد بہن..... کی شادی دو سال ہوئے ایک رنڈوے سے ہوئی تھی نا؟"

"ہاں۔ ہاں۔"

"اور دوسرا گھر۔ یہاں سے میرا مکان۔"

" وہاں تو پہلے ایک سکول ماسٹر رہا کرتا تھا۔"

اس کا ایک لڑکا بھی تھا، الطاف۔ میرا ہم جماعت تھا۔ سنا ہے بیچارہ آجکل پاگل خانے میں ہے۔"

" لیکن اس کا پاگل خانے سے کیا تعلق؟" میں نے جان سے پوچھا۔

جانؔ نے معاً ٹارچ جلائی اور مجھے قبر میں بغور دیکھنے کے لئے کہا۔ مدہم روشنی میں مجھے قبر کے تعویذ میں لگے ہوئے شیشے میں سے کسی کے قدموں کے نقوش دکھائی دیئے۔ فرش کچا تھا۔ اس پر اب بھی دھول اُڑ رہی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کسی نے بڑی کاریگری سے پاؤں کے اِن نشانوں کو محفوظ کر لیا تھا۔

" یہ کیا ماجرا ہے، جانؔ؟" میں نے پوچھا۔

جواب میں اس نے برساتی کی ایک الماری کھولی۔ اس میں ایک مضبوط لوہے کی مقفل صندوقچی رکھی تھی۔ جانؔ نے اسے کھول کر اس میں سے نیلے رنگ کا ایک دوپٹہ نکالا۔ صندوقچی کھلتے ہی اس میں سے بھینی بھینی خوشبو کی ہلکی سی لہر اٹھی۔ جان کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ دوپٹہ بڑی احتیاط سے بند کیا ہوا تھا۔

" میرے ہاتھ پلید ہیں۔ میں ویسے وضو کئے بغیر ایسے مقدس کپڑے کو چھو تک نہیں سکتا۔"

مجھے یہ کپڑا دکھا کر اس نے فوراً صندوقچی اور الماری دونوں بند کر دیئے۔

" یہی وہ آسیب ہے جس کی لوگوں کو کوٹھے پہ دوپہر یا رات کے وقت آوازیں آیا کرتی تھیں۔"

" وہ کیسے؟"

" کوئی ایک برس ہوا جب میں ایک روز اتفاق سے دوپہر کے وقت کوٹھے پر آیا تو مجھے کسی کے چھت پر سے کودنے کی آواز آئی۔ ہوا میں ایک نیلگوں شعلہ لہرتا دکھائی دیا۔ وہ جو اس الماری میں بند ہے۔ میں نے دبے پاؤں آگے لپک کر دیکھا۔ وہ رحیم بخش کی لڑکی تھی۔"

" جانؔ!"

"..... ہاں ... سلمہؔ!"

" سلمہ!"

" اور الطاف۔ غریب ماسٹر کا بیٹا . . اُن کی یہیں جائے ملاقات ہوا کرتی تھی۔"

" اور تم؟"

" میں نے اسے پہلی اور آخری بار دیکھا۔ وہ چہرہ، معاف کرنا۔ مرے لئے ایسے آدرش، ایسے "آیڈیل" کی حیثیت رکھتا ہے جس کی تلاش میں لیونارڈو ——— کی طرح آرٹسٹ سالہا سال مارا مارا پھرتا ہے اور پھر جا کر کہیں "مونالزا" جیسا شاہکار پیدا ہوتا ہے۔"

یہ دیکھو۔ اس کی تصویر کا خاکہ!" جانؔ نے اپنی قمیض کی اندرونی جیب میں سے مجھے ایک تصویر نکال کر دکھائی۔ جانؔ نہیں جانتا تھا کہ وہ تصویر کبھی مکمل نہیں ہو گی کیونکہ وہ نیلگوں شعلہ سونے کی دیوار تلے جا کر بجھ گیا تھا اور جان کی قسمت میں اب صرف ایک جھلک، نیلگوں دوپٹہ اور وہ فانی نقش پا آئے تھے۔ کسی کی محبت اور کسی کا شاہکار نامکمل رہیں گے!

بچّوں کی مصوّری

سید امجد علی

دو سال ہوئے مجھے ملتان کے شہر میں جو اپنی نفیس نیلگوں پھول دار اینٹوں اور برتنوں کے لئے مشہور ہے، کمہاروں کے محلے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس قدیم شہر کے عہد مغلیہ سے ماقبل مقبرے ایسی اینٹوں سے آراستہ ہیں جن پر نہایت خوبصورت بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ انسان یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ روغنی اینٹیں اور ان پر بیل بوٹے بنانے کا پرانا فن ملتان کے ان چار پانچ گھرانوں میں برابر جاری ہے جن کا یہ آبائی پیشہ بن چکا ہے۔ ایک کارخانہ میں ایک کاریگر نے اپنے کمال کا یوں مظاہرہ کیا کہ ایک کچّی اینٹ اٹھا کر پل جھپکنے میں بڑی ماہرانہ چابکدستی سے کتنی ہی پیچ در پیچ مرغولیں اور بیل بوٹے بنا دئے۔ پاس ہی ایک دس برس کا لڑکا مٹّی کی تختی لئے بیٹھا تھا جس پر ملتانی مٹّی ملی ہوئی تھی۔ وہ قوسی خطوط بنانے کی مشق کر رہا تھا۔ کاریگر نے مجھے بتایا کہ وہ اسی طرح کئی کئی دن مشق کئے جاتا ہے۔ جب وہ ان میں طاق ہو جاتا ہے تو پھر کوئی اور نقش بنانا شروع کر دیتا ہے مثلاً مچھلی یا کوئی اور چیز جو اب تک مقبول چلی آ رہی ہو۔

یہ وہ طریقہ ہے جس سے اگلے وقتوں میں ہمارے ہاں نقاشی کی تعلیم دی جاتی تھی اور دیگر قدیم مہذّب ممالک میں بھی یہی دستور تھا۔ مثلاً چین میں نومشق کو قلمکاری کے بعض طریقوں کی مشق کرنا پڑتی تھی جن کو پرانے استادوں نے نقاشی سیکھنے کے بنیادی گر قرار دیا تھا۔ جیسے بانس کی ٹہنی یا کنول یا بطخ کے پر سے قلم کاری وغیرہ۔

غرض اُن دنوں بچّوں کی فنّی تربیت کے لئے اظہار کے بعض پسندیدہ اسالیب بلکہ موضوعات میں مشق بہم پہنچانا شرط اوّلیں تھا۔ ان طریقوں کو سیکھنا اور بار بار دہرانا بچوں کے لئے ضروری تھا۔ جو کچھ انھیں کرنا ہوتا تھا وہ پہلے ہی سے معلوم تھا۔ صرف اس میں مہارت پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔

اب حالات بدل چکے ہیں۔ مغربی تصوّرات اور طریق تعلیم کے رائج ہونے سے بچوں کی فنّی تربیت صرف انہی امور تک محدود نہیں رہی کہ انھیں بعض خوبصورت وضعیں اور شکلیں یا نقوش اور طرحیں بنانا سکھایا جائے جو ماہرانہ کاریگری کے سنگ بنیاد ہیں بلکہ اس بات پر زور دیا جانے لگا کہ بچّے خارجی دنیا کے مشاہدات پر توجہ دیں اور انھیں اپنی یادداشت میں محفوظ رکھیں۔ یہ فنّی کے بجائے سائنسی عمل ہے کیونکہ اس میں جبلّی احساس کی بجائے شعور کی نشو و نما پر توجہ دی جاتی ہے۔ پہلی صورت میں تو اشیاء کے رنگ روپ کی طبعی جذباتی اہمیت اور رنگوں اور شکلوں کی آمیزش سے مرتّب ہونے والی طرحوں کو ملحوظ رکھا جاتا ہے اور دوسری کا سرکار ٹھیک ٹھیک جانچنے، جزئیات کو پہچاننے اور ان کی ترتیب و تدوین سے ہے تاکہ ان کی بعض معلوم مثالوں سے مشابہت قائم رکھی جاتے۔

ظاہر ہے کہ بچّوں کی فنّی تربیت کے ان طریقوں سے اپج بالکل دب کر رہ جاتی ہے۔ پہلے طریقے میں تو بعض معروف خوبصورت پیرایوں کو سمجھنے اور دہرانے سے بچّوں کے جمالیاتی شعور کو تھوڑی بہت نمو دی جاتی تھی لیکن ان دونوں میں مہارت پیدا کرنے پر بہت زیادہ، اور ذاتی طبّاعی اور اپج پر بہت کم زور دیا جاتا تھا جو فن کی روح رواں ہے۔

اس دریافت کا سہرا جدید معلّمین کے سر ہے جو پچھلے چالیس سال میں اس نتیجہ پر پہونچے کہ بچّوں کی فنی تربیت کا محض آنکھوں اور ہاتھوں کو سدھانے کی بے روح مشق ہی پر مشتمل ہونا ضروری نہیں بلکہ یہ ساری شخصیت کو نمو دینے کی بات ہے۔ یہ ایک جسارت آمیز اقدام ہے جس کی بدولت بچّے کا ذہن پھیلتا اور اس کی ذات نشو و نما پاتی ہے۔ رنگوں اور خطوں کے ذریعے اس آزادانہ اور بے ساختہ اظہار کو احساسات کی رہائی اور شخصیت کی ترجمانی کا حیرت آفریں عمل تصوّر کیا گیا ہے جس میں دلی واردات اور افکار کی ترجمانی کی جاتی ہے اور شخصیت کو نمو پانے کا موقع ملتا ہے۔ ساتھ ہی یہ عمل بچّوں کو کچھ نہ کچھ تخلیق کرنے اور جمالیاتی صلاحیتوں کو تقویت دینے کا موقع بھی بہم پہونچاتا ہے۔

پاکستان میں بھی بچّوں کی فنّی تربیت کے لئے اس قسم کی تعلیم کو اہم تسلیم کیا جانے لگا ہے اور ملک میں جا بجا کتنے ہی اچھے اچھے تعلیمی ادارے اُن پرانے طریقوں کو چھوڑتے جا رہے ہیں جن کے مطابق بچّے صرف تصویروں کی نقل اتارتے تھے یا کلاس میں متفرق چیزوں کی خاکہ کشی یا

نقاشی کرتے تھے جن لوگوں نے پاکستانی اداروں میں اس قسم کی فنّی تربیت کا آغاز کیا ان میں شاکر علی اور سلطان ربی ۔ (وی ۔ ایس ۔ اسکول ۔ کراچی)، علی امام (صادق پبلک اسکول بہاول پور)، معین نجمی (ایچیسن کالج ، لاہور) حنیف رامے (لارنس کالج ، گھوڑا گلی ، اور انور جلال شمزا (کیتھیڈرل اسکول لاہور) کے نام قابل ذکر ہیں ——— ان کے علاوہ اس سلسلہ میں کئی اور باکمال اساتذہ دیگر مقامات پر بہت عمدہ کام کر رہے ہیں ۔ مثلاً گورنمنٹ سیکنڈری اسکول ، ایبی سینیا لائن کراچی میں مسٹر عباسی ، اسکیچ کلب ، یو ۔ ایس ۔ آئی ۔ ایس ، کراچی میں مسٹر اے ۔ ایس ۔ ناگی اور آرٹسٹ کلب کراچی میں مسٹر سردار محمد ۔ حسنِ اتفاق سے کراچی میں مسز ہیتھ ڈلیسپر جیسی باکمال اور گرم جوش آرٹسٹ کی موجودگی ، جو پہلے مقامی امریکن اسکول میں مصوّری کی تعلیم دیتی تھیں ، اس سلسلہ میں اہل فن کو زیادہ سرگرمی اور شغف سے کام کرنے کی ترغیب دلاتی رہی ہے اور ان کے لئے امداد کا ایک مستقل ذریعہ ثابت ہوئی ہے ۔ ملک میں کئی اور ادارے بھی بچّوں کی فنّی تربیت پر پہلے سے بڑھ چڑھ کر توجہ دے رہے ہیں مگر وہ اتنے خوش قسمت نہیں کہ انھیں اچھے استاد میسّر آئیں جو بچوں میں اپنی اپچ اور ذہانت سے تصاویر بنانے کا شوق پیدا کر سکیں ۔ اکثر استاد تو بالکل پرانی وضع کے "ڈرائنگ ماسٹر" کی مانند ہوتے ہیں جو طلباء کو صرف اتنا ہی سکھا سکتے ہیں کہ وہ تختہ سیاہ یا کسی کتاب سے کوئی تصویر نقل کر لیں یا زیادہ سے زیادہ کوئی چیز سامنے رکھ کر اس کا خاکہ اتار لیں ۔ اس کے باوجود ارباب تعلیم میں یہ خواہش ضرور موجود ہے کہ وہ فنّی تربیت کے اس پہلو پر توجہ دیں یہ ان کا قصور نہیں کہ انھیں اس ضمن میں ٹھیک قسم کے لوگوں کی رہنمائی حاصل نہیں ہوتی ۔

بچوں کی تصاویر کی نمائش پاکستان کے قریب قریب ہر ایک فنّی ادارے کے سالانہ جلسہ کا مستقل جزو ہے ۔ یہاں تک کہ کراچی کے بہروں اور اندھوں کے اسکول نے بھی اپنے سالانہ جلسے میں اپنے طلبہ کے تیار کئے ہوئے سو ایک خاکے اور تصاویر پیش کیں ۔ یہاں بھی وہی شکایت ہے کہ بچّوں کو ایسے استادوں کی تربیت ہاتھ نہیں آتی جن کے فنّی تعلیم و تربیت کے بارہ میں خیالات واقعی جدید ہوں ۔ اس لئے ان کا کام محض نقالی ہے ۔ وہ تصویریں بناتے ہیں تخلیق نہیں کرتے ۔ اس سے کہیں زیادہ دلچسپ کام کچھ سال ہوتے شاکر علی نے بی ۔ وی ۔ ایس ، پارسی اسکول (کراچی) میں انجام دیا تھا ۔ وہ بچوں کو رنگین کاغذ دے دیتے تھے ۔ تاکہ وہ ان کو اپنی اپنی پسند کے مطابق خوبصورت شکلوں میں تراشیں اور پھر ان ٹکڑوں کو جوڑ جوڑ کر مکمل تصویریں تیار کریں ۔ شاکر صاحب نے خود بھی ان تراشوں سے فائدہ اٹھایا اور بچّوں کی بنائی ہوئی تصاویر کو اپنی تصاویر میں استعمال کیا ۔ انھوں نے ایک نمائش کا بھی اہتمام کیا ، جس میں ان کے زیر تربیت بچوں کی بہت ہی نفیس بنائی ہوئی تصاویر پیش کی گئی تھیں یہ تصاویر انھوں نے اپنے آپ سے ہی تیار کی تھیں ۔

اس سے کہیں وسیع پیمانہ پر اقوام متحدہ کے عوامی تعلیم کی نصابی کتابوں کے متعلق "سیمنار" کے موقع پر ایک نمائش کا اہتمام ہوا مگر بلاشبہ بچّوں کی کھینچی ہوئی تصاویر کی سب سے بڑی اور کامیاب نمائش ایچیسن کالج لاہور میں منعقد ہوئی ۔ مصوّری کے استاد جناب معین نجمی نے تمام پاکستان سے تصاویر فراہم کرنے کی کوشش کی ۔ انھوں نے تقریباً ۵۰۰ عمدہ تصاویر حاصل کیں جن میں سے زیادہ تر لاہور یا مغربی پاکستان کے دوسرے شہروں سے بہم پہنچائی گئی تھیں ، علاوہ بریں وہ زیادہ تر انگریزی وضع کے پبلک اسکولوں سے حاصل کی گئی تھیں ، اس لئے وہ ہمارے تعلیمی اداروں کی اطفالی مصوّری کی پوری طرح نمائندگی نہیں کرتی تھیں ۔ پھر بھی ایچیسن کالج نے جو نفیس مجموعہ شائع کیا تھا اس میں بعض بہت دلچسپ تصاویر شامل تھیں اور اس طرح بچّوں اور ان کی مصوّری کی بڑی حوصلہ افزائی کی گئی تھی ۔

حال ہی میں راقم الحروف نے کراچی کے اسکولوں کے بچّوں کی بنائی ہوئی تصاویر کی ایک چھوٹی سی نمائش منعقد کی تھی ۔ ان تصاویر کو پیش نظر رکھتے ہوئے بعض اشارات بے محل نہ ہوں گے کیونکہ ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں فنّی تربیت کیا نہج اختیار کر رہی ہے ۔

ایک خاص بات یہ ہے کہ چار چھ سال کے بچّوں کی بنائی ہوئی تصاویر بہت کم تھیں ۔ یہ اس حقیقت پر روشنی ڈالتی ہے ، جس کی دیگر ذرائع سے بھی تصدیق ہوتی ہے ، کہ ہمارے مدارس میں اس عمر کے بچّوں کی فنّی تربیت پر سب سے کم توجّہ دی جاتی ہے اگرچہ جدید تعلیمی نظریے اس پر روز بروز زیادہ زور دے رہے ہیں ۔

جہاں تک ۱۴ ۔ ۱۶ سال کے لڑکوں کا تعلق ہے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان کی تصاویر یا اکثر بچّوں کی تصاویر سے زیادہ بالغ لوگوں کی تصاویر معلوم ہوتی ہیں ۔ بچّوں کی تصاویر کی نمائشوں کا مدعا فنی شاہکاروں کی تلاش نہیں بلکہ بچّوں کے ذہن سے زیادہ قریب آنا اور ان کے متعلق بہتر اور بالکل تازہ واقفیت حاصل کرنا ہے بچّوں کی تصاویر میں احساس

ـہ یہ دونوں پبلک اسکول ہیں ۔

حیرت ہونی چاہیئے۔ ہمیں یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ ہمارے ملک میں چودہ[۱۴] پندرہ[۱۵] سال کے لڑکے بھی بچپن کی تازگی کھو چکے ہیں اور بلوغ کی سرحد میں داخل ہو گئے ہیں۔ اس طرح جلد بالغ ہو جانے میں شاید آب و ہوا کو کچھ دخل ہو یا کرخت حالات کو، یا اُس پرانی وضع کی تعلیم کو جو بچوں کو بڑا خیال کرتی ہے یعنی عمر و قامت میں چھوٹے مگر "بڑے بچے"۔

ان تصاویر کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ان میں سے اکثر سکھانے والوں کے اثر کی غمازی کرتی تھی۔ ان میں سیکھنے والوں کی اپنی جھلک کم تھی۔ بعض تصاویر میں تو شاگرد کے نام کے ساتھ استاد کا نام بھی درج تھا۔ بے شک استاد کو شاگرد کی فنّی تربیت میں بے حد دخل ہے لیکن صرف ان معنوں میں کہ وہ اس کی شخصیت کو بروئے کار لائے۔ اگر استاد اپنے پہلے ہی سے مقررہ، بالعموم روایتی تصوّرات سے بچوں کے طبعی میلانات اور سیدھے سادے خیالات اور اسالیب کو پنپنے سے روک دے یا انھیں دبا دے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس سے ہمارے فیصلہ کی تائید ہوتی کہ گو ہمارے اساتذہ میں ذوق و شوق اور کاوش و محنت کی کمی نہیں پھر بھی وہ فنّی تربیت کے صحیح تصوّر سے بیگانہ ہیں۔

تصاویر کی ایک اور خرابی، جس کا ہم میں سے کوئی بھی ذمہ دار نہیں۔ اسالیبِ اظہار میں تنوّع کا فقدان اور گھٹیا درجہ کے سامان کا استعمال ہے۔ کئی خاکے محض پنسل سے بنائے گئے تھے۔ بے شک پنسل کسی استاد کے ہاتھ میں بڑے حیرت انگیز نتائج پیدا کر سکتی ہے مگر سیکھنے والا بچہ کالی کالی لکیروں میں اپنے جوہر ٹھیک طرح بھلا کیسے دکھا سکے گا؟ اگر خطوط کچھ بولتے بھی ہیں تو گھٹے گھٹے دبلے دبے۔ ممکن ہے بعض بچے اس قدر نظم اور ضبط کے قائل ہوں کہ وہ تصویر کشی کے لئے پنسل ہی کو پسند کریں، پھر بھی کوئی تعجّب کی بات نہیں کہ اگر انھیں موقع دیا جاتے تو ان میں سے اکثر اپنی ترجمانی کے لئے کسی بھی رنگ کو اختیار کر لیں۔ اکثر بچّوں نے یا تو گھٹیا قسم کے روغنی چاک استعمال کئے یا آبی رنگ، اور وہ بھی گھٹیا کاغذ پر۔ اگر انھیں عمدہ سامان مہیا کیا جائے اور اسالیب اظہار میں بھی تنوع پیدا کرنے کا موقع دیا جاتے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ بہتر نتائج نہ پیدا کریں۔ اب جب ہم خود اپنے ملک میں کاغذ تیار کر رہے ہیں یہ اُمید کی جاتی ہے کہ کم از کم ایک بڑی دشواری دور ہو جائے گی اور ہمیں ڈرائنگ کا کاغذ سستا اور بافراط مل سکے گا۔

جہاں تک تصاویر کی اچھائی برائی یا خصوصیات کا تعلق ہے ان کے بارہ میں کوئی مجموعی رائے ظاہر کرنا مشکل ہے۔ میرے خیال میں مختلف قوموں کے بچّوں کی تصاویر میں اتنا فرق نہیں ہوتا جتنا بڑوں کی تصاویر میں۔ پھر بھی پاکستانی بچّوں کی تصاویر میں بعض امتیازی خصوصیات کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

بچے غیر شعوری طور پر اُن فنّی روایات سے جو اُن کے ماحول میں رچی بسی ہوں اثر قبول کر ہی لیتے ہیں۔ وہ شروع ہی سے بھانپ لیتے ہیں کہ تصاویر میں توازن کی ایک صورت سڈول پن پیدا کرنا ہے۔ اگر وہ اپنی تصاویر میں یہ بات نہ بھی پیدا کریں تو بھی ایک پُر شکوہ وضع ضرور عطا کریں گے جو حرکی ہونے کی بجائے سکونی ہوتی ہے۔ ان کے کسی نقش میں ترچھی ترتیب تو شاذ ہی دکھائی دیتی ہے۔

باقی رہے رنگ تو کسی خاص وجہ کی بناء پر ہم آہنگ ہونے کے بجائے وہ عموماً الگ ہی الگ لگا دئے جاتے ہیں جیسا کہ دوسرے ممالک کے بچّوں کی تصاویر میں نظر آتا ہے۔ اِس سے اُس سپاٹ سے نقش میں جان سی پڑ جاتی ہے، جس پر تصویر کی بنیاد ہو۔

بے شک تصاویر میں گرد و پیش کی زندگی اور چیزوں کی اچھی خاصی جھلک دکھاتی دیتی ہے کیونکہ بچّے دنیا میں ہر کہیں نقال ہی ہوتے ہیں۔ گو ان کا کام واقعات کی ہُو بہُو تصویر کشی کرنا نہیں ہوتا پھر بھی ان کے نقوش واقعیت سے قریب تر ہوتے ہیں۔ کیا ہم اس کو من وعن قدرتی وضع سے تعبیر کریں؟ بچّے تجریدی طرحوں یا پیرائوں کے بجائے اس مادّی دنیا کا نقش کھینچتے ہیں جس کا سرچشمہ یادداشت ہو یا چشم تصوّر۔ ویسے ہمارے بچّے جب بھی موقع ملے لباسوں اور عمارتوں پر بیل بوٹے بنانے کے بہت شوقین ہیں۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک لحاظ سے دوسروں کی نسبت وضع و ہیئت اور تصویری خصوصیتوں پر زیادہ نظر رکھتے ہیں۔

اس قسم کی الگ پہچان میں آنے والی مشترک خصوصیات کا سراغ لگانا کچھ ایسا مناسب بھی نہیں ہے، اس لئے ہم اس کو یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ بچوں کی تصاویر کو ناظر خود دیکھ کر بہتر اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں۔ ان سے کم از کم اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ دوسروں کی طرح ہمارے بچّے بھی اس مخصوص تخیّل سے اچھی طرح بہرہ ور ہیں۔ جس سے خیالات کو تصاویر کے روپ میں ڈھالا جاتا ہے۔

پاکستان شاہراہ ترقی پر

ہمارے نئے باتصویر کتابچوں کا سلسلہ

ملک کی اہم صنعتوں پر "ادارۂ مطبوعات پاکستان" نے مصور کتابچوں کا سلسلہ حال ہی میں شروع کیا ہے جو ملک میں اپنی افادیت اور نفیس آرائش و طباعت کی خوبیوں کے باعث بہت مقبول ہوا ہے۔ یہ کتابیں ہر موضوع سے دلچسپی رکھنے والے ماہروں سے مرتب کرائی گئی ہیں اور ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ملک کی ان اہم صنعتوں پر مختصر مگر مکمل معلومات، اعداد و شمار اور اہم حقائق عام پڑھنے والوں کی دلچسپی اور استفادہ کے لئے پیش کئے ہیں۔

ہر کتابچہ میں آرٹ پیپر پر چھپی ہوئی ۱۲ صفحے کی نفیس تصاویر ہیں جن کے ذریعے ہر صنعت کے مختلف مراحل کی تیاری کی کیفیت سامنے آجاتی ہے۔ ہر کتابچہ کا سرورق رنگین آرٹ کارڈ پر نفیس تصاویر سے مزین ہے۔

استفادۂ عام کی خاطر قیمت ہر کتابچہ صرف ۴ر رکھی گئی ہے۔ یہ کتابچے اس وقت تیار ہیں:

- پٹ سن
- کپڑے کی صنعت
- اشیائے صرف
- سیمنٹ کی صنعت
- پن بجلی کی صنعت
- ذرائع آبپاشی کی توسیع
- چائے کی کاشت اور صنعت
- ماہی گیری
- کاغذ کی صنعت

ملنے کا پتہ:- ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

"ماہِ نو" کی اشاعتِ خاص

شمارۂ جمہوریت

مارچ ۱۹۵۷ء

تاریخی سال ـــــــــــــــ تاریخی پیشکش

پاک و ہند کے ممتاز اہلِ قلم کے مضامین سے مزیّن

تاسیس جمہوریۂ اسلامیہ پاکستان کی پہلی سالگرہ کی تقریب پر

مارچ ۱۹۵۷ء میں شائع ہو رہا ہے

ضخامت عام اشاعتوں کے دوچند سے زیادہ - دیدہ زیب رنگین سرورق ـــــــ نادرہ کارصناعی کا نمونہ

متعدد رنگین تصاویر: جو نقش کاری اور فن کی لازوال روایات کی حامل ہوں گی۔

سادہ تصاویر: ۱۲ صفحات: ملک کی اہم ترقیات، علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی جھلک

چند متوقع لکھنے والے

غلام عباس	ڈاکٹر سید عبد اللہ	سیماب اکبرآبادی مرحوم	ابو الاثر حفیظ
حجاب امتیاز علی	سید وقار عظیم	فضل احمد کریم فضلی	جگر مرادآبادی
ابو الفضل صدیقی	سید ضمیر جعفری	ابن انشا	جوش ملیح آبادی
انور	حامد اللہ افسر	ناصر کاظمی	بیگم سلمیٰ تصدق حسین
ممتاز مفتی	ممتاز حسن	یوسف ظفر	آنسہ منہاج محمود
انتظار حسین	ممتاز حسین	عبد الحمید عدم	بیگم ادا جعفری
ابو سعید قریشی	کمال احمد رضوی	حفیظ ہوشیارپوری	روشن صدیقی
•	شمیم احمد	سراج الدین ظفر	سید جعفر طاہر

• شیر افضل جعفری • عبد العزیز خالد • سید یوسف بخاری

وغیرہ

قارئین، مشتہرین اور ایجنٹ حضرات: نوٹ فرمالیں کہ اس سال سے "ماہ نو" کا شمارۂ خاص اگست کی بجائے مارچ میں شائع ہوا کرے گا

جمہوریت نمبر کے لئے مشتہرین حضرات اپنے لئے صفحات کی بکنگ جلد از جلد کرالیں، کیونکہ یہ پرچہ بہت جلد طباعت کیلئے چلا جائے گا۔

ایجنٹ حضرات "ماہ نو" کے "جمہوریت نمبر" کی مطلوبہ تعداد سے بزنس منیجر صاحب ادارۂ مطبوعات پاکستان کراچی کو جلد از جلد مطلع فرمائیں۔

ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

کشمیر

ے اسرا ممں ں احد ادں
درکں ماں ں ے و

لسمںر ے دکھں مہاحرس دریا عبور کر کے ا سںاں مں
داحل ھو رہے ہں

اراد کسمر کا ایک برف بوس پہاڑ

بچے کی نظر میں)

(خورد سال: ۱۲

(ملاحظہ ہو مضمون ''بچوں کی مصوری'' صفحہ ۳۲ پر)

پر حملہ کرنے کے لئے وہ اس کا ساتھ دے۔ نصیر خاں اپنی فوج لے کر لاہور تک آیا۔ اور یہاں سکھوں کو شکست فاش دے کر واپس چلا گیا۔ کیونکہ وہ زیادہ دیر تک بلوچستان سے غیر حاضر نہیں رہ سکتا تھا، احمد شاہ ابدالی دہلی کی طرف بڑھا۔ کیونکہ وہاں اُن مرہٹوں نے اودھم مچا رکھا تھا جو پانی پت سے بچ نکلے تھے۔

۱۷۶۹ء میں تمام ایرانی سرداروں نے متحد ہو کر افغانوں پر حملہ کیا۔ لڑائی مشہد کے میدان میں ہوئی۔ شاہزادہ تیمور ایرانی فوج کا سپہ سالار تھا۔ اس جنگ میں ایک دن ایسا آیا کہ ابدالی کی فوجوں کے پاؤں ڈگمگانے لگے، ایرانی فوجوں کا ریلا بڑا خوفناک تھا، افغان پسپا ہونے لگے۔ عین اس موقع پر نصیر خاں ایک پہلو سے تین ہزار توپچی گھڑسواروں کے ساتھ بلائے ناگہانی کی طرح ایرانیوں پر ٹوٹ پڑا، یوں معلوم ہوتا تھا کہ آن واحد میں کوئی طوفان اُمڈ کر آیا ہے۔ اس ناگہانی حملہ پر ایرانی بوکھلا گئے اور میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ کئی ہزار ایرانی توپچیوں نے تہ تیغ کر دیئے۔

ابدالی نصیر خاں کی غیر معمولی جنگی قابلیت اور شجاعت کو دیکھ کر بہت ہی خوش ہوا اور اُسے بلوچستان کے کچھ اور علاقے بھی دے دیئے۔

اس کا چچا زاد بھائی بیرم خاں کابل سے بلوچستان پہنچا، اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اس کی بہن احمد شاہ ابدالی کی بیوی ہے اور اسی رعب میں اس نے نصیر خاں سے بلوچستان میں اپنے حصے کا تقاضا کیا جو ایک فضول سا مطالبہ تھا۔ نصیر نے انکار کیا تو بیرم خاں کچھ فوج لے کر آ گیا۔ بیرم خاں بری طرح شکست کھا کر بھاگا اور جب تک نصیر خاں زندہ رہا اس نے بلوچستان کا رُخ نہ کیا۔

۱۷۹۵ء میں نصیر خاں راہیٔ ملک عدم ہوا۔ اس نے تین لڑکے اور پانچ لڑکیاں پیچھے چھوڑیں۔ اس کے بڑے بیٹے محمود خاں کی عمر ۱۴ برس کی تھی۔

کردار

وہ ایک اعلیٰ پایہ کا سیاستدان، سپاہی اور شہزادہ تھا۔ اس میں بےشمار خوبیاں تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے ہاتھ بھائی کے خون سے رنگے ہوئے تھے، لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، وہ عمر بھر اپنے بھائی کے غم کو دل سے نہ بھلا سکا، جب بھی بھائی کا ذکر آتا تو اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے اور وہ کہتا: "میں نے صرف ملک اور قوم کی خاطر اپنی عزیز ترین شے کی قربانی دی" اور اس نے اس قول کو پورا کر دکھایا۔ اس نے اپنی ساری زندگی صرف اپنی رعایا کے لئے وقف کر دی۔ اُسے دولت کی مطلق ہوس نہ تھی، دولت سمیٹنے کے لئے اس نے اپنی عمر میں کوئی قدم نہ اٹھایا اور ذاتی جاہ و جلال کا وہ کبھی آرزو مند نہ ہوا۔ میدانِ جنگ میں جب جاتا تو بالکل عام سپاہیوں کی طرح زندگی بسر کرتا۔ کوئی یہ نہیں پہچان سکتا تھا کہ وہ حاکم وقت ہے۔ اسے صرف ایک فکر تھا کہ وہ اپنی قوم کو کس طرح خوشحال بنائے، خویش پروری اور اقربا نوازی کے وہ سخت خلاف تھا۔ اس کا کوئی رشتہ دار کسی اعلیٰ عہدہ پر نہیں تھا۔ اور نہ وہ ملکی اور معاشرتی معاملات پر کسی عزیز کو ترجیح دیتا تھا۔

ایک اور بات بھی اس کے ذہن میں تھی؛ وہ مخیّر تھا، رحمدل تھا لیکن اس کا یہ خیال بھی تھا کہ اگر لوگوں کو زیادہ انعام و اکرام دیئے جائیں تو وہ جاگیرداری کے جذبہ میں مست ہو کر رہ جائیں گے اور محنت و مشقت کر کے روٹی کمانے کی عادت نہیں رہے گی، البتہ وہ فنکاروں اور کاریگروں کی بہت حوصلہ افزائی کیا کرتا تھا، ایک دفعہ ایک فنکار کپڑے پر اعلیٰ قسم کی کشیدہ کاری کر کے دربار میں لایا، نصیر خاں نے کہا جس قدر اشرفیاں اُٹھا سکتے ہو اٹھا لو۔

انصاف اور قانون

نصیر خاں کا سب سے بڑا اصول یہ تھا کہ معاشرتی انصاف کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے، جب تک "سوشل جسٹس" بروئے کار ہوگی عوام کے حقوق کبھی پامال نہیں ہوں گے۔ وہ اس اصول پر سختی سے کاربند تھا کہ بلوچستان کے طول و عرض میں بدکردار اور غنڈے اس کا نام سن کر تھرا جاتے تھے۔ اس کے بھائی نے بہت سے غنڈے پال رکھے تھے جن کے ذریعہ وہ عوام کو پریشان کیا کرتا تھا۔ جوں ہی زمام اقتدار اس کے ہاتھ میں آئی اس نے غنڈوں کا قلع قمع شروع کر دیا، ظاہر ہے کہ اُسے اپنے حصولِ مقصد کے لئے غنڈوں کی ضرورت نہیں تھی۔ بعض انگریز مورخوں کا خیال ہے کہ اگر یہ شخص یورپ میں ہوتا تو تاریخ میں اس کا نام سنہری حروف میں لکھا جاتا اور اگر وہ ہندوستان کا بادشاہ ہوتا تو شاید وہ ایشیا کا سب سے بڑا روشن خیال بادشاہ تصور کیا جاتا اور ممکن ہے آج ہندوستان و پاکستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ سندھ، پنجاب، اور سرحد میں وہ ضرب المثل کی طرح مشہور تھا، اسکی بہادری، انصاف پسندی، فراخدلی اور تحمل کے بہت سے واقعات زبان زد عام تھے۔ کہتے ہیں کہ چھوٹے سے چھوٹا عہد کر کے بھی اس نے ایک دفعہ بھی وعدہ خلافی نہیں کی۔

نصیر خاں نے نظم و نسق کو بہتر بنانے کے لئے نئے نئے قوانین بنائے۔ اس نے اسلامی قانون کو رائج کرنے میں کافی محنت سے کام لیا۔ اس نے اس امر کا خاص طور پر اہتمام کیا تھا کہ انصاف کرنے والے حاکم کسی حالت میں بھی مجرم سے رعایت نہ کریں اور کسی شخص کی سفارش نہ سنیں۔ اس کے احکام اس قدر سنگین تھے کہ کسی کو سفارش کرنے کی جرأت ہی نہ ہوتی تھی۔ قتل کے مقدمات وہ خود سنا کرتے تھے۔ اگر مقتول کے رشتہ دار رضامند ہوں تو خون بہا ورنہ گردن مار دینے کا حکم۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بات مقتول کے رشتہ داروں پر چھوڑ دیتا تھا کہ وہ قاتل کو اپنے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُتاریں یا عمر بھر اُسے غلام بنا کر کام لیتے رہیں۔ البتہ اگر مقتول غیر ملکی ہو تو پھر قاتل سے کسی قسم کی رعایت کا امکان نہیں تھا۔ جرم ثابت ہونے پر فوراً موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا، ڈاکوؤں اور شبخون مارنے والوں کے لئے بھی موت کی سزا

بقیہ صفحہ [illegible] پر

اس کا بڑا بھائی کسی طرح بھی ڈھب پر نہ آیا بلکہ اس نے نصیر خاں کو بُرا بھلا کہا۔ نصیر خاں نے کئی بار کوشش کی کہ کسی طرح وہ الگ ہوجائے لیکن حاجی محمد خاں پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ اُس نے نصیر خاں کے قتل کی سازش شروع کر دی، جب بات انتہا تک پہونچ گئی تو نصیر خاں نے اپنے بھائی کو قتل کروا دیا۔ کہتے ہیں کہ وہ اس واقعہ سے عمر بھر رنجور رہا، مرتے دم تک یہ داغ اس کے سینے سے نہ مٹ سکا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ محض اپنے وطن کی محبت کے باعث وہ اس حد تک مجبور ہوگیا تھا ورنہ وہ اپنے بھائی کو کبھی قتل نہ کرواتا۔

مظالم کا خاتمہ

بلوچستان کے رہنے والے نصیر خاں سے بے اندازہ محبت کرتے تھے، ایک دفعہ وہ اپنے بڑے بھائی کی زندگی میں قلات میں گیا تو لوگوں نے اس کا شاندار خیر مقدم کیا۔ اس کی بہادری کے کارناموں اور اعلیٰ سیرت کی خبریں تو مدت ہوئی وہ سُن چکے تھے، وہ غائبانہ طور پر ہی اس کے بہت گرویدہ ہوچکے تھے اور جب حاجی محمد قتل ہوا تو سب نے اطمینان کا سانس لیا اور بلوچستان کا ہر فرد نصیر خاں کے ساتھ تھا، نصیر خاں نے نادر شاہ کو مطلع کر دیا کہ ریاست کا انتظام اس نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے، نادر شاہ نے مبارک باد کا پیغام بھجوایا۔ گدی پر بیٹھتے ہی نصیر خاں نے تمام مظالم کا خاتمہ کر دیا۔ شیعہ اور سنی جھگڑا ختم کر دیا گیا۔ اس نے سرکاری طور پر اعلان کیا کہ ان دونوں فرقوں کے مباحثے نہیں ہوا کرینگے۔ ہندوؤں سے مذہبی مباحثے بھی موقوف کر دیئے گئے۔ بہت سے ٹیکس بھی معاف کر دیئے گئے، اس نے اعلان کیا کہ جو ہندو اس کے بھائی کے مظالم سے مجبور ہوکر بھاگ گئے تھے وہ واپس آجائیں۔ چنانچہ ہندو جوق درجوق واپس آگئے۔ اس نے ایک مذہبی ٹیکس عائد کر دیا جس کی رُو سے مندروں کی نگہداشت اور برہمنوں کی دیکھ بھال ہوا کرتی تھی، یہ سارا ٹیکس اُن پر صرف ہوتا تھا۔ لدا ہوا اُونٹ جب تجارتی مال لیکر بازار میں داخل ہوتا تھا تو فی اونٹ چار آنے وصول کئے جاتے تھے اور یہ وہ ٹیکس تھا جو مندروں اور برہمنوں پر صرف ہوتا تھا۔

نصیر خاں نے بلوچستان کے کونے کونے کا دورہ کیا۔ موقع پر جاکر لوگوں کی شکایات سُنیں اور تمام حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ واپس آکر اس نے عوام کی بہبود کے لئے بہت سی تاریخی اصلاحات نافذ کیں جن کا ذکر مختصراً آگے آئے گا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے کابل اور ایران سے پھلوں کے پودے منگوا کر بلوچستان میں لگوائے، اس کی یہ آرزو تھی کہ بلوچستان میں ایسے باغ لگوائے جائیں جن کی مثال ہندوستان بھر میں نہ ہو۔

احمد شاہ ابدالی

۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کا انتقال ہوا، ۱۷۵۸ء میں نصیر خاں نے خود مختار حکومت کا اعلان کر دیا۔ ابدالی کو یہ بات ناگوار گذری۔ اس نے اپنے ایک وزیر کی کمان میں ایک بہت بڑی فوج بھجوائی تاکہ نصیر خاں کو بغاوت کی سزا دی جائے۔ قلات سے تیس میل دور تیرنگ واد کے مقام پر بلوچیوں اور افغانوں کی مڈبھیڑ ہوئی۔ افغان دلیروں کو بری طرح شکست ہوئی۔ کئی ہزار افغان میدان جنگ میں کام آئے۔ جب احمد شاہ ابدالی نے اس شکست کا حال سُنا تو وہ غم و غصہ سے بیتاب ہوگیا۔ اس نے بہت بڑا لشکر جمع کیا اور بلوچستان پر حملہ آور ہوا، مستونگ کے مقام پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ ابدالی پوری قوت کے ساتھ چڑھ آیا تھا اور انتقامی جذبات سے بھرپور تھا۔ اس لئے یلغار بڑی سنگین تھی نصیر خاں پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوا اور اسے اس بات کا پہلے ہی علم تھا کہ اُسے پیچھے ہٹنا پڑے گا کیونکہ ابدالی کی قابلیت اور طاقت کو وہ خوب جانتا تھا۔ سوچی سمجھی ہوئی تدابیر کے مطابق وہ پیچھے ہٹا اور قلات میں قلعہ بند ہوگیا۔ قلعہ میں اس نے خوراک اور دیگر اشیاء کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ ابدالی نے قلات کا محاصرہ کیا اور یہ محاصرہ کافی طویل ہوگیا۔ ابدالی نے تین دفعہ بڑی شدت کے ساتھ یلغار کی کہ وہ قلعہ کی دیواریں توڑ کر گذر جائے لیکن تینوں دفعہ اُسے ناکامی ہوئی۔ اور اُدھر یہ حالت تھی کہ افغان بددل ہونے شروع ہوگئے اور رسد بھی ختم ہوگئی۔ چنانچہ ابدالی صلح پر مجبور ہوا اور معاہدہ کی شرائط سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ نصیر خاں کا پلہ بھاری تھا۔ شرائط یہ تھیں:-

(۱) ابدالی نصیر خاں کے چچا کی لڑکی سے شادی کریگا تاکہ دونوں سلطنتوں کے رابطے زیادہ مضبوط ہوں۔

(۲) نصیر خاں کسی قسم کا خراج ادا نہیں کرے گا۔

(۳) نصیر خاں فوجی امداد دے گا لیکن ابدالی نصیر خاں کے سپاہیوں کو نصف تنخواہ ادا کرے گا۔

(۴) نصیر خاں کسی صورت میں افغانوں کی خانہ جنگی میں حصہ نہیں لے گا۔

اس معاہدہ کے بعد ابدالی قندھار چلا گیا۔ اس کی نئی بیوی کے ہمراہ اس کا بھائی بہرام خاں بھی گیا۔ یہ نصیر خاں کا چچازاد بھائی تھا۔

نصیر خاں کی دلاوری

احمد شاہ ابدالی جیسا سپہ سالار بھی نصیر خاں کی دلاوری اور جنگی استعداد کا معترف ہوگیا۔ اس سے نصیر خاں کی خداداد قابلیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ جب ابدالی قلات کا محاصرہ کئے ہوئے تھا تو اس وقت وہ اپنے خیمے کے باہر نماز پڑھ رہا تھا، نصیر خاں نے عین اس جگہ گولہ پھینکا جہاں ایک لمحہ پہلے ابدالی نے قالین پر سجدہ کیا تھا۔ صرف ایک لمحہ کی غلطی ہوگئی ورنہ ابدالی کا وہیں کام تمام ہوجاتا۔ جب ابدالی نے دیکھا کہ نصیر خاں اس بلا کا نشانچی ہے تو اس نے فوراً معاہدہ صلح کی آرزو کی۔

۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی نے نصیر خاں سے درخواست کی کہ ہندوستان

نصیر خاں

(وادیٔ بلوچستان کی تاریخ کا ایک ورق)

ـــ نبیل صحافی

سندھ کی تہذیب بہت قدیم تہذیب ہے جو صدیوں سے مختلف حملہ آوروں کی جولان گاہ بنی رہی ہے لیکن اس کے باوجود اس کی صحت مند ثقافت اور یگانگی ایک نمایاں اور روشن پہلو رہا ہے۔ مورخوں نے اگرچہ واضح الفاظ میں نہیں کہا لیکن واقعات کی رفتار ہمیشہ یہ ظاہر کرتی رہی ہے کہ تاریخی اہمیت صرف ایک علاقہ سے وابستہ نہیں تھی۔ اگر بلوچستان میں کوئی مرد مجاہد پیدا ہوتا تو سارا مغربی پاکستان اس پر فخر کرتا اور اس مجاہد کو اپنے کنبے کا ایک فرد تصور کیا جاتا۔ یہی حال پنجاب، سرحد، سندھ کا تھا۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ زمانۂ قدیم میں وادیٔ سندھ کو مخصوص حصوں میں تقسیم نہیں کیا گیا تھا۔ جب مسلمانوں نے اس سرزمین میں قدم رکھا تو فاتحوں کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ اس علاقے کو مختلف صوبوں میں بانٹ دیا جائے۔ پشاور، لاہور، ملتان، اُچ شریف، ٹھٹھہ اور قلات بڑے بڑے شہر تھے اور یہ سارا ایک ہی سلسلہ تصور ہوتا تھا۔

وادیٔ سندھ میں بلوچستان کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اس سرزمین میں ایسے ایسے جاں نثار پیدا ہوئے کہ آج مغربی پاکستان بجا طور پر اُن پر فخر کرسکتا ہے۔ البتہ تاریخ نے ذرا بخل سے کام لیا ہے۔ کہیں بھی ان بہادر فرزندوں کا ذکر نمایاں طور پر نہیں کیا گیا اور پھر انگریزوں کے عہد میں تو اس علاقے کی ممتاز ہستیوں کا ذکر کرنا گناہ سے کم نہیں تھا کیونکہ اس عہد میں اس امر کی پوری کوشش کی گئی کہ بلوچستان کو ایک پسماندہ اور غیر مہذب علاقہ بنا کر پیش کیا جائے حالانکہ حقیقت میں اس سرزمین میں تہذیب اپنے پورے عروج پر رہی ہے۔

گوسانی خاندان

جب چنگیز خاں نے مسلمان علاقوں کو تاخت و تاراج کرنا شروع کیا تو بہت سے مسلمان قبائل اپنے اپنے وطنوں کو چھوڑ کر دوسرے ممالک میں جاکر آباد ہوئے۔ اس وقت کچھ مغل سیستان اور سندھ میں بھی آکر آباد ہوگئے، کچھ مدت وہاں قیام کرنے کے بعد ملتان، شکارپور اور بالائی سندھ کے مسلمان متحد ہوئے۔ اس وقت راجہ شیو قلات کا حکمراں تھا اور اس کا بیٹا سنگین زری پر حکومت کرتا تھا۔ تمام بلوچی قبائل جن میں براری پیش پیش تھے قنبر کی سرکردگی میں راجہ پر حملہ آور ہوئے۔ جنگ میں راجہ ہلاک ہوا اور اس کے بیٹے سنگین نے اسلام قبول کیا۔ اس کے خاندان کو گورزوانی کے نام سے پکارا جانے لگا۔ بعد میں اس قبیلے کو گوسانی کہنے لگے۔

قنبر کا خاندان

قنبر بلوچستان کی گدی پر متمکن ہوا۔ اس نے بلوچستان اور سندھ میں اپنی حکومت کو مضبوط تر بنانے کے لئے بہت سے کارہائے نمایاں کئے۔ قنبر کی آرزو تھی کہ وہ ملتان، سندھ اور بلوچستان کے تمام قبائل کو متحد کرے اور اس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوگیا۔ چنانچہ اس کے عہد میں پنجاب کے لوگ بھی بلوچستان کا سفر اختیار کیا کرتے تھے، اس کے خاندان میں سے عبداللہ خاں نے کچھ گنداوا پر بھی قبضہ کرلیا۔

نادر شاہ کی آمد

طہماس قلی خاں نے جو دنیا میں نادر شاہ کے نام سے مشہور ہے، ہندوستان کا رُخ کیا، بلوچستان اور سندھ میں اس نے اپنے جرنیل فوج سمیت بھجوائے۔ عبداللہ خاں نے اطاعت قبول کی۔ چنانچہ اس تمام علاقے میں نادر شاہی سکہ جاری کیا گیا۔ عبداللہ خاں نے اپنے دو بیٹے بھی بطور یرغمال نادر شاہ کے دربار میں بھجوا دیئے۔ اُن میں نصیر خاں بھی تھا۔ بعدازاں عبداللہ خاں ایک لڑائی میں مارا گیا۔ نادر شاہ نے اس کے بڑے بیٹے حاجی محمد خاں کو بلوچستان کی گدی پر بٹھا دیا۔ حاجی محمد بڑا ظالم انسان تھا۔ وہ ذاتی تعیش ہی کو حکومت خیال کرتا تھا۔ اس نے اپنی رعایا پر ٹیکسوں کی بھرمار کردی۔ اس کے ظلم و ستم سے تنگ آکر ہندو علاقہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ بہت سے مسلمان بھی اپنا گھربار چھوڑ کر چلے گئے۔ عوام کی زندگی بالکل اجیرن ہوگئی تھی۔ کئی سرکردہ لوگوں نے نادر شاہ کو خفیہ خطوط لکھے کہ وہ اُن کو اس ظالم حاکم سے نجات دلوائے۔

سندھ کے ریگستان سے ہوتا ہوا جب نادر شاہ دہلی پہنچا تو اس وقت نصیر خاں اس کے ہمراہ تھا، نصیر خاں بڑا بہادر اور اعلیٰ کردار کا انسان تھا، دہلی کی یلغار میں اس نے انتہائی قابلِ ستائش کارنامے سرانجام دیئے۔ نادر شاہ ہمیشہ اس بہادر نوجوان کی تعریف کیا کرتا تھا اور ایک دفعہ تو وہ اس کے اعلیٰ کردار اور شجاعت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے بھرے دربار میں نصیر خاں سے کہا :-

"بلوچستان کے لوگ تمہارے بھائی کے ظلم و ستم سے بے حد نالاں ہیں، میری طرف سے اجازت ہے کہ تم اپنے بڑے بھائی کو گدی سے اُتار دو اور خود متمکن ہوجاؤ تاکہ تمہاری ریاست خوشحال ہوسکے"۔

بھائی کا قتل

نصیر خاں قلات پہنچا اور اس نے اپنے بڑے بھائی سے درخواست کی کہ وہ ریاست کے انتظام و انصرام سے الگ ہوجائے لیکن

ادیب سہارنپوری

مسلسل بے طلب سی اک اذیت، بے طلب غم ہے
مسرت کی تمنا، ایک بے کہرام ماتم ہے
بلا سے ہو مزاجِ گردشِ دوراں جو برہم ہے
مرے ساقی ہو گردش میں ہے پیمانہ تو کیا غم ہے
یہاں زہد و ریا کا غُل، نہ شورِ دین و دنیٰ
یہی فردوس بھی ہوگا، جو مے خانے میں عالم ہے
وہ عالی ظرف تیرے میکدے کے رند ہیں ساقی
کہ ان کے سامنے دریائے مے بھی ہو تو شبنم ہے
یہ اہلِ ہوش آخر میکدے تک کیوں نہیں آتے
کوئی سر در گریباں ہے، کسی کی آنکھ پُر نم ہے
دلِ راحت طلب شاید غموں سے ہی بہل جاتا
یقیں بھی تو نہیں آتا کہ دنیا میں خوشی کم ہے
نکل آتے ہیں آنسو جب ذرا جی کھول کر ہنسے
ہمارے قہقہوں میں بھی تو اک اندازِ ماتم ہے
مرادوں کا بھرم کھلنے لگا ہے نامرادی میں
ہر اک صورت ہے دھندلائی ہوئی، ہر نقش مبہم ہے
تجھے اپنا بنا کر بن گئی جنت وہی دنیا
جسے ہم کہتے آئے تھے کہ دوزخ ہے جہنم ہے
الٰہی ان کے غم بھی تو مری تقدیر میں لکھ دے
یہ کیوں ہنستی ہوئی اُن پھول سی آنکھوں میں شبنم ہے
ادیب اک شوخ نے میری غزل سن کر یہ فرمایا
یہ باتیں ہم سے کہنے کے لئے آئینہ کیا کم ہے

نظر حیدرآبادی

شعرِ دل آویز سوزِ کیف و سازِ غم بھی ہے
نغمہ بھی فریاد بھی آہنگ بھی ماتم بھی ہے
اہلِ محفل ذوقِ نظارہ یہاں درکار ہے
دیدۂ شاعر میں شعلے ہی نہیں شبنم بھی ہے
جب سے ہے ناآشنائے وادیٔ نجد و تتار
عشق کی آواز بے مقصد بھی ہے مدھم بھی ہے
کچھ خدا کی رحمتیں ہیں اس جہاں سے بے نیاز
کچھ مزاجِ ابنِ آدم ان دنوں برہم بھی ہے
کٹ نہیں سکتی تو گل جاتی ہے زنجیرِ الم
اے رہینِ زخمِ دوراں وقت خود مرہم بھی ہے
روز روز آتا نہیں ہے روزِ ابرِ برشگال
ساقیا! حکمِ قدح خواری کہ یہ موسم بھی ہے
پھر درِ میخانہ وا ہے جام چھلکاؤ نظر
اس کھنکتی رُت میں تم کو فکرِ کیف و کم بھی ہے

جمیل الدین عالی

حقیقتوں کو فسانہ بنا کے بھول گیا
میں دردِ عشق کی ہر چوٹ کھا کے بھول گیا

بہائے تھے جو غمِ آرزو میں اک مدت
ان آنسوؤں کو فقط مسکرا کے بھول گیا

گماں میں یہ رہا منزلوں کا عرصے تک
وہ رہگذار بھی منزل میں آ کے بھول گیا

اب اس سے بڑھ کے بھی وارفتگیٔ دل کیا ہو
کہ تجھکو زیست کا حاصل بنا کے بھول گیا

زہے امید اثر اے خوشا جنونِ قبول
دعا کو ہاتھ اٹھائے اٹھا کے بھول گیا

دل و جگر جو یوں تپتے جھلستے جاتے ہیں
کوئی چراغِ تمنا جلا کے بھول گیا

سلیم احمد

جاں دے کے یوں سلیم سکوں آشنا ہوئے
گویا کسی کے حقِ وفا سے ادا ہوئے

با وصفِ احتیاط و بصد احترامِ حسن
شکوے ہوئے، گلے ہوئے اور برملا ہوئے

کیفِ وفا گواہ کہ ہم اہلِ شوق سے
وعدے تھے جتنے چشمِ کرم کے وفا ہوئے

جب ہر نفس میں بوئے وفا تھی بسی ہوئی
وہ رُت بدل گئی، وہ زمانے ہوا ہوئے

اے چشمِ التفات وہ دُنیا بدل گئی
مت پوچھ درد و سوزِ محبت وہ کیا ہوئے

دیکھا تو ہوگا، حال جو تھا کل سلیم کا
اور اب سُنا ہے پھر وہ کہیں مبتلا ہوئے

یوسف ظفر

کوئی اُٹھا ہے مرے پہلوئے سوزاں سے ابھی
دل کو تسکیں نہ ملے گی کسی عنواں سے ابھی

یہ مری خامئ اُلفت تو نہیں ہے اے دوست!
رنج ہوتا ہے مجھے گردشِ دوراں سے ابھی

کاش یہ زیست بھی اک خوابِ پریشاں نکلے
چونک چونک اُٹھتا ہوں ہر خواب پریشاں سے ابھی

ایک سایہ درو دیوار پہ لہراتا ہے
کوئی کتراتا ہے میرے دلِ ویراں سے ابھی

وحشتِ دل بھی وہی، حال پریشاں بھی وہی
ابھی زنداں میں ہوں، نکلا ہوں جو زنداں سے ابھی

کاش وہ بھی ترے سینے پہ سکوں پا جائے
جسے نسبت ہے تری زلفِ پریشاں سے ابھی

راہِ بے جادہ وبے جا پہ ظفر کیوں چلئے
پوچھنا ہے مجھے یارانِ غزلخواں سے ابھی

ابن انشا

فقیر بن کر تم ان کے در پہ ہزار دھونی رما کے بیٹھو
جبیں کے لکھے کو کیا کرو گے، جبیں کا لکھا مٹا کے بیٹھو

اے اُن کی محفل میں آنے والو! اے سود و سودا بتانے والو
جو اُن کی محفل میں آ کے بیٹھو تو ساری دنیا بھلا کے بیٹھو

بہت جتاتے ہو چاہ ہم سے، مگر کرو گے نباہ ہم سے؟
ذرا ملاؤ نگاہ ہم سے، ہمارے پہلو میں آ کے بیٹھو

جنوں پرانا ہے عاشقوں کا — جو یہ بہانا ہے عاشقوں کا
تو اک ٹھکانا ہے عاشقوں کا، حضور جنگل میں جا کے بیٹھو

ہمیں دکھاؤ نہ زرد چہرا، لئے یہ وحشت کی گرد چہرا
رہے گا تصویرِ درد چہرا، جو روگ ایسے لگا کے بیٹھو

جناب انشا یہ عاشقی ہے، جناب انشا یہ زندگی ہے
جناب انشا جو ہے یہی ہے نہ اس سے دامن چھڑا کے بیٹھو

تازہ ترین کتابیں

واجد علی شاہ اور ان کا عہد

واجد علی شاہ، ایک بدقسمت فرماں روا تھے۔ غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کے تہ بہ تہ پردے ان پر اور ان کے عہد پر پڑے ہوئے ہیں۔ لوگ صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ ایک رند مزاج فرماں روا تھے۔ راگ رنگ، نغمہ و موسیقی عیش و طرب اُن کی زندگی کا مشغلہ تھا۔ ان کا عہد ایک زوال پذیر قوم کا عہد تھا جس میں ادبار انحطاط کے آثار و تلاطم کے سوا کچھ نہ تھا۔

لیکن یہ سب دروں کی پھیلائی ہوئی باتیں ہیں۔ واجد علی شاہ کا عہد علمی، ادبی، معاشرتی، سماجی، دینی، فنی، عسکری، انتظامی، مالی، ہر اعتبار سے ایک شان دار عہد تھا وہ ایک بیدار مغز فرماں روا تھے۔ اُن کے زمانے کا اودھ، شیراز و اصفہان سے ٹکراتا تھا۔ اُن کے زمانے کا لکھنؤ، لندن اور پیرس کو شرماتا تھا۔ ان کے زمانے کی تہذیب، ایک باوقار اور پرشکوہ قوم کی تہذیب تھی۔

رئیس احمد جعفری نے بڑی عرق ریزی، دیدہ کاوی، کاوش تحقیق اور مورخانہ تحقیق و جستجو سے کام لے کر اس عہد کا ایک مرقع کھینچا ہے۔ یہ مرقع عہد واجد علی شاہ کی ایک مکمل اور مستند تاریخ ہے۔ اس میں غدر کی ہولناکیاں بھی ہیں۔ دربار کی سازشیں بھی۔ دین و ملت کے پروانوں کی سرگذشت بھی۔ مجاہدین کی تلواروں کی جھنکار بھی اور اسیران خانۂ زنجیر کی آواز بھی۔ اس مرقع میں اس زمانہ کی پوری تاریخ آگئی ہے۔ ادب، فن، شاعری، علم، دانش، آرٹ، کلچر اور سیاست، رواں کی جامع و مانع تاریخ۔ ضخامت ۸۰۰ صفحات سائز ۲۶×۲۰/۸ زیر طبع۔

جماعت مجاہدین
غلام رسول مہر

سرزمین ہند و پاک میں تحریک احیاء دین اور آزادیٔ وطن کے کارواں سالار سید احمد شہید اور ان کے رفقاء ہماری تاریخ کے وہ نادر الوجود مشاہیر ہیں جن کے حالات و سوانح پر صد سالہ فراموش کاریوں کی گرد جمی پڑی تھی۔ یہ وہ بزرگ تھے جنہوں نے شدید مخالف ہواؤں میں احیاء دین اور آزادیٔ وطن کے چراغ ہم قوموں اور ہم وطنوں کے لئے عزت مندانہ قومی زندگی کے کبھی نہ مٹنے والے نشان قائم کئے۔ ضخامت ۳۲۵ صفحات قیمت سات روپے۔

ہر دل عزیزی
عابدی جعفری

ہر دل عزیزی کیا ہے؟ —— یہ ایسی خداداد صلاحیت کا نام ہے جس سے لوگ متاثر ہو کر آپ کو پسند کرنے لگیں۔ آپ کی عزت کرنے لگیں۔ یہ کتاب کئی طریقے سے آپ کے لئے کارآمد ثابت ہوگی۔ یہ آپ کو آپ کی صحیح قدر و منزلت سے آشنا کرے گی۔ آج بہت سے لوگ اپنی زندگی میں محض اس وجہ سے ناکام ہیں کہ وہ خود اپنی صحیح قدر و قیمت سے ناآشنا ہیں اور اسی لئے وہ احساس کمتری کے شکار ہیں۔ آپ اس وقت تک دوسروں کو پسند نہیں کر سکتے، جب تک آپ خود اپنی قدر و قیمت سے آگاہ نہ ہوں۔ اور اپنے آپ کو پسند نہ کرتے ہوں۔ احساس کمتری وہ زہر ہے جس کا آثار موجود نہیں۔ یہ کتاب اگر کسی اور طریقہ سے آپ کے لئے مفید ثابت نہ بھی ہوئی، صرف آپ پر آپ کی ذاتی قدر و قیمت جتا سکی تو سمجھئے کہ اس کے پڑھنے میں جو وقت صرف ہوا وہ ضائع نہیں گیا اور یقین مانئے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے آشنا تو ہو ہی جائیگا۔ آج ہزاروں لوگ ان نفسیاتی اصولوں پر عمل کرکے تاریکی اور گمنامی اور احساس کمتری کی زندگی کو ٹھوکر مار کر کامیاب زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آپ بھی ایسا ہی کر سکتے ہیں۔ صفحات ۳۶۰ قیمت چار روپے۔

بالاکوٹ
رئیس احمد جعفری

بالاکوٹ وہ مقام ہے، جہاں خدا کے ان بندوں نے حضرت سید احمد شہیدؒ کی سرکردگی میں جام شہادت نوش کیا جو —— دین اسلام کی سربلندی کے لئے گھر سے نکلے تھے۔ یہ بڑی خونچکاں تاریخ ہے۔ اس تاریخ کو ناول کے پیرایہ میں تاریخی صحت کے ساتھ رئیس احمد جعفری نے بڑے لرزہ خیز انداز میں سپرد قلم کیا ہے۔ یہ ناول بھی ہے اور تاریخ بھی —— تاریخ کا دل ہے۔ زیادہ دلچسپ، ناول تاریخ کی طرح مستند۔ اسے پڑھنے کے بعد اسلامی ولولہ اور جوش کی ایک دنیا نظر کے سامنے پھر جاتی ہے۔ صفحات ۵۳۰ قیمت آٹھ روپے۔

زیب النساء
حسین انور

مغل شہزادی جس کی ضیا پاشیوں نے ایران و ہندوستان کو جگمگا دیا۔ عالمگیر کی وہ چہیتی بیٹی جس نے علم و ادب کے پرچم کو بلند کیا۔ اگر اس کا وجود نہ ہوتا تو عہد عالمگیر میں شعر و ادب کا چراغ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بجھ جاتا۔ مغل حکمرانوں نے جہاں بت کدۂ ہند میں تہذیب و تمدن اور فن تعمیر و مصوری کو ایسا فروغ دیا کہ آج بھی اس دھرتی کے سینہ پر ان کی یادگاریں عظمت و جلال کے پرچم بلند کر رہی ہیں، وہاں زیب النساء نے علم و ادب کی ایسی سرپرستی کی جس کی مثال تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اور اب حسین انور نے زیب النساء کے حالات ناول کے پیرائے میں پیش کرکے اردو ادب میں ایک عظیم اضافہ کیا ہے۔ صفحات ۴۶۴ قیمت چھ روپے بارہ آنے

ملنے کا پتہ:- شیخ غلام علی اینڈ سنز تاجران کتب۔ کتاب منزل کشمیری بازار لاہور۔ بندر روڈ۔ کراچی

قدیم توشے خانے اور وضعداریاں

اکرام الدین قدوائی

اس برصغیر پر اسلامی دور کا آغاز ہی ایرانی تہذیب سے متاثر تھا۔ ایرانی اثرات جو دراصل ساسانی اور عباسی شان و شوکت کی یادگار تھے، یہاں کی معاشرت میں بھی سرایت کر گئے اور ایرانی وضع یہاں کے لوگوں کی بیرونی زندگی کے لئے ایک نمونہ قرار پائی۔

یوں تو اس علاقے میں اسلامی تہذیب کا ایک شاندار گہوارہ دلّی کا دربار موجود تھا جہاں توشے خانے ایک سماجی ادارہ کے طور پر موجود تھے، وہ توشہ خانے جنہیں نت نئے طرز کے لباس سے آراستہ کیا جاتا تھا لیکن دور شاہی کے زمانۂ انحطاط میں یہاں سے جو لوگ دور دراز مقامات پر جا کر بس گئے تھے انہوں نے نہ صرف اپنے نئے دربار اور محفلیں آراستہ کیں بلکہ شاہی تہذیب اور آرائش و تمدن کے لوازمات بھی اپنے ساتھ لے گئے چنانچہ دلّی کے شاہی لوازمات آرائش و تمدن کے خوشہ چینوں میں اودھ کے حکمران بھی تھے۔ جو خاص خراسان کے باشندے تھے اور ان میں ایرانی اوضاع و اطوار پورے طور سے سرایت کر چکے تھے۔ انہوں نے لباس میں تراش خراش کر کے اپنی خوش مذاقیوں اور جدت طرازیوں کا اظہار کیا اور نئی نئی وضع کے کپڑے تیار کئے جو اب تک پسندیدہ نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے توشے خانوں میں چار چاند لگا دئے۔ لباس میں یہ ترقی اسلامی دور کی تمدنی زندگی میں ایک نمایاں اضافہ ہے۔ دربار دہلی نے جس لباس کی ابتدا کی اس کو لکھنؤ کے دربار نے اپنے طور پر اوج کمال تک پہنچایا۔

ابتدا میں یہ لباس عام طور سے عبا، قبا، پگڑی اور پائجامہ تھا کلیتہً یا زیادہ تر ساسانی (عجمی و عباسی) دربار کے امراء عمائد کی وضع پر مبنی تھا۔ برصغیر پاک و ہند میں موسم اور آب و ہوا کی بنا پر سبک اور نازک کپڑے اختیار کئے گئے۔ عجمی قبا میں ترمیم کر کے "جامہ" بنایا گیا۔ اس میں گریبان نہ ہوتا تھا بلکہ دونوں جانب سے ترچھے پردے ایک دوسرے پر آ کر سینے کو ڈھانک لیتے تھے۔ سینے کا اوپری حصہ جو گلے کے نیچے ہوتا ہے اسی طرح کھلا رہتا تھا جس طرح آجکل انگریزی کوٹوں میں اور جس طرح آجکل تقریباً قمیص پہننے سے اوپر والے حصے کو چھپاتی ہے اسی طرح اس حصّے کو ڈھانکنے کے واسطے اس وقت "نیمہ" رائج تھا جو جامہ کے نیچے پہنا جاتا تھا۔ یہ کہنیوں تک کی آدھی آستینوں کا شلوکہ تھا۔ اس میں سینے پر سامنے گھنڈیاں لگائی جاتی تھیں۔ سینے پر جامے کا وہ پردہ جو بائیں طرف سے آتا، نیچے رہتا اور داہنے پہلو پر بندوں سے باندھ دیا جاتا اور اس پر داہنی طرف کا پردہ رہتا جو اوپر بائیں پہلو میں باندھ دیا جاتا۔ کمر کے پاس سے دامنوں میں بہت چنٹیں دے کر ایک گھیردار کپڑا جوڑ دیا جاتا جو ٹخنوں کے اوپر لٹکا رہتا تھا۔ جامے کی آستینیں آدھی کلائی تک کھلی اور دونوں جانب لٹکتی رہتی تھیں۔

اسی ایرانی قبا سے ماخوذ کر کے دہلی میں "بالابر" ایجاد ہوا جس میں گول گریبان بالکل کھلا رہتا تھا۔ اس میں چنٹ اور گلہ نکال دیا جاتا تھا۔ داہنے دامن میں ایک چوڑی سی کلی لگا دی جاتی تھی تاکہ دامن آگے کی طرف نہ کھلیں۔ یہی کلی اس کلی کا نقش اولیں ہے جو اس وقت شیروانیوں میں بائیں جانب نیچے لیجا کے کمر سے اٹکا دی جاتی ہے۔

"جامہ" اور "بالابر" دونوں کو ملا کر دہلی ہی میں "انگرکھا" ایجاد کیا گیا۔ جس میں چولی کا حصہ قبا سے لیا گیا تھا اور سینہ کھلا۔ سینے کی جگہ پر ایک گول گریبان بڑھا دیا گیا جو بائیں طرف گردن کے پاس گھنڈی تکمے سے اٹکا دیا جاتا تھا۔ اس میں پہلے داہنی طرف کا پردہ نیچے بغل میں بندوں سے باندھا جاتا اور پھر اوپر بند ہوتے تھے جس سے دونوں طرف کے پردے سینے کے نیچے، بیچوں بیچ لا کر باندھ دئے جاتے تھے۔ انگرکھے کے دامن اگرچہ قبا کے سے ہوتے مگر پرانے جامے کی یادگار میں دونوں پہلوؤں پر بغلوں کے نیچے چنٹ ضرور رکھی جاتی تھی۔

جب لکھنؤ میں انگرکھے کا رواج شروع ہوا تو یہاں کے لوگوں نے بھی اس میں جدت طرازیوں سے کام لیا۔ انگرکھے میں زیادہ چستی اور قطع داری پیدا کی گئی، چولی خوب گول اور کھنچی ہوئی چست ہو گئی، بغلوں کی چنٹ بالکل نکل گئی، دامنوں میں بجائے موڑ کے سنجافی گوٹ ٹانکی گئی۔ انگرکھے کو اور زیادہ خوشنما بنانے کے لئے لکھنؤ کے شوقین وضع دار لوگوں نے ایک کمرتوئی کے عوض، جو چولی کے نیچے بند لگانے کی جگہ پر ہوتی تھی، پلیٹوں کی وضع کی تین تین

تھے۔ یہ ٹوپی نسبتاً زیادہ سادہ اور تیاری کے اعتبار سے آسان بھی تھی، اسلئے لکھنؤ والوں نے اس کو بہت پسند کیا اور عوام میں اس قدر رواج ہوا کہ آج بھی لوگ اسی کو پہنے نظر آتے ہیں۔

لکھنؤ میں ایک اور ٹوپی کا رواج بھی ہوا جو "مندیل" کہلائی۔ اس کے موجد شاہ غازی الدین حیدر تھے۔ اس کی وضع قطع دفلی کی سی ہوتی تھی۔ اس کو خوشنما بنانے کے واسطے اس پر کارچوب کا کام ہوتا تھا۔ یہ ٹوپی بہت پسند کی گئی اور بعض نواب زادوں اور دولتمندوں نے اس کو زیادہ موقر اور شاندار تصور کرکے اختیار کیا۔

آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ نے اپنے دربار کے خطاب یافتہ معززین کے لئے ایک عجیب وغریب قسم کی ٹوپی رائج کی۔ ایک گول حلقہ سادے اطلس یا کارچوبی کام کا بنایا جاتا جو پیشانی پر زیادہ اونچا ہوتا۔ اس میں اوپر کی طرف تن زیب، گرنٹ یا جالی کی ایک بڑی سی جھولی بنا کے جوڑ دی جاتی جو پہنتے وقت گردن تک لٹکتی اور سر کے پچھلے حصے پر پڑی رہتی۔ بادشاہ نے اس ٹوپی کا نام "عالم پسند" رکھا جو عوام میں "جھولا" کے نام سے مشہور رہوئی، مگر یہ اس قدر غیر مقبول اور نا پسندیدہ وضع تھی کہ شاہ کے بعد اس کا استعمال متروک ہوگیا۔ صرف چوگوشیہ اور دو پلڑی ٹوپیاں ایک عرصہ تک سروں پر قائم رہیں۔ بلکہ دوپلڑی ٹوپی کا اب بھی رواج عام ہے۔

جسم کے نچلے حصے کے لئے پائجامے رائج تھے جو مختلف وضعوں کے تیار کئے جاتے تھے۔ ایک عام رواج اُنگا تنگ مُہری کے پائجامہ کا تھا، جس کے اوپر کا گھیر بڑا ہوتا تھا اور شرعی کہلاتا تھا۔ اس کی قطع میں کچھ تغیر ہوا۔ مہری کسی قدر بھی اونچی ہو گئی مگر ٹخنوں تک ہی قائم رہی۔ شلوار بھی ایک پسندیدہ لباس تھا۔ یہ نیچے مُہری کے پاس تنگ اور اوپر گھیرے پاس اتنا ڈھیلا ہوتا تھا کہ وہ حصہ پھول کر ایک غبارہ سا معلوم ہوتا تھا۔ مغربی پاکستان کے شمالی اور سرحدی علاقے کے لوگ آج بھی استعمال اسی کو کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ کلیوں دار پائجامہ بھی رائج تھا جس کا اوپر کا گھیر تو زیادہ نہیں ہوتا تھا مگر دونوں پائنچے کلیاں جوڑ جوڑ کر بڑے اور گھیردار بنائے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کلیوں دار پائجامہ خاص تندھاریوں کا لباس تھا جو شاہی فوج میں اکثر شامل تھے۔ ملازم تھے اور فن سپہ گری کے باعث خاصی شہرت کے مالک تھے۔ دہلی کے بانکوں نے اپنے نام و نمود کے واسطے ان تندھاریوں کی وضع و لباس کو اختیار کرلیا۔ ان کی دیکھا دیکھی بہت سے شریف زادوں نے جنہیں بانکوں کی یہ وضعداری پسند آئی اس پائجامہ کو اختیار کرلیا۔ یہ لوگ جب لکھنؤ آئے تو ان کا یہی لباس یہاں بھی قائم رہا۔ لکھنؤ کے وضعدار اور نفاست پسند لوگوں کو یہ کلیوں دار پائجامہ اس قدر عزیز تھا کہ انہوں نے اسے اپنی بیگموں تک کو پہنایا اور آہستہ آہستہ شہر کی تمام عورتوں نے اس کو پہننا شروع کردیا۔

اہلِ لکھنؤ نے اس کلیوں دار پائجامہ پر اضافہ کرکے عرض کے پائنچوں کا پائجامہ تیار کیا جو ہلکا پھلکا اور ہندوستان کی گرمیوں کے موسم میں نہایت آرام دہ تھا۔ رفتہ رفتہ یہ شہر کے امراء اور مہذب لوگوں کی وضع میں داخل ہوگیا۔ کچھ عرصہ کے بعد آڑی کاٹ کے گھٹنے رائج ہوئے جو بہت پسند کئے گئے اور لکھنؤ کے شوقین مزاج "گھٹنا" پہننے لگے۔ یہ گھٹنا خوب چست اور کھنچا ہوا ہوتا تھا اور گٹے پر اس کی شکنوں کی بہت سی چوڑیاں رکھی جاتی تھیں۔ یہ پائجامے اطلس، کمخواب، مشروع یا رنگین سوتی کپڑے کے بنائے جاتے تھے۔

اسی دور میں انگرکھے، چکن یا اسی طرح کے دوسرے لباس پر دوشالہ یا شالی رومال اوڑھنے کا رواج تھا۔ یہ سردی کے دنوں میں اوڑھا جاتا تھا، گرمیوں کے لئے اس میں نفاست اور سُبکی پیدا کرلی گئی اور باہر بیٹ اور چکن کے رومال بنائے گئے۔ اس وقت تمام سفید پوش شریفوں کا یہ عام لباس ہوگیا تھا۔ آج کل بھی چند وضعدار شرفا اس وضع قطع کو اپنے پرانے تکلفات کی طرح نباہتے جا رہے ہیں۔

پنجابی شاعری:

دوہے

ہاشم شاہ
حامد شاہ عباسی

مترجمہ: شفیع عقیل

مہندی سے سسّی نے اپنے نازک پاؤں سنوارے
تھل کی ریت جلے یوں جیسے جو بھونیں بھٹیارے
سورج بھاگا اور بدلی میں چھپ گیا ڈر کے مارے
ہاشم دیکھ یقیں، سسّی کا اپنا قول نہ ہارے

میں دکھیا ری درد کی ماری، بچھی ہوں ایک پہیلی
میں دیوانی، برہا ماری، جگ میں پھروں اکیلی
مجنوں کی منزل کو سمجھا ر دی میرا اللہ بیلی
ہاشم ! یار ملے تو سمجھوں جو تن کلفت جھیلی

ساجن تیرے برتاوے سے جان لبوں پر آئے
بول پڑوں تو جگ رسوائی پیت بھی رہ نہ جائے
شرم کی ماری جس گھر جاؤں برہا ڈھول بجائے
ہاشم ! جس گھر ہاتھی جائے، چھپے نہ لاکھ چھپائے
(ہاشم شاہ)

•

اے احمق اس میٹھی دنیا کو تو کڑوا جان
قدم قدم پہ لالچ دے کر گھیرے گا شیطان
کرم دھرم کام آئیں گے سب یہیں رہے گی شان
جو ہو تا سو کا شنا، تو ریت اس جگ کی جان

عشق شہنشاہ دو عالم عشق مرا ایمان
عرش سے لے کر فرش تلک، تو عشق کو غالب جان
اس کی خاطر بنے بھکاری راجے اور سلطان
جو بن عشق جئے دنیا میں وہ کیسا انسان
(حامد شاہ عباسی)

ہماری ڈاک

محترمی! آپ کے خط کا جواب دیر سے دے رہا ہوں سو اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ آپ سے خفگی؟ بے شک آپ کو کیسے گذرا۔ اگر پچھلے دنوں آپ کی خدمت میں کچھ نہ بھیج سکا تو اس کا باعث وہ ہرگز نہ تھا جو آپ نے سمجھا۔ آپ ہمیں خاموش نہ جانیئے گا۔ اب سن ستاون شروع ہے۔ اس سال کے حساب میں بہت کچھ لکھا جائے گا۔ ان روزوں زور سردی ہے۔ پالا پڑتا ہے۔ دانت بجتے ہیں۔ انگلیاں ٹھٹھرتی ہیں۔ بسنت ہوئے اور سرسوں پھولے تو قلم اٹھاؤں۔ سو اس مہینہ کو تو ۵۶ کے حساب میں ڈالئے اور درگذر کیجئے۔ اگلے مہینہ سے سن ستاون سمجھئے۔ انشاء اللہ فروری لگتے ہی بھیجوں گا۔

آپ کی ڈاک واہ وا، سبحان اللہ۔ ماہِ نو آتا ہے تو سب سے پہلے اسی صفحہ کو کھولتا ہوں اور مزے لے لے کر پڑھتا ہوں۔ اچھا آداب

(انتظار حسین)

"خیابانِ پاک" کہاں دیکھتا۔ پیسے ہو گئے تو یہ جھوم جھوم کر خریدوں گا۔ ویسے مخدومی ابوالفضل صدیقی صاحب کے تاثرات بہت پسند آئے۔ کیا کہنے۔ بہن عاصمہ حسین کی نظم "آخری بات" خاصے کی چیز ہے۔ "چڑھا دوں کا چڑھاوا" کہنا یا "شمع پر پیروئی مشربِ پروانہ کرو" ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ پھر نظم میں آہنگ اور بلند کرنے والے ٹکڑے سے کلائمکس پیدا کرنا انتہائی مہارت فن کے متقاضی مقامات ہیں۔ اب "ہیلن آف ٹرائے" کی طرف آیئے۔ ضمنی عنوان "حسینۂ یونان" ہو۔ یہ عنوان "ہیلن" ہی ہو۔ "آہو مزاجوں کی جگہ" "آہو مزاجوں کے دلشاد ٹولے" کر لیں۔ "ترنج ہائے زریں" واقعی پچک گئے۔ شکر گذار ہوں۔ ترنج کی جیم دب رہی ہے۔ بولتی نہیں اور نشہ نہیں آتا۔ اس کو یوں کر لیں ع

شفق رنگ چہروں پہ خورشید قرباں سنہری صبوحوں کی مانند سینے

ع ادھر اک سفینے کی ٹوٹی ہوئی ہڈیاں موجِ طوفاں نے یکسر چبائیں۔

—— اب آپ نے فرمایا تو معلوم ہوا کہ بس یونہی سنا ہو گیا ہے ورنہ میرے نزدیک مجبوری نام کا کوئی لفظ نہیں۔ ایک خوبصورت مگر خوفناک (IMAGERY) ملاحظہ فرمائیں!

اُدھر اک سفینے کی ٹوٹی ہوئی ہڈیاں سیلِ دنداں سیہ نے چبائیں

"سیلِ دنداں سیہ" کے لئے شاباش طلب ہوں۔ واہ واہ کیا شکل بنی ہے!

(جعفر طاہر)

ایڈیٹر صاحب! تین عدد سونیٹ ارسالِ خدمت ہیں اور ایک سفارش نامہ جو میرے دوست گرامی جناب حامد علی خاں صاحب (ایم۔اے) نے تحریر فرمایا ہے، منسلک ہے۔ براہ کرم اس سانیٹ کو پڑھ کر اپنی رائے سے مطلع فرمایئے۔ اور ان کو اپنے موقر جریدہ میں شامل فرما کر مجھے ممنون ہونے کا موقع دیجئے۔

(دانا اکبر آبادی)

ادارہ کو کسی "سفارش" کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اہلِ قلم کی تحریریں خود اپنی اشاعت کے لئے محل پیدا کر لیتی ہیں۔ بہرکیف آپ کا سانیٹ اس صفحہ پر مطالعہ کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔

سونیٹ

جامِ صہبائے محبت نوش کر اے ہمنشیں!

ہم عدم سے آئے ہیں یاں دل لگانے کے لئے
زندگی کی تلخ کو شیریں بنانے کے لئے
گھوم، پھر، سیر و سیاحت کر کہ جنت ہے یہیں
چھوڑ یہ گوشہ نشینی، بات یہ اچھی نہیں
دیکھ! اس دنیائے دو روزہ کی کیف آور بہار
دیکھ! خوبانِ جہاں کے دلنشیں نقش و نگار

پھول سے رخسار منظورِ شوخ، باہیں مرمریں!

تو اگر کہتا ہے غم آلود ہے یہ زندگی
ایک غم الفت بھی ہے اس کو بھی کر لے اختیار
تاکہ آ جائے جہانِ آرزو میں نو بہار
تاکہ ذوق و شوق سے تیری ادا ہو بندگی

پیار کر اس زیست سے یہ زندگی ہی عشق ہے
باقی سب بکواس ہے، گپ ہے، فجور و فسق ہے!

نقد و نظر

عبداللہ — یہ ناول بنگلہ زبان سے جناب عبدالحق فریدی صاحب نے اردو میں منتقل کیا ہے۔ کتاب کسی طرح ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتی۔ زبان کی روانی و موزونیت صاف بتا رہی ہے کہ یہ حق صاحب کی گویا تصنیف ہے۔ زبان فصیح و بامحاورہ اور معیاری ہے۔ کتابی زبان اسی کو کہتے ہیں جس کو ثقہ اہل زبان استعمال کرتے ہیں، کہیں انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں۔ کوئی بندش یا فقرہ ایسا نہیں جو انمل بے جوڑ ہو۔ اصل کتاب کے سرسری مقابلہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں خود بھی زبان کی یہ ادبی ثقاہت موجود نہیں جو ترجمہ میں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مترجم دونوں زبانوں کے مزاج سے آشنا ہی نہیں بلکہ دونوں زبانوں میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ بنگلہ ادب کے تمام شہ پارے جو اس وقت تک اردو میں منتقل ہوئے ہیں ان میں یہ ترجمہ سب سے زیادہ کامیاب کوشش ہے۔

داخلیت کا جہاں تک تعلق ہے۔ وہ ایک عام موضوع ہے۔ قدیم و جدید کا تصادم — ہندوستان کی ہر زبان میں اس پر لکھا جا چکا ہے۔ عبوری دور کے ادبی سرمایہ کی ابتدا ہی اس سے ہوئی ہے۔ اردو میں اس موضوع پر اس ناول سے ملتا جلتا عابد صاحب کا ڈراما "پردۂ غفلت" ہے۔

فریدی صاحب نے اس ترجمے سے اردو داں طبقہ پر ایک بڑا احسان کیا ہے۔ اس سے ایک بڑی غلط فہمی کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مشرقی پاکستان میں بھی شریف گھرانے آباد ہیں، کبھی ان کے بھی چلن وہی تھے جو دوسرے علاقے کے مسلم گھرانوں کے تھے۔ یہ بھی اسی تہذیب کے پروردہ تھے جس پر شمالی ہند کے نامور مسلمان گھرانوں کو آج تک ناز ہے۔ ناول کا مطالعہ قاری کو اپنے خاندان کی قدیم روایات یاد دلاتا ہے۔ اور مشرقی و مغربی پاکستان کی باہمی ثقافت کا مزید اعتماد پیدا کرتا ہے۔ نئے تمدن و تہذیب کی ابتدا بنگال ہی سے ہوئی تھی۔ نئی تعلیم کا خیال بنگال ہی میں پروان چڑھا تھا۔ سرسید کی تعلیمی کاوشوں کو میری رائے ناقص میں "مسلم انسٹی ٹیوٹ کلکتہ" کی سرگرمیوں سے بھی اشارا ملا تھا۔ راجا رام موہن رائے کے نقوش موجود تھے۔ ان کے نانا مرحوم خود مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پہلے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ مختصر یہ کہ اس علاقہ کے لوگ قدیم و جدید کی کشمکش میں سب سے پہلے پھنسے۔ عبداللہ دراصل اسی دور کا نمائندہ ہے۔

قاری یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس کے خاندان کا تعلق "سرمنڈول" سے تھا یا "سرپھروں" کی جماعت سے۔ اوّل الذکر بالکل بے ہوش تھے بلکہ بے حس تھے۔ لکیر کے فقیر بنے رہے۔ سر منڈاتے رہے اور اولے پڑتے رہے۔ بلائے ناگہانی سے فراریت کو آخرت کی زاد راہ متصور کر کے عمل سے بے نیاز ہو گئے تھے۔ آخر الذکر گروہ نے معاشرہ کو بدلنے کی کوشش کی۔ خود بدلے۔ نئی قدروں کا ساتھ دیا۔ اغیار سے میدانِ عمل میں ٹکر لی اور اپنے وجود کو ثابت کر دکھایا۔ گو یہ تمام کوشش ایرالو تھی اور کسی کی "نظرِ کرم" کی ہمیشہ مرہونِ منت رہی۔ اس ردِ عمل کو اسلامی تو نہیں البتہ "مسلمانی" کہا جا سکتا ہے۔ غرضیکہ عبداللہ میں یہی سب کچھ ہے۔ معاشرہ کی زبوں حالی توہمات کو کس طرح "جبل متین" بنا دیتی ہے اور عمل کا ایک ادنیٰ کرشمہ کس طرح تیقن ذات کا ضامن ہو جاتا ہے۔ عبداللہ سے مشرقی پاکستان کو سمجھنے میں خاصی مدد مل سکتی ہے۔ مترجم کی کوشش ہر طرح لائق صد ستائش ہے۔ اردو داں طبقہ کے لئے اس کتاب کا مطالعہ یقیناً مفید ثابت ہوگا۔

سید شبیر علی کاظمی

شہباز خاں

از: سید عابد علی عابد
ناشر: "ادارۂ ادبیات" لاہور
صفحات: ۲۶۳، قیمت: تین روپے

حکمتِ اشیاء نے جہاں موجودہ انسان کو طرح طرح کی آسائشوں سے بہرہ ور کیا ہے وہاں ارتکاب جرائم میں بھی آسانیاں مہیا کی ہیں جنہوں نے جاسوسی افسانوں کو جنم دیا۔ ایسے افسانے بظاہر جتنے آسان معلوم ہوتے ہیں اتنے ہی مشکل ہیں۔ ان کے لئے افسانہ نویس کا ایک جگادری سراغ رساں ہونا ضروری ہے، جس کا دل و دماغ ان سب کا دل و دماغ ہو اور وہ ان تمام عقدوں کو سلجھا سکے جو وہ فرداً فرداً سلجھا سکتے ہیں۔ اردو میں اعلیٰ درجہ کے جاسوسی ناول اور افسانے بہت کم ہیں اور تمثیلیں ان سے بھی کم۔ عابد صاحب نے اس صنف ادب پر توجہ دی ہے جس کا نتیجہ متعدد تمثیلیں ہیں۔ ان تمثیلوں کا مرکزی کردار اردو کا شرلاک ہومز "شہباز خاں" ہے۔ مصنف کا قانونی تجربہ سونے پر سہاگہ ثابت ہوا ہے۔ پیشکش، واقعات کا ربط ضبط اور تکنیک ان تمثیلوں کی کامیابی کی ضامن ہے۔

پنجابی زبان دا ادب تے تاریخ

عبدالغفور قریشی

تاج بکڈپو، اُردو بازار، لاہور

صفحات: ۴۸۴، قیمت ۱۰/- روپے

پنجابی میں نظم جتنی زیادہ ہے نثر اتنی ہی کم ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب جو پنجابی کی مخصوص چٹخارے دار زبان میں لکھی گئی ہے، خاص اہمیت رکھتی ہے۔ پنجابی زبان کی پہلی تاریخ کی حیثیت سے جو پنجابی ہی میں تحریر کی گئی ہے اور فارسی رسم الخط میں اس کی اہمیت اور بھی نمایاں ہے۔ فاضل مرتب نے بڑی محنت اور جانفشانی سے پنجابی زبان و ادب کے متعلق کثیر معلومات بہم پہنچائی ہیں اور ادبا و شعراء کے حالات اور کلام کے نمونے بھی پیش کئے ہیں۔ اگر اس کے ساتھ تنقید عالیہ کا التزام بھی ہوتا تو کتاب کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی۔

جزیروں کے گیت

سید ضمیر جعفری

ناشر: مکتبۂ کارواں۔ لاہور

صفحات: ۱۶۶، قیمت: دو روپے

رومانوی جزیروں کا وہ جھرمٹ جو جزائر شرق الہند کے نام سے مشہور ہے۔ مدتوں سے رومانوی دلچسپی کا باعث ہے۔ جب الف لیلہ اور دوسری حیرت آفریں داستانیں لکھی گئی تھیں۔ یہ جان کر ہماری دلچسپی اور بڑھ جاتی ہے کہ یہ جزیرے "فردوس دل و نگاہ" ہوتے ہوئے "سارونگ باجوں" اور "پنتونوں" یعنی بڑے میٹھے رسیلے، پیارے پیارے اور رنگا رنگ گیتوں کا دیس بھی ہیں جنہیں سید ضمیر جعفری نے ایک صاحب ذوق شاعر کی حیثیت سے اردو نظم میں منتقل کیا ہے۔ اور اس خوش اسلوبی سے کہ وہ ان کی اپنی "باغ و بہار" فکر کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں۔ یہ گیت جن میں سے بعض پہلی دفعہ "ماہ نو" میں منظر عام پر آئے، اردو کو ایک نئی چیز، ایک نئی تازگی اور مہک عطا کرتے ہیں۔ ساتھ ہی شاعر نے "اپنے دل کی دھڑکنوں کے ساز پر بھی کچھ پُرلطف گیت گائے ہیں جو انہیں "رنگین جزیروں" میں لکھے گئے تھے اور انہیں کا سا کیف بھی رکھتے ہیں۔ یہ گیت نئی فضاؤں، نئی جگہوں، نئے ناموں اور نئی دھنوں سے شاعری کا ایک نیا تصور بھی پیدا کرتے ہیں۔

نیا دور - ۵-۶

چندہ سالانہ: ۱۵ روپے ۔ فی پرچہ ۳ روپے

کراچی کا یہ مؤقر ماہنامہ پھر اپنے مخصوص قد و قامت اور خط و خال کے ساتھ بروئے کار آیا ہے۔ اگرچہ اس واقعہ کو بھی کافی عرصہ گذر چکا ہے۔ بعض پارے مثلاً "نشر معلّیٰ" (ممتاز حسین) "طرز اور تجربہ" (الطاف گوہر) اور "مثلث" (عزیز احمد) ایک خاص افق سے طلوع ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور فکر و نظر میں نئی جوت جگاتے، نئی وسعتیں پیدا کرتے اور نئے طلسمی دریچے وا کرتے ہیں۔

"پھول" لاہور (سالگرہ نمبر)

ناشر: دارالاشاعت، ریلوے روڈ، لاہور

اُردو میں بچوں کا سب سے پرانا رسالہ "پھول" جس کو مولانا عبدالمجید سالکؔ، ابوالاثر حفیظؔ اور غلام عباس جیسے نامور ادیبوں کی ادارت کا شرف حاصل رہا ہے آجکل نسیم ممتاز کے زیر ادارت، جو مولوی ممتاز علی مرحوم کے پوتے ہیں، بچوں کی تفریح اور ذہنی تربیت کا سامان مہیا کر رہا ہے۔ گذشتہ سال کی طرح اب بھی اس رسالہ کا سالگرہ نمبر خاص اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ اور ہم امید کرتے ہیں کہ خورد سال قارئین اس کا بڑی دلچسپی سے مطالعہ کریں گے *

(ر ـ خ)

رسید کتب

حسرت موہانی	عبدالشکور	انوار بک ڈپو لکھنؤ
مشرق	سلیم اللہ فہمی	مشرق کوآپریٹو پبلیکیشنز لمیٹڈ ۹۷ آغا صادق روڈ۔ ڈھاکہ
تاریخ زبان اُردو	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	آزاد کتاب گھر دہلی
حسرت تمنا (دو جلد)	سکیش اکبرآبادی	عزیزی پریس۔ آگرہ
کلیات ولی	سید نور الحسن ہاشمی	انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی
اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں	عبدالماجد دریابادی	ادارۂ فروغ اُردو لکھنؤ
افکار اسلامی کی تشکیل جدید	ڈاکٹر سید عبداللطیف	اکیڈیمی آف اسلامک سٹڈیز حیدرآباد (دکن)
ایک آنسو ایک تبسم	شفیع عقیل	مرکز ادب، ضیا برقی پریس کراچی
چٹانیں اور رومان	خاطر غزنوی	خادم کو، پشاور
ہوترنگ	سید ضمیر جعفری	مکتبۂ کارواں۔ ایبک روڈ، انارکلی، لاہور

ذکرِ جمیل ——— بقیہ: ص ۹

وَالبقاءِ وَمَن لَمْ یَقُمْ فِیْھَا بِمَا یَجِبُ عَرَّضَھَا لِلزَّوَالِ وَالفَنَاءِ۔

ترجمہ۔ خداوند تعالیٰ نے دولت مندوں کے مال میں فقراء کا رزق فرض کیا ہے۔ پس اگر غریب آدمی بھوکا رہتا ہے تو اس لئے کہ دولتمند اس کو اس کا رزق نہیں دیتا اور خداوند تعالیٰ قیامت کے دن ان سے بازپرس کرے گا۔

اے جابر جس شخص پر خداوند تعالیٰ کی نعمتیں زیادہ ہوتی ہیں اس کی طرف لوگوں کی حاجتیں زیادہ ہو جاتی ہیں۔ پس وہ شخص جو محض خدا کے لئے ان نعمتوں میں وہ کرتا ہے جو اس پر واجب ہے تو وہ ان میں ہمیشگی و دوام پیدا کرتا ہے۔ اور جو ان نعمتوں میں وہ امور نہیں کرتا جو اس پر واجب ہیں تو وہ ان کو زوال و فنا کے لئے پیش کر دیتا ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ آپ نے یہاں شرعی زکوٰۃ کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ کیونکہ زکوٰۃ کے لئے تو نصاب شرعی کا عذر پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر دولت مند کے لئے آپ نے چند اصول مقرر فرما دئے ہیں۔ آپ نے کیا اچھا اصول مقرر فرمایا ہے:

مَاظَفِرَ مَنْ ظَفِرَ الاِثْمُ بِهِ، وَالغَالِبُ بِالشَّرِّ مَغْلُوبٌ۔

اس شخص کو فتحمند نہ سمجھنا چاہیئے جس پر گناہ نے فتح پائی اور جو شخص شر کے ذریعہ سے غالب ہوا وہ دراصل مغلوب ہے۔

رُدُّوا الحَجَرَ مِنْ حَیْثُ جَاءَ فَاِنَّ الشَّرَّ لَا یَدْفَعُہُ اِلَّا الشَّرُّ۔

ترجمہ۔ جو پتھر جہاں سے آیا ہے وہیں اس کو واپس کر دو۔ کیونکہ بدی نہیں دفع ہو سکتی لیکن بدی سے۔

مَنْھُوْمَانِ لَا یَشْبَعَانِ: طَالِبُ عِلْمٍ، وَطَالِبُ دُنْیَا۔

ترجمہ۔ دو شوق والے کبھی سیر نہیں ہوتے: طالب علم و طالب دنیا

صَوَابُ الرَّایِ بِالدُّوَلِ: یُقْبِلُ بِاِقْبَالِھَا وَیَذْھَبُ بِذَھَابِھَا۔

ترجمہ۔ درستی فکر دولت کے ساتھ وابستہ ہے۔ جب دولت آتی ہے تو فکر صحیح بھی آجاتا ہے۔ جب دولت چلی جاتی ہے تو وہ بھی چلا جاتا ہے۔

اَلعَفَافُ زِیْنَۃُ الفَقْرِ وَالشُّکْرُ زِیْنَۃُ الغِنیٰ

ترجمہ۔ پاکدامنی فقر کی زینت ہے اور شکر دولت کی زینت ہے۔

یَوْمُ العَدْلِ عَلَی الظَّالِمِ اَشَدُّ مِنْ یَوْمِ الجَوْرِ عَلَی المَظْلُوْمِ۔

ترجمہ۔ عدل کا دن (قیامت) ظالم کے لئے شدید تر ہے بہ نسبت جور کے دن کے جو مظلوم پر گزرا۔

اَلثَّنَاءُ بِاَکْثَرَ مِنَ الاِسْتِحْقَاقِ مَلَقٌ، وَالتَّقْصِیْرُ عَنِ الاِسْتِحْقَاقِ عِیٌّ اَوْحَسَدٌ۔

ترجمہ۔ کسی کی حق سے زیادہ تعریف کرنی چاپلوسی ہے۔ اور اس کے حق سے کمتر تعریف کرنی یا تو کمزوری ہے اور یا حسد ہے۔

لِلظَّالِمِ مِنَ الرِّجَالِ ثَلَاثُ عَلَامَاتٍ: یَظْلِمُ مَنْ فَوْقَہُ بِالمَعْصِیَۃِ وَمَنْ دُوْنَہُ بِالغَلَبَۃِ، وَیُظَاھِرُ القَوْمَ الظَّلَمَۃَ۔

ترجمہ۔ ظالم کی تین علامتیں ہیں۔ جو اس کے اوپر ہیں ان کی نافرمانی کر کے ظلم کرتا ہے۔ جو اس کے تحت ہیں ان پر زبردستی کرتا ہے اور ستمگاروں کی جماعت کی مدد کرتا ہے۔

لَا تَظُنَّنَّ بِکَلِمَۃٍ خَرَجَتْ مِنْ اَحَدٍ سُوْءً اَوَاَنْتَ تَجِدُ لَھَا فِی الخَیْرِ مُحْتَمَلاً۔

ترجمہ۔ جو بات کوئی کہے تو اس کو برائی پر محمول نہ کرو جب تک کہ اس کے موجب میں نیکی کا احتمال ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص

ایسی بات کہے جو تم کو بری لگتی ہے تو اس کو کہنے والے کی بدنیتی پر محمول نہ کرو جب تک اس کا امکان ہے کہ یہ بات اس نے نیک نیتی سے کہی ہو۔

اَلْغِیْبَۃُ جُھْدُ الْعَاجِزِ۔

ترجمہ۔ دوسرے کی غیبت کرنا عجز و کمزوری ہے۔ یعنی غیبت کرنے والا اس طرح اپنے دشمن سے انتقام لیتا ہے۔ کیونکہ اس میں ظاہرا انتقام لینے کی طاقت نہیں ہے۔

اَلدَّھْرُ یَوْمَانِ: یَوْمٌ لَکَ وَیَوْمٌ عَلَیْکَ فَاِذَا کَانَ لَکَ فَلَا تَبْطَرْ وَاِذَا کَانَ عَلَیْکَ فَاصْبِرْ۔

ترجمہ۔ تیرے لئے زمانہ کی دو حالتیں ہیں۔ جب وہ تیرے موافق ہے تو تو اتراتا نہ پھر اور مغرور نہ ہو جا اور جب زمانہ تیرے خلاف ہو تو صبر کر۔

صَاحِبُ السُّلْطَانِ کَرَاکِبِ الْاَسَدِ: یُغْبَطُ بِمَوْقِعِہٖ وَھُوَ اَعْلَمُ بِمَوْضِعِہٖ۔

ترجمہ۔ بادشاہ کا مصاحب مثل شیر کے سوار کے ہے۔ لوگ تو اس کے موقعہ کی وجہ سے اس پر حسد کرتے ہیں اور وہ خود اپنی (خطرے کی) حالت سے واقف ہوتا ہے۔

اِنَّ کَلَامَ الْحُکَمَاءِ اِذَا کَانَ صَوَابًا کَانَ دَوَاءً، وَاِذَا کَانَ خَطَاءً کَانَ دَاءً۔

ترجمہ۔ حکمار کے اقوال اگر صحیح ہیں تو وہ دوا ہوتے ہیں اور اگر غلط ہیں تو وہ خود مرض ہیں۔

جب آپ جنگ صفین سے واپس ہو کر کوفہ آئے تو ایک شخص حرب بن شرحبیل جو اپنی قوم کا سردار تھا آپ کے ساتھ پیدل ہو لیا اور آپ گھوڑے پر جا رہے تھے۔ آپ نے اس سے فرمایا: اِرْجِعْ فَاِنَّ مَشْیَ مِثْلِکَ مَعَ مِثْلِیْ فِتْنَۃٌ لِلْوَالِیْ وَمَذَلَّۃٌ لِلْمُؤْمِنِ یعنی تم واپس جاؤ۔ کیونکہ تمہارا میرے ساتھ اس طرح چلنا کہ میں سوار رہوں اور تم پیدل بری مثال پیدا کرتا ہے جو حاکم کے لئے بلا ہوگی اور مومن کے لئے مذلت۔

اَکْبَرُ الْعَیْبِ اَنْ تَعِیْبَ مَا فِیْکَ مِثْلُہٗ یعنی سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ تم لوگوں کے اس نقص کو پکڑو جو خود تم میں ہے۔

مِنَ الْخُرْقِ الْمُعَاجَلَۃُ قَبْلَ الْاِمْکَانِ وَالْاَنَاۃُ بَعْدَ الْفُرْصَۃِ۔

یعنی یہ حماقت ہے کہ کسی شے پر قابو پانے کے امکان سے پہلے اس کی طرف عجلت کی جائے اور یہ بھی حماقت ہے کہ جب قابو پانے کا امکان ہو جائے تو پھر اس کے حصول میں دیر کرے۔

اس عجلت میں اور اس حالت میں تو اتنا ہی ہو سکتا تھا کہ جتنا میں نے پیش کیا ہے یہ تو وہ بحر ناپیداکنار ہے کہ اب تک تو جس کے ساحل پر سے چند کنکریاں بھی نہیں چنی جا سکی ہیں۔ اس بحر زخار میں سے صدف حقائق کو نکال کر لانا میں تو کس گنتی میں ہوں ابھی اعلم العلمار سے یہ کام نہیں ہو سکا ہے۔ اور نہج البلاغہ وہ گنجینۂ معانی ہے جس کی مکمل شرح ابھی تک نہیں لکھی جا سکی ہے۔ بہر صورت یہ کتاب ایسی ہے کہ جو ہر مسلمان کے مطالعہ میں رہنی چاہئیے۔ اور اگر کوئی شخص مسلم ہو یا غیر مسلم حضرت علی کے متعلق اس کتاب کا بغور متعدد بار مطالعہ کئے بغیر کچھ لکھنا چاہتا ہے تو اس کی تحریر اس قابل بھی نہ ہوگی کہ کوئی سمجھدار آدمی اس کی طرف دیکھنے کا وقت بھی ضائع کرے کجا کہ پڑھنا۔

السلام علی من اتبع الھدیٰ

نصیر خاں: ——— بقیہ صفحہ ۴۲

مقرر تھی۔ چوری، جیب تراشی، رشوت اور اسی قسم کے دوسرے جرائم کے لئے شہر کے چوک میں کوڑوں کی سزا دی جاتی تھی، اگر کسی شخص کی بیوی زنا کرے تو زانی اور زانیہ دونوں کے لئے موت کی سزا مقرر تھی۔

اس کے عہد میں کوئی شخص جھوٹی گواہی نہیں دیتا تھا۔ ایک دو دفعہ ایسا ہوا کہ جھوٹی گواہی کی بنا پر ایک بے گناہ سزا پا گیا۔ اس نے جھوٹی گواہی دینے والوں کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ اس کے بعد کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ کوئی شخص کسی پر بہتان باندھے یا عدالت میں جا کر جھوٹی گواہی دے۔

چھوٹے چھوٹے جرائم کا فیصلہ خیل کے سردار کیا کرتے تھے اور اگر طرفین مطمئن نہ ہوں تو اس سے بڑے سردار کے ہاں اپیل کی جا سکتی تھی اور اگر وہاں بھی اُنہیں اطمینان نہ ہو تو وہ نصیر خاں کے دربار میں اپیل کر سکتے تھے لیکن خان کا دبدبہ اس قدر تھا کہ خیل کا کوئی سردار رشوت نہیں لیتا تھا۔ اس لئے غلط فیصلے کا امکان ہی نہیں تھا۔ چھوٹے جرائم کی اپیل شاید ہی کبھی نصیر خاں کے دربار میں کی گئی ہو۔ قتل کے سلسلے میں اگر کسی مسافر کو شبخون مار کر قتل کر دیا جائے تو اس حالت میں خیل کے سردار کو اختیار تھا کہ وہ نصیر خاں کی اجازت کے بغیر فی الفور کامل ثبوت مہیا کرنے کے بعد راہزن کو پھانسی کی سزا دے دے البتہ اس مقدمہ کی پوری مسل نصیر خاں کے پاس بھیجنی ضروری تھی۔

مختلف خیلوں کے سرداروں کی ایک اسمبلی بنائی گئی تھی جس میں مختلف قبائیلوں کے جھگڑوں، ریونیو اور دوسرے قوانین پر بحث ہوتی تھی۔ نصیر خاں اسمبلی کے ہر اجلاس میں شامل ہوتا تھا۔

ریونیو نصیر خاں کے عہد میں ریاست کا کُل مالیہ تیس لاکھ روپے سے زائد تھا۔ اس میں کراچی کسٹم کا روپیہ شامل نہیں تھا۔ نصیر خاں کے عہد میں تجارتی مال پر بہت کم ٹیکس تھا۔ تجارتی مال سے لدے ہوئے اونٹ پر صرف پانچ روپے ٹیکس تھا۔ البتہ ہندوؤں کے مندروں کے لئے چار آنے فی اونٹ علیحدہ ٹیکس تھا۔ گھوڑوں اور مویشیوں پر کوئی ٹیکس عائد نہیں کیا جاتا تھا۔ زمینداروں سے لگان جنس میں وصول کیا جاتا تھا، اور یہ کُل پیداوار کا ⅓ حصہ ہوتا تھا، بلوچستان میں اس وقت کریم خانی سکّہ جاری تھا۔ اس روپے کے اڑتالیس پیسے ہوتے تھے، سونے کا سکّہ چھ کریم خانی روپوں کے برابر ہوتا تھا۔

نصیر خاں کے عہد میں دور دراز تک تجارت ہوتی تھی۔ ملتان، لاہور اور پشاور کے سوداگر بے دھڑک قلات جایا کرتے تھے، یہ تاجر وہاں سے گھوڑے خرید کر لاتے تھے اور ان سوداگروں کو آج تک کبھی شکایت کا موقع نہیں ملا تھا۔ کیونکہ قلات، بہاولپور، ملتان، لاہور اور پشاور سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔ اور ان تمام علاقے کے لوگوں میں ایک والہانہ رابطہ اور محبت تھی۔

"لالہ" ——— بقیہ صفحہ ۲۷

اب کون ہے تیرا — اب تُو صرف ایک آوارہ چھوکری ہے۔ وہ ہاتھوں میں رافع کے خطوط لئے ہوئے پورچ سے نکل کر گیٹ کی طرف مڑی۔ اس کے مسلسل وحشت انگیز قہقہوں کی آواز سے سرونٹ کوارٹر سے نوکر آ گئے۔ "کہاں جا رہی ہو بی بی — اتنی رات گئے۔" بوڑھے خانساماں نے اس کو اپنے بازوؤں میں گھیر لیا۔ "کہاں جاؤ گی؟" وہ گرجی "چھوڑ دو مجھ کو۔ میں آوارہ ہوں۔" "لیکن آپ سیشن جج امیرالدین صاحب کی بیٹی اور کمشنر صاحب کی بہن ہیں۔ آپ خاندان کی عزت ہیں۔" "غلط"، وہ چیخی "میں کسی کی بیٹی یا بہن نہیں ہوں۔ میں آوارہ ہوں۔" اور وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگی۔ کسی نے کہا "دکھیا کا دماغ چل گیا۔" وہ کہتی رہی "مجھے چھوڑ دو۔ میں لالہ امیرالدین نہیں ہوں۔ میں آوارہ ہوں۔ میں رافع کے پاس جا رہی ہوں — !!"

"ماہ نو" میں مضامین کی اشاعت

کے متعلق شرائط

۱۔ "ماہ نو" میں شائع شدہ مضامین کا مناسب معاوضہ پیش کیا جاتا ہے۔

۲۔ مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی رسالے یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا۔

۳۔ ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔

۴۔ ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

۵ مضمون کے ناقابلِ اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہو گا۔

۶۔ ایڈیٹر مسوّدات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہو گا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہو گی۔

•

سیدھی پیٹھ اور مضبوط
اعضاء کے لئے
اپنے ننھے بچہ کو
یہ خالص دودھ دیجئے
OSTERMILK
جو مائیں اپنے شیرخوار بچوں کو ضرورت بھر یا بلکل ہی چھاتی کا دودھ نہ پلا سکتی ہوں وہ آسٹر ملک پر پورا بھروسہ کر سکتی ہیں۔ یہ بالکل خالص، قوت بخش اور نہایت عمدہ دودھ ہے جسکو اس طرح سے بنایا جاتا ہے کہ بچوں کے ہاضمہ کے موافق ہو۔ ہڈیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے اسمیں وٹامن "ڈی" ملایا جاتا ہے اور لوہا شامل کیا جاتا ہے تاکہ بچے خون کی کمی والی بیماری سے محفوظ رہ سکیں۔ آپ اپنے بچے کی نشوونما سیدھی پیٹھ اور بازوؤں کی مضبوطی کے لئے آسٹر ملک پر پورا اعتماد کر سکتی ہیں۔ یہ خاص کر پاکستان میں شیرخوار بچوں کے لئے بیحد موزوں ہے۔
آسٹر ملک
ماں کے دودھ سے قریب تر
ہر ماں کے لئے مفید مشورہ
بچہ کی دودھ پینے والی بوتل کو صاف اور جراثیم سے پاک رکھنے کے لئے ایک برتن میں ٹھنڈا پانی لیجئے اسمیں خالی بوتل ڈال کر اتنا گرم کیجئے کہ اُبلنے لگے۔ پھر بوتل نکال لیجئے لیکن اُس کے اندرونی حصہ کو صاف کرتے وقت خشک نہ کیجئے۔
گلیکسو لیبوریٹریز پاکستان لمیٹڈ
کراچی لاہور چٹاگانگ ڈھاکہ

بچت کیجئے

اپنی روز افزوں ضروریات کیلئے

انسانی ضروریات روز بروز بڑھتی رہتی ہیں۔ بچوں کی تعلیم کا خرچ ہے۔ بیماری کی صورت میں علاج معالجہ کی ضرورت ہے۔ شادی بیاہ کے اخراجات ہیں۔ مکان بنوانے ان سب اور کئی اور ناگہانی طور پر آجانیوالی ضروریات کیلئے روپیہ درکار ہے۔ اگر پس انداز کیا ہوا روپیہ موجود ہے تو یہ سب ضرورتیں بغیر دقت اور تردد کے پوری ہو سکتی ہیں۔

رقم جمع کرانے اور روپیہ واپس لینے کا طریقہ نہایت آسان ہے اور حسابدار کی اپنی موجودگی ڈاکخانہ میں ضروری نہیں۔ اپنے فائدہ اور آرام کی خاطر بچت کیجئے اور اس بچت کو ڈاکخانہ کے سیونگ بنک میں لگائیے، جسے گورنمنٹ کی ضمانت حاصل ہے۔ یہاں آپ کا سرمایہ ہر لحاظ سے محفوظ ہے اور اس پر معقول منافع بھی حاصل ہوتا ہے۔

بجت کیجئے اور جمع کیجئے

ڈاکخانہ سیونگ بینک

مزید تفصیلات قریب ترین ڈاکخانہ کے سیونگ بنک سے حاصل کریں

میری قمیص پٹخنا بند کرو...
SUNLIGHT
SOAP
چٹاخ ! پٹاخ ! ٹوٹے بٹن تار تار کالر، پھٹی آستیں !
میں اس طرح اپنی قمیص دھلوانا نہیں چاہتا۔
سن لائٹ صابن استعمال کیجئے
جی ہاں -! جب سن لائٹ صابن کافی مل سکتا ہے تو کپڑوں کو اس طرح
کوٹ پیٹ کر دھونے کی کیا ضرورت سن لائٹ کے جلد اثر کرنیوالے
جھاگ سے کوٹے پیٹے بغیر میل خود بخود صاف ہو جاتا ہے۔ کپڑے
بھگو دیجئے، سن لائٹ صابن ملئے اور دھو ڈالئے بس آپ کا کام
ختم ہو گیا۔ اپنے تمام کپڑے سن لائٹ صابن سے دھوئیے۔!
یہ آپ کے ہاتھ کی جلد کے لئے بھی مضر نہیں ہے
سن لائٹ صابن
پٹخے بغیر کپڑوں کو
سفید اور اجلے
دھوتا ہے

ان کی تندرستی اہم ہے
اسی وجہ سے میں ہمیشہ ڈالڈا
سے کھانا تیار کرتی ہوں
اتنے ہی وٹامن جتنے کے اصلی گھی میں
اب ڈالڈا براند وناسپتی میں بہت زیادہ غذائیت ہے
ڈالڈا کے ہر اونس میں وٹامن اے
کی اتنی ہی مقدار موجود ہے جتنی
کے اچھے اور خالص گھی میں ہوتی ہے
ڈالڈا میں وٹامن ڈی بھی موجود
ہے! آپ کے بچوں کی صحت مند
پرورش کے لئے ان کی غذا میں ان دونوں وٹامن کی
موجودگی ضروری ہے۔
ہمیشہ محفوظ اور پاک وصاف
ڈالڈا براند وناسپتی کو عمدہ بناتی تیلوں سے تیار
کرکے حفظان صحت کے اصولوں کے تحت سربمہر اور ہوا بند
ڈبوں میں بھرا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ تازہ اور صاف ستھرا
ہے۔ اپنے تمام کھانے ڈالڈا سے تیار کیجئے۔ اور اپنے گھر والوں
کو صحت مند رکھئے۔
ڈالڈا براند وناسپتی
کھانوں کو بہتر بناتا ہے
HVM 17—193 UD

بہتر زندگی کا
منصوبہ ...
کھیتی باڑی کے جدید طریقوں، گھریلو صنعتوں کی روز افزوں ترقی
اور اسکولوں نیز شفاخانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے گاؤں کے
باشندوں میں یقین اور خود اعتمادی کی ایک نئی روح پھونکدی ہے۔
پٹرولیم سے بنی ہوئی چیزوں کی حتی المقدور با کفایت تقسیم کاری کے
ذریعہ برماشیل بھی پاکستان کی نشو و نما اور ترقی میں
برابر کی شریک ہے۔
برماشیل ترقی پاکستان کا ایک حصہ ہے

میں لکس ٹائیلٹ صابن استعمال کرتی ہوں

فلمی ستاروں کا سفید اور خوشبودار حسن بخش صابن

LTS 6—193UD

ماہِ نو
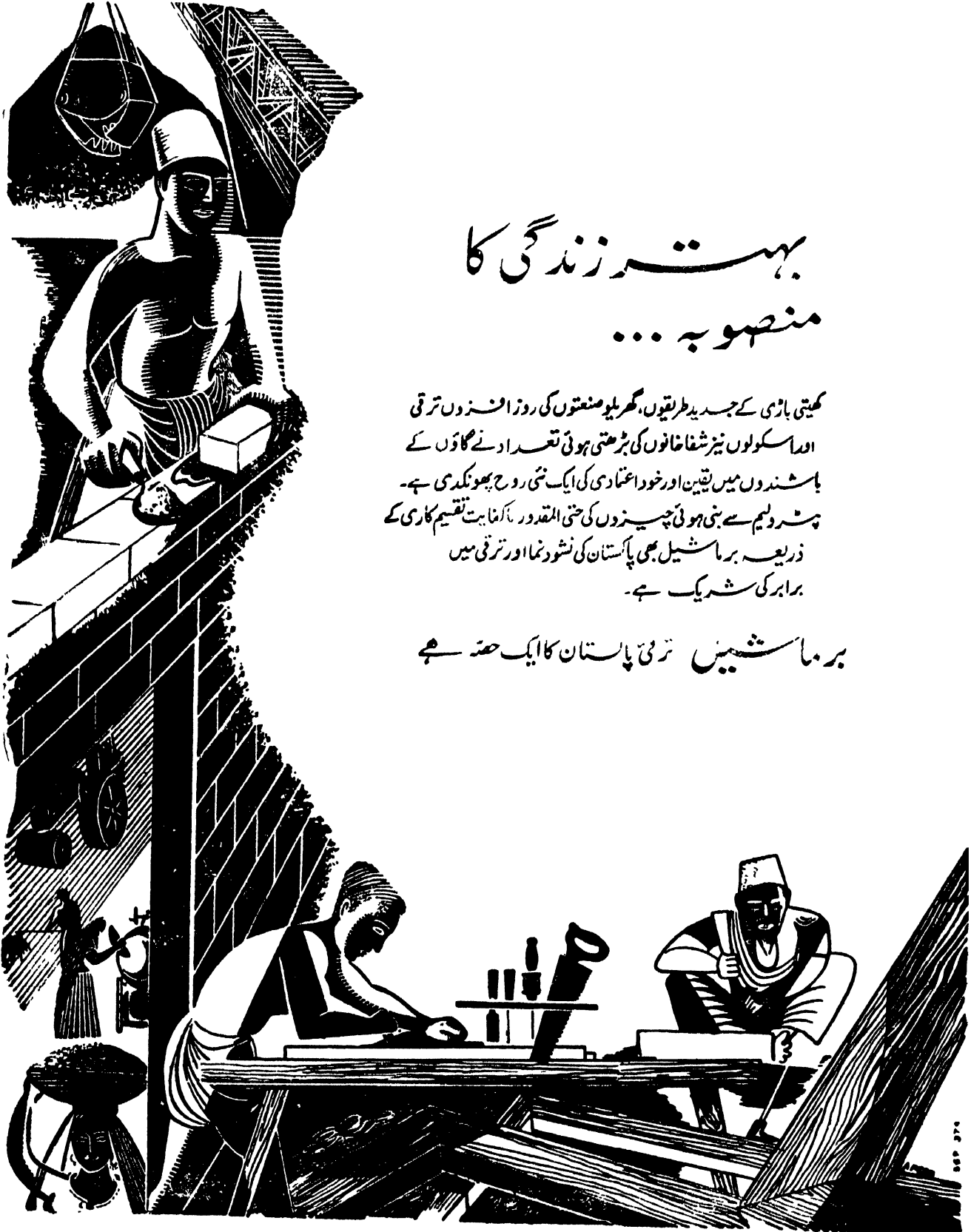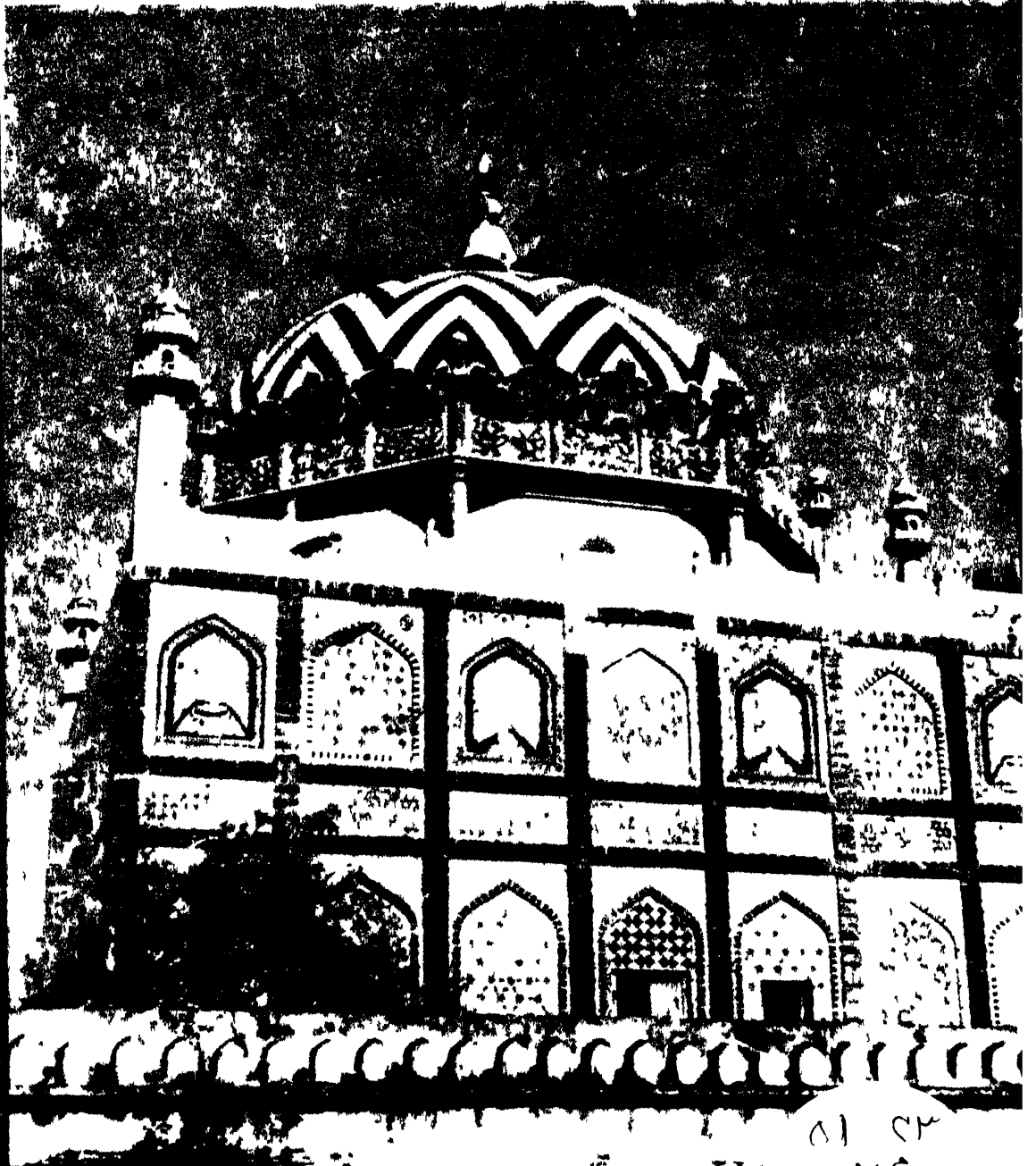
جگر مرادآبادی　ممتاز مفتی　قیوم نظر　ابوسعید نورالدین
ڈاکٹر آصفجاہ کاروانی　اختر ہوشیارپوری　انجم اعظمی　یونس احمر
جمیل نقوی　مشتاق مبارک　رفعت روبینہ　سحاب قزلباش
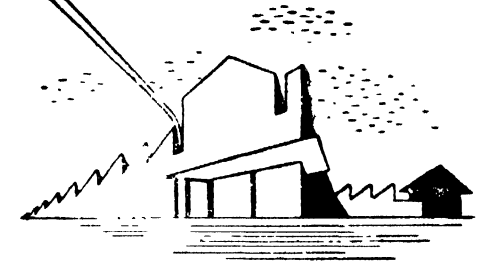
سائنس
آپ کی
خدمت میں
ہر ترقی پذیر تیل کی کمپنی کے لئے جدید ترین
آلات سے لیس تجربہ گاہیں بے حد ضروری ہیں
تاکہ سیال ایندھن اور مزلقات کے نمونوں
کا تجزیہ کر کے اس بات کا یقین کیا جا سکے
کہ گاہکوں کو موزوں ترین تیل فراہم کئے جا رہے ہیں۔
برماشیل کی تجربہ گاہیں، جو قیام پاکستان کے
ساتھ ساتھ وجود میں آئی تھیں، جدید ترین ساز و سامان
سے لیس ہیں اور ان میں کام کرنے والے بھی
اعلیٰ تربیت یافتہ کیمیا داں ہیں۔
یہ تجربہ گاہیں بلا معاوضہ گاہکوں کی خدمت کرتی ہیں
اور ان میں کئے جانے والے اہم تجربات نہ صرف
ہر قسم کی مشینوں کی کارکردگی میں اضافہ کرتے ہیں بلکہ پیداوار
کی قیمت میں کمی کا باعث بھی ہوتے ہیں۔
برماشیل ترقئ پاکستان کا ایک حصہ ہے
BSP-385

اپریل ۱۹۵۷ء
ماہ نو - کراچی

میری قمیص
پٹخنا
بند کرو....
چٹاخ! پٹاخ! ٹوٹے بٹن تار تار کالر پھٹی آستین!
میں اس طرح اپنی قمیص دھلوانا نہیں چاہتا۔
سن لائٹ صابن استعمال کیجئے
جی ہاں! جب سن لائٹ صابن کافی مل سکتا ہے تو کپڑوں کو اس طرح
کوٹ پیٹ کر دھونے کی کیا ضرورت سن لائٹ کے جلد اثر کرنے والے
جھاگ سے کوٹے پیٹے بغیر میل خود بخود صاف ہو جاتا ہے کپڑے
بھگوئیے سن لائٹ صابن ملئے اور دھو ڈالئے بس آپ کا کام
ختم ہو گیا اپنے تمام کپڑے سن لائٹ صابن سے دھوئیے
یہ آپ کے ہاتھوں کی جلد کے لئے بھی مضر نہیں ہے
سن لائٹ صابن
SUNLIGHT SOAP
پٹخے بغیر کپڑوں کو
سفید اور اجلے
دھوتا ہے
S 12-193 UD

ماہِ نو

جلد ۱۰ شمارہ ۱

اپریل ۱۹۵۷ء

مدیر: رفیق خاور

نائب مدیر: ظفر قریشی

اداریہ: آپس کی باتیں

بہ یادِ اقبالؒ: اقبال کا تصورِ خودی — ڈاکٹر آصف جاہ کاروانی — ۷

اقبال کا نظریۂ انسانِ کامل — ابو سعید نور الدین — ۱۶

"خمستانِ فرنگ" — قیوم نظر — ۱۹

نذرِ اقبال (نظم) — سحاب قزلباش — ۲۴

"شرف النسا" (نظم) — علامہ اقبالؒ — ۲۴

میں گیت اسی کے گاتی ہوں (بنگلا نظم) — بیگم صوفیہ کمال، مترجمہ: یونس احمر — ۲۵

غزل: جگر مراد آبادی — ۲۶

افسانے، رپورتاژ، فکاہیہ: معلق شاہراہ (رپورتاژ-۲) — ممتاز مفتی — ۲۷

نئی شام (افسانہ) — رفعت روبینہ — ۳۳

زرسانگہ (پشتو عوامی کہانی) — فہمیدہ اختر — ۳۸

احوال واقعی (فکاہیہ) — محمد مسعود — ۵۱

نظمیں: پچھتاوا — جمیل نقوی — ۴۱

تم کون ہو؟ — قاضی نذر الاسلام مترجمہ ابتسام الدین — ۴۲

ہدیہ ہائے نیاز — عالی رضوی — ۴۳

ابگینے — ضمیر اظہر — ۴۳

غزلیات: اختر ہوشیارپوری • انجم اعظمی — ۴۸

شائستہ بیزار • رشید انگجراتی — ۴۹

اقبال صفی پوری • مشتاق مبارک — ۵۰

ہماری ڈاک: — ۵۳

سرورق: شاہ عنایت اللہ شہید کا روضہ (جھوک ضلع ٹھٹہ) — رنگین عکس: آفتاب

سالانہ چندہ

ساڑھے پانچ روپے

فی کاپی ـــــــ آٹھ آنے

ادارۂ مطبوعات پاکستان
پوسٹ بکس ۱۸۳ ـ کراچی

آپس کی باتیں

عہدِ حاضر خاصۂ اقبال گشت — ملک الشعرا بہار نے یہ بڑے پتے کی بات کہی تھی۔ یہ دور واقعی اقبال ہی کا دور ہے جو ہر اعتبار سے اس کی پوری پوری نمائندگی کرتے ہیں۔ انہوں نے یونہی نہیں کہہ دیا تھا کہ: من نوائے شاعرِ فردا ستم

اقبال پہلے بھی شاعرِ فردا تھے، اب بھی ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ کیونکہ جس دور میں وہ پیدا ہوئے اس کی خصوصیت ہی یہ تھی کہ مشرق و مغرب کو ایک بار پھر آمیز کیا جائے اور ایک نئی زندگی، نئے نظام، نئے سلسلۂ تہذیب و تمدن کا آغاز ہو۔ اس میں ایک ایسی ہمہ گیر شخصیت کا پیدا ہونا لازم تھا جو موجودہ تمدنوں کے اختلاط سے ایک جامع نظام کی بنیاد رکھے اور یہ کہہ سکے کہ: من شاید نخستیں آدم از عالمے دیگر

اقبال ایک ایسی ہی عہد آفریں شخصیت تھے، اپنے ہی "انسانِ کامل" کی ایک عمدہ مثال۔ انہوں نے ایک نئے تصور کو جنم دیا جو زندگی کو نت نئے سانچوں میں ڈھالنے میں مدد دیتا ہے۔ اسلئے یہ تصور کبھی فرسودہ نہیں ہو سکتا۔ اس میں عبرانیت اور یونانیت، عرب و عجم، مشرق و مغرب کا ایسا امتزاج پیش کیا گیا ہے جس سے فرد اور جماعت دونوں کی مسلسل نشو و نما لازمی ہے +

اقبال کی یہ آفاقیت، یہ ابدیت روز بروز نمایاں ہو رہی ہے۔ وہ دن گئے جب وہ انجمن میں تنہا تھے۔ اب عجم بھی اسی طرح ان کے افکار سے باخبر ہے جس طرح عرب۔ اور مغرب بھی اتنا ہی مستفیض ہو رہا ہے جتنا مشرق۔ چنانچہ ایران، مصر، فرانس، اٹلی، انگلستان، امریکہ کہیں ان کی تصانیف کے تراجم ہو رہے ہیں اور ان کے ہمنواؤں کا حلقہ روز بروز وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ مشرق تو الگ رہا مغرب میں بھی اقبال پر جس ذوق و شوق سے کام ہو رہا ہے، حیرت آفریں ہے۔ بعض اہلِ مغرب تو اس طرح اقبال کے افکار کی شرح و تفسیر کر رہے ہیں جیسے وہ آیاتِ الٰہی ہوں اور ان کی تصانیف مذہبی صحائف۔ ہمیں فخر ہے کہ ہمارے ملک کی ایک مایۂ ناز شخصیت نے اپنے تخیلات سے نئی جوت جگائی ہے اور نوعِ انسان کی رہنمائی کی ہے ؛

ایسی عظیم شخصیت کے افکار کی توضیح و نشر و اشاعت ہمارا فرض ہے۔ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ اقبال اکاڈمی کے قیام سے اس اہم کام کا وسیع پیمانہ پر اہتمام کیا گیا ہے۔ حال ہی میں اس ادارہ نے کراچی میں اقبال سے متعلق نوادر کی نمائش منعقد کی جس سے تحقیق کے لئے نیا سامان میسر آنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ہم اس شمارہ میں اس تقریب کی چند تصاویر پیش کر رہے ہیں ان کے ساتھ ہی تبرکاً اقبال کے مقبرہ، ان کی اپنی تعمیر کردہ کوٹھی اور ان کے ملازم علی بخش کی تصویریں بھی پیش کر رہے ہیں۔ ان سب سے زیادہ ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ ہم سب سے پہلے شرف النسا کے مقبرہ کی چند تصاویر پیش کر رہے ہیں جس کا ذکر اقبال نے "جاوید نامہ" میں کیا ہے۔ یہ خاتون لاہور کے مغل گورنر عبدالصمد کی دختر نیک اختر تھیں جو تلوار باندھ کر قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول رہتی تھیں کیونکہ یہ دونوں ملت کی بقا اور تحفظ کے ضامن ہیں۔ اور ان کی وصیت کے مطابق دونوں کو ان کے مرقد پر رکھ دیا گیا تھا۔ ہم نے قارئین کی دلچسپی کے پیشِ نظر ایک جگہ "جاوید نامہ" کے وہ اشعار بھی درج کر دئے ہیں جو شرف النسا سے تعلق رکھتے ہیں ؛

اس شمارہ کے ساتھ "ماہ نو" کی عمر کا دسواں سال شروع ہوتا ہے۔ نئے سال کے نئے عزائم کی ایک ابتدائی جھلک اس اشاعت میں نظر آئے گی منجملہ دیگر خصوصیات کے اس شمارہ میں تصاویر کا اہتمام ایک خاصے کی چیز ہے چنانچہ اس شمارہ میں لاہور کے شکستہ مغلیہ باغ "چوبرجی" کی چند تصاویر بھی پہلی بار پیش کی جا رہی ہیں۔ یہی کیفیت ایبٹ آباد کی ہے۔ ان سب وجوہ کی بنا پر یہ شمارہ تصویری اعتبار سے نوادر و اولیات کا شمارہ ہے ؛

آج کل مغرب میں اقبال کا جو چرچا ہے اس کی تھوڑی سی جھلک آپ کو خواب قیوم نظر کے مضمون "خمستانِ فرنگ" میں دکھائی دے گی جس میں انہوں نے موجودہ ڈچ اہلِ قلم سے اپنی ملاقاتوں کا حال بیان کیا ہے اور اس کے آخر میں کلامِ اقبال کے ولندیزی مترجم ہولسٹ سے گفتگو پیش کی ہے ؛

"ماہ نو" کا اگلا شمارہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی یادگار ہوگا۔ "قصہ گویاں قصۂ ناگفتہ اند" غیر مسلم مورخین نے اس کے خد و خال مسخ کر دئے ہیں۔ اب وقت ہے کہ ہم حقیقت کے رخ سے نقاب ہٹا کر اس کو اپنے اصلی رنگ میں پیش کریں۔ یہ ہمارے اہلِ قلم اور اربابِ تحقیق کو صلائے عام ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ وہ اس قومی پیشکش، اس شمارہ خاص میں ایسی آب و تاب پیدا کریں گے کہ یہ ہمیشہ کے لئے یادگار رہے ؛

اقبال کا تصوّرِ خودی

ڈاکٹر آصف جاہ کاروانی

اگرچہ علامہ اقبال کی جملہ نگارشات کا مرکزی خیال خودی ہے تاہم انہوں نے اپنے نظریات دیگر فلاسفہ کی طرح بالتفصیل اور بالترتیب کہیں بیان نہیں کئے۔ منظومات میں اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، گلشنِ رازِ جدید اور بالِ جبریل کے ساقی نامے میں ان کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی کے دیباچوں اور ڈاکٹر نکلسن کو اسرارِ خودی کے انگریزی ترجمے کے سلسلے میں انہوں نے جو خط لکھا تھا اس میں نظریۂ خودی کی بعض جزئیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن ان میں تفصیلات نظریہ کم ہیں، خودی کی اہمیت اور استحکام پر زیادہ زور دیا ہے۔ اپنی تمام تصانیف میں سے صرف انگریزی خطبات موسوم بہ "ری کنسٹرکشن آف ریلیجیئس تھاٹ اِن اسلام" میں اقبال نے نظریاتی حیثیت سے خودی کی تفصیلات سے بحث کی ہے لیکن چونکہ ان خطبات کا براہِ راست تعلق فلسفے سے نہیں ہے بلکہ مذہبی فکر کی از سرِ نو ترتیب سے ہے لہٰذا ان میں بھی نظریۂ خودی کی تفصیلات پر بالترتیب روشنی نہیں ڈالی گئی۔ علاوہ اس کے ان خطبات میں اقبال نے اپنے نظریات کے مغربی مآخذ کو نظر انداز کر دیا تھا جس کی وجہ سے اُن کا جامع تصوّر قائم کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنہ ۱۹۲۰ء میں اقبال نے غلام بھیک نیرنگ کو اُن کے خطبات کے ترجمے کے بارے میں لکھا تھا "باقی رہا لکچروں کے ترجمے کا کام سو یہ کام ناممکن نہیں تو مشکل اور از بس مشکل ضرور ہے۔ ان لکچروں کے مخاطب زیادہ تر وہ مسلمان ہیں جو مغربی فلسفے سے متاثر ہیں اور اس بات کے خواہشمند ہیں کہ فلسفۂ اسلام کو فلسفۂ جدید کے الفاظ میں بیان کیا جائے اور اگر پرانے تخیلات میں خامیاں ہیں تو اُن کو رفع کیا جائے۔ میرا کام زیادہ تر تعمیری ہے اور اس تعمیر میں میں نے فلسفۂ اسلام کی بہترین روایات کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ مگر میں خیال کرتا ہوں کہ اردو خواں دنیا کو شاید ان سے فائدہ نہ پہنچے کیونکہ بہت سی باتوں کا علم میں نے فرض کر لیا ہے کہ پڑھنے یا سننے والے کو پہلے سے حاصل ہے، اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔"

اس مقالے میں علامہ اقبال کی نگارشات اور اُن کے تخیل کے مشرقی و مغربی مآخذ کو مدِنظر رکھتے ہوئے اُن کے فلسفۂ خودی کے نظریاتی پہلو پر روشنی ڈالنے کی سعی کی گئی ہے۔

اقبال کے نزدیک جملہ موجودات کی اصل ایک باشعور قوتِ تخلیق ہے جسے وہ انتہائی خودی یا ULTIMATE EGO کہتے ہیں:-

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است
ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است
صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ اُو
غیرِ اُو پیداست از اثباتِ او
می شود از بہرِ اغراضِ عمل
عامل و معمول و اسباب و علل
خیزد، انگیزد، پرد، تابد، رمد
سوزد، افروزد، کشد، میرد، دمد

اپنے انگریزی لکچروں میں وہ کہتے ہیں: "شعوری تجربے کے عمیق پہلوؤں کا تجزیہ کرنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ تجربہ کا انتہائی منبع ایک باشعور قوتِ تخلیق ہے جس کو میں نے انتہائی خودی کا نام دے دیا ہے۔"

اگر چشمی کشائی بر دلِ خویش
درونِ سینہ بینی منزلِ خویش (گلشنِ رازِ جدید)

اُن کا خیال ہے کہ اس انتہائی خودی کو قرآن پاک میں ایک مکمل شخصیت تصور کیا گیا ہے اور اس کی انفرادیت کو واضح کرنے کی غرض سے اس کو اللہ کا مخصوص نام دیکر اس کی یہ تعریف کی گئی ہے:-

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝
وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝

اس تعریف کی تائید میں دلائل پیش کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں: "انتہائی خودی زمانِ مجرد میں رہتی ہے۔ زمانِ مجرد میں رہنا انتہائی خودی کا اثبات ہے اور خودی کے اثبات کے معنی انا ہیں۔" انا یا خودی چونکہ شخصیت کا دوسرا نام ہے لہٰذا یہ واضح ہو گیا کہ خدا ایک شخصیت ہے۔ چونکہ انتہائی خودی کا دائرہ عمل زمانِ مجرد ہے جو ایک حرکی عضویہ (DYNAMIC ORGANISM) ہے اور

ایک مسلسل "ہنوز" کی شکل اختیار کئے ہوئے ہے لہذا نہ تو انتہائی خودی کی کوئی ضد ہو سکتی ہے اور نہ وہ جامد و ساکت ہو سکتی ہے بلکہ اسے ایک بے مثال قوتِ تخلیق ہی کی شکل میں تصور کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ انتہائی خودی کی کوئی ضد نہیں اس کا کوئی مدِمقابل نہیں اس لئے اس کا تخلیقی عمل خارجی نہیں داخلی ہوگا اور وہ بازیابی (RECREATION) کے متضاد رجحان سے پاک ہوگی۔ انتہائی خودی چونکہ بازیابی کے متضاد رجحان سے مبرّا ہے۔ لہذا اس کی ذات ہر نقص سے پاک ہوگی اور اس کی شخصیت کامل ہوگی۔ اس طرح وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ انتہائی خودی ایک شخصیت ہے کامل، خود مرکوز، بے نظیر اور بازیابی کے وصف سے پاک۔ اُن کا خیال ہے کہ یورپ کے جدید سائنٹی فک اور فلسفیانہ تجربوں اور دنیا قوتوں سے بھی خدا کے اس تصور کی تصدیق ہوتی ہے۔

لیکن شخصیت کا تصور کردار کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ انتہائی خودی اگر شخصیت ہے تو اس کا بھی کچھ کردار ہونا چاہئے۔ اقبال کے خیال میں فطرت انتہائی خودی کا کردار ہے جس کی تصدیق وہ اِس حدیث سے کرتے ہیں "دہر کو بُرا مت کہو، دہر خدا ہے۔" وہ کہتے ہیں "انتہائی خودی کے لئے فطرت کی وہی حیثیت ہے جو انسانی خودی کے لئے کردار کی ہے۔ فطرت کا مطالعہ خدا کے کردار کا مطالعہ ہے۔" فطرت کا مطالعہ کرنے سے انتہائی خودی کا تصور بھی قائم کیا جا سکتا ہے اور اس کا قرب بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

خدا کو شخصیت تصور کر لینے سے ایک دقت یہ پیدا ہوتی ہے کہ اُسے لامحدود کیسے سمجھا جائے؟ اقبال اس کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں "خدا کو لامکانی محدودیت کے لحاظ لامحدود تصور نہیں کیا جا سکتا۔ روحانی معاملات میں محض مکانی بڑائی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ مادی اور مکانی لامحدودیت کو مطلق بھی نہیں کہا جا سکتا۔ جدید سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ فطرت کوئی ساکت و جامد شے نہیں جو لامحدود خلا میں واقع ہو بلکہ وہ تو باہم متعلق واقعات کا نظام ہے جس کے باہمی تعلقات سے زمان و مکاں کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ گویا یہ اس حقیقت کو پیش کرنے کا دوسرا طریقہ ہے کہ زمان و مکاں وہ معانی ہیں جو فکر نے انتہائی خودی کے تخلیقی عمل کو دیئے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر زمان و مکاں انتہائی خودی کے امکانات ہیں جن کا کچھ حصہ ہمارے زمان و مکاں کی شکل میں ہمارے پیشِ نظر ہے۔ انتہائی خودی کے باہر اور اس کے تخلیقی عمل کے علاوہ نہ زماں ہے نہ مکاں۔ لہذا انتہائی خودی نہ تو مکانی لامحدودیت کے لحاظ سے لامحدود ہے اور نہ پابندِ مکاں انسانی خودی کی طرح محدود۔ اس کی لامحدودیت کا دار و مدار اس کے تخلیقی عمل کے لامحدود امکانات پر ہے جن کا نامکمل مظاہرہ ہماری یہ کائنات ہے۔ مختصر یہ کہ خدا کی لامحدودیت داخلی ہے خارجی نہیں" (انگریزی لکچر ص ۶۵)

شخصیت کے سلسلہ میں ایک اعتراض یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ خودی انتہائی ہو یا محدود، غیر خودی کے بغیر اس کا تصور کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ نیز اگر انتہائی خودی کے باہر کوئی شے نہیں ہے تو پھر اسے خودی کیسے تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں اقبال کہتے ہیں "حقیقت کی اس نوعیت کے بارے میں جس کا انکشاف شعوری تجربے سے ہوتا ہے منطقی استدلال سے رائے قائم کرنے میں کوئی مدد نہ ملے گی۔ شعوری تجربے کا تزکیہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حقیقت ابدی ایک باشعور زندگی ہے جسے زندگی کے تجربے کی روشنی میں ایک عضو کل ہی تصور کیا جا سکتا ہے جو خود مرکوز بھی ہے اور مرکزی نقطے کا حامل بھی۔ چونکہ زندگی کا یہی خاصہ ہے لہذا حیاتِ ابدی کو بھی خودی ہی تصور کیا جا سکتا ہے۔" (انگریزی لکچر ص ۷۰-۷۱)

اقبال انتہائی خودی کے چار اوصاف بتاتے ہیں یعنی خالقیت، علمیت، ابدیت اور قدرتِ مطلقہ۔ (۱) خالقیت۔ عام طور پر لوگوں میں یہ خیال رائج ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کا عمل ایک مخصوص گزشتہ واقعہ ہے۔ خدا نے 'کُن' کہا اور یہ کائنات ہو گئی۔ اقبال کا خیال ہے کہ اگر کائنات کو ایک مکمل اور موجود بالذات شے تصور کر لیا جائے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کی حیثیت خدا کی زندگی میں ایک اتفاق سے زیادہ نہیں۔ اگر یہ اتفاق واقع نہ ہوتا تو یہ کائنات وجود ہی میں نہ آتی۔ اس نظریہ سے خدا کی تخلیق بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں "قرآن پاک میں کہا گیا ہے کہ خدا ہر روز اپنے آپ کو کسی نئے کام میں مصروف رکھتا ہے۔" اور اس آیت سے یہ معنی اخذ کرتے ہیں کہ خدا کا تخلیقی عمل اب بھی جاری ہے۔ وہ اس تفسیر کی تائید میں جدید سائنس کا نظریۂ اضافیت پیش کرتے ہیں جس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "یہ کائنات کوئی ٹھوس شے نہیں ہے۔ بلکہ باہم متعلق واقعات کا ایک نظام ہے جس میں اضافہ ہو رہا ہے۔" وہ کہتے ہیں "ہمارے شعوری تجربے کا تزکیہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ زمان و مکاں اور مادہ موجود بالذات انتہائی خودی کی مدِمقابل حقیقتیں نہیں ہیں بلکہ وہ تو خدا کی تخلیقی زندگی کو سمجھنے کے عقلی طریقے ہیں۔" اس طرح وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ چونکہ اس کائنات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ خدا کا تخلیقی عمل مسلسل جاری ہے۔

اقبال کا خیال ہے کہ "انسان جس میں خودی نسبتاً مکمل ہو چکی ہے، الہٰیت کی قوتِ تخلیق میں ایک مخصوص مقام رکھتا ہے۔ خدا کی جملہ تخلیقات میں صرف وہی اِس قابل ہے کہ اپنے خالق کی تخلیقی زندگی میں باشعور شرکت کر سکے" اور

بیاد اقبال رح

کراچی میں شاعر مشرق سے متعلق
یادگاروں کی پہلی نمائش
(بہ اہتمام اقبال اکادمی)

یادگار خطوط و مسودات

جناب ممتاز حسن ، نائب
صدر اقبال اکادمی کی
افتتاحی تقریر ، زیر صدارت
بیگم "جنجیرہ"

نمائش کے افتتاح سے پہلے
شرکائے جلسہ

علی بخش
(اقبال رح کا باوفا خدمت گذار)

"جاوید منزل"
(لاہور میں شاعر مشرق کی رہائش گاہ)

آخری آرامگاہ
(زیارت گاہ خاص و عام)

وہ بہتر دنیا کا تصور قائم کرنے اور موجود کو مطلوب کی شکل دینے کی صلاحیت رکھنے کی وجہ سے اور اپنی خودی کے لئے بے مثال اور مجموعی انفرادیت حاصل کرنے کی غرض سے اس بات کا متمنی رہتا ہے کہ ہر قسم کے ماحول کو استعمال کرے اور اپنا تخلیقی عمل جاری رکھے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا آزاد تخلیقی عمل کی مالک انسانی خودیوں کے صدور اور عمل سے خدا کی تخلیقی آزادی محدود تو نہیں ہو جاتی۔ اقبال اس کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں "اس میں شک نہیں کہ بدیہی اور ناقابلِ تعین عمل کی صلاحیت رکھنے والی خودیوں کا ظہور ہمہ گیر خودی کی آزادی پر ایک طرح کی پابندی ہے لیکن یہ پابندی خارجی طور پر عائد نہیں کی گئی بلکہ وہ تو اس کی اپنی تخلیقی آزادی سے پیدا ہوئی ہے جسکے ذریعہ اس نے محدود خودیوں کو اپنی زندگی، قوت اور آزادی میں شریک کرنے کے لئے منتخب کیا ہے"۔ (انگریزی لکچر ص۸۰)

۲۔ ابدیت: اقبال کا خیال ہے کہ انتہائی خودی کی ابدیت کا مسئلہ سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے وقت کی نوعیت معلوم کرلی جائے۔ وقت کی صحیح نوعیت معلوم کرنے کے لئے اپنے شعوری تجربے کا نفسیاتی تزکیہ ضروری ہے۔ اس تزکیہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہماری خودی کے دو رُخ ہیں کارگذار (EFFICIENT) اور قدر افزا (APPRECIATIVE)۔ کارگذار صورت میں وہ اپنی فوری ضروریات کے پیش نظر وقت کو "آج" اور "کل" میں تقسیم کرلیتی ہے۔ یہ شماری وقت ہے جو حقیقی وقت نہیں ہے لیکن قدر افزا صورت میں اسے ماضی، حال اور مستقبل ایک مسلسل "ہنوز" معلوم ہوتا ہے۔ یہ زمان مجرد ہے جو حقیقی وقت ہے۔ یہ ایک عضوی کلیہ ہے جس کو ہم ابدیت کہتے ہیں۔ اگر ہم اپنے شعوری تجربے کی رہنمائی قبول کرلیں اور ہمہ گیر خودی کو زندگی کے مشابہ تصور کرلیں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ابدی خودی ایک طرف شماری وقت میں رہتی ہے اور دوسری طرف زمان مجرد میں ؛

۳۔ علمیت: محدود خودی کی حالت میں علم کے معنیٰ استدلالی معلومات ہیں جن کا تعلق کسی موجود بالذات شے سے ہوتا ہے۔ لیکن اقبال کے خیال میں انتہائی خودی کی علمیت کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کیونکہ اس کا مدمقابل کوئی نہیں ہے۔ ہمہ گیر خودی کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو غیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں فکر و عمل، عمل علم اور عمل تخلیق یکساں ہوتے ہیں۔ لہذا ایسی خودی جو دانا بھی ہے اور موضوع معلوم کی اصل بھی اس کے علمیت کی نوعیت کسی طرح بھی استدلالی نہیں ہو سکتی۔ انتہائی خودی چونکہ زمان مجرد میں رہتی ہے جہاں ماضی حال و مستقبل مل کر ایک ابدی "ہنوز" کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ لہذا اسے امکانات کے ماضی، حال اور مستقبل کے تمام واقعات کا علم ہونا چاہئے۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہ خیال ایک حد تک درست ہے لیکن اس سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ کائنات ایک کامل نظام ہے جس کا مستقبل پہلے سے متعین ہے، جس کے واقعات کے تسلسل کو بدلا نہیں جا سکتا گویا ایک جابر تقدیر ہے جس نے خود خدا کے تخلیقی عمل کو محبوس کر دیا ہے۔ اس نظریئے سے خدا کی تخلیقی آزادی بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "علم الہیٰ کو ایک ایسا زندہ تخلیقی عمل سمجھنا چاہیئے جس سے موجودات کا عضوی تعلق ہے۔ خدا کے تخلیقی حیات کے عضوی کل میں مستقبل یقیناً پہلے سے موجود ہے۔ لیکن وہ واقعات کی متعینہ اشکال اور مقررہ تنظیم کی صورت میں نہیں ہے بلکہ صرف کھلے امکانات کی شکل میں ہے"۔ (انگریزی لکچر ص۷۹) اس طرح اقبال یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جہاں تک کھلے امکانات کا تعلق ہے انتہائی خودی ان سے پہلے سے واقف رہتی ہے۔ لیکن واقعات کے اوقات اور اُن کی جزئیات اس کے علم میں نہیں ہوتے ؛

۴۔ قدرت مطلقہ: مندرجہ بالا بحث سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انتہائی خودی تخلیق اور علمیت کے لحاظ سے متناہی ہے تو پھر اسے قادرِ مطلق کیسے کہا جا سکتا ہے؟ اقبال کہتے ہیں کہ ہمیں لفظ 'محدود' سے گھبرانا نہ چاہیئے۔ خدا کا ہر عمل خواہ وہ تخلیقی ہو یا کسی اور نوعیت کا ایک قسم کی محدودیت ہے جس کے بغیر خدا کو ایک ٹھوس عملی خودی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ذہنی طور پر تصور کی ہوئی قدرت مطلقہ ایک اندھی اور ناقابل اعتبار قوت ہوگی۔ خدا کی لامحدود قدرت کا راز اس کی آمرانہ آزادی میں نہیں بلکہ اُس کی باضابطہ دانشمندی میں ہے"۔ (لکچر ز ص۷۹)

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ اقبال کے نزدیک خدا کی لا محدودیت خارجی نہیں داخلی ہے۔ اس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ خدا کی ہر جگہ موجودگی کے نظریہ کے قایل نہیں ہیں۔ اپنے انگریزی لکچروں میں وہ نظریۂ خدا کے تحت کہتے ہیں؛ "میرے خیال میں یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی الہامی کتب میں خدا کو جو نور کہا گیا ہے اور اس سے جو مفہوم اب تک لیا جاتا رہا ہے اُسے اب بدلنا ہوگا جدید طبعیات نے یہ طے کر دیا ہے کہ روشنی کی رفتار گھٹائی بڑھائی نہیں جا سکتی۔ اور ہر ناظر کے لئے اس کا نظام حرکت کچھ بھی ہو یہ رفتار ایک سی رہتی ہے۔ لہذا اس تغیر و تبدل کی دنیا میں روشنی ہی ایک ایسی چیز ہے جو مطلق کے قریب تر آجاتی ہے۔ چنانچہ نور کا جو استعارہ خدا کے لئے استعمال کیا گیا ہے اس کے معنی جدید معلومات کی روشنی میں "خدا کی ہمہ جائی" نہیں بلکہ اس کی مطلقیت لینا چاہئیں۔" گلشن راز جدید میں وہ کہتے ہیں؛

مجو مطلق دریں دیر مکافات

کہ مطلق نیست جز نور السمٰوات

انتہائی خودی کو ایک ایسی شخصیت جو مکمل، بے مثال، یکتا، بازبالی کے متضاد رجحان سے مبرّا اور اپنا مدمقابل نہ رکھتی ہو تصور کر لینے سے یہ سوال پیدا ہوگا کہ اس کا تخلیقی عمل کیسے ہوتا ہے؟ اقبال کے خیال میں انتہائی خودی سے صرف خودیاں وجود میں آسکتی ہیں ؎

نہ ریزد جز خودی از پرتوِ اُو
نہ خیزد جز گہرا اندر رندِ اُو
خودشکن گردید واجزا آفرید
اندکی آشفت وصحرا آفرید

"انتہائی خودی جس میں فکر و عمل ہم آہنگ ہیں اس کی قوت تخلیق خودی وحدتوں کی شکل میں عمل پیرا رہتی ہے۔" یہ خودی وحدتیں انتہائی خودی کے باہر نہیں بلکہ اندر رہتی ہیں۔ ان خودیوں کی مجموعی حیثیت کو وہ ایک خودی وحدت تصور کرتے ہیں جسے عام اصطلاح میں فطرت یا کائنات کہا جاتا ہے ؎

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد
آشکارا عالمِ پندار کرد

وہ کہتے ہیں "یہ کائنات مادی ذرے کی میکانی حرکت سے لیکر انسانی خودی کی آزاد فکری حرکت تک اپنے ہر عمل میں 'انا الاکبر' کا خود انکشاف ہے۔ موجودات کا ہر ذرّہ ایک خودی وحدت ہے" (انگریزی لکچر ص ۶۲) لہذا یہ کائنات کوئی خارجی شے نہیں ہے بلکہ انتہائی خودی کا داخلی تخلیقی عمل ہے اور اس کا ادھورا انکشاف ؎

زمین و آسماں اُو را مقامی
میانِ کارواں تنہا خرامی
ز احوالش جہانِ ظلمت و نور
صدائے صور و مرگ و جنت و حور
درونِ شیشۂ او روزگارست
ولے برما بتدریج آشکارست

ہماری محدود عقل نے انتہائی خودی کے اس انکشاف کو ٹھوس شکل دے لی ہے ؎

کہن دیری کہ بینی مشتِ خاک است
دمے از سرگذشتِ ذاتِ پاک است

خرد در لامکاں طرحِ مکاں بست
چو زناری زماں را بر میاں بست

فطرت یا کائنات زمانِ مجرد میں حرکت کرتی رہتی ہے جہاں فکر، زندگی اور مقصد ہم آہنگ ہو کر ایک عضوی وحدت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اقبال کے خیال میں یہ "وحدت نظر کا دھوکہ نہیں بلکہ ایک واقعی حقیقت ہے جس کا تصور صرف خودی وحدت کی صورت میں ہی کیا جا سکتا ہے۔ ایک ٹھوس خودی وحدت جو ہر چیز پر طاری وساری ہو اور ہر انفرادی حیات و فکر کا سرچشمہ ہے۔" نیز یہ کائنات ایک آزاد تخلیقی حرکت ہے زندگی ہے۔ حرکت اور تغیر اس کی اساسی خصوصیات ہیں، وہ ایک ایسا ترقی پذیر اور خود بازیاب نظام ہے جس کے اضافے اور ارتقا کی حدود مقرر نہیں ہیں ؎

من ایں گویم جہاں در انقلاب است
درونش زندہ و در پیچ و تاب است
درونش خالی از بالا و زیر است
ولے بیرون او وسعت پذیر است

فطرت کے انتخابی اور شعوری اختیارات متعین ہیں اور وہ خودی وحدتوں کی شکل میں عمل پیرا رہتی ہے۔ یہ خودی وحدتیں اسفل خودیوں کی شکل میں نمودار ہوتی ہیں۔ یہ اسفل خودیاں فطرت کے تسلسل میں ایسے واقعات کی صورت میں ہوتی ہیں جن کو فکر مکانیت کا جامہ پہنا دیتا ہے اور عملی اغراض کے پیش نظر ان کو الگ الگ اشیا تصور کر لیتا ہے ؎

جہاں را فربہی از دیدنِ ما
نہالش رستہ از بالیدنِ ما

یہ کائنات زماں میں حرکت کرتی رہتی ہے یہ تخلیقی حرکت کسی خارجی دباؤ یا اثر کے تحت نہیں ہوتی۔ بقول اقبال "اس کائناتی بہاؤ یعنی زماں میں مکان کی حرکت کی کوئی طے شدہ منزل نہیں ہے اگر ایسی بات ہوتی تو اس کی اور تخلیقی اور تخلیقی نوعیت ہی ختم ہو جاتی۔ کائنات کی تخلیق کسی مذاق کا بھی نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک حقیقت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"

اس کی زمانی حرکت سے بتدریج نباتی اصولوں پر تجربات پیدا ہوتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک ان تجربات کے تین درجے ہیں۔ مادی۔ حیاتی اور شعوری۔ مادے کی نوعیت کے بارے میں بحث کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں "بہر نوع یہ ایک تجربے میں آنے والی حقیقت ہے کہ جب کوئی کام کیا جاتا ہے تو روح اور جسم متحد ہو جاتے ہیں اور دونوں مل کر اس کام کو سرانجام دیتے ہیں۔ یہ تجربہ ثابت کرتا ہے کہ روح اور جسم کے تعاون کی حدود قائم نہیں کی جا سکتیں اور یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ کام کا کتنا حصہ جسم نے کیا اور کتنا حصہ روح نے۔ اس سے یہ محسوس

ہوتا ہے کہ دونوں کی اصل ایک ہی ہے۔" یعنی روح مادے سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ مادہ روح کا ایک رُخ ہے۔ اپنے اس خیال کی تصدیق وہ جدید سائنس کے نظریۂ اضافیت سے کرتے ہیں۔ جس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "جسم یا مادہ خلائے مطلق میں واقع کوئی جامد شے نہیں ہے بلکہ واقعات یا اعمال کا ایک نظام ہے۔" تجربات کا وہ نظام جسے روح یا خودی کہا جاتا ہے وہ بھی واقعات کا ایک نظام ہے اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ روح اور جسم کی اصل ایک ہی ہے اور باوجود اس کے کہ دونوں کا فرق قائم رہتا ہے وہ ایک دوسرے کے لئے تار و پود کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ خود عملی چونکہ خودی کی خصوصیت ہے، لہذا اُن اعمال کی تکرار جاری رہتی ہے جن سے جسم بنتا ہے ؎

تن و جاں را دو تا گفتن کلام است
تن و جاں را دو تا دیدن حرام است
بجاں پوشیدہ رمزِ کائنات است
بدن حالی ز احوالِ حیات است
عروسِ معنی از صورت حنا بست
نمودِ خویش را پیرایہ ہا بست
حقیقت روئے خود را پردہ باف است
کہ او را لذتی در انکشاف است (گلشنِ رازِ جدید)

چنانچہ اقبال کے نزدیک جسم روح یا خودی کا جمع شدہ کردار یا عمل ہے اور اُسے روح یا خودی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تو شعور کا ایک مستقل عنصر ہے اور اسی مستقل عنصر کے باعث وہ باہر سے پائیدار معلوم ہوتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں "مادہ اسفل درجہ کی خودی وحدتوں کا نظام ہے۔ جب ان خودی وحدتوں کے اجتماع اور بین العملی میں ایک خاص قسم کا تعاون پیدا ہو جاتا ہے تو اس سے اعلیٰ درجہ کی خودی پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا یہ وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر عالمِ رنگ و بو میں اپنی رہنمائی خود کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔" (انگریزی لیکچر ص ۱۰۵-۱۰۶)

زماں میں مکان کی حرکت سے پیدا ہونے والے دوسرے تجربے کا نام زندگی ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ "چونکہ ذی حیات عضویوں کا عمل اسبابی نہیں مقصدی ہوتا ہے، اس لئے زندگی کے ظہور کا مسئلہ نظریۂ علت و معلول کی روشنی میں حل نہیں ہو سکتا۔ نظریۂ علت و معلول کا تعلق صرف خارجی اعمال سے ہوتا ہے لیکن زندگی ایک داخلی عمل ہے۔ یہ مسئلہ تو ایسے نظریئے سے حل ہو سکتا ہے جس کا تعلق داخلی اعمال سے ہو۔ یہ صحیح ہے کہ ذی حیات عضویوں کے اعمال کے بعض پہلو ایسے بھی ہوتے ہیں جو فطرت کی غیر ذی حیات اشیاء میں بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن اساسی طور پر عضویہ کا کردار میراثی ہوتا ہے۔ جس کی تسلی بخش تشریح نظریۂ طبیعاتی جواہر سے نہیں کی جا سکتی۔ ذی حیات عضویہ کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ خود کفیل اور خود باز یاب (SELF-REPRODUCING) ہوتا ہے۔ طبیعاتی اور کیمیائی میکانیت اس خصوصیت کی تشریح پیش کرنے سے قاصر ہے حقیقت یہ ہے کہ حیات ایک بے مثال غیر معمولی ظہور ہے اس کا تجزیہ نباتی اصولوں کی روشنی میں ہی ہو سکتا ہے" (لیکچرز ص ۴۴-۴۵)

حیاتِ پر نفس بحرِ روانی شعور و آگہی اُو را کرانی
چہ دریائے کہ ژرف و موجدار است ہزاراں کوہ و صحرا بر کنار است
مپرس از موج ہائے بے قرارش کہ ہر موجش بروں جست از کنارش
گذشت از بحر و صحرا را نمی داد نگہ را لذتِ کیف و کمی داد
ہر آں چیزے کہ آید در حضورش منور گردد از فیض شعورش
بخلوت مست و صحبت ناپذیر است دلے ہر شئے ز نورش مستنیر است
نختیں می نماید مستنیرش کند آخر بہ آئینی اسیرش
خرد بندِ نقاب از رخ کشودش ولیکن نطق عُریاں تر نمودش
نگنجد اندریں دیر مکافات
جہاں او را مقامی از مقامات

ارتقائے حیات کے سلسلہ میں وہ مولانا رومی کے مندرجہ ذیل اشعار پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں "کہ اس شاعر نے ارتقا کے جدید تصور کی کس قدر کامیابی سے پیشگوئی کی ہے"۔

آمدہ اوّل بہ اقلیم جماد وز جمادی در نباتی اوفتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد وز جمادی یاد ناورد از نبرد
وز جمادی چوں بہ حیواں اوفتاد نامدش حال نباتی ہیچ یاد
جز ہماں میلی کہ دارد سوئے آں خاصہ در وقت بہار و ضیمراں
باز از حیواں سوئے انسانیش می کشد آں خالقی کہ دانیش
ہم چنیں اقلیم تا اقلیم رفت تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت
عقل ہائے اولینش یاد نیست ہم ازیں عقلش تحول کردنیست
تا رہد ایں عقل پر حرص و طلب صد ہزاراں عقل بیند بوالعجب

ارتقا کا مقصدی عمل جاننے اور اپنے آپ کو ماحول کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت رکھنے کی وجہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ حیات طبیعی اور کیمیائی اعمال کا نتیجہ نہیں ہو سکتی بلکہ وہ زماں میں مکانی حرکت کا ایک تجربہ ہے اور اس کی اصل روحانی ہے۔ یاد رہے کہ اپنے ارتقا کے طویل عرصے میں اس نے کیمیائی اور طبیعی اعمال کا مقررہ انداز اختیار کر لیا ہے۔

"زندگی کے ارتقا کے راستے میں سب سے بڑی مزاحمت مادہ یعنی فطرت ہے لیکن فطرت چونکہ زندگی کے داخلی قویٰ کو پھلنے پھولنے کے ذرائع بہم پہنچاتی ہے اس لئے اس کو بری چیز تصور نہ کرنا چاہئیے۔ زندگی مختاری حاصل کرنے کی کوشش کا نام ہے جو اپنے راستے سے تمام مزاحمتوں کو دور کرکے پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے۔"

زماں میں مکاں کی حرکت سے پیدا ہونے والے پیہم تجربے کا نام شعور ہے۔ شعور کو زندگی کا ایک انحراف تصور کرنا چاہئیے۔ اس کا کام زندگی کے بڑھتے ہوئے کارواں کے لئے روشنی بہم پہنچانا ہے۔ شعور کشاکش کی ایک حالت ہے، خود یکسوئی SELF-CONCENTRATION کی ایک شکل ہے جس کے ذریعہ زندگی ان جملہ تعلقوں اور یادداشتوں کو الگ کر دیتی ہے جن کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کی حدود مقرر نہیں ہیں، ضرورت کے لحاظ سے اس کا دائرۂ عمل کم و بیش ہوتا رہتا ہے۔ اسے مادے کے اعمال کا ایک ضمنی مظاہرہ تصور کرنا اس کی آزاد عملی حیثیت سے انکار کرنے کے مساوی ہوگا۔ اور اس کے آزاد عمل سے انکار کرنے کے یہ معنی ہونگے کہ علم کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ علم شعور ہی کے منظم اظہار کا دوسرا نام ہے۔ بقول اقبال "شعور نہ زندگی کے ایک خالص روحانی اصول کی ایک قسم ہے، وہ کوئی شے نہیں بلکہ ایک منظم اصول اور کردار کا ایک مخصوص طریقہ ہے۔"

زندگی کی اعلیٰ ترین تخلیق انسان ہے۔ جو ذی حیات اشیا میں افضل ترین درجہ رکھتا ہے جسمانی خواہ روحانی اعتبار سے وہ ایک خود مرکز انفرادیت ہے۔ انسانی منزل پر پہنچ کر زندگی کا مرکز خودی یا شخصیت ہو جاتا ہے شخصیت کشاکش کی حالت کا نام ہے۔ اور اس کی بقا کا دارومدار اس حالت کو برقرار رکھنے پر ہے۔

اقبال کے خیال میں انسان کا اخلاقی اور مذہبی نصب العین نفیٔ خودی نہیں بلکہ اثبات خودی ہے۔ اس خیال کے ثبوت میں وہ اس طرح دلائل پیش کرتے ہیں کہ یہ جہان رنگ و بو، یہ زمین اور آسماں، یہ وادیاں اور پہاڑ، یہ روز و شب کا تسلسل اور موسموں کا تغیر و تبدل یہ چاند اور سورج، یہ ستارے اور سیارے سب واہمہ سہی۔ نظر کا دھوکا سہی۔ یہ بھی مانا کہ انسان اور اس کا علم محدود ہے، زمان و مکاں کا پابند ہے

تواں گفتن جہان رنگ و بو نیست — زمین و آسمان و کاخ و کو نیست
تواں گفتن ہمہ نیرنگ ہوش است — فریب پردہ ہائے چشم و گوش است

لیکن ایک چیز تو یقینی واقعی ہے جس میں شک قطعی ناممکن ہے اور وہ خود میرا سوچنا اور شک کرنا ہے۔ یہ تو ایک متضاد بات ہوگی کہ جو چیز سوچ رہی ہے وہ سوچنے کی حالت میں موجود ہی نہ ہو۔ شک کرنے کے معنی سوچنے اور سوچنے کے معنی ہونے کے ہیں۔ میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں۔ اور کچھ ہو یا نہ ہو میری خودی، میری انا، میری ذات کا وجود تو قطعاً ہے۔

اگر گوئی کہ "من" وہم و گماں است
نمودش چو نمود این و آن است
بگو با من کہ دارائے گماں کیست
یکے در خود نگر آں بے نشاں کیست
خودی را حق بداں باطل مپندار
خودی را کشت بے حاصل مپندار

اقبال کے خیال میں انسانی خودی وحدت کی پہلی اہم خصوصیت اس کی لازمی خلوت پسندی ہے۔ جو ہر خودی کی بے مثالیت کو نمایاں کرتی ہے۔ مثلاً جب میرے دل میں کسی چیز کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ تو اس خواہش کا تعلق صرف میری ذات سے ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر مجھے کوئی تکلیف ہوتی ہے تو باوجود ہر ممکن کوشش کے میری تکلیف کوئی مجھ سے نہیں لے سکتا ہے۔ میری خوشیاں، میری تکالیف، میری خواہشات صرف میری ہیں۔ میری ذاتی خودی کا مخصوص حصہ ہیں۔ میرے جذبات، میری محبت، میری نفرت، میرے فیصلے، میرے عزائم بلا شرکتِ غیر کلیتاً میرے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں "خود خدا بھی مجھے کسی بات کے محسوس کرنے، کوئی فیصلہ کرنے یا کسی چیز کو پسند یا ناپسند کرنے کے لئے مجبور نہیں کر سکتا۔" اپنی داخلی کیفیات کے اسی بے مثال تعلق کو ہم لفظ "میں" یا انا سے تعبیر کرتے ہیں۔

خودی کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ دیگر خودیوں کے ساتھ ربط و ضبط پیدا کرلینے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود وہ خود مرکوز ہوتی ہے۔ اس کی شخصیت کا ایک ذاتی دائرہ ہوتا ہے جس کے اندر کوئی اور خودی داخل نہیں ہوسکتی۔ گلشن راز جدید میں اس خیال کو پیش کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں۔

خودی اندر خودی گنجد محال است
خودی را عین خود بودن کمال است

درحقیقت خودی کی قطعیت کا دارومدار ہی اس بات پر ہے کہ وہ اپنے

وجود کو الگ تھلگ برقرار رکھے۔ ان کا بیان ہے "انسان کی خودی جس قدر کامل تر ہوگی۔ اسی قدر وہ قوتِ الٰہی کے وجود میں ٹھوس حیثیت کی مالک ہوگی۔ اور اپنے گرد و پیش کی چیزوں کے مقابلے میں اعلیٰ درجہ کی حیثیت رکھے گی"۔

خودی کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے وجود کو بحیثیت خودی برقرار رکھنے کی متمنی ہے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے وہ بازیابی کا طریقہ اختیار کرتی ہے۔ چونکہ وہ ایک زمانی عمل ہے اور موت کی تلوار اس کے سر پر ہمیشہ لٹکتی رہتی ہے۔ اور ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ اس کا سلسلۂ حیات کسی وقت بھی منقطع ہو جائے وہ انفرادی بقاء کے بجائے اجتماعی بقا حاصل کرنے کا راستہ اختیار کرتی ہے۔ اقبال کے نزدیک "شجرِ ابدیت کا ممنوعہ پھل کھانے کے معنی جنسی شعور بیدار کرنے کے ہیں اور یہی جنسی شعور بازیابی کے ذریعہ موت کا مقابلہ کرتا ہے"۔ اسی خیال کو وہ "بالِ جبریل" کے ساقی نامہ میں اس طرح پیش کرتے ہیں۔

ہوا جب اسے سامنا موت کا
کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا
اتر کر جہانِ مکافات میں
رہی زندگی موت کی گھات میں
مذاقِ دوئی سے بنی زوج زوج
اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

گویا زندگی موت سے کہتی ہے: اگر تم زندوں کی ایک پود ختم کر دو گی تو میں دوسری پیدا کر لوں گی۔

خودی کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ پابند مکاں نہیں ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایسی وحدت میں ظاہر کرتی ہے جس کو ہم ذہنی حالتیں کہتے ہیں۔ ذہنی حالتیں الگ الگ نہیں پائی جاتیں۔ بلکہ ایک دوسرے میں گھلی ملی رہتی ہیں۔ وہ ایک کثیر الاجزائی کل یعنی ذہنی کیفیات میں پائی جاتی ہیں۔ ان باہم متعلق حالتوں یا واقعوں کی وحدت ایک مخصوص نوعیت کی اور مطلقاً بے مثال وحدت ہوتی ہے جو مادی وحدت سے اساسی طور پر مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا ایک عقیدہ دوسرے عقیدے کے کس طرف ہے۔ نہ کسی چیز کے دلکش ہونے یا غیر دلکش ہونے کا اندازہ اس کے قرب و بعد سے لگاتے ہیں۔

ہم جو تصورِ مکاں کے بارے میں قائم کرتے ہیں، وہ مکانی لحاظ سے مکان سے منسوب نہیں ہوتا۔ بلکہ خودی کا یہ وصف ہے کہ وہ کئی مکانی نظاموں کا تصور پیدا کر سکتی ہے۔ بیداری کی حالت اور خواب کی حالت کی مکانیت میں کوئی باہمی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ حالتیں ایک دوسری میں مخل بھی نہیں ہوتیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خودی اس لحاظ سے پابند مکاں نہیں ہے جس لحاظ سے جسم ہے۔ باوجود اس کے کہ ذہنی اور جسمانی دونوں قسم کے واقعات وقت میں نمودار ہوتے ہیں۔ خودی کے وقت کا پیمانہ جسمانی وقت کے پیمانے سے اساسی طور پر مختلف ہوتا ہے۔ جسمانی واقعے کا امتداد واقعۂ حاضر کے طور پر پابند مکاں ہوتا ہے لیکن خودی کا امتداد داخلی ہوتا ہے جس میں ماضی حال اور مستقبل تینوں ملے رہتے ہیں۔

خودی ز اندازہ ہائے ما فزون ست
خودی زاں کل کہ تو بینی فزون ست
ضمیرِ زندگانی جاودانی ست
بچشمِ ظاہرش بینی زمانی ست
شر د بہر ابد ظرفی ندارد
نفس چوں سوزنِ ساعت شمارد
چو حس دیگر شد ایں عالم دگر شد
سکون و سیر و کیف و کم دگر شد

اقبال کے خیال میں خودی کے دو رخ ہیں۔ کارگذار اور زندہ افزا۔ کارگذار خودی کا تعلق ہمارے روزمرہ کے معاملات سے ہے۔ اس خارجی نظام کی اشیاء سے ہے جو ہماری آن پاس شعوری کیفیات کو متعین کرتا ہے۔ اور ان پر مکانی علیحدگی کی مہر لگا دیتا ہے۔ یہاں خودی کا دائرۂ عمل خارجی ہوتا ہے۔ اور ایک کلیت کی حیثیت سے اپنی وحدت کو برقرار رکھتے ہوئے وہ اپنے آپ کو مخصوص اور منفرد حالتوں میں نمایاں کرتی ہے۔ اس حیثیت میں خودی کا دائرۂ عمل اس زماں میں ہوتا ہے جسے کم و بیش کہا جاتا ہے۔ اس قسم کے زماں کو جو حقیقی زماں نہیں ہے۔ مکاں سے ممیز کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہ خودی وحدتِ فطرت کو الگ الگ حصوں میں بانٹ کر روزمرہ کی کارگذاری کا پروگرام مرتب کرتی ہے۔ اور اس طرح فطرت پر قابو پاکر اپنے وجود کو مستحکم کرتی ہے۔

شعوری تجربہ کا غائر جائزہ لینے سے خودی کا دوسرا رخ نظر آئیگا جسے اقبال قدر افزا کہتے ہیں۔ خودی کا یہ رخ روزمرہ کی مصروفیات کا

وجہ سے دبا رہتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی گہری سوچ، بے ہوشی یا نیند کی حالت میں جب کارگذار خودی معطل ہوتی ہے اور ہم اپنے داخلی وجود میں جھانکتے ہیں تو ہمیں تجربہ کا یہ داخلی مرکز نظر آتا ہے جس کا عمل خارجی نہیں داخلی ہے۔ قدر افزا خودی کے وجود میں شعور کی مختلف حالتیں ایک دوسرے میں گھل مل جاتی ہیں۔ خودی کی کلیت میں کیفیات کا کارگذاری امتیاز مٹ جاتا ہے۔ اور کارگذار خودی کے برعکس اس کے اجزاء کی کثرت خالص کیفی ہو جاتی ہے۔ جس میں حرکت بھی ہوتی ہے اور تغیر بھی لیکن یہ تغیر و تحریک منقسم ہوتے ہیں۔ اور نوعیت کے لحاظ سے بالکل غیر شماری ہو جاتے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ قدر افزا خودی کا وقت ایک مسلسل "حال" رہتا ہے۔

اقبال کے خیال میں انسانی خودی کے وجود میں امرِ الٰہی کا عنصر موجود ہے جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے اعمال میں مختار نہیں ہے لیکن اقبال کے نزدیک امرِ الٰہی کے معنی زمانِ مجرد کے ہیں جس میں آئندہ واقعات کے کھلے امکانات پہلے سے موجود ہوتے ہیں لیکن ان کے اوقات وقوع اور تفصیلات مقرر نہیں ہوتیں۔ لہٰذا جہاں تک خودی کی استقبالی کارکردگی کے امکانات کا تعلق ہے وہ متعین نہیں کرتی لیکن ان امکانات میں سے کسی ایک امکان کو اپنی کارکردگی کے لیے منتخب کرنا اور اس پر عمل پیرا ہونا یہ خودی کے اختیار میں ہے۔ اور وہ اس سلسلے میں کلیتاً آزاد اور خود مختار ہے۔

اقبال کے نزدیک لافانیت خودی کا موروثی حق نہیں ہے البتہ اپنے عمل سے وہ لافانیت حاصل کر سکتی ہے۔ لیکچرز میں وہ کہتے ہیں ...

"ذاتی لافانیت ہمارا موروثی حق نہیں ہے۔ انسان فقط امیدوار کہا جا سکتا ہے اور اس کو لافانیت اپنے عمل سے حاصل کرنی ہوگی۔ اگر خودی نے اپنے آپ کو اپنے عمل سے مستحکم اور آئندہ زندگی کے لیے منضبط کر لیا ہے۔ تو جسم کی تخریب کا اس پر اثر نہیں ہوتا۔ اور موت کا طوفان اس کی کشتی کو غرقاب نہیں کر سکتا۔"

اقبال کا عقیدہ ہے کہ موت انقطاع سلسلۂ حیات کا نام نہیں۔ بلکہ وہ تو استحکامِ خودی کا امتحان ہے۔ لیکچروں میں وہ کہتے ہیں۔ "زندگی خودی کو عمل کا موقع بہم پہونچاتی ہے۔ اور موت خودی کی امتزاجی عملیت کا امتحان ہوتی ہے۔" اگر موت کا جھٹکا خودی کا خاتمہ نہیں کر دیتا تو وہ خاکی جسم چھوڑنے کے بعد عالمِ برزخ میں پہونچکر حقیقت کے نئے پہلوؤں کا مشاہدہ کرتی ہے۔ اور اپنے آپ کو ان نئے حالات کے مطابق بنانے کی تیاری کرتی ہے۔ خودی کو اپنی جد و جہد اس وقت تک جاری رکھنی ہوگی۔ جب تک وہ اپنی رستخیز حاصل نہیں کر لیتی۔ رستخیز کوئی خارجی عمل نہیں، وہ تو خودی کا زندگی کے اعمال کا جائزہ ہے۔ رستخیز انفرادی ہو یا اجتماعی اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں ہوگی کہ خودی اپنے سابقہ حاصلات اور آئندہ امکانات کا جائزہ لے۔ "آزادی خودی کا یہ عمل ایک نئی صورتِ حال پیدا کر کے تخلیقی انکشاف کے نئے امکانات پیدا کرتا رہے گا۔"

جسدِ خاکی چھوڑنے کے بعد خودی کی جسمانی ساخت کیا ہوگی؟ اس کا جواب دیتے ہوئے اقبال کہتے ہیں: "اس کائنات کی فطرت ایسی ہے کہ انسانی جسم کی تباہی کے بعد خودی کے لئے کوئی جامہ مہیا کر دے جس کی وساطت سے وہ اپنی کارکردگی کا سلسلہ جاری رکھ سکے البتہ یہ بتانا مشکل ہے کہ اس جامہ کی نوعیت اور ہیئت کیا ہوگی۔ بہر نوع انسان کی گذشتہ تاریخ اور ارتقاءِ حیات کی مختلف منزلوں کو دیکھتے ہوئے یہ بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کہ جسم کی تباہی کے بعد خودی کا تخلیقی عمل بھی ختم ہو جائے۔" ہاں اتنا ضرور ہے کہ خودی دوبارہ اس دنیا میں نہیں آئے گی۔

کیا محدود خودی اور انتہائی خودی ایک دوسرے سے قطعی الگ تھلگ رہ سکتی ہیں، کیا محدود خودی انتہائی خودی کے روبرو اپنی شخصیت کو برقرار رکھ سکتی ہے؟ اقبال کے خیال میں یہ سوالات لامحدودیت کے غلط تصور سے پیدا ہوتے ہیں۔ لامحدودیت کے معنی لامحدود وسعت نہیں، ایسی لامحدودیت کا تصور تمام محدود حد بندیوں کو سمارے کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ انتہائی خودی کی لامحدودیت خارجی نہیں داخلی ہے۔ اس کا دار و مدار مکانی وسعت پر نہیں، تخلیقی امکانات پر ہے۔ نیز محدود خودی خارجی چیز نہیں بلکہ داخلی قوت کا نام ہے۔ جب ہم اس لحاظ سے سوچتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ محدود خودی اگرچہ جداگانہ نہیں ہے پھر بھی ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ خارجی وسعت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ زمانی مکانی نظام میں جذب نظر آئے گی۔ داخلی وسعت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ اس شے کی مدمقابل محسوس ہوگی جس پر اس کی حیات و بقا کا دار و مدار ہے۔ گویا وہ اس سے الگ بھی ہے اور گہرا تعلق بھی رکھتی ہے۔ اسرارِ خودی کے انگریزی ترجمے کے سلسلے میں اقبال نے ڈاکٹر نکلسن کو جو خط لکھا تھا اس میں کہتے ہیں "جو خدا سے قریب ترین نقطہ پر پہونچ جاتا ہے وہی مکمل ترین شخص ہے۔ وہ بالآخر خدا کی ذات میں جذب نہیں ہو جاتا بلکہ تسخیرِ کائنات کے ذریعے خدا کو بھی اپنی خودی میں جذب کر لیتا ہے۔" گلشنِ راز جدید میں کہتے ہیں ؎

بحرش گم شدن انجام ما نیست
اگر او را تو در گیری فنا نیست

اقبال کے خیال میں انسانی خودی لامحدودیت کے لحاظ سے بحیثیت حیاتی وحدت ابھی نامکمل ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ خود مرکوز، مربوط، متناسب اور یکتا وحدت بننے کی متمنی ہے۔ اسے کامل وحدت بننے کے لئے ابھی بہت سے ماحولوں سے گزرنا ہوگا۔ اپنی زندگی کی موجودہ منزل پر یہ اس کے لئے مشکل ہے کہ وہ کشاکش کی حالت کو مستقل طور پر اور بغیر سستائے برقرار رکھ سکے۔ موجودہ شکل میں تو خفیف سے خفیف اشتغال بھی اس کی وحدت کو توڑ کر اس کی قوت انتظامیہ کو زائل کر سکتا ہے۔

اقبال کے خیال میں انسانی خودی کو اس وجہ سے حقیر نہ سمجھنا چاہیے کہ اس کی تخلیق اسفل درجے کی خودی سے ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں "کسی چیز کی اہمیت کا اندازہ اس کی اصل سے نہیں لگانا چاہیے اس کا دار و مدار حقیقت چیز کی ذاتی صلاحیت، اہمیت اور رسائی پر ہوتا ہے"۔

انسانی خودی حیات اشیاء میں افضل ترین درجہ رکھتا ہے اپنے آپ کو مخالف ماحول میں پاتا ہے جہاں مزاحم قوتیں اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں جب گرد و پیش کے حالات ناسازگار ہوتے ہیں تو وہ ان کو اپنی ضروریات اور خواہشات کے مطابق بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب وہ اس پر حملہ آور ہوتی ہیں تو وہ اپنے اندر سمٹ کر خوشی اور امید کے داخلی ذرائع پیدا کر لیتا ہے۔ باوجود اس کے کہ وہ کمزور ہے اور اس کا تمام متعلق اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کائنات کی کوئی چیز اس سے زیادہ دلکش، طاقت ور اور حوصلہ افزا نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ اس کی کارکردگی کی ابتدا ہے لیکن "اس کائنات کے وجود میں ایک مستقل عنصر بننا اس کا حصہ ہے وہ اپنی اصلیت کے لحاظ سے ایک تخلیقی عمل ہے، ایک ترقی پذیر جذبہ جو اپنے سفر میں یکے بعد دیگرے منزلیں طے کرتا رہتا ہے" (انگریزی لکچر صد[؟]) یہ انسان ہی کا حصہ ہے کہ وہ گرد و پیش کی کائنات کی خواہشات میں شریک ہو کبھی اپنے آپ کو قوائے فطرت کے مطابق بدلتے ہوئے اور کبھی فطری قوتوں کو اپنے اغراض و مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہوئے اپنی اور اس کائنات کی تقدیر بنائے۔ اس ترقی پذیر تعمیری عمل میں خود خدا انسان کا شریک کار ہو جاتا ہے بشرطیکہ وہ پہل کرے۔ اگر وہ پہل نہیں کرتا، اگر وہ اپنی داخلی دولت کو بڑھانے کی ضرورت محسوس پیدا نہیں کرتا، ———————————

——————— اگر وہ زندگی کے رواں دواں دھارے کی رفتار محسوس نہیں کرتا تو اس کی خودی مضمحل ہونی شروع ہو جاتی ہے اور وہ بے حس مادہ بن کر رہ جاتا ہے۔

زندگی کے رواں دواں دھارے کی رفتار محسوس کرنے، ہر گھڑی بدلتے ہوئے حالات کو سمجھنے، اور ان سے پیدا ہونے والی مزاحمت پر قابو پانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان اپنے گرد و پیش کی حقیقت سے تعلقات پیدا کرے۔ اقبال کے خیال میں یہ تعلقات علم کے ذریعے پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ علم تین ذریعوں سے حاصل ہوتا ہے۔ مشاہدہ، فکر اور وجد۔

مشاہدے کی تلقین کرتے ہوئے گلشن راز جدید میں کہتے ہیں ؎

جہان رنگ و بو گلدستۂ ما
ز ما آزاد و ہم وابستۂ ما
دل ما را با او پوشیدہ راہی ست
کہ ہر موجود ممنون نگاہی ست
گر او را کس نہ بیند زار گردد
اگر بینیم او را یار گردد
حدیث ناظر و منظور رازی ست
دل ہر ذرہ در عرض نیازی ست
تو ہم از صحبتش یاری طلب کن
نگہ را از خم پیچش ادب کن
بیاری ہائے او زنبور خیبر گیر
تو جبریل امینی بال و پر گیر
بہ آبیاری کشت چشم تر دار
کہ دریابی تماشائے ثمر را

مشاہدہ پر زور دیتے ہوئے اقبال کہتے ہیں "ایشیا بلکہ تمام قدیم دنیا کی تہذیب محض اس لئے زوال پذیر ہوئی کہ اس نے خارجی دنیا کو نظر انداز کیا اور حقیقت کو محض داخلی طور پر سمجھنے کی کوشش کی۔ اس طریقے سے نظریے تو پیدا ہو گئے لیکن اقتدار حاصل نہ ہو سکا اور محض نظریات کی بنیادوں پر پائیدار معاشرے نہیں وجود میں آ سکتے"۔

فکر کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں "یہ کہنا درست نہیں کہ چونکہ

(باقی صفحہ ۵۴ پر)

اقبالؒ کا نظریۂ انسانِ کامل

ابوسعید نورالدین

انسانِ کامل ایک صوفیانہ نظریہ ہے، جس کی بنیاد "وحدت الوجود" ہے۔ صوفیا کا عقیدہ ہے کہ انسان کی روح ربانی ہے۔ انسان اسی دنیا کے آب و گل میں رہ کر پیہم مجاہدہ اور ریاضت کے ذریعہ سے ذاتِ خداوندی سے اتحاد و اتصال پیدا کرسکتا ہے۔ یا صوفیانہ اصطلاح میں "مجاہدہ" سے "مکاشفہ" تک پہنچ سکتا ہے۔ یہاں پہنچ کر وہ "انسانِ کامل" کا مرتبہ حاصل کرلیتا ہے، وہ دنیا میں خدا کا نائب اور دنیا کا محافظ ہوتا ہے۔ اس کے وجود سے خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے، اس لئے اس کو دنیا کا قطب بھی کہا جاتا ہے۔

اس نظریہ کی بنیادیں تو تیسری صدی ہجری میں بایزید بسطامیؒ اور منصور حلاجؒ کے ذریعہ ہی سے پڑ گئی تھی اور "سُبْحَانِیْ مَا اَعْظَمُ شَانِیْ" اور "اَنَا الْحَق" کہہ کر انہوں نے اس امر کا ثبوت پیش کر دیا تھا کہ انسان بھی روحانی طور سے خدا سے اتحاد و اتصال پیدا کرکے انجام کار اس اعلیٰ مرتبہ تک پہنچ سکتا ہے، جہاں اس کی رضا خداوند تعالیٰ کی رضا بن جاتی ہے، لیکن تاریخ تصوفِ اسلام میں انسانِ کامل کی اصطلاح کو سب سے پہلے ساتویں صدی ہجری میں شیخ محی الدین ابن عربیؒ نے اپنی کتاب "فصوص الحکم" میں استعمال کیا ہے۔ .... اور بعد میں نویں صدی ہجری میں عبدالکریم الجیلیؒ نے اس پر مستقل طور پر بحث کی، اور "انسانِ کامل" کے نام سے ایک بسوط کتاب تصنیف کی۔

حدیثِ قدسی میں آیا ہے: لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ۔ دوسری ایک حدیث شریف میں آیا ہے: اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ۔ ان احادیث کی رو سے ابن عربیؒ کے نزدیک تخلیقِ کائنات کی علت حقیقتِ محمدیہ ہے۔ جس طرح جملہ کائنات میں انسان اشرف اور اکمل مخلوق ہے۔ اسی طرح آپ جملہ افرادِ انسانی میں اشرف اور اکمل ہیں۔ آپ ہی دراصل انسانِ کامل ہیں۔ دوسروں کو یہ شرف آپ ہی کے فیض اور برکت سے حاصل ہوتا ہے۔ انسانِ کامل حقیقت کا مظہر ہے۔ وہ کائنات کا ایک ایسا خلاصہ ہے جس کی ذات میں خدا کی صفات کاملہ منعکس ہوتی ہیں، اور جس طرح حقیقتِ محمدیہ کائنات کی تخلیقی حقیقت ہے، اسی طرح انسان کامل بھی تخلیقِ کائنات کی علت ہے۔ چنانچہ ایک حدیثِ قدسی میں آیا ہے: کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیاً، فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ، فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ۔ ابن عربیؒ کہتے ہیں: "چوں کہ صرف انسانِ کامل ہی حقیقی معنوں میں خدا کو پہچانتا اور محبوب رکھتا ہے، اس لئے انسانِ کامل ہی دراصل تخلیقِ کائنات کی علت ہے۔"

صوفیائے کبار کی طرح اقبالؒ نے بھی دنیا کے سامنے "انسانِ کامل" کا نظریہ پیش کیا ہے۔ لیکن چونکہ انہوں نے "وحدت الوجود" کی مخالفت کی ہے اور اس کے برعکس نظریۂ "خودی" کو پیش کیا ہے، اس لئے "انسانِ کامل" کے نظریہ میں بھی انہوں نے اس قدیم نظریہ سے اختلاف کیا ہے۔ یعنی ان کے نظریۂ "انسانِ کامل" کی بنیاد دیگر صوفیائے کبار کی طرح "وحدت الوجود" نہیں بلکہ "خودی" اور محض "خودی" پر ہے۔

دیگر صوفیا نے جہاں "وحدت الوجود" کی رو سے انسان کا ذاتِ خداوندی سے اتحاد اور اتصال پیدا کرکے "انسانِ کامل" کا نظریہ پیش کیا، وہاں اقبالؒ نے انسان کی ہستی کو خدا کی ہستی سے الگ قائم کیا۔ اس کو عشق و محبت سے مستحکم کرکے "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہ" کی رو سے صفاتِ الٰہیہ سے متصف کرنے کی تلقین کی، اور انسانی "خودی" کو ایک خاص لائحۂ عمل کے ماتحت تربیت دے کر "انسانِ کامل" کا نظریہ پیش کیا۔ اس سلسلہ میں اگرچہ دونوں کی منزلِ مقصود ایک ہی ہے لیکن اس منزل تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں۔ صوفیا اپنی ذات کو ذاتِ باری تعالیٰ میں فنا کرکے اس منزل تک پہنچتے ہیں، اور علامہ اقبال اپنی ذات کو ذاتِ باری تعالیٰ سے الگ قائم کرکے اس منزل تک پہنچتے ہیں۔

چونکہ اقبال کے نظریۂ "انسانِ کامل" کی تمام تر بنیاد "خودی" پر ہے، اس لئے یہ بتانا لازم ہے کہ انسانِ کامل تک اُن کی روحانی ارتقا کا طریقہ کیا ہے۔ انہوں نے اس بات کو "اسرارِ خودی" میں منظم طریقے سے پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک خودی کی تربیت کے مندرجۂ ذیل تین مراحل ہیں:۔

۱۔ اطاعت: اطاعت سے مقصود اللہ، اس کے رسولؐ اور

احکامِ الٰہی کی اطاعت ہے۔ تربیتِ خودی میں اطاعت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اطاعت نہ ہو، تو انسان کسی حالت میں کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ اس لئے اقبال نے اطاعت کو تربیتِ خودی کا اوّلیں مرحلہ قرار دیا ہے۔ اطاعت کا صحیح نمونہ دیکھنے کے لئے وہ اونٹ کی مثال پیش کرتے ہیں۔ یہ جانور اپنی طبع میں مطیع، فرمانبردار اور محنت شعار ہوتا ہے۔ شتربان اُسے جدھر چلاتا ہے، بے چون و چرا، صبر و استقلال کے ساتھ اطاعت کرتا ہے۔ انسان کو بھی چاہئے کہ اسی طرح خدا، اس کے رسولؐ اور احکامِ الٰہی کی اطاعت کرے۔ اسلئے کہ اطاعت اور فرماں پذیری ہی سے وہ کمال کے درجہ تک پہنچ سکتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

توہم از بارِ فرائض سر متاب   برخوری از عِندَہٗ حُسنُ المآب

دراطاعت کوش اے غفلت شعار   می شود از جبر پیدا اختیار

ناکس از فرماں پذیری کس شود   آتش ار باشد ز طغیاں خس شود

اور اس لئے آئینِ محمدیؐ کی پابندی کی تلقین کرتے ہیں:

شکوہ سنجِ سختیِ آئیں مشو   از حدودِ مصطفیٰؐ بیروں مرو

ضبطِ نفس: اس مرحلہ میں وہ اسلام کے ارکانِ خمسہ کی پابندی کو لازمی قرار دے کر ان کے مقاصد اور فوائد بیان کرتے ہیں۔ اسلام کے ارکانِ خمسہ یہ ہیں: (۱) کلمۂ توحید (۲) نماز (۳) روزہ (۴) حج (۵) زکوٰۃ۔

ضبطِ نفس کا پہلا رکن کلمۂ توحید ہے۔ جب تک انسان اس پر ایمان نہ لائے، اس کا نفس ہمیشہ ترساں و لرزاں رہتا ہے، لیکن جو شخص کلمۂ توحید پر ایمان لے آئے، اس کا نفس ہر قسم کے وسوسوں سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ اس وقت وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا خالق و مالک سمجھتا ہے اور دل میں اسی کا خوف رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

تا عصائے لا الٰہ داری بدست   ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست

خوف را در سینۂ اُو راہ نیست   خاطرش مرعوبِ غیر اللہ نیست

انسان کو فطری طور پر اپنے اعزّہ سے محبت ہوتی ہے، اور ان کی محبت بعض اوقات ایسی شدید صورت اختیار کر لیتی ہے کہ وہ فرائضِ دینی کی انجام دہی سے بھی غافل ہو جاتا ہے، لیکن کلمۂ توحید پر جو شخص ایمان رکھتا ہے، وہ "بندِ زن و فرزند سے فارغ" ہو جاتا ہے۔

ہر کہ در اقلیمِ لا آباد شد   فارغ از بندِ زن و اولاد شد

می کند از ما سوا قطعِ نظر   می نہد ساطور بر حلقِ پسر

ضبطِ نفس کا دوسرا رکن نماز ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے: اِنَّ الصَّلوٰۃَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ ط اس آیت کی رو سے نماز ضبطِ نفس کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے کہ نفس ہمیشہ بُرے کاموں کا حکم دیا کرتا ہے، اور نماز اس سے باز رکھتی ہے۔ نماز کی اسی فضیلت کی بنا پر اس کو حجِ اصغر کہا گیا ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں:۔

لا الٰہ باشد صدف، گوہر نماز   قلبِ مسلم را حجِ اصغر نماز

در کفِ مسلم مثالِ خنجر است   قاتلِ فحشا و بغی و منکر است

ضبطِ نفس کا تیسرا رکن روزہ ہے۔ روزہ سے نفس کو فطری طور پر ضعف پہنچتا ہے، اور منہیات اور ناجائز خواہشات سے بچنے کے لئے مفید ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:۔

روزہ بر جوع و عطش شبخوں زند   خیبرِ تن پروری را بشکند

ضبطِ نفس کا چوتھا رکن حج ہے۔ وطن پرستی نفس کی خاص خواہشات میں سے ہے۔ اس کے ترک کا واحد ذریعہ حج ہے۔ یہ مسلمانوں کو ہجرت سکھاتا ہے، اور یہ ایک ایسا فریضہ ہے جس کی بدولت سال میں ایک خاص مرکز پر مسلمانوں کو یکجا جمع ہونے کا موقع ملتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:۔

مومناں را فطرت افروز است حج   ہجرت آموز و وطن سوز است حج

طاعتے سرمایۂ جمعیتے   ربطِ اوراقِ کتابِ ملتے

ضبطِ نفس کا پانچواں رکن زکوٰۃ ہے۔ حُبِّ مال و حُبِّ دولت نفسانی خواہشات کا تقاضا ہے۔ اس سلسلہ میں ضبطِ نفس کا واحد طریقہ زکوٰۃ ہے۔ اس کے علاوہ زکوٰۃ سے اُخوّت و مساوات کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے اور مال میں برکت بھی ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

حُبِّ دولت را فنا سازد زکوٰۃ   ہم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ

دل ز حَتّٰی تُنْفِقُوْا محکم کند   زر فزاید، الفتِ زر کم کند

الغرض یہ ہیں اسلام کے ارکانِ خمسہ، جن پر انسان کاربند ہو کر ضبطِ نفس، یعنی حصولِ کمال کا دوسرا مرحلہ طے کر سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

ایں ہمہ اسبابِ استحکامِ تست   پختہ، محکم اگر اسلام تست

نیابتِ الٰہی:۔ اس مرحلے پر پہنچنے کے بعد انسان خَلِیْفَةُ اللّٰہِ فِی الْاَرْضِ ہونے کا مستحق ہو جاتا ہے، اور اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً کی صداقت کا صحیح معنی میں احساس کر سکتا ہے۔ جو شخص نیابتِ الٰہی اور خَلِیْفَةُ اللّٰہِ فِی الْاَرْضِ ہونے کا مستحق ٹھہرتا ہے، وہی انسانِ کامل ہے۔ انسانِ کامل کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ یہ انسان کے روحانی ارتقا کا خلاصہ ہے۔ "حیات" یا "خودی" مدتوں تک مسلسل رو بہ ترقی رہتی ہے۔ تو کہیں جا کر

ایک انسان کامل ہوتا ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں:۔

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات   تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

اس "دانائے راز" کا ظہور حقیقتِ محمدیہ کی صورت میں ہو چکا ہے۔ آپ ہی "دانائے راز" اور "انسانِ کامل" ہیں۔ اقبال کہتے ہیں:۔

شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت   تا چراغِ یک محمد بر فروخت

لیکن آپ خاتم الانبیا ہیں۔ آپ کے بعد اور کوئی نبی نہیں ہوگا۔ اس لئے اقبال بھی صوفیا کی طرح ایک دوسرے انسانِ کامل کے قائل ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ پروفیسر نکلسن کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ "انسانِ کامل کے بغیر دنیا میں امن و امان قائم نہیں ہو سکتا۔ لیگیں، پنچایتیں اس مقصد کے لئے قطعی ناکافی ہیں۔ آئے دن اس قسم کی لیگیں اور پنچایتیں برابر ناکام ثابت ہو رہی ہیں"۔

انسانِ کامل کی پیدائش سے قبل انسانیت کے جسمانی و روحانی حیثیتوں سے مدارج ارتقا کا طے کرنا ضروری ہے۔ وہ ابھی ہمارے لئے ایک نصب العین ہے۔ اس زمانہ میں خارج میں اس کا کہیں وجود نہیں۔ البتہ انسانیت کے تدریجی ارتقاء سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل میں ایک ایسی قوم پیدا ہوگی، جس کے افراد کم و بیش ایسے ہوں گے کہ وہ انسانِ کامل ان ہی میں پیدا ہوگا۔ چنانچہ وہ اس کے ظہور کے شدت سے متمنی ہوتے ہیں:۔

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا   اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو   در سواد دیدہ ہا آباد شو
شورشِ اقوام را خاموش کن   نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن
باز در عالم بیار ایامِ صلح   جنگجویاں را بدہ پیغامِ صلح

قرآن مجید میں آیا ہے "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ"۔ اس کی رو سے انسان آنحضرت صلعم کی ذات بابرکت کو نمونہ قرار دے کر انسانِ کامل بننے کی کوشش کر سکتا ہے۔ اقبال کے عقیدے کے مطابق انسان کے اندر نائبِ الٰہی بننے کی صلاحیت بدستور موجود ہے۔ اس کی دلیل خدا کا قول:۔ "اِنِّي جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيفَةً" ہے:

انسانِ کامل دنیا میں خدا کا حقیقی حکمراں ہوگا۔ وہ اپنی فطرت کے خزانہ سے دوسروں کو دولتِ حیات بخشے گا۔ انسان ارتقا کے مدارج جس قدر طے کرتا جائے گا، اسی قدر وہ اس سے قریب ہوتا جائے گا، اور جس قدر اس کی طرف بڑھتا جائے گا، اسی قدر وہ کمال کے درجہ تک پہنچتا جائے گا۔

'انسانِ کامل' کامل ترین خودی ہے۔ انسانیت کے ارتقائی مدارج میں جس قدر مشکلیں اور صعوبتیں پیش آئیں، وہ صرف اسی نصب العین کے حصول کی خاطر گوارا ہو سکتی ہیں۔ انسانِ کامل دراصل موجودہ انسان کی جسمانی اور روحانی معراجِ کمال ہوگا۔ اس میں زندگی کی متضاد قوتیں ہم آہنگ ہو جائیں گی۔ اور اس کے اندر قوت اور علم اپنے انتہائی مدارج کے ساتھ موجود ہوگا۔ وہ انسانِ کامل تمام کائنات پر حاوی ہوگا۔ اقبال کے الفاظ میں ع

مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

مولانا رومیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق مثنوی میں آنحضرت صلعم کی حیاتِ طیبہ کا ایک واقعہ نہایت دلپذیر پیرایہ میں بیان کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ انسانِ کامل کائنات میں گم نہیں ہو سکتا، بلکہ خود کائنات اس کے اندر گم ہو جاتی ہے۔ آنحضرت صلعم کی رضاعی ماں حلیمہ سعدیہؓ ایک دن آپ کے ایامِ طفولیت میں آپ کو لئے بازار کی طرف گئی ہوئی تھیں، یکایک آپ گم ہو گئے۔ وہ آپ کو نہ پاکر بہت پریشان ہوئیں اور آپ کی تلاش میں ادھر اُدھر دوڑیں، لیکن غیب سے ہاتفِ غیبی کی ندا آئی:۔

غم مخور یاوہ نگردد او ز تو
بلکہ عالم یاوہ گردد اندرو

اقبال کہتے ہیں کہ میں انسانِ کامل کے متعلق اس سے بڑھ کر کہتا ہوں:۔

در رہ ایشاں مرا هم سخن تمام شود   ایں سخن گے باور مردم شود

انسانِ کامل کے اندر وہ قوت موجود ہے جس کی رو سے وہ نہ صرف کائنات کو اپنے اندر جذب کرتا ہے، بلکہ خود خدا کو بھی اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں:۔

مسلم استی، دل باقلیمے مبند   گم مشو اندر جہانِ چون و چند
می نگنجد مسلم اندر مرز و بوم   در دلِ او یاوہ گردد شام و روم
دل بدست آور کہ در پہنائے دل   می شود گم ایں سرائے آب و گل

انسانِ کامل کی ہمہ گیر فطرت کے متعلق انہوں نے "مردِ مسلمان" کے عنوان سے "ضربِ کلیم" میں ایک پُر زور نظم لکھی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن   گفتار میں، کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت   یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

وغیرہ وغیرہ

اس سلسلہ میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اقبال اپنے کلام میں عموماً انسانِ کامل کے لئے مختلف اصطلاحات استعمال کرتے ہیں جیسے مردِ مومن، مردِ مسلمان، مردِ خدا، مردِ حق، مردِ حُر، مردِ آزاد، مومن، مومنِ جانباز، مردِ کامل، قلندر، فقیر وغیرہ۔ ان سب کا مفہوم ان کے نزدیک ایک ہی ہے، یعنی انسانِ کامل:

خمستانِ فرنگ

قیوم نظر

ہالینڈ کے مترجم ادیبوں سے ملاقات کے ذکر کے سلسلے میں مجھے سب سے پہلے برٹ وڈن اور جیمز ہومز کا خیال آتا ہے۔ یہ دونوں شاعر ہیں اور اپنی اپنی زبان میں اچھے شعر کہتے ہیں۔ مگر اب یہ دونوں خود شعر لکھنے کی بجائے دوسرے شعرا کے اشعار کو مختلف زبانوں کا جامہ پہناتے ہیں اور اس طرح زبانوں کے بُعد کو مٹاتے اور ایک زبان کے خیال کو دوسری زبان بولنے والوں تک پہنچاتے ہیں۔ برٹ وڈن ڈچ شاعر ہے مگر انگریزی، فرانسیسی اور جرمنی زبانوں پر بھی اتنی قدرت رکھتا ہے کہ ان کی نظموں کو نہایت سلیقے سے ڈچ زبان میں ڈھال لیتا ہے۔ جیمز ہومز امریکن ہے اور انگریزی کا شاعر ہے۔ وہ آج سے پانچ برس پہلے ہالینڈ کی تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے سلسلے میں ایمسٹرڈم پہنچا اور اب تک ایمسٹرڈم ہی میں مقیم ہے۔ اس اثنا میں اس نے ڈچ زبان میں اتنی مہارت پیدا کر لی ہے کہ وہ اب ڈچ شعرا کی نظموں کو بلا تکلف انگریزی کا جامہ پہنا دیتا ہے۔

ایمسٹرڈم میں پروفیسر ڈاکٹر وان ہوودن سے میری ملاقات ایمسٹل ہوٹل میں ہوئی تھی جہاں ہالینڈ کی پی ای این کلب نے میرے اعزاز میں اپنے ملک کے ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور دوسرے [illegible] وغیرہ کو مدعو کیا تھا۔ اس محفل میں اتنے لوگوں کا ہجوم تھا کہ میرے لئے ہر ایک کو جاننا مشکل ہو رہا تھا۔ چنانچہ میں اپنے لیکچر وغیرہ سے فارغ ہو کر حاضرین سے رخصت ہو رہا تھا کہ پروفیسر وان ہوودن نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھ سے ایک تفصیلی ملاقات کی خواہش ظاہر کی کیونکہ اپنے ملک میں بیلے (BALLET) اور اوپیرا کا ذکر جس انداز سے میں نے اپنی گفتگو میں کیا تھا اس سے ان کی دلچسپی ان دونوں چیزوں اور مجھ میں بہت بڑھ گئی تھی۔ آخر میں نے اسے اپنی فراغت کا دن بتایا تھا اور اس کے ساتھ ایک مفصل اور تفصیلی ملاقات کا پروگرام بنایا تھا۔ اس پروگرام کے مطابق میں آج اس کے قبضے میں تھا۔

دراصل میں آج دوپہر ہی کو ہیگ سے ایمسٹرڈم آگیا تھا۔ اور پروفیسر ہوودن کے ساتھ کھانا کھانے اور اس سے تفصیلی گفتگو کرنے کے بعد جب میں روئلڈ ہولسٹ سے جو ایمسٹرڈم سے کافی دور ایک گاؤں میں رہتا ہے ملنے کے بارے میں سوچ رہا تھا تو ڈاکٹر وان ہوودن مجھے جیمز ہومز کے مکان پر لے گیا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ہولسٹ کے ملنے سے پہلے اگر میں جیمز ہومز کو مل لوں تو بہت مفید رہے گا۔ ڈاکٹر کی کار پر بیٹھ کر جب میں ہومز کے مکان پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ سارا مکان ایک ہی کمرے میں ہوتا ہے۔ کمرے پر نگاہ ڈالی تو آمنے سامنے کی دو دیواروں کے ساتھ لگی ہوئی الماریوں میں ڈچ شعرا کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک دیوار میں روشنی کے لئے کھڑکیاں اور دوسری دیوار میں ہاتھ منہ دھونے کا برتن اور نل وغیرہ لگا ہوا تھا۔ ایک پلنگ تھا جس پر گرم بستر بچھا تھا۔ پلنگ کے سامنے ایک چھوٹی میز اور دو کرسیاں دھری تھیں۔ پرے کونے میں چھوٹی سی تپائی پر ایک گملا رکھا تھا۔ جس میں نہ جانے کونسی بیل لگی تھی۔ یہ سب کچھ ایک ہی کمرے میں موجود ہونے کے باعث گمان ہو سکتا تھا کہ ہر چیز بے ترتیبی سے بکھری ہوئی ہوگی۔ مگر ایسا نہ تھا اور یہ یقیناً اس کمرے میں رہنے والے کی خوش سلیقگی پر دلالت کرتا تھا۔

جیمز ہومز نے اپنے کمرے کی چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معذرت چاہی اور ہمیں بستر پر ہی بیٹھ جانے کے لئے کہا۔ دراصل پروفیسر وان ہوودن نے مجھے یہاں لاتے ہوئے راستے میں بتایا تھا کہ جیمز ہومز نے تفصیل سے جدید ڈچ شعرا کا مطالعہ کیا ہے اور ان کی شاعری کے متعلق جس قدر نشستوں میں حصہ لیا ہے اس کے پیش نظر میرا اس سے ملنا بے حد مفید ہو سکتا تھا۔

جیمز ہومز نے جدید ڈچ شعرا میں میری دلچسپی کے پیش نظر مجھے ان کی ایسی نظموں کا ایک مجموعہ دیا جنہیں اس نے انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ میں نے مجموعے کی ورق گردانی کرتے ہوئے اس سے دریافت کیا کہ ان شعرا نے کونسی ایسی نئی بات پیدا کی تھی جس کے پیش نظر ان کو اس قابل گردانا گیا کہ ان کی نظموں کو خاص طور پر مجموعے کی صورت میں شائع کیا جائے۔ ہومز کا خیال تھا کہ جدید ڈچ شاعری بالعموم اعلیٰ پایہ کی نہیں ہے۔ مگر یہ ایک ایسا دور ہے جس میں تمام دنیا کی شاعری پر زوال آیا ہوا ہے۔ اس لئے اس خیال کے پیش نظر کہ چونکہ ڈچ شاعری بہت اچھی نہیں اس لئے اسے دوسری زبانوں کے مقابلے میں پیش ہی نہ کیا جانے بجا نہیں۔ ویسے جدید ڈچ شعرا نے بھی

دوسری زبانوں کے شعرا کی طرح ہیئت میں ایسی تبدیلیاں اور موضوع میں ایسا نیا پن لانے کی کوشش کی ہے جو بار آور ہونے پر اچھے نتائج پیدا کر سکے گی۔ دراصل یہ دور تجرباتی ہے بعض جدید شعرا اس دور میں یقیناً نہیں ابھر سکتے کیونکہ ان کے تجربات اتنے ذاتی اور محدود ہیں کہ ان کے زندہ رہنے کی کوئی صورت ہی نہیں۔ تاہم جدید ڈچ شعرا میں ایک دو شاعر ایسے بھی مل سکتے ہیں جن سے مستقبل میں کچھ امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

میرے اس سوال کے جواب میں کہ جدید ڈچ شعرا نے ہیئت میں کیا ضروری تبدیلیاں کی ہیں، جیمز ہومز نے بتایا کہ کلاسیکل ڈچ شاعری میں قافیے کے بغیر شعر کا تصور ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کا وزن کا کینڈا بھی یونانی شاعری کے ڈھب پر تھا۔ جدید ڈچ شعرا یہ باتیں محض نئے پن کے لئے روا رکھتے ہیں، اسی لئے ان کا کوئی مستقبل نہیں۔ مگر جدید ڈچ شاعری میں بسا اوقات کوئی بات ایسے ڈھب سے بھی آن پڑتی ہے کہ کلاسیکی شاعری کے تمام بندھنوں کو توڑنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ مقام بہت نازک ہے۔ کم ظرف دھوکا کھاتا اور بہک جاتا ہے۔ اسی لئے بہت سی آزاد نظمیں ناکام رہتی ہیں۔ مگر جب کہیں یہ چیز فکر کی پختگی اور کاریگری کی صناعی کے طفیل ابھرتی اور نکھرتی ہے تو لاجواب ہوتی ہے۔ ایسی نظموں کی تعداد اگرچہ کم ہے مگر ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جدید ڈچ شعرا میں اختر برج نے اپنی ابتدائی نظموں میں اسی بغاوت کا اظہار کیا تھا۔ شاید اس کو رستے کی دشوار گذاری کا احساس جلد ہی ہو گیا تھا چنانچہ اپنی بعد کی نظموں میں وہ کلاسیکی ہیئت کی طرف پھر لوٹ آیا اور اس کی بعض اچھی نظمیں اسی کلاسیکی سانچے میں ہیں۔ مگر اختر برج کا معاملہ کچھ الگ سا ہے۔ وہ جدید شعرا کی صنف میں شمار تو ہوتا ہے۔ مگر اس کا موضوع تمام تر رومانی ہے۔ وہ بیشتر حسن و عشق ہی کی بات کرتا ہے اور پھر اپنی بات کو گھما کر ایک ہی مرکز پہ لے جاتا ہے۔ اس نے اپنی محبوبہ کو مار ڈالا تھا اور پھر شاید احساس گناہ نے اسے دیوانہ کر دیا تھا۔ اپنی دیوانگی کے طفیل وہ کچھ عرصہ پاگل خانے میں بھی رہا تھا بالآخر اس کو ایک نرس کی نگرانی میں دیا گیا تھا یہی نرس آجکل اس کی بیوی ہے مگر یہ تو ایک مختلف کہانی ہے۔

ہومز نے گفتگو کے دوران میں میں نے دو ایک بار ہولسٹ کا ذکر کیا تو اس نے کچھ اس بے اعتنائی سے اس کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی شاعری میں زیادہ جان نہ دیکھتا تھا اور اسے شاید جدید شاعروں میں شامل کرنا بھی زیادتی شمار کرتا تھا۔ صرف یہی نہیں اب مجھے ڈاکٹر وان ہوورن کی اس بات کا مطلب بھی سمجھ میں آ رہا تھا کہ کیوں یہ چاہتا تھا کہ میں ہولسٹ سے ملنے سے پہلے ہومز سے ضرور ملاقات کر لوں۔ میرا اندازہ ہے کہ ہومز شاید ہولسٹ کے اس فلسفۂ زندگی کو سراہ ہی نہ سکتا تھا جو اسے مادیت سے دور کسی اور سرزمین میں لے گیا تھا اور جس کے کارن ہولسٹ نے نہ صرف تجرد کی زندگی کو اختیار کیا تھا بلکہ آکسفورڈ کا فارغ التحصیل ہونے اور ایک کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ ہونے کے باوصف وہ درویشی کے دامن کو تھامے ہوئے بے نیازی کی وادیوں میں نکل گیا تھا۔ دراصل جیمز ہومز اور وان ہوورن شعرا کے ایک ایسے گروہ کے مداحوں میں سے تھے جن میں اختر برج کو اہم مقام حاصل تھا۔ اگرچہ اب تک مجھ پر یہ بات بھی روشن ہو چکی تھی کہ ہالینڈ میں اس وقت دو شاعر ایسے تھے جو اپنے ہم عصر ساتھیوں کو لئے ہوئے الگ الگ کھڑے تھے لیکن تعجب اس بات پر تھا کہ ان کے مداحوں میں ایک تحدید ذہنی جذبہ کام کر رہا تھا جو ایک زمانے میں لکھنؤ میں انیسیوں میں اور دبیریوں میں تھا۔ گو ہومز اور ہوورن نے ہولسٹ کے خلاف بظاہر کچھ بھی نہ کہا تھا بلکہ رسماً اس کی تعریف بھی کی تھی لیکن دونوں جس انداز سے اختر برج کا تذکرہ کرتے، اس کی شاعری کو سراہتے اور ہولسٹ کے ذکر سے پہلو تہی کرتے ہوئے گذر جاتے تھے اس سے ان کے دل کی کیفیت زبان تک آئے بغیر واضح ہو جاتی تھی۔

جیمز ہومز کے نزدیک اختر برن ایک ایسا شاعر تھا جو دنیا کے لئے کوئی پیغام نہ رکھتا ہو یا جو دنیا کے نظام ہی کو بدلنا چاہتا ہو یا پھر حیات انسانی کی الجھنوں ہی کا کوئی حل پیش کرتا ہو۔ آج کے شاعر کے لئے ایسا کرنا ضروری بھی نہ تھا کیونکہ آج کا ڈچ شاعر تو اپنی ہی دنیا میں گم رہنا چاہتا تھا اس کی تو اپنی ہی زندگی ایسے ایسے تجربات کا مرقع تھی جن کو وہ ابھی تک خود ہی پوری طرح نہ سمجھ پایا تھا۔ دراصل یہ ناسمجھی ہی جدید ڈچ شاعری کا جوہر تھی بعض لوگوں کے نزدیک یہی بات اس کی خرابی کا باعث بھی ٹھہرتی تھی۔ پھر وان ہوورن بھی دبی زبان میں کبھی کہنے لگتا تھا "ہولسٹ اس کا دوست ہے اور وہ اس کے کوائف سے پوری طرح آگاہ بھی ہے۔ اس کی بیشتر اچھی شاعری اسی زمانے کی یادگار ہے جب اس کی عمر چالیس پینتالیس برس سے زیادہ نہ تھی اور اب تو وہ بہت ہی کم لکھتا ہے"۔ چنانچہ ہوورن کو یقین تھا کہ گذشتہ پندرہ بیس برس میں ہولسٹ نے دس نظمیں بھی تو ایسی نہ لکھی تھیں جنہیں ادب میں کوئی مقام حاصل ہو سکتا تھا۔ اور پھر اسے زیادہ نظمیں لکھنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ اس کے پاس زمین تھی، جائیداد تھی جس کے سہارے وہ آسائش کی زندگی بسر کرتا تھا۔ وقت اور زمانہ اس کے لئے کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ اس کو جنگ متاثر کرتی تھی نہ امن

وہ اب ہر بات سے بے نیاز تھا۔ شاعری سے بھی۔

اب میں نے ہولسٹ کی شاعری پر بات چیت کرنے کی بجائے مناسب خیال کیا کہ ہومر سے ترجمے کی مشکلات کا تذکرہ کیا جائے لیکن اس نے ترجمے کی دقتوں سے پہلے اپنی مشکلات کا ذکر شروع کر دیا جو زیادہ تر زبان سے متعلق تھیں۔ اگرچہ اس نے گذشتہ پانچ برس میں شبانہ روز کی محنت سے ڈچ زبان پر کسی قدر قدرت حاصل کر لی تھی مگر اس کا خیال تھا کہ زبان کی بھی بہت سی باریکیاں تھیں جن کو وہ کماحقہٗ نہ برت سکتا تھا اور بسا اوقات اس کو اس ضمن میں اپنے خاص دوستوں سے مدد بھی لینا پڑتی تھی پھر بعض ڈچ شعرا موضوع کی پیچیدگیوں کے باعث خود اپنی زبان میں بھی زیادہ نہ کھلتے تھے، اسی لئے ان کی نظموں کو ترجمہ کرتے ہوئے الجھنیں اور بھی بڑھ جاتی تھیں۔ یا پھر ایسی نظموں کو ایک تشریحی سے انداز میں ترجمہ کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی تھی جس کو وہ مناسب خیال نہ کرتا تھا۔ در آخر میں اس کے کہنے کے مطابق ہر قابلِ ذکر زبان کی طرح ڈچ زبان کا بھی اپنا ایک مزاج تھا جو انگریزی سے یقیناً مختلف تھا۔ مزاج کو پانے اور اسے سمجھنے کے لئے اس کے خیال میں زیادہ مدت درکار تھی۔ زبان دانی کی ان تمام دقتوں اور موشگافیوں کے باوجود دان ہودن کا خیال تھا کہ برٹ ووٹن ایسا ہمدرد مترجم جدید شعرا کو ملنا مشکل تھا۔ چونکہ ہودن بھی دونوں زبانوں پر قدرت رکھتا تھا اسی لئے اس کی رائے میں ہومر کے تراجم اصل کی اکثر و بیشتر خوبیاں اور رنگینیاں لئے ہوئے تھے۔ اور جدید شعرا اس ضمن میں خوش قسمت تھے کہ ان کو ایک نہایت اچھا مترجم مل گیا تھا۔

برٹ ووٹن کے ہاں میں ہورنک کی ہمراہی میں رات کے دس بجے کے لگ بھگ پہنچا تھا۔ ہومر سے فارغ ہو کر وان ہودن مجھے جماتن لے گیا تھا۔ یہ ایک ایسا اشاعتی ادارہ ہے جو ایشیائی زبانوں کی کتابوں کے ڈچ زبان میں تراجم کو شائع کرتا ہے۔ وان ہودن اس کے ڈائرکٹروں میں سے ایک ہے۔ شام کا کھانا مجھے اسی ادارے کے شعبۂ تاریخ کے مہتمم کے ہاں کھانا تھا۔ اس لئے وان ہودن چلا گیا اور ڈاکٹر کے ہمراہ اس کے گھر کھانے پر پہنچ گیا۔ وہاں پروگرام کے مطابق ہورنک پہنچ گیا جو بالآخر مجھے برٹ ووٹن سے ملانے کے لئے اس کے گھر لے گیا۔ ہورنک خاصا جسیم اور ضخیم تھا، انگریزی ذرا کم ہی جانتا تھا اور اگرچہ وہ اکیس کتابوں کا مصنف تھا جن میں سولہ اس کی نظموں کے مجموعوں پر مشتمل تھیں لیکن وہ مجھ سے کسی بحث میں نہ الجھنا چاہتا تھا اور مجھے فوری طور پر برٹ ووٹن کے مکان پر لے جانا چاہتا تھا۔ ہورنک بقول شخصے قد آور شاعر تھا مگر اپنے آپ کو جدید ڈچ شعرا کی صف میں شمار نہ کرتا تھا کیونکہ اس نے ہر قسم کے مضامین کو اپنی نظموں میں باندھا تو تھا مگر اس نے کبھی قافیہ اور وزن کے مستند اصولوں سے انحراف نہ کیا تھا۔ تاہم اس کا خیال تھا کہ جدید ڈچ شعرا کو اپنی بات اپنے انداز میں کہنے کا پورا موقع ملنا چاہیئے۔ گو اُسے یہ بھی یقین تھا کہ یہ شاعری کسی طرح پروان نہیں چڑھ سکتی۔

برٹ ووٹن کا مکان کم از کم تین کمروں پر ضرور مشتمل تھا۔ کیونکہ ایک کمرے میں اُس کے دو بچے سوئے ہوئے تھے۔ ایک کمرے میں اس کی بیوی بیٹھی کچھ سی رہی تھی۔ اور ایک کمرے میں وہ خود کرسی پر بیٹھا ہیملٹ کا ترجمہ ٹائپ کر رہا تھا۔ اُس کا قد درمیانہ، ٹھوڑی نکیلی اور عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ اس نے اب تک فرانسیسی، جرمنی اور انگریزی نظموں کے دس مجموعے ڈچ زبان میں ترجمہ کئے تھے مگر میں اس کو ان مجموعوں کے باعث ملنے کی بجائے اس لئے ملنا زیادہ اہم شمار کر رہا تھا کہ اوّل تو اُس نے اقبال کی نظموں کو ڈچ زبان میں ڈھالا تھا اور میں جاننا چاہتا تھا کہ اُس نے اقبال کے ترجمے اگر براہِ راست کئے ہیں تو اُس کو اُردو اور فارسی سے کس قدر آشنائی حاصل تھی۔ دوسرے جب پروفیسر وان ہون نے مجھے یہ کہا تھا کہ برٹ ووٹن نے شاید جدید پاکستانی شعراء کی نظموں کے تراجم بھی کئے ہیں تو اس ملاقات میں میری دلچسپی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ کیونکہ ہالینڈ کی تمام یونیورسٹیوں میں مجھے ایک متنفس بھی تو ایسا نہ ملا تھا جو اُردو جانتا ہو۔ ماسوا میوزیم کے اس ایک اسٹنٹ کے زولاکی دن ۔۔۔ رہ کر لنگوا فون ریکارڈوں سے اُردو سیکھتا تھا۔ اور میں جب اس سے ملا تھا تو اس نے مجھ سے اپنا تعارف اُردو ہی میں کرایا تھا جس پر میں نہایت خوش ہو کر اس کو اس کی ہمت کی داد دے رہا تھا۔

عام ڈچ گھروں کی طرح برٹ ووٹن کا گھر بھی صاف ستھرا اور خوش ذوقی کا آئینہ دار تھا۔ جس کمرے میں وہ بیٹھا کام کر رہا تھا مجھے اس پر کسی لائبریری کا کمرہ ہونے کا گماں ہوتا تھا۔ کیونکہ چاروں طرف الماریوں میں ۔۔۔ و شاعری کی کتابیں اور مختلف زبانوں کے شعرا کے مجموعے نہایت قرینے سے رکھے تھے اور جب برٹ ووٹن نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی تمام کائنات ایک بیوی، دو بچے اور یہ چند کتابیں ہیں تو میں نے اس سے پوچھ ہی لیا تھا کہ وہ عام زندگی میں کیا کرتا، کیا کماتا، کیا کھاتا اور کیا بچاتا تھا۔ اس کے جواب میں اس نے مجھے ہنستے ہوئے بتایا تھا کہ اب تو وہ پیشہ ور مترجم ہو کر رہ گیا تھا۔ آج ڈچ زبان میں ترجمہ کرنا اتنے پیسے ضرور دے جاتا تھا کہ ایک معمولی ضروریات رکھنے والا آدمی اُن سے اپنے اخراجات کو پورا کر سکے۔ البتہ پس انداز کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ ننگی نہائے گی کیا اور نچوڑے گی کیا کے مصداق دنیا کی کسی زبان کا عام ادیب قلم کو شاید ذریعۂ

معاش تو بنا سکتا ہے مگر اس میں آسائش اور بے پروا اندازی کو شامل نہیں کر سکتا۔ میرے ایک اور سوال کے جواب میں برٹ دوٹن نے بتایا تھا کہ عام طور پر اُسے ترجمہ کرتے ہوئے بہت سا وقت لگتا تھا۔ مثلاً ہیملٹ جس کا وہ اب ترجمہ کر رہا تھا ایک برس سے پہلے نہ ختم ہو سکتا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد ڈاکٹر ـــــ کے ہاں جب میں نے جدید شعرا کا ذکر کرتے ہوئے رونلڈ ہولسٹ کو ہالینڈ کے بہترین شعرا کی صف میں شمار کیا تھا تو ہورنک نے پہلے تو دبی زبان میں اس کی بڑائی سے انکار کیا تھا اور کہا تھا کہ ہولسٹ ایک اعتبار سے صوفی شاعر ہے، وہ آئرلینڈ والوں سے اور کیبلنگ سے زیادہ متاثر تھا اور شاعری میں بھی وہ "ڈبلیو بی ایٹس" کی پیروی کرتا ہے صرف یہی نہیں جب وہ ڈچ زبان میں آئرستانی روایات کو لاتا ہے تو اُن سے بے تحاشا اجنبیت کی بو آتی ہے اور جیمز ہومز کی اِس رائے سے پروفیسر وان ہودن نے بھی اتفاق کیا تھا مگر برٹ دوٹن سے جب میں نے ہولسٹ کا ذکر چھیڑا تو اس کو اسکی تعریف میں رطب اللساں پایا۔ دوٹن کا خیال تھا کہ ہولسٹ ڈچ شعرا میں نہ صرف نہایت اہم مقام کا مالک ہے بلکہ بعض زاویوں سے تو کوئی جدید شاعر اس کے نزدیک تک نہیں پہنچتا، پھر دوٹن نے بتایا تھا کہ ہولسٹ بہت شرمیلا شاعر ہے۔ وہ تنہائی پسند اور کم آمیز ہے، اس لئے وہ لوگ جو پراپیگنڈے سے متاثر ہوتے ہیں، ہولسٹ کی شاعری کی تعریف نہیں کر سکتے۔ ہولسٹ کی کم آمیز طبیعت اور الگ تھلگ رہنے کی عادت کا ایک تجربہ مجھے بھی ہو چکا تھا۔

میں ہالینڈ میں پہنچتے ہی یورس ڈیلز سے ملا تھا۔ ڈیلز عجب باغ و بہار اور ہرفن مولا قسم کا آدمی تھا۔ اگرچہ ان دنوں وہ ہیگ کی اسٹیج پر بطور اداکار کام کر رہا تھا۔ مگر گذشتہ تیس برس میں اس نے اسکول میں معلمی سے زندگی شروع کر کے اسٹیج پر ایکٹر اور ڈائریکٹر کے راستے سے ہوتے ہوئے دو فلمیں تیار کرنے کے ساتھ نہ صرف میکبتھ، مِڈسمر نائٹ ڈریم اور انٹونی اینڈ کلوپیٹرا کا ڈچ زبان میں ترجمہ کر ڈالا تھا بلکہ گذشتہ جنگ کے دوران میں اس نے اسٹیج کے لئے دو طربیہ کھیل بھی لکھے تھے جو ان دنوں بہت کامیاب ہوئے تھے۔ ترجموں کے سلسلہ میں اُس نے بہت سے فرانسیسی شاعروں کی نظموں کو ڈچ زبان کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ چنانچہ جب تفصیل سی گفتگو کے بعد اُسے میری دلچسپیوں کا بھی علم ہوا تو اس نے از خود بر تخی میں، جو ہیگ سے شاید دو سو میل دور ہے، رونلڈ ہولسٹ کو فون کیا اور میرا اس سے فوراً ملاقات کرنا ضروری خیال کیا۔ ہولسٹ کی عمر ساٹھ برس سے زیادہ تھی۔ اس لئے ڈیلز نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اس ہنگامہ خیز دنیا سے الگ تھلگ رہ کر ہی اپنی شاعری کی دنیا میں مگن رہتا تھا اور پھر یہ بھی نہیں کہ وہ بہت زیادہ لکھتا تھا۔ سال میں چند ایک نظمیں ہی اس کے قلم سے نکلتی تھیں۔ وہ نقادوں کی بات پر بھی زیادہ دھیان نہ دیتا تھا اور اپنے موافق اور خلاف ہر قسم کی تنقید پر خاموشی اختیار کئے رکھتا تھا۔ اس لئے نقادوں کا ایک گروہ بھی اس سے بدظن تھا۔

ہولسٹ سے ٹیلی فون پر گفتگو کرنے کے بعد ڈیلز نے مجھے بتایا کہ وہ مجھ سے مل کر یقیناً بہت خوش ہوگا۔ چنانچہ ملاقات کا وقت معین کرنے کے باعث بیں وہ کل مجھ سے براہ راست میرے ہوٹل پر ٹیلی فون کرے۔ اور پھر جب اس نے مقررہ وقت پر مجھے ٹیلی فون کیا تھا تو اپنے بڑھاپے کا واسطہ، راستے کی دشوار گذاری (کیونکہ اس گاؤں تک ریل وغیرہ نہ جاتی تھی) مکان کی مرمت اور بعض دیگر الجھنوں کا ذکر کر کے معذرت چاہی تھی۔ اس سے دو دن بعد مجھے اس کا ایک تفصیلی معذرت نامہ اور ایک تصویر جو میں نے مانگی تھی، مل گئی تھی۔ جب میں نے ایمسٹرڈم میں جو اس کے گاؤں سے شاید اسّی میل دور تھا اسے پی۔ ای۔ این کلب کی ایک مجلس میں ملنے کے لئے لکھا تھا تو اُس نے پھر معذوری کا اظہار کر دیا تھا۔ میں نے بھی شاید اس سے ملنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ چنانچہ ایک دن اسکو اطلاع دیئے بغیر جب میں اس کے گاؤں میں جا ہی پہنچا تھا تو وہ اتفاق سے گھر پر موجود نہ تھا اور جا نے کھیتوں میں کہاں چھپا ہوا تھا کہ تلاش کے باوجود اس کا سراغ نہ ملتا تھا۔

برٹ دوٹن بھی اس کے مداحوں اور شاید قریبی دوستوں میں تھا۔ اس لئے جب میں نے اُسے ہولسٹ سے نہ مل سکنے کی سرگذشت سنائی تو اُس نے بتایا کہ وہ اس کے تمام معروف و غیر معروف ٹھکانے جانتا تھا۔ اِس لئے چند دنوں تک وہ یقیناً اس قابل ہو سکے گا کہ مجھے اس سے بہر عنوان ملا سکے۔ لیکن مجھے تو اس سے اگلے ہی دن ہالینڈ کی سرحد کو عبور کرنا اور جرمنی چلے جانا تھا۔ اس لئے دوٹن کی مدد اور ہمت کے باوجود میں اب اس سے نہ مل سکتا تھا اور اس کا مجھے افسوس تھا۔

ہولسٹ کی متصوفانہ شاعری سے گذر کر جب جدید شعراء کا ذکر چلا تو دوٹن کا خیال تھا کہ یہ گروہ ماضی سے یکلخت الگ ہو جانا چاہتا تھا۔ اُن کا ایک پاؤں تو شاید حال پر رہتا تھا مگر دوسرا پاؤں ہوا میں معلق ہونے کے باعث اُن کو لنگڑانا پڑتا تھا۔ اس کے خیال میں یہ گروہ شاید ہر منطقی استدلال کو شاعری کے منافی خیال کرتا تھا جس کی وجہ سے اس کی نظمیں متوازن، ہموار اور رواں نہ رہتی تھیں۔ اس گروہ کی نظمیں پڑھنے سے ذہن کو اسی طرح جھٹکے لگتے تھے۔

جس طرح ایک ٹوٹی پھوٹی، جگہ جگہ گڑھوں اور ملبے سے اٹی ہوئی سڑک پر ایک گاڑی میں بیٹھ کر گذرنے سے درگت بنتی تھی۔ اور جس طرح اس سڑک پر جسم کے توازن کو قائم رکھنا مشکل ہو جاتا تھا ویسے ہی جدید شعراء کی نظموں کو پڑھتے وقت ذہنی توازن کو برقرار رکھنا عام سوجھ بوجھ والے قاری کے بس کی بات نہ تھی میرا جی چاہتا تھا کہ میں ووڈن سے ایک ایک بات پر تفصیل سے گفتگو کروں مگر رات بھیگ چکی تھی اور مجھے ابھی ہیگ واپس جانا تھا۔ اس لئے میں نے اس تمام سلسلے کو بھی گول کیا اور موضوع گفتگو کو اقبال کی نظموں کے تراجم پر لے آیا۔

میرا خیال تھا کہ ووڈن اردو اور فارسی میں سے ایک زبان ضرور جانتا ہوگا۔ کیونکہ اس کے بغیر اقبال کی نظموں کے ترجمے کا کٹھن کام سرانجام نہیں پا سکتا۔ باتوں باتوں میں مجھے یہ تو علم ہو گیا تھا کہ ووڈن کو اردو سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ تاہم میرا خیال تھا کہ وہ فارسی کی ضرور کچھ شدبد رکھتا ہوگا۔ اس لئے جب میں نے اس سے یہ دریافت کیا کہ اس کا فارسی کا علم کس قدر تھا تو مجھے اقبال کی بزرگی کے باوجود اس پر رحم آنے لگا۔ ووڈن فارسی سے بھی بیگانۂ محض تھا۔ یہ صحیح ہے کہ آج دنیا کی ہر زبان میں ایسا ہو رہا ہے اور مترجم اصل کو دیکھے اور جانے بغیر ترجمے کئے جا رہے ہیں۔ بلکہ آج سے پچیس اٹھائیس سال پہلے جب تاجور مرحوم نے "ادبی دنیا" کو پہلے پہل جہازی سائز پر شائع کیا تھا اور اس کے ادارے میں سید عابد علی عابد بھی شامل تھے تو رسالے کا ایک حصہ مختلف زبانوں کی نظموں کے تراجم کے لئے مخصوص ہوتا تھا۔ اس میں تراجم کے نیچے "چینی سے، ملائی سے، یونانی سے، عبرانی سے" وغیرہ وغیرہ کے الفاظ دیکھ کر میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ اس ادارے میں کون ایسا فاضل ہو سکتا تھا جو دنیا کی ہر زبان کی نظموں کو براہ راست اردو کے قالب میں ڈھال سکتا تھا۔ یہ میری تعلیم کا ابتدائی زمانہ تھا۔ چنانچہ ایک دن کالج میں عابد علی عابد صاحب سے جب حقیقتِ حال معلوم ہوئی تو اُن شعرا کے ساتھ جن کی نظموں کے تراجم ہوتے تھے ہمدردی پیدا ہونے کی بجائے مجھے اس نظریئے کو جان کر خوشی ہوئی جس کے تحت ادبی دنیا کا ادارہ یہ کام کر رہا تھا۔ مگر آج نہ جانے کیا بات تھی کہ مجھے اقبال کے ساتھ ویسی ہی ہمدردی پیدا ہونے لگی تھی جو بسا اوقات کسی مظلوم اور بے بس کے لئے از خود پیدا ہو جاتی ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اقبال کی نظموں کے مطالب کو دونوں زبانوں کو جاننے والے کے لئے بھی سمجھنا مشکل تھا۔ لیکن ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ اُردو اور فارسی میں سے کسی ایک کو جانے بغیر تیسری زبان اور دوسرے ذہن کے سہارے چوتھی زبان میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ اس سارے سلسلہ میں کیا کیا دقتیں پیش نہ آتی ہونگی اور کیا کیا لطیفے نہ ہوتے ہونگے۔ نہ جانے اُن کا کیوں احاطہ کرنے لگ گیا تھا۔

اقبال کی نظموں کے ساتھ میرا یہ جذباتی سا ردعمل بہت مختصر سے لمحے کے لئے تھا، کیونکہ اب مجھے اس سلسلہ کی افادیت کے بہت سے پہلو نظر آنے لگے تھے۔ اقبال پاکستان کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ اس نے پاکستان کے خیال کو جذبات کی بھٹی سے نکال کر لفظوں کے سانچے میں چھاپے خانے کی سیاہی کے ساتھ پیش کیا تھا۔ یہ اس کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ پھر عقل و دانش، علم و حکمت، اور ذوق و یقین کے اس نے ایسے رموز کھولے تھے کہ مشرق کی بات مغرب کو بھی وزن دار معلوم ہوتی تھی۔ سرمایہ پرستی کے اس دور میں جب کہیں بھولے سے مغرب پر کوئی ایسا لمحہ بھی طاری ہوتا تھا جب وہ اس کے عواقب و عوامل سے گھبرا اُٹھتا تھا تو اس کی نگاہ اب مشرق کی روحانیت کی طرف ہی اٹھتی تھی۔ مشرق کی اس روحانیت کو فکر و عمل کے نئے سانچے میں ڈھالنے میں اقبال کی شاعری کو بھی ایک بلند مقام حاصل تھا۔ اقبال نے پاکستانی مسلمانوں کے روپ میں دنیا کے مسلمانوں کو جس طرح للکارا اور ابھارا تھا اس کا غلغلہ اور دبدبہ مغرب کے ایوانوں میں اس کی نظموں کے تراجم ہی سے تو پہنچ سکتا تھا۔ میں اب برٹ ووڈن کی کوششوں کو سراہ رہا تھا۔ اس کی ہمت کی داد دے رہا تھا، اس کے کام کی افادیت کا تذکرہ کر رہا تھا اور ترجموں کی کتاب کی، جو اس اثنا میں اس نے مجھے دی تھی، ورق گردانی کر رہا تھا۔ فرطِ حیرت سے اُنہیں سونگھ رہا تھا اور اس خوشبو سے حظ اٹھا رہا تھا جو ایسے موقعوں پر نہ جانے کاغذ میں کس طرح سرایت کر جاتی ہے۔

میرے اس سوال کے جواب میں کہ اس نے ترجمہ کرتے وقت اقبال کے کن کن انگریزی تراجم کو پیش نظر رکھا تھا، ووڈن نے مجھے بتایا کہ اُس نے نکلسن کے ترجمے سے بھی استفادہ کیا تھا لیکن وہ اپنے ڈچ ترجموں کو بیشتر ڈاکٹر کیرنن کے انگریزی ترجموں کے سانچے پر ڈھال رہا تھا۔ کیونکہ اس کے خیال میں کیرنن نے نکلسن سے زیادہ سلاست اور روانی اور شاعرانہ معانی آفرینی سے کام لیا تھا اور جب میں نے اشارۃً کیرنن کے ترجموں کی کمزوریوں اور اُن پر ایک ہی نظر ثانی کی ضرورت توجہ دلائی تو اس نے مجھے بتایا کہ اسے اس چیز کا بہت بعد میں علم ہوا لیکن اس نے یہ گوارا نہ کیا کہ اسکے اپنے ترجموں کی اساس کمزور تراجم پر ہو۔ اس لئے اس کو بھی کیرنن کی تبدیلیوں کے پیش نظر اپنے بعض ترجموں کی صورت بدلنا پڑی تھی۔ ترجمہ کرنے کے دوران میں ووڈن کے ایک ڈچ دوست نے بھی اسکی مدد کی تھی جو خود شاعر تھا نہ مترجم مگر فارسی

(باقی ص۵ پر)

نذرِ اقبالؒ

سحاب قزلباش

دلوں میں یوں خودی کا ذوق پیدا کر دیا تو نے
کہ ہر قطرے کو طوفاں سے شناسا کر دیا تو نے

سکھایا ہم کو دنیا میں طریقہ جینے والوں کا
ہجومِ یاس کو یکسر تمنا کر دیا تو نے

تری لَے بول اُٹھی، دیر و حرم تک گنگنا اُٹھے
کہ پتھریلے دلوں میں درد پیدا کر دیا تو نے

ترے اشعار میں گذرے ہوئے موسم کی انگڑائی
نظر میں عظمتِ کہنہ کو زندہ کر دیا تو نے

بھٹکتا ہے جہاں مایوس انساں اپنے مسلک سے
وہاں امید کا ہر سو اُجالا کر دیا تو نے

قصرِ شرف النسا

علامہ اقبالؒ

گفتمش "این کاشانهٔ از لعلِ ناب — آنکه می گیرد خراج از آفتاب!
این مقام این منزل این کاخِ بلند — حوریان بر درگهش احرام بند!
اے تو وادی سالکان را جستجوئے — صاحبِ او کیست؟ با من باز گوئے"
گفت "این کاشانهٔ شرف النساست — مرغِ بامش با ملائک ہمنواست!
قلزمِ ما این چنین گوہر نزاد — ہیچ مادر این چنین دختر نزاد!
خاکِ لاہور از مزارش آسمان — کس نداند راز او را در جہان!
آن سراپا ذوق و شوق و درد و داغ — حاکمِ پنجاب را چشم و چراغ
آن فروغِ دودهٔ عبدالصمد — فقرِ او نقشے که ماند تا ابد!
تا ز قرآن پاک می سوزد وجود — از تلاوت یک نفس فارغ نبود
در کمر تیغِ دو رو قرآن بدست — تن بدن ہوش و حواس اللہ مست
خلوت و شمشیر و قرآن و نماز — اے خوش آن عمرے که رفت اندر نیاز!
بر لبِ او چون دمِ آخر رسید — سوئے مادر دید و مشتاقانه دید!
گفت اگر از رازِ من داری خبر — سوئے این شمشیر و این قرآن نگر
این دو قوت حافظِ یکدیگرند — کائناتِ زندگی را محورند!
اندرین عالم که میرد ہر نفس — دخترت را این دو محرم بود و بس!
وقتِ رخصت با تو دارم این سخن — تیغ و قرآن را جدا از من مکن
دل بآن حرفے که می گویم بنہ — قبرِ من بے گنبد و قندیل به!

مومنان را تیغ با قرآن بس است
تربتِ ما را ہمین سامان بس است!"

عمرہا در زیرِ این زرین قباب — بر مزارش بود شمشیر و کتاب
مرقدش اندر جہانِ بے ثبات — اہلِ حق را داد پیغامِ حیات!
تا مسلمان کرد با خود آنچہ کرد — گردشِ دوران بساطش در نورد
از دلش تاب و تبِ سیماب رفت — خود بدانی آنچہ بر پنجاب رفت!

خالصه شمشیر و قرآن را ببرد
اندران کشور مسلمانی بمرد"

بنگالی نظم

میں گیت اُسی کے گاتی ہوں

(دیادِ اقبالؒ)

بیگم صوفیہ کمال
مترجمہ:- یونس احمر

گیت اُسی کے گاتی ہوں
جس نے حیات کا کھوج لگایا، جس نے جیون پتھ دکھلایا
جہل کی تیرہ شب میں جس نے نور وضیا کا دیپ جلایا
دیپ جلائے جس نے من کے، دن کا سُندر نور اُڑا کر
زیست پہ جس نے جیت دلائی خوف کی باتیں دل سے مٹا کر
گیت اُسی کے گاتی ہوں

میں گیت اُسی کے گاتی ہوں
سُکھ ساگر میں لہراتی ہوں
ہر دم جس کے ہونٹوں نے ہیں انساں ہی کے نغمے گائے
ان کو سن کر خوں گرمایا، جن سے طوفاں شرما جائے
جس نے مجبوروں مظلوموں کی آہوں سے ہو کر مضطر
"شکوہ" کے انداز میں اپنے رب سے باتیں کیں جی بھر کر
گیت اُسی کے گاتی ہوں

جس دن تیرے ہونٹوں سے تھا گیت فضا میں لہرایا
دل میں آشا جاگ اٹھی تھی، آنکھوں نے اک سپنا دیکھا
اور تو نے للکارا تھا:

جیون بڑا کٹھن ہے بھائی، شان سے آگے بڑھتے جاؤ
رستے کیسے ہی اوگھٹ ہوں تم گھاٹی پر چڑھتے جاؤ
دل سے شُبہے دور کرو، زنجیریں خود کٹ جائیں گی
نیا نشیمن اپنا بناؤ، صبحیں نجات کی آئیں گی
یہ گیت جو میرے ہونٹوں پر دن رات مچلتے رہتے ہیں
دراصل ترے ہی نغمے ہیں جو دل میں اُبلتے رہتے ہیں
وہ دیکھ کہ ان نغموں نے ہیں زنداں کی گرا دیں دیواریں
دریا میں بھی طوفاں آ ہی گیا، کام آ گئیں موجوں کی یلغاریں
وہ لے تھی تری ہی لے جس میں شعلوں کی زبانیں پلتی تھیں
ہاں تیرے ہی دم سے مشکل راہیں پل بھر میں آسان ہوئیں
راتیں تو نے رو رو کاٹیں، پلکوں سے طوفان بہے
اپنی قوم کی دکھیاری آنکھوں سے سب آنسو پونچھے
گیت میں تیرے گاتی ہوں

تو قوم کی آنکھ کا تارا ہے، میں گیت ترے ہی گاتی ہوں
تیری ہی چھایا ہے جس کو میں اپنے من میں پاتی ہوں
کیا قوم کی خاطر دکھ جھیلے اور پہروں اشک بہائے ہیں
زنجیرِ غلامی توڑنے کو طوفانی نغمے گائے ہیں
محکومی کی زنجیروں میں جو قوم تھی سب کچھ بھول چکی
تو اس کا دلیلِ راہ بنا اور بخشی اس کو آزادی
تعظیم سے میرا سر ہے نگوں ہاں تیری خدمت میں اقبال
اس دور کا تو قومی شاعر، تو سچ مچ ہے اک نیا ہلال
میں گیت ترے ہی گاتی ہوں

غزل

جگر مراد آبادی

اک یہی حسنِ یقیں، تسکینِ جان و دل سہی
مجھ سے تو غافل نہیں ہے تجھ سے میں غافل سہی
پھر بھی آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں اک سراپا ناز کو
زندگی میں ہر تجلّی حُسن کی شامل سہی
جو بھی مل جائے محبت میں وہی انعامِ دوست
کیفِ محرومی سہی، لطفِ شکستِ دل سہی
پھر بھی کتنی دل نشیں ہے پھر بھی کتنی جانفزا
حسن کی ایک ایک ادا ظالم سہی قاتل سہی
عشق ہی کی فطرتِ سرکش کا لیکن کیا علاج
ہر نفس رہبر سہی، جادہ سہی منزل سہی

کس کو ملتی ہے جگر یہ دولتِ بیدار بھی
لاکھ جامِ جم کے بدلے اک شکستہ دل سہی

رپورتاژ،

معلق شاہراہ

(۲)

مہاندری

ممتاز مفتی

زاویۂ نظر

جیپ رک گئی

"یہ کوائی ہے" کمبل میں لپٹے ہوئے گاڈدی نے فخریہ انداز میں کہا۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ پہاڑ سامنے سے کھلے ہوئے تھے اور مشرقی کونے کی طرف جہاں ہماری جیپ کھڑی تھی آپس میں مل گئے تھے۔ اس کھوہ نما کونے میں چیل کا ایک گھنا جنگل تھا۔ "بڑی خوبصورت جگہ ہے" گاڈدی نے سگرٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "خوبصورت"! میں نے ایک بار پھر اس کھوہ کی طرف دیکھا۔ "شیروں کی آماجگاہ معلوم ہوتی ہے" مسعود نے ہنسکر کہا۔ "بے وقوف" عمر نے ناک سکوڑی۔ "تم پہاڑوں کو کیا جانو۔ تختے کی طرح فلیٹ میدانوں کے رہنے والے کیا جانیں، انہیں تو الٹا چھوٹی سی پہاڑی بھی اچھی لگتی ہے۔" مسعود نے کہا "ہنہ" اور عمر نے پھر ناک سکوڑی۔

کھوہ کے کونے پر دھوئیں کے سیاہ رنگ میں چھپی ہوئی جھونپڑی نے غلیظ کپڑوں کے پلندے میں سے سفید رنگ کے دانت چمکے "یہ تو اپنی اپنی نظر ہے۔ بابوجی۔ جانے دیوگے؟" وہ بولا۔ "اور بابوجی جب انگریج یہاں آیا کرتے تھے تو کوائی کو دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو جایا کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ کوائی کا جواب نہیں ——— اپنی اپنی نظر ہے بابوجی۔"

مسعود نے طنزاً کپڑوں کے اس غلیظ پلندے کی طرف دیکھا اور جیپ میں بیٹھ گیا اور جیپ ہونکتی ہوئی چڑھائی چڑھنے لگی اور اوپر موڑ کے قریب جا کر پھر رک گئی جہاں دوسری جانب سے آنے والی ایک اور جیپ کھڑی تھی۔ اس جیپ سے ایک صاحب اور میم غور سے نیچے کوائی کی کھوہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ "بیوٹی فل" میم نے خوشی نے جذبے سے چھلکتے ہوئے کہا۔ "بیوٹی فل" میں نے مڑکر کوائی کی طرف دیکھا اور حیران رہ گیا۔ وہ درختوں کا ایک وسیع جھنڈ جو نیچے سے شیروں کی آماجگاہ دکھائی دے رہا تھا یہاں بلندی سے ایک عظیم الشان شالا مار معلوم ہو رہا تھا۔ ہموار میدان کے مختلف زینے کی سیڑھیوں کی طرح اوپر نیچے پھیلے ہوئے تھے جیسے کسی عظیم مغل کے ہاتھ نے نہایت سلیقے سے ان روشوں کو سنوارا اور سجایا ہو۔

کیا یہ وہی کوائی تھی جسے ہم نے نیچے سے دیکھا تھا؟ میں نے جانچنے کی کوشش کی۔ "سبحان اللہ!" سردے کی پھانک سے چھینٹے اڑے۔

"سب نظر کا کھیل ہے" گاڈدی مسکرایا اور اس نے بامعنی انداز سے اسحاق کی طرف دیکھا جو کوائی کے تختوں کی بجائے میم کے سرخ ہونٹوں اور چھلکی ہوئی آنکھوں میں کھویا ہوا تھا۔

"ہاں" ضیا نے طنزاً دہرایا "سب زاویے کا فرق ہے۔" "بیوٹی فل انڈیڈ" عمر نے قہقہہ لگایا "فلیٹ زمین پر رہنے والے چراغ تلے اندھیرے کے مصداق دور سے پہاڑوں کا حسن دیکھ سکتے ہیں"۔

"دور سے"۔ اسحاق چونک کر بولا اور اس نے حسرت سے صاحب کی طرف دیکھا جو اپنے زاویے میں محو تھا اور گویا کوائی کے زینہ نما تختوں پر گھوم رہا تھا۔

میری نظر میں وہ ایستادہ پہاڑ گھومنے لگے جیسے وہ پردۂ سیمیں کا ایک منظر ہو۔ دور کے مٹیالے پہاڑوں نے گویا سبز پیرہن پہن لئے۔ ڈوبی ہوئی چھپی ہوئی گھاٹیاں ابھر کر حسین وادیاں بن گئیں چیل کے گڈمڈ درخت قطاروں میں ایستادہ ہو گئے۔ نیچے نشیب میں سڑک کے کنارے

کنارے پاکستانی جوان سڑک کو سہارا دیے کھڑے تھے۔ ان کے متبسم چہرے امید بھری مسکراہٹ سے روشن تھے۔ ان کی نگاہیں وطن کی عظمت کے زاویے سے منطبق، ان کے قدم مارچ کی لے پر ناچ رہے تھے اور پیچھے کنہار بڑھے چلو کی دھن گنگنا رہا تھا۔

جیپ بُنکتی ہوئی اس تنگ سڑک پر لڑھک رہی تھی جیسے کوئی کھلونا منڈیر پر قلابازیاں لگا رہا ہو۔ دائیں ہاتھ پہاڑ کی دیوار سے چوٹیاں جھک جھک کر اس عجیب سے کھلونے کی طرف جھانک رہی تھیں، بائیں ہاتھ دور کہیں نیچے دریا ہونک رہا تھا اور اس کے پار کوہستان کا ہیبت ناک پہاڑ اپنا کلاہ اٹھائے کھڑا تھا۔ سڑک پر کوئی مکان یا دکان دکھائی نہیں دے رہی تھی کبھی کبھار کوئی راہ گیر ہاتھ میں سونٹا پکڑے ہوئے سڑک پر نظر آتا تھا اور جیپ کو دیکھ کر سہم کر ایک طرف ہو جاتا۔ اس کی ڈری ڈری نگاہوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس علاقے میں اجنبی ہے۔ "سمجھ میں نہیں آتا" مسعود نے کہا "یہ اپنے علاقے میں اجنبیوں کی طرح کیوں چل پھر رہے ہیں"۔

"اونہوں" عمر چلایا "یہ اس علاقے کے نہیں ہیں"

"اور کہاں تمہارے گھر سے آئے ہیں؟" مسعود طنزاً ہنسا۔

"یہاں گاؤں بھی تو دیکھنے میں نہیں آیا کہیں" ضیا نے چاروں طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ "گاؤں بسانے کی جگہ بھی ہو کہیں"۔ سر دے کی پھانک سے چھینٹے اڑے۔ "یہاں تو دیواریں ہی دیواریں ہیں۔ میدان تو سرے سے مفقود ہے"۔

"بیوقوف" عمر نے قہقہہ لگایا "انسان جب بسنے پر آتا ہے تو وہ یہ نہیں دیکھتا کہ نشیب ہے یا دیواریں ہیں"۔

"یہ بھی ٹھیک ہے" ضیا ہنسا۔ "الٹے پانی تیرنے والا جانور ہے نا۔ کیوں اسحاق"؟ اس نے اسحاق کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

"ہوں کیا ہے؟" اسحاق چونکا

"تمہارا زاویۂ نظر کیا کہتا ہے؟"

مسعود نے قہقہہ لگایا۔ "ان کا زاویۂ نظر تو اب تک نہ جانے کہاں پہنچ چکا ہوگا۔ اس میں سیاہ فام لوگ نہیں سماتے"۔

سرخ مرچ پیلی پڑ گئی۔ "میں کہتا ہوں" وہ بولا "وہ ضرور تاثر تھی۔ آئرلینڈ والیوں میں کتنی جان ہوتی ہے"۔

"دیکھا۔ بیچارہ اسی چکر میں پھنسا ہے"۔ ضیا بولا "اماں یہ وادی کاغان ہے۔ اتنے پیسے خرچ کر کے تمہیں یہاں لائے ہیں اور تم آئرلینڈ میں گھوم رہے ہو"۔

قافلے

دفعتاً سامنے سے شور سنائی دیا اور سب کی توجہ ادھر منعطف ہو گئی حتیٰ کہ اسحاق بھی آئرلینڈ سے لوٹ کر وادی کاغان کی اس سڑک پر آپہنچا۔ سامنے سڑک پر ڈری ہوئی پست قد پہاڑی گایوں اور بھینسوں کا ایک ریوڑ سڑک پر گڈمڈ ہو رہا تھا اور ایک مختصر پہاڑی کنبہ ہاتھوں میں لاٹھیاں پکڑے انہیں سڑک سے ہٹا کر پہاڑی کی جانب ہانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بوڑھا بھینس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ جوان لڑکی کو گائے سینگوں سے دھکیل رہی تھی اور ایک چھوٹا سا لڑکا کھوہ کے کنارے ایک شریر بکری کو سنبھالنے کی ناکام کوشش میں، عالم بے بسی میں کھڑا جیپ کی طرف دیکھ رہا تھا جس کی بھیانک آواز سے تمام مویشی ڈر کر ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ نوجوان لڑکی کو گائے کے سینگوں کے آگے بے بسی کی کیفیت میں دیکھ کر ضیا نے کمبل میں لپٹے ہوئے گاڑی کا بازو پکڑ لیا۔ "یار خدا کا خوف کرو، رک جاؤ ڈرائیور" گاڑی ہنسنے لگا۔ "یہ گوجروں کے قافلے تو قدم قدم پر ملیں گے۔ ان کے لئے رکنا شروع کر دیا تو بس سمجھ لو رات یہیں بسر کرنی پڑے گی"۔

"بیچارے کس مصیبت میں ہیں" اسحاق نے کہا

"میں کہتا ہوں" مسعود چلایا۔ "یہ مویشیوں کو دھکیل رہے ہیں یا مویشی انہیں، پہلے اس بات کا فیصلہ کر لو"۔

"گوجروں کی ساری زندگی مویشیوں کو دھکیلنے اور دھکیلے جانے میں صرف ہوتی ہے۔ اب سردیاں آنے والی ہیں نا اس لئے یہ اپنے گھٹے لئے نچلے علاقوں میں آ رہے ہیں"۔

"کیوں؟" اسحاق نے پوچھا۔

"بھئی دسمبر میں تو یہاں برف ہی برف ہوگی۔ نہ کھیت نہ چارہ، ان دنوں یہاں وہی رہے گا جس کے گھر میں کھانے کے لئے اناج ہوگا اور گرم رہنے کیلئے

اینڈ مین" عمر نے کہا۔

مویشیوں اور گوجروں کی اس کھینچا تانی کے بعد تمام قافلے والے اور گائے بھینسیں سب پہاڑی کے دامن میں ایک طرف گڈ مڈ ہو رہے تھے۔ بڈھا ہونک سا تھا۔ لڑکی ڈری سہمی ہوئی ایک پتھر سے چمٹی ہوئی تھی۔ عورت بچے کو سر سے چمٹائے چٹان کے کونے پر اپنا سر تھامے بیٹھی لمبے لمبے سانس لے رہی تھی اور نو سال کا بچہ گہری وادی کے کنارے ایک درخت سے چمٹا ہوا تھا۔

"ارے یہ تو بڑی مصیبت میں مبتلا ہیں بیچارے" ضیا چلانے لگا "اگر ہر جیپ کی آمد پر انہیں اسی قدر ہیبت و درد کرنی پڑتی ہے تو سمجھو کہ یہ تو سیل لمبی سڑک ان کے لئے پل صراط سے کم نہیں۔"

"زندگی کتنی کٹھن ہے" عمر بولا "سارا دن چلتے ہیں، مویشیوں کے سینگوں کے دھکے کھاتے ہیں اور رات کسی کھلے میدان میں تھک ہار کر پڑ رہتے ہیں۔ گرمیوں میں اوپر پہاڑیوں کی چوٹیوں کی طرف چل پڑتے ہیں، سردیوں میں نیچے میدانوں کی طرف۔"

"وہ دیکھو وہ کیسے گھور رہی ہے ہمیں، جیسے سارا قصور ہمارا ہو" ضیا نے جوان لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اپنا اپنا زاویۂ نظر ہے" مسعود چلایا۔ "یہ خان ڈرائیور انہیں راہ کی رکاوٹ سمجھتا ہے اور وہ اس گھمر گھمر کرنے والے انجن کو اپنی جلاوطنی کا باعث سمجھتے ہیں۔"

"ہاں بھئی" میں نے کہا "اس سڑک پر تو دو ہی زاویے ممکن ہیں، پیدل اور سوار۔"

گوجروں کے قافلے کے بعد اونٹوں کا قافلہ شروع ہو گیا۔ اونٹوں اور خچروں کی لمبی لمبی قطاریں چلی آ رہی تھیں، ان پر کھالیں لدی ہوئی تھیں۔ خچر جیپ کو دیکھ کر دولتیاں چلاتے تھے، اونٹ ڈر کر بھاگتے تھے اور اپنے رکھوالوں کو مصیبت میں ڈال دیتے تھے۔

"ارے یہ کیا مصیبت ہے" ضیا اس افراتفری کو دیکھ کر چلایا۔ "یہ اونٹ ہیں یا کیا۔ وہاں پنڈی میں جب کبھی فوج کے اونٹ سڑک پر چلتے ہیں تو لاکھ ہارن بجاؤ، گھنٹیاں دو، موٹر کے گیئر بدلو، وہ اپنے مزے سے چلتے رہتے ہیں، جیسے سنا ہی نہ ہو، جیسے سڑک باوا جان نے خرید رکھی ہو۔"

"ہم تو مانتے ہی نہیں کہ یہ اونٹ ہیں" مسعود نے ہنسکر کہا۔

"وہ کیسے" عمر چڑ گیا "اندھے ہو گیا؟"

"پڑھے لکھے لوگ ہیں ہم۔ تمہاری طرح اَن پڑھ نہیں" مسعود بولا۔

"یہ کون سا علم ہے بھائی؟" ضیا شرارت سے مسکرایا۔ جب سے مکتب جانا شروع کیا ہے پڑھتے چلے آئے ہیں کہ اونٹ صحرا کی کشتی ہے، ریگستان میں پیدا ہوتا ہے، ریت پر چلتا ہے اور ریگستان ہی میں مر کر دفنایا جاتا ہے اور زندگی وہاں گزارتا ہے جہاں پانی نہیں ملتا اور یہاں دیکھو تو نیچے دریا بہہ رہا ہے۔ اوپر سے چشمے گر رہے ہیں، ریت کا نام و نشان تک نہیں۔ پھر ہم کیسے مان لیں کہ یہ اونٹ ہیں" مسعود نے فاتحانہ انداز سے بات ختم کی۔

عین اسوقت ایک اونٹ نے بآوازِ بلند منہ سے بگل سا بجایا اور اس کے منہ سے جھاگ کا ایک تودہ مسعود کے منہ پر آ گرا۔ عمر تالیاں بجا کر ہنسنے لگا۔ "لو کرلو بات۔" ضیا کی ہی ہی سے پہاڑیاں گونجنے لگیں۔ سردے کے چھینٹے اُڑنے لگے اور مرچ کا رنگ اور بھی سرخ ہو گیا۔ کمبل کی گٹھری میں بھی حرکت ہوئی۔

"اے خان!" مسعود نے گٹھری کو جھنجھوڑا "خدا کے لئے تم نہ ہنسو۔ تمہارے بازوؤں میں چھپا نوں کا دارومدار ہے۔"

"باہوا سے تو نہیں ہنستا وہ" عمر چلایا "کیوں خان؟"

"جو مرنا ہے بھائی" کمبل پوش گاڈی بولا "تو ہنستے ہوئے کیوں نہ مریں؟"

"لیکن" مسعود نے کہا "آخر مریں کیوں، خالی ہنستے ہی کیوں نہ رہیں؟"

دفعتاً گاڑی رک گئی۔

لینڈ سلائیڈ "لو بھائی صاحب" خان بولا۔ "اب چاہے دل کھول کر ہنس لو، گاڑی آگے نہیں جا سکتی۔"

"آگے نہیں جا سکتی" عمر غصے میں بولا "کیوں؟"

"سڑک پر پہاڑ گرا ہوا ہے" اس نے کہا۔

"ارے!" ضیا چلایا۔ "سڑک پر پہاڑ گر پڑا ہے، اب تک تو پہاڑ پر سڑک سر پٹختی آئی ہے۔"

ہمارے سامنے موڑ پر سڑک یوں ڈھیری سی بنی ہوئی تھی جیسے کسی کے اوپر سے ایک بہت بڑا ٹرک گزر گیا ہو۔ بڑے بڑے پتھر یہاں سے وہاں تک بکھرے پڑے تھے جن کے تلے پانی رِس رہا تھا۔ دس پندرہ پہاڑی ہاتھوں میں کدالیں اور ٹوکرے اُٹھائے کام میں مصروف تھے، لیکن اِن پتھروں کے ڈھیر کے سامنے دس پندرہ آدمی یُوں دکھائی دے رہے تھے جیسے ڈبل روٹی پر چیونٹیاں رینگ رہی ہوں۔

"میں بتاؤں" عمر چلّایا "یہ لینڈ سلائیڈ ہے۔"

"سوال یہ ہے" ضیا بولا "اب ہوگا کیا؟"

"جو ہونا ہے ہو جائے گا"۔ مسعود ہنسا "اسی لئے تو گھر چھوڑ کر آئے ہیں اتنی دور۔"

"اس کی نصیحت تو کنواری لڑکیوں کی سی ہے"۔ میں نے کہا "جو ہونا ہے ۔۔۔"

"کیا بات ہے؟" ضیا ہنسنے لگا۔

"مسعود کی بات چھوڑو"۔ عمر چلّایا "جو منہ میں آیا بک دیا۔"

مسعود کا منہ غصے سے کپّا ہو گیا۔ "عجب احمق ہو" وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "یہ خصوصیت تو تہذیب حاضرہ کی جان ہے لوگ روزمرہ کی زندگی سے بور ہو جاتے ہیں، وہ اطمینان و سکون کو موت کے مترادف سمجھتے ہیں تاکہ زندگی میں مدوجزر پیدا ہو یعنی کچھ ہو جائے۔ اگر عمر کتاب میں یہ حقیقت پڑھ لے تو واہ واہ کر کے دوستوں کو سُناتا پھرے گا۔ اور مسعود کے مُنہ سے نکلے یہی بات تو کہے گا بکواس ہے۔"

کمبل پوش گائڈ نے ہماری بحث کو کاٹ دیا۔ قریب آکر کہنے لگا "بھائی صاحب یہ معاملہ ٹھیک نہ ہوگا۔"

"کیا مطلب؟" عمر چیخنے لگا۔

"میرا مطلب ہے" گائڈ کہنے لگا۔ "سڑک صاف نہیں ہوگی، اس میں دقت لگے گا۔"

"لو اس میں کیا ہے، اگر ایک بلڈوزر لگا دو تو ابھی ایک دم ٹھیک نہ ہو جائے تو کہنا" عمر نے کہا۔

"لگا دو جی بلڈوزر" ضیا نے حاکمانہ انداز سے ہیں یوں اشارہ کیا جیسے ہم سٹیج پر کھڑے ڈرامہ کھیل رہے تھے۔

"بحکم ظلّ الٰہی" پہلی مرتبہ مریچ کے ہونٹوں پر تبسم جھلکا۔

"کتنا خوش قسمت ہے یہ شخص جسے عمر کہتے ہیں" مسعود نے کہا۔ "جو 'اگر' کی دنیا میں رہتا ہے اگر میں لکھ پتی ہوتا تو ہوائی جہاز میں سفر کرتا۔ لہٰذا ریل کا ٹکٹ خریدنے کی کیا ضرورت" وہ ہنسنے لگا "لیکن اگر بلڈوزر ہوتا کیوں، اگر ہوائی جہاز ہوتا تو ہم کب سے پہنچ چکے ہوتے منزل مقصود پر۔"

اب ہوائی جہاز سے اتر کر زمین پر آؤ بھائی صاحب۔ ضیا کندھے پر بستر اُٹھاتے ہمارے قریب آکر بولا۔ "ذرا اپنا بستر اٹھالو خان ڈرائیور کہتا ہے کہ جیپ کو کراس کرنے کے لئے خالی کرنا پڑے گا۔"

"ارے" عمر چیخنے لگا۔ "تو کیا ہم بستر اٹھا کر چلیں گے؟"

"نہیں نہیں؛ مسعود غرّایا "تم یہاں بیٹھ کر بلڈوزر کا انتظار کرو۔"

سب نے اپنے بستر کندھے پر اٹھائے اور سوٹ کیس ہاتھ میں لٹکا کر پتھروں کے اس ڈھیر کو پار کرنے میں مصروف ہو گئے۔ ابتدا میں تو یہ ایک نیا تجربہ تھا لیکن چند قدم چلنے کے بعد اس کی دلچسپی ختم ہو گئی۔ اِن ناہموار اور گیلے پتھروں پر سامان اٹھا کر چلنا بہت کٹھن کام تھا۔ اس کے باوجود عمر اپنا سامان لئے یوں بھاگا جا رہا تھا جیسے کوٹ اٹھا کر مال روڈ پر ٹہل رہا ہو۔ عبداللہ اطمینان سے لمبے لمبے ڈگ بھر رہا تھا۔ مسعود، اسحاق، ضیا اور میں یوں گرتے پڑتے بڑھ رہے تھے جیسے مال گاڑی میں گڑ کی بوریاں اُچھلتی ہیں۔

"ارے" ضیا چلایا۔ "یہاں تو خالی ہاتھ چلنا بھی مشکل ہے۔ پھر یہ بستر اور ٹرنک ۔۔۔"

"بستر اور ٹرنک کی بات چھوڑو" مسعود بولا۔ "ان پتھروں پہ چلنے کی بات کرو جو پھیلے جا رہے ہیں۔"

"ابھی ہم جیپ میں بیٹھے ہوئے قافلوں پر ہنس رہے تھے" ضیا نے قہقہہ لگایا "اور اب خود قافلہ بنے ہوئے ہیں۔"

"ہاں ـــ" مسعود نے شور مچایا۔ "اب بدلا زاویۂ نظر۔"

"اگر اب کوئی جیپ ملے تو دیکھیں گے کہ سوار لوگ کیسے دکھائی دیتے ہیں۔ ارے۔" ضیا نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن وہ دھڑام سے گر پڑا اور سامان اور بستر اس کے اوپر آگرہ۔ بصد مشکل ضیا اٹھا اس نے بستر اٹھایا اور پھر خاموشی سے چلنے لگا۔

"کیوں بھئی ـــ" مسعود نے اسے چھیڑا۔ ایک بار گرنے سے کیا ہوا؟"

"ارے نہیں بھائی ـــ لیکن ان حالات میں صرف ایک کام ہو سکتا ہے' یا چلو اور یا بات کرو۔"

"جب جیپ میں بیٹھے تھے تم اس وقت تو بہت اِتراتے تھے۔" عمر چیخنے لگا۔

"جب برکھا رُت تھی' اب موسم خشک ہے۔" ضیا نے جواب دیا۔

"شکر ہے۔" مسعود نے کہا۔ "کہ وہ تمام قافلے جنہیں ہم راستے میں ملے تھے ادھر سے اُدھر جا رہے تھے ورنہ اگر کوئی اُدھر سے اِدھر آ رہا ہوتا تو اب وہ ہماری حالت دیکھ کر ہم پر ہنستے۔"

"ہنس لینے دو میاں، اپنا کیا جاتا ہے" عمر چلایا۔ "ان قافلے والوں کا کیا ہے۔ اِن کی زندگی مسلسل جدوجہد میں گزر جاتی ہے، موسم گرما میں وہ پاکستان سے نمک لے کر جاتے ہیں، سرما کی آمد سے پہلے وہ چلاس اور گلگت سے کھالیں، زیرہ، پٹو اور سلاجیت لاد کر لاتے ہیں۔ وہاں چلاس اور گلگت میں نمک نہیں ملتا۔" وہ بولا۔

"تو کیا نمک خواری کا محاورہ چلاس اور گلگت میں ترتیب دیا گیا تھا۔" مسعود نے پوچھا۔

"ہاں بھائی ـــ" ضیا ہنسنے لگا "کسی ایسی ہی جگہ ترتیب دیا گیا ہوگا جہاں نمک نہیں ملتا۔ اور لوگوں کو اس بات کا احساس ہے کہ نمک اللہ تعالیٰ کی نعمتِ عظمیٰ ہے۔"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں" عمر بولا "کہ یہ محاورہ کہاں ترتیب دیا گیا تھا۔ لیکن نمک خواری کا حق ادا کرنے میں گلگت کے لوگوں کا جواب نہیں۔ انہیں پاکستان سے عشق ہے۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا "اگر کوئی اُن سے کہے کہ پاکستان تو جہنم ہے جہنم تو وہ جواب دینگے ہمیں جنت میں جانے کی خواہش نہیں۔ ہم تو جہنم ہی میں خوش رہینگے۔"

"بھئی واہ ـــ" مسعود بولا "کیا جواب ہے۔"

"جواب کہاں یہ تو لاجواب ہے۔" ضیا ہنسنے لگا۔

"اس ملک کا جواب نہیں ـــ" پھر میری طرف اشارہ کرکے عمر کہنے لگا "اور اس قلندر کی جتنی تھیوریاں ہیں وہاں جاکر سب چوپٹ ہو جاتی ہیں۔ یہ کہا کرتا ہے نا' کہ وادیوں میں رہنے والی عورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ نگاہیں اٹھا کر پوچھتی ہیں 'ہیں جی' اور چوٹیوں پر رہنے والیاں آنکھیں جھکا کر 'جی ہاں' گلگت جاکر دیکھو تو سمجھ میں آئے کہ وہاں جنسی بے ہودگی سرے سے مفقود ہے۔"

"اس کی بات چھوڑو۔" مسعود بولا "اپنی بات ثابت کرنے کیلئے کہدے گا کہ گلگت دراصل ایک ایسی چوٹی ہے جو وادی میں واقع ہے۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

"عجیب ملک ہے۔" عمر رومانی انداز میں بولا۔ "جہاں لوگ گھروں کو تالے نہیں لگاتے۔"

"ارے" ضیا چلایا "تو کہو نا وہاں چندر گپت لوریا کا راج ہے۔"

"عجیب چغد ہو ـــ" عمر چیخنے لگا۔

"بھائی تاریخ میں تو یہی لکھا ہے۔" ضیا بولا۔

"وہاں جرم نہیں ہوتے" وہ بولا "وہاں کا راجہ ہماری طرح کا ایک انسان ہے۔"

"ارے۔" مسعود بولا "راجہ اور انسان۔ بھئی یہ بات تو ہم نے بھی نہیں سنی کبھی۔"

"بڑا غیر تاریخی ملک ہے" ضیا ہنسنے لگا "جو ساری تواریخ کو جھٹلا رہا ہے۔"

"صرف انسان ہی نہیں۔" عمر ہنسنے لگا "پر جا میں بیٹھ کر حقہ پیتا ہے حقہ۔ لوگوں کے ساتھ قہقہے لگاتا ہے مہمانوں کی تواضع کرتا ہے۔ بدستِ خود۔"

"ارے" ضیا نے آتی ہوئی جیپ کو دیکھ کر کہا۔ "یہ کون سے راستے سے آگئی؟"

جیپ میں سے کمبل کی گٹھری سے گاڈدی کے دانت چمکے "آؤ بیٹھ جاؤ بھائی صاحب" وہ بولا۔ "گاڑی تو میں نے نکال لی ہے ان پتھروں کے ڈھیر سے، لیکن اتنی دیر ہو چکی ہے کہ ہمیں مہاندری سے نکلنے نہیں دینگے۔"

"نکلنے نہیں دینگے؟" مسعود بستر سر سے پھینکتے ہوئے بولا۔ "وہ کیوں؟"

"بھئی وَن وے ٹریفک ہے نا اس سڑک پر۔ بالاکوٹ سے ناران جانے والی گاڑیوں کا وقفہ ختم ہوگیا اب ناران کی گاڑیاں بالاکوٹ کی طرف چل رہی ہونگی۔"

"جی۔" گاڈدی نے اس کی ہاں میں ہاں ملا کر کہا "مہاندری کا سنتری ہمیں آگے نہ جانے دیگا۔"

"اجی سنتری کا کیا ہے۔" ضیا جیپ میں بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ "ایک سنترا تھما دو تو سنتری کا منہ بند ہو جاتا ہے۔"

"ہاں بھئی کچھ کرنا چاہیئے۔" عمر بولا "ورنہ رات مہاندری میں گزارنی پڑے گی۔ لیکن صاحب کیا جگہ ہے مہاندری سبحان اللہ!"

اب کنہار کی وہ V شکل کی وادی کھلتی جا رہی تھی۔ بالاکوٹ سے پارس تک گویا ہم ایک عظیم دیوار کے کنارے پر چیونٹی کی طرح رینگتے رہے تھے۔ کبھی جیپ اوپر سے نیچے لڑھکتی اور پھر نیچے سے اوپر ہونکتی ہوئی چڑھتی۔ بائیں ہاتھ کالے پہاڑ چل رہے تھے۔ اس بلندی سے جہاں جیپ چل رہی تھی نہ تو دریا دکھائی دیتا تھا اور نہ کہیں دیواروں کے اس تسلسل میں فرق آیا تھا کہ نگاہ دور تک جاسکے اور اس پھیلاؤ کو منظر کہا جاسکے۔ پارس تک ہماری کیفیت لکڑی کے بندر کی سی تھی جو رسّی کھینچنے سے سوٹی پر چڑھتا ہے اور پھر گر پڑتا ہے لیکن پارس کے بعد وہ V شکل کی وادی U شکل میں کھلنے لگی۔ اور ہمیں محسوس ہونے لگا کہ ہم ویران علاقے کی سڑک پر بھٹکے ہوئے نہیں بلکہ ایک آباد علاقے میں گذر رہے ہیں۔ ہاں کبھی کبھار سڑک پر کوئی شخص یوں ٹہلتا ہوا دکھائی دیتا جیسے اسے کہیں پہنچنا نہ ہو۔ اس کے انداز سے محسوس ہوتا کہ وہ کسی قافلہ کا فرد نہیں اور وہ ہماری جیپ کی طرف یوں گھورتا جیسے باغ کا مالی اس راہ گیر کی طرف دیکھتا ہے جو اس کی ملکیت پر قدم رکھ رہا ہو یا کبھی کبھار اوپر کسی چوٹی پر سے کوئی بچّہ سر نکالتا اور شوق سے ہماری جانب دیکھتا۔ یا کوئی بکری نچلے ڈھلان پر میں میں کرتی۔ ان کے علاوہ وہاں آبادی کا کوئی نشان نہ تھا۔

پارس کے بعد سڑک مسلسل طور پر اُتر رہی تھی۔ اور اس اُترائی کی نوعیت ایسی تھی کہ ہم بھولے جا رہے تھے کہ وہ جیپ ہے اور تیل سے چلتی ہے اور چلتے ہوئے بڑبڑاتی اور ہونکتی ہے۔ وہ یوں پھسل رہی تھی جیسے موٹر نہیں کھلونا ہو۔

دفعتاً ایک موڑ کے بعد وہ رُک گئی اور ہمارے سامنے دریا چل رہا تھا۔

مہاندری

"ارے" ضیا چلایا۔ "یہ۔ یہ کیا ہے۔ یہ تو دریا ہے۔"

اس دریا کو دیکھ کر ہم سب حیران ہوئے جیسے اس کا یوں منظرِ عام پر آجانا ایک عجیب سی بات ہو۔ کوائی کے اس پار تک ان دو متوازی دیواروں کے درمیان چلتے ہوئے عین اَن جانے میں یہ گمان ہو چکا تھا کہ وہ وادی کاغان نہیں تھی بلکہ طلسمِ ہوشربا کا ایک پُراسرار منظر تھا یا کوئی جنّات کا زنداں تھا جس کی تہ کے منظرِ عام پر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور ہم بابوسر پاس کی طرف جانے کی بجائے کسی کوہ ندا کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اور وہ کمبل پوش گاڈدی کوئی رحم دل دیو یا دیوتا تھا جس نے ہماری بے بسی پر رحم کھا کر ہمیں منزلِ مقصود پر پہنچانے کا بیڑا اٹھایا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ آنکھ کھولیں وہ دیواریں مل جائیں گی اور وہ کمبل پوش اس اڑن کھٹولے سے باہر نکل کر کہے گا "اے آدم زاد، یہاں میری حد ختم ہو گئی۔ اب میں تمہیں آگے نہیں لے جاسکتا البتہ یہ بتا سکتا ہوں کہ اس دیوار پر چڑھنے کے بعد ایک خون کا دریا آئیگا اور پھر ـــــ"

اس جیتے جاگتے دریا کو دیکھ کر ہم نے آنکھیں ملیں، ہمارے روبرو دو کی بجائے تین دیواریں کھڑی تھیں جو نیچے سے اوپر تک چلتی گئی تھیں اور ان کے اوپر بالشت بھر آسمان ٹنگا ہوا تھا۔ سیاہ خوفناک دیواریں جن پر اندھیرے نے ابھی سے تسلط جما لیا تھا اور نیچے وہ مختصر سا دریا چیخ رہا تھا، چلا رہا تھا، بین کر رہا تھا۔ کتنا خوفناک لیکن کتنا جاذب منظر تھا۔

"یہ ہے مہاندری۔" گاڈدی کے دانت چمکے۔

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

افسانہ:-

نئی شام

رفعت روبینہ

بھلا قہقہہ لگانا بھی کوئی آرٹ ہے مگر شکیل بھیا نے ہمیشہ ہر جاننے والے کا قہقہہ ہی تو سننے کی کوشش کی ہے۔ یوں تو قہقہے سے مجھے بھی بڑی دلچسپی ہے مگر جنون نہیں۔

میرے خیال میں قہقہہ تو آنسوؤں اور مسکراہٹ کے امتزاج کا سنگم ہے، قہقہے کو کم کرتے چلے جائیں تو وہ چہرے پر گلابی مسکراہٹ بن کر چھا جاتے گا، بڑھاتے ہی چلے جائیں تو گالوں کی لالی پر آنسو بھی ڈھلکا دے گا اور پھر قہقہے بھی کتنی قسم کے، مثلاً بڑے ہی لانبے اور جاندار قہقہے جو تیرہ برس سے بیس برس کے سن کے لڑکے لڑکیوں یا بے فکرے امیر نوجوانوں نے ہی خدا سے الاٹ کر والیے ہیں، بڑے طویل اور ہچکیاں کھاتے ہوتے قہقہے جو کافی ہاؤسوں، باروں، ریسٹورانوں کی چھتوں تلے ابھرتے ہیں یا رات کے وقت لمبی لمبی کاروں کی پچھلی سیٹوں سے۔ ڈوبتے ابھرتے قہقہے، مہذب سوسائٹی کے احترام کا نشان، ایک دم سے گونجتے مگر کھو کھلے قہقہے جیسے متوسط طبقہ کی سفید پوش زندگی، ہچکی سی بن کر پھر دھیمی ہنسی میں بدل جانے والا قہقہہ کسی راز کا حامل، بے ترتیب قہقہہ مختصر سے سکون اور گھڑی بھر کی بے فکری کا عکس۔ ایسے ہی بے ترتیب قہقہے آج کل کی مجلسوں میں زیادہ گونجتے ہیں اور ایسے ہی نقرئی قہقہوں کی محفل کے اختتام پر ایک دن شکیل بھیا نے میرے ہی کمرے میں عافیہ آپی کو بڑی رازداری سے پوچھا تھا کبھی تم نے قہقہہ لگانے کی کوشش بھی کی ہے عافی؟ تو کیا بھیا آپ مجھے انسان نہیں سمجھتے۔ قہقہے کی کوشش نہیں کی جاتی بلکہ غیر ارادی طور پر ہونٹوں سے اُبل پڑتا ہے، عافیہ آپی نے فیروزی دوپٹے میں چُنٹیں ڈالتے ہوتے کہا۔

مگر عافی تمہاری تحریروں میں اس قدر درد ہوتا ہے جس سے محسوس ہی نہیں ہونے پاتا کہ تم ہنسی کا مفہوم بھی جانتی ہو یا نہیں۔ اور پھر تحریر کے علاوہ خود تمہاری باتوں میں بھی اکثر اوقات تلخئ احساس کا پرتو ملتا ہے، تو کیا پھر تلخیاں اور قہقہے ایک جلو میں زندہ رہ سکتے ہیں، شکیل بھیا دریچے سے لگے برساتی ہوائیں جھومتے ہوتے باہر دیکھنے لگے۔

ہوں، شکیل بھائی، تلخیاں اور قہقہے تو ہمیشہ ہی اکھٹے رہتے ہیں اگر آپ کے کان نہ سُن سکیں تو علیحدہ بات ہے، قلقل مینا مشہور ہے حالانکہ مینا کے اندر تلخ شراب کے سوا کچھ نہیں ہوتا، مگر جونہی تلخی کو انڈیلا مینا کے ہونٹوں سے قہقہہ اُبل پڑا، خواہ کڑواہٹ کی شدت سے یا زمانہ کی خود فریبی پر۔ مگر جاندار اور مسلسل قہقہہ جیسے۔۔۔

خوب عافیہ محترمہ، تو آج سمجھا آپ واقعی ادیبہ ہیں، شکیل بھائی نے میری بک شیلف سے "گردشِ جام" تلاش کرتے ہوتے عافیہ آپی کی مدلل گفتگو کو اپنے طنزیہ فقرے تلے دبا ڈالا اور پھر صوفے میں دھنس کر عدم کی شاعری اپنی بھاری آواز میں انڈیلنے لگے، اور عافیہ آپی قالین پر بیٹھی خاموشی سے دوپٹے میں چُنٹیں ڈالتی رہیں، اور بظاہر تو میں اپنی فائلوں میں گم، مگر دل میں سوچنے لگی۔

"آپی کتنی پیاری ہے اکاش یہ میری حقیقی بڑی بہن ہوتی اور جب لڑکیاں مجھے کہتیں، تمہاری باجی کی آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں جیسے ہزار سالہ نرگس کی آنکھ جس میں شبنم کی نمی بھی ہے، بھونرے کی سیاہی بھی، جھیل کے شفاف پانی سی نیلاہٹ بھی، اور پھولوں سی معصومیت بھی، اور پلکیں کتنی گھنی جیسے گل ہزارہ کی پتیاں، جسم کتنا متناسب جیسے بچپن سے تیراکی کرکے تراشا خوبصورت بنایا ہے، تمہاری باجی تو کسی شوکیس میں رکھنے کے قابل ہے"۔

تو میں اور بھی مارے فخر کے اکڑ اکڑ کر چلتی۔ اور اپنی آپی کو گہرے فیروزی فاختئی اور سی گرین رنگ کے کپڑے پہننے کو کہا کرتی۔ مگر عافیہ آپی کو تو جیسے اپنی خوبصورتی کا احساس تک نہ تھا۔ مجھے یاد ہے ایک دن میں نے زبردستی اُن کے بالوں کے رنگلٹ بناتے تھے، اور جب میں لے خود ہی اپنی کوشش پر مسرور ہو کر اُن سے لپٹ کر بڑے پیار سے کہا "آپ کتنی خوبصورت ہیں عافی آپی"! تو انھوں نے کہا

"ہاں۔ ہو آنکھ گر حسیں تو خزاں بھی بہار ہے"

اور میں خاموشی سے چلی آئی۔

تو اس دفعہ تو امی کے بزار اصرار پر چچی نے عافیہ آپی کو چھٹیاں گزارنے بھیج دیا۔ ورنہ تو یہ کہیے گا کہ آپی کبھی فالتو ہمارے یہاں آتی ہوں۔ رشتہ دار دور کی سہی مگر اتنی دور کی بھی نہ تھی اور پھر آج کل تو رشتہ داری کتنی دور کی بھی ہو خوبصورت لڑکیوں اور قابل لڑکوں کے والدین یوں بھی اپنی قرابت

نکال لیتے ہیں، اور پھر ممانی آپی تو ابوجان کے کسی رشتہ میں ہمارے سگے چچا کی لڑکی لگتی ہے۔ اب امی بھی شکیل بھیّا کے لئے نسبتیں دیکھ رہی تھیں، عافی پر نظر پڑ گئی ؎

اور ادھر شکیل بھائی تو نہ جانے اپنے کو کیا سمجھتے تھے، آج تک شاذ ہی کوئی لڑکی اُن کی تنقید سے بچ نکلی ہو۔ میری ہی سہیلیوں کے نام بڑے عجیب رکھے ہیں، بیچاری ایک بڑی ہی خاموش لڑکی ہے بر جبیں جو اکثر کمزور رہتی ہے، اُسے اب یہ زہریلے آنسو کہتے ہیں کیونکہ اُس کے چہرے کے خاموش اور غمگین تاثرات انھیں قاضی نذرالاسلام کے زہریلے آنسو یاد دلاتے ہیں۔ روفیہ ہی کو لو، ایک دن پک نک کے دوران باہر سے آتے ہوئے لڑکے نے اُس پر کوئی فقرہ کس دیا، روفیہ طیش میں آکر خوب تیزی سے اُسے باتیں سنانے لگیں، بس اُسے اُسی دن سے تھری ناٹ تھری کہنے لگے، اسے اب بھی کہتے ہیں۔ روفیہ تم تو تھری ناٹ تھری کی گولی سے بھی تیز ہو۔ عابدہ بیچاری تندرست، سرخ و سفید، موٹی تازی ہونے کے باعث ملٹی وٹامن کے خطاب سے نوازی گئی۔ مگر جس دن سے آپی آئیں میں خود حیران کہ وہ اب تک کسی آنریری خطاب سے کیوں محفوظ ہیں۔ تو آج یہ قہقہے کا بہانہ ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گئے، اور پھر پڑھتے پڑھتے خود ہی بولے یہ گیت کیسا ہے "جیون"؟

"مجھے تو بہت پسند ہے مگر گیتوں سے زیادہ مجھے قطعات پسند ہیں، بالکل ہلکے پھلکے مگر جذبات سے بھرپور" عافیہ آپی نے رائے دی ؎

اچھا تو تمہیں شعر و شاعری سے بھی اُنس ہے۔ کوئی ایسی چیز بتاؤ جو تمہیں پسند ہو۔ آج شکیل بھائی تو انتہائی بات کرنے کے موڈ میں تھے ؎

جی، مجھے تو ایسے شعر جو پڑھتے ہی دل میں اتر جائیں پسند ہیں، ویسے تو چیزوں کی پسند میں تم میری ہم خیال ہو۔ اکثر میرا دل چاہتا ہے کہ رات کی خاموشی میں کوئی میرے دریچے کے دھندلکوں میں چھپا بڑی پیاری آواز میں کوئی پُر درد نظم سنا دے۔ اور کئی بار تو میں نے اپنے اوپر کیفیت طاری کرنے کے لئے رات کو کھڑکیاں کھلی چھوڑ دی ہیں۔ اور میری روح چیخ چیخ کر ایک نسوانی آواز کی تمنا کرتی ہے۔ سرد ہوا کے ہوتے ہوتے کبھی میرا جسم و جان جلنے لگتے ہیں ؎

مگر آپ کو ایسی نظمیں آخر اتنی کیوں پسند ہیں۔ ان میں تو طوفان حوادث۔

"ہاں ہاں ابھی تک طوفان سے محفوظ ہوں، مگر طوفان ضرور حوادث کے ہی نہیں ہوتے اور بھی تو ہوتے ہیں" بھائی نے آپی کی بات ٹوک کر جواب دیا اور اپنے کمرے میں چلے گئے ؎

مگر اسی شام جب ہم ہنڈی پوائنٹ کا چکر لگا کر واپس آتے تو عافیہ آپی کی چمپئی رنگت دہکنے سی لگی تھی اور میرے دل میں ایک جانا پہچانا سا خیال بھٹک کر آ گیا "اگر یہ میری بھابی بن جاتیں تو"؟

تین دن کی ایسی ہی باتوں کے بعد ایک دن جب ہم سیر سے واپس آ رہے تھے تو برساتی ہوا بہت تیز چلنے لگی اور سردی ہو گئی۔ عافیہ آپی نے سویٹ کریپ کی قمیض پہنی ہوئی تھی، سردی سے کپکپانے لگی، بھائی ہمیں ہوٹل میں بٹھا کر ساتھ والی دکان سے کشمیری کام کی فاختئی کوٹی خرید لاتے۔ آپی جھینپ سی گئیں مگر بھیّا کی نظروں میں نہ جانے کیا نظر آ گیا کہ جھٹ پہن لی، دوسرے دن بارش اور دھند کے باعث ہم باہر نہ جا سکے، گھر میں بیٹھے تاش اور کیرم، شعر و شاعری کی بازیاں لگاتے رہے۔ اور میں دیکھتی رہی کہ آپی بھیّا کے نزدیک ہوتی جا رہی ہے۔ شام کے دھندلکے میں آپی اپنے کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی کوٹی کی نئے سرے سے فٹنگ دیکھ کر کچھ گنگنائے جا رہی تھی ؎

میں برآمدے میں کھڑی گہری دھند کو دیکھ رہی تھی، عافی آپی کی گنگناہٹ نے مجھے چونکا سا دیا، میرا دل چاہا کہ میں عافیہ آپی سے جا کر کہوں "آپی آپ ایک گرم کوٹی لے کر اور چند باتوں کی لطافت اور دلچسپی میں بہہ کر اپنی دھڑکنوں کو محبت کا راگ سمجھنے لگی ہو۔ مگر میرے شکیل بھائی تو اب تک نہ جانے کتنے تحفے دے چکے ہیں، وہ ہر لڑکی کو تحفہ دیتے ہیں تاکہ ان کے گرد لڑکیوں کا حلقہ وسیع ہو جائے، مگر محبت۔ اوں ہوں! محبت تو اُن کے نزدیک ایک وقتی جذبہ ہے، بیئر کا پیگ اور بس۔ پھر ایک پیگ چڑھا کر جیسے کبھی نشہ نہیں ہوا، ہاں تین چار پیگ سے گہری نیند آ جاتی ہے۔ بھیّا بھی اپنے نزدیک ایک وقت میں دو تین 'شعلے' دیکھ کر اطمینان محسوس کرتے ہیں۔ اور عافیہ آپ تو بڑی ہی حساس ہیں، ایک دم مشرقی جو محبت کے زینے سے پہلا قدم پھسل جانے کے بعد تاعمر اس کی چوٹ کو ذلت سمجھ کر اپاہج بن جاتی ہے۔ اگر آپ واقعی محبت کرنا چاہتی ہیں۔ تو آپ بھی ریحانہ بن جائیں، قدسیہ کی عادات اپنائیں، قمر اور بلقیس سے سبق لیجیے گا، نسیم اور افتخار کو دیکھئے گا۔ ان سب نے کئی بار محبت کی ہے، جو برساتی دھند کی طرح غائب ہو جاتی ہے۔ قمر، نسیم اور بلقیس، انھوں نے شکیل بھائی کے ساتھ پک نک منائی، سیریں کیں، تلاش اور کیرم کی بازیاں لگائیں، فلم دیکھے، رومان اور ادب پر گفتگو کی، اور آج کل بھیّا تمہاری باتوں میں محو ہیں تو اُن کو کوئی اور پسند آ گیا... اس طرح دونوں کی زندگیوں میں کوئی خاص فرق نہیں آیا ؎

اگر آپ کو ایونگ اِن مری مار کہ محبت کرنی ہے تو شوق سے۔ اگر آپ اس بازی میں جیت گئیں تو ہمیں خوشی ہو گی، کیونکہ اماں ابھی تک پارٹیوں پہ نہ جانے کتنے روپے برباد کر چکی ہیں۔ مگر ان کا بیٹا ابھی تک کوئی لڑکی پسند ہی نہیں کر سکا۔

"ادں ہوں! یہ لڑکی ہے یا پان کی بیگم، نوری چلتی کیسی ہے بطخ کی طرح، شاہدہ
ی کمر ضرورت سے زیادہ پتلی ہے۔ رابعہ کی آواز ایک دم مصنوعی، نادرہ تو حکم کا
لو لا ہے شاہینہ کی ناک بہت اونچی تو نشاط کی آنکھیں سانپ کی طرح گول" ؛
غرض وہ آج تک کوئی لڑکی پسند ہی نہیں کر سکے، یا جان بوجھ کر پسند کرتے ہی
نہیں۔ اسی لئے تو امی اب انہوں کی طرف پلٹی ہیں کہ شاید کوئی پسند کی بھول جائے
سی لئے عافیہ آپ کی ضرورت سے زیادہ خاطریں ہوتی ہیں، آپ کو فلم دکھائے
جاتے ہیں۔ پک نک منائی جاتی ہے، مگر دیکھئے اب بھی بھائی شادی کے لئے
سنجیدہ ہوتے ہیں یا نہیں، وہ ہر لڑکی کو دیکھنے کے لئے بہت جلد باز قسم کے ہیں،
پچھلے ہی اتوار کی تو بات ہے بڑی آپا کی نند گوہر کو پارٹی پر محض اس لئے بلایا تھا کہ
دیکھیں اب وہ کتنی بدل گئی ہے۔ سنا ہے کالج جاتے ہی بڑی ہی سمارٹ بن گئی
ہے۔ اور پارٹی کے ختم ہوتے ہی بھیا نے رائے دی: بڑی بور قسم کی لڑکی ہے۔
ور بشری بچاری بڑی بھلی سی لڑکی ہے، بی۔ اے پاس مگر بھیا کہتے ہیں اس کی
پ اسٹک ہمیشہ ایک طرف کے دانتوں پر لگی رہتی ہے۔ جس لڑکی کو لپ اسٹک لگانا
ہیں آتا وہ بھی کوئی لڑکی ہے۔ اور اب اگر بھیا کو آپ میں کچھ نظر آگیا ہے تو ہم
بھی خوش قسمت ہیں اور آپ بھی"۔

اور پھر ایک دم سے بھیا اور آپی کے قہقہوں نے میرے خیالات کی لہریں
میٹ ڈالیں ؛

دو تین دن سے بھیا بڑے پریشان سے نظر آنے لگے۔ ابا جی کے ساتھ کاروبار
کے کاغذات بھی ٹھیک نہ کئے تھے۔ بظاہر پریشانی کی کوئی وجہ نہ تھی، وہ اسی طرح
د بجے صبح بیڈ ٹی کا آرڈر دیتے اور ساڑھے دس بجے تک شیو، غسل اور ناشتے
سے فارغ ہو کر باہر نکل جاتے، دوپہر کا کھانا کسی ہوٹل یا دوست کے یہاں کھاتے
ین بجے واپس آکر سو جاتے اور شام چھ بجے ایوننگ سوٹ میں سیر کے لئے چل دیتے،
ساڑھے گیارہ بجے شب واپس آتے، اس لئے ہم میں سے کسی نے بھی انھیں نہیں
پوچھا۔ بارش کی زیادتی کے باعث رین کوٹ بھی ناکافی تھا، اس لئے بھیا نے
دوپہر تو سوتے میں گذار دی اور شام بھی گھر ہی میں بسر کی۔ ہفتہ کی رات جو اُن
کے لئے نئی رنگینیاں لے کر آتی۔ اسی لئے وہ ضرورت سے زیادہ خاموش اور
سنجیدہ بن گئے۔ میں نے آپی کے ساتھ جلدی سے کھانا کھایا۔ اور بھیا کے کمرے کا
رخ کیا۔ انھوں نے کمرے ہی میں کھانا منگوایا تھا۔ بھیا غسل خانے میں تھے، اُن کے
پلنگ کے قریب والی میز پر بیئر کی بوتل اور پیگ پڑے تھے ؛

"بیئر" آپی دیکھتے ہی چونک پڑی ؛

"بیٹھئے آپی" میں نے کرسی پیش کی، مگر وہ ابھی تک حیران کھڑی تھیں۔

"بیئر" وہ زیر لب پھر بولیں ؛

"آخر آپ کو اتنی حیرت کیوں ہے آپی" میں پوچھ ہی بیٹھی ؛

"مگر گھر میں بھی؟" آپی جیسے سرزنش لئے بولیں ؛

"تو اس سے اچھا طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے آپی کہ اپنے گھر کمرے میں بند ہو کر
پی جائے"۔ عین اس وقت بھیا ڈریسنگ گون کی ڈوری باندھتے ہوئے قریب
آ کر بولے ؛

"بیٹھو بھئی، کیوں کھڑی ہو دونو؟"

اور آپی مجسمے کی طرح آرام کرسی میں ڈھیری ہو گئیں۔ کمرے میں ہم تینوں
کی گہری گہری سانسیں ابھرنے لگیں۔ بند دریچوں پر بارش کے قطرے فوجی نوجوانوں
کی طرح چاند ماری کر رہے تھے۔ نیچے کھڈ سے ان گنت بوندیوں سے لبریز ہوا کے
تند جھونکے بڑی تندہی سے اوپر آکر شور مچا رہے تھے۔ میں نے شال اچھی طرح
لپیٹ کر اپنے آپ کو کرسی میں لٹا سا لیا، کمرے میں کافی خنکی تھی اور آپی نے بھی
خنکی محسوس کرتے ہوئے آرام کرسی میں دبک کر پاؤں سکیڑ کر پائنچوں میں چھپا لئے،
پشمینہ کی نرم کشمیری شال اپنے جسم کے گرد مضبوطی سے لپیٹ لی۔ بھیا پلنگ کی پائنتی
بیٹھے خاموشی سے لائٹر صاف کرنے لگے ؛

میں اس خنک سکوت سے اکتا کر خود ہی بولی "کوئی بات کی جائے بھئی۔
خاموش بیٹھنا تو تھا پھر میں اپنے بستر میں بہتر تھے"۔ اور بھیا نے پلٹ کر مسکراتے
ہوئے رائے دی: "آؤ تاش کھیلیں"۔ میں نے تاش کے پتے بانٹنے شروع کر دئے۔
"تم نے کافی کے لئے کسی کو کہہ دیا ہوتا" بھیا بولے۔ اور عین اس وقت ہلکی سی دستک
دے کر کریم کافی لے آیا۔ بھیا خلافِ معمول بنانے بھی لگے ؛

کافی اور تاش، تاش اور کافی، کتنا ہی وقت نکل گیا مگر بھیا کے چہرے
پر ابھی تک تھکن کے آثار تھے جنہیں وہ ایک ہفتہ سے چھپا رہے تھے۔ آپی کی آواز
میں میٹھی سی لہر تھی۔ مگر وہ بھیا کی بیئر سے آج بہت ڈر گئی تھیں حالانکہ جانتی تھیں
کہ وہ ہر قسم کی پینے کے عادی ہیں مگر عادی اتنا نہ سمجھتی ہوں گی کہ حضرت گھر پر
بھی شوق فرماتے ہیں۔ بھیا دھیرے دھیرے یہ شعر گنگنانے لگے ؎

پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا

"ذرا اونچے بھیا" آپی نے فرمائش کی ؛

اور بھیا واقعی اونچے سُروں میں بہہ نکلے، ایک کے بعد دوسرا، تیسرا اور
چوتھا اور پھر میں نے نمبر جمع کرنے کے لئے انھیں خاموش کرا دیا، اس دفعہ پھر
میں جیت گئی تھی ؛

اور بھیّا نے سگرٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔
"تم شکست سے خائف ہو عافی؟"

"جی نہیں بھیّا، شکست کے بغیر جیتنے کا کبھی لُطف نہیں آتا۔ جیت ایک لافانی عطیہ ہے تو شکست ایک ایسا تحفہ ہے جس کی کسک ابد تک قائم رہتی ہے"

"ہوں، تو تمہیں شکستیں عزیز ہیں؟ گویا کہ" بھیّا نے کش لگانے کے لئے بات روکی۔ آپی بولیں "ابھی تک تو کوئی شکست نہیں اپنائی، جسے عزیز رکھوں ویسے"۔

"اچھا تو شکستوں پر رونے کے متعلق کیا خیال ہے تمہارا؟" بھیّا نے مزید تفصیل چاہی۔

"رونا تو بچوں کا کام ہے شکو بھیّا، ویسے جو آنسو میں گہرائی ہے وہ قہقہے میں نہیں"۔

"ہوں تو عافی تم قہقہے سے بھی دلچسپی رکھتی ہو، میں حیران ہوں تمہارے خیالات مجھ سے اتنے کیوں ملتے ہیں۔ قہقہہ تو مجھے ہمیشہ پسند رہا۔ مگر آنسو، کسی ہمدرد کی آنکھ کا آنسو، محبوبہ کا آنسو، خوشی کا آنسو، غم کا آنسو واقعی ان میں کتنی گہرائی ہے۔ جن میں ڈوب کر انسان زندگی کے عمق میں پہونچ جاتا ہے۔ جدا ہوتے ہوئے محبوبہ کی آنکھ کا آنسو وہ سب کچھ کہہ دیتا ہے جو اُس کے لرزتے ہوئے ہونٹ کبھی نہیں کہہ سکتے، کسی زخم پر ایک ہمدرد آنسو کا قطرہ وہ اثر کرتا ہے جو مرہم نہیں کر سکتا"۔

"آخر آپ سارا فلسفہ آج ہی کیوں بگھارنے پر تلے ہیں؟" میں نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"تو کیا تمہیں نیند آرہی ہے؟" دلچسپ باتوں میں محو آپی چونک پڑیں۔ اور بھیّا کہنے لگے "میں کہتا تھا گھر میں رہ کر ہفتہ کی رات بور گذرے گی مگر شکر ہے کہ کچھ بہتر رہی" اور پھر "عہد وفا" کی آخری رات کے شعر گنگنانے لگے۔ اور آپی ایک بار پھر شاعر کے تخیل اور آواز کے تاثر میں ڈوب گئیں۔ "مگر بھیّا یہ دوگانہ ہوجاتا تو" میں نے یونہی کہہ دیا۔ اور آپی اپنی جگہ خود ہی سمٹ شرما کر رہ گئیں۔ آپی، عافی، ثانی بھلا شرمانے کی کیا بات ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہہ کر پھر سانس نکال لی اور پھر میں جونہی اُٹھی، آپی بھی چپلیاں گھسیٹتی میرے پیچھے لپک آئیں، رات کا ایک بجا تھا بارش پہلے سے ہلکی تھی پہاڑوں سے ٹکراتے ہوئے نالے بے طرح بلند آواز میں بہے جا رہے تھے۔ دریچے بند ہونے کے باوجود آہستہ آہستہ بج رہے تھے اور پردے ہل رہے تھے، روشنی بجھا کر میں بستر میں دراز ہو گئی۔

صبح سات بجے آنکھ کھلی تو پہاڑوں پر ہلکی ہلکی دھوپ کے آثار نظر آتے

اور مجھے یاد آیا، آج ننھے خلیل کی چھٹی سالگرہ ہے۔ وہ شام بھی کتنی دلچسپ تھی، تمام دن کی تیاری کے باعث ربانہ، مارینہ اور میں تھک سے گئے تھے، خلیل اور سہیل بچوں کو اکٹھا کرتے رہے، مارینہ نے آپی کو ہلکا سا میک اپ کیا، اسی لئے وہ مہمانوں کی نگاہوں میں بچ کر رہ گئیں۔ نرگس نے گانے کی فرمائش کی، پہلے تو بچوں کے لئے لوریوں کے کورس ہوتے پھر خلیل اور نجیا کا بڑا پیارا دوگانہ، اس کے بعد بے بی تابندہ، عشرت اور حوریہ کے ننھے ننھے دلچسپ ڈانس، خلیل اپنے تحفے دیکھنے دکھانے بڑی میز کی طرف لپکا اور بچّے اودھم مچاتے باہر نکل گئے۔ اب پارٹی کا رخ پلٹا۔ میں نے غور سے دیکھا، اب تصنع کے شاہکاروں کی مسکراہٹ بچوں کے کھیلوں سے ہٹ کر اپنے لئے تھی، شکیل بھیّا بچوں کے ڈانس دیکھنے آتے تھے اور اب بالوں اور جوڑوں کے نئے سٹائلوں، پنسل سے بنائے ہوئے ابروؤں، مشین سے مڑی ہوئی پلکوں، میکس فیکٹر سے رنگے ہوئے چہرے سے لُطف اٹھانے لگے تھے، بچوں کی سالگرہ تو ایک بہانہ ہوتا ہے ورنہ بچوں سے زیادہ ایسی محفل میں بڑے شامل ہوتے ہیں۔ یہاں رنگی ہوئی جوانیاں انگڑائیاں لیتی ہیں اور رومان انگڑائی کا میٹھا نشہ بن جاتا ہے۔

روزی ڈارلنگ ایک گانا سناؤ، ربانہ نے فرمائش کی، اور روزی نے ہمیشہ کی طرح اپنی ایک پسندیدہ غزل کملا جھریا کی آواز میں پیش کی۔ پھر ثمینہ کی باری آئی۔ اس نے گانا سنایا۔

آواز اتنی اچھی نہ تھی۔ اور اسی طرح پانچواں نمبر عافی کا، انھوں نے بڑے اصرار کے بعد ایک اور غزل چھیڑ دی اس کے بعد پارٹی ختم ہوگئی۔

دوسرے دن دوپہر کے قریب بھیّا اچانک ہی تار لئے گھر میں داخل ہوتے۔ عافی کے لئے بری خبر تھی، ان کے ابّا سخت بیمار تھے۔ بادلِ ناخواستہ انھوں نے جانے کی اجازت دی۔ انھوں نے اپنے کپڑے سمیٹے اور پانچ بجے کے قریب بھیّا نے ایجنسی سے آکر کار نکالی، بھیا اور میں چھوڑنے جا رہے تھے پنڈی تک، خیال تھا گاڑی پر چڑھا کر ہم بھیّا کے دوست وسیم کے یہاں رات گذاریں گے۔ امّی کو ڈائریا تھا۔ اباجی دو دن پہلے ہی کراچی جا چکے تھے۔ آپی اداس تھیں اور فکرمند بھی۔ امّی کی آنکھوں میں آنسو تھے، مارینہ اور ربانہ رو رہی تھیں۔

بھیّا اپنی عادت کے مطابق راستے میں بولنے لگے۔ "یہ جلیبی موڑ ہے عافی مگر ہاتھ کی لکیریں اس سے زیادہ پیچ دار ہیں۔ یہ چیڑ کے درخت ہیں، سرو کے درخت کو قامت یار سے تشبیہہ دی جاتی ہے مگر ان کے متعلق آج تک کسی نے نہیں سوچا حالانکہ جلتے یار سے پڑے ہوئے پھیپھڑوں کے چھالے

اسی کی ہوا سے شفا پاتے ہیں۔ اب ہمیں یہ موڑ نشیب میں لے جاتے گا۔" اور پھر بھیّا نے جب دیکھا کہ اُن کی شاعرانہ باتوں نے بھی اداس دل پر کوئی اثر نہیں کیا اور وہ کیف میں گانے بھی لگے تو میں نے جلدی سے کہا "شکو بھیّا شراب کا ذکر مت کیجئے، آپی تو پرسوں کی بیئر ہی سے بُری طرح خائف ہیں۔ آپ کے کمرے میں دیکھ کر"۔ تو بھیّا ایک ننھا سا قہقہہ اچھال کر بولے:۔

"بیئر! اسے بیئر سے کیوں ڈر گئیں؟ بیئر شراب نہیں، یہ تو گرمیوں میں اچھی ٹانک ہے۔ شراب سے ڈرنا کیا۔ عافیہ تم ادب نواز ہو تو پھر تمہیں شراب کا مرتبہ جاننا چاہیئے۔ اُس شراب سے ڈرنا چاہیئے جو پینے والوں کو پاگل بنا دے جو سرور اور کیف بخشے اُسے بڑھ کر اٹھا لینا چاہیئے، لڑکیاں یوں بھی شراب سے خائف رہتی ہیں شاید اپنا رقیب سمجھتی ہیں۔ اس لئے تمہارا ڈر بھی حیران کن نہیں۔ اچھا تو اِن شعروں کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے:

وہ آفتاب جو شب کو طلوع ہوتا ہے — تلاش کر کے کہیں سے وہ آفتاب تو لا

صدائے قلقلِ مینا بھی ایک نغمہ ہے — مرے حسین مغنی ذرا رباب تو لا

میں بھول جاؤں نہ مفہومِ زندگی اے دوست — ذرا چھلکتا ہوا ساغرِ شراب تو لا"

نیچے گھاٹی میں برساتی پانی نغمہ ریز تھا اور کار میں شکو بھائی اور میں ان دونوں سے محظوظ ہوتے پنڈی تک آ گئے۔ دل بری طرح متلا رہا تھا۔ آپی کو بھی چکر آنے لگے، اس لئے پہلے تو کافی پی گئی اور پھر وقت گذارنے کے لئے صدر اور مال پر پیدل ہی چل پڑے۔ بھیّا کی زبان اُسی طرح چل رہی تھی، آپی خاموش تھی، شہر کے آئس کریم سینڈوچ کھاتے ہوتے میں نے دونوں کے چہروں پر نظر کی۔ بھیّا کے چہرے سے سب پریشانی اور تھکن دُھل چکی تھی۔ مگر آپی خاموش تھی بھیّا سے چرب زبان شخص کی موجودگی میں بھی اداس تھی!

رات کو گاڑی پر چڑھا کر جب ہم واپس آنے لگے تو بھیّا نے کھڑکی سے لگ کر کہا "عافی مجھے افسوس ہے کہ تم سب گرمیاں ہمارے یہاں نہ گذار سکیں۔ اگر چچا جان بیمار نہ ہوتے تو بڑے آرام سے گرمیاں کٹ جاتیں" اور آپی نے مخصوص مسکراہٹ سے جواب دیا "جی قسمت کی لکیروں پر آبلے پھوٹ پڑیں تو برف کے گالوں کی تمنّا بے سود ہے شکو بھائی، ویسے میں نے اچھا وقت گذارا ہے جس کی یاد میرے دل میں ہمیشہ باقی رہے گی، خصوصاً آپ کے ساتھ جاتی ہوئی پک نک، بارش کے دن، سہانی اُجلی شامیں" بات کرتے میں آپی کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور بھیّا کے چہرے پر تھکن کی ایک لہر سی آ گئی:

"آنسو میں واقعی کتنی گہرائی ہے" میں نے آپ سے کہا۔

دوسری شام جب ہم مری جا رہے تھے، پنڈی سے چند میل آگے جا کر بھیّا نے اپنی جیب سے تار کا فارم نکال کر پُرزے پُرزے کر کے نیچے گھاٹی کی طرف اُڑاتے ہوتے کہا:

"جاؤ میرے جھوٹ کے حامل کاغذی پرندو اڑ جاؤ کرسمے بیت گیا" اور پھر خود ہی قہقہے لگانے لگے:

"بھیّا" میں نے چیخ کر سٹیرنگ پر رکھے ہوتے بھیّا کے ہاتھ کو بُری طرح کچل دیا۔ اور وہ بولے

"ڈر دنہیں میں پاگل نہیں مگر اتنی بات ہے کہ میں حقیقت کا سامنا کرنا نہیں چاہتا، کر سکتا ہی نہیں اور قریباً دس بارہ روز سے مجھے عافی کی آنکھوں سے خلوص اور پاکیزہ محبت جھلکنے لگی تھی، تم جانتی ہو اس معاملے میں کتنا بزدل ہوں، میں تو محبت کا مفہوم چند تحفوں کے تبادلے سمجھتا تھا اور پاکیزہ محبت کی دیوی عافیہ میری نظروں میں بہت بلند ہے، وہ خالص مشرقی لڑکی ہے اور میری محبت یا کُلے کی خوشبو، میرے وقتی جذبے برسات کے بادل ہیں اس کی آنکھوں میں زندگی کے سوز و ساز کی گہرای۔ اور میں ان حقیقتوں کا سامنا کبھی نہیں کر سکتا۔ میں نے کمرے میں بلا کر اس کے سامنے شراب پی، اس کے پاس بیٹھ کر دوسری لڑکیوں سے مذاق کیے اور پھر ایک فارم ڈیم کو پنڈی بھیجدیا۔ تم نے جلدی سے پنڈی اور لاہور کی غلطی نہ جانی۔ تار میں نے جیب میں رکھ لیا۔ ہوں تم اداس ہو، مجھے پتہ ہے وہ تمہیں بہت عزیز تھی مگر میں تو نرگس کے لئے زمرد آپا کو کہہ چکا ہوں۔ وہ اس ہفتہ نکاح کرنے کو تیار رہیں۔ آج مجھے دیکھو کتنی خوشی ہے، آج شام کتنی حسین ہے۔ مجھے یوں معلوم ہو رہا ہے کہ پہلی بار میں مری میں داخل ہو رہا ہوں" اور بھیّا نہ جانے کیا کیا بولتے رہے:

سر کو سیٹ کی پشت سے لگا کر میں نے نئی شام کی اُجلی شفق پر ایک نظر ڈال کر نمناک آنکھیں بند کر لیں:

پشتو عوامی کہانی

فہمیدہ اختر

لنڈی خانہ کے درخت شینوں سے بھرے ہوتے تھے۔ گہرے سبز رنگ کے گول گول سے پتوں میں مونگیا رنگ کے شینوں کے خوشے لنڈی خانے میں گہرا حسن پھیلا رہے تھے۔ زرسانگہ کے قدم رقص کی سی کیفیت لئے شاطرینہ سے آگے بڑھ گئے اس نے ہنستی ہوئی نظروں سے شینوں کے شاداب درختوں کو دیکھا اور دوپٹہ سامنے والے درخت کی اوپر والی شاخ پر پھینک کر اسے نیچے جھکا لیا۔ اور شینوں کے خوشے توڑ توڑ کر جھولی میں ڈالنے لگی۔ جب جھولی بھر گئی تو دونوں ہاتھوں سے اُسے رگڑ سی دی۔ خوشوں میں سے شینوں کے دانے جھولی میں بکھر گئے۔ اس نے دانے ٹوکری میں ڈال دئے اور دانوں سے خالی خوشے پھینک دئے۔ اس نے دوسری شاخ جھکائی اور دونوں ہاتھوں میں اسے پکڑ کر جھولا سا جھولنے لگی۔ اتنے میں اس کے کانوں میں ایک رسیلی سی آواز آئی: "بہت خوش ہو۔ بھائی کی منگنی ہونے والی ہے، آخر کیوں نہ اتنی خوشی ہو۔ آٹھ بہنوں کا ایک بھائی ہے۔" زرسانگہ نے ایک دم سے رک کر سامنے دیکھا۔ اس کی نظر درختوں میں چھپی ہوئی گل مندا پر پڑی۔ ایک لطیف قہقہہ اس کے پاکیزہ لبوں پر پھیل گیا۔ جھکی ہوئی شاخ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔ وہ بولی "منگنی تو جمعے کو ہوئی ہے مگر خوشی منانی ابھی باقی ہے۔ ہمارے آدمی جلال آباد گئے ہوئے ہیں، قوال لانے کے لئے۔" گل مندا مسکرائی اور زرسانگہ کے قریب آتے ہوئے بولی: "اچھا، مجھے تو علم نہ تھا، تمہیں مبارک ہو۔"

زرسانگہ کی نشیلی آنکھوں میں شینوں کے درختوں کی ساری ٹھنڈک بھر گئی۔ اس نے دعا دی "خدا کرے تمہارے بھائی کی منگنی بھی جلد ہو جائے۔" گل مندا نے پوچھا "وہ لوگ کب لوٹیں گے جلال آباد سے؟" زرسانگہ نے آزاد سرزمین کی آزاد ہواؤں میں ایک سرد سانس لیتے ہوئے کہا "ہو سکتا ہے آج ہی آجائیں پھر آج رات کو ہی محفل جمے گی، تم بھی آنا ہمارے ہاں، چھت پر سے تماشا دیکھیں گے۔" اور زرسانگہ کے خوبصورت ہاتھ اوپر اٹھ گئے اور اس کی لانبی لانبی سفید سفید انگلیاں گریبان میں اٹکے ہوئے کابلی روپوں پر ٹپ ٹپ کرنے لگیں گویا وہ بھائی کی منگنی کی خوشی میں کوئی سریلا سا ساز بجانے لگ گئی ہو۔ ایک مضبوط ہاتھ نے پیچھے سے آکر اس کا بایاں ہاتھ پکڑ لیا۔ گل مندا کی نظریں کانپ گئیں اور زرسانگہ کا دایاں ہاتھ کابلی روپوں پر ساز بجاتا ہوا ایکدم رک گیا۔

اس نے حیران ہو کر بائیں جانب دیکھا۔ اس کی نظر شاہ خمیر پر پڑی۔ وہ فوراً معاملے کو سمجھ گئی اور اُسے حقیقت بتانے کے انداز میں چلائی "میں یارزائی کے یار محمد کے خاندان سے نہیں ہوں، میں کرمنہ کے بادشاہ گل کے خاندان سے ہوں، میرا لباس تو دیکھو یہ کرمنہ کا لباس ہے۔" مگر شاہ خمیر نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے اپنے پیچھے کھینچنے لگا۔ گل مندا گرجی "یہ سچ کہہ رہی ہے، اسے چھوڑ دو۔" شاطرینہ نے درختوں کے درمیان سے دیکھا اور اس کے چہرے کے ارد گرد دہکتے ہوئے انگاروں نے حلقہ کر لیا، اُس نے ایک بھاری پتھر اٹھایا تاکہ شاہ خمیر کا سر پھوڑ دے۔ اچانک اس کی نظر شاہ خمیر کے دو ساتھیوں پر پڑ گئی۔ اُسے اپنی جان بھی خطرے میں محسوس ہوئی۔ وہ غصے میں لرزتی ہوئی درختوں کی آڑ میں ہو گئی۔ زرسانگہ کے کانوں میں قبائلی علاقے کی تیز و تند آندھیوں کا سارا شور بس چکا تھا۔ وہ طوفان کی طرح چیخی "میں زخاخیلوں کے بہادر اور غیرت مند قبیلے سے ہوں بدبخت، ہمارے ساتھ کیوں دشمنی مول لیتے ہو؟" جب اس نے محسوس کیا کہ شاہ خمیر اکیلا نہیں اس کے ہمراہ دو نوجوان اور بھی ہیں تو اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ "ارے بہادرو پہلے دشمن کو پہچانا کرو، پھر دشمنی کیا کرو۔" شاہ خمیر کے قدم مدھم پڑ گئے، اس نے مڑ کر زرسانگہ کی طرف دیکھا۔ شکر خان غرایا "ایسے ہی کہہ رہی ہے، مت چھوڑنا۔" اس کے ساتھ ہی شاہ خمیر کی رفتار تیز ہو گئی۔

جوان اول بی بی کیمپ کے باہر بیٹھی اپنا سرخ رنگ کا کرتا سی رہی تھی۔ جب اس کی نظر شاہ خمیر اور زرسانگہ پر پڑی تو اس کی سفید پیشانی پر کئی شکنیں نمودار ہو گئیں اور ان شکنوں میں سوچ کے آثار نمایاں ہو گئے۔ چند لمحوں تک ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھی، کرتا کندھے پر ڈالا اور زرسانگہ کے قریب آکر اسے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔ زرسانگہ کے ترو تازہ چہرے پر شفق کی ساری سرخیاں جمع تھیں، اس کا سانس تیزی سے آجا رہا تھا اور اس کی نشیلی آنکھیں انگارے برسا رہی تھیں۔ اول بی بی نے قہر آلود نظر شوہر پر ڈالی اور بولی "نئی دشمنی مول لے لی؟ یہ لڑکی یار محمد کے خاندان سے نہیں، یہ کرمنہ کی معلوم ہوتی ہے۔" شاہ خمیر کی نظروں میں غصہ بھر گیا، وہ شکر خان کی طرف دیکھنے لگا۔ زرسانگہ نے بھی ایک لمحے کے لئے شکر خان کی طرف دیکھا۔ شکر خان کو یوں لگا

جیسے وہ کہہ رہی ہو "تم ایک ٹھیک دشمن نہیں ہو"۔ لشکر خاں کے سینے میں پشیمانیوں کے مدوجزر اٹھنے لگے۔ وہ شانے کے ساتھ لٹکے ہوئے پستول سے کھیلنے لگا۔ اور خفت آمیز لہجہ میں بولا "تو کیا ہوا، یہ واپس جا سکتی ہے"۔

اوّل بی بی نے زرسانگہ کے شانے پر محبت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "چلو بہن کچھ کھا پی لو۔ تھک بھی گئی ہو گی، ذرا آرام کر لو، دوپہر کے بعد چلی جانا"۔

زرسانگہ نے بے قراری سے کہا "نہیں میں ابھی وقت واپس جاؤں گی"۔

اوّل بی بی اسے سمجھانے لگی، "اتنا صبر کرو بہن کہ گل اکبر اور خان بادشاہ آجائیں، ان کو تمہارے ساتھ بھیج دوں گی، تم اکیلی کیسے جاؤ گی؟"

زرسانگہ کیمپ کے اندر جا کر چارپائی پر ایک طرف چپ چاپ بیٹھ گئی۔ اوّل بی بی نے اس کے سامنے ایک چنگیر لا کر رکھ دی، اس میں لسی سے بھرا ہوا کٹورہ، مکھن، پیاز اور جوار کی دو روٹیاں تھیں۔

زرسانگہ منہ پھیر کر بولی "میں کھانا نہیں کھاؤں گی"۔

اوّل بی بی نے نرمی سے کہا "تم ہماری مہمان ہو بہن، تمہارے خاندان سے ہماری کوئی دشمنی نہیں" اور لسی کا پیالہ زرسانگہ کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

جب قبائلی علاقے کی ہواؤں میں دوپہر کی تمازت بھر گئی تو زرسانگہ، گل اکبر اور خان بادشاہ کے ساتھ چل پڑی۔ "آپ لرگی" کا پہاڑ عبور کر کے وہ اسے "لنڈی خانے" تک چھوڑ کر واپس چلے گئے۔ شبنوں کے ٹھنڈے سایوں والے درختوں کے جھنڈ تک پہنچ کر اسے اپنی نند شاطر بیہ کا خیال آیا۔ اس نے کرمنہ کے سارے علاقے میں آگ لگا دی ہو گی! ایسا نہ ہو کہ آدم خیل آ چکا ہو اور قوالوں کو واپس کر دیا ہو۔ وہ شبنوں کے خوبصورت درختوں میں بھاگنے لگی۔ آن کی آن میں تاغیانو کے پہاڑ پر چڑھ گئی اور پھر تیزی سے دوسری طرف اتر گئی۔ جب اس نے کرمنہ کی سرزمین پر قدم رکھا تو اس کا جی چاہا کسی سے پوچھے "میرے بھائی نے قوال تو واپس نہیں کر دیئے؟" اچانک اس کی نظر یارانے پر پڑی جو کھیتوں کے درمیان والی پگڈنڈیوں پر سے گذر رہا تھا۔ وہ اس کے قریب جا کر بے تابی سے بولی "میرا بھائی جلال آباد سے آگیا ہے؟ اس نے قوال تو واپس نہیں کر دیئے؟" یارانے نے اسے حیران نظروں سے دیکھا اور کہا "وہ ابھی نہیں آیا"۔ زرسانگہ کی زندگی کے گویا تمام اندیشے علاقہ آزاد کی فضاؤں میں کھو کر رہ گئے۔ وہ گنگنائی "خدایا ہم آٹھ بہنوں کے بھائی کو سات بیٹوں کا باپ کرنا"! یارانے نے کچھ پوچھنا چاہا مگر وہ پگڈنڈیوں پر سے دوڑتی چلی گئی۔

شاطر بیہ صحن میں مرجھائی ہوئی بیٹھی تھی، محلہ کی چند عورتیں اسے گھیرے ہوئے تھیں۔ جب ان کی نگاہ زرسانگہ پر پڑی تو وہ چونک سی گئیں اور اس طرح اسے دیکھنے لگیں جیسے ماضی کے پردوں میں چھپے ہوئے کسی شناسا کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ چند لمحے لگاتار دیکھنے کے بعد شاطر بیہ کا سویا ہوا چہرہ جاگ اٹھا۔ وہ بھاگ کر آئی اور اپنی حسین بھاوج کے گلے سے لپٹ گئی۔

کرمنہ میں شور مچ گیا کہ زرسانگہ واپس آگئی، وہ غلطی سے لے جائی گئی تھی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا گھر عورتوں اور بچوں سے بھر گیا۔ سب اسے ایسی نظروں سے دیکھنے لگے تھے جیسے انہوں نے اسے پہلی بار دیکھا ہو اور وہ کسی اجنبی شہر سے آئی ہو۔

جب دن کے اجالے شام کے دھندلکوں میں ڈوبنے لگے تو ننھا رخسے بھاگتا ہوا آیا اور بولا "وہ آگئے ہیں"۔ زرسانگہ کا جی چاہا کہ وہ رخسے کو گود میں اٹھا کر اس کا پھول سا چہرہ چوم لے مگر وہ جلدی سے باہر بھاگ گیا۔ وہ بھاگتی ہوئی چھت پر گئی اور دیوار کی آڑ میں ہو کر نیچے دیکھنے لگی۔ اس کی نظر کئی چہروں پر پڑنے کے بعد آدم خیل پر پڑی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ناچتی ناچتی اس تک پہنچ جائے اور اسے سینے سے لگا لے اور کہے "میرے اچھے بھائی، اللہ تجھے سات بیٹوں کا باپ بنائے"۔

یارست کرمنہ کی چہ میگوئیوں سے بے خبر حجرے کو درست کرنے لگ گیا۔ اس کے چہرے پر جلال آباد کے سفر کی تکان کے کوئی آثار نہ تھے۔ حجرے کے چاروں طرف چارپائیاں ڈال دی گئیں اور درمیان میں چٹائی بچھا دی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کرمنہ کے جوان اور بوڑھے بندوقیں تھامے ان کی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ بچے قوالوں کے ارد گرد زمین پر جمع ہو گئے، محلہ کی کئی عورتیں آئیں اور زرسانگہ کے پاس چھت پر چلی گئیں، قوالوں نے قوالی شروع کر دی اور کرمنہ کے در و دیوار موسیقی کی تانوں میں کھو گئے۔

یارست محسوس کرنے لگا کہ محفل میں بیٹھے ہوئے لوگ جب اس کی طرف دیکھتے ہیں تو ان کی نظریں کوئی عجیب سی کہانی سنانے لگتی ہیں۔ اس نے غزل سے پوچھا "یہ کیا بات ہے"؟ غزل نے اسے اشارہ کیا اور وہ دونوں موسیقی کی محفل سے باہر نکل گئے۔

غزل صبح کا واقعہ سناتا گیا اور یارست کا خون کھولتا گیا۔ جب غزل خاموش ہو گیا تو یارست نے ایک جھٹکے کے ساتھ ہاتھ میں تھامی ہوئی بندوق کو کندھے کے ساتھ لگا لیا اور بھاری بھاری قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا۔ غزل اس کے پیچھے بھاگا "دیکھو دوست، بھابھی بے قصور ہے، اسے کچھ نہ کہنا"۔

یارست غرّایا "اسے بازار کے علاقے میں جا کر شینے اکٹھے کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی تھی کہ لوگ میری طرف دیکھیں اور کہیں کہ اس کی بیوی

کو فلاں لوگ پکڑ کر لے گئے تھے؟ تم چاہتے ہو کہ میں بے غیرت بن جاؤں اور خاموش رہوں؟" اور وہ تیز تیز قدموں سے جانے لگا۔ غزل دیر تک وہاں حیران اور پریشان کھڑا رہا۔

صحن میں قدم رکھتے ہی یارمست نے بیوی کو پکارا۔ آواز میں پہاڑ دل کی سی سختی اور طوفانوں کا سا جوش تھا۔ بھائی کی منگنی کی خوشیوں میں مگن اور ساری کائنات سے بے خبر زرسانگہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی اور لرزتے قدموں سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آنے لگی باقی عورتیں خوفزدہ ہو کر چھت کے اس کنارے پر آگئیں۔ یارمست گرجا "میرے گھر سے اسی وقت نکل جاؤ، میں بے غیرت نہیں ہوں کہ اس عورت کو گھر میں رکھوں جس کے ہاتھوں میری بے عزتی ہو۔" زرسانگہ کے حلق میں علاقۂ آزاد کے سارے کانٹے چبھ گئے۔ چھت پر بیٹھی ہوئی عورتیں لرز کر رہ گئیں۔ شاطرینہ کو چکر سا آگیا، وہ بھاگ کر آئی اور بھائی کے قدموں میں گر پڑی۔ "میرے بھائی، اس بیچاری کا کیا قصور ہے؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" یارمست نے پاؤں کھینچ لئے۔ "میں نہیں چاہتا کہ میرے وطن کے دشمن اسے میرے لئے ایک مستقل طعنہ بنا دیں۔ میں وطن کے لوگوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں غیرت مند ہوں۔" پھر وہ بندوق زور سے زمین پر مار کر بولا۔ "تم ابھی تک کھڑی ہو، میں کہتا ہوں جاؤ، بھائی کے گھر کا رخ کرو۔"

زرسانگہ بوجھل قدموں سے دروازے سے نکل گئی۔ اس کی زندگی کی راہوں پر جلتے ہوئے سارے دیئے بجھ گئے۔ چاروں طرف تاریکیاں پھیل گئیں۔ اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ اس نے دیوار کا سہارا لے لیا۔ کیا یہ خواب ہے؟ اس نے بے جان سے دل کے ساتھ سوچا۔ وہ زور زور سے آنکھیں جھپکانے لگی۔ تو کیا یہ حقیقت ہے؟ اس کے سوئے ہوئے سے دماغ میں یہ خیال ابھرا۔ اس کے ساتھ ہی موسیقی کی تانیں بستی کے لوگوں کے تمسخر آمیز قہقہوں میں بدل گئیں۔ وہ آگ اگلتے ہوئے تنور میں جا گری، اس کے لبوں کو تیزی سے جنبش ہوئی۔ "یہ شاطرینہ کا بھائی سمجھتا ہے کہ وہ غیرت مند ہے اور میں غیرت مندوں کی بیٹی نہیں ہوں۔" اس کے پاؤں تیزی سے حرکت میں آگئے۔ وہ بھائی کے حجرے کی طرف بھاگتی ہوئی چلی گئی۔

آدم خیل سامنے والی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ روز کی نسبت زیادہ خوبصورت اور جوان معلوم ہو رہا تھا۔ اچانک زرسانگہ کو یوں لگا جیسے وہ دور دیس کے ایک طاقتور قبیلے کو اس کا دشمن بننے کے لئے پکارنے آئی ہے۔ وہ دہلیز پر جا رکی۔ اس کی نظریں اوپر اٹھ گئیں۔ آسمان کی نیلاہٹوں میں سات تاروں کا جھرمٹ بڑی تیزی سے چمک رہا تھا۔ اس نے اس کی چھاؤں میں گہری ٹھنڈک محسوس کی۔ اس کے قدموں نے اس طرف لپکنا چاہا مگر اسی لمحے اس نے پریشان ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ کائنات پکارنے لگی تھی "بے غیرت!" شعلے لپکے اور اس کی روح سے بغلگیر ہو گئے۔ ان کی گرمی میں نیلگوں آسمان پر چمکنے والے سات تارے اپنی ساری ٹھنڈک کھو بیٹھے۔ وہ اس زور سے لڑکھڑائی کہ محفل میں سے بہتوں کی نظر اس پر پڑ گئی۔ دوردان شاہ جلدی سے اس کے پاس آیا اور پوچھا "کیا بات ہے؟" وہ بے چینی سے بولی "آدم خیل کو بھیج دو۔"

آدم خیل نے قریب آتے ہی خوشی کے لہجے میں کہنا چاہا۔ قوال اچھے ہیں؟ میں تو نہیں لانا چاہتا تھا، پھر سوچا چلو ہماری بہن خوش ہو جائے، اصرار کر رہی ہے، مگر جب اس نے تاروں کی مدھم روشنی میں اسے غور سے دیکھا تو پریشان ہو کر کہا "کیا بات ہے؟ کسی نے تمہیں کچھ کہا ہے؟"

زرسانگہ اسے صبح کی واردات سنانے لگی، اس کی آواز میں تند ہواؤں کا سا زور تھا۔ جب وہ خاموش ہو گئی تو آدم خیل اداسی سے بولا "تو یارمست نے تمہیں گھر سے نکال دیا ہے؟"

"ہاں! وہ کہتا ہے میں بے غیرت نہیں ہوں کہ تمہیں گھر میں رکھوں۔ تمہارے ہاتھوں میری بے عزتی ہوئی ہے" پھر اس کا وجود تیزی سے جلنے لگا، وہ چیخ پڑی "اس نے اس طرح مجھے گھر سے نکال کر تمہاری غیرت کو پکارا ہے۔"

آدم خیل کے صحت مند وجود میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ وہ فیصلہ کن لہجہ میں بولا "میری غیرت اس پکار کو سنے گی، میرے پیچھے آؤ۔"

یارمست صحن میں بیٹھا بندوق گود میں لئے کلائیاں گھٹنوں پر رکھے اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ تھامے کچھ سوچ رہا تھا۔ جب ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھلا تو وہ چونک اٹھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اس نے دیکھا کہ آدم خیل کی آنکھوں میں کسی پختہ مگر خطرناک عزم کی سرخی ہے اور اس کے پیچھے زرسانگہ کھڑی ہے۔ آدم خیل گرجا "میں دشمنوں کو غیرت کے معنی سمجھانے جا رہا ہوں، اب تمہیں میری بہن کو گھر سے نکالنے کی ضرورت نہیں۔" اور جب وہ دروازے کی طرف مڑا تو زرسانگہ بولی "شاہ خمیر تو مجھے راستے سے ہی واپس کر دیتا لیکن شکر خان نے اسے ایسا کرنے سے روکا۔"

آدم خیل سوچ میں پڑ گیا "میں نے شکر خان کو کبھی نہیں دیکھا۔"

زرسانگہ جلدی سے بولی "اس کے چہرے پر چیچک کے داغ ہیں۔"

یہ سنتے ہی آدم خیل تیزی سے دروازے سے نکل گیا۔ اس وقت اس کے قدموں کی چاپ سے زمین کا سینہ کانپ رہا تھا، حجرے میں پہنچتے ہی وہ چیخا "بند کر دو یہ موسیقی!"

آثار صنادید : چوبرجی

(لاھور کا ایک شکستہ باغ)
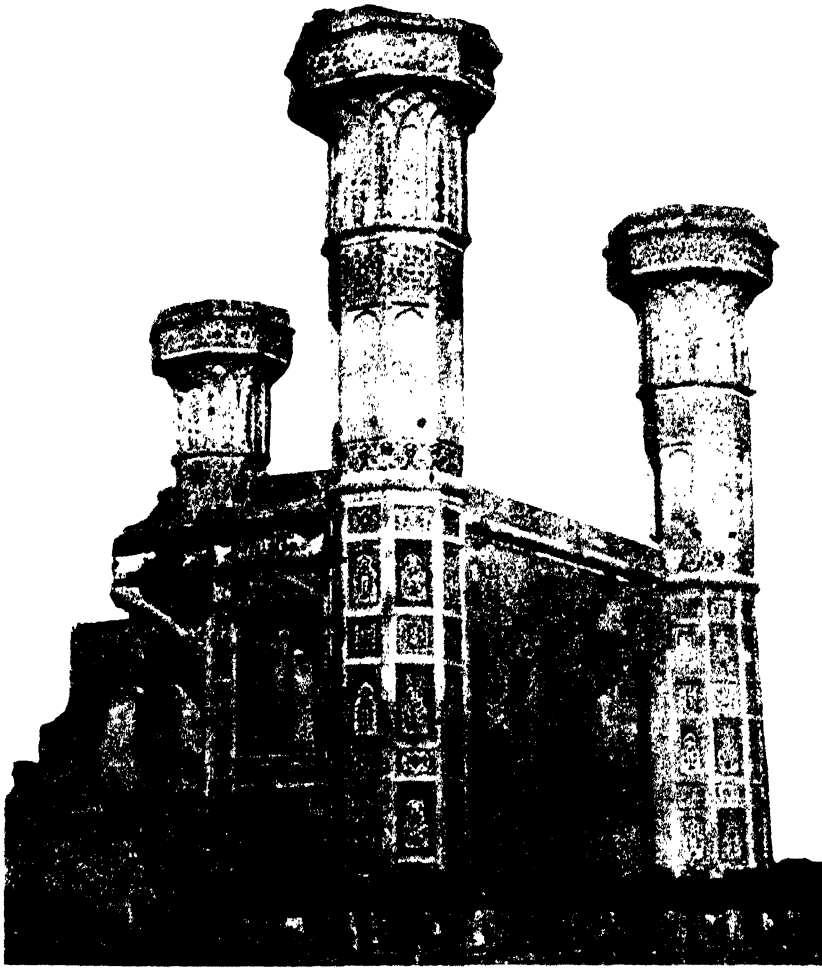
صدر دروازہ

میناروں پر نقش و نگار

ایبٹ آباد

(مغربی پاکستان کی خوش منظر پہاڑی بستی)

موسیقی ایک دم بند ہوگئی۔ آدم خیل کے سُرخ چہرے کی طرف لوگ اس طرح دیکھنے لگے جیسے اُنہیں تمام معاملے کا علم ہو۔ مت غلی اُسے مشورہ دینے لگا "اس وقت اس محفل کو درہم برہم نہ کرو۔"

آدم خیل بندوق پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "جب تک میں دشمنوں سے انتقام نہیں لے لیتا صرف اس بندوق سے پیار کروں گا۔"

مت غلی کہنے لگا "انتقام کا وقت معین نہیں ہوتا، انتقام چالیس سالوں میں بھی لیا جاسکتا ہے۔"

"میں باعزت بادشاہ گُل کا بیٹا ہوں، میری نظروں میں بے عزتی کے انتقام کا وقت معین ہے، میں چالیس گھنٹوں کے اندر اندر انتقام لونگا۔"

مت غلی کے چہرے پر فکر کے آثار پیدا ہوگئے۔ "بے وقوف نہ بنو آدم خیل، بہتر موقع کی تلاش میں رہو۔ شاہ خمیر کیمپ میں رہتا ہے اور کیمپ میں گورا فوج ہے۔"

آدم خیل گرجا "تم بھولتے ہو مت غلی، غیرت کی آگ پہاڑوں میں شگاف پیدا کر دیتی ہے اور سمندروں کے پانیوں کو خشک کر ڈالتی ہے۔"

پوری محفل نے یہ سب کچھ سنا۔ روغن شاہ نے بنات گُل سے کہا "غیرت مندوں کی اولاد غیرت مند ہوتی ہے، طاقتوروں کے مقابلہ پر جا رہا ہے، وہ چھ بھائی ہیں اور یہ تنہا ہے۔"

ملنگ نے خان میر سے کہا "عزت دنیا کی بہت بڑی دولت ہے۔"

اسی رات علاقۂ غیر کے آسمان پر چمکنے والے چاند نے ایک خوبصورت نوجوان کو دیکھا جس نے بندوق تھامے تیز تیز قدموں سے بوڑے پہاڑ کو عبور کیا اور خیبر سے ہوکر لواڑگی کی طرف چلا۔ اس کے پیچھے لالٹین تھامے اس کے دو ساتھی تھے۔

صبح چار سیر گوشت خریدا گیا اور سیڑھی کہیں سے حاصل کی گئی اور رات کی تاریکی میں جب کیمپ کا رخ کیا گیا تو کتے بھونکنے لگے۔ ان کے آگے چار سیر گوشت پھینک دیا گیا، وہ گوشت کھانے لگے۔ رات خاموش ہوگئی، کیمپ کی دیوار کے ساتھ سیڑھی کھڑی کر دی گئی۔ آدم خیل بڑے اطمینان سے اوپر چڑھا، دیوار کے اندر کی جانب دایاں پاؤں اور باہر کی جانب بایاں پاؤں لٹکا کر سیڑھی اوپر کھینچنے لگا۔ نیچے سے گُل نواز اور مست خان سیڑھی اوپر کی طرف اٹھا رہے تھے۔ جب وہ اوپر اٹھ گئی تو آدم خیل اسے کیمپ کے اندر کی جانب جھکانے لگا، یہاں تک کہ وہ دیوار کے ساتھ لگ گئی۔ آدم خیل نیچے اترا اسے چاند کی مدھم روشنی میں کئی چارپائیاں نظر آئیں۔ وہ ایک چارپائی کے پاس گیا، وہاں ایک عورت کو سویا ہوا پایا، دوسری چارپائی کے پاس گیا تو نظر چیچک کے داغوں سے آلودہ چہرے پر پڑی۔ اس کے سانسوں کی رفتار تیز ہوگئی، اس نے حقارت سے چیچک زدہ چہرے کو دیکھا اور بندوق اس کے سینے پر رکھ کر چلا دی۔ کیمپ میں سوئے ہوئے لوگ ایکدم جاگ پڑے، انہیں یوں محسوس ہوا جیسے خواب میں کچھ دیکھا ہو۔ کیمپ کے اندر کسی کا قتل، کوئی اتنی جرأت کر سکتا ہے؟ ہر ایک کا ذہن یہی سوچ رہا تھا۔ تھوڑی دیر اس کیسی وہم کے پیدا ہوتے ہی شاہ خمیر نے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ سید اکبر نے بھی عین اسی وقت سر اٹھایا اور پوچھا "گولی چلنے کی آواز تھی؟" اب تو شاہ خمیر گھبرایا اور جلدی سے بولا "ہاں"۔ پھر وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور سرہانے رکھی ہوئی بندوق فوراً ہاتھ میں تھام لی۔ سید اکبر بھی اٹھ بیٹھا اور پورے کیمپ میں کھلبلی مچ گئی۔ اس وقت تک آدم خیل دیوار پھاند کر کیمپ سے دور جا چکا تھا۔ ایکدم کیمپ سے روشنیاں بلند ہوئیں، آدم خیل اور اس کے ساتھی سیڑھی کے ساتھ زمین پر منہ کے بل لیٹ گئے۔ جب اندھیرا چھا گیا تو بجلی کی سی تیزی سے اٹھے اور بھاگنے لگے۔ پھر روشنیاں بلند ہوئیں اور وہ پھر زمین کے سینے سے چمٹ گئے۔ جانے کتنی بار روشنیاں بلند ہوئیں اور کتنی بار اُن کے تندرست وجودوں نے زمین کی چھاتی کو چھوا۔

دوسرے روز صبح تک کرمنہ، یہ خبر پہنچ گئی کہ آدم خیل کامیاب رہا۔ اسی روز مغرب کے وقت وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ چپکے سے لواڑگی کے ایک مکان سے نکلا اور کرمنہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ بوڑے پہاڑ کو عبور کرنے تک وہ بڑے چوکنے رہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ چاروں طرف نظریں دوڑا لیتے۔ بوڑے پہاڑ کو عبور کرنے کے بعد آدم خیل کے فتحمندانہ قدم بہن کے گھر کی طرف اٹھ گئے۔ بستی کے مردوں، عورتوں اور بچوں کا ایک جم غفیر اسے تحسین کی نظروں سے دیکھتا ہوا ساتھ ہولیا۔ زرسانگہ دوڑ کر آئی اور اس کی مضبوط چھاتی سے چمٹ گئی۔ وہ غیور لہجے میں بولا "میں نے تمہیں پشتونوں میں بہت اونچا کر دیا ہے۔" ان گنت نظریں زرسانگہ کی طرف اٹھ گئیں۔ زرسانگہ کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ اس بستی کی ایک ایسی باوقار ملکہ ہے جس کی مسرتوں کے چمکتے ہوئے چاند کو بجھانے کے لئے دور دیس کا ایک قبیلہ کمر باندھ رہا ہے۔ ایکا ایکی سات دیئے نیلگوں آسمان میں بکھر کر خلاؤں میں کھو گئے۔ وہ بے اختیار رونے لگی، اس نے آدم خیل کی چوڑی چھاتی کے گرد اپنی باہوں کا حلقہ اور تنگ کر لیا اور اس کی جانب اٹھی ہوئی ان گنت نظروں میں عزت وتوقیر [illegible]

پچھتاوا

حسیل نقوی

کبھی چلے تھے ہم اک عزمِ زندگی لے کر
تری نگاہ سے ٹکرا کے پاش پاش ہوا
وہ ایک راز جو تحت الشعور میں تھا نہاں
ترے وصال کی منزل پہ آ کے فاش ہوا

ترا وجود مری زندگی کا سرمایہ
ترا خیال مرے دل کا جزوِ لاینفک
مشامِ جاں کو عطا کر رہے ہیں شادابی
تری جبیں کا پسینہ ترے بدن کی مہک

مگر یہ کیا، نہ تمنا، نہ آرزو، نہ خلش
یہ زندگی ہے تو اس زندگی میں رنگ کہاں
ہزار گرمیٔ احساس، ایک سوزِ دروں
نشاطِ بزم کہاں، خوفِ عار و ننگ کہاں

بہت حسین ہیں رنگینیوں کے افسانے
کہ مستعار ہیں رنگ آفریں بہاروں سے
جلو میں جلوۂ صد لالہ زار ہو تو کیا
جنوں کی پیاس تو بجھتی ہے خارزاروں سے

جنوں بکھیر رہا ہے فضا میں لالہ و گل
مگر یہ کیا کہ خرد رولتی ہے انگارے
فروغِ جلوۂ صد کہکشاں کو کیا کیجے
مری نظر میں سلگتے ہیں ڈوبتے تارے

بفیضِ حسن شگفتہ ہوا گلِ احساس
بنامِ عشق جنوں کامگار رہ نہ سکا
وبالِ جان ہوئی فطرتِ دلِ خودگیر
قرار پا نہ سکا بے قرار رہ نہ سکا

تم کون ہو؟

قاضی نذر الاسلام
مترجمہ: احتشام الدین

تم کون ہو اے دوست جو یوں کرتے ہو نظروں سے اشارے

پھر بند کبھی سب مجھ پہ ہیں دروازے شبستاں کے تمہارے

للا کے ہوا چیت کی دیتی ہے پُراسرار سندیسے

باغوں میں چہکتی ہیں جہاں کوئلیں شاخوں کے سہارے

بیساکھ میں پھر فاختہ آتی ہے تری بن کے پیامی

کیا کیا مجھے للکارتے ہیں ندی کے بپھرے ہوئے دھارے

پت جھڑ میں چھلکتے ہیں سرِ شاخ تری پلکوں کے آنسو

اگہن کبھی جاڑے میں تو اٹھلا کے ٹھوکے مجھے مارے

اور پوس میں تنہا تو بھٹکتا ہے مری یاد میں اکثر

ہم کرتے ہیں اک بحرِ جدائی کے کناروں سے اشارے

اے شاعرِ وارفتہ ہم آغوشِ نسیم و نفسِ گل ہو بصد شوق

کرنے ہوں اگر دوست کے کاشانۂ رنگیں کے نظارے

ہدیہ ہائے نیاز

عالی رضوی

یہ شب کی مانگ ستاروں سے کون بھرتا ہے
ہوائیں مشک چھڑک کے کہاں سے لاتی ہیں
ستارے ڈوب کے کن سمتوں کو جاتے ہیں
بہاریں لوٹ کے کن بستیوں سے آتی ہیں

ہر اک وجود زمان و مکاں کا زندانی
ہر اک مقام پہ اک لذتِ شگفت و شہود
یہ اہتمامِ بہاراں، یہ موجِ نغمہ و نور
فقط وفورِ نمو ہے فقط گدازِ کشود

یہ غنچگی کا تبسم فسانہ خواں کیا ہے
شگفتِ گل کی صدائیں حکایتیں کیا ہیں
پریدہ رنگ خزاں کی اداس شاموں میں
سلگتی شاخوں کے لب پر شکایتیں کیا ہیں

میں ارتقا کے تسلسل کا آفریدہ ہوں
ہوائیں میری رفاقت کے گیت گاتی ہیں
یہ چاند، پھول، ستارے بتا رہے ہیں مجھے
تو کائنات کا دولہا ہے ہم براتی ہیں

یہ صبح و شام کے پیہم گریز پا لمحے
مرے شعور سے سرگوشیاں سی کرتے ہیں
خیال و خواب کے ہر نا تمام پیکر میں
کبھی اداس کبھی شوخ رنگ بھرتے ہیں

مرے وجود سے قائم ہے لذتِ تخلیق
مری طلب کا کرشمہ ہے حسن کا اعجاز
مرے لئے ہے یہ آرائشِ خمِ کاکل
مرے لئے ہیں یہ اندیشہ ہائے دور و دراز

نگاہ و دل مجھے جب آئینہ دکھاتے ہیں
شعورِ ذات غمِ کائنات بنتا ہے
یہ رنگ و بو کے مظاہر مجھے بتاتے ہیں
کلی کا زخم کلی کے لہو سے بھرتا ہے

یہ ماہ و سال کی گردش مری تمنائی
تغیراتِ زمان و مکاں مرے دمساز
عروسِ ہستیٔ عشوہ طراز کے جلوے
مرے حضور ہیں فطرت کے ہدیہ ہائے نیاز

آبگینے

ضمیر اظہر

نیند

پپوٹے جھک رہے ہیں خواب کے رنگیں تخیل سے
کہ چشمِ نیم وا میں گھل رہی ہیں مستیاں پیہم
الجھ کر رہ گئی ہیں ذہن میں مبہم سی تدبیریں
فضائے جان و دل پر چھا رہا ہے سحر کا عالم

شادی

اچانک کان میں گونجی صدا محزون ترانے کی
سرشکِ شبنمی سے بھر گئے آنکھوں کے پیمانے
دلِ نازک پہ دستک دی خیالاتِ گزشتہ نے
ادھورے رہ گئے تخئیل میں بچپن کے افسانے

لبِ جو

زر فشاں سائے، کنارِ آبجو، عکسِ نجوم
پرتوِ مہتاب سے معمور ہیں سیمیں حباب
فرشِ مرمر پر فروزاں ہیں سنہری مشعلیں
یا شگفتہ ہیں سرِ سیماب رخشندہ گلاب

خوابِ حسیں

آئینۂ مہتاب ترا روئے مبیں ہے
پیکر میں ترے جذب کوئی سحرِ نگیں ہے
ہوتا ہے گماں مجھ کو تری ذات پہ اکثر
معصوم فرشتوں کا تو اک خوابِ حسیں ہے

قدیم وادئ سندھ کی معاشرت (۲)

ادریس صدیقی

وادی سندھ کے قدیم باشندے بال باندھنے کے لئے موباف استعمال کرتے تھے۔ یہ موباف عام طور پر نصف انچ چوڑی سونے، چاندی اور دوسری دھاتوں کی بنی ہوئی پتلی پٹیاں ہیں۔ جو وضع میں سیدھی، مخروطی یا محراب دار ہوتی تھیں۔ بعض بعض موباف ۱۶ انچ تک لمبے ہوتے تھے۔ ان کے کناروں پر سوراخ ہوتے تھے، جن میں ڈور ڈال کر ان کو سروں کے گرد باندھا جاتا تھا۔ بعض موبافوں پر کسی نوکیلی چیز سے نقطے ڈال کر نقاشی کی گئی ہے۔ سمیر میں بھی ایسے موباف کثرت سے مستعمل تھے۔ پیشانی پر نوکیلے قسم کا جھومر استعمال کیا جاتا تھا۔ ایسا جھومر مارواڑی عورتیں آج کل بھی پہنتی ہیں۔

کانوں میں بالیاں پہننے کے رواج کا اندازہ مجسموں پر بنی ہوئی نقاشی سے کیا گیا ہے، لیکن بالیاں شاذ ونادر ہی دریافت ہوتی ہیں۔ سونے کی بنی ہوئی دندانے دار چند ایسی ٹکیاں ملی ہیں جن کے پیچھے کیل سی جڑی ہوئی ہے۔ اور یہ ناک کی کیل کی بہ نسبت کانوں کے ٹاپس سے زیادہ مشابہ ہیں۔

ہاتھوں میں کنگن اور دست بند کے علاوہ چوڑیاں پہننے کا عام رواج تھا۔ یہ چوڑیاں سونے چاندی، تانبے، کانسے، ہاتھی دانت اور مٹی کی بنی ہوتی تھیں۔ سونے اور چاندی کی چند پولی اور کھوکھلی چوڑیاں بھی دریافت ہوتی ہیں۔ غریب عورتیں مٹی کی چوڑیاں پہنتی تھیں، جو نہایت نفاست سے بنائی جاتی تھیں۔ اور بعض چوڑیوں پر تصویری نقاشی بھی کی گئی ہے۔ رقاصہ کے مجسمہ کے بائیں ہاتھ میں کلائی سے بغل تک چوڑیاں نظر آتی ہیں۔ گجرات (ہندوستان) میں اب بھی پورے پورے ہاتھوں میں چوڑیاں پہنی جاتی ہیں، البتہ سندھ میں اب یہ رسم ختم ہو چکی ہے۔ خیال ہے کہ رقاصہ کے ہاتھ کی چوڑیاں ہاتھی دانت کی بنی ہوں گی یا سنکھ کی کیونکہ اگر یہ کسی دھات یا مٹی کی بنی ہوتیں تو ان کے بوجھ کی وجہ سے ہاتھ اٹھانا بھی مشکل ہو جاتا۔ شیشے کی چوڑیاں موہن جو دڑو میں دریافت نہیں ہوتی ہیں اور نہ شیشے کی کوئی دوسری چیز ہی ملی ہے۔

انگلیوں میں انگوٹھیاں اور چھلے پہنے جاتے تھے۔ بعض انگوٹھیاں بالکل سادہ گول یا چپٹے تار کے چھلے جیسی ہیں۔ بعض ایک ہی تار کو کئی بار چھلوں کی شکل میں موڑ کر بنائی گئی ہیں۔ اس طرز پر بنے ہوئے چھلوں میں سات سات پھیر ہیں۔ عام طور پر انگوٹھیاں تانبے یا کانسے کی بنائی جاتی تھیں۔ چاندی کی صرف ایک انگوٹھی ملی ہے جس میں ایک چپٹے تار کے اوپر نگ رکھنے کی جگہ چپٹے چوکور ماتھے پر ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے خطوط کھینچے گئے ہیں۔

پیروں میں کڑے پہننے کا رواج تھا۔ مٹی کے چند مجسموں کے پیروں میں کڑے پائے گئے ہیں۔ کانسے کے ایک مجسمے کے پیروں میں بالکل اسی قسم کا کڑا پڑا ہے جیسا کہ آج بھی شملہ (ہندوستان) کی پہاڑی عورتیں پہنتی ہیں۔ اسی قسم کے کڑے قریلیش میں بھی پہنے جاتے تھے۔

بالوں میں کنگھا لگایا جاتا تھا۔ ایک دُہرے دندانے والا ہاتھی دانت کا بنا ہوا کنگھا، جس کے دونوں طرف گول دائروں کی نقاشی کی گئی ہے، ایک نوجوان خاتون کے کاسۂ سر کے قریب ملا تھا۔ ایک اور V شکل کا کنگھا بھی دریافت ہوا ہے۔ ہاتھی دانت کی بنی ہوئی ایک خوبصورت کنگھی بھی دریافت ہوئی ہے جس میں موجودہ کنگھیوں کی طرح دونوں طرف دندانے ہیں۔

تانبے، کانسے اور چینی کے گول بٹن بھی دریافت ہوئے ہیں۔ یہ شکل وصورت میں عام طور پر مالٹا، پرتگال اور جنوبی فرانس کے بٹنوں سے مشابہ ہیں۔ یہ وضع میں سادہ ہیں اور ان کی پشت کی جانب تاگا پرونے کے لئے دو سوراخ بنائے گئے ہیں۔ کانسے کے بٹن گھنڈی نما ہیں اور ان کے اوپری جانب دو سوراخ ہیں۔

سنگھار عورت کے ساتھ ساتھ شاید سنگھار کی بھی تخلیق کی گئی ہے۔ چنانچہ وادئ سندھ کی عورتیں بھی سنگھار کی دلدادہ اور مشتاق تھیں۔ وہ افزائش حسن کے لئے سرمہ اور غازہ استعمال کرتی تھیں۔ سرمہ دانیاں اور سلائیاں کثیر تعداد میں پائی گئی ہیں جس سے یہ اندازہ لگایا ہے کہ مرد اور عورتیں دونوں سرمہ لگاتے تھے۔ آج کل بھی سندھ میں عام طریقہ پر سرمہ استعمال کیا جاتا ہے۔ گھونگھے اور سیپ کی ڈبیوں میں سرخ رنگ کا پاؤڈر دریافت ہوا ہے۔ ایسی ہی ڈبیوں میں اس قسم کا غازہ کیش اور آر کے مقبروں سے بھی دریافت ہوا ہے۔

ہڑپہ اور موہن جو دڑو میں سیسے کا کاربونیٹ بھی ملا ہے جو شاید چہرے کو سفید کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہوگا جیسا کہ یونان اور چین میں تقریباً

اسی عہد میں دستور تھا۔ تزئین کے لئے شنگرف بھی مستعمل تھا۔ ایک قسم کا ایسا سبز مادہ بھی دریافت ہوا ہے جس کے بارے میں مسٹر میکے کا خیال ہے کہ وہ شاید کاجل کی طرح استعمال کیا جاتا تھا۔ جیسا کہ مصر میں سلی کیٹ[1] مستعمل تھا تانبے کے گول آئینے بھی ملے ہیں جن کے کنارے جلد محفوظ رکھنے کے لئے ابھرے رکھے جاتے تھے۔ پیروں کو صاف کرنے کے لئے مٹی کے جھانوے استعمال کئے جاتے تھے۔

العرض آپ اپنے ذہن میں اس عہد کی خاتون کا ایک نقشہ قائم کریں اور اس پر تھوڑی دیر غور فرمائیں تو ایسا محسوس کریں گے جیسے بھرے بھرے ہونٹوں اور دوشیزہ صفت سینوں والی ایک جیتی جاگتی عورت آپ کے سامنے کھڑی ہے۔ کلائیوں میں چوڑیاں، بازو پہ بازو بند یا جوشن، گلے میں کئی لڑیوں کا ہار ہے بالوں کو یوں آراستہ کر رکھا ہے کہ سامنے کی طرف ایک بل کھاتی ہوئی اونچی لہر بن گئی ہے۔ باقی بالوں کو جوڑی چوٹی بنا کر کندھے پر چھوڑ دیا ہے۔ ماتھے پر موباف ہے، کمر کے گرد ایک چوڑی کردھنی۔ پاؤں میں کڑے، کانوں میں ٹاپس، ناک میں کیل، چہرہ پر غازہ، گالوں پر سُرخی، آنکھوں میں سرمہ، بھلا کس چیز کی کمی ہے؟

کھلونے وادیِ سندھ کے قدیم بچے موجودہ بچوں کی طرح کھلونوں کے معاملے میں بہت خوش قسمت تھے۔ یہاں لاتعداد کھلونے ملے ہیں جن سے یہ بھی اندازہ لگتا ہے کہ اس عہد کے والدین اپنے بچوں کی دلچسپی اور ان کے کھیل کود پر کتنی توجہ دیتے تھے۔ یہاں مٹی، سیپ، پتھر اور ہاتھی دانت کے کھلونے پائے گئے ہیں جو اس صنعت کی ترقی کے مظہر ہیں۔ خیال ہے کہ لکڑی کے کھلونے بھی بنائے جاتے ہوں گے جو تلف ہو گئے ہیں اور اب ان کے آثار ناپید ہیں۔ مٹی کی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی گاڑیاں بکثرت ملی ہیں جو وضع قطع میں ان بیل گاڑیوں سے قطعی مشابہ ہیں جو آج کل بھی موہن جو دڑو کے علاقہ میں سڑکوں پر چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ ان سے یہ اندازہ بھی لگتا ہے کہ موہن جو دڑو کے لوگ مسافرت اور باربرداری کے لئے بیل گاڑیاں استعمال کرتے تھے۔ چند گاڑیوں کے ساتھ ساتھ مٹی کے بنے ہوئے بیل بھی ملے ہیں۔ بیل گاڑی کا ایک بڑا دلچسپ سٹ ملا ہے جس میں کوچوان اپنی جگہ پر پیر موڑے بیٹھے دکھایا گیا ہے۔ اور دو مسافر اس کے پیچھے بیٹھے ہیں گاڑی کے آگے آگے ایک کتا دوڑتا ہوا دکھایا گیا ہے جو پیچھے مڑ کر کوچوان کو دیکھ رہا ہے۔ ان تینوں آدمیوں کی بیٹھنے کی جگہ چھوٹے چھوٹے کھانچے سے ہیں جن میں یہ سوار فٹ ہو جاتے ہیں اور اگر ان کو کسی دوسری جگہ بٹھانے کی کوشش کی جائے تو لڑھک جاتے ہیں۔ یہاں ایسے رتھ دریافت نہیں ہوئے ہیں جو عام طریقہ پر میدان جنگ میں کام آتے تھے۔

ایسے جھنجھنے بھی دریافت ہوئے ہیں جو گیند کی طرح گول اور اندر سے کھوکھلے ہیں۔ ان کے اندر چھوٹی چھوٹی کنکریاں پڑی ہوتی ہیں اور ان کے ہلنے سے آواز پیدا ہوتی ہے جو بچوں کے لئے بڑی دلچسپی کا باعث ہوتی ہوگی۔ ایسی چڑیاں بھی ملی ہیں جو کھوکھلی ہیں اور جن کی دُم کے پاس ایک سوراخ ہے۔ یہ بچوں کی سیٹیاں تھیں۔ ان کی دم کے سوراخ سے ہوا پھونکنے پر آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کئی دوسری طرزوں پر بنی ہوئی چڑیاں بھی ملی ہیں۔ ایک چڑیا چونچ کھولے ہوتے دکھائی گئی ہے گویا چوں چوں کر رہی ہے۔ ہڑپا اور موہن جو دڑو میں چڑیوں کے پنجرے بھی ملے ہیں۔ جن سے یہ اندازہ لگتا ہے کہ چڑیاں پالی بھی جاتی تھیں۔ ایک پنجرے کی کھڑکی سے ایک چڑیا غالباً بلبل (؟) باہر نکلتی ہوئی دکھائی گئی ہے[2]۔ بانس پر چڑھتے ہوئے بندر یا کسی دوسرے جانور کے بہت سے نمونے ملے ہیں اور ان کے علاوہ چھوٹے سینگوں والے بیل، گینڈے، بھینس، شیر، سور، بندر اور کتے کے نمونے بھی۔ آبی جانوروں میں مگرمچھ اور کچھوا، پرندوں میں مرغی اور فاختہ کے بھی چھوٹے چھوٹے مجسمے ملے ہیں۔ ترازو کے چند چھوٹے چھوٹے پلڑے بھی دستیاب ہوتے ہیں جن میں ڈوریاں ڈالنے کے سوراخ بھی ہیں یہ پلڑے بہت بھدے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچوں نے بناتے ہیں۔ اسی طرح گھروں میں برتے والے برتنوں کی وضع کے چھوٹے چھوٹے مٹی کے کھلونے بھی پائے گئے ہیں۔ جن میں سے بعض پر تو بچوں کی ننھی ننھی انگلیوں کے نشان بھی ہیں۔ عہد طفولیت کی معصوم مشغولیت کے یہ نشان کتنے دلچسپ ہیں؟

اعلیٰ قسم کے بنے ہوئے کھلونوں میں ایسی قسم کے بیل ہیں جن کے سر دھڑ سے الگ بنائے گئے ہیں۔ یہ سر کھوکھلی گردن میں ایک ایک کے ذریعہ پھنسائے جاتے تھے اور کوہان میں ایک سوراخ کر کے اس کے اندر سے ایک ڈور گذار کر ان سروں میں باندھ دی جاتی تھی۔ اس طرح ڈور کھینچنے پر یہ سر ہلتے تھے۔ اسی طرح بندر کا ہمشکل ایک جانور ملا ہے جس کے ہاتھ ہلتے ہیں۔ ایسے کھلونے بھی ملے ہیں جن میں

---

[1] ایک سبز رنگ کی معدنی شے جو تانبے کے "کس" سے مرکب ہے

[2] اکثر ماہرینِ آثار نے ان کو چڑیوں کے پنجرے کہا ہے لیکن یہ قیاس زیادہ صحیح نہیں ہے کیونکہ ان کی جسامت اتنی چھوٹی ہے کہ ان میں چڑیا سما نہیں سکتی۔ چند محققین کا خیال ہے کہ یہ مٹی کی گول قندیلیں ہیں جن سے روشنی چھن چھن کر باہر آتی ہوگی۔ اور بلبل والی شبیہہ ٹڈا ہے جو روشنی کی کشش سے قندیل کے پاس آیا ہے۔

اس حکمت سے سوراخ کئے گئے ہیں کہ ان میں تاگا ڈال کر حسب دلخواہ رفتار سے اوپر نیچے دوڑایا جا سکتا ہے لیکن افسوس ہے کہ لڑکیوں کا محبوب ترین کھلونا یعنی گڑیا کہیں نہیں ملی۔ یہ کپڑے یا لکڑی کی بنائی جاتی ہوں گی اور تلف ہو گئی ہیں۔

کھیل تفریح

برّصغیر ہند و پاکستان کی ابتدائی تاریخ میں پانسہ کا بڑا دخل رہا ہے کون نہیں جانتا کہ کس طرح یدھشٹر راج پاٹ، دھن دولت، حتیٰ کہ اپنی رانی تک کو ہار گیا۔ اسی طرح راجہ نل کا قصہ بھی زبان زد خاص و عام ہے اور آج بھی پانسہ اور کوڑیاں کھیلنے والے راجہ نل کی دہائی دیتے ہیں رگ وید میں بھی اس کھیل کا کئی مقامات پر ذکر ہے لیکن یہ کھیل اس عہد سے بھی بہت قدیم ہے اور وادی سندھ کے لوگوں کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ وادی سندھ کے پانسے مٹی اور پتھر کے بنے ہیں۔ ان کی چھ سمتوں میں مختلف تعداد میں گول نشان بنے ہیں۔ یہ نشان ایک سے چھ تک ہیں اور اس طرح بنائے گئے ہیں کہ ایک کے بالمقابل دو ہے تین کے بالمقابل چار اور پانچ کے مقابل چھ اس قسم کا مٹی کا بنا ہوا ایک پانسہ دوآل کے قریب ٹیپ گوا رائی نمبر ۲ میں ملا ہے جو تقریباً ۲۸۰۰ سال قبل مسیح کا بنا ہوا ہے۔ آج کل کے پانسوں میں عام طریقہ پر نشانوں کو اس طرح بنایا جاتا ہے کہ مختلف سمتوں کے نشانات کا جوڑ ہر حالت میں سات ہوتا ہے۔ بعض پانسوں کے کونے گھسے ہوئے ہیں جن سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ان کو کسی نرم چیز پر پھینکا جاتا ہوگا۔ بعض چوکور پانسوں میں جو عام طور پر ہاتھی دانت کے بنائے گئے ہیں تین سمتوں میں تو ایک دو اور تین نشانات ہیں اور چوتھی سمت میں طول البلدی خطوط کھینچے گئے ہیں۔ کچھ پانسوں پر ہر طرف ایک مختلف قدیم تحریر ہے جو ابھی تک پڑھی نہیں جا سکی۔ ایسے کندہ پانسے بھی دریافت ہوتے ہیں جنھیں نجومی قسمت کا حال بتلانے میں استعمال کرتے ہیں۔ ان پانسوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وادی سندھ کے قدیم فرزند اپنی قسمت کے سربستہ راز معلوم کرنے کے اتنے ہی مشتاق تھے جتنے کراچی میں بندر روڈ پہ بیٹھے ہوئے نجومیوں کے پاس جانے والے موجودہ لوگ!

موجودہ شطرنج کے پیادوں کی طرح مٹی پتھر اور سنگ یشب کے لاتعداد مہرے ملے ہیں۔ ان میں سے بعض بہت ہی خوبصورت ہیں۔ یہ جسامت میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یقینی طور سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ واقعی شطرنج کے مہرے ہی رہے ہوں گے۔

موہن جو دڑو میں ایک ایسی اینٹ ملی ہے جس پر چار چوکور خانوں کی تین قطاریں کھدی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک خانہ متوازی الاضلاع ہے جس کے وتر ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے بنائے گئے ہیں۔ یوں ⊠ خیال کیا گیا ہے کہ یہ چوسر کی بساط کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس اینٹ کے ساتھ ہی اس قسم کی اور اینٹیں ہوں گی جس سے تین خانوں کی دس قطاریں ہوں گی اور ان پر مصریوں کی طرح دسی کھیلی جاتی تھی اور اگر اس میں چھبیس خانے تھے جو اس طرح بنائے گئے تھے کہ ایک طرف تین قطاروں میں بارہ خانے تھے اور ان دونوں کے بیچ میں دو خانے بنائے گئے ہوں گے تو یہ سر وولی کی آر میں دریافت شدہ سمیری بساط سے مماثلت رکھتی تھی۔ یہ اینٹ ایک فرش سے دستیاب ہوتی ہے اور یہ کھیل فرش پر بیٹھ کر ہی کھیلے جاتے ہیں۔ اسی طرح کی اور بھی اینٹیں ملی ہیں اور یہ قیاس صحیح معلوم ہوتا ہے کہ چوسر اور سرنگجی کے قسم کے کھیل کھیلے جاتے ہوں گے۔ البتہ ان کا نام کچھ اور رہا ہوگا۔ اور کھیلنے کے طریقے بھی مختلف ہوں گے۔ یہاں مٹی اور پتھر کی بہت سی گولیاں بھی ملی ہیں اور ہو سکتا ہے کہ گولیاں کھیلنے کا دستور بھی ہو۔ بعض گولیاں اتنی خوبصورت، گول اور چکنی ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا ان کے بنانے میں اتنا انہماک کیوں برتا گیا ہے۔

ایک مہر پر دو پرندے ایک دوسرے پر جھپٹتے دکھائے گئے ہیں جس سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پرندوں سے دل لگی بھی یہاں کا محبوب مشغلہ رہا ہوگا اور جس طرح آج کل بلبل، مرغ، تیتر اور بٹیریں لڑائی جاتی ہیں اسی طرح وادی سندھ کے لوگ بھی پالیاں بدتے ہوں گے۔ بیلوں کی لڑائی کا بھی رواج تھا۔ یہ تفریح جزیرہ کریٹ (قریطش) کی پرانی تہذیب میں بھی رائج تھی اور ہسپانیہ میں آج بھی اس کے مناظر دیکھے جا سکتے ہیں۔

شکار

وادی سندھ کے لوگ گوشت خور تھے۔ وہ پالتو جانوروں کے علاوہ جنگلی جانوروں کو شکار کر کے بھی گوشت فراہم کرتے تھے۔ ایک مہر پر دو آدمیوں کو تیر کے ذریعہ ہرن کا شکار کرتے دکھایا گیا ہے۔ دوسری مہر پر جنگلی بکری کو ہدف بنایا گیا ہے۔ موہن جو دڑو میں بے شمار تیر دریافت ہوتے ہیں اور ان کو شکار میں استعمال کیا جاتا ہوگا۔ یہاں کی تصویری تحریر میں بھی تیر کمان کے نشان ملتے ہیں۔ مٹی کی پختہ گولیاں یا غلّے بھی ملے ہیں جن سے کمان کی شکل کی غلیل کے ذریعہ چڑیوں کا شکار کیا جاتا تھا۔ چوہوں کو پکڑنے کے لئے مٹی کے پھندے یا چوہے دان استعمال کئے جاتے تھے۔ اس قسم کے چوہے دان موہن جو دڑو میں دریافت ہوتے ہیں۔ مچھلی پکڑنے کے سیکڑوں کانٹے اور جال کو ڈبونے کے لئے استعمال کی جانے والی گولیوں کی دریافت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مچھلی کے شکار کا بھی عام رواج تھا۔ مٹی کے بنے ہوتے چند ایسے کتے بھی ملے

ہیں جو شباہت میں شکاری کتوں جیسے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ یہ کتے جانوروں کے شکار میں استعمال کئے جاتے ہوں۔ سندھ میں آج کل بھی شکاری کتوں کی مدد سے کافی شکار کھیلا جاتا ہے۔

پالتو جانور

وادی سندھ کے باشندے جانوروں کو شکار کرکے کھانے کے ہی شائق نہ تھے بلکہ جانوروں کو پالتے بھی تھے۔ پالتو جانوروں کی اقسام کم نہ تھیں۔ چنانچہ کھدائی میں کوہان والا بیل یا سانڈ، بھینسا، بھیڑ، ہاتھی، اونٹ، سؤر اور مرغ کے ڈھانچے اور ہڈیاں دستیاب ہوئی ہیں۔ سؤر اور مرغ کے بارے میں یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ پالتو تھے یا جنگلی۔ پالتو جانوروں کے بارے میں بچوں کے کھلونے اور مہروں پر نقش کی ہوئی تصویریں بھی ہماری بڑی رہنمائی کرتی ہیں۔ ان سے اندازہ لگتا ہے کہ یہ لوگ بھینسے، بندر، کتا، بلی، طوطا، مور اور مرغ سے اچھی طرح واقف تھے۔ گدھے کی موجودگی کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملتا اور محققین میں اس بارے میں کافی اختلاف ہے کہ وادی سندھ کے لوگ گھوڑے سے واقف تھے یا نہیں۔

وادی سندھ میں سانڈوں کے ڈھانچے بڑی کثرت سے ملے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے بیلوں کی نسل لینے کا کتنا اچھا انتظام تھا۔ یہ بیل سندھ، شمالی گجرات اور راجپوتانہ کے موجودہ شاندار بیلوں سے کلی طور پر مشابہ تو نہیں ہیں البتہ اُن چھوٹے کوہان والے بیلوں سے بالکل مختلف ہیں جو آج کل وسط ہند اور دکن میں عام طور پر پائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ سندھ اور بلوچستان میں بغیر کوہان اور چھوٹی سینگوں والے بیل بھی ہوتے تھے۔

اس سلسلے کی سب سے دلچسپ دریافت ایک ایسی پختہ اینٹ ہے جس پر ایک کتے اور بلی کے پیر کے نشان بنے ہیں۔ یہ نشان اس وقت پڑے ہوں گے جب گیلی مٹی سے اینٹیں بنائی گئی ہوں گی اور اس کتے نے بلی کا پیچھا کیا ہوگا۔ وہ بلی ان اینٹوں کے اوپر سے بھاگی ہوگی۔ اور کتے نے بڑی تیزی سے اس کا پیچھا کیا ہوگا۔ یہ نشان کافی گہرے ہیں اور اس طرح سے بنے ہیں کہ اس طریقہ کے علاوہ کسی اور طرح نہیں پڑ سکتے۔ یہ تیز بھاگنے والی بلی اور اس کا پیچھا کرنے والا کتا تو نہ جانے کب کے ختم ہو چکے لیکن اینٹوں پر پڑے ہوتے یہ نشان جہد بقا کی مسلسل اور مستقل داستان کی غمازی کرتے ہیں۔

جنگلی جانور

اُن جانوروں سے قطع نظر جن کا ذکر شکاری یا پالتو جانوروں کے ضمن میں کیا گیا ہے، یہاں ایسے وحشی اور نیم وحشی جانور بھی تھے جو گھروں میں آیا جایا کرتے تھے جیسے نیولا اور سیاہ چوہا۔ ان کے علاوہ خرگوش بھی موجود تھا۔ شیر، ریچھ، ہاتھی اور گینڈے جیسے وحشی جانور عام تھے۔ ہرن چار قسم کے ہوتے تھے کشمیری بارہ سنگھا، سانبھر، چیتل۔ اور پاڑا ہرن۔ ان ہرنوں کے صرف سینگ ہی پائے گئے ہیں۔ ممکن ہے یہ سینگ دواؤں میں استعمال کئے جانے کے لئے دور دور سے منگائے گئے ہوں۔ کشمیری بارہ سنگھا آج کل صرف کشمیر اور ہمالیہ کے نواح میں ملتا ہے چیتل آج کل نہ سندھ ہی میں پایا جاتا ہے، اور نہ پنجاب میں۔ اسی طرح سانبھر بھی سندھ، راجپوتانہ اور پنجاب میں نہیں ملتا۔ البتہ پاڑہ ہرن اب بھی سندھ میں ملتا ہے۔

رقص و سرود

موئن جو ڈرو میں رقص کا عام رواج تھا جس کے ثبوت میں کانسے کا بنا ہوا رقاصہ کا مجسمہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ہڑپہ سے دریافت شدہ پتھر کا ایک اور مجسمہ بھی عالم رقص میں دکھایا گیا ہے۔ رقص قدیم ہندوستان کی مذہبی رسوم میں ایک اہم مقام رکھتا تھا۔ اور پرستش کا ایک خاص جز و ہوتا تھا معلوم نہیں موئن جو ڈرو میں اس کو مذہبی حیثیت حاصل تھی، یا یہ محض تفریح اور دل بہلانے کا ذریعہ تھا۔ ناچ کے ساتھ گانا بجانا بھی ہوتا تھا۔ دو مہروں پر ڈھولک کی تصویر بنی ملی ہے۔ ایک مہر پر ایک مردانی شبیہہ کی گردن میں ڈھولک یا مرونگ لٹکا ہوا دکھایا گیا ہے۔ ناچنے والے کو تھاپ دینے کے لئے کرتال بھی مستعمل تھی جس کے چند نشانات پائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ وادی سندھ کی تصویری تحریروں میں ایسے بہت سے نقوش ملے ہیں جن کو بربط اور چنگ تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے ساز کشمیر میں بھی مستعمل تھے۔

حکمت

ایسے شواہد بہت کم ملے ہیں جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ وادی سندھ کے لوگ طب، نجوم اور علم الحساب سے بھی واقف تھے۔ البتہ یہاں سمندر جھاگ اور بارہ سنگھے کے سینگ کے ٹکڑے دریافت ہوئے ہیں۔ ان کی موجودگی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں ضرور یہاں کے ویدوں کے نسخوں کا جز ہوں گی۔ ایک ایسا سیاہ مادّہ بھی دریافت ہوا ہے جس کو سلاجیت تجویز کیا گیا ہے۔ سلاجیت ضعف معدہ، ذیابیطس، جگر کے امراض اور گٹھیا وغیرہ کے لئے اکسیر ہے۔ اسی طرح مٹی کی ہانڈیوں میں دہ شاخہ یا استخوان ماہی رکھی ہوتی ملی ہے۔ یہ بھوک بڑھانے کے لئے استعمال کی جاتی ہے اور بیرونی طور پر کان، آنکھ، گلے اور جلدی امراض میں استعمال کی جاتی ہے۔ مونگے اور نیم کے درخت کی پتیاں بھی احتیاط سے رکھی ہوئی پائی گئی تھیں اور یہ بھی ادویات کے کام آتی ہوں گی۔ ان تمام چیزوں سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس تہذیب میں "آیور ویدک" طریق علاج ابتدائی دور میں تھا۔

بالکل صحیح سمتوں میں بنے ہوتے مکانات اور سڑکوں سے اندازہ لگایا

(باقی ص۵۵ پر)

غزلیات

اختر ہوشیار پوری

اے پریشان گیسوؤں والو
آؤ کچھ دیر کو تو سستا لو

کیا کرو گے چلا نہ دَور اگر
اے حسین انکھڑیوں کے متوالو

ہم بڑے کام کے ہیں دیوانے
ان سے کہہ دو کہ ہم کو اپنا لو

میری قسمت تو بن ہی جائے گی
پہلے اپنی لٹیں تو سلجھا لو

فصلِ گل آئی کھو چلے وحشی
تم کہاں ہو جنوں کے رکھوالو؟

وقت پھر لوٹ کر نہ آئے گا
آؤ اور اپنی بات منوا لو

دل کا ہر داغ ایک اختر ہے
روشنی مانگو تیرگی والو

انجم اعظمی

بزمِ خوباں سے پرے کوچۂ جاناں سے ہیں دور
وصل کیا خاک ہو جب یہ ہے جنوں کا دستور

ان سے اب کرتے نہیں کوئی ملاقات مگر
ہم ہوئے جاتے ہیں اس طرزِ وفا پر مغرور

ہر قدم ایک فسوں تازہ بہ تازہ گویا
ایک ہم ہیں کہ ہمیں یہ بھی نہیں ہے منظور

شیخ جی آئے ہو پھر جام و صراحی لیکر
بات تو جب ہے کہ پہلو میں بٹھا دو اک حور

ان دنوں حرفِ تمنا پہ مٹے جاتے ہیں
ہم سے مت پوچھ کہ یوں بھی ہمیں ملتا ہے سرور

حسرتِ دید کے قائل ہی نہیں ہیں ہم لوگ
جلوۂ یار کا سودا ہے تو دیکھیں گے ضرور

دل لگی جس کو سمجھتے تھے وہ شے کیا نکلی
پڑ گئے آج مرے زخمِ جگر میں ناسور

دن میں کیا ڈھونڈتے ہو انجمِ مستانہ کو
رات آتی ہے تو میخانے میں ہوتا ہے ظہور

شائستہ بیزار

اپنے غبارِ راہ سے منزل نئی بنائیں
کیوں ہوں اداس بے رخیِ رہبراں سے ہم

آئی تھی آج اپنی تہی دامنی پہ شرم
یوں لوٹ لوٹ آئے ترے آستاں سے ہم

تنہائیاں دلوں کی بھلا کس طرح مٹیں
کچھ اجنبی سے آپ ہیں کچھ بدگماں سے ہم

معلوم اب ہوا کہ وہی منزلیں بھی تھیں
سو بار اضطراب میں گزرے جہاں سے ہم

ایسا نہ ہو کہ شیشہ و پیمانہ توڑ دیں
گھبرا کے بے نیازیِ پیرِ مغاں سے ہم

ملتا کسی نظر کا سہارا اگر ہمیں
یوں تھک نہ جاتے زیست کے بارگراں سے ہم

ہو جائے گر طلوعِ سحر کا یقیں تو پھر
گھبرائیں گے نہ تیرگیِ بے کراں سے ہم

آج ان کے التفات کا انجام سوچ کر
بیزار سے ہیں ہر نگہِ مہرباں سے ہم

شیدا گجراتی

ابھر رہے ہیں دلوں کے نقوش دیرینہ
لٹا رہی ہے طبیعت سخن کا گنجینہ

دکھا رہا تھا خرد کو جنوں کا آئینہ
دھڑک دھڑک سا گیا کائنات کا سینہ

کہیں تو کس سے کہیں اور سنے تو کون سنے
نئے جہاں میں وفا کی حدیث پارینہ

مری نواؤں میں مری شخصیت کو ڈھونڈ اے دوست
مری غزل ہے مری زندگی کا آئینہ

گذر رہے ہیں یہ کن منزلوں سے فرزانے
زباں پہ پیار کی باتیں دلوں میں ہے کینہ

اس انجمن میں ملا بھی تو کیا ملا دل کو
یہی کہ ٹوٹ گیا حسرتوں کا آئینہ

جنوں ہی اصل میں میراثِ ابنِ آدم ہے
جنوں ہی عظمتِ انساں کا آخری زینہ

کبھی تو ہو گا عبارت سے آشنا شیدا
وہ میری عمرِ محبت کا خوابِ دوشینہ

مشتاق مبارک

مستی بھری نگاہ تو نکھرا ہوا شباب
گویا سمٹ کے آگیا ساغر میں آفتاب
اٹھی یہ کس کے عارضِ پرنور سے نقاب
عالم مری نظر میں ہے اک نقشِ اضطراب
میں تابِ حسن لا نہ سکوں اس سے کیا غرض
اپنی تجلیوں کو تو ہونے دے بے نقاب
خود ملتفت نگاہ سے دیکھا گئے مجھے
میری نظر ملی تو انہیں آگیا حجاب
صرفِ سجود اور رہو پھر عشق کے حضور
یا رب مزاجِ حسن میں کیسا یہ انقلاب
کیفیتوں سے کتنی عبارت ہے ایک دل
ہے یہ امینِ سوز و الم درد و اضطراب
میرے جنونِ شوق کی یہ وسعتیں تو دیکھ
ذروں سے کر رہا ہوں میں تخلیقِ آفتاب

اقبال صفی پوری

رگ رگ میں اس مست نظر کا کیفِ مجسم آج بھی ہے
کتنے عالم بدلے لیکن اپنا وہ عالم آج بھی ہے
جس کی آڑ میں تم ہو پنہاں وہ غمِ محکم آج بھی ہے
درد تو کم ہوتا رہتا ہے، درد تو کم کم آج بھی ہے
اُن کے غم کو کیوں اپنایا، درد کو اپنا سمجھا کیوں
اتنی بات پہ گردشِ دوراں مجھ سے برہم آج بھی ہے
کس پر دار کیا دُنیا نے اس کو کوئی کیا سمجھے
چہرے تو ہنستے ہیں لیکن روح میں ماتم آج بھی ہے
اُن سے جب ٹکرائی تھیں نظریں اس کو زمانہ بیت گیا
دل کی تہ میں ایک خلش سی مبہم مبہم آج بھی ہے
سیکڑوں سورج اُبھرے ڈوبے پھر بھی وہی ہے ربطِ جمال
پہلے بھی تھی پھول پہ شبنم پھول پہ شبنم آج بھی ہے
سب کو یہ دولت نہیں ملتی، غم ہے بقدرِ ظرف اقبالؔ
جس میں ہے کچھ ظرف کی وسعت اس کے لئے غم آج بھی ہے

فکاہیہ:

احوالِ واقعی

محمد مسعود

کامریڈ قسم کے حضرات مجھے سرمایہ دار سمجھتے ہیں اور سرمایہ دار گھٹیا قسم کا کامریڈ تصور کرتے ہیں۔ کیونکہ میں نے پانچ سال کے طویل عرصہ میں ایک دفعہ بھی کار تبدیل نہیں کی اور نہ میرے پاس لمبی مونچھوں اور چمکدار بٹنوں والا کوئی ڈرائیور رہی ہے۔ میرا پرانا مستری بوڑھے گدھ کی طرح نیم وا آنکھوں سے منتظر رہتا ہے کہ کب میری کار میں کوئی نقص ہو اور وہ میری حجامت بنائے۔ جب میں بادلِ ناخواستہ اس کی دکان کا رُخ کرتا ہوں تو پہلے بصد منت بنک کے منیجر سے ضروری رقم کا بندوبست کر جاتا ہوں۔ اور جب پہلی تاریخ کو بنک والے وہ رقم کاٹ لیتے ہیں تو اہلیہ محترمہ جو میرے چند بال باقی ہیں اُن کا صفایا کر دیتی ہیں۔ سگریٹوں کا راشن آدھا رہ جاتا ہے اور تمام مہینہ جلی کٹی سنتا رہتا ہوں۔ غرضیکہ کار کی وجہ سے میری جان عذاب میں ہے اور ایک لمبی سانس کے ساتھ یہ کہنے پر مجبور ہوں — کلیجہ تھام لوگے جب سنوگے داستاں میری۔ اس کے باوجود مجھے کامل یقین ہے کہ ان چند حروف کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا۔ اور کیا عجب کہ بچارے کار والوں کے متعلق کئی ایک غلط فہمیاں رفع ہو جائیں۔

کار کی موجودگی کو زر و دولت کا نشان یا ثبوت سمجھا جاتا ہے، لیکن اصلی حالت یہ ہے کہ دس تاریخ کے بعد دوکانداروں کے تپاک سے گرمجوشی محو ہو جاتی ہے، پندرہ تاریخ تک دوست مصافحہ کرنے سے کتراتے ہیں، بیس کے لگ بھگ سے چھپنا شروع کر دیتے ہیں، پچیس تاریخ کو والدِ محترم ہوا سے مخاطب عام دنیا سے تعلقات متوازن رکھنے کی تلقین کرتے سنے جاتے ہیں، اٹھائیس تاریخ کو بیگم صاحبہ کا درجۂ حرارت تھرمامیٹر سے باہر نکل جاتا ہے۔ اور ڈاکٹروں کی کوشش کے باوجود پہلی تاریخ تک راہِ راست پر نہیں آتا اگر پہلی اتوار کو ہو تو پھر سوموار تک بخار کے اترنے کی توقع کی جاتی ہے۔

تانگے والے، گڈے والے، ریڑھے والے، بھینسوں والے، بکری والے، ٹرک والے، سائیکل والے، اور پیدل چلنے والے مجھے دنیا کے لئے خطرناک وبا سمجھتے ہیں۔ اور ہر ایک کی یہی خواہش ہے کہ دنیا اس سرمایہ دار کے وجود سے پاک ہو جو غرور و نخوت کا پتلا ہے، جس کے پاس بے شمار دولت ہے، جو جان بوجھ کر کیچڑ کی چھینٹیں اور غبار کے بادل اُڑاتا ہے اور جس کا ہارن کانوں کے پردے پھاڑتا ہے۔ ان نیک خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وہ ہر وقت کمربستہ نظر آتے ہیں اور کبھی کبھی اس کارِ خیر میں کامیابی بھی حاصل کر لیتے ہیں۔

میں کار والا بیچارا نہایت مرنجاں مرنج قسم کا، طعنوں سے ڈرنے والا اور بہتوں کا بھلا کرنے والا انسان ہوں۔ کار خرید کر اپنا دیوالہ نکالنے کے بعد ہر تیسرے ماہ چالیس پچاس کے لگ بھگ ٹیکس ادا کرتا ہوں، ٹیکس ادا کرنے اور ضروری کاغذات وصول کرنے کے لئے "بیچارے کلرک" کے پاس کئی چکر لگانا پڑتے ہیں۔ وہ پان چبانے اور سگرٹ پینے میں سخت مشغول ہوتے ہیں، کئی رجسٹروں کے خالی صفحوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد کبھی کبھار نظریں اوپر اٹھاتے ہیں تو بغیر سلام دعا اُن کے منہ سے یہی نکلتا ہے کہ "پرسوں آئیے"۔ کاش میرے پاس ایک روپیہ ہوتا اور میں اس کام کے لئے ایک ملازم کو روانہ کر دیتا اور "روپیہ اندر اور کاغذ باہر" کا نعرہ آزما لیتا۔ جب پٹرول خریدتا ہوں تو فی گیلن تقریباً ڈیڑھ روپیہ سرکارِ عالیہ کی خدمت میں بطور ٹیکس ادا کرتا ہوں۔ اس پر نئے ٹائر، نئی بیٹری اور حضرتِ مستری کے بل مستزاد ہیں۔ دوکاندار کار دیکھتے ہی پگڑی سیدھی کر لیتے ہیں، کھجوروں سے مکھیاں اُڑا دیتے ہیں اور ڈیڑھ روپے سیر والے سیب دو روپے سیر کے حساب سے میرے حوالے کر دیتے ہیں۔ ان مصیبتوں کے باوجود سنتری صاحب کی سیٹی صرف میرے لئے مخصوص ہے۔ تانگے والا جہاں چاہے گھوڑا دوڑائے، سائیکل والے صاحب انارکلی میں سیک اور لیڈر کھیلتے چلے جائیں، اُن سے کوئی بازپرس نہیں جہاں مجھ سے ذرا سی چوک ہوئی سنتری صاحب کی سیٹی بجی اور میری کمبختی آئی۔

کار پر کمر توڑ کسٹم ڈیوٹی اور پٹرول پر گردن توڑ ٹیکس ادا کرتا ہوں۔ اور تماشہ یہ کہ اسی روپے کے صرف سے سڑکوں کے عین درمیان وہ بڑے بڑے گڑھے تجویز کئے جاتے ہیں جو کار کی کمانی اور میری اپنی ریڑھ کی ہڈی توڑنے میں مدد دیتے ہیں۔ اور میں "سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی" کا ورد کرتا رہتا ہوں۔ میں چیختا چلاتا رہتا ہوں، "تانگے والا" "آوارہ ہوں" کے فلمی گیت کی تانیں اُڑاتا ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ ایک مرتبہ میں نے بصد عجز عرض کیا "اے کوچوان صاحب، اگر آپ اپنے تانگے کو ایک طرف کر لیں تو میری مشکل حل ہو جائے"۔ فرمایا "باؤ جی۔

گھوڑا نواں ایں"[1] اور میں شاہ عالمی سے لوہاری تک ان کے پیچھے پیچھے گھسٹتا چلا گیا۔ بھینسوں کو مجھ سے خاص دشمنی ہے۔ جب مجھے کہیں جلد جانا ہو تو بھینسیں بھی اسی وقت ہوا خوری کا پروگرام بنا لیتی ہیں۔ مجھ خاکسار اور اس کی کار کو بصد استغنا نظر انداز کرتے ہوئے سڑک کے عین درمیان اور دائیں بائیں نہایت اطمینان سے چہل قدمی میں مصروف رہتی ہیں اور گوبر کے انباروں سے میرا سواگت کرتی جاتی ہیں۔ بھینس والا کبھی کبھار نظر آجائے، تو بڑی مدد کرتا ہے۔ ڈنڈے سے اشارے کرتا ہے تو وہ بھینس جو سڑک چھوڑ دینے پر آمادہ نظر آتی تھی، وہیں سڑک پر آجاتی ہے۔ گدھے تو خیر گدھے ٹھہرے، وہ مغرب کی سمت جا رہے ہیں۔ میں بھی اسی سمت جانا چاہتا ہوں۔ جہاں میں نے ہارن دیا گدھا صاحب فوراً "اباؤٹ ٹرن" ہو گئے۔ دُم کی بجائے اپنا منہ کار کی طرف کر دیا۔ میں بھی رکتے رکتے اُن کے قریب پہنچ گیا۔ وہ بھی بڑھے اور سڑک کے عین وسط میں میرے بمپر سے سرگوشیاں شروع کر دیں۔ میں ہزار منت کرتا ہوں کہ صاحب رستہ دیجئے، مجھے جلد جانا ہے، بمپر سے پھر کانفرنس کر لینا۔ مگر وہ اپنی تھوتھنی بمپر سے ہٹانے پر آمادہ نہیں ہوتے "تا آنکہ اُن کا "ڈرائیور" دو چار مغلظ اور ثقیل قسم کی گالیاں نہ سنا دے۔ حضرت اونٹ جن کی کوئی کل سیدھی نہیں، اُن سے میری ملاقات عموماً نہر کے کنارے پر ہوتی ہے۔ میں نے ہارن دیا اور انہوں نے نہر کی سڑک پر بھاگنا شروع کر دیا۔ نہ دائیں طرف نہر میں چھلانگ لگاتے ہیں، نہ بائیں طرف سڑک سے اترتے ہیں۔ میرے آگے آگے پانچ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اپنی "میراتھون" شروع کر دیتے ہیں یہ شغل صرف آٹھ میل تک جاری رہتا ہے۔ اور میں اپنی منزل مقصود پر ایک گھنٹہ دیر سے پہنچتا ہوں۔ لاہوری بھیڑ اور بکری کو تو میں دم بخود کار ایک طرف ٹھہرا لیتا ہوں، کیونکہ سن گیا ہے کہ کئی مائیں بچوں، دو بھیڑوں یا بکریوں یا دیگر گھوڑے کی رسی پکڑے کے ہاتھ میں دے دیتی ہیں:

کار کیا ہے؟ اپنے ملکی بھائیوں سے دشمنی کا پروانہ ہے۔ سرمایہ داری کا داغ تو لگ ہی گیا۔ جہاں کہیں خدانخواستہ کسی قسم کا حادثہ ہوا بس کار والے کی شامت آئی۔ بچہ کسی فوری جذبے کے تحت اچانک سڑک پر آجائے تو قصور کار والے کا ہے۔ وہ گڈا جس پہ ہزاروں من بھوسا لدا ہے اور جس کے "ڈرائیور" کو دائیں بائیں کی تمیز نہیں، کار سے ٹکرا جائے، اس کا انجر پنجر ڈھیلا کر دے تو بھی قصور کار والے کا ہے۔ راہ گیر دائیں بائیں کی تمیز نہ کرتے ہوئے کار کی زد میں آجائیں تو بھی قصور کار والے کا ہے۔ غرضیکہ ساری دنیا کے جانداروں کو اجازت ہے کہ وہ بغیر آنکھیں کھولے جو چاہیں کریں اور جہاں چاہیں چلیں۔ اُن پر کسی قسم کی پابندی نہیں اور نہ انہیں اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے کی مہم جاری کی جاتی ہے لیکن حادثوں سے بچانے کی ذمہ داری تمام تر کار والے پر عائد ہوتی ہے۔ اور ہر حال میں قصور اسی کا ہے:

میں معمولی رفتار سے سڑک پر جا رہا ہوں۔ کہ ایک شاعر نما حضرت اچانک فٹ پاتھ چھوڑ کر سڑک پر آجاتے ہیں۔ میرا ہارن چلاتا ہے، بریکیں چیختی ہیں، لیکن وہ مڑ کر نہیں دیکھتے۔ اُن کو بصد مشکل بچاتے بچاتے میں صفر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے، اُن سے ذرا ہٹ کر، گذر جاتا ہوں تو مجھے تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "انسانیت! انسانیت!" میں یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ بھی کوئی مصرعہ ہے اُن کو "مکرر مکرر" کہتے گذر جاتا ہوں:

رنگ انارکلی میں تفریحاً جاتے ہیں۔ میرے لئے یہ تفریح بھی ناممکن ہے۔ اوّل تو سنتری جی مجھے چوک نیلا گنبد میں آدھا گھنٹہ ٹھہرا لیتے ہیں اور میرے گرد تانگوں، سائیکلوں، بسوں اور دیگر کاروں کا ایک گروہ جمع ہو جاتا ہے۔ جب تک ازراہ نوازش مجھے چلنے کا اشارہ ملے میرے حواس باختہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ کار کو تانگے سے بچاؤں تو میرا مڈگارڈ بس سے جا چپکتا ہے، بس سے بچاؤں تو کسی منسٹر کی ممی کار کا سامنا ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ "جل تو جلال تو" کا ورد کرتا انارکلی میں داخل ہوتا ہوں۔ وہاں عموماً حسین جلوہ ریز ہوں۔ ادائیں فتنہ خیز ہوں۔ ہوائیں عطر بیز ہوں، تو "شوق کیوں نہ تیز ہوں" کا عالم ہوتا ہے لیکن اس گنہگار کی نظریں تانگوں کے پائیدانوں، کاروں کے بمپروں اور سائیکلوں کے پیڈلوں پر ہوتی ہیں کہ کب میری کار کا بخیہ ادھیڑتے ہیں پٹر پٹر چلاتا، ہارن بجاتا جگہ ڈھونڈتا ہوں کہ کہیں کار کھڑی کر سکوں، لیکن کاروں اور تانگوں کی مسلسل قطار لوہاری دروازہ تک نظر آتی ہے۔ یوں ہی رینگتا رینگتا انارکلی کے اخیر تک پہنچ جاتا ہوں اور دل میں شکر بجا لاتا ہوں کہ انارکلی میں کار کے لئے جگہ نہیں ملی تو نہ سہی۔ جان بچی لاکھوں پائے خیر سے بدھو گھر کو آئے۔ اتنے میں ایک سائیکل سوار حضرت بجلی کی تیزی سے دائیں بائیں لپکتے، پیچھے سے نمودار ہوتے ہیں اور اپنے دائیں پیڈل کی وساطت سے میرے بائیں مڈگارڈ پر مختلف قسم کے نقش و نگار چھوڑ جاتے ہیں اور مڈگارڈ کا کچھ حصہ ساتھ لے جاتے ہیں۔

فاعتبروا یا اولی الابصار!

---

[1] پنجابی، بابو صاحب گھوڑا اینا ہے۔

ہماری ڈاک

محبی ۔ آداب و نیاز ۔ "ماہ نو" کا استقلال نمبر ملا اور سرورق دیکھتے ہی یشب و یاقوت کے جگمگاتے ہوئے ہار، پکھراج اور پری دوت کے دست بند اور نیلم و زبرجد کی بیش بہا انگشتریاں یاد آگئیں ۔ سرورق اس قدر حسین اور دیدہ فروز تھا کہ اسے ہی دیکھتا رہا ۔ جی کسی طرح تیار نہ ہوتا تھا کہ آگے بھی کچھ ورق الٹ کر دیکھوں منظومات اور مضامین کے بارے میں میرا کچھ عرض کرنا چھوٹا منہ اور بڑی بات ہوگی ۔ آپ کا انتخاب قابل قدر اور ہر لحاظ سے لائق صد تحسین ہے ۔ گو میری داد تحسین ناشناس سہی لیکن داد دئے بغیر چپ بھی نہیں رہا جا سکتا ۔

جناب ادریس صدیقی صاحب کا مضمون بے حد دلچسپ اور معلومات افزا ہے ۔ آپ ایسے مضامین شائع فرما کر ادب کے علاوہ ہمارے ملک کی تہذیب و ثقافت کی ایک بے مثال خدمت سرانجام دے رہے ہیں ۔ خدا "ماہ نو" کو سلامت رکھے کہ اس کی بدولت اپنے آبا کے مدائن کی سیر تو ہو جاتی ہے ۔

جناب ابو الفضل صدیقی صاحب کا "کمبھیڑے" بیحد پسند آیا ۔ میں بہت کم ہنستا ہوں، لیکن مجھے اعتراف ہے کہ بعض مقامات پر بے اختیار ہنس پڑا ۔ ان کی ہندی دانی کی تعریف فضول ہے ۔ ان کی ساری عمر مہاجنوں، بنیوں، پنڈتوں اور ودوانوں میں گذری ہے ۔ وہ ہندی نہیں لکھیں گے تو اور کون لکھے گا؟

مخدومی و مکرمی ڈاکٹر باقر صاحب قبلہ کا غصہ بجا ہے، لیکن انہوں نے جو مجھے درباداروں کی فہرست میں گنوایا ہے، یہ مجھ پر ظلم ہے ۔ وہ جو کچھ فرماتے ہیں بجا ہے، لیکن انہیں شعرا کی افتادِ طبع کا احترام تو کرنا چاہیئے تھا ۔ بہرحال وہ استاد ہیں اور سعادت مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ استاد کی گھڑکیاں سہہ لی جائیں اور سامنے "شوکنا" اچھا نہیں ۔

آپ کا ۱۸۵۷ء ممئی نمبر کا اعلان پڑھ کر کلیجے پر چھریاں چل گئیں ۔ میر تقی "چہار درویش" کا پہلا درویش بعینہٖ یہی واقعات دُہراتا ہے اور ۱۸۵۷ء کے بعد اسیرانِ وطن کی مساعی کا ذکر کرتے ہوئے تخلیقِ پاکستان تک آکر حضرت قائد اعظمؒ کی ایک تقریر سنا کر اپنا بیان ختم کر دیتا ہے ۔ افسوس! یہ نظم پہلے ہی "ہمایوں" میں چھپ چکی ہے ۔ ———— جعفر طاہر

مکرمی ۔ سلام نیاز

میں مستقل طور پر تو نہیں، البتہ اکثر "ماہ نو" کا مطالعہ کرتا ہوں ۔ میرے نزدیک "ماہ نو" اردو ادب اور پاکستانی ثقافت کی بڑی ٹھوس خدمات انجام دے رہا ہے "جمہوریہ نمبر" دیکھ کر تو آپ کو بے اختیار آپکو مبارکباد پیش کرنے کو جی چاہتا ہے ۔

اس سے قبل کئی دفعہ یہ چیز میرے ذہن میں کھٹکی کہ "ماہ نو" باوجود ہر قسم کے وسائل مہیا ہونے کے ٹائپ میں کیوں طبع نہیں ہوتا، جب کہ "ماہ نو" اردو زبان و ادب کی ترقی کا بہت بڑا علمبردار ہے اور یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ لیتھو کی چھپائی اردو کی خاطر خواہ ترقی میں بڑی رکاوٹ ہے ۔ پھر یہ سوچ کر کہ نہ جانے "ماہ نو" کن مصلحتوں کی بنا پر لیتھو میں چھپ رہا ہے، خاموش ہو جاتا رہا ہوں ۔ اب جمہوریہ نمبر کے چند صفحے ٹائپ میں چھپے ہوئے دیکھ کر بیحد مسرت ہوئی اور بے اختیار یہ سطور لکھنے پر مجبور ہو گیا ۔ آپ خود دونوں چھپائیوں کا موازنہ کریں اور قارئین سے بھی دریافت فرمائیں ۔ نتیجہ یقیناً میری رائے سے اتفاق کی صورت میں نکلے گا ۔

اگر اس اقدام میں کوئی مانع نہ ہو تو جلد یا بہ دیر "ماہ نو" کو ٹائپ میں طبع کرانے کا انتظام فرمائیں ۔ فی الحال چند صفحات ٹائپ کے شامل کیے جا سکتے ہیں ۔ اگر نتیجہ مفید صورت میں نکلے تو سارے کا سارا "ماہ نو" ٹائپ میں طبع ہونا چاہیئے ۔ پھر جب آپ دوسری زبانوں کے رسائل ٹائپ میں طبع کراتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ہم اردو پڑھنے والوں کو اس سے محروم رکھا جائے؟ امید ہے آپ یہ انتظام فرما کر اردو خواں طبقے پر بہت بڑا احسان فرمائیں گے ۔

مخلص محمد احمد

محترم مدیر ۔ تسلیم ——— بچپن سے بکر مجھے اردو زبان کے ساتھ دلچسپی رہی ہے ۔ اب تک کسی رسالہ کا خریدار نہیں بنا ۔ "ماہ نو" کے اداریے، کتابت اور طباعت کی خوبی کو بہت پسند کیا ۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ میں مندرجہ ذیل شرائط کی بنا پر خریدار بننے کیلئے تیار ہوں ۔

۱۔ میری نظمیں اور مقالات معیاری ہونے کی صورت میں آپکو "ماہ نو" میں شائع کرنے ہونگے ۔ معمولی سی اصلاح و ترمیم کا آپکو حق حاصل ہوگا ۔ "ماہ نو" میں شائع شدہ منظومات یا غزلیں اس کے حوالے سے کسی رسالہ یا اخبار میں شائع کرا سکوں گا ۔

۲۔ منظومات، مضامین اور مقالات کی اشاعت کے عوض آپکو کوئی معاوضہ ادا نہ کرنا ہوگا ۔

۳۔ نظم یا غزل یا مضمون کے ابتداء میں نام پورا لکھنا ہوگا یعنی م ۔ ش ۔ ق ہوشیار پوری ..... لائلپور ۔ "صرف ق ہوشیاری" پر اکتفا نہ کیا جائے گا ۔ ٹائٹل پر آپ صرف ق ہوشیار پوری لکھ سکتے ہیں ۔

خمستانِ فرنگ

بقیہ: صہ ۲۳

جانتا تھا اور بعض جگہ جہاں ہکلسن یا کیرنن اُلجھ یا بھٹک جاتے تھے اور ووڈن خود بھی ایک طرح سے بے بس ہو جاتا تھا تو اس کا وہ دوست فارسی کی اصل نظم کو دیکھ کر اس کی دستگیری کرتا تھا اور یوں یہ نہایت مشکل کام اپنی تمام دقتوں کے باوجود سرانجام پا گیا۔

ترجمے کی دشواریوں سے گذر کر اب ووڈن اقبال کی شاعری کی دنیا میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ چنانچہ وہ کہہ رہا تھا کہ اگرچہ اس نے دوسری زبانوں کے شاعروں کے کلام کو بھی اکثر ڈچ زبان کے سانچے میں ڈھالا تھا اور ان ترجموں کے بہت سے مجموعے بھی شائع کئے تھے لیکن معانی کی جتنی مشکلیں اس کو کلامِ اقبال کا ترجمہ کرتے وقت پیش آئی تھیں اس کا اندازہ وہی کچھ کر سکتا تھا یا اسکے وہ دوست جو اس کو اقبال کے شعروں پہ سر دھنتے ہوئے دیکھتے تھے اور حیران ہوتے تھے۔ اس کے نزدیک اقبال واقعی بہت بڑا شاعر تھا اور اس کی عظمت سے انکار کرنا کم از کم اس کے لئے ناممکن تھا۔ دراصل اس کی عظمت ہی کا یہ سکہ تھا کہ اس نے اپنے آپ کو اس بے حد دشوار کام کو سرانجام دینے کے لئے رضامند کر لیا تھا۔ اقبال کو اپنے مطالب کے اظہار پر حیرت انگیز قدرت حاصل تھی۔ چنانچہ بیسویں صدی کے ان تمام شعرا میں جن کا کلام اس نے ترجمہ کرنے کی غرض سے مطالعہ کیا تھا، اقبال کو نہایت بلند اور ارفع مقام پہ پایا تھا۔

میں اب ووڈن سے ایک ایک کر کے اقبال کی اُن نظموں کے عنوان جاننا چاہتا تھا جن کا اس نے ترجمہ کیا تھا اور پھر اپنے ذہن میں اُن نظموں کے اصل متن کو لا کر اُن کے ترجمہ شدہ مفہوم سے آشنا ہونا چاہتا تھا تاکہ دیکھ سکوں کہ ڈچ ترجمے میں اصل خیال سے کہاں تک نقش و نگار باقی رہ گئے تھے کہ ہورنک نے جس نے ہماری اس تمام گفتگو میں کم ہی دلچسپی لی تھی اور جو کرسی پر بیٹھا اب اونگھنے بھی لگا تھا یکایک جیسے چونک سا پڑا۔ اس نے اپنی کلائی کی گھڑی کی طرف دیکھا اور مجھے بتایا کہ ہیگ کے لئے آخری گاڑی چھوٹنے میں صرف چند ہی منٹ باقی رہ گئے تھے۔ اور اگر مجھے کل صبح تک یہیں نہیں رہنا تھا تو مجھے فوراً اسٹیشن پہ پہنچنا چاہیئے تھا۔ صبح تک ایمسٹرڈم میں رہنے کے تصور نے جیسے مجھے خواب سے چونکا دیا۔ میں گھبرا کر اپنی جگہ سے اُٹھ بیٹھا۔ نہایت عجلت میں مسز ووڈن سے، جو ہمیں اس تمام عرصے میں بار بار کافی پلاتی رہی تھی، رخصت طلب ہوا۔ ووڈن میرے ساتھ اسٹیشن تک جانے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اس لئے میرا خیال تھا کہ راستے میں بھی اقبال کے بارے میں اس سے گفتگو کروں گا۔ مگر اسٹیشن اتنا قریب تھا اور ہورنک نے کار کو اس قدر تیزی سے چلایا کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں گاڑی پر سوار نہ ہو سکتا تھا۔

قدیم وادیٔ سندھ کی معاشرت

بقیہ: صہ ۲۷

گیا ہے کہ یہ لوگ سماوی اثرات کے قائل تھے اور علم نجوم سے کچھ نہ کچھ شغف رکھتے تھے بعض محققین نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہاں کے لوگوں کا سال شمسی حساب سے تھا۔ اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا گیا ہے کہ دریائے سندھ میں برسات کے خاص مہینوں میں طغیانی اور اسی طرح مقررہ مہینوں میں جاڑے اور گرمی کے موسم آتے ہوں گے اور موسموں کی یہ تبدیلی سورج کے عمل کے تابع ہے۔ چنانچہ قیاس کیا گیا ہے کہ یہ لوگ چاند کی بہ نسبت سورج سے زیادہ عقیدت رکھتے ہوں گے۔ اس کے مزید ثبوت سواستکا کے بہت سے نشانات کا پایا جانا بھی ہے جو سورج کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔

جو باقیات اب تک دریافت ہوتے ان سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہاں کے ارباب علم و حکمت: وید، جوتشی اور ساحر پر مشتمل تھے۔ جنگجو طبقہ کی موجودگی کے کوئی آثار نہیں ملتے۔ برچھیاں، تیر یا دوسرے اوزار اتنے اچھے نہیں ہیں کہ ان سے لڑ کر کوئی جنگ جیتی جا سکے۔ حکام میں حکومت کے عمال اور بندریہ کے ملازمین تھے۔ یہاں ایک تجارت پیشہ قوم آباد تھی، بقیہ لوگ صنعت کار اور اہل حرفہ تھے۔ مثلاً کاشتکار، مچھیرے، ملاح، بھیڑوں اور گایوں کے چرواہے، گاڑی بان، گھریلو نوکر، زرگر، عقیق اور ہاتھی دانت کے کاریگر، کمہار، کھلونے بنانے والے، ٹھٹھیرے، راج، معمار، مکان بنانے والے مزدور، لکڑہارے، سنگ تراش اور مہر تراش، ان تمام پیشہ وروں کی موجودگی کے کچھ نہ کچھ شواہد ضرور ملتے ہیں۔

"معلق شاہراہ" ——— بقیہ: ص ۳۲

"مہاندری ہے ادرے —" ضیا چلایا۔ "یہ تو کوئی زنداں معلوم ہوتا ہے۔" ضیا کا قہقہہ اس زنداں میں یوں دب کر رہ گیا جیسے پریس کے نیچے روئی دب جاتی ہے۔"

"بھائی وہ سنتری" عمر باآواز بلند چلایا۔ "میں نے کہا مسعود"

وہ چیخ کر بولا "اماں میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

"عمر کے ہونٹ ہل رہے تھے جیسے میں، وہ یوں ہاتھ چلا رہا تھا جیسے سینما میں آواز خراب ہو جانے پر تصویریں خالی ہونٹ ہلاتی ہیں۔

"یہ عمر کیا کہہ رہا ہے؟" ضیا بولا۔

"بھئی واہ" مسعود قہقہہ مار کر ہنسا۔ "یہ تو لاجواب جگہ ہے۔ یہاں تو خالی ہونٹ ہلتے ہیں، آواز نہیں نکلتی۔ بیاہے ہوئے لوگوں کو اپنی بیویوں کو یہاں لے آنا چاہیئے تاکہ نہ اُن کا جھگڑا سنائی دے نہ گھر کا سکون تباہ ہو۔"

"اچھا سکون ہے۔" ضیا بولا "یہاں تو ویسے ہی رونگٹے کھڑے رہیں گے۔"

"ذرا قریب ہو کر بات کرو تو کچھ پتہ بھی چلے۔" مسعود بولا۔

ہر کوئی کھڑا اپنے ہونٹ ہلا رہا تھا ہر کوئی چلا رہا تھا۔

"بھئی واہ" مسعود تالیاں بجاتے ہوئے چیخنے لگا۔ "اسمبلی ہاؤس تو یہاں بننا چاہیئے، ہر کوئی چلائے اور کسی کی کوئی نہ سنے کے منظر کی یہاں تکمیل ہو جائے گی۔"

عمر بھاگا بھاگا آیا، اس نے سب کو گردن سے پکڑا۔ ایک مقام پر اکٹھا کیا اور پھر چلا کر کہنے لگا "بھئی آگے جانا ہے کہ نہیں؟ وہ سنتری بیٹھا ہے، کہتا ہے اب ادھر سے کوئی گاڑی ناران کی طرف نہیں جا سکتی۔ ٹائم ختم ہو گیا ہے، اس نے پھاٹک بند کر رکھا ہے۔"

"بےکار ہے" مسعود چلایا۔ "وہ ہماری بات سنے گا ہی نہیں۔ مہاندری میں کوئی شخص دوسرے کی بات نہیں سن سکتا۔ میں اپنی ماں اور بیوی کو یہاں بھیج دوں گا" "بڑی محبت سے رہیں گی یہاں وہ۔" وہ تالیاں بجاتے ہوئے ہنسنے لگا۔

"بے وقوف" عمر چلایا۔ "وقت گزرتا جا رہا ہے۔ سنتری کو منا لو تو مزے میں رہیں گے۔ ورنہ رات یہاں گزارنی پڑے گی۔"

"میں کہتا ہوں سنتری کو ایک روپیہ تھما دو۔" ضیا چلایا۔

"تو تم دے دو اسے روپیہ" عمر چلایا۔

"نہ بھئی۔" ضیا نے کہا "یہ مشکل بات ہے۔ اپنے کو اس کا کچھ تجربہ نہیں ہے۔"

روپیہ دینے سے باری باری سب نے انکار کر دیا۔ عمر کہنے لگا میں تو دھونس دکھا سکتا ہوں، روپیہ نہیں دے سکتا۔ عبداللہ بات سن کر ہنس دیا، اس کی خاموشی مفہوم سے لبریز تھی۔ اسحاق بولا "بھائی لینے کا معاملہ تو ٹھیک ہے، رشوت دینے کا تجربہ نہیں۔" "ابھی میری باری نہیں آئی تھی کہ مسعود چلانے لگا۔" روپیہ دینے کا کیا ہے؟" وہ بولا "روپیہ میں دے دوں گا، کہو تو پانچ دے دوں لیکن بات نہیں کرنا ہوگی۔"

سنتری سے بات کرتے ہوئے۔ عمر جوش میں آ گیا اور روپیہ دینے کی تفصیل کو بھول کر دھونس دکھانے لگا۔ "آخر کیوں نہیں کھولتے تم پھاٹک؟" وہ چلایا۔

"ہم اپنی غلطی کی وجہ سے لیٹ نہیں ہوئے۔" ادھر عمر چلا رہا تھا، ادھر سنتری یوں خاموشی سے پہاڑوں کی طرف گھورنے میں لگا ہوا تھا جیسے وہ سپاہی نہیں بلکہ عاشق ہو اور اس کی محبوبہ پہاڑ کی اس چوٹی پر رہتی ہو۔ دفعتاً مسعود ڈرامائی انداز سے آگے بڑھا اور بات کئے بغیر سنتری کے ہاتھ پر روپیہ رکھ کر بولا۔ "دیکھنا تو بھائی یہ روپیہ کھرا ہے؟" سنتری چونکا، اسے بجانے لگا یہ دیکھ کر مسعود آگے چل پڑا۔ جب سنتری نے کہا "ہاں ٹھیک ہے" تو وہ دور جا چکا تھا "کھرا ہے بابو۔" سنتری نے چلا کر کہا لیکن مسعود چلتا گیا۔ سنتری نے حیرانی سے ہماری طرف دیکھا اور پھر روپیہ جیب میں ڈال از سر نو بت بن کر بیٹھ گیا اور سامنے پہاڑ کی چوٹی کو گھورنے لگا۔

"ہمیں جواب دو نا —" عمر نے چلا کر کہا لیکن سنتری چپ چاپ بیٹھا رہا۔

"اونہوں" ضیا چلایا "بےکار ہے۔" یہ کہہ کر وہ دریا کی طرف چل پڑا۔ اسے آتے دیکھ کر ہم سب وہاں سے سرک آئے۔ صرف عمر وہاں کھڑا رہ گیا۔ وہ چیخ رہا تھا، چلا رہا تھا، اس کے منہ سے کف جاری تھے لیکن وہ ابوالہول سنتری یوں چپ چاپ بیٹھا تھا جیسے پان فروش چپ چاپ ریڈیو کے پاس بیٹے رہتے ہیں۔

(باقی)

اقبال اور تصور خودی — بقیہ: صفحہ ۱۰

فکر کی رسائی محدود ہے اس لئے وہ لامحدود کو نہیں سمجھ سکتا۔ فکر اپنی عمیق حالت میں اس لامتناہی محیط کل تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہے جس کی خودکش حرکت میں مختلف متناہی تصورات محض لمحات کی حیثیت رکھتے ہیں، لہذا فکر اپنی اصلی نوعیت کے لحاظ سے جامد نہیں حرکی ہے اور بتدریج اپنی داخلی لامحدودیت کو زماں میں ظاہر کرتا رہتا ہے۔ وہ ایک حرکی خود اظہار کل ہے جو ہم کو متعین شکلوں کا سلسلہ معلوم ہوتا ہے۔ فکر کائنات کی زندگی میں تدریجی شرکت سے اپنی محدودیت کی حدود کو توڑ کر داخلی لامحدودیت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے بے معنی تصور کرنا درست نہیں کیونکہ وہ اپنے طور پر متناہی کو لامتناہی کی خبر دیتا ہے۔" (لکچرز صفحہ ۶)

وجد کے بارے میں کہتے ہیں کہ ہمارا قلب ایک قسم کی داخلی بینائی ہے یہ ہم کو حقیقت کے ایسے پہلوؤں کا مشاہدہ کراتی ہے جو مشاہدہ اور فکر سے نظر نہیں آ سکتے۔ یہ بینائی کوئی پراسرار حس نہیں ہے بلکہ حقیقت کو سمجھنے کا ایک طریقہ ہے جس میں ظاہری حواس کو استعمال نہیں کیا جاتا۔ گو اس تجربے کا منطقی لحاظ سے تجزیہ ممکن نہیں تاہم علم کے ایک ذریعے کے لحاظ سے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ فکر اور وجد متضاد اور مخالف تجربات نہیں ہیں۔ زبور عجم میں کہتے ہیں ؎

عقل ہم عشق است و از ذوق نگہ بیگانہ نیست

ان کے خیال میں ان دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے اور وہ ایک دوسرے کا تکملہ کرتے ہیں۔ ایک حقیقت کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے اس کا جائزہ لیتا ہے، دوسرا اس کا کلیتہً نظارہ کرتا ہے۔ ایک کی نظر حقیقت کے خارجی پہلو پر ہوتی ہے دوسرے کی داخلی پہلو پر۔ دونوں کو باہمی احیا کے لئے ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔

انسانی خودی اسی علم کے ذریعہ حقیقت کو سمجھنے اور اپنے آپ کو حالات کے مطابق بنانے کی سعی کرتی ہے اور اسی ہتھیار سے حقیقت کے خارجی اور داخلی پہلوؤں پر فتح حاصل کرتی ہے۔

اقبال کے فلسفۂ خودی کی اس تشریح سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ زندگی کا واحد مقصد خودی کا استحکام و ارتقا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ خودی کے استحکام کے لوازمات کیا ہیں اور وہ کونسی باتیں ہیں جو خودی کو کمزور کر کے اس کے انہدام کا باعث ہوتی ہیں۔ اقبال نے اقدار کا معیار بھی پیش کر دیا ہے جس سے اعمال و افعال کی اچھائی برائی پہچانی جا سکے۔ ہر وہ عمل جو خودی کو چمکائے، ابھارے، مستحکم کرے حسن ہے، صواب ہے، عبادت ہے۔ ہر وہ عمل جو خودی کو مضمحل کرے، کمزور کرے، مٹائے برا ہے، گناہ ہے۔

سیدھی پیٹھ
اور
مضبوط اعضاء کے لئے
اپنے
ننھے بچّہ کو یہ خالص دودھ
دیجئے
OSTERMILK
اگر آپ کا بچّہ بوتل سے دودھ پا رہا ہے تو اُس کے لئے آسٹر ملک
بہترین ہے۔ یہ ایک خالص قوّت بخش اور غذائیت والا دودھ ہے
جس کے استعمال سے بچّوں کی پیٹھ سیدھی اور اعضاء مضبوط ہوجاتے
ہیں۔ ہڈیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے اسمیں وٹامن "ڈی" ملایا جاتا
ہے اور لوہا شامل کیا جاتا ہے تاکہ بچے خون کی کمی والی بیماری سے محفوظ رہ سکیں۔
اس لئے آسٹر ملک فوراً خریدیئے۔ یہ خاص کر پاکستان میں بچّوں
کے لئے بیحد موزوں ہے۔
ہر ماں کے لئے مفید مشورہ
تین مہینے کی عمر تک بچّے کو ۲۴ گھنٹہ میں ۲۰ گھنٹہ سونا چاہیئے اس
عمر کے بعد نیند کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ نو مہینے کی عمر میں
بچّہ کو دن کے وقت صرف ۴ گھنٹہ اور ۲۴ گھنٹہ میں کُل ۱۶ گھنٹہ
سونا چاہیئے۔
آسٹر ملک
ماں کے دودھ سے قریب تر
گلیکسو لیبوریٹریز (پاکستان) لمیٹڈ
کراچی لاہور چٹاگانگ ڈھاکہ
R. 62

کتاب منزل لاہور کی چند نادر مطبوعات

سرگذشتِ مجاہد
از غلام رسول مہر

سید احمد شہیدؒ کے سلسلہ کی چوتھی اور آخری جلد۔
اعلاءِ کلمۃ الحق اور آزادیٔ وطن کے لئے حضرت سید احمد شہید نے جو علمِ جہاد کفر و ضلالت کے ہولناک دور میں بلند کیا اس کا پھریرا اندرون و بیرون ہند ایک صدی تک لہراتا رہا مگر اس کی داستان عزم و استقامت کے اوراق استبدادی ہاتھوں کے طفیل اس طرح بکھر چکے تھے کہ اب تک کسی زبان میں یکجا نہ ہو سکے۔ خدا کا شکر ہے کہ مولانا غلام رسول مہر نے ایک عرصہ کی جانکاہی کے بعد انہیں یکجا کر دیا ہے اور اب یہ کتاب کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اس میں ہمارے دورِ انحطاط کا پس منظر، مستقبل کی شاندار عمارت کی بنیادیں، عزم و عمل کے لئے مثالی مرقع، مجاہدین و سرفروشانِ اسلام کی قربانیاں، جانبازیاں، مقدمے، جیلیں، جلاوطنیاں، مال و املاک کی ضبطی۔ غرض سب کچھ پوری تفصیل اور تاریخی شمار کے ساتھ درج کر دیا ہے۔ قیمت ۱۳/۱۲/. روپے

سنہ ۱۸۵۷ء
از غلام رسول مہر

پاک و ہند کی پہلی جنگِ آزادی کے مفصل حالات جو پہلی مرتبہ صحیح اصول پر مرتب کئے گئے ہیں۔
جنگ آزادی کا پس منظر اور اس کے اسباب پر سیر حاصل بحث جو علاقہ بہ علاقہ اور علاقہ بہ علاقہ ترتیب سے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔
اس کتاب میں مجاہدین آزادی کی بے مثال قربانیاں بھی خاص انداز میں پیش کی گئی ہیں۔ انگریزوں نے جو خوفناک ظلم کئے اور جس بے دردی سے اہلِ وطن کا خون بہایا اس کی داستان بھی پہلی مرتبہ مکمل صورت میں پیش کی گئی ہے۔ (زیرِ طبع) اردو زبان میں ۱۸۵۷ء پر پہلی مستند کتاب ہے۔

۱۸۵۷ء کے مجاہد
از غلام رسول مہر

جن بہادر جانبازوں اور اولوالعزم مجاہدوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو کامیاب بنانے میں نمایاں حصہ لیا اور وطن کو آزاد کرانے میں جان کی بازی لگائی اُن کے مستند و مفصل سوانحِ حیات؛ ایسی کتاب آج تک کسی بھی زبان میں نہیں لکھی گئی۔ حضرت محل۔ رانی جھانسی، شہزادہ فیروز شاہ۔ مولانا احمد اللہ شاہ، نانا صاحب، تانتیا توپے، عظیم اللہ خان، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، جنرل بخت خاں۔ ڈاکٹر وزیر خاں، مولانا لیاقت علی اور بیسیوں دوسرے مجاہدوں کے ولولہ افروز حالات (زیرِ طبع)

اقبال اور عشقِ رسولؐ

اقبال کا مطالعہ ایک نئے انداز سے۔
اقبال کی شاعری ملتِ اسلامیہ کے لئے ایک پیغام تھی لیکن اس پیغام کا اساسی سرمایہ ملک و ملت میں صحیح اسلامی اسپرٹ کی تبلیغ تھی۔ اقبال نے یہ اسپرٹ اسی چشمۂ فیض عام سے حاصل کی تھی جو فاران کی چوٹی سے پھوٹا تھا۔ اقبال کی شاعری میں پیغمبرِ اسلام کا ذکر جس انداز سے کیا گیا ہے۔ رئیس احمد جعفری نے اس سے کلامِ اقبال کا ایک نئے انداز سے مطالعہ کیا ہے۔ اور مطالعہ اقبال کے لئے ایک نئے تحقیقی اسلوب کا آغاز کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ اس نامور شاعر نے پیغمبرِ اسلام کی ہدایات اور رہنمائی کو کس والہانہ عقیدت سے اپنی ذات اور شاعری کی متاع بنایا۔ سائز ۲۷×۱۷ صفحات ۴۵۸ قیمت ۴/۱۲/

اقبال اپنے آئینہ میں
رئیس احمد جعفری

اقبال کے بارے میں سب دنیا کی شہادت یہ ہے کہ وہ حکیم الامۃ تھے، ترجمانِ حقیقت تھے، مفکرِ اسلام تھے، بہت بڑے فلسفی تھے۔ سیاست ملی کے مجاہد تھے۔ پان اسلامزم کے علمبردار تھے، عاشقِ رسولؐ تھے۔ فرنگی سامراج کے نکتہ چیں تھے۔ غلامی کے دشمن تھے، آزادی کے متوالے تھے۔ کوئی شبہ نہیں یہ سب باتیں اپنی جگہ پر صحیح اور بالکل صحیح ہیں۔ لیکن اقبال کے اشعار، اقبال کا تعارف کس طرح کراتے ہیں یہ موضوع اب تک اچھوتا ہے۔ اس پر اب تک کسی نے خامہ فرسائی نہیں کی۔ اب ملک کے مشہور اہلِ قلم رئیس احمد جعفری نے اس موضوع کو اپنایا ہے۔ اور "اقبال اپنے آئینہ میں" لکھ کر اقبالیات کے سلسلہ میں ایک گراں بہا اضافہ کیا ہے۔ سائز ۲۷×۱۷ صفحات ۴۰۰۔ قیمت چھ روپے۔

زیب النساء
از حسین الور

مغل شاہزادی جس کی ضیاء پاشیوں نے ایران اور ہندوستان کو جگمگا دیا۔ عالمگیرؒ کی وہ چہیتی بیٹی جس نے علم و ادب کے پرچم کو بلند کیا۔ اگر اس کا وجود نہ ہوتا تو عہدِ عالمگیری میں شعر و ادب کا چراغ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بجھ جاتا۔ مغل حکمرانوں نے جہاں بت کدۂ ہند میں تہذیب و تمدن اور فنِ تعمیر و مصوری کو ایسا فروغ دیا کہ آج بھی اس دھرتی کے سینے پر اُن کی یادگاریں عظمت و جلال کے پرچم بلند کر رہی ہیں وہاں زیب النساء نے علم و ادب کی ایسی سرپرستی کی، جس کی مثال تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اور اب حسین الور نے زیب النساء کے حالات ناول کے پیرائے میں پیش کر کے اُردو ادب میں ایک عظیم اضافہ کیا ہے۔ سائز ۲۲×۱۸ صفحات ۴۶۴ قیمت چھ روپے بارہ آنے۔

ملنے کا پتہ

شیخ غلام علی اینڈ سنز تاجرانِ کتب۔ کتاب منزل کشمیری بازار لاہور۔ بندر روڈ کراچی

ان کی تندرستی اہم ہے
اسی وجہ سے میں ہمیشہ ڈالڈا
سے کھانا تیار کرتی ہوں
اتنے ہی وٹامن جتنے کے اصلی گھی میں
اب ڈالڈا برانڈ وناسپتی میں بہت زیادہ
غذائیت ہے۔ ڈالڈا کے ہر اونس میں وٹامن اے کی
اتنی ہی مقدار موجود ہے جتنی کے اچھے اور خالص گھی میں
ہوتی ہے۔ ڈالڈا میں وٹامن ڈی بھی موجود ہے! آپ کے
بچوں کی صحت مند پرورش کے لئے ان کی غذا میں ان
دونوں وٹامن کی موجودگی ضروری ہے
ہمیشہ محفوظ اور پاک و صاف
ڈالڈا برانڈ وناسپتی کو عمدہ نباتی تیلوں سے تیار
کر کے حفظان صحت کے اصولوں کے تحت سربمہر اور
ہوا بند ڈبوں میں بھرا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ تازہ اور
صاف ستھرا ہے۔ اپنے تمام کھانے ڈالڈا سے تیار
کیجئے۔ اور اپنے گھر والوں کو صحت مند رکھئے۔
ڈالڈا براںڈ وناسپتی
کھانوں کو بہتر بناتا ہے
HVM 19—193 UD

PA

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳، کراچی نے شائع کیا ۔ مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس مکلوڈ روڈ ۔ کراچی
مدیر: رفیق خاور

جون ۱۹۵۷ء

ابوالاثر حفیظ	فراق گورکھپوری	فضل احمد کریم فضلی
ممتاز مفتی	جناب امتیاز علی	ڈاکٹر سید عبداللہ
سید ضمیر جعفری	سید یوسف بخاری	یونس احمر
سید امین اللہ ظفر	شین مجمی	صمیم اظہر

ماہ نو

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی یادگاری تقاریب

اہالیان ... کی طرف سے بہادر شاہ ظفر ... زندہ باد

کراچی میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی یادگار
کیا جائے گا نیاز محمد خاں صاحب چیف کمشنر

یوم ظفر ...

اب ت
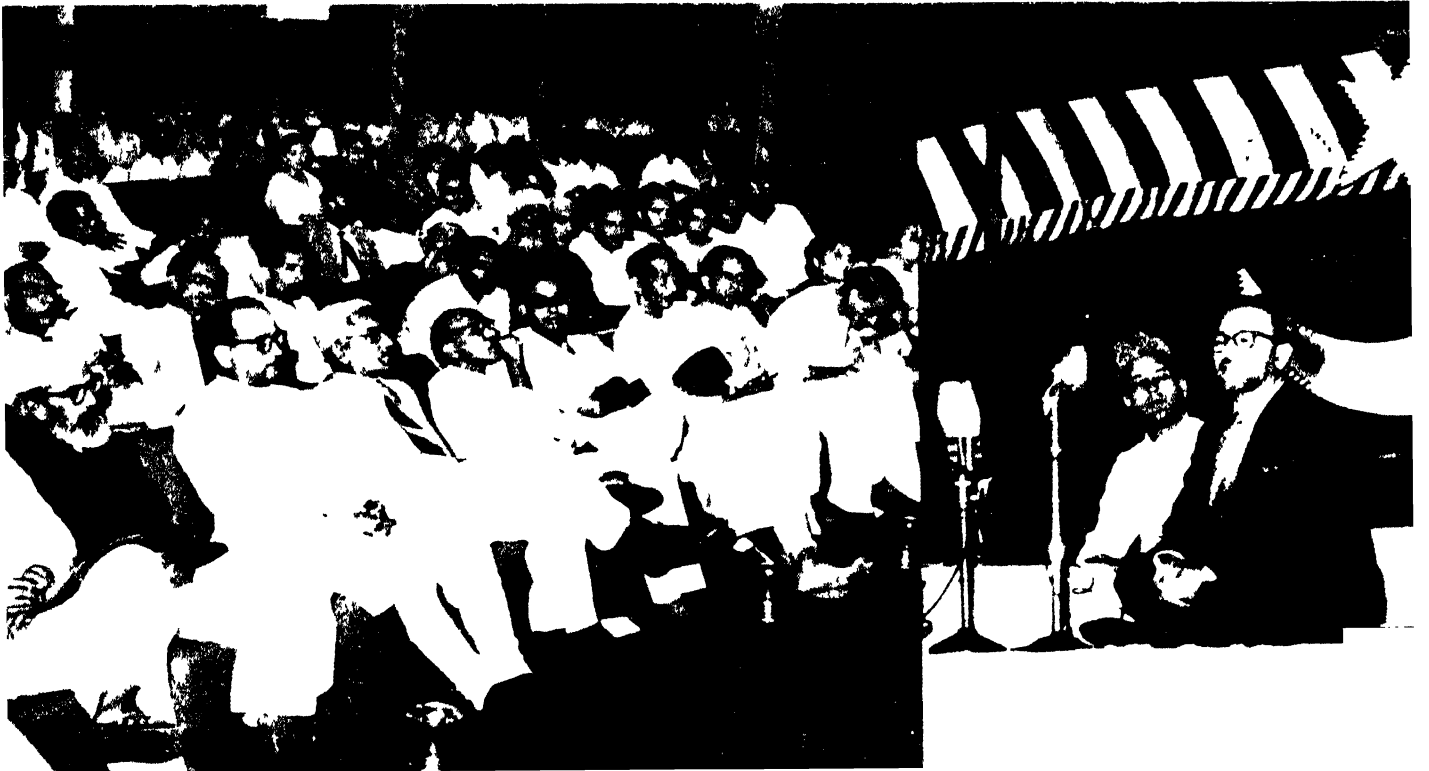
بچوں کی پرورش کا پہلا سبق

بچے نازک، ناتواں اور بڑی دیکھ بھال کے محتاج ہوتے ہیں۔ تاہم اُن کے اندر نشوونما کی زبردست صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ مناسب نگہداشت، اچھی غذا اور عمدہ ٹانک کے استعمال سے اُن کے پنپتے ہوئے اور زندگی سے بھرپور جسم کو پُوری پُوری افزائش کا موقع مل سکتا ہے۔
نونہال کے باقاعدہ استعمال سے آپ کے بچے کو وہ تمام اجزا مناسب مقدار میں مہیا ہوتے رہیں گے جو اُس کی نشوونما اور اُسے بیماریوں سے بچانے کے لئے ضروری ہیں۔
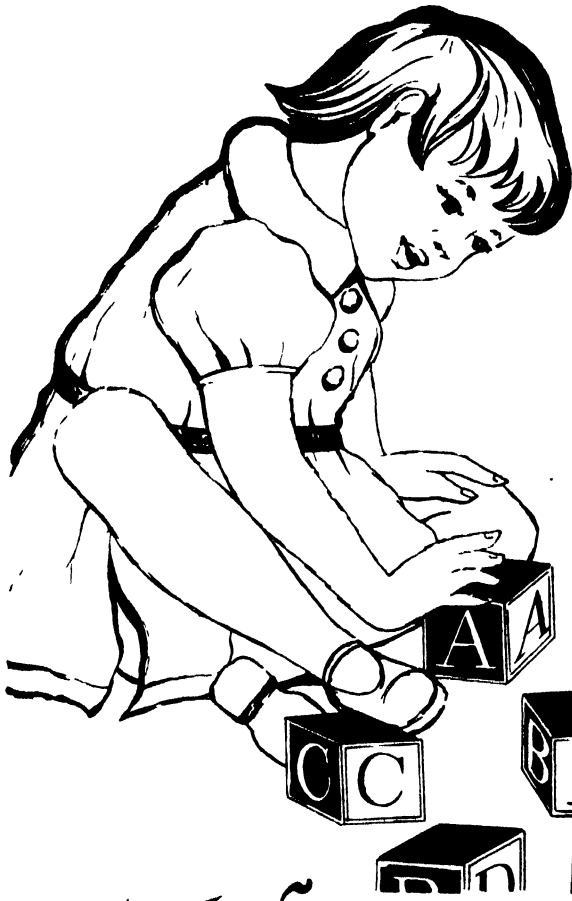
"گرائپ مکسچر" و "بے بی ٹانک" ہر موسم میں یکساں طور پر مفید ہیں

ہمدرد

تعلیم و تربیت کا اہم منصوبہ
تعلیم اور تربیت کے مسئلہ کو حکومت پاکستان کے نزدیک ہمیشہ بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے مدرسوں
کے لئے نئی عمارتوں کی تعمیر اور ٹیکنیکل تربیت کے لئے سہولتوں کی فراہمی کی بدولت اندازہ ہے کہ
طالب علموں کی تعداد میں دس لاکھ سے زیادہ اضافہ ہو جائے گا اور سولہ سو انجینیر اور مستری ہر سال
ٹریننگ حاصل کر سکیں گے۔
پیٹرولیم سے بنی ہوئی چیزوں کی حتی المقدور بالکفایت تقسیم کاری کے ذریعہ برماشیل بھی عوام کا
معیارِ زندگی بہتر بنانے کے لئے کوشاں ہے اور اس طرح پاکستان کی ترقی میں معاون ہے۔
برماشیل ترقئ پاکستان کا ایک حصہ ہے۔
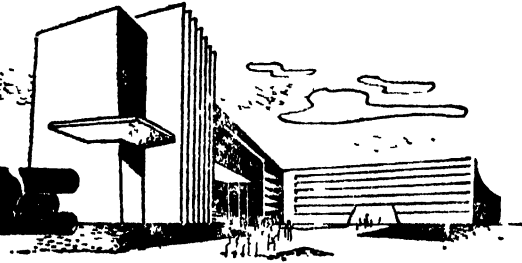
پین امریکن، جس کی سروس ۷۹ ممالک میں موجود ہے، ہر ملک میں مسافروں کا پُرجوش خیر مقدم کرنے کے لئے تیار رہتی ہے۔

"ہم آپ ہی کے منتظر تھے..."

پین امریکن کے ۴۱۱ دفاتر میں سے، جو دُنیا بھر میں موجود ہیں، ہر دفتر آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہے۔ ہر جگہ پین امریکن کے، محبت سے پیش آنے والے قابل لوگ، جو آپ ہی کی زبان بولتے ہیں، آپ کو مع سامان کے کسٹم سے گزرنے، آپ کے لئے ہوٹل میں کمرہ مخصوص کرانے، آپکی رہنمائی اور تعارف وغیرہ میں آپکی مدد کرینگے

اور اس طرح ہر سفر میں آپ وہ بے بہا فائدہ حاصل کرتے ہیں جو دُنیا کے گرد پرواز کے دَوران میں ہم نے حاصل کیا ہے۔ پین امریکن دُنیا کے گرد چکر لگانے والی پہلی ایرلائن ہے جو بحرِ اوقیانوس کو ساٹھ ہزار سے زائد مرتبہ عبور کر چکی ہے اِس میں بارہ سو ایسے ہواباز ہیں جن میں سے ہر ایک دس لاکھ میل سے زائد پرواز کر چکا ہے۔

جب آپ دوبارہ ہوائی سفر کریں تو اِس بیش بہا تجربہ سے ضرور فائدہ اُٹھائیں اپنے ہوائی سفر کے تمام انتظامات کے لئے اپنے ٹریول ایجنٹ کو موقع دیجئے۔ آپ اُسکی خدمات مفت حاصل کر سکتے ہیں۔ یا اِس پتہ پر پین امریکن سے معلومات حاصل کیجئے:۔

کراچی: ہوٹل میٹروپول، ٹیلیفون نمبر 50281

PAA

دُنیا کی سب سے زیادہ تجربہ کار ایرلائن

PAN AMERICAN

PAA 913

ماہِ نو

جلد ۱۰ شمارہ ۳

جون ۱۹۵۷ء

مدیر: رفیق خاور
نائب مدیر: ظفر قریشی

سالانہ چندہ
ساڑھے پانچ روپے
قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

ادارۂ مطبوعات پاکستان
پوسٹ بکس ۱۸۳ - کراچی

مقالات:	اقبال کا ایک ممدوح — نظیری	ڈاکٹر سید عبداللہ	۷
	نذرل کے گیت	یونس احمر	۱۴
	"دادرا" (قاضی نذر الاسلام)	مترجمہ عبدالرحمٰن بیخود	۱۶
غزلیات:	ابوالاثر حفیظ • فضل احمد کریم فضلی • فراق گورکھپوری		۱۹-۲۰
روزنامچہ/رپورتاژ:	مارچ کے لیل و نہار	حجاب امتیاز علی	۳۱
افسانہ:	معلّق شاہراہ (۴) وادیٔ کاغان	ممتاز مفتی	۲۱
	رقیہ (بنگلا افسانہ)	سید شمس الحق مترجمہ ابوسعید نورالدین	۳۷
فکاہیہ:	پرائی موٹر کا چسکا (نظم)	سید ضمیر جعفری	۴۵
نظمیں:	"شاید صدف، شاید گہر"!	ش۔ ضمی	۴۰
	نقوشِ بہار	ضمیر اظہر	۳۶
	رہ و رسم وفا	شاہد عشقی	۳۶
ثقافت:	خطاطی	سید یوسف بخاری	۴۶
افق تا افق:	(چیدہ اقتباسات)		۵۲
بہتر زندگی کے لئے:	مکھی (مصور فیچر)		۵۷
نقد و نظر:	ش۔ ح		۵۵

سرورق: شالامار باغ لاہور — رنگین عکس: خورشید

آپس کی باتیں

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق۔ اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی صد سالہ یادگار سے بڑھ کر ہنگامہ اور کیا ہوگا جو بیک وقت سانحۂ غم بھی تھا اور ہنگامۂ شادی بھی۔ یہ ہمارے قومی احساس کا امتحان تھا اور مقامِ مسرت ہے کہ ہم اس میں کامیاب رہے۔ جس جوش و خروش سے یہ یادگار منائی گئی اور اس سلسلہ میں جو سرگرمیاں دیکھنے میں آئیں، ان کا غلغلہ اس تاریخی واقعہ سے کم نہ تھا۔ یہ ایسے واقعات ہیں جو کسی قوم کو دل زندہ اور جان زندہ رکھتے اور اس میں وقتاً فوقتاً نئی روح پھونکتے رہتے ہیں۔

اس ہلچل سے شعر و ادب کی زود اثر دنیا میں بھی ہلچل پیدا ہوتی ہے، اور عوام کے سینوں سے جو لہریں اٹھتی ہیں ویسی ہی لہریں ادب و فن میں بھی اٹھتی ہیں اور اپنا اثر چھوڑ جاتی ہیں، چنانچہ پہلے کی طرح اب بھی دونوں میں ایک نئی جان پڑ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے تخلیق اور تحقیق کے کتنے ہی نادر نمونے سامنے آگئے جو ہمارے علمی، ادبی اور تاریخی سرمایہ میں ایک اہم اضافہ ہیں۔ ان سے اس قسم کی مزید سرگرمیوں کے لئے راستہ کھل گیا ہے جن کا سلسلہ دیر تک جاری رہے گا اور امید ہے دور رس نتائج پیدا کرے گا۔

غور سے دیکھا جائے تو کسی قوم کی زندگی ہنگاموں ہی سے عبارت ہوتی ہے، بعض چھوٹے بعض بڑے، کوئی سرسری کوئی دیرپا۔ اور اپنی نوعیت کے مطابق چھوٹا یا بڑا، سطحی یا بھرپور اثر بھی پیدا کرتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ادب ہمیشہ ہنگامی واقعات سے وابستہ ہو کیونکہ ادب میں تفریح و تفنن کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ اور اس سے بڑھ کر آفاقی و ابدی مسائل کو۔ تاہم زندہ تحریکوں سے جو کسماہٹیں، رواں دواں حیات سے جو احساسات ابھرتے ہیں اور ذہن و شعور میں جو اقدار انگیخت پیدا ہوتی ہے، وہ محض خیالی پلاؤ پکانے سے نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک نہایت اہم سوال ہے۔ تمام نوع انسان کا سوال طلسمی محلوں اور ہاتھی دانت کے برجوں کا ماحول بھی شاید ذہنی بقا کے لئے ضروری ہے۔ وہاں بھی کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی حد تک جہاں حقیقی تجربے ہی سے پیدا ہوتی ہے اور واقعیت سے ربط رکھنا پڑتا ہے۔ جو ادب زندہ سرگرمیوں اور سچ مچ کے حالات و واقعات سے ابھرتا ہے، وہ چلتے پھرتے زندہ انسانوں کے لئے زیادہ تاثیر رکھتا ہے اور تفنن کا سامان بشرطیکہ وہ تجربہ کسی پختہ فنی ذہن میں پرورش پاکر نمودار ہوا ہو۔

یہ بات جتلانے کے لائق ہے کہ فراریت کے الزامات کے باوجود اردو شاعری میں زندگی کے ادی کوائف کا جتنا گہرا احساس ہر عہد میں موجود رہا ہے، اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ قومی شاعری کے جو دفتر ہمارے ہاں موجود ہیں، دوسری زبانوں میں کہاں لکھے گئے اور کون سا شاعر ہے جس نے سیاسیات پر قلم نہ اٹھایا ہو۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہمیں اپنے ادبی تقاضوں پر بھی نئے سرے سے نظر ڈالنا لازم ہوا۔ تاہم حالی اور ان کے معاصرین کی نہج پر قدیم و جدید کا محتاط محاکمہ اور جامعیت سے اصلاح و تجدید، یہی ادبی ترقی کا راز اور صحیح ادبی مسلک ہے۔ خدا صفا دع ماکدر۔ نئی روشنی (عالمگیر ذہنی و ثقافتی فضا) میں بیش از بیش جدیدیت اور توسیع و ترقی، رسمیت اقل اور تجدید اتم، موجودہ انتشار کو دور کرکے اور مناسب جائزہ و تنقیح کے بعد مختلف نظریات، تصورات اور روایات کو سمو کر ایک جامع مسلک کی تشکیل ہمارا ادبی نصب العین ہونا چاہئے۔ ہم یہ بات حتمیت کے دعوے کے ساتھ نہیں بلکہ غور و فکر کی دعوت دینے کے لئے لکھ رہے ہیں۔

پاکستانی یا قومی ادب کا سوال بھی اسی کے ساتھ وابستہ ہے، کیونکہ صحیح معنوں میں قومی ادب وہ ہے جو مخصوص خد و خال کے باوجود مقامی نہیں آفاقی ہو۔ ضرورت صرف ایک نمایاں وضع کی ہے اور ایسی خصوصیات کی جو ہمارے مزاج اور روح، ہماری روایات اور ملی خصائص کی عکاسی کریں۔ کچھ عرصہ ہوا ڈاکٹر باقر نے ایک مضمون "اردو ادب اور ملی زندگی" (جمہوریت نمبر) میں اسی حقیقت کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی تھی۔ یہ ایک اچھی علامت ہے کہ ہمارے ذہین افراد کو اس مسئلہ کا احساس ہے۔

عہدِ حاضر بین الاقوامی روابط کا زمانہ ہے جس میں ثقافتی و تمدنی اشتراک لازم ہے۔ ہم اس شمارہ سے "افق تا افق" کے زیرِ عنوان دوسری زبانوں سے ہم آہنگ نگارشات کا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ شہری زندگی کا معیار بلند تر کرنے کے لئے ایک مستقل مصور فیچر اضافہ کیا گیا ہے جو تجربۃً نسخ میں طبع ہوگا۔ اس طرح امید ہے کہ "ماہ نو" مفادِ عامہ میں بھی قوم کی خدمت کر سکے گا۔

اقبال کا ایک ممدوح — نظیری

ڈاکٹر سید عبداللہ

اقبال نے اپنے کلام میں جن شاعروں کی ستائش کی ہے اور ان کے اشعار یا مصرعوں کی تضمین کی ہے، ان میں سے ایک عہد اکبری کا مشہور شاعر نظیری بھی ہے۔ غور کیا جائے تو یہ بھی تحسین کی ایک صورت ہے۔ وہ کلام جو تضمین میں آجاتا ہے پسند کی نظر سے دیکھے جانے کے بعد انتخاب اور تضمین کا شرف پاتا ہے۔ نظیری کے اس قسم کے اشعار اور مصرعے اقبال کے کلام میں اگرچہ بہت زیادہ نہیں مگر جس قدر ہیں وہ اس امر کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اقبال کو نظیری کے کلام سے دلچسپی تھی۔ اس کا دیوان ان کے مطالعات میں شامل تھا اور وہ اس کی شاعری کو تحسین کی نظر سے دیکھتے تھے۔

نظیری کے متعلق اقبال کی تحسین، جو تضمین کے پردے میں ہے، وہ بالواسطہ سہی مگر انہوں نے نظیری کی کھلی تحسین بھی ایک غزل میں کی ہے۔ یہ غزل نظیری کی زمین میں ہی لکھی ہے۔ اس غزل کا ایک شعر یہ ہے:-

بملکِ جم نہ دہم مصرعِ نظیری را
"کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست"

اقبال کے مصرعے کا پیرایۂ بیان صاف صاف بتا رہا ہے کہ انہیں نظیری کے اس مصرعے نے بے حد متاثر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے داد بھی ایسی دی ہے جو (اُن کی زبان سے) رومی کے سوا شاید کسی اور شاعر کو نہ ملی ہوگی۔ بلاشبہ عرفی بھی ان خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں جن کے لئے اقبال کے دل میں بڑی عقیدت کا جذبہ موجود ہے، چنانچہ انہوں نے عرفی پر ایک نظم لکھ کر بڑی محبت کا اظہار کیا ہے۔ کئی اور موقعوں پر بھی انہوں نے عرفی سے گہری وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ مگر نظیری کی تحسین کا یہ انوکھا انداز، جو نظیری کے حصے میں آیا ہے، شاید عرفی کے لئے بھی استعمال نہیں ہوا۔ بظاہر داد و تحسین کا یہ طریق محض شاعرانہ اور رسمی بھی سمجھا جا سکتا ہے مگر رسمی تعریف اقبال کی عادت میں داخل نہیں تھی — اقبال ہی ہمارے وہ شاعر ہیں جو رسمی تعریف سے عموماً محترز رہے ہیں۔ لہٰذا اقبال کی طرف سے پیش کی ہوئی اس داد کو رسمی نہیں سمجھا جا سکتا اور ظاہر ہے کہ اس سچی داد و تحسین کے محرکات بھی اونچی قسم کے ہوں گے، جن کے زیر اثر ان کا جذبہ بے اختیار یا از اختیار کہنے پر مجبور ہوا۔ قدرتاً ان کا تعلق ان ذہنی اور جذباتی روابط سے ہوگا جو اقبال کو نظیری سے وابستہ کئے ہوئے تھے۔

یہ تو ایک حقیقت ہے کہ رومی و حافظ کے بعد اقبال نے اسالیب کے معاملے میں سب سے زیادہ استفادہ اگر کیا ہے تو عہدِ مغلیہ کے شعرائے فارسی سے کیا ہے۔ ان میں بھی خاص طور سے وہ نظیری، عرفی، فیضی اور غالب کے خوشہ چیں یا کل چیں ہیں جس کا سراغ ان کے کلام سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس کا سبب سوائے اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ اقبال محولہ بالا شاعروں کے حسنِ بیان یا بلندیِ افکار سے متاثر تھے۔ جن کی گرمی یا شیرینی کو وہ اپنی شاعری میں جذب کر لینا چاہتے تھے۔ اب ان شاعروں کے وہ انداز خاص جن میں اقبال کو دلچسپی ہو سکتی ہے کئی اور بھی ہوں گے مگر ان کے لئے شاید سب سے زیادہ جاذبِ توجہ ثابت ہوتی ہے۔ زندگی کی وہ تیزرَئے اور تند لہر جو ان کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ اور گو کہ ان میں سے بیشتر شاعر انسان کو تقدیر کا نخچیر یا صید زبوں ہی مانتے ہیں مگر ان کی شاعری میں طلب اور تڑپ کے کچھ ایسے انداز بھی نظر آتے ہیں جو انسان کی محکمی اور قوت کی گواہی بھی دیتے ہیں۔ فارسی کی عام شاعری میں قطعِ آرزو کا جو دل کش اور حیات سوز فلسفہ جاری و ساری رہتا ہے، اس کی تلافی کی صورتیں اگر کہیں نظر آتی ہیں تو مغلوں کے اس ابتدائی زمانے کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ یہ دور بھی کوئی عظیم اثباتی فلسفہ پیش نہ کر سکا کیونکہ اس زمانے کو ایک خاص فکری آزمائش سے گزرنا پڑا تھا۔ وہ آزمائش تھی اکبر کی عقلیت جو اعلیٰ علمی ریاضتوں کی پیداوار نہ تھی بلکہ پیچ در پیچ ذہنی تضادوں کی مخلوق تھی جن کے زیر اثر ضد کا جواب

ضد سے دیا جا رہا تھا۔ عہدِ اکبری کی اصل برائی اس کی دینی تحریک میں نہ تھی، اس کی برائی تو اس پرجوش روحانی تحریک کی صورت میں نمودار ہوئی جس کی قیادت ابوالفتح گیلانی وغیرہ نے کی اور جس کی پرورش میں خان خاناں کی فیاضیوں نے خاص حصہ لیا۔ غرض اکبری زمانے کی شاعری میں زندگی کا خون دوڑتا نظر آتا ہے۔ اور یہی خون کی سرخی ہے جو اقبال کی نگہ میں کھب کھب جاتی ہے۔ یوں تو عام عشقیہ اور صوفیانہ شاعری میں طلب اور عشق کی اہمیت جتائی گئی ہے۔ مگر زیر بحث دور کا لب و لہجہ بھی زندگی کی نوا سے معمور ہے ؂

نظیری کا ایک عام مضمون ہے کہ زندگی کے لئے عشق اور عشق کے لئے طلب اور جد و جہد ضروری ہے۔ اور یہی وہ وسائل ہیں جن سے یہ مشتِ خاک اکسیر بن سکتی ہے۔ پھر زندگی ایک نبرد ہے، ایک معرکہ ہے، جس کو صرف جفا طلبی اور سخت کوشی سے ہی جیتا جا سکتا ہے پس کامیابیوں اور فتح مندیوں سے ہم کنار ہونے کی آرزو صرف اس شخص کو رکھنی چاہئے جو نازکی اور آرام طلبی کا دلدادہ نہ ہو ؂

عہدِ مغلیہ کی ساری جاندار شاعری میں زندگی کی تکمیل کی آرزو پائی جاتی ہے۔ نظیری، فیضی، عرفی اور غالب، ان چاروں کے کلام میں حیات کی کہنگی و فرسودگی کے خلاف احتجاج، ایک شکایت، ایک شکوہ موجود ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک کے یہاں حیات کو بدلنے اور اس کو نئی بنیادوں پر کھڑا کرنے کی بے تاب خواہش نظر آتی ہے اور یہ سب رجحانات وہ ہیں جو اقبال کے افکار کا جزوِ خاص ہیں ؂

مذکورہ بالا چاروں شاعروں کے لفظیات اور استعارات و کنایات بھی ان کی شاعری کی معنوی لہر سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ زندگی، طلب اور تڑپ کے تاثر کو واضح اور موثر بنانے کے لئے حرکت، روانی، جوش، مقابلہ و جنگ کے استعارات استعمال کئے گئے ہیں۔ ان شاعروں نے مبالغے سے بڑا کام لیا ہے۔ مبالغے کی تاثیر سے ان کوائف کا نقش دلوں اور دماغوں پر زیادہ گہرا، زیادہ تیز اور شدید ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک کے انداز، لہجے اور آوازیں اپنی اپنی شخصیتوں کے مطابق جدا جدا ہیں، ایک ہی میدان میں لڑنے والے کئی سپاہیوں کی طرح جو ایک ہی معرکے میں جرأت آزما ہوں مگر ان میں سے ہر ایک کا کس بل جدا جدا اور انداز پیکار مختلف ہو، یا جیسے ایک ہی دُھن میں ایک ہی قسم کے راگ الاپنے والے کئی گائیکوں کی آوازیں ہر ایک کے لئے وجہ امتیاز بن رہی ہوں، اس لحاظ سے نظیری، عرفی، فیضی اور غالب کی آوازیں جدا جدا ہیں، خواہ ان کے بعض رجحانات مشترک ہی کیوں نہ ہوں۔ اقبال ان میں سے ہر ایک کی طرف نسبت بہ نسبت ملتفت ہوئے ہیں مگر اقبال کی شاعری اور ان کی شاعری کی مجموعی سپرٹ میں بیّن فرق پایا جاتا ہے۔ تاہم یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کے دل میں ان کے متعلق جو بڑی کشش ہے اس کا بہت بڑا سبب ان کا وہ جوش انگیز لہجہ بھی ہے جو اقبال کے پیغامِ خاص سے بڑی مطابقت رکھتا ہے ؂

سب سے پہلے نظیری کی اس غزل کو لیجئے جس کے ایک شعر کی تضمین کر کے اقبال نے نظیری کو بہت بڑا خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ غوغا نیست، دانا نیست ——۔ یہ نظیری کی پوری غزل ہے، اس کا مطلع بالکل اقبال کے مذاق کے مطابق ہے۔ اس میں ایک معرکے کا تصور ہے جو جاں بازی اور سربازی کا متقاضی ہے۔ ستیز، جفا طلبی اور خطر طلبی اقبال کے محبوب افکار ہیں۔ خواہ وہ غزل کے لباس میں ہوں یا کسی اور پیرائے میں "کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست" میں جوش اور سرفروشی کا جو رنگ ہے وہ اقبال کے فکر سے مطابقت رکھنے والی چیز ہے۔ نظیری کی غزل کے تیسرے شعر میں بھی "صف بستہ" اور "معرکہ" کے الفاظ نے حسن و عشق کا عجب معرکہ گرم کر رکھا ہے۔ غزل کے باقی اشعار میں بھی اندازِ بیان برجستہ اور مضمون زندگی کا ترجمان ہے۔ غرض یہ ساری غزل حیات بخش ہے اور پہلا شعر تو جہادِ زندگی کا ایسا درس دیتا ہے جو فیضی اور عرفی کے سوا کسی اور شاعر کے یہاں خال خال ہی ملے گا۔ اکبری، جہانگیری دور کی شاعری کا یہی لہجہ اس کو باقی ادوار کی شاعری سے ممتاز کرتا ہے ؂

اس سلسلے میں یہ یاد رہے کہ نظیری زندگی کی اس لہر کے باوجود خوش آواز غزل گو ہے۔ اس کی نوا فیضی اور عرفی کے مقابلے میں لطیف اور مدہم ہے اور بعض خاص صورتوں میں تو اس کی آواز بہت کمزور اور نرم و نحیف معلوم ہوتی ہے۔ وہ عرفی سے خاصا دور اور غالب کے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔ اس کے کلام میں اقبال کی نوا بھی ہے مگر جب اس کی غزل اس کے شخصی غم کی ترجمان بن جاتی ہے یا اس کے افسردہ اور گھٹے ہوئے مزاج کی آئینہ داری کرنے لگتی ہے۔ یا جب وہ معاملہ بندی کی روح میں ڈوب کر لکھتا ہے، تو وہ اقبال سے خاصا دور اور اقبال سے بالکل الگ شخص معلوم ہوتا ہے۔ اقبال کی جو غزل نظیری کی مندرجہ بالا غزل کے جواب میں ہے وہ یہ ہے ؎

ز خاکِ خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست — تجلیِ دگرے در خورِ تقاضا نیست
بملکِ جم ندہم مصرعِ نظیری را — کسے کہ کشتہ نشد از قبیلۂ ما نیست
اگرچہ عقلِ فسوں پیشہ لشکرے انگیخت — تو دل گرفتہ نباشی کہ عشق تنہا نیست
تو رہ شناس نۂ و ز مقامِ بے خبری — چہ نغمہ ایست کہ در بربطِ سلیمیٰ نیست
نظر بخویش چناں بستہ ام کہ جلوۂ دوست — جہاں گرفت و مرا فرصتِ تماشا نیست
بیا کہ غلغلہ در شہرِ دلبراں فگنیم — جنونِ زندہ دلاں ہرزہ گردِ صحرا نیست
ز قید و صید نہنگاں حکایتے آور — مگو کہ زورقِ ما روشناسِ دریا نیست
مریدِ ہمتِ آں رہروم کہ پا نگذاشت — بہ جادۂ کہ درو کوہ و دشت و دریا نیست
شریکِ حلقۂ رندانِ بادہ پیما باش — حذر ز بیعتِ پیرے کہ مردِ غوغا نیست
برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائی است — حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

اقبال کی اس غزل میں ان کے پیغام کے مختلف اجزا ایک جا جمع ہیں۔ ان کی خود شناسی، تحفظِ خودی، خطر طلبی، معرکہ آزمائی، ہنگامۂ پیکارِ حیات، غلغلہ و غوغا، تسخیر و جہاں گیری، حسن و عشق کے نئے زاویے، جدت، و تازگی غرض وہ سب باتیں پائی جاتی ہیں جو اقبال کی شاعری سے مخصوص سمجھی جاتی ہیں۔ ان غزلوں کے مطالعہ سے دونوں شاعروں کا جو فرق واضح ہوتا ہے۔ وہ اولاً یہ ہے کہ نظیری کے اشعار کا مرجع فرد اور اس کا قلب ہے۔ اقبال کے اشعار کا مرجع ملت اور اس کا اجتماعی وجدان ہے۔ اس کے علاوہ جہاں نظیری کے یہاں "رخصتِ تماشا نیست" کی مجبوری ہے وہاں اقبال کی غزل میں "فرصتِ تماشا نیست" کی خودکافی بے نیازی ہے۔ اس لحاظ سے اقبال اور نظیری کے مشترک میدان بہت محدود معلوم ہوتے ہیں مگر دونو شاعروں کے پیغام میں مرجع اور ملاء کے عدم اشتراک کے باوجود لہجہ و گفتگو کے کئی مشترک انداز بھی نمایاں ہیں۔ دونوں کی غزل کے پیرائے اور تیور باہم خاصے مانوس بھی ہیں۔

اقبال کی شاعری کا ایک بنیادی خیال یہ ہے کہ زندگی جفا طلبی ہے اور اس میں خطرات و مصائب نہ صرف برداشت کرنا چاہئیں بلکہ ان کو لازمۂ حیات سمجھ کر ان کا استقبال کرنا چاہیئے ؎

بہ کیشِ زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است
سفر بہ کعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است (پیامِ مشرق)

نظیری کے کلام میں بھی "خطر طلبی" اور سخت کوشی کے حق میں بہت کچھ مل جاتا ہے۔ نظیری پر حافظ کا اثر ایک مانی ہوئی بات ہے مگر حافظ کی طرح کا شیوۂ تسلیم و رضا نظیری کے تصورات میں کوئی خاص مقام نہیں رکھتا۔ حافظ تو دہر کی قہرمانی قوتوں کے سامنے بے محابا ہتھیار ڈال دینے کے قائل ہیں اور اُن سے نجات حاصل کرنے کے لئے حیلے یا مصالحت کے معتقد ہیں۔ زمانے سے کھلی لڑائی کی ہمت نہیں رکھتے، چنانچہ لکھا ہے ؎

اگر ستیزہ کنی روزگار بستیزد

مگر اکبری دور کے رجحانات حافظ کے دور سے خاصے مختلف تھے، اس لئے بیشتر امور میں نظیری نے حافظ سے الگ طرح سوچا ہے۔ نظیری میں اقبال کی سی مردانگی نہ سہی تاہم یہ ہمت تو ہے کہ زمانے کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے ؎

دہر چوں در دشمنی مست است افگندم سپر
دشمنِ نامرد را من مردِ میداں نیستم

نظیری کے استعارات و لفظیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک سخت جانی اور جفاکشی کی بڑی اہمیت ہے، وہ تو نرمی و نازکی کو (حسن کے معاملے میں بھی) کوئی خوبی کی بات نہیں سمجھتا۔ کیونکہ نرمی و نازکی جہادِ زندگی میں حقیقت و صداقت کے جوئندہ سپاہی کے کسی کام نہیں آسکتی ؎

نشانِ ذوقِ حقیقت بہ نازکاں ندہند
چہ شد کہ فاختہ خوش گوی و سرو موزون است

اسی سبب سے ہم دیکھتے ہیں کہ نظیری کے اشعار میں گلشن کے بجائے دشت سے محبت کا خاصا ذکر ہے۔ وہ اپنے آپ کو فضائے دشت کا طائر کہتا ہے اسے گلشن کی نرم اور خواب آور فضا میں راحت نہیں ملتی ؎

تا از فضائے دشت بگلشن فتادہ ام
از چشمِ طائرانِ نوا زن فتادہ ام

دلم از زمزمۂ طرفِ چمن نہ کشاید
گوش بر قہقہۂ دامنِ کہسار کنم
نالۂ نغمہ سرایانِ چمن بے اثر است
روشِ دام زمرغانِ گرفتار کنم

در چمن معذور داریدم اگر گردم ملول
نغمہ سنجِ کوہ و دشتم از گلستاں نیستم

نظیری کو کوہ و دشت سے جو لگاؤ ہے یہ بے سبب نہیں ہو سکتا۔ وہ ذہناً سخت اور قوی صفاتِ حیات سے رغبت رکھنے والا شاعر ہے۔ زندگی کے تجربات نے اسے جس بصیرت سے بہرہ ور کیا، اس کی روشنی میں اس کو یہ محسوس ہوا کہ زندگی سراسر ایک معرکۂ خیر و شر یا معرکۂ جذبات ہے۔ اس میں تلخی و نامرادی ایک ناگزیر حقیقت ہے۔ اس سے نباہ کرنے کے لئے طبعِ بلاکش کی ضرورت ہے۔ سختی، درشتی، اور ناگواریوں کو خوش آیند بنا لینے کی عادت تقاضائے حیات ہے۔ نظیری ایک نئی دنیا کی تخلیق کے لئے بھی تڑپ رکھتا ہے۔ وہ زندگی کے کہنہ و فرسودہ نظام کا شاکی ہے اور اس کو ڈھا کر اس کے کھنڈروں پر ایک بالکل نئی دنیا تعمیر کرنا چاہتا ہے ؎

ایں جہاں زشت است، طرحِ تازۂ بر صفحہ کش
ویں بنا سست است قصرِ قائمے بنیاد کن

بلکہ اسے تو قائم شدہ نظامِ عالم کی ابتری پر ہنسی آتی ہے ؎

تختۂ تعلیم گردوں بین و نقش در ہمش
خندہ چوں شاگردِ زیرک طبع بر اُستاد کن

جہاں تک میں سمجھ سکا نظیری کے ذہن کو نظامِ کائنات کی تعمیرِ نو سے اتنی دلچسپی معلوم نہیں ہوتی جتنی اس بات سے کہ حیات کا نظامِ کہن برباد ہو جائے، خواہ اس کی جگہ کوئی نیا عالم ظہور میں آئے یا نہ آئے۔ یہ کیوں ہے؟ اس کے لئے اس کی ذاتی زندگی کے حوادث اور الم انگیز تجربات ذمے دار ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس کے لہجے میں سختی سے زیادہ تلخی پائی جاتی ہے اس کے لہجے میں وہ احتجاج اور وہ شکوہ ہے جس میں کچھ کر گزرنے کا ارادہ پنہاں ہے۔ اس کے استعارات کچھ اور ہی زاویوں کا پتہ دیتے ہیں۔ نظیری اسی وجہ سے نور کی بجائے برق کی پرستش کرتا ہے۔ مثلاً ؎

ما برق جائے نور بکاشانہ بردہ ایم
آتش بپاسبانیٔ پروانہ بردہ ایم

یا مثلاً ع: سینہ بر برق کشیم و جگر تازہ کنیم

ع: راہِ عاشق بر میانِ ہفت دریا آتش است

تن اگر خاک است اما دل سراپا آتش است

اس کی ذہنی دنیا میں سیلاب اور طوفان دونوں فنا کے کارندے ہونے کے باوجود یوں معلوم ہوتے ہیں گویا وہ حیات اور تعمیر کے نمائندے ہیں جن سے حیات کو ثبات و دوام ہوتا ہے۔ زندگی کی ہمواریاں بھی چونکہ سکون و قرار کی علامت ہیں، اس لئے شاعر کو ان ہمواریوں سے بھی گویا ضد سی ہے — شور، آشوب، غوغا، نظیری کے نظامِ حیات میں دلآویز نغموں سے زیادہ دلکشی رکھتے ہیں۔ "زکہ با خود ہر نفس آشوب و غوغائے دگر دارم"۔ "نغمہ سنجی" (شاعری اور محض موزونیت) اسے مطلوب نہیں۔ وہ توفغانِ درد کا طلب گار ہے —

نغمہ سنجیدہ می گویند ایں را نالہ نیست
نے نشانِ درد دارد نے خراشِ رفتے

غرض ان سب تأثرات کا ثبوت ان کی لفظیات میں موجود ہے، چنانچہ آتش، سیل، طوفان اور برق کا بکثرت استعمال ان کی خاص ذہنی کیفیتوں کا پتہ دیتا ہے۔ پھر تاخت و تاراج کے استعارے (جو نظیری سے زیادہ فیضی کے یہاں پائے جاتے ہیں) نظیری کے اس رجحان کی اور بھی اچھی ترجمانی کرتے ہیں۔ آشوب سے نظیری کو جو خصوصی لگاؤ ہے، تلخیوں سے اس کو جو خاص محبت ہے، ناگواریوں سے جو خاص دلچسپی ہے، اس سے ان کے اس ذہنی رجحان کا اظہار ہوتا ہے کہ زندگی ایک معرکہ ہے، ایک پیکار ہے۔ اسی کے زیرِ اثر وہ زندگی سے نوشِ بے نیش کی نہ توقع رکھتا ہے نہ ایسی حلاوت کا آرزو مند ہے[1]۔ اسی کے سبب کو زہر میں شکر خند کی سی حلاوت ملتی ہے اور گریۂ تلخ میں شہد و شکر کی سی مٹھاس۔ یہ سب باتیں دراصل اس تجربے کی پیداوار ہیں جن کا سطورِ بالا میں ذکر ہوا۔

نظیری کے ذہنی میلانات میں پیش قدمی، ہرچہ بادا باد اور تہور کے رجحانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ع: بیشتر راندیم رخش از کارواں سود از دیم
ع: آتش افگندم بمجلس، بال بر مجمر زدم
ع: آتشے آوردم و در عرصۂ محشر زدم
ع: سوئے سرچشمہ شدم چشمۂ حیواں کردم
ع: از بغل مینا بر آوردیم و بر خارا زدیم

اقبال نے مندرجہ ذیل شعر کی تضمین کی ہے۔ اس میں بھی وہی اندازِ تہور پایا جاتا ہے —

ہر کجا راہ دہد اسپ بر آں تاز کہ ما
بارہا مات دریں عرصہ بہ تدبیر شدیم

اور یہ سب باتیں نظیری کی آشوب پسندی اور ہنگامہ دوستی کی شاہد ہیں۔ نظیری کا یہ رجحان خالص محبت کے مضامین میں بھی ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ مثلاً حسن کے ہزاروں انداز ہوتے ہیں، اس میں رنگا رنگ دل فریبیاں پائی جاتی ہیں اور نظیری کی نظر بھی ان دلفریب جلووں اور نظر فریب رنگوں پر پڑی ہے۔ وہ یقیناً حسینوں کے ناز و غمزہ اور کرشمہ و ادا سے مسحور ہوتا ہے۔ مگر اسے اصلی راحت ایسے دوست کے قرب میں حاصل ہوتی ہے جو شوخ، ہنگامہ آفریں اور دل آشوب ہو اور خوئے عتاب رکھتا ہو۔ شاید محبوبوں کے اسی "قبیلے" کی تعریف میں نظیری نے وہ مشہور غزل لکھی ہوگی جس کا مطلع یہ ہے —

بہوش سیرِ چمن کن کہ شاہداں مستند
قرابہ پرسرِ ابرِ بہار بشکستند

---

[1] بہ کسے نشیں نظیری کہ بہ نیش نوش بخشد ‏ ‏ چہ تمتعِ حلاوت ز حدیثِ بے گزند اں
طعمِ حنظل را بعادت راست کردم در مذاق ‏ ‏ من کہ شکر را ز تلخی از دہاں انداختم

نشے کی حالت میں محبوبوں کی باہم لڑائی جھگڑا اور اس میں قرابہ و صراحی کی شکست و ریخت، اس سے حسینوں کی طبع عربدہ جو کا پتہ چلتا ہے۔ اور ان کا یہی انداز خاص نظیری کو مرغوب ہے ÷

ان سب ذہنی میلانات کا نتیجہ یہ ہے کہ نظیری کی نوا میں ایک خاص قسم کا جوش پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی داخلی لہر اور ظاہری آواز و ولولہ انگیز ہے۔ اس کے پیرایہ ہائے بیان میں وہ شور قیامت تو نہیں جو عرفی کے یہاں ہے (یا بعض اوقات غالب کے یہاں ہوتا ہے) مگر آشوب و ہمہمہ یقیناً ہے۔ اسی وجہ سے اس کی عام غزلوں کی لے بھی جوشِ زندگی سے لبریز ہے۔ مثلاً ذیل کی غزل ملاحظہ ہو۔ اس کے الفاظ کتنے رعد۔ دار اور اس کا لہجہ کس قدر تند ہے ؎

وقت آں آمد کہ خنجر گہ باگلِ سوری زنی
لعبتِ چینی گزینی جام فغفوری زنی
چہرہ از لعلِ قبایانِ بدخشانی کنی
بادہ با فیروزہ خطانِ نشاپوری زنی

باقی اشعار میں بھی یہی صوتی طنطنہ ہے ÷

نظیری کے ذہن کے یہ سب رنگ اقبال کے دل میں گھر کرنے والے ہیں۔ ان میں بہت کم چیزیں ایسی ہیں جن کو رسمی کہا جا سکتا ہو۔ یہ اکبری دور کی خاص ذہنیت کی پیداوار اور اس دور کی شاعری کے مخصوص نتائج ہیں۔ نظیری کے یہاں بعض ایسے مضامین بھی ہیں جن کو روایتی کہنا چاہئے۔ مثلاً عقل کے مقابلے میں عشق کی فوقیت اور انسان کا اشرف المخلوقات ہونا وغیرہ۔ یہ صوفیوں کے عام نظریے ہیں جو ہر صوفی شاعر کے کلام میں مل جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک خاص قسم کا انائی احساس، یا دل کی فضیلت وغیرہ وغیرہ، مگر اس نوع کے مضامین نظیری سے خاص نہیں۔ یہ عام صوفیوں کے عقائد ہیں۔ اس لئے اقبال کو اس معاملے میں نظیری سے بطور خاص استفادہ کی حاجت نہ تھی، نہ ان خیالات میں اقبال و نظیری کی ہم خیالی پر زور دینے کی کوئی ضرورت ہے ÷

یہاں تک تو بحث یہ تھی کہ نظیری کس حد تک ذہنی اور جذباتی طور پر اقبال کے ہم قبیلہ شاعر تھے۔ مگر نظیری کی شاعری ان تصورات سے الگ بعض دوسرے گوشوں تک بھی پھیلی ہوئی ہے، جن کی رنگین فضاؤں سے ان کا اپنا دور اور بعد میں آنے والے اردو اور فارسی کے بہت سے شاعر خاصے متاثر ہوئے، چنانچہ تذکروں کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ اردو کے کئی شاعروں نے نظیری کے تتبع کا دعویٰ کیا۔ اور مصحفی کے متعلق تو یہ کہا گیا ہے کہ اس نے ایک مکمل دیوان نظیری کے تتبع میں لکھا تھا۔ اس کے علاوہ رسماً بھی اکثر فارسی اردو کے شاعروں نے نظیری سے عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ اگرچہ یہ تو غائر مطالعہ ہی سے معلوم ہو سکے گا کہ ان میں سے کتنوں نے سچ مچ نظیری کے رنگ میں لکھ کر اس کی شاعری کے ترکیبی عناصر میں ایک عنصر ایسا بھی تھا جس میں نظیری کی جھلک دکھائی دیتی ہے، اور اس فیض کا غالب نے اعتراف اور اعلان بھی کیا ہے ؎

جوابِ خواجہ نظیری نوشتہ ام غالبؔ
خطا نمودہ ام و چشمِ آفریں دارم

غالب پر نظیری کا رنگ ۔ اگر کہیں نظر آتا ہے تو معاملہ بندی میں یا ادا نگاری میں۔ وہ غزل خاص طور سے پیش نظر رہے جس کا قافیہ ردیف ہے تماشا کش نگر، جالاکش نگر، وغیرہ۔ اس کے علاوہ بھی استفادہ کی کچھ صورتیں نظر آتی ہیں مگر اقبال نے نظیری کی معاملہ بندی کو گویا ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ نظیری اور اقبال یہاں پہنچ کر ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ اب اقبال و نظیری کی بحث ختم۔ نظیری کی شاعری کے بعض منفرد پہلوؤں کا اجمالی تذکرہ کرنا مقصود ہے ÷

عہد مغلیہ کے فارسی شاعروں میں سے (غالب کو چھوڑ کر) کسی شاعر کی شاعری اس کی شخصی زندگی کی اتنی صاف صاف ترجمانی نہیں کرتی جتنی نظیری کی شاعری۔ نظیری کے کلام سے (غزل سے بھی) نظیری کی پوری شخصیت کی تاریخ لکھی جا سکتی ہے۔ اس کی زندگی کے تقریباً سبھی نشیب و فراز اور باریک پیچ و خم اس کی شاعری سے معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ کاشان و ہندوستان کا تفاوت، احمد آباد کی زندگی کے اوّلیں و آخریں دور، جوانی اور

بڑھاپے کے احساسات، رنج و غم اور شادی و مسرت کی دھوپ چھاؤں، محبت کے موضوع اور ان کے مخاطب، پری رویانِ یزد سے لے کر چشم ہندو اور عشقِ ترسا زادہ تک محبت کے بدلتے ہوئے کئی رنگوں کا انعکاس اس کی غزل میں واضح صورت میں نظر آتا ہے۔ اور قصیدوں اور مرثیوں میں تو اس کے جذبات کی رنگ برنگ تصویریں اور بھی نمایاں شکل میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ تو واضح ہے کہ کسی شاعر کی شاعری اس کی سوانح عمری کی قائم مقام نہیں بن سکتی، مگر سوانح عمری کے داخلی انعکاسات کی نشان دہی کے لئے اس سے بہتر کوئی اور ذریعہ بھی نہیں۔ یہ البتہ اس شاعر کے بارے میں درست ہو سکتا ہے جس کا ہر ہر شعر اس کے تجربات و حادثات زندگی کے براہِ راست ردِ عمل کا نتیجہ ہو، اور وہ شعر کو خلوص اور راست بازی کا آئینہ سمجھتا ہو۔ اس قسم کی سچائی اور راست بازی نظیری کے یہاں موجود ہے۔ اس نے اپنے تجربے کے ساتھ کبھی دھوکا نہیں کیا، نہ اس کے معاملے میں ریاکاری اختیار کی۔

نظیری کے یہاں زندگی کے ہر دور کے احساسات کے واضح ثبوت ملتے ہیں۔ شباب، ادھیڑ عمر اور پیری، تینوں ادوار کی الگ الگ نفسی کیفیتیں اس کی شاعری کے آئینہ میں نظر آجاتی ہیں۔ نظیری کے یہاں مقامی اشارات بھی کثرت سے دیکھنے میں آتے ہیں۔ کاشان، یزد، نشاپور، ہند کی جھلک ملکی واقعات تاریخی تک بھی اس کی غزل میں جذب ہو جاتے ہیں۔ مخصوص اور معین تجربہ اور مقامیت کا احساس اس کے یہاں عرفی سے کہیں زیادہ ہے۔ نظیری کی بڑی امتیازی خصوصیت جس میں عرفی و فیضی اس کے مقابلے میں کبھی ٹھہر نہیں سکے، وہ ان کی معاملہ بندی ہے یا پھر ہلکی ہلکی لذتِ الم جس کی تاثیر دل و جگر میں پیوست ہو جاتی ہے۔ عرفی کی غزل میں گرمی اور جوش سا ہے مگر تلذذِ الم نہیں۔ نظیری کی دو باتیں عرفی کو حاصل نہیں ہوئیں، ایک تو وہ خلشِ غم جس کا ذکر ہوا۔ اور دوسری وہ لطافت بیان جس کی ادائے خاص پر غالب جیسا خودنگر بھی عاشق تھا۔ عرفی کا جوش اور اس کے استعاروں کی شعلہ انگیز گرمی اپنی جگہ بڑی توانا چیز ہے۔ مگر آگ کو کبھی کبھی گلزارِ خلیل بننے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ عرفی تو خود کہتا ہے کہ زندگی آگ بھی ہے اور سلسبیل بھی! ؎

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در اقلیم عشق
روئے دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است (عرفی)

مگر عرفی کی شاعری میں آگ ہی آگ ہے، سلسبیل نہیں، یہ سلسبیل اگر ہے تو نظیری کے یہاں۔ پھر نظیری کا غم بھی عجب طرح کا غم ہے، کچھ میٹھا میٹھا غم کہ اگر کھو جائے تو اس کے کھو جانے کا رنج ہو۔ کچھ ایسا غم کہ اس کی جستجو میں بھی لطف آئے۔ پھر یہ غم کسی ترش رو قنوطی یا جھنجھلائے ہوئے افسردہ آرزو شخص کا غم بھی نہیں کہ طبع پر گراں گزرے۔ یہ تو ایک دانش مند آدمی کا غم ہے جس نے نیش و نوش دونوں کو اپنی فطرت میں جذب کرنے کی لذت پالی ہو۔

نظیری کی معاملہ بندی بھی صرف خارجی ادا نگاری نہیں اس میں نفسیات شناسی کا عنصر بھی موجود ہے۔ عاشق و معشوق دونوں کی نفسیات کا علم اور انسانی جذبے سے باخبر ہے اور جذبے سے سرشار انسانوں کے دل و دماغ کے اثرات سے خاصا واقف۔ جذباتِ قلبی کا جو اثر عاشق اور معشوق کی ظاہری اداؤں اور عادتوں پر ہوتا ہے، اس سے بھی اس کو بڑی واقفیت ہے۔ جذبۂ انسانی کے متعلق نظیری کی یہ بصیرت اس کو خاصا اونچا شاعر بنا دیتی ہے۔ وہ جب محبت اور نفسیات محبت کا بیان اپنی مخصوص شوق انگیز لے میں کرتا ہے تو اس کے اثر و تاثیر کی حدیں بیکراں ہو جاتی ہیں۔ پُرجوش بدن، جذبات کی گرمی، سینوں کے رموز و اسرار سے واقفیت، حسن کی اداؤں کی مصوری، زندگی کی کچھ تحسین، کچھ تعجب، کچھ زہر خند، کچھ شکر خند، کچھ حجاب حسن اور ان پہ نمک پاشی، کچھ مستی و مے پرستی کچھ گل پاشی۔ یہ ہیں نمایاں خط و خال نظیری کی شاعری کے!

تذکرہ "گلزارِ ابرار" کے بیان کے مطابق نظیری آخری عمر میں خاصہ صوفی بن گیا تھا۔ صوفیانہ عقائد کا رسمی بیان اس کے اشعار میں کافی ہے۔ بعض عاشقانہ غزلوں میں صوفیانہ لب و لہجہ بھی پیدا ہو گیا ہے، مگر صوفیانہ جذب و سرور کی کیفیت کچھ زیادہ پیدا نہیں ہو سکی۔ اکبری دور کی عقل پرستی کا رنگ بھی کہیں کہیں چڑھا ہے۔ (مگر سطحی)۔ وہ بحیثیت مجموعی جذبے کا پرستار شاعر ہے۔ اس کی شاعری جذبے ہی سے رنگین ہے۔ غرض یہ کہ نظیری کی نوا حیات آفریں عناصر کی حامل ہے جن کے سبب اس کی شاعری میں اقبال کو ذہنی اور نفسی یگانگت محسوس ہوئی۔

نذرل کے گیت

یونس احمد

اُردو پڑھنے والے نذر الاسلام کو صرف انقلابی شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اور انہوں نے قاضی صاحب کی انقلابی اور باغیانہ نظمیں پڑھ کر یہ رائے قائم کرلی ہے کہ ان کی شاعری میں آتشیں خیالات اور باغیانہ جذبات کے علاوہ وہ نرم و نازک دل نہیں جس میں عشق و محبت کے چراغ جلتے ہیں۔ ان کی یہ رائے درست بھی ہے کیونکہ اُردو میں ابتک جتنی نظموں کے تراجم ہوئے ہیں اُن میں سے بیشتر قاضی صاحب کی شاعری کے ایک ہی رُخ کی نمائندگی کرتے ہیں ــــ یعنی وہ سراپا انقلاب ہیں اور بغاوت ان کا پیغام ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ادارۂ مطبوعات پاکستان نے "صورِ اسرافیل" کے نام سے اُردو میں قاضی صاحب کی جن نظموں کے تراجم شائع کئے ہیں اُن میں اُن کے وہ گیت بھی شامل ہیں جن کے ایک ایک بول میں درد اور ٹیسوں کی نہ جانے کتنی ترائیں آباد ہیں۔ اگرچہ گیتوں کے ان تراجم سے ان کی عشقیہ شاعری کی اچھی طرح نمائندگی نہیں ہوتی ہے۔ پھر بھی جو چند تراجم "صورِ اسرافیل" میں شائع کئے گئے ہیں وہ ان کے عاشقانہ مزاج اور نرم و نازک جذبات کو سمجھنے میں مدد ضرور دیں گے۔

نذرُل اوائل عمر ہی سے دیوانے مشہور تھے ــــ گیتوں اور گانوں کے دیوانے ابھی ان کی عمر دس بارہ سال ہی کی ہوگی کہ وہ گاؤں گاؤں اپنے ہمجولیوں کو لے کر گیتوں کی دُنیا آباد کرتے اور کچھ پیسے بھی پیدا کرلیتے۔ اوّل اوّل تو وہ اپنے ہمجولیوں کے ساتھ ساتھ گایا کرتے تھے۔ بعد میں سنگیت کے اُستاد بن بیٹھے! ہم نذرُل کے گیتوں اور غزلوں کا گہرا مطالعہ کریں تو ان کی رُومانی زندگی کے بہت سارے گوشے ہماری آنکھوں کے سامنے اُبھر آئیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے دل و دماغ میں آتشیں لاوے پلتے تھے، لیکن صاف و شفاف آسمان پر جب چودھویں کا چاند نظر آجاتا اور چاروں طرف سکوت کا عالم ہوتا تو وہ اپنے من میں عجیب سی کسک اور تڑپ محسوس کرتے۔ انہیں ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ جس حُسنِ جہاں تاب کی تلاش میں صحرا صحرا گھوم رہے ہیں وہ اُن سے برابر دُور ہوتا جارہا ہے اور اسی بیکلی کے عالم میں گانے لگتے ہیں:

دُور رہنے والی پریتم تجھے حاصل نہ کرسکا اس لئے یہ گریہ وزاری ہے۔

دریا میں تھپیڑے اسی لئے آتے ہیں کہ ساحل ایک دوسرے سے نہیں ملتے

تم مل جائیں تو یہ بانسری بھی خاموش ہوجاتی اور ہلاکت خیز موت آجاتی

نہیں پا نہ سکا، یہی وجہ ہے کہ میرا سینہ خالی نہیں ہے۔ بانسری کا سینہ خالی ہے اسی لئے نغمے پیدا ہورہے ہیں۔

نذرل ہمیشہ محبت اور حُسن کے سودائی رہے ہیں اور اسی عالم میں وہ نہ جانے کتنی بار فریب بھی کھا چکے ہیں۔ لیکن اس فریب پیہم سے اُن کے دل میں نفرت کی آگ نہیں بھڑکی بلکہ ان کے لب برابر مسکراتے رہے اور آنکھوں میں ہمیشہ رجائیت کے چراغ جلتے رہے۔ بنگال کی ہری بھری فضائیں ہوں یا ریگستان کا تپتا ہوا ماحول، اُنہوں نے ہر جگہ محبت کے گیت الاپے۔ کوئی کامنی نار اُن کے گیت کے بول سے مسحور ہوجاتی اور اپنا دل ان کے پاؤں پر رکھ دیتی تو انہیں محسوس ہوتا کہ جس منزل کی تلاش میں وہ صحرا نوردی کررہے ہیں اب وہ بالکل قریب ہے۔ لیکن منزل قریب آکر بھی دُور ہوجاتی اور تب اُن کے ہونٹوں سے گیت کا جھرنا پھوٹ پڑتا:

میں نے دل کا سودا ایک بار نہیں کئی بار کیا ہے۔
اور ہزار دل قسم کی موت مرتا بھی رہا ہوں۔
پائل کی جھنکار کی طرح پاؤں میں بجتا بھی رہا ہوں۔
آنسوؤں سے میں نے کتنے ہار گوندھے ہیں۔
جن میں میرے دل کا خون شامل ہے۔

اور یہ حقیقت ہے کہ نذرل نے کئی بار دل کا سودا کیا ہے ۔۔۔ کبھی ہگلی اور پدما کنارے، کبھی بحیرۂ عرب کے ساحل پر۔ اور ہر بار انہوں نے گیتوں کے ذریعے اپنے دل کے آتش فشاں کو ظاہر کیا ہے۔ ممکن ہے لوگ انہیں ہرجائی کا خطاب دے ڈالیں لیکن اگر ہم ان کی مجنونانہ زندگی اور لاابالی طبیعت کا بغور مطالعہ کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ وہ اپنے گیتوں بھرے دل کی طرح ایسا ہی ایک دل چاہتے تھے جو ان کی محبت کی حدّت کو اور بھڑکا دے۔ مگر ایسا کوئی دل انہیں نہیں ملا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب ان کی شاعری کا آفتاب نصف النہار پر تھا اور ان کی موسیقی پر ہر عورت و مرد جان چھڑکتے تھے اُن ہی دنوں نہ جانے کتنی لڑکیاں اُن کی شمعِ شاعری پر پروانہ وار گریں۔ وہ ان کی زندگی کا بڑا ہی رومانی دَور گزرا ہے "پران توش چٹرجی" نے جو قاضی صاحب کے قریبی ساتھی رہ چکے ہیں اپنی کتاب "قاضی نذرل" میں لکھا ہے:

" قاضی نذرل بنگالی شاعری کے اُفق پر شعلوں کی طرح آئے اور دیکھتے ہی چھا گئے۔ ان ہی شعلوں میں ان گنت مرد و عورت یا تو پتنگے کی طرح بھسم ہو گئے یا کندن بن کر چمک اُٹھے۔ لیکن وہ تو صحرا نوردی کرنے کے لئے اس دنیا میں آئے تھے ۔۔۔! تلاش اور جستجو ہی ان کا مدّعا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی کسی کے نہ رہ سکے۔ ایک خیال کے بعد دوسرا خیال آتا ۔۔۔ ایک اُفق سے دوسرے اُفق کی طرف روانہ ہو جاتے۔ انہیں منزل نہ مل سکی۔"

انہیں منزل نہ مل سکی، اس لئے وہ سپنوں میں حقیقت کی جھلک دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک گیت "سنگھا" میں اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ لیکن ان کا یہ سپنا کبھی حقیقت نہ بن سکا۔ حقیقت بن جاتا تو ان کے گیتوں کے فوارے رُک جاتے اور دل کے اندر بھڑکنے والی آگ سرد ہو جاتی۔ بعض بنگالی نقادوں کا خیال ہے کہ پرمیلا دیوی یعنی ان کی دوسری بیوی ہی ان کے سپنوں کی ملکہ تھی اور جب وہ انہیں مل گئی تو ان کی تلاش و جستجو بھی ختم ہو گئی۔ اس کی حمایت میں وہ قاضی صاحب کی مشہور نظم "پُجارن" کو پیش کرتے ہیں جس میں انہوں نے پرمیلا دیوی کو خطاب کر کے دل کی باتیں کہی ہیں۔ لیکن جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں بات کچھ اور ہی ہے! بلاشبہ پرمیلا دیوی سے انہیں بے پناہ محبت تھی اور وہ ان کو اپنا سب کچھ سمجھتے تھے مگر ان کے دل میں جو چنگاری ابتدائے جوانی سے بھڑکی تھی وہ کسی طرح سرد نہ ہو سکی۔ پرمیلا دیوی کو حاصل کرنے کے بعد بھی وہ کچھ کمی محسوس کرتے تھے۔ ایک (۱) نامعلوم کسک تھی جو بار بار اُن کے ذہن کو کرید جاتی۔ انہیں خود نہیں معلوم تھا کہ وہ کون بنتِ مریم ہے جو اُن کی دبی ہوئی راکھ میں چنگاری پیدا کر جاتی ہے اُنکی دل گداختگی سبک سجل گیتوں کے چشمے بہاتی تھی۔ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے وہ گیتوں کی دنیا میں کھوئے رہتے ۔۔۔ کیونکہ وہ سراپا شعر ہو تے۔ سنہ ۱۹۲۰ء کی بات ہے۔ وہ بنگالی روزنامہ "نوایگ" کے ایڈیٹر تھے۔ مجھے ان کی نظمیں اور گیت پڑھنے کے بعد اُن سے ملنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس وقت میری عمر سترہ اٹھارہ سال کی ہو گی۔ لوئر سرکلر روڈ (کلکتہ) میں دفتر تھا۔ میں اُن سے ملنے گیا ۔۔۔ پہلی بار۔ انہیں کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔ میں نے چپراسی کے ذریعہ اپنا نام لکھ کر بھیجا اور ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے مجھے بُلایا۔ اس وقت اُن کے سر پر ٹوپی تھی اور ڈھیلے ڈھالے کُرتے کے اوپر ایک جیسا دہ پڑی تھی۔ میں ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ بڑی بڑی آنکھوں میں جیسے گیتوں کے ہزاروں چراغ جل رہے تھے۔ مجھ پر اُن کا رعب ایسا غالب ہوا کہ میرے ہاتھ پاؤں پھُول گئے۔ بڑی مشکل سے زبان سے اتنا نکلا ۔۔۔ "آپ سے ملنے کی دیرینہ تمنا تھی"۔ یہ سُن کر وہ مسکرا پڑے۔ اس وقت شاید وہ کوئی گیت لکھ رہے تھے کیونکہ سامنے کاغذ رکھا ہوا تھا اور اس پر چند شعر لکھے نظر آئے۔ میں نے پوچھا "آپ پہلے شاعر ہیں یا موسیقار؟" یہ سوال سن کر پہلے تو انہوں نے مجھے بغور دیکھا۔ پھر کہا: "میری شاعری محض اتفاقیہ ہے اور موسیقی کی دیوی کو تو میں نے خونِ جگر دے کر حاصل کیا ہے۔ یہ دن رات کی ریاضت اور فطری لگاؤ کا نتیجہ ہے کہ میں کچھ پا سکا ہوں"۔ اتنا کہہ کر وہ کچھ گنگنانے لگے۔ ان کی گنگناہٹ میں بھی موسیقی کا جادو شامل تھا۔ مجھے اُس وقت ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ان کے دل و نظر میں عشق کے جو شعلے تڑپ رہے ہیں وہ گیتوں کے بول میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ ان کی اس موسیقی میں بھی ان کے سوزِ عشق کو بڑا دخل ہے کیونکہ اگر ان کا دل جذبۂ عشق اور سوزِ محبت سے خالی ہوتا تو موسیقی پھیکی پڑ جاتی۔

نذرل کا عشق ہنگامہ خیز بھی ہے اور نرم و گداز بھی۔ کبھی ماضی کے خاکستر میں کوئی چنگاری تڑپتی ہے تو ان کے جذبات میں طوفان آ جاتا ہے اور کبھی گھنگھور گھٹائیں پچھم سے اٹھتی ہیں تو دل میں نامعلوم سی کسک پیدا ہوتی ہے۔ اور اس وقت وہ اپنی اس کیفیت کو قلمبند کر دیتے ہیں جو بعد میں گیت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ان کے عشق کی ہنگامہ خیزی دیکھنی ہو تو طویل نظم "سمندر سے خطاب" پڑھیے۔

قاضی نذر الاسلام کا ایک گیت:

دادرا

مترجمہ: عبدالرحمن بیخود

نہ چاہوں جدا پھر بھی رہنا پڑے گا　جدائی کا غم دل کو سہنا پڑے گا　جو کانٹوں کی تکلیف اے دل سہے گا　وہ درد ایک دن پھول ہو کر کھلے گا

بچانے کی کوشش تو کی باغباں نے　مگر پھول سوکھے، یہ کہنا پڑے گا　وہ کانٹا لئے میں بہاؤں گا آنسو　شبِ تار کا جب اندھیرا مٹے گا

ستانے کا شب کو [illegible]　سدھائے گا پردیس تو اور یہاں میں

یہ معلوم ہے پھر بھی گوندھی ہے مالا　فلک سے کہوں گا تری داستاں میں

خرام ان کا پامال کر دے گا پھر بھی　تری آس پر جاگ کر کوکبِ نو

یہ گل پاؤں میں لے رہے ہیں سنبھالا　دکھاؤں گا ہمراہیوں کو نشاں میں
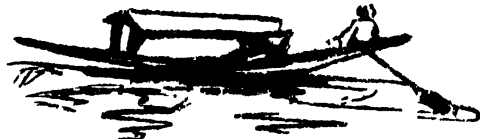
نذرل سچ مچ گیتوں کا بنجارہ ہیں۔ ان کی جھولی گیتوں سے بھری ہوئی ہے۔ وہ دن یاد آتے ہیں جب دوستوں کی محفل میں نذرل اپنے سبک سجل گیت سنا کر فضا کو مست و بے خود بنا دیتے تھے۔ ایک گیت کے بعد دوسرا گیت، دوسرے کے بعد تیسرا ــــ اور اسی طرح نہ جانے کتنے گیتوں کی فرمائش ہوتی۔ اور ایک دن ایسا بھی آیا کہ وہ خاموش ہو گئے۔

آج سے چھ سال پہلے کی بات ہے کہ میں گیتوں کے اس بنجارے سے ملنے گیا۔ ان دنوں میں کلکتہ ہی میں تھا۔ سنہ ۱۹۴۰ء اور ۲۴ دسمبر سنہ ۱۹۵۰ء میں کتنا فرق تھا۔ اس دن میں نے قاضی صاحب کو ایک عجیب عالم میں پایا۔ ان کے سامنے کاغذ کا ڈھیر تھا اور وہ کاغذ کو کبھی ادھر رکھتے کبھی ادھر۔ اور دوسری طرف ان کی بیوی پرمیلا دیوی کھاٹ پر لیٹی اداس اور مغموم تھیں۔ قاضی صاحب کی قوتِ گویائی ختم ہو گئی ہے لیکن وہ چل پھر سکتے ہیں۔ پرمیلا دیوی کی قوت گویائی سلامت ہے مگر وہ حرکت نہیں کر سکتیں۔ میں اس دردناک منظر کی تاب نہ لا سکا۔

گیتوں کا بنجارہ جس نے ہمیں ہزاروں گیت دیئے ہیں، آج خاموش ہے۔ کیا اس کی یہ خاموشی گویائی میں بدل سکتی ہے؟ کیا وہ پھر کبھی اپنے گیتوں کے شعلوں سے وادیٔ حسن کو گرمائے گا؟

غزل

ابوالاثر حفیظ

دل بے مدعا ہے اور میں ہوں — مگر لب پر دعا ہے اور میں ہوں

نہ ساقی ہے نہ اب وہ شے ہے باقی — مرا دور آگیا ہے اور میں ہوں

کوئی پُرساں نہیں پیرِ مغاں کا — مرا پاسِ وفا ہے اور میں ہوں

ادھر دُنیا ہے اور دُنیا کے بندے — اِدھر میرا خدا ہے اور میں ہوں

یہ طولِ عمرِ نامعقول و بے کیف — بزرگوں کی دُعا ہے اور میں ہوں

نہ پوچھو حال میرا کچھ نہ پوچھو — کہ تسلیم و رضا ہے اور میں ہوں

لہُو کے گھونٹ پینا اور جینا — مسلسل اک مزا ہے اور میں ہوں

حفیظ ایسی فلاکت کے دنوں میں

فقط شکرِ خدا ہے اور میں ہوں

غزل

(ظفر کی کہانی فضلی کی زبانی)

فضل احمد کریم فضلی

جانِ وطن تھے ہم تو ہم بھی وطن سے نکلے
نکلے تو روح جیسے کھنچ کر بدن سے نکلے

تھا برق و باغباں کا دھڑکا چمن میں لیکن
کیا کیا نہ دل پہ گزری جب ہم چمن سے نکلے

بے اختیار نکلیں آنکھوں سے جیسے آنسو
کچھ اس طرح سے ہم بھی اس انجمن سے نکلے

وہ شانِ بے گناہی وہ آنِ کج کلاہی
ہم راہِ امتحاں میں کس بانکپن سے نکلے

سمجھے تھے قد و گیسو آرامِ جاں بنیں گے
لیکن وہ قد و گیسو دار و رسن سے نکلے

دنیا کو بھی ہنسایا دنیا پہ بھی ہنسے ہم
کیا کیا نہ کام اپنے دیوانے پن سے نکلے

نکلے تھے سیرِ گل کو تسکینِ دل کی خاطر
لیکن یہ لالہ و گل خونیں کفن سے نکلے

دل ٹوٹنے کی تجھ کو ہو بھی خبر تو کیونکر
شیشہ نہیں جو ظالم آواز چھن سے نکلے

وہ بولتی نگاہیں وہ بولتی ادائیں
گوشے ہزار اُن کی طرزِ سخن سے نکلے

اُن کی اداؤں میں کچھ یوں جھلک رہی ہے
چھن چھن کے حسن جیسے اس پیرہن سے نکلے

یادِ ظفر میں فضلی شعروں میں ڈھل گئے ہیں
آنسو جو آج چشمِ عہدِ کہن سے نکلے

غزل

فراق گورکھپوری

مردِ حق پیشہ کو پھر دار و رسن پہ کھینچا — اک ستوں اور گرا ایک چراغ اور بجھا

دام نادار لگائیں گے نئی دنیا کا — مل دولت سے ہے تو اے چرخ یہ سودا نہ پٹا

جس کو کچھ سود و زیاں سے نہیں اے دل سروکار — عشق کا اس کو حساب آتا ہے سیدھا سیدھا

لے لیا صبحِ ازل کو اسے میرے دل نے — بارِ غم کہ دو گردن سے کبھی اٹھائے نہ اٹھا

آ پڑے وقت تو دنیا ہے قسم کھانے کو — ہاں قسم ہے تجھے اے عشق قسم اس کی نہ کھا

جس سکوں کی ہے طلب، روئے زمیں پر وہ نہیں — ہم نے اس انجمن ناز کو بھی جا کے دیکھا

سب سے موزوں ہے زیارت کے لئے شہرِ نگار — یہ نہیں وہ ہے جہاں عشق نے دم توڑ دیا

ہو نہ ہو کوئی کمی تو ہے زمانے میں ضرور — نظر آتا ہے یہ عالم مجھے سونا سونا

دھڑکنیں دل کی دئے جاتی ہیں بس ایک پیام — زندگی کیا ہے بس اک سلسلۂ بیم و رجا

عشق والوں میں وہ پہلی سی نہ گرمی نہ تڑپ — حسن والوں میں وہ اگلی سی نہ وفا ہے نہ جفا

اک کشش ہوتی ہے اسلاف کی جگ بیتی میں — قصۂ عہدِ گزشتہ کے کچھ افسانے سنا

کم سے کم موت سے ایسی مجھے امید نہیں — زندگی تو نے تو دھوکے پہ دیا ہے دھوکا

خواب تھا خواب وہ نظارۂ حالِ انساں — آنکھ جس وقت کھلی مجھ سے تو دیکھا نہ گیا

نام سے دل کے سر میکدہ جس کی ہے تلاش — میرے پہلو میں وہ اک جام دھرا ہے کب کا چھلکا

وہ پھریں اپنے در و بام پہ اہلے گہلے — عشق آوارہ پھرے دشت میں مارا مارا

آپ کا شائقِ ارشاد ہوں میں آپ سے دور — حکم کی بات سمجھیں مجھے آیا آیا

ہے جو اللہ کی قدرت کا تماشا منظور — اک ذرا آئینے کے سامنے گھونگھٹ کو اٹھا

محفل ان کی ہے، گھر ان کا ہے، مراعات ان کی — دخل کیوں دیتے ہو تم حضرتِ دل تم سے کہا

چل گئی حضرتِ واعظ میں اور اک رند میں آج — معرکہ خوب ہے بیٹھے کو بڑا ہے تیسا

اف یہ تنہائی کا احساس بھری دنیا میں — زندگی مجھ سے اب اس طرح تو آنکھیں نہ چرا

دور بدلا تو کہاں جائیں گے اے حاکمِ وقت — ہم غریبوں کی الگ بات ہے عالیجاہا

مجھ سے تو پوچھ رہا ہے شبِ غم کا مصرف — دل میں سوئی ہوئی اک جوت ہے آج اس کو جگا

رند بے چین ہیں بزمِ مہ و انجم روشن — ساقیا جام اٹھا، جام اٹھا، جام اٹھا

منتظر دل کی کٹی جاتی ہے تاروں بھری رات — نیند آتی ہے تری یاد کو آنا ہے تو آ

اس کی دیوار کے سائے میں کٹی عمر فراق
میں تو کمبخت یہیں تھا کہیں آیا نہ گیا

غزل

سراج الدین ظفرؔ

ہم مہ وشوں کا رازِ دروں کھولتے رہے
میزانِ دلبری پہ انہیں تولتے رہے

عکسِ جمالِ یار بھی کیا تھا کہ دیر تک
آئینے طوطیوں کی طرح بولتے رہے

کل شب ہمارے ہاتھ میں جب تک سبو رہا
اسرارِ کتمِ راز میں پَر تولتے رہے

کیا کیا تھا حلِ مسئلۂ زندگی میں لطف
جیسے کسی کا بندِ قبا کھولتے رہے

دنیا شبِ سیاہ تھی لیکن سبو بدست
ہم اُس میں نورِ صبحِ ازل گھولتے رہے

پوچھو نہ کچھ کہ ہم سے غزالانِ بزمِ شب
کس شہرِ دلبری کی زباں بولتے رہے

ہم متقیٔ شہرِ خرابات رات بھر
تسبیحِ زلفِ سیم تناں رولتے رہے

کل رات ملتفت تھے اِدھر کچھ نئے غزال
ہم بھی نظر نظر میں اُنہیں تولتے رہے

تا صبح جبرئیل کو ازبر تھا حرف حرف
راتوں کو جو سرور میں ہم بولتے رہے

اتنی کہانیاں تھیں کسی زلف میں کہ ہم
ہر رات ایک دفترِ نو کھولتے رہے

کل رات میکشوں نے توازن جو کھو دیا
خطِ سبو پہ کون و مکاں ڈولتے رہے

وہ رندِ خوش عمل ہیں کہ دنیا کا ہر اصول
جام و سبو کے تول پہ ہم تولتے رہے

روکا ہزار بزم نے ہنگامِ مے کشی
ہم تھے کہ رازِ ارض و سما کھولتے رہے

اپنا بھی وزن کر نہ سکے لوگ اور ہم
بے جسم ایک ذات کو بھی تولتے رہے

سرمایۂ ادب تھی ہماری غزل ظفرؔ
اشعارِ نغز تھے کہ گہر رولتے رہے

رپورتاژ:

معلق شاہراہ

(وادئ کاغان)

ممتاز مفتی

خوفناک گونج: وہ سب دریا کے کنارے بیٹھے اُن مہیب دیواروں کی طرف دیکھ رہے تھے جو تینوں طرف مسلط و محیط تھیں۔ پھر دفعتاً سورج یوں ڈوب گیا جیسے درخت سے ٹوٹ کر آم گرتا ہے۔ اور اندھیرا چھا گیا۔ جوں جوں اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا، دریائے کنہار کا شور خوفناک ہوتا جا رہا تھا، حالانکہ مہاندری کی وہ خوفناک دیواریں نگاہ سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ وہ پُرہیبت چوٹیاں اور تنگ و تاریک گھاٹیاں نگاہوں سے اوجھل ہونے کے بعد گویا کنہار کے شور میں منعکس ہو رہی تھیں۔ دریا کے شور میں دل دہلا دینے والی گونج اُبھر رہی تھی۔ ایسی خوفناک گونج جسے سُن کر رونگٹے کھڑے ہوئے جا رہے تھے۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی ہمارا خون بلو رہا ہو۔

"چلو یار اندر کوٹھڑی میں چلیں" عمر بولا۔ "یہاں باہر بیٹھے مجھے وحشت ہو رہی ہے۔"

"تم" مسعود بولا۔ "تم تو خود سراپا وحشت ہو۔ تمہیں کیا وحشت ہو گی۔"

"ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے میرا دل پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔" عمر نے جھرجھری لی۔

"ہاں بھئی۔" ضیا بولا۔ "بڑا سناٹا ہے، نسیں تاروں کی طرح بج رہی ہیں۔"

"ہا" مسعود ہنسا۔ "ذرا اور بج لینے دو۔"

"واقعی دھنک دھنک سی ہو رہی ہے۔" اسحاق نے کہا۔

"اس دھنک دھنک سے روح کی غلاظت صاف ہو جاتی ہے۔" مسعود بولا۔

"چھوڑو یار" عمر غصے میں چلایا۔ "ہم یہاں تفریح کے لئے آئے ہیں، روح کی ڈرائی کلینگ کے لئے نہیں آئے۔ رکھو اپنے پاس" عمر اُٹھ کر اندر جانے لگا تو مسعود نے لپک کر اسے پکڑ لیا: "اور وہ جو سستے جاسوسی ناول پڑھا کرتا ہے اور سنسنیشنل نمبر کے تار لرزیں، یہاں بغیر دام خرچے روح کے تار لرز رہے ہیں، تو میدان چھوڑ کر بھاگتا ہے۔"

"گرارڑا ـــــــ ڑدم ـــــــ" ایک مہیب آواز سنائی دی۔ سب سہم گئے۔

"یہ کیسی آواز تھی بھئی؟" ضیا گھبرائے ہوئے بولا۔ "جیسے زمین کا سینہ شق ہو گیا ہو۔"

"چلو خدا کے لئے اندر چلو" عمر نے ہاتھ جوڑے، مسعود کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ عمر بھاگا اور سب اس کے پیچھے پیچھے کوٹھڑی کی طرف چل پڑے۔

ڈاک بنگلے کے برآمدے میں ایک گیس اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں سسکیاں بھر رہا تھا۔ گیس کے قریب صاحب دونوں ہاتھوں میں سر تھامے [illegible] رکھے، لیل اس چھائے ہوئے خوفناک اندھیرے کو گھور رہا تھا جیسے چھپکلی سے خوفزدہ ہو کر اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ بیگم [illegible] پہلو سے چمٹی ہوئی تھی۔ وہ ڈر کر کائنات میں کھویا ہوا تھا، وہ ڈر کر میاں میں کھوئی ہوئی تھی!

کوٹھڑی کے پاس بنگلے کا چوکیدار لالٹین جلائے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری لکیریں یوں متحرک تھیں جیسے پہاڑ پر [illegible] آنکھوں میں گویا کنہار کی وہ خوفناک گونج سمٹی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"وہ دیکھو وہ" ضیا نے بڈھے چوکیدار کی طرف اشارہ کیا۔

"توبہ ہے" عمر بولا "جیسے تنانوں پر کنہار کی وادی اُٹھائے بیٹھا ہو۔"

" دریا کا سارا شور اس کی روح میں سلب ہو چکا ہوگا " مسعود نے کہا۔
" ہاں " اسحاق بولا۔ اور پھر سب خاموش ہو گئے۔
گڑارڑا ——— گڑ ڈدوم :
ایک بار پھر وہی آواز بلند ہو گئی جیسے پہاڑ کی چوٹیاں وادیوں کو ملو رہی ہوں یا زمین در زمین چوٹیاں ابھر کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہی ہوں۔
" بابا یہ کیسی آواز تھی ؟ " عمر نے چوکیدار سے پوچھا۔
" ہائیں " وہ چونکا۔ " آواز ؟ ——" وہ رک گیا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ سی پھیل گئی۔ وہ مسکراہٹ ایسی تھی جیسے اس مسکراہٹ کے پیچھے کائنات کا راز بندھا ہوا ہو۔ چوکیدار کی خاموشی میں چاندنی کی عظمت تھی، خوفناک عظمت جس پر حسرت و یاس کی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اس کے روبرو لالٹین کا شعلہ لرز رہا تھا۔

ایک مرکز : کوٹھڑی میں پہنچ کر جب ہم زمین پر اپنے اپنے بستر بچھا رہے تھے تو ضیا کہنے لگا۔
" یار یہاں سانپ وانپ کا اندیشہ تو نہیں ؟ "
" سانپ " مسعود پھنکارا۔ " بے وقوف جہاں کائناتی خوف مسلط ہو وہاں چھوٹے موٹے ڈر کی گنجائش نہیں رہتی۔ "
" اس کائناتی خوف سے ڈر کر اپنے بل میں گھسا ہوا ہوگا " عمر نے کہا۔
" اور اگر وہ سالا کائناتی خوف سے بے نیاز ہو تو ؟ " ضیا ہنسنے لگا۔
" کیا فرق پڑتا ہے " میں نے کہا اور ہم سب لیٹ کر اس کائناتی خوف میں کھو گئے۔
اس چھوٹی اور بے ڈھب سی کوٹھڑی میں جلتی ہوئی لالٹین کا شعلہ اس کائناتی خوف سے لرز رہا تھا۔ باہر وہ خوفناک گونج ہر لمحہ مہیب تر ہوتی جا رہی تھی۔
" ارے یار " ضیا بولا۔ " یہاں کے لوگ اس مسلسل شور کی وجہ سے کیسے سوتے ہوں گے ؟ "
" لڑکے " مسعود اٹھ بیٹھا۔ " تم نے وہ نیاگرا فالز کا قصہ نہیں سنا ؟ "
" نہیں تو " ضیا نے جواب دیا۔
" تو سنو " مسعود بولا۔ " امریکہ میں نیاگرا فالز کے قریب ایک گاؤں آباد ہے۔ ایک روز رات کے دو بجے کے قریب گاؤں کے سب لوگ یوں بیدار ہو گئے جیسے کسی نے انہیں جھنجھوڑ کر جگا دیا ہو۔ وہ سب محسوس کرنے لگے جیسے کچھ ہو گیا ہے، جیسے کچھ کھو گیا ہے، جیسے کوئی خلافِ معمول بات وقوع میں آئی ہو لیکن کسی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ ہوا کیا ہے۔ پھر دفعتاً ایک شخص چیخ کر بولا " ارے آبشار ! " اور معاً سب نے محسوس کیا کہ آبشار کی آواز بند تھی۔ اور گاؤں پر ایک خوفناک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ یعنی وہ گاؤں جہاں مسلسل آبشار کا شور رہتا تھا اس وقت پُراسرار خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ " آبشار کیا ہوا ؟ آبشار کیا ہوا ؟ " ان کے دلوں میں سے آوازیں آ رہی تھیں۔ ڈر کر وہ اٹھ بیٹھے۔ سارے گاؤں پر خوف و ہراس چھا گیا۔ پھر وہ لالٹین جلا کر آبشار کی طرف چل پڑے۔ وہاں پہنچ کر وہ حیران رہ گئے۔ دریا میں پانی نہ تھا۔ آبشار کی جگہ تہہ کی چٹانیں دکھائی دے رہی تھیں۔ انہیں اپنی آنکھوں اور کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا " مسعود نے ہنسنے کی کوشش کی۔
" کمال ہے " ضیا بولا۔ " مسلسل شور ہو تو ڈر، اور یکدم خاموشی چھا جائے تو بھی ڈر۔ کیا زندگی ہے ہماری ! "
" اب سونے بھی دو گے یا نہیں " عمر بولا " یہ طوطا مینا کا قصہ سنا دیا ہے یا رسنے، تو یہ ڈر آنے لگا ہے کہ کہیں یہ شور ختم نہ ہو جائے "
" جبھی تو کہتے ہیں " میں نے کہا کہ ڈر کے جذبے کو ایک جگہ مرکوز کر لو اور چھوٹے موٹے ڈروں سے بے نیاز ہو جاؤ "
گڑارڑا۔ ڑ ددوم —— پھر وہی مہیب آواز گونجی، جیسے کائنات نے لبیک کہا ہو " ایک مرکز۔ ایک مرکز " کنہار کے پانی نے اسے دہرانا شروع کر دیا۔ شا آ آ آں۔ ہوا کا ایک تند جھونکا آیا۔ لالٹین کی بتی لرزی اور گل ہو گئی اور وہ کوٹھڑی، وہ بنگلہ، وہ دریا، وہ کہسار، وہ مہیب شور اور وہ چھایا ہوا اندھیرا سب ایک ہو گئے، ایک۔ صبح جب وہ بیدار ہوئے تو آنکھیں ملتے ہوئے ضیا بولا " ارے ! " سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پھر وہ آپ ہی آپ کہنے لگا " شکر ہے کنہار کا شور قائم ہے۔ ساری رات اس ڈر کے مارے میں نے آنکھ نہیں کھولی کہ کہیں شور بند نہ ہو جائے "

"ہونہہ" مرچ جھنجھلائی۔ "ساری رات خراٹے لیتا رہا ہے اور اب ———"

"لو سن لو" ضیا ہنسا۔ "میاں کنہار کے بہتے ہوئے ہوتے کوئی خراٹے لے سکتا ہے کیا؟ اور اگر لے بھی تو کیا وہ سنائی دیں گے؟ میاں اس کائناتی شور میں بھلا خراٹوں کی کیا حیثیت، کیوں بھائی؟" اس نے تفریحاً چوکیدار سے پوچھا جو چائے اٹھائے کوٹھڑی میں داخل ہو رہا تھا۔

چوکیدار کے چہرے کے کہساروں اور وادیوں میں عجیب سی حرکت ہوئی۔

"تم خراٹے لیا کرتے ہو سوتے میں؟" ضیا نے اس سے پوچھا۔

"خراٹے" وہ بولا "ہاں صاحب، خراٹے تو لیتے ہی ہیں لوگ۔"

"اور یہ شور" ضیا نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔

"شور" بڈھے نے تعجب سے دیکھا "کونسا شور صاحب؟"

"دریا کا شور" وہ بولا

"ہاں" بڈھے کے چہرے کی وادیوں میں گویا کرنیں دوڑ گئیں۔ "وہ تو ہے صاحب۔"

جب بوڑھا چائے رکھ کر باہر نکل گیا تو ضیا ہنسنے لگا۔ "ارے یار حد ہے" وہ بولا۔ "انہیں یاد دلانے پر دریا کا شور یاد آتا ہے۔ اس مسلسل شور کی نسبت انہیں خراٹوں کے شور کا زیادہ احساس ہے۔"

"اپنی اپنی توجہ ہے" مسعود نے کہا "رات کو درختوں تلے الاؤ کے پاس وہ خانہ بدوش بیٹھا تھا نا" اس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ دریا کے شور سے بے نیاز ہو، جیسے اس کی روح میں اس دریا سے زیادہ مہیب دریا بہہ رہا ہو۔ "کیوں بھئی نفسیاتی بابکے، کیا کہتا ہے تمہارا علم؟" اس نے میری طرف دیکھ کر دانت نکالے۔

"میں بتاؤں کیا کہے گا یہ؟" عمر چلانے لگا۔

"کیا؟" ضیا نے پوچھا۔

"کہے گا" عمر بولا "جب رات کے وقت اس بڈھے چوکیدار کی بیوی جاگتی ہے اور یہ سوتے میں خراٹے لیتا ہے تو اس کی بیوی کے لئے ان خراٹوں کی آواز کنہار کے شور کی نسبت زیادہ مہیب ہوتی ہے۔ ہا ہا ہا ہا" وہ ہنسنے لگا۔

اڑھائی ہزار کا کیمرہ

"کیوں ٹھیک کہتا ہے یہ؟" ضیا مسکراتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔

"اب بول" عمر چلایا "اب کیوں خاموش ہے۔؟"

"کوئی کیمرا ہوتا تو تصویر لیتے اس کی" مسعود بولا۔

"ارے میرا کیمرہ" ضیا چلایا۔ وہ دیوانہ وار اٹھا اور اپنے بستر کو ٹٹولنے لگا "اگر جو کھو گیا تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔"

"کیمرا ہی ہے نا، کوہ نور کا ہیرا تو نہیں" مسعود چلایا۔

"خدا کی قسم! کوہ نور کے ہیرے سے کم نہیں" وہ بولا۔ "اور مانگے کا ہے۔"

"شکر ہے مل گیا" اس نے کیمرا ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہے کیا قیمت ہے اس کی؟ اڑھائی ہزار!"

"اڑھائی ہزار! دکھانا تو" عمر چلایا۔

مسعود نے لپک کر کیمرا ضیا کے ہاتھ سے چھین لیا۔ اور وہ کیمرے کو دیکھنے لگے۔

"جرمن ساخت کا ہے" ضیا بولا "اور اسی سال کا موڈل ہے۔ ہر چیز موجود ہے اس میں۔ روشنی اور ایکسپوژر کا آلہ بھی ساتھ لگا ہے۔ آٹومیٹک ایکسپوژر کا انتظام بھی ہے۔ فوکس ٹھیک کرنے کا آلہ لگا ہے۔ اور یہ آلہ جو ہے اسے چلا دو، جو اس بٹن کے دبانے سے کام کرتا ہے، تو جب تک فوکس ٹھیک نہ ہو جائے ویوئر (VIEWER) میں تصویر نہیں آتی۔ یعنی کٹی ہوتی ہے۔ لیٹسٹ ماڈل ہے لیٹسٹ۔"

"جبھی تو اڑھائی ہزار قیمت ہے" اسحاق نے حیرت سے کیمرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھئی واہ، پھر تو مزے ہو گئے" مسعود ناچنے لگا۔ "پھر دیر کس بات کی ہے، ابھی ہو جائے ایک تصویر۔"

"آؤ بھئی آؤ" وہ چلانے لگا۔ "سب باہر نکل آؤ، تصویر ہو گی۔ آجاؤ لڑکو" وہ چیخ کر بولا۔

"لیکن۔ لیکن" ضیا چلایا۔

"لیکن کیا؟" مسعود غرانے لگا۔

"لیکن تصویر کون کھینچے گا؟"

"تصویر کون کھینچے گا؟ تم اور کون؟" مسعود نے کہا۔

"لیکن مجھے تو اس کیمرے کو چلانا نہیں آتا" ضیا نے مجرمانہ انداز سے کہا۔ "مجھ سے تو یہ کھلتا بھی نہیں۔ لینز کا شٹر نہیں کھلتا۔"

"لاؤ اس میں کیا ہے" عمر بولا۔ "مجھے دو۔"

"لیکن یار" ضیا بولا "توڑ نہ دینا اسے۔"

عمر دیر تک کیمرے کو لے کر اُلٹتا پلٹتا رہا۔ پھر مسعود نے اُس سے کیمرہ چھین لیا اور اس کے پیچ و پیچ مروڑتا رہا۔ اِس دوران میں سب اس کے اردگرد کھڑے ہو کر دیکھتے رہے اور ضیا چلاتا رہا "ارے یار کہیں توڑ نہ دینا، توڑ نہ دینا کہیں"۔ مایوس ہو کر مسعود غصے میں آ گیا۔ "یہ کیا کیمرا ہے اونہوں۔ یہ تو کوئی جنتر منتر معلوم ہوتا ہے۔ جیسے گورکھ دھندا۔"

"اتنا قیمتی کیمرا ہے اور تم کہتے ہو منتر جنتر ہے۔"

"ہا ہا" مسعود ہنسا۔ "یہ تو وہی بات ہوئی جو ایک بار آئی سپیشلسٹ نے کی تھی۔ سنو یار سنو"۔ اس نے عمر اور اسحاق کو گھورا، جو کیمرے سے کشتی لڑنے میں مشغول تھے۔ "میری بات سنو" وہ غرایا۔ "ایک بار والد صاحب کی دائیں آنکھ خراب ہو گئی تو میں انہیں ایک آئی سپیشلسٹ کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے آلات سے اُن کی آنکھ کا بغور معائنہ کیا، کہنے لگا ہوں! آنکھ کی پتلی بالکل ٹھیک ہے، بالکل اوکے، فسٹ کلاس۔ ہُوں، آنکھ بالکل صاف ہے۔ اُنہوں، موتیا بند، بالکل نہیں، شیشے کی طرح صاف۔ کالا بالکل ٹھیک۔ سفیدی اوکے۔ آنکھ کے مسل خوب خوب، بہت اچھے، بہت اچھے۔ اِٹ اِز اے فسٹ کلاس آئی۔ اوکے پرفیکٹ"۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولا "صرف نقص یہ ہے کہ اس میں بینائی دکھائی نہیں دیتی"۔ اس پر میں قہقہہ مار کر ہنس پڑا اور وہ سالا چڑ گیا۔ "بے وقوف کہتا تھا اِٹ اِز اے فسٹ کلاس آئی۔ پرفیکٹ، صرف نقص یہ ہے کہ قوت بینائی نہیں۔ ایڈیٹ ——— اور ضیا کا یہ اڑھائی ہزار کا کیمرا موسٹ ماڈرن ماڈل ہے۔ ہر قسم کی کل لگی ہے اِس میں۔ ٹائم ایکسپوژر، سلف فوکس، لائٹ ایڈجسٹمینٹ، صرف نقص یہ ہے کہ تصویر نہیں کھینچ سکتا۔ ہا ہا" وہ دیوانہ وار ہنسنے لگا۔

مسعود کی عادت ہے کہ جب وہ غصے میں سوڈربن جائے تو وہ طنزاً ہنستا ہے۔ "ہا ہا" یا خالی ایک "ہا"۔ اس "ہا" میں بلا کی بناوٹ ہوتی ہے، بلا کا غصہ ہوتا ہے، اور اُس کی وہ خشک اور گرم "ہا" گونجتی ہے اور سننے والے محسوس کرتے ہیں جیسے وہ "ہا" اُن کے کان کے پردے پھاڑنے کے لئے ہو۔ اور وہ محسوس کرتے ہیں جیسے اُن کا مذاق اُڑایا جا رہا ہو اور جوں جوں اُن کے چہروں پر غم و غصہ کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کی "ہا" میں بے رحم خوشی کا عنصر بڑھتا جاتا ہے۔

"ہا — ہا — ہا" مسعود بھیانک آواز میں بھونک رہا تھا۔ عمر کا منہ سُرخ ہوتا جا رہا تھا، مرچ جل رہی تھی، ضیا کی مسکراہٹ بوکھلائے جا رہی تھی۔ باہر دروازے پر موٹر ڈرائیور گاڈوی چلا رہا تھا۔ "بابو چلو گے یا نہیں، وَن وے ٹریفک ہے، وقت گذر گیا تو کیا کریں گے؟" بنگلے کا چوکیدار گھبرایا ہوا کھڑا تھا کہ کن دیوانوں سے پالا پڑا ہے۔ فکر کی وجہ سے اس کے چہرے کی لکیریں گویا سمٹ کر معدوم ہونے کی کوشش میں رخساروں سے کانوں کی طرف دوڑی جا رہی تھیں۔ میدان میں ٹھہرے ہوئے خانہ بدوشوں کی دو عورتیں منہ میں اُنگلیاں ڈالے حیرت سے ہماری طرف تک رہی تھیں اور میں محسوس کر رہا تھا جیسے دریائے کنہار کا شور رک گیا ہو، پانی ٹھہر گیا ہو، چوٹیاں اپنے کلاہ اُتار کر نیچے ہماری طرف جھانک رہی ہوں۔ "ہا — ہا — ہا" مسعود کی آواز اور بلند تر ہوئی جا رہی تھی۔ اور بلند اور بلند!

"بھوں بھوں" ——— موٹر کا ہارن زور سے بجا اور دفعتاً گویا مجھے ہوش آ گیا۔ ہماری جیپ نیچے کی طرف پھسلتی جا رہی تھی، سب خاموش بیٹھے تھے۔ عبداللہ ٹھوڑی ہاتھ میں پکڑے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسحاق یوں سمٹا ہوا بیٹھا تھا جیسے رسی بل کھائے ہوئے ہو۔ گویا سامنے عمر پہاڑ کی چوٹیوں کو ناپنے میں مصروف تھا۔ گاڈوی کمبل سے باہر نکل کر سٹیرنگ وہیل سے چمٹا ہوا تھا۔ اور مسعود گھونسے کی شکل بنائے اپنے بوٹ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

"دفعتاً ضیا چلایا "ارے یار میرا کیمرا!"

کیمرے کا نام سنتے ہی سب چونک پڑے۔

"کیمرا" عمر نے چونک کر دوہرایا۔

"وہیں تو نہیں پھینک آئے کیا؟" ضیا نے چیخ کر پوچھا۔

"مجھے تو نہیں معلوم" عمر بولا۔

"معلوم نہیں کس نے رکھا ہے؟" اسحاق نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"میں تو ساری زندگی میں اڑھائی ہزار کی رقم ادا نہ کر سکوں گا۔" ضیا سر پیٹنے لگا۔

"گھبراؤ نہیں، میرے پاس ہے۔" سردے سے مٹھاس بھرے چھینٹے اڑے، پریشان چہروں پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

دفعتاً مسعود نے سر اٹھایا۔ "ڈرائیور!" وہ چلایا۔ "ذرا رکو، ٹھہرو۔"

"کیوں بابو جی؟" گائڈ نے حیرانی سے دوہرایا۔

"ہاں" مسعود نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں اس موٹر میں نہیں جاؤں گا۔"

"نہیں جاؤگے؟" عمر نے حیرت سے پوچھا۔ "لیکن کیوں؟"

"بس نہیں جاؤں گا" وہ بولا۔ "ہم گھر سے پک نک کرنے آئے ہیں، قدم قدم پر اڑھائی ہزار کے کیمرے کے گم ہو جانے کا غم کھانے نہیں آئے۔"

"ہا ہا ہا ہا" عمر نے قہقہہ لگایا۔

"ہنسنے کی کیا بات ہے؟" مسعود نے سنجیدگی سے کہا۔ "یا تو تم سیر و تفریح کر سکتے ہو یا اڑھائی ہزار کے کیمرے کی چوکیداری۔ دونوں کام بیک وقت نہیں ہو سکتے"

"ٹھیک کہتا ہے، ٹھیک کہتا ہے۔" اسحاق بولا۔

"صبح جاگو تو اللہ کا نام لینے کے بجائے کیمرے کا غم کھاؤ۔ بھئی وہ دیکھنا میرا اڑھائی ہزار کا کیمرا موجود ہے نا۔ چائے پیو تو گھونٹ گھونٹ پر کیمرے کا غم کھاتے رہو۔ دوڑو بھاگو تو یہ فکر کندھوں پر اٹھائے پھرو کہ کیمرا کھو تو نہیں گیا اور رات کو سوؤ ۔۔۔ لیکن سونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سرہانے تلے اڑھائی ہزار کی رقم رکھی ہو تو نیند کیسے آئے گی؟"

"بات تو معقول ہے۔" عمر ہنسا۔

"بکو نہیں۔" مسعود نے سینگ نکالے۔ "میں مذاق نہیں کر رہا، اگر اڑھائی ہزار کا غم کھانے کی اہلیت ہوتی تو خدا کی قسم اب تک میں اڑھائی کیا پانچ ہزار روپے جمع کر چکا ہوتا۔ ہم نے تو آج تک اپنے سرمائے کا غم کھانا بھی گوارا نہیں کیا اور یہ لڑکا چاہتا ہے کہ بیگانے کے اڑھائی ہزار کا غم کھائیں۔ نہ بھئی مجھ سے یہ نہ ہوگا۔"

"بھئی بات تو واقعی سوچنے والی ہے۔" ضیا کی شرارت بھری مسکراہٹ چمکی۔

"اور پھر کیمرا بھی وہ" مسعود چلایا۔ "جو تصویر تک نہیں کھینچ سکتا۔ روک دو بھئی۔ میں کہتا ہوں روک دو گاڑی۔"

"جیپ رک گئی۔" مسعود نے سڑک پر چھلانگ لگا دی۔

"ارے" ضیا چیخنے لگا۔ "وہ تو واقعی اتر گیا ہے۔"

"بے وقوف!" عمر نے اس کے پیچھے پیچھے پھلانگتے ہوئے کہا۔ اس کا منہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

"لاحول ولاقوۃ۔" عبداللہ ہنسا اور گاڑی سے اتر گیا۔

سب مسعود کے پیچھے پیچھے جیپ سے اتر گئے۔

"ارے!" سڑک پر ضیا چیخنے لگا۔ "یہ تو بستی ہے اور ہم سمجھا ویرانے میں رکے ہیں۔"

وادیٔ کاغان: جیپ سڑک کے کنارے پر کھڑی تھی۔ سامنے سڑک پر دو رویہ پتھر کی پتلی دیواروں میں چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں جن میں کپڑا، اناج اور چائے وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ ان دکانوں کے سامنے ٹوٹے ہوئے بنچ تھے، جن پر کچھ لوگ یوں بیٹھے ہوئے تھے جیسے انہیں کوئی کام کاج نہ ہو۔ دکاندار آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اور دکان میں پڑے ہوئے سامان اور آتے جاتے لوگوں سے اس قدر بیگانہ تھے جیسے انہیں خرید و فروخت سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ ان کے چہروں پر کوئی جذبہ نہ تھا، کوئی اظہار نہ تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بیٹھے بیٹھے کھو گئے ہوں، اپنے آپ سے کھو گئے ہوں۔ یا جیسے ان گھروندوں میں بیٹھے بیٹھے انہیں نروان حاصل ہو چکا ہو۔ ان کی کسی حرکت میں شوق، جستجو یا جدوجہد کی جھلک نہ تھی۔ اُن کے چہروں پر حسرت آلود سیری کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔

ان غلیظ گھروندوں کے اردگرد گھنا اور گہرا سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ درخت، کھیت، پھول دار پودے، گھاس اور بوٹی۔ چاروں طرف سے سبزے نے گویا ان پر یورش کر رکھی تھی اور انہیں اس حد تک مغلوب کر دیا تھا کہ انہیں سدھ بدھ نہ رہی تھی۔ بائیں ہاتھ کی طرف دور کھیتوں کے پرے کنہار گویا ایک فاتح کی طرح گرجتا ہوا مارچ کر رہا تھا۔

"یہ ہے کہاں، یہ کونسی جگہ ہے؟" سب نے گاوڈی سے پوچھا۔

"کاغان۔" اس نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

"کاغان — یہ؟" وہ چلایا "تو کیا ہم یہ دیکھنے کے لئے اتنی دور سے آئے ہیں؟" اس نے عبداللہ سے کہا۔

عبداللہ کی آنکھوں سے مسرت کی بوندیں اڑیں جیسے وہ کاغان آنے پر بے حد مسرور ہو۔

"لاحول ولا قوۃ" اسحاق بولا۔ "کونسی جگہ ہے یہ؟"

وہ دیکھو وہ دیکھو" عمر چلایا "وہ۔" اس نے ٹوکریوں کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ کونسی سبزی ہے بھئی؟" ضیا نے پوچھا۔

"سبزی، بے وقوف! عمر جھنجھلا گیا۔ "اندھے ہو؟ یہ سیب ہیں سیب۔ کاغان کے سیب۔"

"اچھا!" وہ بولا۔ "یہیں ہوا کرتے ہیں۔ پر یار یہ اس قدر سبز کیوں ہیں؟ اور سبز بھی ایسے جیسے بے رنگ سے ہوں۔ جیسے موٹے بیر ہوتے ہیں۔"

"یہاں کے سیب ایسے ہی ہوتے ہیں بے وقوف" عمر بولا۔ "تمہیں کچھ پتہ ہی ہو تو۔" مسعود کی طرف دیکھا گا جو سڑک کی پرلی نکڑ پر یوں کھڑا نگاہ سے بازار کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے پاکستانی فلم کا ولین اپنی سازش کے ناکام ہونے کے بعد اپنے کمزور سا منہ کی طرف دیکھتا ہے۔ "سیب کھاؤ گے؟ مسعود کاغان کے سیب کھاؤ گے؟" اس نے مسعود سے یوں پوچھا جیسے اڑھائی ہزار کے کیمرے کی بات ہی نہ ہوئی ہو کبھی۔

"ہاں!" مسعود نے ریچھ کی طرح سر ہلایا۔ اس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہاں کہہ کر اس نے عمر پر احسان کیا ہو۔

سیب کھانے کے موقع کو بھانپ کر سب مسعود کے گرد جمع ہو گئے۔

"یہاں کے لوگوں کے چہروں پر اتنی بے حسی اور اکتاہٹ کیوں ہے مسعود؟" ضیا نے گویا اڑھائی ہزار کا کیمرہ اٹھا لانے کی معذرت پیش کی۔

"ہوں!" مسعود نے اپنی لمبی تھوتھنی موڑی۔

اس لمبی تھوتھنی کو دیکھ کر ایک ساعت کے لئے خاموشی طاری ہو گئی۔

نفسیات کا چکر: "واہ واہ" دبی زبان سے اسحاق بولا۔

"ارے!" ضیا نے زیر لب کہا۔ اور اسحاق کی طرف اشارہ کیا جو اپنی ہی دھن میں کھویا ہوا تھا۔ "اس بھلے مانس کا زاویۂ نظر بھی دیکھ لو بھائی۔" ضیا نے مسعود کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔

سب کی نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں جس طرف اسحاق کی نظریں گڑی ہوئی تھیں۔ "ارے!" ضیا نے شور مچا دیا۔ "میں نے بھی کہا۔ واہ واہ کرنے کا یہاں کیا مقام ہے؟"

"کیا مقام ہے واہ واہ کرنے کا؟" ہاتھوں میں سیب اٹھائے عمر نے آکر پوچھا۔

"واہ واہ کرنے کا وہ مقام ہوتا ہے جدھر اسحاق کی توجہ مرکوز ہو۔" ضیا زیرِلب ہنسنے لگا۔

بائیں طرف دو کانوں کے درمیان ہی سے ایک چھوٹی سی تنگ سی گلی نکل گئی تھی۔ سامنے ایک مکان کا دروازہ کھلا تھا۔ اور اندر صحن میں چار ایک عورتیں ڈھولک لئے بیٹھی تھیں۔ اُن کے جسم پامال تھے۔ چہرے خشک اور رکھ درے تھے۔ اُن کے انداز میں کوئی نزاکت اور نہ اثر تو تھی، لیکن اُن کی آنکھوں میں ایک نگاہ تھی۔ ایک عجیب سی نگاہ، بھوکی ننگی نگاہ، اُن کا گیت ایک بین تھا، حسرت و یاس کی ایک مدھم زیرِلب پکار۔

"ارے" ضیا چلایا۔ اور اسحاق کی طرف اشارہ کرکے بولا۔ "ارے بھائی اب تو کافی ہو چکا، اب بس۔" وہ ان لیکن اسحاق ویسے ہی کھڑا ہوا تھا۔ اور اَن جانے میں کھچا سا جا رہا تھا۔

"میں نے کہا مسعود!" ضیا بولا "بھئی اسے سمجھاؤ نا۔ ابھی تو ہمیں مسافت طے کرنی ہے۔"

"بھئی عجیب بات ہے۔" عمر چلایا۔ "یہاں کے مرد یوں ہیں جیسے اکتائے ہوئے ہوں، اور ان گانے والیوں میں بھوک اور گرسنگی ہے۔ کیوں مسعود ہے نا؟" پھر مجھ سے مخاطب ہو کر وہ پوچھنے لگا "کیوں مہاراج، تمہارا علم کیا کہتا ہے اس نکتے کے بیچ؟"

"ہا" مسعود کا ذہنی قہقہہ گونجا۔ "ہا"۔ اور اس کی ٹھوڑی سمٹ کر اپنی جگہ پہ آ گئی۔

ضیا خوش ہوا کہ اس کے اڑھائی ہزار کے کیمرے کی بات پس پشت پڑ گئی۔ وہ تالیاں پیٹنے لگا۔ عمر نے مسعود کا رنگ بدلتے دیکھا تو جھٹ ایک ایک سیب سب کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "ہا" مسعود نے سیب کھاتے ہوئے کہا "چکر میں ڈالنا منفیّت پر منتج ہے۔ اس سے پوچھو گے تو تمہیں چکر میں ڈال دے گا۔ اس سے پوچھو کہ یہاں کے مرد اکتائے ہوئے کیوں ہیں؟ تو کہے گا اس لئے کہ عورتوں کی نگاہوں میں تشنگی ہے۔ اور اگر پوچھو کہ عورتوں کی نگاہ میں تشنگی کیوں ہے؟ تو کہے گا اس لئے کہ مرد اکتائے ہوتے ہیں۔ ہا" اس کا وہ بھیانک قہقہہ گونجا۔

"ہا ـــــ ہا"

"ہی ہی ہی ہی" ضیا نے گویا ہنسی کی پچکاری چلائی۔ "لیکن یار بیچارہ خود چکر میں پڑا ہے۔ کسی کو کیا ڈالے گا۔"

"اونہوں" عمر بولا "یہ خود نہیں پڑا۔ ایک نفسیات کا علم بذاتِ خود ایک چکر ہے۔"

"ہا" مسعود چلایا۔ "واہ!"

سر دے میں سے چھینٹے اُڑنے لگے، وہ بچ گویا کہ جدائی میں سوال سوال کر رہی تھی۔

"ارے!" دفعتاً ضیا چلایا "یہ کیا تھا؟"

"کیا، کیا تھا؟" عمر نے پوچھا۔

"یہ جو میں نے ابھی کھایا ہے" ضیا بولا "یہ کیا سیب تھا؟"

"اور کیا بھنے ہوئے چنے تھے؟" اسحاق نے چمک کر بات کی۔

"منہ میں تو ایسا ذائقہ ہے جیسے حلوۂ کدو کھایا ہو۔ ایمان سے ہمارے گاؤں کے شلغم ہی اِن سیبوں سے زیادہ شیریں ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ وہاں ہمارے گاؤں میں ایک گورا ملیٹن آنکلی۔ کنجڑا شلغموں کا ٹوکرا رکھے بیٹھا تھا۔ ٹامیوں نے پوچھا 'واٹ دِس؟' کنجڑا بولا 'سیب۔ سیب۔ فروٹ۔' 'ول ول فروٹ' کہہ کر وہ پل پڑے۔ کنجڑے نے ایک ایک آنے میں سارے شلغم بیچ دیئے۔ ایمان سے! اور یہ سیب۔ ہونہہ!"

"عجب آدمی ہے۔" عمر چلایا "بھئی یہ جگہ تو سیبوں کے لئے مشہور رہے۔ اور تم کہہ رہے ہو یہ سیب سیب ہی نہیں۔"

"بھائی مَیں؟" اسحاق نے کہا "کبھی اٹک کے پُل پر گئے ہو؟ وہاں تلی ہوئی مچھلی بکتی ہے۔ وہاں کی مچھلی مشہور ہے۔ لوگ کراچی سے چل کر آتے ہیں اسے کھانے کے لئے، اور معلوم ہے وہ مچھلی آتی کہاں سے ہے؟ دریا سے نہیں، کراچی سے! ہاں، کریٹ کے کریٹ بھرے آتے ہیں۔ روز ریل گاڑی سے۔"

"ٹھیک تو ہے" مسعود بولا "دریا کے کنارے بیٹھ کر مچھلی کھانے والے کو یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ سمندر سے پکڑی ہوئی مچھلی کھا رہا ہے۔"

"ہاں بھئی" اسحاق نے کہا "یہ سوچنے کی بات ہے"
"چھوڑو اس چکر کو" مسعود بولا "آخر دنیا کی اقتصادی مشکلات کا غم ہم کیوں کھائیں؟"
"ہاں بھئی تم حلوہ کدو سیب کھاؤ" ضیا چلایا۔
"تمہیں سیبوں کا کیا پتہ ہے؟" عمر غصے میں آ گیا۔
"عمر سے کسی پہاڑی چیز کی عیب جوئی نہ کیا کرو" عبداللہ نے پہلی مرتبہ بات کی "اُسے غصہ آجاتا ہے"
"کیوں؟" ضیا نے پوچھا "اس کا سسرال ہے کیا؟"
"نہیں ننھیال ہے" عبداللہ نے جواب دیا۔
"جبھی تو اُسے پہاڑوں پر چڑھنے کا خبط ہے" مسعود بولا "جس طرح بلی چوہے کو دیکھ کر اُسے مارنے پر مجبور رہتی ہے، یہ پہاڑ دیکھتا ہے تو اس پر چڑھنے کا خبط دیوانگی بن کر اس کے سر پر سوار ہو جاتا ہے"
"نہ بھائی" ضیا بولا "یہ اس کا ننھیال ہے، یہ بات اپنی سمجھ میں نہیں آتی"
"کیوں؟" میں نے پوچھا۔
"جو یہ اس کا ننھیال ہے تو پھر اس کے چہرے پر اکتاہٹ کیوں نہیں؟ اُلٹا اس کی نظر میں تو ننگی بھوک ہے" ضیا نے ہنسی کی پچکاری چھوڑی۔
"تو کیا — ؟ ہاہا۔ ہاہا" مسعود ناچنے لگا"
"بدبخت، کمینے" عمر نے سیب تھوک کر گالیاں دینا شروع کر دیں۔
"اب چلوگے بھی بابوجی؟" گاڑی ڈرائیور نے قریب آکر کہا۔
"ہاں بھئی" عبداللہ بولا۔ "ون وے ٹریفک ہے۔ ورنہ رات یہیں بسر کرنی پڑے گی"
"چلتے ہیں، چلتے ہیں" ضیا بولا "پر خان صاحب" اس نے گاڑی سے مخاطب ہو کر کہا: "یہ یہاں کے دوکانداروں کو کیا ہے؟"
"کیا ہے؟" وہ بولا۔
"یہ اس قدر اُکتائے ہوئے کیوں ہیں، جیسے گاہک کی پرواہی نہ ہو، بکری کا خیال ہی نہ ہو"
"جیسے سیر بھر پلاؤ کھا کر سیر ہوئے بیٹھے ہوں" مسعود نے بات کی وضاحت کی۔
"بابوجی" گاڑی بولا۔ انہیں گاہک کی کیا پروا؟ گاہک تو ان کی رعایا ہیں"
"ارے رعایا؟" ضیا چلایا
"بابوجی یہ دکاندار نہیں، یہ تو کاغان کے سید ہیں، ساری زمینوں کے مالک ہیں"
"فیوڈل لارڈ ہیں" عبداللہ نے وضاحت کی۔
"تو بھئی یہ کمبی نیشن بھی عجیب ہے" عمر ہنسا۔ "فیوڈل لارڈ دکانداری کر رہے ہیں"
"یعنی" مسعود چلایا۔ "اپنی رعایا کو سودا دے کر احسان کرتے ہیں۔ کپڑا بیچتے ہیں، اُن کا تن ڈھانکتے ہیں۔ یہ بات ہے نا؟"
"مطلب ہے" ضیا بولا "یعنی جو پیسے قیمت کے طور پر وصول کرتے ہیں وہ ایک ضمنی بات ہے"
"پھر تو ٹھیک ہے بھائی یہ اکتاہٹ" مسعود بولا۔
"اور وہ ننگی بھوک" ضیا چلایا۔
"وہ تو ہوگی، مالدار ہونے کا دوسرا رُخ ہے نا" مسعود نے کہا۔
"پھر تو نفسیات کا وہ چکر ٹھیک ہوا نا" عمر بولا۔

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

کراچی میں پاکستانی مصور "صادقین" کی تصاویر کی نمائش   افتتاح: وزیرِ اعظم پاکستان

وزیر اعظم پاکستان کا دورہ جاپان

پاکستان میں عکاسی کی ترقی

بگولہ — وسیم بیگ

دعا — محسن حسین

یہ تصویریں

صفحۂ مقابل پر جو تصویریں پیش کی جا رہی ہیں وہ پاکستان کے تین ممتاز عکاسوں کے فن کے نادر نمونے ہیں جن کو فوٹوگرافی کے بین الاقوامی ادارے "الیف اے آئی پی" نے حال ہی میں فوٹوگرافی کے اعلیٰ ترین خطابات "آنریری ایکسیلینسی" اور "ایکسیلینسی" عطا کئے۔ اس سے پہلے کسی پاکستانی کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا۔

یہ خطاب ان فنکاروں کو دئے جاتے ہیں جو نہ صرف فوٹوگرافی کی مشہور عالمی نمائشوں میں فن کے معیاری نمونے پیش کرنے کے اہل ہوں بلکہ اس کی مدتوں بے لاگ خدمت بھی کرتے رہے ہوں۔ ادارہ دنیا کے تمام فن کاروں کے کام کو برسوں جانچتا رہتا ہے اور جب کوئی فن کار ہر لحاظ سے معیار پر پورا اترتا ہے تو اس کی کاوش اور خدمات کے اعتراف میں یہ خطابات دئے جاتے ہیں جن کو وہ عمر بھر اپنے نام کے ساتھ استعمال کر سکتا ہے۔ ساتھ ہی ایک ڈپلوما اور طلائی بیج بھی اعزاز کے طور پر دیا جاتا ہے، جو عکاس کے ماہرِ فن ہونے کی علامت ہے۔

مذکورہ بالا تینوں عکاس پاکستان کے اولیں اور ممتاز ترین ادارۂ عکاسی "فوٹوگرافک سوسائٹی آف پاکستان" کے سرگرم و سرکردہ اراکین ہیں اور انہوں نے پاکستان میں اس فن کو ترقی دینے اور اس کا ذوق عام کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ان کی کھینچی ہوئی تصاویر دنیا کی متعدد مشہور نمائشوں میں دکھائی گئی ہیں۔ GONE WITH THE WINC — لندن کی ایک نمائش میں دکھائی جا چکی ہے اور تین نہایت مشہور رسالوں میں چھپ چکی ہے۔ مسٹر ابراہیم رحمت اللہ (آنریری ایکسیلینسی) ایک عرصہ فوٹوگرافک سوسائٹی کے صدر رہے ہیں اور مسٹر وسیم الدین (آنریری ایکسیلینسی) اس کے سکرٹری ہیں۔ مسٹر محسن صبیح (ایکسیلینسی) اس سوسائٹی کے رسالہ "فوٹو ٹرینڈ" کے مدیر اعزازی ہیں جو پاکستان میں فوٹوگرافی کا واحد ماہنامہ ہے۔ ان کی تصویر ILL MANNEREC دنیا کی بہترین تصویروں میں چنی گئی تھی اور الیف آئی اے پی ایئر بک میں پورے صفحہ پر شائع ہوئی +

سانیٹ:

شاید صدف، شاید گہُر!

(کیماڑی سے منوڑا جاتے ہوئے)

ش۔ ضحیٰ

نیلے نیلے پیچ و خم کا ایک لہراتا چمن
ہلکے ہلکے زیر و بم میں کچھ سکوں، کچھ اضطراب
یہ سفینہ ہے کہ نغمہ، وہ جزیرہ یا حباب
جھاگ کے فانوس میں شمعوں کی رنگیں انجمن
میں کہ حیراں، تُو کہ حیرانی پہ میری خندہ زن
اِک حقیقت کتنی واضح، کتنا مبہم ایک خواب
اِک طرف فطرت کے جلوے، اِک طرف تیرا شباب
اور میرے دل کے آئینے میں دونوں ضوفگن

دل کا آئینہ کہ ہے خود ایک بحرِ بے قرار
جس کے مدّ و جزر ہیں یہ منظرِ شام و سحر
جس کی موجیں کہکشانی رفعتوں سے ہمکنار
جن پہ رقصاں دو سفینے، ایک سورج اِک قمر
تُو اِسی دل کے تموّج کا ہے کوئی شاہکار
اور میں؟ اس موج کا شاید صدف، شاید گہُر!

روزنامچہ:

ماہ مارچ کے لیل و نہار

حجاب امتیاز علی

یکم مارچ ۵۷ء: آج صبح ایک بھونرا دروازے سے اندر آیا اور دریچے سے باہر نکل گیا!

بہاریں آنے ہی والی ہیں ——— !

۴ر مارچ ۵۷ء، شب: گذشتہ محفل موسیقی سے ڈیڑھ بجے گھر واپس پہنچے۔ رات بےحد سرد اور دل بےحد غیر مطمئن تھا۔ رات کے دو بجے کے قریب کھانے کی میز پر بیٹھی کافی پی رہی تھی کہ کسی نے صحن باغ کا دروازہ کھٹ کھٹایا۔ اتنی رات گئے سوائے چور کے اور کون ہو سکتا ہے! یہ سوچ کر پریشان سی ہو گئی۔ دوبارہ سہ بارہ کھٹ کھٹانے پر آہستہ سے دروازہ کھولا اور جالی کے دروازے میں سے جھانک کر دیکھا تو صندل ——— صندل کو دیکھ کر اچانک سردی کا احساس کافور اور اطمینان قلب شدید ہو گیا۔ یہ بلا آج چار دن سے پراسرار طریق پر گم ہو گیا تھا اور میں سخت پریشان تھی۔ خیر صبح کا گیا شام کو لوٹ آئے تو اُسے بھولا نہیں کہتے۔

حالانکہ رات تین بجے سوئی تھی، مگر آج آنکھ سویرے کھل گئی۔ ناشتے پر پھل اور شہد کھایا۔ عرشہ چمن پہ بیٹھ کر اخبار ختم کیا۔ آج اخبار میں ایک دلچسپ خبر پڑھی۔ لکھا ہے ایک بیل نے خودکشی کر لی! اور اس خودکشی کی تہہ میں عشق کارفرما تھا! اس عجیب خودکشی کی تفصیل یہ ہے کہ جودھپور سے خبر آئی ہے کہ ایک انعام یافتہ بیل نے ڈیڑھ سو فٹ بلند عمارت پر چڑھ کر چار دفعہ خودکشی کرنے کی کوشش کی۔ مگر چاروں دفعہ عین وقت پہ اُسے بچا لیا گیا۔ اس خوفناک ارادے سے ہفتہ بھر پہلے اس پیارے جانور۔ "نندے" نے کھانا پینا ترک کر دیا تھا اور روپوش ہو گیا تھا۔ اتفاق سے ایک چوکیدار نے اُسے عمارت پر چڑھتے ہوئے دیکھ لیا اور بمشکل خودکشی سے باز رکھ کر نیچے اُتار لایا۔ مگر ۳ر مارچ کی منحوس صبح ——— لوگوں نے دیکھا۔ اسی عمارت کے نیچے نندے کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ لوگ کہتے ہیں اسے محبت کی ناکامی نے خودکشی پر آمادہ کیا تھا ——— ! یہ خبر پڑھ کر میں سوچتی رہی کہ اب عشق کی دست درازی، جانوروں تک بھی جا پہنچی؟ میری تشخیص یہ ہے کہ اگر مرحوم بیل نے واقعی خودکشی کی ہے تو وہ "نروس بریک ڈاؤن" کا مریض تھا۔ اسے تجزیۂ نفس کی ضرورت تھی۔ کیونکہ ناکامیٔ عشق سے جو شخص بھی خودکشی کرتا ہے ظاہر ہے اس کی وجہ محبت نہیں ہوتی بلکہ اس کا اپنا دبا ہوا شدید غصہ ہوتا ہے۔ یہ کام ایک اعصابی ہی کر سکتا ہے۔ ویسے تو اسٹیکل نے بھی اسّی سال کی عمر میں خودکشی کی تھی مگر اس کی وجہ اُس کا فسادِ اعصاب نہیں تھا۔ خودکشی ہمیشہ غیر متوازن ذہنیت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ محبت انسان کو حیاتِ جاودانی بخشتی ہے، موت کے گھاٹ نہیں اُتار سکتی۔

چھ بجے آرٹ کونسل کا کھیل "مرا قائل" دیکھنے گئی۔ وہاں سے پونے دس بجے فارغ ہوئی۔ اور ہم تینوں ایڈیٹر "ہمایوں" ——— میاں بشیر احمد کے ہاں ڈنر پر چلے گئے۔ چونکہ وقت مقررہ سے دیر میں پہنچے تھے۔ اس لئے برآمدے میں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ ابھی مہمانوں نے کھانا شروع نہیں کیا تھا۔ پلیٹیں ہاتھ میں لئے کھڑے تھے۔ میرے اندر جاتے ہی بیگم گیتی بشیر احمد نے کہا کہ کئی مہمان نہیں آئے ہیں۔ نہ جانے لوگوں میں کیا مرض ہے کہ عین وقت پر ٹیلی فون کر کے معذرت چاہ لیتے ہیں۔ اس کے باوجود کمرۂ طعام مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ میاں بشیر احمد اور بیوی بشیر احمد (بقول شوکت تھانوی) کی خوش طبعی اور خوشدل مہمانوں کے قہقہوں نے غیر موجود مہمانوں کا خیال نہ آنے دیا۔

رات نہایت خنک ہے، بادل ہیں، گھٹائیں ہیں اور نہایت تند ہوائیں۔

۵ر مارچ ۵۷ء: رات کے کھانے سے بڑی دیر میں گھر لوٹی۔ آج ریڈیو والوں کو ایک افسانہ مکمل کر کے دینا تھا۔ چنانچہ عرشہ چمن پر بیٹھ کر تمام صبح لکھتی رہی۔ بارہ بجے کے قریب بلیوں کو لے کر سبزے پر چہل قدمی کرتی رہی۔ ایک بجے ہم تینوں مسٹر "کنڈاوالا" کے ہاں لنچ پر چلے گئے۔ دوپہر حسین اور روشن تھی۔ اور کھانے کی میز موسمی پھولوں سے آراستہ۔ وہاں مسٹر اور مسز چیمپین سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ صاحب ہالی وڈ سے "پاکستان" نامی فلم بنانے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ کھانے پر شاخِ نازک سی ایک جاپانی لڑکی سے بھی ملاقات ہوئی۔ اسے دیکھ کر بار بار باغ کی تیتری کا خیال آتا رہا۔ اس دعوت میں صرف امریکن اور جاپانی تھے۔

پونے تین بجے گھر واپس آئی پانچ منٹ باغ کے زینے پر کھڑی گہرے نیلے آسمانوں کو دیکھتی رہی۔ پھر افسانہ ختم کر کے روانہ کر دیا ؎

چھ بجے آرٹ کونسل کے کھیل "مرا قاتل" دیکھنے پھر چلی گئی۔ اس کھیل میں یاسمین بھی پارٹ ادا کر رہی ہیں۔ یاسمین نے پہلی ہی بار پارٹ ایسے رکھ رکھاؤ اور نفاست سے کیا ہے کہ ایک ایک ملنے والے نے بے حد تعریف کی۔ آج تماشائی بہت زیادہ تھے کہیں تو جگہ نہ ملنے کی وجہ سے واپس چلے گئے۔ وہاں سے سوا نو بجے فارغ ہو کر ہم تینوں وہیں سے سیدھے لیڈی عبدالقادر کے ہاں ڈنر پر چلے گئے۔ یہ کھانا انہوں نے اپنے بیٹے میجر جنرل آلطاف کے اعزاز میں کیا تھا۔ منظور قادر صاحب علیل ہیں۔ مگر اس کے باوجود مہمانوں کے درمیان ایک دیوان پر نیم دراز رہے اور باوجود بخار ہونے کے شگفتہ نظر آنے کی کوشش کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد بیگم منظور قادر انہیں معالج کی ہدایت پر آرام کرنے کے لئے اندر لے گئیں۔ امتیاز، لیڈی عبدالقادر اور بیگم میجر جنرل اعظم خاں معاشرتی و ثقافتی موضوع پر اتنی دیر باتیں کرتے رہے کہ نصف شب گذر گئی۔ تینوں کمرے مہمانوں سے بھرے ہوئے تھے ؎

رات ایک بجے واپس آ کر روزنامچہ لکھ رہی ہوں۔ سردی کی وجہ سے تمام تیلیاں لحافوں میں محوِ خواب ہیں، اور آسمان کے مشرقی حصے پر ایک سیارہ بڑی تیزی سے چمک رہا ہے ؎

۶ر مارچ ۵۷ء: آج صبح "بس سٹاپ" فلم دیکھا۔ یہ میرا اس سال کا اٹھارواں فلم ہے۔ پونے چار بجے گنیرڈ کالج گئی جہاں امتیاز کو چھوٹی لڑکیوں کا ڈرامہ دیکھ کر رائے زنی کرنی تھی۔ لڑکیوں نے اپنی بساط بھر اچھا کھیل کیا۔ پونے چار بجے "چین پاکستان دوستی" کی استقبالی چاء میں گئی جو آرٹ کونسل کے خوبصورت سبزہ زار پر تھی۔ ساڑھے پانچ بجے "نپولین فینٹاسی" فلم دیکھنے چلی گئی۔ کئی ریویو اس کی تعریف میں پڑھ چکی تھی۔ پیشکش اچھی معلوم ہوئی۔ مگر جو کچھ دکھایا اس کی تہہ تک پہنچنے سے قاصر رہی۔ رات کو کھانے کے بعد دوسری منزل کی چھت پر بیٹھی تارے گنتی اور کانپتی رہی۔ کیونکہ رات بعید خنک تھی۔ اندھیرے درختوں پر پرندے بدخوابی کی وجہ سے کبھی کبھی کراہنے لگتے تھے ؎

۷ر مارچ ۵۷ء: بہاروں کو کیا ہو گیا ہے؟ کسی طرح آنے ہی نہیں پاتیں۔ میں تقریباً ہر صبح اس امید میں اٹھتی اور صحنِ گلستاں میں جاتی ہوں کہ شاید بہار کی گرم ہواؤں کا کوئی جھونکا موتیا اور یاسمین کی کلیوں کو آج شگفتہ کر دے گا۔ مگر سرمائی سرد؛ بے لطف ہوائیں کلیوں کو کھل کر پھول نہیں بننے دیتیں۔ آج ساتویں مارچ ہے مگر نہ کہیں کوئل کی کوک سنائی دیتی ہے نہ کسی ابابیل کی کوئی سیٹی! — ہاں پرسوں شام کی بات ہے کہ پائیں باغ میں نارنجی گلاب کے عقب میں ایک بلبل سرنگوں نظر آئی تھی وہ بھی میری طرح بادِ مخالف کی شاکی معلوم ہوتی تھی ؎

حسبِ معمول صبح کا سارا وقت عرشۂ چمن پر تحریری کام میں گذر گیا۔ اِن دنوں میں مسودے ٹھیک کر رہی ہوں ؎

آج آسمان کی رنگت گہرے کاسنی رنگ کی رہی جو عموماً آخری خزاں میں رہتی ہے۔ البتہ شام کے قریب اس کا رنگ ارغوانی ہو گیا تھا۔ جو اکثر ابتدائی بہاروں میں ہوا کرتا ہے ؎

آج میں نے کھانے پر سرو بالائی بھی کھائی۔ اس کے بعد باغ کے زینے پر بیٹھ کر دیوانِ غالب پڑھتی اور یوڈی کولون سونگھتی رہی۔ پھر چاء پی کر چند منٹ صحنِ گلستاں میں بلبل کی نغمہ سرائی سنتی رہی۔ چار بجکر دس منٹ پر "فاربیڈن" فلم دیکھا۔ سوا چھ بجے آرٹ کونسل کے مشاعرے میں چلی گئی۔ جب فیض احمد فیض صاحب نے اپنی نظم پڑھی اور اس کے بہترین مصرع پر پہنچے تو میرے پیچھے سے چند خواتین نے "ویری گڈ۔ ویری گڈ" کہہ کر انہیں داد دی۔ اس جدید طرز کی داد کو سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ آئندہ ہمارے مشاعروں میں شاعروں کے آگے شمع کی بجائے ٹیوب لائٹ پیش کی جائے گی! زہرہ نگاہ نے بال ترشوا دیئے ہیں۔ مجھے پسند آئے۔ مگر راجہ غضنفر علی خاں صاحب نے جھک کر مجھ سے سرگوشی کی۔ "شاعرہ نے بال کیوں ترشوا دیئے؟" میں نے کہا عورتیں معمہ ہوتی ہیں۔ اُن کی باتیں وہی جانیں ؎

رات کا کھانا گھر پر کھایا۔ پھر عرشۂ چمن کے تاریک گوشے میں دیر تک بیٹھی تاروں میں کھوئی سردی سے کانپتی رہی ؎

۸ر مارچ ۵۷ء: آج کا دن یوں ہی گذر گیا——

پونے ۳ بجے کے قریب باغ کی راہ سے دو گلابی پروالی تیتریاں اکھٹی رقص کرتی ہوئی اندر آئیں اور لمحہ بھر میرے سامنے ناچ کر باہر نکل گئیں—— اب نہ جانے یہ بچھڑی ہوئی کب ملیں! کیونکہ زندگی کی رقص گاہ نہایت پیچیدہ اور طویل ہے۔!

۹ر مارچ ۵۷ء: آج صبح "بیٹوین ہیون اینڈ ہیل" فلم کا سنسر شو دیکھا۔ واپس آکر مسودے ٹھیک کرتی رہی۔ ایک کہانی مکمل کر کے الماری میں بند کر دی۔ پھر باغ کی سیڑھی پر بیٹھ کر "پیکاسو" کی تصاویر والی کتاب دیکھتی اور پڑھتی رہی۔ گذشتہ مہینے میں تجریدی فن کی تصاویر کی ایک نمائش میں گئی تھی جو مجھے بہت پسند آئی۔ جدید آرٹ اور اس کے بیباک شوخ رنگ بڑے دل آویز ہوتے ہیں۔ جدید فن کو دیکھتے ہی اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ یہ مصوّر کے مدفون اور خفیہ جذبات کا اشارتی اظہار ہے۔ اس طرح تجریدی آرٹ دیکھنے والے کے لئے زیادہ دلچسپ ہو جاتا ہے۔ فرائڈی نفسیات ہمیں اپنی ذہنی تندرستی کی سلامتی کے لئے اپنے دبے ہوئے جذبات و احساسات کے اظہار کا بڑی شدت سے مشورہ دیتی ہے اور خفیہ جذبوں کی اظہاریت کے لئے فن سے زیادہ اور کیا چیز موزوں ہو سکتی ہے! انسان کے دبے ہوئے نامعلوم خوفناک ارادوں اور جذبوں کا ایک حسین اظہار اس کا فن ہوتا ہے۔ دوسری بات جو اس جدید آرٹ کو دیکھ کر محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مصوری محض فطرت کی نقالی نہیں بلکہ فن کار کی انفرادیت کا اعلان ہے۔ زندگی جھوٹ بول کر بھی گذاری جا سکتی ہے مگر فن میں جھوٹ نہیں چل سکتا۔ اس میں خالص صداقت کی ضرورت ہے اور فن میں صداقت اسی وقت آتی ہے جب اس میں فن کار کی شخصیت، اس کے فلسفے، اور اس کی انفرادیت کی شدید اظہاریت ہو۔

آج دیر تک میں دیوانِ غالب بھی پڑھتی رہی اور سر دھنتی رہی ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے!

سوال یہ ہے کہ آج اس قسم کی بیخودی کس کو نہیں چاہیئے!

شام کو "سیمی رمیس" فلم دیکھا توقع تھی کہ مصر قدیم کا یہ افسانہ لذیذ ہوگا مگر مایوسی ہوئی۔

۱۰ر مارچ ۵۷ء: آج سنسر شو میں امتیاز کا جانا لازمی تھا۔ اس لئے صبح کے وقت "آئی ڈائیڈ تھاؤزنڈ ٹائمس" دیکھا۔ واپس آکر مسودات درست کرتی رہی۔

آج شام ہم نے اُن تمام اداکاروں کو چائے اور موسیقی پر مدعو کر رکھا تھا جنہوں نے آرٹ کونسل میں امتیاز کے کھیل "مرا قاتل" اور "باکس اینڈ کاکس" میں کردار ادا کئے تھے۔ یہ سب اداکار گورنمنٹ کالج اور دو ایک اور کالجوں کے طالبعلم ہیں۔ ان کے علاوہ مسٹر جسٹس ایس۔ اے رحمان (صدر آرٹ کونسل) اور مسٹر خلیل (سکریٹری) بھی شریک محفل رہے۔ بیس پچیس لوگ تھے۔ "مرا قاتل" کے پروڈیوسر مسٹر صفدر میر (پروفیسر گورنمنٹ کالج) بھی شریک رہے۔ اُنکی شرکت سے ظاہر ہوا کہ طوفان گذر چکا۔ لہذا ہم سب کو خوشی ہوئی۔ مہمانوں میں سے کئی نے گا کر سُنایا۔ یاسمین نے کلاسیکی موسیقی آج دل لگا کر یوں گائی کہ مجھے کلاسیکی موسیقی پر جو اعتراضات تھے وہ چند لمحوں کے لئے بالکل دور ہو گئے۔ بہار کی جنوں انگیز شاموں میں بہترین موسیقی کو سُن کر عام طور پر مجھے مالیخولیا کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

شام ہوشربا تھی۔ اداکار مہمان خوشدلی سے ہنس بول رہے تھے۔ بعض مہمان تو بڑی دیر تک ٹھہرے رہے۔ ان سب کے جانے کے بعد ساڑھے نو بجے میں ایک لمبی ڈرائیو کو چلی گئی۔ واپس آکر بلیوں کو ملاقات کی گولیاں منگوائیں۔ اب ڈیڑھ بجے کے قریب یہ روزنامچہ لکھ رہی ہوں — ابھی تو مجھے کچھ دیر تاروں کی دنیا میں بھی جانا ہے۔

۱۱ر مارچ ۵۷ء: صبح اُٹھتے ہی خواب گاہ کی کھڑکی سے جھانک کر نیچے صحن گلستاں کو دیکھا۔ بائیں باغ میں گلابی۔ زرد۔ نارنجی اور تربوزی رنگ کے بیسیوں گلاب قہقہے لگاتے نظر آئے۔ لیموں کی کیاریوں میں لبی ہوئی چینی کی چائے پی۔ اور بلیوں کو لیکر تختۂ گلاب کے قریب چہل قدمی کرتی رہی۔ پھر عرشۂ چمن پر بیٹھ کر تحریری کام میں مصروف ہو گئی۔ آج اعصاب تہہ و بالا سے ہیں۔ اس لئے کام میں دل نہ لگا۔ لہذا بالاخانے پر چلی گئی اور خواب گاہ کے دریچے میں بیٹھکر "شاہکار تصاویر" دیکھتی رہی۔ بڑی خوبصورت کتاب ہے۔ اس میں ایک تصویر پر مری نظر جم کر رہ گئی۔ تصویر کے نیچے امتیاز نے یہ تشریح لکھی ہے:۔

"قدیم مصر کی دیواری تصاویر میں کسی بلی کی تصویر زندگی سے ایسی بھرپور نہیں جیسی "کرسی تلے بلی" ہے۔ بلی ایک نشستین کرسی کے پائے سے بندھی ہے۔ کھانے کی طشتری اس کی پہنچ سے باہر ہے چنانچہ جھنجھلاہٹ اور چڑچڑاہٹ کے مارے بدن کا ایک ایک رُواں کانٹے کی طرح کھڑا ہے۔ مصوّر کو ٹھیک علم نہ تھا کہ بلی کی دُم کہاں ہوتی ہے؟ اس نے دو بار دُم لگانے کی کوشش کی لیکن دونوں ہی بار ناکام رہا۔"

یہ پڑھکر میں نے غور سے تصویر دیکھی تو معلوم ہوا کہ بلی کی دُم مصور نے پہلے تو بلّی کے نیچے لگانے کی کوشش کی تھی پھر جب اسے اپنی صریح غلطی کا احساس ہوا تو سوچ سوچ کر اور اپنی طرف سے صحیح جگہ منتخب کر کے کمر کے عین اوپر لگا دی! ــــ ع "اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا" !! عہد ماضی کے اس گمنام مصری مصور کی اس انجانیت پر پیار آنے لگا۔ جو بھی اس تصویر کو دیکھے گا اسے مصور کے بھولپن پر پیار آئے گا۔ اور دُم کی بے جا جگہ دیکھ کر ہنسی بھی آئے گی اور تعجب بھی ہوگا۔
اس کتاب میں ایک سیاہ و زرد سیاہی بلّی کی تصویر دیکھی جس کی آنکھیں بہار کے آسمانوں جیسی گہرے فیروزے رنگ کی ہیں۔ ایسی ہی آنکھیں میرے بلے عنبر کی ہیں۔

چھ بجے "بلیک ماسک" فلم دیکھا۔ رات بزمِ اقبال کے ڈنر میں چلی گئی جو ایران کی ڈاکٹر کاظمی کے اعزاز میں دیا گیا تھا۔ میزبان خلیفہ اور بیگم عبدالحکیم تھے۔ بہت سے علماء موجود تھے۔ چونکہ ڈاکٹر کاظمی طبیب ہیں۔ اس لئے بعض ڈاکٹر صاحبان بھی مدعو تھے۔ ڈاکٹر کاظمی حسین اور دلآویز خاتون ہیں۔ اور پاکستان کی شیدا ہیں۔ دیر تک میں اُن سے ایران کے افسانہ نگاروں کے متعلق پوچھتی رہی۔ کھانے کے بعد تقریریں ہوئیں۔ اخیر میں خاتون موصوف نے بھی انگریزی اور فارسی میں مختصر مگر معقول تقریر کی۔
واپسی میں رات نہایت خیال انگیز ہوگئی تھی۔ خنک ہوائیں تھیں اور کالی گھٹائیں۔ کہیں کہیں بجلی بھی چمک جاتی تھی۔ واپس آکر ہم نے کافی پی۔ بلیوں کو دودھ دیا۔ اور جعفر طوطے کو ایک امرود۔

۱۲ مارچ ۵۷ء: صبح سے آج مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے چاروں طرف پھول کھلے ہوئے ہیں ــــ! آج تمام دن مالیخولیا کی سی کیفیت چھائی رہی۔ یہ سب بہاروں کا اثر ہے! میرے دونوں کبوتر "سُنبل و ریحاں" کل شام سے لاپتہ ہیں۔
صبح کے وقت حسبِ معمول عرشۂ چمن پر تحریری کام کرتی رہی مگر طبیعت بے چین سی ہوگئی تو اُٹھ کھڑی ہوئی۔ نیچے کی منزل میں چلی گئی۔ گلدانوں کے پانی کی مقدار ٹھیک کی اور اُن میں ایک ایک جن اسپرین کی ٹکیہ ڈالی۔ پھر تازہ پھول کاٹ کر دریچوں میں لگائے۔ مگر طبیعت کا رجحان قنوطیت کی طرف مائل رہا اور خیالات جنوں انگیز! لہٰذا سکونِ اعصاب کے لئے یوڈی کلون سونگھتی رہی اور سبز آسمانوں کے نیچے چپ بیٹھی کتاب پڑھتی رہی۔
آج لنچ پر چند دوستوں کو مدعو کر رکھا تھا۔ لہٰذا ایک بجے کے قریب تیار ہو کر نیچے اُتر آئی۔ بہاریں ہیں اس لئے میں نے کھانے کی میز پر آڑو کے شگوفوں کے لاتعداد گچھے جگہ جگہ رکھدیئے اور سرخ گلاب کی پتیوں کی نو میں نے بارش کر دی۔ پھولوں کی اس افراط کے باوجود میرے دو مہمانوں کی طبیعتیں خواہ مخواہ اخلاقی تفریط پر مائل رہیں۔ اور عین کھانے پر ایک خاص موضوع پر کج بحثی شروع ہوگئی۔ دونوں حضرات اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ طبقے کے چراغِ محفل سمجھے جاتے ہیں۔ مگر کج بحثی کا علمیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ نہ اس کی وجہ آدمی کی جہالت ہوتی ہے۔ بلکہ اس کی بنیادی وجہ آدمی کا اندرونی جذباتی انتشار ہوتا ہے۔ اس لئے ہم اکثر پڑھے لکھے لوگوں کو بھی اُلٹی باتیں کرتے اور کج بحثی میں مبتلا دیکھتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ ہماری معاشرت میں بے شمار ہیں۔ ان کے جذبات کی تحت الثریٰ میں جھانک کر دیکھیئے تو کیا نظر آئے گا ــــ؟ ایک تلاطم بے ترتیب! ــــ اس نامعلوم بے ترتیبی سے جو بے چینی اُن کی طبیعت میں پیدا ہوتی ہے اس کو ترتیب دینے کی کوشش میں اکثر اُن لوگوں کی علمیت کی کشتی ڈگمگاتی نظر آتی ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنے اس اندرونی انتشار سے آگاہ اور محتاط رہنا چاہیئے۔ اِس موضوع پر کبھی بحث نہیں کرنی چاہیئے جس کے متعلق کوئی معلومات نہ ہوں۔ ایک عالم اور ماہرِ فن کا طور طریق طالب علمانہ ہوتا ہے، استادانہ نہیں۔ آج کے دونوں حضرات اندر سے سخت کھوکھلے تھے اور اس پر ستم انداز استادانہ رکھتے تھے۔
آج کی دوپہر کا رنگ گلابی تھا۔ شام کے قریب نیلا ہوگیا ــــ شام کو فلم "موبی ڈک" دیکھا۔ جس کتاب سے یہ فلم بنا ہے وہ میں نے نہیں پڑھی۔ یہ کتاب امریکی کلاسکس میں شمار ہوتی ہے۔ فلم اکتا دینے والا ہے۔ گریگری پیک کے ڈاڑھی لگی ہوئی تھی جس سے اور وحشت ہوئی۔ رات کا کھانا گھر ہی پر کھایا اور صحنِ گلستاں میں بلیوں کو لے کر ٹہلتی رہی۔ آج طبیعت پر عجیب وارفتگی چھائی رہی۔

۱۳ مارچ ۵۷ء: شکر ہے کل طوفان آنے کے آثار تھے۔ آج اس کے گذر جانے کی علامات ہیں! آج 'سنبل و ریحاں' واپس آگئے۔ شام کو فلم "شارٹ گراس" دیکھا۔ آج آسمان بنفشئی رنگ کا تھا۔ شام کے وقت گہرے سبز رنگ کا ہوگیا۔ جس پر کاسنی رنگ کے لکۂ ہائے ابر منتشر رہے۔

۱۴ مارچ ۵۷ء: حسبِ معمول تمام صبح عرشۂ چمن پر بیٹھ کر تحریری کام کرتی رہی۔ تقریباً تمام مسودے درست کر لئے۔ کام کی رفتار تیز رہی تو جلد فارغ ہو جاؤں گی۔ اور دوسرا افسانہ لکھنا شروع کر دوں گی۔
آج کا دن بھی سرد تھا جس کی وجہ سے کئی کلیاں مکمل کر پھول نہ بن سکیں۔ آفتابی کرنوں کے چومنے کے بعد ہی تو موتیا کی کلیاں کھلتی ہیں۔ موسم کی اس بےجا

بے وقت کی خنکی نے بیزار کر رکھا ہے۔ مجھے خنکی نہ انسان میں اچھی لگتی ہے نہ موسم میں!

کھانے کے بعد خواب گاہ کے دریچے میں بیٹھ گئی۔ دو ہزار سال پہلے کے ایک گھوڑے کو تکتی اور سر دُھنتی رہی۔ اگر حسن اور فن ایک ہی چیز ہے تو پھر کہنا پڑتا ہے کہ حُسن کو ابدیت حاصل ہے۔ عظیم فن پارہ یعنی حُسن کبھی فنا نہیں ہوتا۔ "شاہ کار تصاویر" میں ایک گھوڑے کے سنگین مجسمے کی تصویر درج ہے جسے ایک سنگ تراش نے دو ہزار سال پہلے تراشا تھا۔ تصویر کے نیچے کی عبارت تصویر کی طرح حسین ہے۔ لکھا ہے :-

"شاعروں نے بے شمار کتابیں حُسن کی تعریف میں لکھی ہیں کہ کس طرح وقت نہ حسن کو گھنا سکتا ہے نہ مٹا سکتا ہے۔ اس کا پیار اپن بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ دو ہزار تین سو سال گذرے ایک گمنام یونانی سنگ تراش نے گھوڑے کا یہ مجسمہ بنایا تھا۔ کیسے کمال کا جسم ہے! اس پہ یہ چنچل پن! ہوا کی بے فکری سے قدم اُٹھاتا ہوا جیسے زمانے میں بڑھا آ رہا ہے!"

تصویر دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ کائنات کی اس مہیب تاریکی میں عقیدت و محبت کی شمع لے کر اس پیارے یونانی کو ڈھونڈوں جس کے جسم کو ہر چند اجل نے عرصہ ہوا نابود کر دیا ہے۔ مگر یہ تراشیدہ فن پارہ آج دو ہزار سال بعد بھی اس کی زندۂ جاوید انفرادیت اور لافانی شخصیت کو ہمیشگی بخش رہا ہے۔ اس فانی دنیا میں ہمارا جسم نہیں ــــ بلکہ ہماری شخصیت اور شخصیت کا فلسفہ ہمیں زندہ رکھتا ہے۔ آج سقراط زندہ ہے۔ افلاطون زندہ ہے۔ ارسطو زندہ ہے۔ فرائڈ اور جیمز زندہ ہیں۔ ہماری روزمرّہ کی زندگی میں اُن کے فلسفے کی داخلیت، اُن کی حیاتِ ابدی کی شاہد ہے۔

آج راجہ غضنفر علی خاں کے ہاں ڈپٹی ہائی کمشنر انڈیا مسٹر اور مسز راؤ کے لئے الوداعی ڈنر تھا۔ ابتدائی بہاروں کی حسین رات اپنے اندر ایک داستانیت لئے ہوئے تھی۔ راجہ صاحب کی نئی کوٹھی کے تقریباً تمام کمرے بقعۂ نور بنے ہوئے تھے۔ مہمان ایوانِ ملاقات کے علاوہ باغ کی شہ نشینوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ یاسمین نے میزبان کی خواہش پر دو دُھنیں گا کر سنائیں۔ مہمانوں میں ڈاکٹر خان صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ انہیں نیند آ رہی تھی۔ اور ان کے متعلق میرا خیال تھا کہ انہیں سوائے سیاسیات کے اور کسی شے سے دلچسپی نہ ہوگی۔ مگر عجیب بات ہے کہ وہ یاسمین کی کلاسیکی دُھن سے متاثر ہو گئے۔ نصف شب کے گذرنے پر باغ کے اندھیرے پر زرد رنگ کا چاند نمودار ہوا۔ مہمانوں کے ہجوم سے ہٹ کر کسی نہ کسی طرح میں نے اسے دیکھ ہی لیا۔ دو ایک مہمانوں کو دکھانے کی کوشش بھی کی۔ مگر مرد موجودہ سیاسیات پر نالاں اور رائے زنی کر رہے تھے اور خواتین ساڑھیوں کی قیمتوں پر! دونوں قابلِ رحم تھے۔ بہتر تھا کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے مکروہاتِ دنیوی سے کنارہ کش ہو کر چاند کی پرستش میں محو ہوتے جسے دیکھ کر آج ڈائنا کا خیال بے اختیار آ جاتا تھا کیونکہ آج وہ اس قدر درخشاں تھا جیسے نور کا دیوتا ــــ! چاند دیکھ کر جب میں دوبارہ ایوانِ ملاقات میں واپس آئی تو راجہ صاحب فیض احمد فیض صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کر رہے تھے۔ اس پر فیض صاحب نے حسبِ معمول اپنی بے حد دھیمی آواز میں فرمایا، "میں اپنی چیزیں لوگوں کو سناتا ہوں یا دوستوں کو۔ مگر جو خواتین و حضرات موجود ہیں انہیں نہ "لوگ" کہا جا سکتا ہے نہ سب "مرے دوست" ہیں لہٰذا مجھے معذور سمجھئے۔" یہ سن کر میں پھر چاند دیکھنے میں محو ہو گئی۔

رات کے ڈیڑھ بجے واپس آ کر اب یہ چند سطور لکھ رہی ہوں۔ ابھی کافی ہے ــــ بلّیاں ہیں ــــ تارے ہیں ــــ ان تین چیزوں سے فارغ ہو کر سو سکوں گی۔

۲۳ مارچ ۱۹۵۷ء - آج یوم جمہوریہ ہے! ــــ میں تمام دن بادلوں کو دیکھتی رہی۔ رنگین اور درخشاں ٹکڑے ابرِ سمند جیسے گہرے نیلے آسمانوں پر جانوروں، چلتے ہوئے جہازوں اور اپنے کئی جاننے والے دوستوں اور رشتہ داروں کی شکل اختیار کرتے رہے اور ہواؤں میں تیرتے رہے۔ میں چمن کے بالاخانے کی برنیم دراز ہو کر تمام وقت بادلوں کا نظارہ کرتی رہی۔ یادداشت کے لئے لکھتی ہوں۔ گیارہ بجے کے قریب ایک بادل کا ٹکڑا بالکل شوکت تھانوی کی شکل اختیار کر گیا۔ فرق اتنا تھا کہ اس کے منہ میں پان نہیں تھا۔ میں بے اختیار ہنس پڑی۔ پھر وہ گلفام (مرا بلا) بن گیا۔ پھر سوسن (بلّی) بن کر رہ گیا۔

(باقی صفحہ ۱۲۵ پر)

نقوشِ بہار

ضمیر اظہر

بہار کا مشک بیز پیکر
وہ اُس کی نغمہ نواز، ساحر، فسانہ گو، جھولتی جوانی
کہ جیسے فردوس کی کہانی،
سمن سفید و گداز اُس کے
وہ سرخ تازہ گلاب اُس کے
کچھ اس طرح شیشۂ تخیل میں نقش اپنا جما گئے ہیں
بہار اب تک نظر کی ساکت فضاؤں میں لہلہا رہی ہے

•

ربابِ دوراں کا راگ بدلا
عروسِ لیل و نہار کی مسکراہٹیں کھو گئیں اچانک فسانہ بن کر کسی خلا میں
سکوت کے غار میں بھٹک کر فنا ہوئیں حال کی صدائیں
چلیں کچھ ایسی شریر، گستاخ، تیز، تلوار سی ہوائیں
بکھر گئے شاخ شاخ سے ٹوٹ کر گلوں کے حسین ڈیرے!
جھلس گئے کیسے کیسے چہرے!!

•

خزاں کا سکہ ہوا ہے جاری
چمن چمن ہے جمود طاری
شجر شجر برف سرنگوں ڈالیوں پہ چپ چاپ سو رہی ہے
ہوا کہیں جھاڑیوں میں منہ کو چھپائے نوحے سنا رہی ہے
غموں کا جادو جگا رہی ہے
میں پھر بھی ہوں مطمئن کہ دل میں
کوئی حسین شے لبادۂ ہفت رنگ میں مسکرا رہی ہے
بہار اب تک نظر کی ساکت فضاؤں میں لہلہا رہی ہے

رہ و رسمِ وفا

شاہد عشقی

نہ تو ہے آج نم آلود کوئی گوشۂ چشم
نہ کسی دستِ نگاریں کا سہارا حاصل
اس بھرے شہر میں تنہائی کا شکوہ ہے مجھے
آج اک لفظِ محبت کو ترستا ہے یہ دل

نقش جو چھوڑے تھے آشفتہ نوائی نے مری
اجنبی قدموں سے دھندلائے ہوئے ہیں کب سے
کل جہاں میرے لئے سارے دریچے وا تھے
وا نہیں آج وہاں میرے لئے ایک بھی در

یوں بھی تنہائی ہر انساں پہ گراں ہوتی ہے
اور پھر طرفہ ستم یہ ہے کہ شاعر ہوں میں
چند یادیں ہیں جو سینہ سے لگا رکھی ہیں
ورنہ خود اپنے وطن میں بھی مسافر ہوں میں

ان ہی یادوں سے فروزاں ہے شبستانِ خیال
قلبِ انساں میں حرارت ہے ان ہی یادوں سے
پھر بھی یادوں کے سہارے تو نہیں کٹ سکتی
زیست ہر چند عبارت ہے انہی یادوں سے

زندہ انسانوں کی بستی کا ہی اک فرد ہوں میں
پھر بھی ان لاشوں کو کاندھوں پہ لئے پھرتا ہوں
کہیں مسموم نہ ہو آہوں سے بستی کی فضا
اس لئے اپنے لبوں کو بھی سئے پھرتا ہوں

تھا مرے دل میں بھی اک چاہ کا ارماں، لیکن
تنگ ہے اہلِ محبت پہ بہت عرصۂ زیست
آج شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس
گھٹ کے رہ جاتا ہے سینہ میں ہر اک نغمۂ زیست

آج اخلاص و وفا جنسِ گراں مایہ ہیں
چشمِ نم تک مری آسکتا ہے دامن کس کا
کون ہوتا ہے شریکِ غمِ تنہائی دل
اٹھ گئی جبکہ زمانے سے رہ و رسمِ وفا

بنگلا افسانہ:

رقیہ

سید شمس الحق

مترجمہ: ابو سعید نورالدین

الگنی میں ٹنگی ہوئی ایک بڑی اور تین چھوٹی چھوٹی آرسیاں رہنے کے باوجود رقیہ آج کل آرسی کے بغیر ہی کنگھی کرتی اور چوٹی گوندھتی ہے ؎
چار سال کی بچی آلو جب دوسری منزل پر چھپی آپا کے پاس گئی ہوئی تھی اور آلو کا باپ بھی اس وقت تک دفتر میں تھا، اور کالونی کے آسمان پر سورج اتنا پہنچ چکا تھا کہ تقریباً چار بجے کا عمل ہو، اس وقت رقیہ اکیلی خالی گھر میں فرش پر بیٹھ کر کنگھی کر کے چوٹی گوندھ رہی تھی۔ یہ وقت گویا اس نے چوٹی گوندھنے ہی کے لئے الگ کر رکھا تھا۔ اس کے بعد اپنے شوہر کے آنے سے پہلے ہی، وہ اٹھ کر رسوئی میں چلی گئی، بہت دیر تک ناشتہ تیار کرتی رہی، شام ہونے سے بہت پہلے ہی رات کے لئے ترکاری کاٹنے بیٹھ گئی۔ شوہر کے آنے کے بعد اس نے آلو کو بلایا، پھر اس کے ہاتھ کھانا بھیج کر پکانے میں مصروف ہو گئی۔ رات کو سونے کے لئے جب کمرے آئی تو آلو گہری نیند سو رہی تھی، اور حمید کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ جونہی اس نے پاؤں کی آہٹ پر آنکھیں اٹھا کر دیکھا رقیہ ساڑھی کے آنچل سے منہ پونچھنے کا بہانہ کرنے لگی اور کہا:

"تم اور کچھ دیر پڑھو گے کیا؟"

"ہاں، کچھ ایسا ہی خیال ہے"

رقیہ نے جواب کا انتظار نہ کیا، پاس سے گذر کر بستر پر آکر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر بولی:

"لیکن رات بہت ہو گئی ہے"۔

"معلوم ہے"۔ حمید کے جواب میں کچھ غصہ کی آمیزش تھی۔ پھر خاموشی۔

"روشنی چبھ رہی ہے آنکھوں میں"۔ اس قدر آہستہ اور مدھم آواز میں اس نے یہ بات کہی کہ اچھی طرح سمجھ ہی میں نہیں آئی، لیکن حمید کا مزاج بگڑ گیا۔ بولا

"ہاں ضرور لگتی ہوگی۔ اتنا بڑا شیڈ لگا رکھا ہے بتی پر، پھر بھی روشنی آنکھوں میں چبھتی ہے، بڑے تعجب کی بات ہے"۔

اس نے کتاب بند کر کے منہ پھرا کر دیکھا تو رقیہ اُدھر منہ کر کے تکیہ میں سر چھپا کر لیٹی ہوئی تھی اور اس کا سارا جسم بل کھا کر ذرا سا ہو گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بستر سے چمٹ گئی ہے۔ حمید کو بتی بجھا دینے کے بغیر کوئی چارہ نہ رہا ؎

اسی طرح ہر روز کوئی نہ کوئی بات ہوتی ہی رہی۔ پچھلے آٹھ مہینہ سے روز بروز کشیدگی پیدا ہوتی رہی بڑھتی رہی۔ رقیہ کو کبھی کبھی یہ خوف ہونے لگا کہ کسی دن اس کا بیڑا غرق نہ ہو جائے، اندیشہ ہونے لگا کہ اس کی زندگی میں کہیں خلل نہ پیدا ہو جائے۔ یہی اندیشہ مہیب شکل اختیار کر کے اس کو دباتا اور ڈپٹتا رہا۔ رقیہ کو ایک دن کی بات اب بھی یاد پڑتی تھی۔ کوئی پانچ مہینہ پہلے کی بات ہے، شام کے تھوڑی دیر بعد حمید کا چھوٹا بہنوئی افسر آیا ہوا تھا، جب حمید خود اپنے ہاتھ میں کھانے کی طشتری اور چائے کی پیالی لے کر گھر میں داخل ہوا تو اس کو تعجب ہوا اس نے پوچھا بھابی کہاں ہیں؟

"کیوں؟ اندر ہے"۔

"پھر بیمار پڑ گئیں کیا؟"

"ہاں، کچھ بخار چڑھ گیا ہے"۔

حمید اس روز جھوٹ بولنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ہزار کوشش کے باوجود وہ رقیہ کی ضد نہ توڑ سکا۔ رقیہ اندر جانا نہیں چاہتی تھی۔ دروازہ کے پاس کان لگا کر وہ کھڑی تھی۔ حمید کا جواب سن کر اپنے آپ کو مجرم محسوس کرتے ہوئے بھی اس نے اس روز اطمینان کا سانس لیا تھا، لیکن مصیبت اتنی جلدی ٹلنے والی نہ تھی۔ پھر سوال ہوا:

"کچھ بخار چڑھ گیا ہے؟ تو اس کمزوری میں یہ اور خطرہ کی بات ہے۔"

اس کے جواب میں حمید شاید ہنسا تھا۔

"نہیں نہیں ہنسنے کی بات نہیں۔ چلیئے نا اندر دیکھ آئیں۔"

اس کے بعد جو گذرا تھا، اس سے رقیہ کا مرنا ہزار درجہ بہتر تھا۔ افسر کے اندر جانے کے لئے دروازہ کا پردہ اٹھاتے ہی ان کا آمنا سامنا ہو گیا۔ اس کو یہاں سے بھاگ جانے کے لئے ایک لحہ بھی مہلت نہ ملی۔ صرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر افسر کی طرف دیکھتی رہی۔ افسر بھی جلدی میں کچھ سمجھ نہ سکا۔ گویا رقیہ اندر آئے گی، رقیہ کے اسی وقت گھر میں آنے کی بات ہو رہی تھی۔ یہ سوچ کر وہ دائیں جانب کچھ ہٹ کر کھڑا ہو گیا راستہ دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ کمرہ کی روشنی، جو اب تک پردہ کی وجہ سے رکی ہوئی تھی، جا کر رقیہ کے چہرہ پر پڑی۔ گویا ایک لحہ میں ایک سیاہ پردہ اٹھ گیا۔

کچھ اچھی طرح یاد نہیں پڑتا تھا اس کو جب بھاگ کر سونے کے لئے وہ گھر میں آن چھپی تو وہ رو رہی تھی۔ ڈھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد حمید گھر میں آکر داخل ہوا۔ بہت دیر تک کوئی بات نہ کی۔ اس خاموشی نے اس کو گویا اور مجبور کر دیا۔ اس کو ڈر ہوا حمید بھی شاید اس کو دور ہٹا رہا ہے۔ ایسی ایک گونگی تاریکی کی گہرائی کی طرف دھکیل دینا چاہتا ہے، جہاں صرف ایک خطرناک تنہائی ہے۔ اگر وہ اس وقت اس کو نام لے کر بلاتا، تو وہ اس کے پاؤں پڑتی، اور رو رو کر دریا بہا دیتی۔ واقعی حمید نے اس وقت اس کو بلایا تھا۔ "رقیہ"

لیکن اس کی آواز میں غصہ کی آمیزش تھی، اسی لئے رقیہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ اس کا سارا جسم کانپ اٹھا تھا۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے، بتاؤ تو؟"

وہ کیا بتا سکتی تھی۔ حمید نے پھر کہا:

"اس طرح لوگوں کو ہنساؤ گی تم کبھی میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آیا تھا۔ چھی چھی چھی۔"

اس کے بعد کرسی کھینچنے کی آواز سنائی دی۔ شاید حمید بیٹھ گیا تھا۔

یہ صرف تم ہی پر نہیں گذرتی، کتنے ہی لوگوں پر گذرتی ہے!"

ہاں، اس سے رقیہ کا مر جانا ہی اچھا تھا۔

بڑی آرسی دیوار کے نیچ بیچ میں ٹنگی ہوئی ہے۔ دروازہ پر آکر کھڑے ہونے سے پوری تصویر منعکس ہوتی ہے اور اس کا فریم اس قدر خوبصورت بنا ہوا ہے کہ اس سے منعکس شدہ چہرہ پر فریم کئے ہوئے چہرہ کا دھوکا ہوتا ہے۔ اس کی طرف دیکھتے ہی رہنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ آرسی حمید نے اس کو شادی کے بعد دی تھی اور دوسرے دن کہا تھا۔ "تمہیں اس وقت اس کے علاوہ اور کچھ دینا تو نازیبا ہوتا، کم سے کم پہلے تحفہ کے لحاظ سے۔ بازار کی سب سے اچھی آرسی میں تمہارے لئے لایا ہوں، ادھر آؤ۔"

اس کے بعد زبردستی اس کو کھینچ کر آرسی کے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔ رقیہ کو بڑی شرم لگ رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ بھاگ جائے، لیکن حمید نے اس کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ "واہ! آرسی کی طرف دیکھتے ہوئے بھی شرم آتی ہے؟ آنکھیں اٹھا کر دیکھو تو ذرا۔" پھر آنکھیں اٹھا کر دیکھتے ہی وہ ہنس پڑی تھی۔

کچھ دن ہوئے رقیہ نے اس پر پردہ ڈال دیا تھا۔ ہمیشہ پردہ پڑا رہتا تھا۔ کبھی کبھی حمید اس کے سامنے کھڑے ہو کر کنگھی کر لیا کرتا ہے۔ رقیہ کبھی اس میں منھ نہیں دیکھتی آرسی کے نیچے ذرا دور دروازہ کی طرف منہ کر کے فرش پر بیٹھ کر رقیہ کنگھی کر رہی تھی۔ دونوں آنکھیں نیچی کی ہوئی تھیں۔ ایک ننھی سی بلی اس کے پاؤں پر اپنے نرم جسم کو ٹیک لگا کر لیٹی ہوئی تھی۔ اس وقت دوسری منزل سے چھبی کی بڑی بہن، ہاسی ہاتھ میں کنگھی لئے دروازہ کے پاس آکھڑی ہوئی۔ یہ لڑکی گویا طوفانی آسمان کی چمکتی ہوئی بجلی ہے۔ بڑی خوبصورت اور موزوں قد و قامت۔ گوری، دونوں آنکھیں بڑی بڑی اور گہری گہری۔ عمر بھی کوئی اٹھارہ یا انیس سال کی لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ اس کا بچپنا ابھی تک نہیں چھٹا۔ چنچل پروانے کی طرح دن رات ادھر ادھر بھاگتی پھرتی۔ شرم و حیا نام کی بھی نہیں اس میں۔ شوہر کا ہاتھ پکڑ کر برآمدہ میں کھینچا تانی کرتی رہتی ہے۔ پھر بھی ساری باتوں کے باوجود رقیہ کو وہ بڑی اچھی لگتی ہے۔ یہی ہاسی دروازہ کے پاس کھڑی تھی۔ رقیہ نے آنکھیں اٹھا کر کہا "آؤ"

"نہیں، بیٹھوں گی نہیں۔"

لیکن ہاسی بیٹھی، رقیہ کے پاس اور کہا "میری چوٹی گوندھ دیں گی؟
"ہائے ماں، میں پھر کب سے چوٹی گوندھنے والی ہوگئی" رقیہ تعجب سے بہانہ کرنے لگی۔
"یہ میں نہیں جانتی۔ جلدی کر دیجیئے۔"
رقیہ نے اس کو اپنے قریب کھینچا اور بالوں میں کنگھی کرتے کرتے یوں ہی پوچھا "کیوں، اتنی جلدی کیا ہے؟"
ہاسی ہنس دی بہت دیر تک کچھ نہ بولی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ دھیمی آواز میں کہا۔ "آج شام باہر جاؤں گی نا، اس لئے۔"
"کہاں، سینما دیکھنے؟"
ہاسی منہ پھیر کر بیٹھی۔ آنکھیں مٹکتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟"
یہ معلوم کرنا بھی کچھ مشکل ہے؟ —نہیں، میں نے ایسے ہی پوچھ لیا تھا"
چوٹی گوندھی جا چکی تو ہاسی جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی اور بائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے گوندھے ہوئے بالوں کو آہستہ آہستہ دبایا، پھر دیوار میں ٹنگی ہوئی آرسی کے سامنے جاکر پردہ سرکا کر بہت دیر تک منہ دیکھتی رہی۔ ہونٹ پر شاید کچھ میل لگا ہوا تھا، انگلی سے اُسے صاف کر دیا۔ کان کی لَو کے نیچے کچھ بال ہوا میں رقص کناں تھے، ان کو پیچھے ہٹا دیا۔ جب تک ہاسی آرسی کے سامنے منہ دیکھتی رہی، رقیہ الٹی طرف منہ کر کے کھڑی رہی۔ ہاسی چلی جا رہی تھی، رقیہ نے ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور کہا، "ابھی جلدی ہے؟ ادر بیٹھو نا!"
اس نے عذر کیا، لیکن رقیہ کے اصرار پر وہ بیٹھنے پر مجبور ہوگئی۔ رقیہ اس کی نرم گردن پر ہاتھ رکھ کر ذرا سرک کر بیٹھی۔
"جانے کے لئے دل بے تاب ہو رہا ہے، نا؟"
یہ بات کہہ کر خود رقیہ کو کچھ شرم سی محسوس ہوئی۔ ہاسی کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔
"جائیے جی، آپ کیسی باتیں کرتی ہیں!"
وہ بہت پیار کرتا ہے، نا؟
رقیہ کو جانے کیا ہوگیا۔ وہ جانتی تھی، اچھی طرح جانتی تھی، ایسی باتیں پوچھنا اس کو زیب نہیں دیتا، پھر بھی اس نے پوچھ ہی لیا۔
ہاسی نے ہنستے ہنستے جواب دیا "خاک پیار کرتا ہے!"
"کیسا پیار؟"
"جانے دیجئے، میں نہیں جانتی۔ اب چلتی ہوں۔"
یہ کہہ کر ایک لمحہ میں وہ ہرنی کی طرح بھاگ گئی۔ گویا موجیں اٹھا کر، پانی چھڑکا کر چلی گئی۔ رقیہ نے اس کو اور روکنے کی کوشش نہیں کی۔
رقیہ کے بھی کبھی ایسے ہی دن تھے۔ رام دھنو پرندے کے پر کی طرح بڑے سندر اور جنوبی ہوا سے اڑتی ہوئی سیمل کی روئی کی طرح صاف و شفاف۔ کاش ان دلوں کبھی شام نہ ہوتی! رقیہ نے جانے کتنے دن آنکھیں بند کر کے سوچا، اور وہ بات سوچ کر کتنی دفعہ اس کی آنکھوں میں خواب کا سایہ گھنا ہو کر اترا یا تھا۔ لیکن ایک دن اس کی زندگی کے صاف و شفاف آسمان پر بادل چھا گیا غیر متوقع طور پر اجلی دوپہر کی تصویر پر سیاہی بکھر گئی۔ رقیہ نے کبھی اپنے مہیب خواب میں بھی یہ خیال نہیں کیا تھا کہ اس کی زندگی میں کچھ ایسا بھی پیش آئے گا۔ اندھیرے میں اکیلے پن اور لمبی، خواب آور راتوں میں بھی اس کے دل میں ایسا اندیشہ پیدا نہیں ہوا تھا، اسی لئے شاید آج وہ اس قدر پریشان ہوگئی تھی۔ کس وجہ سے ایسا ہوا، اس کی اہمیت دوسروں کے ہاں جو بھی ہو، رقیہ کو اسے بہت بڑی قیمت ادا کر کے قبول کرنا پڑا۔ اس کو بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔
بالکونی کی اس طرف کس کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی؟ دروازہ کی آڑ سے اس نے جھانک کر دیکھا۔ زنیل باہر سے واپس آیا۔ رقیہ نے دروازے کے پٹ ذرا اور ملا دیئے۔ زنیل کے چلے جانے پر پھر باہر کی طرف جھانک کر دیکھا، اس کو ایسا محسوس ہوا کہ سیڑھی کے نیچے کوئی کھڑا ہے۔ غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ ہاسی وہاں کھڑی ہے۔ اس کا چہرہ جھلملانے لگا۔ اس کے بعد وہ دونوں آہستہ آہستہ اوپر چڑھ گئے۔ ایک دن ٹھیک اسی طرح حمید بھی

اوپر آیا تھا اور سرگوشی کے انداز میں کہا تھا۔ "سنو۔"

"کیا؟"

"ایک پیالی چائے۔"

"اس کے بعد؟"

"اس کے بعد ہم دونوں باہر جائیں گے۔"

اسٹوو کی نیلی لو کی روشنی میں رقیہ کا چہرہ گویا کانپ رہا تھا۔ پیشانی، ناک اور ٹھوڑی پر پسینے کے قطرے جم گئے تھے۔ ایک دو لٹیں اڑ کر کان کے پاس گال پر آ گری اور اس نے بائیں ہاتھ سے آگ پر سلور کا فرائی پان پکڑ رکھا تھا۔ اسٹوو کی لگاتار شوں شوں کی آواز کو اگر شمار نہ کیا جائے، تو کمرہ میں اس وقت بالکل سناٹا تھا۔ جمید ذرا دور ایک کرسی پر آرام سے بیٹھا ہوا رقیہ کو دیکھ رہا تھا۔ ٹکٹکی باندھ کر اس کے چہرہ پر نظر جمائے دیکھ رہا تھا۔ اگرچہ رقیہ کی آنکھیں فرائی پان پر تھیں لیکن اس نے محسوس کیا تھا کہ کوئی اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس نے آنکھیں اٹھا کر کہا تھا:

"کیا بات ہے، اس طرح دیکھ کیوں رہے ہو؟ مجھے کبھی تم نے دیکھا نہیں کیا؟"

اتنا کہہ کر وہ ہنس پڑی تھی، ذرا سی میٹھی ہنسی، اور جمید بھی ساتھ ہی ساتھ خاموشی سے ہنسا تھا۔ اس کے بعد سامنے کی طرف ذرا جھک کر بولا تھا:

"ایک انڈا بنانے میں اتنی دیر لگتی ہے؟"

"ابھی ہو جاتا ہے، اتنی جلدی کیا ہے؟ ذرا سی دیر ہو جائے تو حرج کیا ہے؟"

دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر دیر تک چائے پیتے رہے۔ اس کے بعد دروازہ پر تالا ڈال کر سیڑھی سے گن گن کر قدم ڈالتے ہوئے نیچے اتر آئے تھے۔ اس وقت شام گہری ہو چلی تھی۔ وہ دونوں پیدل راستہ پار کر کے چوراہے پر جا کھڑے ہوئے تھے۔ جمید نے پوچھا تھا "رکشا لے لوں، کیا خیال ہے تمہارا؟ یا پیدل ہی چلوگی؟"

"نہیں پیدل چلنا اچھا نہیں لگتا۔"

سینما جانے کے لئے رکشا لی گئی تھی، لیکن تھوڑی دور جا کر جمید نے اس سے کہا تھا "کیوں؟

"سینما شروع ہونے میں ابھی بہت دیر ہے، چلو نا ذرا گھوم پھر لیں"

"چلو"

عظیم پورہ سے گذر کر رکشا رمنا جا پہنچی تھی۔ وہاں راستہ کے دونوں طرف مختلف قسم کے درختوں کی قطار لگی ہوئی تھی جن میں سے بعض کے نام تو معلوم ہیں اور بعض کے نہیں۔ درختوں نے چاروں طرف شاخیں پھیلا کر اوپر کا حصّہ گویا ڈھانپ لیا تھا اور دیکھنے میں ایک طرح سبز رنگ کا شامیانہ معلوم ہوتا تھا۔ کہیں کہیں سے ایک آدھ ٹکڑا آسمان کا بھی نظر آ جاتا تھا۔ اس وقت جمید نے اس کے گوندھے ہوئے بالوں سے ایک بیلہ کا پھول اٹھا کر کہا تھا "میں نے چوری کی"

"جاؤ شریر کہیں کے! راستہ میں لوگ کیا کہیں گے؟"

رقیہ نے کچھ غصہ کے انداز میں اس کو دھمکایا تھا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد پھر وہ منہ چھپا کر ہنسی تھی اور جمید نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ "واہ، تو پھر ہنسی کیوں؟"

"یونہی!"

"یونہی کیا کوئی ہنستا ہے؟"

"ہنستا ہے نا، تم بالکل بچے ہو!"

"لیکن شوہر کو کبھی بچہ نہیں کہنا چاہئے۔"

"سچ؟"

اس کے بعد ہنستے ہنستے رقیہ کے پیٹ میں بل پڑ گئے تھے ۔

سورج اور ذرا ڈھل گیا تھا، رقیہ کا آنچل پھسل گیا تھا، اس کو ٹھیک کرتے کرتے اس نے کہا تھا "بہت گھومے ہم"۔

"اور بھی ذرا گھومیں کیا؟"

"نہیں، رہنے دو" پھر تھوڑی دیر بعد کہا تھا، "آج سینما نہ جائیں تو کیا رہے گا۔ چلو گھر واپس چلیں"۔

"کیوں؟"

"ایک دن کے لئے سینما رہنے دو نا۔ چلو پیدل گھر چلیں"۔

اس کے بعد دونوں ایک دوسرے کے قریب ہو کر پیدل چلتے ہوئے گھر واپس ہوئے تھے، اور سیڑھی سے اوپر چڑھتے چڑھتے حمید نے آہستہ سے کہا تھا، "کیوں، اور کتنے دن باقی ہیں؟"

"کیا؟"

حمید اس کے جواب میں ہنسا تھا۔ ایک عجیب ڈھنگ سے ہنس پڑا تھا وہ۔ رقیہ کے نزدیک اس ہنسی کے معنے نامعلوم نہیں تھے۔ پہلے اس کو بڑی شرم محسوس ہوئی تھی، لیکن اس کے بعد اس کا سارا جسم گویا ایک لمحہ میں کسی کے لمس کے لئے بے چین ہو گیا تھا۔ "پتا نہیں، مجھے کیا معلوم"؟

یہ کہہ کر وہ اور ذرا اوپر چڑھ گئی تھی اور حمید نے لپک کر دو دو سیڑھیاں ایک ساتھ چڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اور بائیں ہاتھ کو کولھے پر رکھ کر گننے لگا تھا، ایک، دو، تین، ۔۔

"چپ شریر کہیں کے"، رقیہ نے اس کو روکا۔

"شاید بہت جلدی، نا، کیوں؟"

"ہوں"

پھر دروازہ کا تالا کھولتے کھولتے حمید نے کہا تھا۔ "اگر لڑکی ہو تو اس کا نام رکھیں گے آلو"۔

"کیسے معلوم ہوا تم کو کہ لڑکی ہوگی؟"

"ایسے ہی"۔

"اگر لڑکی ہوگی تو تم بہت خوش ہوگے، نا؟"

"ہوں۔ او، خو ۔۔ ب۔ تمہاری طرح خوبصورت اور گورے رنگ کی"۔

واقعی، ان کے گھر میں آلو ہی آئی۔ اس کی شکل و صورت بالکل رقیہ جیسی تھی۔ حتیٰ کہ اس کی ٹھوڑی بھی بالکل اسی جیسی تھی۔ صرف اس کا منہ اور زیادہ ننھا، زیادہ نرم اور زیادہ سفید تھا ۔

اب رقیہ کو آلو کے لئے خطرہ ہے۔ اس کی زندگی سے جو لعنت وابستہ ہوگئی ہے (ہاں رقیہ اس کو لعنت ہی کہے گی) وہ گویا اس کی بچی آلو کو بھی چھو جائے گی۔ آٹھ مہینے پہلے جو بلائے ناگہانی آئی تھی، اس کا اعادہ اگر آلو کی زندگی میں بھی ہو، تو وہ اس کو کیسے روکے گی؟ ایسی بھی کیا ہمت ہے رقیہ کی؟ نہیں کچھ بھی نہیں۔ رقیہ کا شعور ڈوبا رہا ہے ۔

آٹھ مہینے پہلے بغل کے چھوٹے گھر کے دروازے اور کھڑکیوں میں لال پردے لگے ہوئے تھے۔ کئی دن بعد جب وہ سب کھول لئے گئے تھے، اس وقت بیرونی فضا کی کھلتی ہوئی روشنی آکر اس کی دونوں آنکھوں میں تیر کی طرح چبھ رہی تھی۔ اس روز اس کو غیر یقینی طور پر جانی پہچانی فضا بھی بالکل نئی لگ رہی تھی اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کو یہاں رہنے کا اور کوئی حق نہیں پہنچتا۔ وہ گویا سب کے بیچ میں رہ کر بھی بالکل تنہا ہے جیسے پر سے جس طرح پانی الگ ہو جاتا ہے، گویا اسی طرح اس کے ہاتھ سے اس کا آخری سہارا بھی جاتا رہا! سب سے بڑھ کر اس کے سامنے اس دن عدم اعتمادی کا سایہ اور اسی کے دوسرے رخ پر لایعنی مذاق آکر نمودار ہوا تھا!! جو رقیہ ایک دن حمید کے ہاتھ اپنے آپ کو کھل کر سپرد کر کے

خوش ہوتی تھی، وہی آج اپنے آپ کو اس سے چھپا کر رکھنا چاہتی ہے، آڑ تلاش کرتی ہے! ایک دن حمید نے اس سے کہا تھا:

"آلو کو صبح و شام ذرا پڑھا تو سکتی ہو۔ اس کے اسکول جانے کی عمر تو ہو آئی ہے۔"

"پڑھاتی تو ہوں" پھر کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے کہا تھا

"دوسری منزل والی ہاسی اس روز کہہ رہی تھی کہ بجلی کی روشنی سے بچوں کی آنکھیں جلد خراب ہو جاتی ہیں۔"

"کیوں، کیا ہوا؟"

حمید کچھ سمجھ نہیں پایا تھا کہ رقیہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ رقیہ بھی کچھ ٹھیک سمجھ نہیں سکی تھی کہ کیا جواب دے۔ حمید ابھی سوالیہ انداز میں اس کی طرف آنکھیں کھول کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے دونوں آنکھیں نیچی کر کے دروازہ کی طرف بڑھتے بڑھتے آہستہ سے کہا تھا۔ یہی کہہ رہی تھی کہ میز کی بتی پہ ایک بڑا سا شیڈ ہوتا، تو اچھا ہوتا۔"

اسی دن حمید دفتر سے واپس آتے ہوئے کاغذ کا ایک بڑا شیڈ خرید لایا تھا، اور رقیہ اس کو خود اپنے ہاتھ سے بہت دیر تک لمپ پر چڑھاتی رہی۔ چڑھاتے وقت جانے کس طرح وہ ہاتھ سے چھٹ کر ایک دفعہ فرش پر گر گیا تھا۔

شام کے وقت جب بتی جلائی گئی تھی تو کیسی مدھم روشنی سے کمرہ بھر گیا تھا۔ شیڈ کے نیچے صرف اجلی روشنی کا ایک دائرہ بن گیا تھا۔ اور اس کے بعد روشنی کم ہوتے ہوتے کمرہ کے چار کونے میں جا کر اس قدر کم ہو گئی تھی کہ وہاں صرف اندھیرا ہی معلوم ہوتا تھا۔ اچھی طرح نگاہ نہ ڈالنے سے ٹھیک کچھ نہیں سوجھتا تھا۔ باہر سے واپس آنے پر شروع میں کمرہ اندھیرا ہی معلوم ہوتا تھا، کچھ دیر بعد آنکھیں ذرا موافق ہو جانے سے چار طرف صرف پھیکی روشنی کی افسردگی دکھائی دیتی تھی۔ پہلے دن ہی حمید نے اس کی شکایت کی تھی۔

"کیا فائدہ ہوا، بتاؤ تو اتنا بڑا شیڈ خرید کر؟ آنکھوں سے کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا!" رقیہ نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا، چپ چاپ کھڑی تھی۔ اس نے پھر کہا تھا "تمہارے اس قسم کے خیالات کے کوئی معنی نہیں ہوتے، بے کار! تم ہمیشہ ایسا ہی کرتی ہو!" رقیہ نے گویا اس دن اس طرح چپ رہ کر یہ سمجھا دیا تھا کہ نہیں، وہ ٹھیک ہی ہے۔ اس کو کہیں ادھر اُدھر نہیں کیا جائے گا۔ حقیقت میں ایسا ہوا بھی نہیں تھا۔

کبھی کبھی وہ سوچتی رہی، حمید اگر چاہتا تو آسانی سے لمپ پر سے شیڈ الگ کر سکتا تھا۔ اس کو پھاڑ بھی سکتا تھا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اگر وہ ایسا کرتا بھی، تو وہ کر ہی کیا سکتی تھی؟

وہ کب راستہ کی طرف کی کھڑکی کے پاس سرک آئی، اس کو کچھ معلوم نہ ہوا۔ ایک دفعہ احساس ہوا کہ وہ نیچے کی طرف دیکھ رہی ہے، راستہ کی طرف۔ کالونی کے راستہ سے ہاسی اور زنیل اب پیدل کہیں جا رہے ہیں۔ بڑی سڑک پر اٹھ کر شاید وہ دونوں رکشا کر لیں گے۔ رقیہ آنکھیں کھول کر بڑی توجہ سے اُدھر دیکھتی رہی۔ یہ کیا، وہ لوگ رُکے کیوں؟ کس کے ساتھ بات کر رہا ہے زنیل؟ کون ہے وہ؟ عجیب بات ہے! حمید کو رقیہ نہیں پہچان سکتی؟

زنیل نے جانے کیا کہا اور ہاسی کے جواب میں حمید ہنسا۔ کیسی پھیکی ہنسی! اس کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔ حمید پیدل آ رہا ہے۔ ہاتھ میں کاغذ میں لپٹا ہوا ایک پیکٹ ہے۔ آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ کھینچ کھینچ کر قدم اٹھا رہا ہے۔ گویا نیچے سے کسی چیز نے کھینچ کر پکڑ رکھا ہے۔ دوسری منزل کی بالکونی پر سے اس کو دیکھنا کیسا عجیب لگتا ہے!

حمید کے سیڑھی پر چڑھنے سے پہلے ہی رقیہ جا کر رسوئی میں گھس گئی۔ اس طرح جانے کی کیا ضرورت تھی؟ تھوڑی دیر بعد بھی جاتی تو کیا نقصان تھا؟ لیکن پھر بھی جائے بغیر نہ رہ سکی۔ اسٹوو جلانے کے لئے بے چین ہو گئی۔ طاق پر رکھی ہوئی ماچس تلاش کرنے لگی۔ وہ جب گھر میں داخل ہوا تو وہ رسوئی سے بولی۔ "آ گئے ہو کیا؟"

"ہاں۔"

تھوڑی دیر بعد حمید نے آواز دی "ذرا سنو تو ادھر"

"کیا؟"

رقیہ ماچس جلاتے جلاتے رُک گئی۔

"ذرا سنو تو!"

رقیہ اسٹوو میں آگ سلگاتے سلگاتے بولی۔ تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔ تم ہاتھ منہ دھو لو۔ میں تمہارا کھانا لے کر آتی ہوں۔"

حمید کی اور کوئی آواز نہ آئی۔ رقیہ کا جی چاہ رہا تھا کہ ابھی وہ جائے، لیکن جانے وہ کیوں نہ جا سکی۔ ایسا محسوس ہوا کسی نے اس کو پکڑ رکھا ہے۔ کھانا تیار ہو گیا، تو طشتریاں نکال کر ان میں چننے لگی۔ اس کے بعد ذرا منہ بڑھا کر آواز دی "آلو، آلو!"

کیسی نرم اور مہین آواز ہے! آلو کا کچھ پتا نہ لگا۔ شاید وہ چھبی آپا کے ساتھ بیٹھ کر کھیل رہی ہے۔ وہ دونوں کیا کھیل رہی ہیں۔ ان کی گڑیوں کی شادی ہو گی! ناچار خود رقیہ ہی کھانے کی طشتری اور چائے کی پیالی ہاتھ میں لے کر آئی۔ ہاسی اس وقت دیوار کی آرسی میں منہ دیکھ کر چلی گئی تھی لیکن اس پر پردہ کھینچ کر نہیں گئی۔ دروازہ کے پاس آ کر وہ رک گئی۔ آرسی میں حمید کی تصویر نظر آ رہی تھی۔ ہاتھ منہ دھو کر تولیہ سے دن بھر کی تھکن کو پونچھ کر کرسی کے ہاتھ پاؤں پھیلائے نیم دراز ہو کر بیٹھا تھا۔ سہاگ بھری نظروں سے وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے بعد اس کے سامنے آ کر میز پر کھانا رکھ کر ذرا پرے جا کر کھڑی ہوئی۔ حمید نے بستر پر سے پیکٹ اٹھا کر کہا "آلو کے لئے کپڑے لایا ہوں۔"

رقیہ نے کپڑے ہاتھ میں لئے، اُلٹ پلٹ کر دیکھا "اگلے منگل کو اس کی سالگرہ ہے۔ جو بنانا ہے ذرا جلدی بنا لینا۔"

"اچھا۔"

"اور یہ لو، تمہارے لئے یہ ساڑھی لایا ہوں۔ ایک دو دوستوں کو آنے کے لئے کہا ہے۔ اس دن تم کو یہ پہننی ہو گی۔"

کیوں؟ صندوق میں تو کافی ساڑھیاں پڑی ہیں؟"

"حمید ایک گھونٹ چائے پی کر بولا "تو کیا اس لئے نئی ساڑھی نہیں خریدنی چاہیئے؟"

رقیہ نے اور کوئی بات نہ کی ساڑھی اور کپڑے الگنی پر رکھ دیئے۔ تھوڑی دیر بعد رسوئی میں چلی گئی سیڑھی پر نرم پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ آلو اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر بولی۔ "امی!"

"کیا؟"

"میرے کپڑے کب بناؤ گی؟"

"کل"

"نہیں آج"

"اچھا آج"

آلو خوش ہو کر چلی گئی۔ سونے کے کمرے میں جا کر فرش پر بیٹھ گئی اور دیکھنے لگی نئے لائے ہوئے کپڑوں میں کتنے پھول ہیں وہ گننے لگی۔ کسی حد تک گن کر الجھ گئی، آگے گن نہ سکی۔ حمید بولا۔ "آلو؟"

"کیا؟"

"کپڑے تم کو پسند آئے؟"

"خو ـــــ ب۔"

"بہت اچھا۔"

رقیہ رسوئی میں بیٹھ کر رات کا کھانا پکانے لگی۔ اب قریباً شام ہونے والی تھی۔ رقیہ سوچنے لگی۔ سارے دن کی باتیں وہ سوچنے لگی۔ ہاسی کی بات، زنجیل کی بات، آلو کی بات۔ ہاسی کے لئے اس کے دل میں کیسی محبت پیدا ہو گئی ہے۔ ابھی تک وہ بچی ہے، بڑی بھولی بھالی ہے۔ رقیہ دل و جان سے

دعا کرتی ہے۔ اس کی طرح کبھی اس کو ایسی بدقسمتی پیش نہ آئے۔ صرف اس کو کیوں کسی کو بھی نہ آئے۔ لیکن کیا یہ واقعی اس کی بدقسمتی ہے! غیر شعوری طور پر رقیہ کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا۔ اس اجڑی ہوئی دنیا میں وہ کس کو لے کر زندہ رہے گی؟ اس کے بعد ہی پھر وہ سوچنے لگی، اس کا تو سب کچھ ہے، اس کے تو سب ہی موجود ہیں، تو کس لئے وہ اپنے آپ کو اس قدر پریشان کر رہی ہے؟ اس کی یہ اجڑی دنیا کیا اس کی من گھڑت نہیں ہے؟"

ایک ایک کر کے اسی طرح ہزاروں سوالات، موافق و مخالف دلائل کے ساتھ آ کر اس کے دل میں بھیڑ لگاتے رہے۔ ان سوالات اور دلائل کے گویا اپنے بنیادی حقوق ہیں۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق خود بخود بن اور بگڑ رہے ہیں۔ رقیہ کا گویا ان پر کوئی قابو نہیں۔ خیالات کے سمندر میں طوفان اٹھا ہے، موجیں گویا آج کے دن ساحل سے ٹکرا رہی ہیں۔ رقیہ گویا پورے یقین اور تمام دلائل کے ساتھ اس طوفان کے سامنے تھر تھر کانپ رہی ہے۔

حمید کیا اب بھی اس سے محبت کرتا ہے؟ ممکن ہے رقیہ کی یہ غلط فہمی ہو۔ جس حمید کو اس نے دیکھا ہے، وہ شاید اسی کا بنایا ہوا ہے۔ کیا ضرورت تھی حمید پر شبہ کرنے کی؟ (شاید وہ آج بھی اس سے اسی طرح محبت کرتا ہے، جس طرح پہلے کرتا تھا) آٹھ مہینہ کے بعد آج پہلی دفعہ اس نے ساڑھی خرید کر دی ہے۔ سامنے آلو کی سالگرہ ہے، اس لئے حمید کی دنیا میں رقیہ کو بھی تک کافی دخل ہے، اسی لئے تو اس کے لئے ہرے رنگ کی، اس کی سب سے مرغوب ساڑھی دیکھ کر لایا ہے۔ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے، کچھ دینا چاہئیے، اسی لئے دی۔ نہیں نہیں، یہ بات نہیں یہ بات وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی!

آج، اسی وقت رقیہ کو خیال آیا حمید اتنے چھوٹے دل کا آدمی نہیں ہو سکتا۔ آج شام پھر اس کو صرف یہی خیال رہا، اس کا بھی ایسا کوئی ہے جس کے ہاتھ وہ اپنے آپ کو سپرد کر سکتی ہے اور جس کے ذمہ سارا کام چھوڑ کر وہ اطمینان کا سانس لے سکتی ہے۔ بالکونی پر سے راستہ میں حمید کو دیکھ کر اس کو ایک دفعہ خیال آیا تھا، ہاں، اس کا بھی ایک سہارا ہے، اسی لئے کھانا لے کر جب وہ گھر کے اندر آئی، اور آرسی میں اس کی تصویر دیکھی، تو اس طرح رک گئی۔

لیکن آٹھ مہینہ سے جس کو اس نے اس طرح دیکھا ہے، اپنے آپ کو علیحدہ کر کے سوچا ہے، آج وہ سب باتیں ایک دم فراموش کر کے ایک ہی دن میں اس کے قریب آ جانا کیا ممکن ہے؟ اس لئے اس کے دل میں جتنی منت و سماجت پیدا ہوئی، اتنی ہی جھجک بھی اس کے ساتھ دکھائی دی۔ اس تذبذب میں پڑ کر رقیہ پتھر کی طرح جم گئی۔ سینہ کیسا خالی خالی محسوس ہونے لگا۔ کھانے پینے کے بعد حمید ایک نئی لائی ہوئی افسانہ کی کتاب پڑھنے بیٹھا۔ رات کے اس وقت تو یا دس بجے ہوں گے، لیکن زیادہ دیر تک نہیں پڑھ سکا، رکنا پڑا۔ سونے کے کمرہ کی بغل میں اور ایک کمرہ ہے۔ وہ اکثر خالی ہی رہتا ہے، اسے آلو کے کھیلنے کا کمرہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ عزیز و اقارب میں سے کوئی آئے، تو اس میں سونے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس کمرہ سے ایک عجیب بین اور دل سوز آواز آنے لگی۔ کیا کوئی رو رہا ہے؟ کون؟ حمید چونکنا ہو کر سننے لگا، صاف رونے کی آواز ہے۔ اس نے کتاب اٹھا کر پھینک دی۔ بھاگ کر جا کے دیکھا، رقیہ کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر دھاڑیں مار مار کر رو رہی ہے۔ اس کو آتے نہ دیکھ کر اس نے خیال کیا تھا، شاید دوسری فلیٹ پر گئی ہوئی ہے، لیکن وہ یہیں کھڑی ہے، اس کے خیال میں بھی نہیں آیا تھا۔

"رقیہ رو کیوں رہی ہے؟" پاؤں کی آہٹ سن کر اس نے منہ پھیرا۔ آنکھ کے پانی سے دونوں گال بھیگ گئے تھے۔ کان کے قریب سے کچھ بال پانی میں تر ہو کر گال سے چمٹ گئے تھے۔ حمید کو دیکھ کر رقیہ بالکل بچوں کی طرح رو پڑی۔ سینہ کی گہرائی سے زور زور سے سانس لینے لگی۔ حمید نے قریب جا کر اس کا منہ پونچھتے ہوئے پوچھا:

"کیوں، کیا ہوا؟"

اس کا پیارا نام لے کر اس نے آواز دی۔ رقیہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ صرف اس کے سینہ پر سر رکھ کر روتی رہی۔ حمید نے اس کو نہیں روکا، رونے دو۔ ایک دفعہ رونا آہستہ آہستہ کم ہو کر رک گیا۔

کالونی کی کھڑکیوں سے روشنی آ کر نیچے گری، راستہ پر۔ سبز گھاس کے فرش پر ٹوٹی پھوٹی روشنیاں بڑی خوبصورت دکھائی دینے لگیں۔ کئی آدمی ادھر سے پیدل جا رہے تھے۔ دھیرے دھیرے ایک رکشا جا رہی تھی۔ راہ چلتے لوگ اوپر سے دیکھنے میں کیسے چھوٹے چھوٹے لگتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے ساتھ چپک کر چپٹے ہو گئے ہیں۔ اس وقت دور کی ایک دو فلیٹوں سے دھندلی آواز کے سوا اور کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ رات زیادہ ہونے لگی۔ حمید اپنا منہ رقیہ کے قریب لے آیا۔ آٹھ مہینہ پہلے رقیہ کو چیچک ہوئی تھی۔ سارے چہرہ پر گہری نشانیاں تھیں، کالے کالے گڑھوں کی طرح، ناہموار۔ حمید گویا ان کو مٹانے کی کوشش کرنے لگا۔
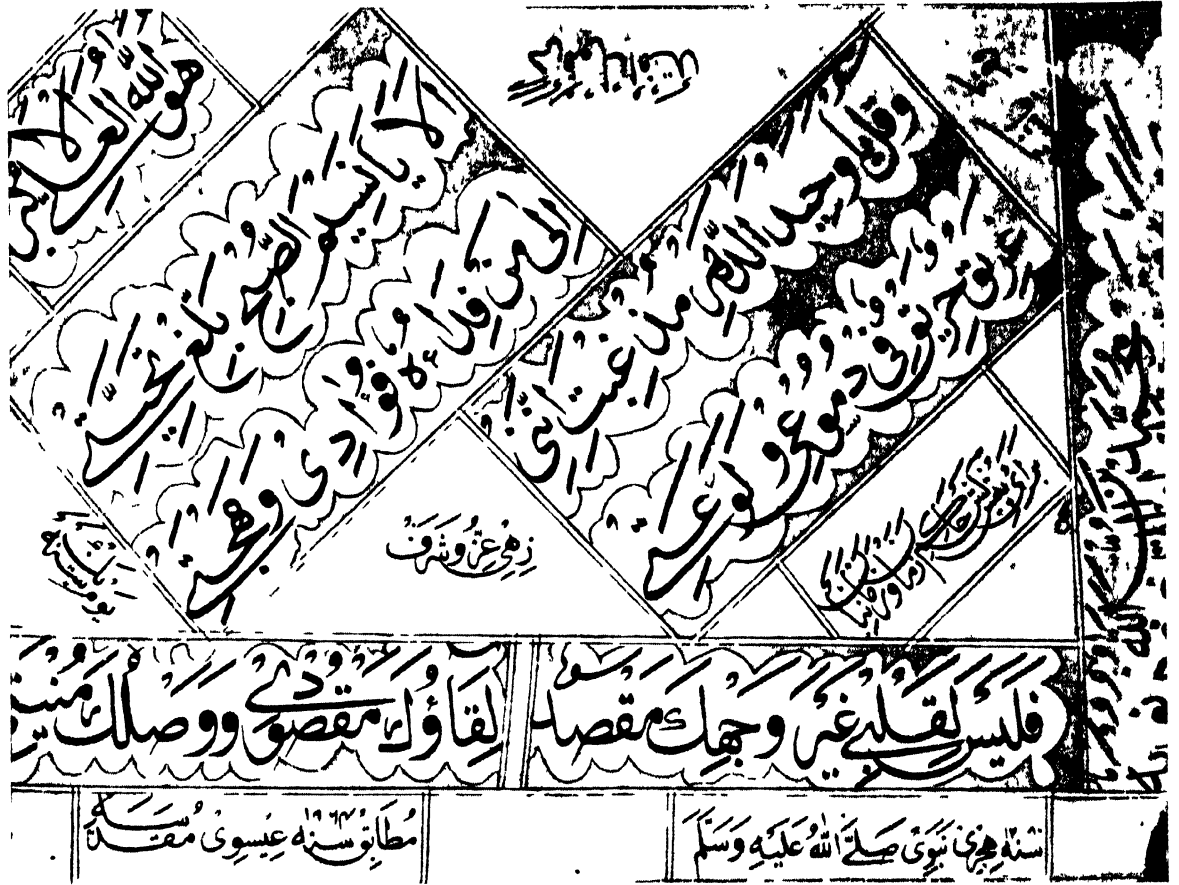
خطّاطی کے نادر نمونے

وصالی۔ حافظ امیرالدین شاکر میرخت ملوبی
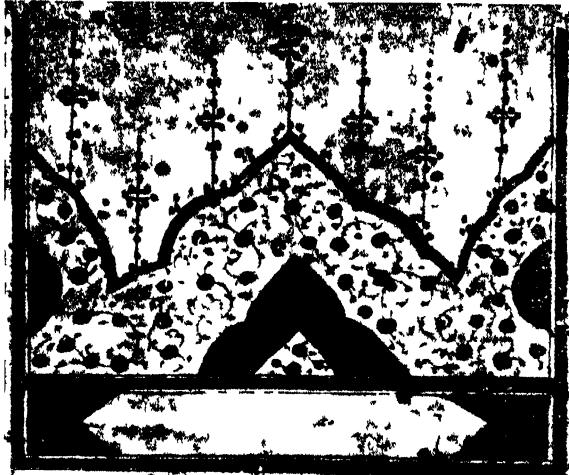
وصالی [illegible] سانبسانی

ثقافت:-
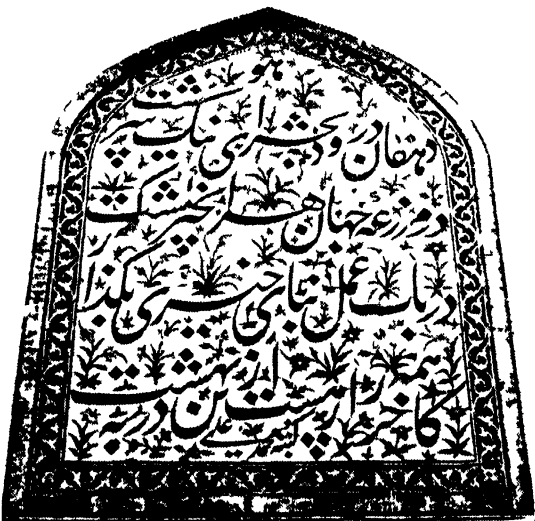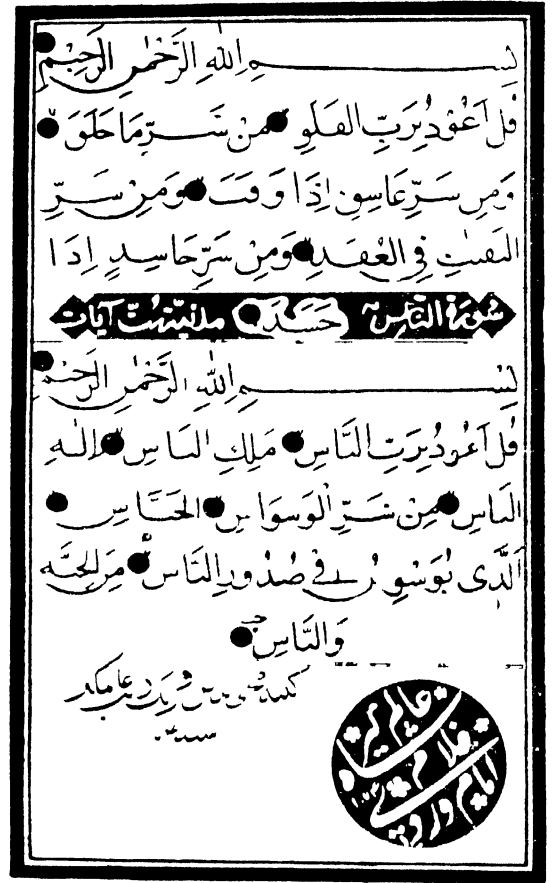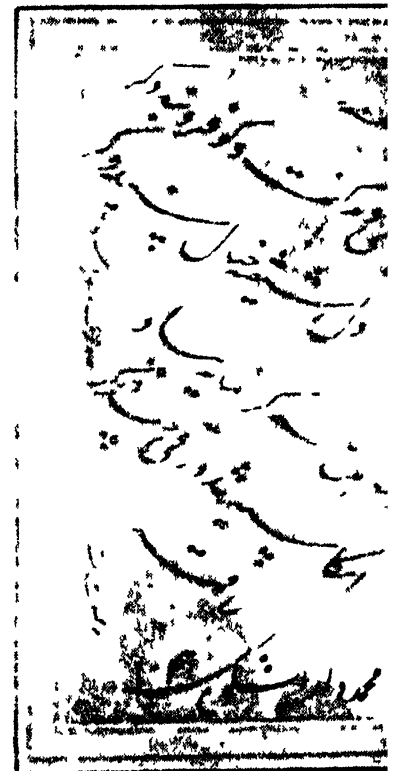
(۱)

سیّد یوسف بخاری

یہ بتانا مشکل ہے کہ خط کیسے اور کب ایجاد ہوا۔ قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ ابتدا میں چند مخصوص نقوش اور تصاویر سے کام لیا گیا ہوگا۔ یعنی ہر واقعہ یا مجرد خیال کو تصویر کی صورت میں پیش کرنے لگے۔ یہ نقوش یا تصاویر چونکہ بہت بڑے تھے اس لئے زیادہ جگہ گھیرنے کے علاوہ ان کے بار بار بنانے میں بڑی دقت پیش آتی تھی۔ لہٰذا یہ آہستہ آہستہ خود بخود مختصر ہوتے گئے اور ایسی شکل اختیار کی جس میں صوریت کم اور معنویت زیادہ ہوگئی۔ یہ طریقِ عمل بھی تکلیف دہ تھا کیونکہ ہر بڑے واقعہ کی وضاحت کے لئے کئی کئی تصاویر سے کام لینا پڑتا تھا۔ لہٰذا مصوری کو ترک کر کے مختلف اجسام اور اشکال میں چند علامتیں مقرر کی گئیں جن کو ابجد کہتے ہیں۔ اس طرح ا تا ی تمام تحتانی حروف مرتب ہوگئے۔ اس دَور کو صوری حروف سے تعبیر کیا گیا اور یہی السنۂ عالم کی کتابت کا سنگِ بنیاد ٹھہرے۔ کچھ عجب نہیں کہ تمام زبانوں کی ابجد اور خطوط کا ارتقا ایک ہی ماخذ سے ہوا ہو۔ جب اس حد تک دسترس حاصل ہوگئی تو حروف کی ترتیب سے لفظ اور الفاظ سے جملے وضع ہوئے۔ یہ کتابت کا حرفی دَور کہلایا۔

رہا یہ سوال کہ ابجد کا آغاز کس زمانے میں ہوا۔ اس کا فیصلہ بھی مشکل ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ کوئی ۴ ہزار سال قبل ہوا ہوگا۔ غالباً ۴ ہزار برس ق۔م سے بابل میں حکومتوں کا قیام اور ان کے حدود میں کتابت جاری ہو چکی تھی۔ اس زمانہ کا خط سومری یا سومیری کہلاتا تھا۔ سومری دراصل عرب اور سام حضرت نوح کے فرزند تھے

اسلامی عقیدے کے مطابق حضرت آدم پر جو اولین صحائف نازل ہوئے ان کی زبان سریانی تھی۔ یہ پہلے خام اینٹوں پر لکھے گئے جن کو بعد میں تحفظ کے خیال سے پختہ کیا گیا۔ یہ خشتی کتابت بظاہر طوفانِ نوح میں غرق ہوگئی۔ حضرت ادریس نے اس ابجد کو ترقی دی جو تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ نشو و نما پاتی رہی۔ اس اسلامی روایت کی تصدیق یوں ہوتی ہے کہ بابل کے آثارِ قدیمہ سے عہد اشوریہ بنی پال (۶۶۸ ق۔م) وغیرہ کے سنگی کتبات برآمد ہو چکے ہیں، جن پر پوری کتابیں تحریر ہیں۔ کتابت کی اصطلاح میں انبیائے کرام کے خطِ وحی کو "توقیفیہ" اور اصلاح یافتہ قلم کو خطِ اصلاحیہ کہا جاتا ہے۔

ان امور سے معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا میں جس قدر نمونے خطوط کے موجود ہیں ان کی تاریخ مصر سے شروع ہوتی ہے اور مصری ہی ابجد یعنی خط کے موجد قرار پاتے ہیں۔ اگر ان تمام خطوط کے باہمی تعلق اور ان کی ارتقائی کیفیتوں کو پیشِ نظر رکھا جائے تو ایک شجرہ مرتب ہو جاتا ہے جس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ خطوط حسبِ ذیل ہیں:-

خط سریانی: اس کی تشریح اوپر کی جا چکی ہے۔

خط سطرنجیلی، المخفف، السرطا: ان خطوط کی ایجاد مصری خطوط کے زوال اور فنیقیہ کے بعد ہوئی۔ ان میں سطرنجیلی آگے چل کر ایک کامیاب خط کی صورت میں اُبھرا اور خط کوفی قدیم کے لئے ایک بنیادی خط ثابت ہوا۔ دونوں خطوط گو سریانی کی مشہور شاخیں ہیں لیکن وقتی طور پر پیدا ہوئے اور فنا ہوگئے۔ بنیادی خطوط ہونے کی وجہ سے ان کو علیحدہ شجرہ کی صورت میں دکھایا گیا ہے

خط سومری: یہ خط قدیم اہلِ بابل کی یادگار ہے جو طوفانِ نوح سے ۴ ہزار برس قبل مسیح رائج تھا۔ اس کے موجد سامی عرب تھے۔

مسماری، پیکانی یا میخی: حمورابی خاندان نے جو سنہ ۲۲۰۰ ق۔م میں بابل پر حکمران تھا، اس خط کو مسماری (پیکانی یا میخی) خط میں تبدیل کر دیا جو ابتدا میں مصور تھا اور اس کی شکل آہنی میخوں یا تیروں سے مشابہ تھی۔

مقدس ہیروغلیفی: یہ مصریوں کا سب سے پہلا مذہبی خط تھا۔ اس کا ہر حرف مصور تھا۔ اس کے کاتب مندروں کے پجاری تھے۔ اہلِ مصر

چونکہ ابتدا میں وحوش کی پرستش کیا کرتے تھے۔ اس لئے اظہار خیال کا ذریعہ حیوانات کی تصاویر قرار دیا گیا۔ مکمل ابجد انہی تصاویر میں بنائی گئی۔ آسانی کے خیال سے انہوں نے اس کی دو قسمیں کردیں :۔

ہیراطیقی (ہیراٹک) یہ پہلی قسم تھی جس کا تعلق براہِ راست مذہبی احکامات سے تھا۔ یہ خط شاہی دفاتر میں بھی جاری تھا۔ اگرچہ یہ کافی رواں تھا لیکن حروف میں کچھ کمی تھی اس لئے ہیراٹک کہلایا۔ اس خط میں پوری تصویر کا صرف ایک جزو باقی رہ گیا اور کاغذ پر لکھا جانا لگا۔ حضرت ابراہیم سے (۵۰۰۰) برس قبل کی کتابیں اس خط میں موجود ہیں۔

دیموطیقی (ڈیموٹک) : یہ دوسری قسم تھی۔ اس میں پہلے خط سے زیادہ روانی تھی۔ مصر میں جب سولہواں خاندان حکمران تھا اس وقت یہ خط اپنے پورے شباب پر تھا۔ اس تقسیم سے مصریوں کو ایک بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ مصوری کی زحمت سے قدرے نجات مل گئی۔

فینیقیہ[1] : (اہل فنیشیا) مصریوں کے شاگرد ہوئے اور انہوں نے ہیروغلیفی سے اپنا جداگانہ خط پیدا کیا جو مصری خطوط سے زیادہ واضح اور شاندار تھا۔ اس طرح عہد قدیم کے یہ چار خط اصل قرار پائے اور ان کی شاخیں تمام دنیا میں پھیلیں۔

مربع عبرانی : عبرانیوں میں ان کا ایک قدیم خط رائج تھا۔ موجودہ مربع عبرانی دراصل فینیقیہ قوم کا عطیہ ہے جس کی بنیاد سنہ ۵۶۰ ق۔م میں بابل میں پڑی۔ یہ خط فینیقیہ سے زیادہ مہذب اور واضح تھا۔

قدیم یونانی : جب مصر پر یونانیوں کا تسلط ہوا تو تینوں مصری خط بالکل زوال میں آگئے۔ یونانیوں نے فنیقی خط کو سامنے رکھ کر قبطی خط میں یونانی حروف شامل کئے اور اپنا جداگانہ رسم الخط ایجاد کیا۔ قبطی خط بھی یونانی حروف سے مرکب تھا۔ جو آغاز اسلام تک جاری رہا لیکن خلیفہ ولید بن عبدالملک اموی کے گورنر عبداللہ نے [illegible]ھ میں اس خط کو عربی خط میں تبدیل کردیا۔

ارامی یا سامی : سلطنت اشوریہ (بابل) جب روبہ زوال ہوئی تو اس کی ابجد، جس کا تعلق فینیقیہ سے تھا، متمدن دنیا میں پھیلی۔ اس سے چند قلم پیدا ہوئے۔ ان میں ایک خط ارامی تھا۔ ارام حضرت سام کے بیٹے اور حضرت نوح کے پوتے تھے۔ یہ قبائل ساحل بحرین پر دیگر عربوں کے ساتھ آباد تھے۔ ان کی زبان قریب قریب بالکل عربی تھی جس میں ارامی زبان کے مادے بکثرت شامل تھے۔ ابتدا میں فینیقیہ اور ارامی خطوط میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا کیونکہ ارامی خط فی الاصل مصری خط کو سامنے رکھ کر معمولی فرق کے ساتھ جاری کیا گیا تھا۔ بعد میں یہ فرق نمایاں ہوگیا۔

جب سامی اقوام کا متمدن دنیا سے ربط ضبط بڑھا تو انہوں نے اپنی قدیم زبان سومری کے علاوہ ارامی زبان اور خط دونوں کو اختیار کرلیا۔ اسی لئے ارامی خط کا دوسرا نام سامی ہے۔ اس کی دو شاخیں مشہور ہیں۔

تدمری : یہ ارامی خط کی پہلی شاخ ہے۔ دراصل یہ قلم تدمر (پال مائر) کے شہریوں کا تھا۔

نبطی : یہ دوسری مشہور شاخ ہے۔ اصل میں یہ قلم پیترا یا بطرا والوں کا خط تھا جو مدین، ارض سینا، فلسطین اور حوران (ممالک شام) میں رائج تھا۔ نبطی دراصل حضرت اسمعیل کی اولاد ہیں۔ حضرت اسمعیل کے ایک صاحبزادے کا نام "نابت" تھا۔ دو تین صدی قبل مسیح نبطیوں کی حکومت نجد سے سواحل بحر احمر، عقبہ اور بادیہ شام تک دراز تھی۔ ان کا مرکز شہر بطرا تھا اور زبان عربی تھی۔ ابتدا میں ان کا خط مسماری تھا جو انہوں نے سومریوں سے حاصل کیا تھا۔ سامیوں کی طرح جب نبطیوں کے بھی متمدن دنیا سے تعلقات پیدا ہوئے تو وہ سیاسی و تجارتی اغراض کے ماتحت اپنا مسماری خط چھوڑ کر ارامی خط میں کتابت کرنے لگے۔

مسند یا مسند سبائی : شمالی عرب میں خط ارامی کی تیسری شاخ مسند سبائی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ موجودہ دور میں یمن کی جو تاریخ کتبات آثار قدیمہ سے مرتب کی گئی ہے اس میں یمن کے تین دور دکھائے گئے ہیں۔ اول ملوک معین، دوم ملوک سبا اور سوم ملوک حمیر۔ یہ تمام بادشاہ نسل کے اعتبار سے ایک تھے لیکن ان کی حکومتوں کا زمانہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ اہل معین کی زبان سبائیوں سے مشابہ تھی۔ یہی وجہ ہے

---

[1] یہ قوم ابتدا میں ساحل بحرین اور خلیج فارس پر آباد تھی۔ جب اس پر یورش ہوئی تو نواح یمن میں آباد ہوئی۔ پھر دوسرے انقلاب میں ارض کنعان (شام) پہونچی۔ ساحل روم پر شہر صور (ٹائر) اور صیدا (سیڈان) انہی کی یادگار ہیں۔ اسی قوم نے کلدانیوں، یونانیوں اور عبرانیوں کو کتابت اور تجارت کی تعلیم دی۔ از تحقیقات ماہر ۱۲۔

کہ ان کی ابجد مسند حمیری کے نام سے مشہور ہوئی جس کا بیان آگے آئے گا۔ مسند سبائی سے تین قلم نکلے جو عرب قبائل کے نام سے موسوم ہوئے یعنی صفوی۔ ثمودی اور لحیانی۔

قبل اس کے کہ ہم مسند حمیری اور حیری یا قدیم کوفی کا ذکر چھیڑیں، قدیم خطوط کے ضمن میں حیثی۔ چینی اور جاپانی خطوط کا تذکرہ کریں گے تاکہ یہ سلسلہ اپنی جگہ مکمل ہو جائے۔

حیثی: ولادت حضرت مسیح سے قبل حیثی ایک قوم تھی جو فراعنۂ مصر کی ہم عصر تھی۔ یہ شام سے ایشیائے کوچک تک آباد تھی۔ اس کا خط بھی ہیروغلیفی کی طرح مصور مگر بھدا تھا۔ شہر حماۃ (شام) میں اس خط میں کتبات برآمد ہوئے ہیں۔

چینی: ایشیائی خطوط میں چینی ایک عجیب اور دلچسپ خط تھا۔ کیونکہ اس کی کتابت اوپر سے نیچے کی طرف ہوتی تھی۔ چینیوں کا اعتقاد تھا کہ فیضان الٰہی کا نزول آسمان سے زمین کی طرف ہوتا ہے۔

جاپانی: یہ خط درختوں کی شاخوں کی طرح پیچدار تھا، اس لئے اہل عرب اپنی اصطلاح میں اسے "شجر" کہتے تھے۔ اس کی دو قسمیں ہیں "کٹلنا" اور "ہیراگانا"۔ جاپانی اور قدیم مغلئی چینی خط ہی کی شاخیں ہیں۔

سریانی، عبرانی اور عربی خطوط دائیں سے بائیں جانب لکھے جاتے تھے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ انسان سے حرکت طبعی کا آغاز ہمیشہ دائیں ہاتھ اور دائیں قدم سے ہوتا ہے۔ جیسے آسمان دائیں سے بائیں یعنی مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتا ہے۔ اس کے برعکس ہندی، قبطی، رومی اور قدیم فارسی خطوط کی کتابت بائیں سے دائیں جانب ہوتی تھی۔ کیونکہ حکمائے یونان کی تحقیق کے مطابق دوران خون قلب سے شروع ہوتا ہے اور قلب بائیں جانب ہے۔ نیز قلب عقل کا مرکز ہے۔

مسند حمیری: ہیروغلیفی سے ارامی یا سامی خط تک (مربع عبرانی اور یونانی قدیم کو نظر انداز کرتے ہوئے کیونکہ وہ خارج از بحث ہیں) خطوط کی پانچ منزلیں پوری ہوتی ہیں چھٹی منزل سطرنجیلی (شاخ فنیقیہ) خط تھا جو ظاہر ہے مسلسل پانچ دور گزرنے کے بعد نہایت واضح اور روشن بن چکا تھا لیکن جب اسے نبطیوں نے اختیار کیا تو اس میں پھر بگاڑ پیدا ہو گئی جس کا عظیم ردعمل یمن میں جا کر ہوا۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں سمجھئے کہ سطرنجیلی اور نبطی کے لطیف امتزاج سے خطِ مسند حمیری وجود میں آیا۔

حیری یا قدیم کوفی: مسند حمیری کو اہل حیرہ نے مناسب اصلاح کے بعد اور بھی آراستہ و مہذب کیا اور یہ حیری یا قدیم کوفی کے نام سے مشہور ہوا واضح رہے کہ یہ اصلاحی خط کوفی نہ تھا جس کو عام طور پر خطِ کوفی جدید سمجھا جاتا ہے بلکہ محض وہ خط تھا جس کو اہل یمن اور اہل مکہ نے حیرہ والوں سے حاصل کیا تھا۔ اس عہد اور اس خط تک نقاط، اعراب، علامات اور اوقاف کا دستور بھی وضع نہیں ہوا تھا اور الف بھی سیدھا نہیں بنا تھا بلکہ نیچے کا حصہ مڑا ہوا تھا۔ اور اس کی شکل یہ تھی "ا" چنانچہ فرامین رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت علی کرم اللہ وجہ اور ان کے صاحبزادگان حضرت حسنؑ اور حسینؑ تک کی تمام تحریریں اسی خط حیری یا قدیم کوفی خط میں ہیں لہٰذا حیری کو جدید کوفی سمجھنا اور دوسروں کو یہ باور کرانا کہ رسول مقبولؐ، چاریار، صحابہ کرام اور حضرت حسن و حسین کے فرامین یا نسخہ ہائے قرآن مجید، جو اُن کے زمانے میں لکھے گئے جدید خطِ کوفی میں تھے، سراسر غلط اور ایک فاش غلطی ہوگی۔

قدیم خطوط کی تاریخ اس جگہ تقریباً ختم ہو جاتی ہے اور عربی ابجد یا خطوط کا آغاز ہوتا ہے۔ مشہور مؤرخ ہشام بن محمد کی روایت کے بموجب عربی خط کا بانی قبیلۂ نصر بن کنانہ میں سے تھا۔ دوسری روایت حمیر بن سبا کو اس کا موجد ٹھہراتی ہے۔ بہرحال یہ سب قبیلۂ قریش ہی کے افراد تھے۔

عربوں میں رسم الخط کی ترقی کے اسباب میں سب سے بڑا وحی الٰہی ہے جس کے ذریعہ قرآن نازل ہوا۔ حضرتؐ کو کتابت وحی کے لئے کاتبوں کی ضرورت پیش آئی تو آپ نے رسم الخط کی طرف توجہ فرمائی۔ غزوۂ بدر میں ستر قیدی ایسے ہاتھ آئے جو نوشت و خواند سے واقف تھے۔ آپ نے اپنی حکمت سے ہر قیدی کا فدیۂ آزادی یہ مقرر کیا کہ وہ دس آدمیوں کو کتابت کی تعلیم دے۔ اس طرح ایک قلیل مدت میں بیک وقت ۰۰۷ نفوس کتابت سے واقف ہو گئے اور پہلا دارالکتابت مدینہ ہوا۔ اس وقت مدینہ کے مقابلہ میں مکہ میں صرف ۱۶ آدمی ایسے تھے جو لکھنا جانتے تھے۔

بعد ازاں جب خلافت راشدہ کا آغاز اور اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا۔ اور تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ تدریس و تدوین میں ترقی ہوئی تو ایک ربع صدی ہی میں سینکڑوں کاتب اور منشی پیدا ہو گئے۔ اس کے بعد قرآن مجید کی حفاظت اور تبلیغ کے لئے چند نسخے لکھے گئے جن میں حضرت عثمان اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ پیش پیش تھے۔ اس وقت تک قرآن مجید کی کتابت میں نقاط اور اعراب کا رواج نہیں تھا۔ نقاط کی ایجاد حضرت علی کرم اللہ وجہ کے عہدِ خلافت میں حاکم بصرہ کے ایما پر ہوئی۔ ان نقاط کے موجد حضرت علی کرم اللہ وجہ کے ندیم خاص ابوالاسود تھے۔ ان نقاط نے پوری ایک صدی تک اعراب کا کام دیا۔ ابوالاسود کا دوسرا کارنامہ عربی نحو کے ابتدائی قواعد کی ترتیب اور تدوین تھا۔ ان کی وفات سنہ ۶۹ھ میں ہوئی۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا رسم الخط میں بھی مسلسل ترمیم و اصلاح ہوتی رہی پہلے حیرہ علمِ خط کا مرکز تھا مگر خلافت بنی امیہ اور عباسیہ میں مدینہ اور مکہ کے علاوہ بصرہ اور کوفہ بھی خط کا مرکز بن گئے۔ کوفہ کو ایسی تاریخی شہرت حاصل ہوئی کہ یہ شہر نہ صرف فن کتابت کا معلم ہوا بلکہ اکثر علوم عربی کا مبدا بن گیا۔ چنانچہ لغت کی پہلی کتاب جو خلیل بصری کی تصنیف تھی اس کی کتابت بھی کوفہ ہی میں ہوئی۔ جدید خط کوفی ابھی تک وجود میں نہیں آیا تھا۔

خط کوفی جدید : اس کا آغاز خلیل بن احمد نحوی موجد علمِ عروض کے زمانے سے ہوا۔ یہ عہد عباسی کا ایک نامور فاضل تھا۔ اس نے قدیم خط کی اصلاح کی اور موجودہ اعراب جاری کئے۔ سنہ ۱۷۰ھ میں وفات پائی۔ اسی سال خلیفہ ہارون الرشید عباسی تخت نشین ہوا۔ خلیل کے بعد علی بن حمزہ کسائی نحوی نے خلیل کے مہذب خط پر ایک اور غائر نظر ڈالی۔ اس میں خوشنویسی سے زیادہ مصورانہ شان اور نقاط میں بانکپن پیدا کیا۔ یہاں تک کہ اس خط کو قبول عام کی سند مل گئی اور اس خط کا نام "خط کوفی" ہوا جو آج تک اسی نام سے مشہور ہے۔ اب مصاحف کی کتابت اور دفتر انشار کی مراسلت بھی اسی خط میں ہونے لگی۔ کسائی نے سنہ ۱۸۲ھ میں وفات پائی۔ اسی عہد کو اس خط کی تاریخ سمجھنا چاہیئے۔

عہد ہارون الرشید سے عہد معتصم باللہ عباسی تک متعدد نامور خطاط ہوئے۔ ان خطاطوں کے تذکروں سے بلا اختلاف یہ ثابت ہے کہ خطِ نسخ کے جس قدر بہترین نمونے دورِ حاضر میں ملتے ہیں، ان سب کی اصل یہی خط کوفی ہے۔ خط کوفی سے عہد ہارون الرشید تک بارہ قلم (جدول ۱) ایجاد ہو چکے تھے۔ جن کی کتابت ہر قلم کی معنوی نسبت کے مطابق اسی خط میں ہوتی تھی۔ "تحقیقات ماہرین" اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ یہ بارہ قلم تیسری صدی ہجری تک رائج رہے۔ ان بارہ قلموں پر عہد ہارون الرشید کے بعد آٹھ قلم (جدول ۲) کا اور اضافہ ہوا۔ اس طرح خط کوفی سے جملہ بیس قلم نکلے۔ ان بیس قلموں کے ساتھ ساتھ چھ قلم (جدول ۳) اور جاری تھے جو خوشنویسی اور کتابت کلام مجید کے لئے مخصوص تھے۔ خلیفہ کے عہد میں گو ان تمام خطوط کے کاتب موجود تھے لیکن ان کے موجد اور معلم کون تھے، اس باب میں تاریخ تقریباً خاموش ہے۔ جب ابن مقلہ نے اپنے چھ خط (جدول ۴) ایجاد کئے تو یہ تمام خط یکسر متروک اور فنا ہو گئے۔

خطِ نسخ : فی الاصل خط کوفی کا مصلح اعظم و اول ابو علی محمد بن علی بن حسن بن عبداللہ ملقب بہ ابن مقلہ تھا۔ سنہ ۲۷۲ھ میں پیدا ہوا۔ خلیفہ القاہر باللہ عباسی کا وزیر تھا۔ لیکن بعض امور سیاسی میں اختلاف کے باعث ابن مقلہ نے خلیفہ کے خلاف سازش کی، اُس وقت تو وہ کسی نہ کسی طرح اس سازش کی پاداش سے بچ گیا، کیونکہ سازش کے ماتحت خلیفہ معزول ہو گیا تھا۔ لیکن جب اس کا بیٹا ابو العباس راضی باللہ خلیفہ ہوا اور سازش عیاں ہو گئی تو قید ہوا۔ اُس کا دایاں ہاتھ اور زبان کاٹ دی گئی اور اسی حالت میں بعمر ۵۶ سال سنہ ۳۲۸ھ میں وفات پائی۔ ابن مقلہ کا انتہائی کمال یہ تھا کہ جب دایاں ہاتھ کٹ گیا تو کہنی میں قلم باندھ کر لکھتا اور لاجواب لکھتا۔ اُس نے ایک خاص روشنائی ایجاد کی تھی جس نے اس کے خط کو اور روشن کر دیا تھا۔ اس عدیم النظیر خطاط نے خط کوفی اور معقلی کے لطیف امتزاج سے اول خطِ نسخ کے علاوہ پانچ اور قلم (جدول ۴) جاری کئے۔ ان پانچ خطوں کے بعد چھ قلم (جدول ۵) اور نکلے مگر ان کو نئے قلم کہنا درست نہیں۔ دراصل یہ سب نسخ کی شاخیں ہیں جو ابن مقلہ اور دوسرے خطاطوں کی اصلاح کردہ ہیں۔ دوسرے اصلاح کرنے والوں میں سے ایک مشہور و معروف خطاط ابو الحسن علی ابن ہلال بوّاب (دربان) تھا۔ ابن بوّاب، ابن مقلہ کی وفات سے تقریباً ۸۴ سال بعد پیدا ہوا اور آسمانِ شہرت پر بدر کامل ہو کر چمکا کیونکہ خط نسخ کی تہذیب اور حسن و جمال کا سہرا آخر میں ابن بوّاب کے سر رہا۔ یہ ۴۱۳ھ / ۱۰۲۲ء یا ۴۲۳ھ میں بمقام بغداد فوت ہوا۔ ابن بوّاب کے بعد نسخ کے باکمالوں میں تین یاقوت مشہور ہوئے۔

یاقوت اول : امین الدولہ ابو الدر یاقوت بن عبداللہ موصلی۔ یہ شاہ سلجوقی کا درباری تھا، اس لئے یاقوت الملکی مشہور ہوا ۶۱۸ھ/۱۲۲۱ء میں بمقام موصل وفات پائی۔

یاقوت دوم : یاقوت بن عبداللہ الرومی الحموی ہوا اس نے ۶۲۶ھ میں وفات پائی۔

یاقوت سوم : یاقوت بن یاقوت بن عبداللہ رومی المستعصمی۔ یہ باکمال ابو المجد خواجہ عماد الدین رومی کے نام سے بھی مشہور تھا۔ خط نسخ کا آخری امام یہی ہوا ہے جس پر اس فن کا خاتمہ ہوگیا ۶۹۸ھ/۱۲۹۹ء میں وفات پائی۔ اس یاقوت کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک قرآن مجید اب تک نواب زادہ سعید الظفر خاں بہادر بھوپال کے کتب خانے میں موجود ہے۔ نواب موصوف نے اسے پیرزادگان مارہرہ شریف کے کتب خانے سے حاصل کیا تھا۔

ایران کی تاریخ کتابت کیومرث سے شروع ہوتی ہے جسے ایرانی یا زردشتی اپنے ملک کا باوا آدم سمجھتے ہیں اس کے چھ دور مقرر ہوئے ہیں :

۱۔ **آشوری دور** : جرمن محقق اسپیگل کی تحقیق کے مطابق مسیح سے ایک ہزار برس قبل ایران میں زبان قدیم فارسی اور پیکانی خط رائج تھا جو مصری اور چینی خط سے مشابہ ہونے کے ساتھ ساتھ مصور بھی تھا۔

۲۔ **میڈوی دور** : (مسیح سے ۰۰ ۶ برس قبل) اس میں وہی قدیم زبان فارسی تھی، جو اب مفقود ہو چکی ہے اور خط پیکانی تھا۔

۳۔ **قدیم ایرانی دور** : (۵۵۹ سے ۳۳۰ ق۔م تک) اس عہد کا آخری بادشاہ دارائے اعظم تھا۔ جس کو سکندر اعظم یونانی نے شکست دی اور ایران کو تاخت و تاراج کیا۔ چنانچہ کوہ بے ستون اور نقش رستم کے کتبات میں ان کے کارنامے درج ہیں جو قریب قریب پیکانی خط میں ہیں زبان قدیم فارسی یا اوستائی تھی۔

۴۔ **طوائف الملوکی دور** : (۳۳۰ ق م سے ۲۲۶ ق م تک) اس عہد کی بدنظمی کی کیفیت شاہنامہ فردوسی میں "اشکانیاں" کے عنوان کے تحت زبان فارسی میں درج ہے۔ قدیم کتابت بدستور قائم رہی۔

۵۔ **ساسانی دور** : (۲۲۶ تا ۶۵۲ ق م) ساسانی حکومت کا بانی اردشیر تھا۔ جس نے زردشتی مذہب کو دوبارہ حیات بخشی۔ بہرام، نوشیرواں خسرو پرویز وغیرہ نامور بادشاہ ہوئے۔ آخری بادشاہ یزدگرد ۳۱ھ/۶۵۲ء میں قتل ہوا۔ زبان متوسط فارسی ہوگئی جو اس وقت عرف عام میں پہلوی کہلاتی تھی۔ خط بھی پہلوی ہوگیا لیکن اس کا ماخذ شکستہ شکل میں مسماری ہی تھا۔

۶۔ **اسلامی دور** : (آغاز از عہد خلافت فاروقی) حلقہ بگوش اسلام ہو جانے کے بعد چونکہ مذہبی احکام کی ادائیگی کے لئے قرآن کریم کا لکھنا پڑھنا اور سمجھنا لازم ہوگیا تھا، اس لئے ایرانی نوشت و خواند میں عربی کا عمل دخل بڑی تیزی سے شروع ہوا اس کے باوجود آئندہ ایک صدی تک پہلوی خط دوش بدوش جاری رہا۔ اس کا ثبوت رودکی کے اشعار سے ملتا ہے :-

فکاهیہ،

پرائی موٹر کا چسکا

سیّد ضمیر جعفری

دوست بدظن ہیں کہ ان سے بدگماں رہتا ہوں میں
ماہ و مہر و مشتری کا "ہمعناں" رہتا ہوں میں

کیا بتاؤں دوستوں کو اب کہاں رہتا ہوں میں
اپنے ہمسائے کی موٹر میں رواں رہتا ہوں میں

رفتہ رفتہ ترک سب سے دوستانہ ہوگیا
ہوتے ہوتے میں "ضمیرِ غائبانہ" ہوگیا

یہ نہیں کہ آجکل میں "خستہ ڈالر" میں ہوں
میں اسی جوتی، اسی ٹوپی اسی کالر میں ہوں

میرا کیا مقدور میں کنگال گیلن بھر میں ہوں
یہ تو اس داتا کی بخشش ہے کہ اس موٹر میں ہوں

کیا کروں عادات کو اوقات پر قابو نہیں
اندریں حالات اپنی ذات پر قابو نہیں

میں یہ کہتا ہوں کہ بارش ہے پری خانے کو چل
وہ یہ کہتا ہے سفارش ہے ذرا تھانے کو چل

میں یہ کہتا ہوں کسی شاداب کاشانے کو چل
وہ یہ کہتا ہے کہ بس خالی ہوا کھانے کو چل

میں یہ کہتا ہوں وہاں کچھ شعر تر ہو جائیں گے
وہ یہ کہتا ہے کہ شاعر دردِ سر ہو جائیں گے

میں یہ کہتا ہوں کہ اقسرماں تک لے چل مجھے
وہ لئے جاتا ہے سوئے مشہد و موصل مجھے

میں یہ کہتا ہوں ذرا حسن کے دو اِک پل مجھے
وہ یہ کہتا ہے ذرا لٹھا مجھے، ململ مجھے

اختیار اس کی روانی پر اگر ہوتا مجھے
"دیکھنا سپنا مجھے، موسے مجھے، جلوا مجھے"

جب سے ارزاں ہوگئی یہ کار بے دام و درم
کوچہ و بازار میں چلنے سے گھٹ جاتا ہے دم

الحذر! یہ ہر طرف چھلکی ہوئی "خیر الامم"!
ران پر ریڑھے کا پہیا، کان پر تانگے کا بم

اے مرے پیارے، گلی کوچے کے یارو! الوداع!
سائیکلسٹو، پیدلو، تانگہ سوارو۔ الوداع!

دو قدم چلنا ہوا دشوار یارو کیا کروں
حوصلہ کم۔ فاصلے بسیار، یارو کیا کروں

بن گئی رفتار ہی دیوار یارو کیا کروں
کر دیا اِس کار نے بیکار یارو کیا کروں

گھر سے تو اکثر بہ قصدِ دوستاں آتا ہوں میں
پھر جدھر موٹر چلی جائے چلا جاتا ہوں میں

"ماہ مارچ کے لیل و نہار" —— بقیہ : ص ۳۵

آج ری پبلک ڈے کی وجہ سے لاہور میں بڑے ہنگامے ہیں۔ زمین پر بھی آسمان پر بھی —— میں زیادہ تر عادتاً آسمان ہی پر رہی۔ وہاں اتنا حسن اور اس قدر جاذبیت تھی۔ بمشکل ڈیڑھ بجے لنچ کے لئے نیچے اُتری۔ تمام بلیوں کو گولیاں نگلوائیں۔ کھانا کھلایا۔ ... ۔ ورسچاں کو دانہ دیا۔ جعفر کو امرود اور ہری مرچ دی، پھر خود کھانا کھانے بیٹھی۔ آج میں نے مصنوعی حرارت سے پختہ پھل بھی کھائے۔ امتیاز نواب سر مہر شاہ کے ہاں لنچ پر گئے ہوئے اور یاسمین اپنی سہیلیوں کے ساتھ "کنگ اینڈ آئی" فلم دیکھنے گئی تھی۔ مگر تھوڑی دیر میں ایک مینی و دو گوش واپس آگئیں۔ دلچسپ اور خوبصورت تصویر ہے۔ میری دیکھی ہوئی ہے :۔

آج کی رات دن کی طرح روشن تھی۔ تمام شہر چراغاں تھا۔ بقعۂ نور راستوں پر لوگوں کے اژدحام میں خراماں خراماں کار میں ہم گویا چہل قدمی کرتے رہے۔ روشنی دیکھنے کے دوران میں امتیاز پر عجیب قسم کی سرور آگیں کیفیت طاری تھی جس کی لاشعوری وجہ پر غور کرنے کا مجھے اب تک وقت نہیں ملا۔ جو فقرہ بھی اُن کی زبان سے ادا ہوتا وہ ناچتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کار یاسمین چلا رہی تھی۔ اُس سے کہا: "دیکھنا لوگن میں کریا نہ پھنس جائے"۔ مطلب تھا دیکھنا لوگوں میں کار نہ پھنس جائے۔ یہ سُن کر یاسمین کہنے لگی "یہ تو کسی ٹھمری کے بول معلوم ہوتے ہیں"۔ میرے بار بار ٹوکنے پر بھی وہ باز نہ آئے۔ جنرل پوسٹ آفس آئی تو اُسے "پتا فیش" کے نام سے یاد کیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی پرانے یونانی فلسفی کا نام ہو۔ جب میں نے اِس طرزِ تکلم پر اعتراض کیا تو ایک مصنوعی وقار سے فرمایا "جب کوئی عالم چھٹی منانے کے لئے نکلتا ہے تو اس کی ذہنیت اس طرح RELAX کرتی ہے"۔ اِن حرکات کی نفسیاتی وجہ ڈھونڈنے کا وقت نہ تھا کیونکہ ڈنر کے بعد محکمۂ ریڈیو کے بلاوے پر اُن کے جشنِ موسیقی میں جانا تھا۔ ریڈیو اسٹیشن کے سبزہ زار پر شامیانوں کے زیرِ سایہ ایک ہزار (اندازاً) موسیقی کے شیدا مہمان بیٹھے تھے۔ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے جج صاحبان۔ کل کے منسٹر صاحبان (کیونکہ آج پنجاب کی منسٹری ٹوٹ چکی ہے) اور یہاں کی عمارتِ تہذیب و ثقافت کے کئی مضبوط ستون رونق افروزِ بزم تھے۔ دیر میں پہنچنے کے باوجود خوش قسمتی اور اتفاق سے مجھے صفِ اوّل میں جگہ مل گئی۔ اس لئے میں بآسانی ماہرینِ موسیقی کی دلخراش تانوں کے ساتھ اُن کے چہروں کے جذباتی اتار چڑھاؤ کو بھی دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد نشستیں نہ رہی تھیں۔ بعد میں آنے والی کئی خواتین کھڑی تھیں۔ آخر امتیاز اور نصیر نے ہمت سے کام لیا اور اپنی نشستیں اُن خواتین کے لئے چھوڑ دیں اور خود قالین پر ہمارے گھٹنوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد کئی حضرات نے اُن لوگوں کی تقلید کی :۔

موسیقی کے پرستاروں کا وجد۔ ستار طبلے اور سارنگی کے دلنواز اور کیف آور نغمے۔ موسیقاروں کا انہماک اور کمال۔ گل سوسن و برگ ریحان کی نکہتیں۔ غرض حسین رات پر ایک داستانی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ اتفاق کی بات کہ اتنے میں موسیقاروں نے ایک قوالی شروع کر دی جس کے بول تھے :۔

"حالات بدلتے رہتے ہیں
دن رات بدلتے رہتے ہیں"

اس پر راجہ غضنفر علی خاں صاحب نے قہقہہ لگا کر ایک دن پہلے کے فوڈ منسٹر پیرزادہ عبدالستار صاحب کی طرف دیکھا۔ اس پر پیرزادہ صاحب فرمانے لگے "سیاسیات جیسی گندی چیز کو فن جیسی خوبصورت چیز سے نہ ٹکرائیے راجہ صاحب"!

اس جشن سے ڈیڑھ بجے لوٹے۔ رات گیلی اور تاریک ہے۔ گھٹائیں ہیں اور ہوشربا برساتی ہوائیں —— ! اور ابھی ——

آخر میں نزاکت علی، سلامت علی مشہور موسیقاروں نے ایک گھنٹہ کلاسیکی موسیقی سنائی۔ پروگرام دیکھ کر اندیشہ ہو رہا تھا کہ فنی مہارت کی یہ موسیقی گھنٹہ بھر کیوں کر سنی جائے گی۔ مگر دونوں گانے والوں نے محفل کو مسحور کر لیا۔ ریڈیو سیٹ پر شاید اتنی دیر اس قسم کی موسیقی نہ سنی جا سکتی۔ سامنے بیٹھ کر محفل میں سننا بہت پر لطف تھا :۔

اس جشن سے ڈیڑھ بجے گھر لوٹے۔ رات گیلی اور سخت خنک ہے۔ گھٹائیں ہیں اور ہوشربا برساتی ہوائیں ! ابھی دو ہی بجے ہیں۔ ایشیائی بہاروں کی راتیں نیند میں ضائع کرنے کے لئے نہیں ہوتیں۔ انہیں تخیلات میں بسر کرنا چاہیئے —— یہ بھی ممکن ہے کہ میں رات کی اس پر اسراریت میں شمع ہاتھ میں لے کر اِدھر اُدھر بھٹکتی پھروں اور اُن چیزوں کو ڈھونڈوں جو مجھے کبھی دستیاب نہ ہو سکیں !

اُفق تا اُفق

(چیدہ اقتباسات)

مسئلۂ کشمیر: صلاح الدین خورشید

۱۔ اس مضمون کے اہم مطالب یہ ہیں: ماضی اور حال میں اہلِ کشمیر پر ظلم و ستم، سکھوں، اور ہندوؤں کی لوٹ کھسوٹ اور بہیمانہ مظالم

۲۔ تاریخی پس منظر: اہلِ کشمیر کا قبول اسلام، عہدِ مغلیہ میں ان کی خوشحالی، سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد سکھوں کے حملے، پھر ہندوؤں کے حملے، موجودہ حکمراں خاندان کی انگریزوں کے ساتھ سازش، معاہدہ امرتسر (۱۸۴۶ء)

۳۔ اہلِ کشمیر کی بغاوت۔ ۱۵۰ سال سے تحریک آزادی کا قیام۔ وادیٔ کشمیر میں آزادی کے لئے جو جد و جہد کی جا رہی ہے وہ نوزائیدہ نہیں بلکہ ۱۵۰ سال سے کسی نہ کسی صورت میں جاری رہی ہے۔

۴۔ تقسیم برصغیر، قیام پاکستان، انضمام ریاستہائے مختلفہ۔

۵۔ مہاراجہ کشمیر کی بھارتی حکومت کے ساتھ سازش اور کشمیر کا بھارت سے الحاق۔

۶۔ فسادات و خونریزی۔ بھارتی حکومت کا اعلان کہ یہ انضمام عارضی ہے، آخری فیصلہ اہلِ کشمیر کریں گے۔ (اکتوبر ۱۹۴۷ء)

۷۔ بھارت کی جانب سے متعدد بار عہد شکنی۔ اقوام متحدہ کے فیصلوں اور قرار دادوں سے انحراف۔ پنڈت نہرو کی استفتاء یا استصواب رائے سے متعلق اولاً ٹال مٹول اور پھر انکار صریح۔ پنڈت نہرو کی بے طور روش اور عناد پرزور، معاہدہ بغداد اور سیٹو سے متعلق غیر منطقی حجت۔

۸۔ شیخ عبداللہ کی گرفتاری اور قید، اقوام متحدہ کے نام شیخ عبداللہ کا مراسلہ جس میں مقبوضہ کشمیر میں مظالم و استبداد، وحشی قوانین کا نفاذ، کشمیری لیڈروں کی گرفتاری اور زباں بندی اور استصواب رائے کے مسئلہ کا ذکر ہے۔

۹۔ بھارتی حکومت سے مطالبہ کہ وہ اقوام متحدہ کی قرار داد کا احترام کرے اور عالمی نگرانی میں استفتاء رو بہ عمل لائے۔

اسلام سے پیشتر عربی شعر میں فلسفۂ زندگی: عباس محمود العقاد

اخلاقی قدار کو سمجھنے کے لئے عرب کسی فلسفی یا معلم اخلاق کی طرف رجوع نہیں کرتے بلکہ شاعروں کے کلام میں اخلاقی مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں، اس حقیقت کو مشہور شاعر ابوتمام نے اپنے ایک شعر میں یوں سمویا ہے:

اگر شعر چند اخلاق و صفات کی نشاندہی نہ کرتا تو بڑی شخصیتیں بلندی اور عظمت کی ان منزلوں پر نہ پہنچ پاتیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اخلاقِ حمیدہ اور صفات عالیہ سے متعلق کوئی بات ایسی نہیں جس کا ذکر شعر عربی نے نہ کیا ہو، اہم بات یہ ہے کہ شعر میں ایسی زندگی بخش اور متحرک تصویریں پیش کی جاتی ہیں کہ عام طور پر عرب اپنے جذبات و فطرت اور اخلاقی فعالیت کے درمیان ہم آہنگی محسوس کرتے ہیں، ان کے نزدیک مبہم سے اخلاقی نظریات۔ فلسفیانہ موشگافی اور منطقی دلیلہ دوانیاں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں، ان کے نزدیک اچھے اخلاق کی کسوٹی ایسی عظیم شخصیتیں ہیں جن کے کارنامے اخلاق حمیدہ کی عملی نمائندگی کرتے ہیں اور جن کے اعمال میں ہر مرد و زن اور پیر و جواں کو اپنی افتاد کے مطابق عملی مثالیں مل جاتی ہیں۔

تاریخ اسلام کے چند صفحات: ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن (سابق ریکٹر اسیوط یونیورسٹی)

تاریخ عبرت انگیز حوادث سے بھری پڑی ہے، انسان اپنی زندگی کے مسائل حل کرنے میں ان حوادث سے مدد لے سکتا ہے تاریخ اسلام بھی ایسے حوادث و واقعات سے پُر ہے آپ کو ایسے کئی خلفاء، امراء، قواد، علماء اور مصلحین کا ذکر ملے گا جنہوں نے فضلیت کا پرچم لہرانے اجتماعی عدل قائم کرنے اور تہذیب و تمدن کو آگے بڑھانے میں گراں مایہ خدمات انجام دی ہیں۔

فاضل مؤلف نے رسولِ کریم، خلفاء راشدین اور بعض اموی خلفاء کی سوانح حیات کے چند شذرات پیش کئے ہیں، ان کے سادہ طرزِ زندگی اور عظیم کارناموں پر خاص طور پر زور دیا ہے اور گاہ بگاہ موجودہ اجتماعی مصائب پر نکتہ چینی کرتے ہوئے صدرِ اسلام کی اجتماعی زندگی اختیار کرنے کی دعوت دی ہے مضمون نگار نے اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ رومن اور دیگر اقوام کے ساتھ اختلاط سے عرب کس حد تک متاثر ہوئے، امیر معاویہ نے نظام حکومت انہی سے مقتبس کیا تھا، خلفاء بنی امیہ سے پیشتر ممالک اسلامیہ میں شاہانہ شان و شوکت اور دبدبۂ سلطانی معدوم تھا، اموی خلفاء نے پہلی بار ان مظاہر کو اختیار کیا، اعیان و ارباب نسبت و کشاد نے حکمراں طبقہ کی تقلید میں آہستہ آہستہ حسب مراتب ان مظاہر کو اختیار کرنا شروع کر دیا، اونچے اونچے محل تعمیر کئے گئے، بڑے بڑے باغ لگائے گئے دمشق رشک جناں ہو گیا۔

آخر میں کھیلوں کا ذکر کیا گیا ہے مضمون نگار کا خیال ہے کہ مسلمانوں میں اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک پہلا خلیفہ ہے جس نے گھوڑ دوڑ کی ابتدا کی، اس زمانے میں دیگر کھیلوں کے علاوہ چوگان بازی کا کھیل نہایت مقبول تھا۔

معراج: جواد المرابط (الوزیر المفوض سفارت خانہ شام در پاکستان)

اس مضمون میں معراج پر روشنی ڈالی گئی ہے عقل انسانی کائنات کی لذت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی۔ خدائے تعالیٰ انبیاء کے وسیلہ سے بنی نوع انسان کو راہ راست دکھاتا ہے، ماورائے کائنات کا علم کسی کو نہیں، سوائے معراج در اصل اس عالم الغیب کی ایک جھلک ہے، اللہ نے رسولِ کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس عنایت خاص سے نوازا مگر آہ کہاں مقام ... واقعۂ معراج ہوا وہ آج دنیا بھر کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کے قبضہ میں ہے...... اے فلسطین، ہماری آنکھیں تیرے غم میں اشکبار ہیں لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فلسطین پر یہودیوں کے قبضہ کا حادثۂ فاجعہ طوفان بلاخیز ثابت ہوگا۔ یہ سفینہ ایک چٹان سے ٹکرائے گا اور تمام عناصر ندامت و ہوان کے گرداب میں جا پھنسیں گے"

فاضل مؤلف نے نماز کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے پابندیٔ احکام دین کی دعوت دی ہے۔ ڈاکٹر اقبال کے مندرجہ ذیل دو شعروں کا عربی ترجمہ نقل کیا ہے:

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں	اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات
یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے	ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

پاکستان کی یاد میں: نزیہ فنصتہ "مالک" اخبار "الانباء" (دمشق)

یورپ، امریکہ، ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ممالک کا میں نے دورہ کیا ہے لیکن میری لوحِ قلب پر دورۂ پاکستان نے جو نقوش چھوڑے ہیں وہ کبھی محو نہ ہوں گے حد درجہ تعجب خیز یہ بات ہے کہ اس نوزائیدہ ملک نے اتنی مختصر سی مدت میں تعمیر و ترقی کے ایسے بے نظیر کارنامے انجام دئے ہیں کہ کوئی ملک ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

سیدھی
پیٹھ اور مضبوط
اعضاء کے لئے
اپنے
ننھّے بچّہ کو یہ
خالص دودھ
دیجئے
OSTERMILK
آسٹر ملک ایک خالص قوت بخش اور غذائیت والا دودھ ہے جوکہ اُن
بچّوں کے لئے بیحد ضروری ہے جنکو کہ مائیں چھاتی کا دودھ کامیابی سے نہیں پلا سکتی
ہیں۔ہڈیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے اسمیں وٹامن "ڈی" ملایا جاتا ہے اور
لوہا اس لئے ملایا جاتا ہے کہ بچّے خون کی کمی والی بیماری سے محفوظ رہ سکیں۔بچّوں کو
سیدھی پیٹھ اور مضبوط بازؤں کیلئے اچھی و قوت بخش غذا کی سخت ضرورت ہے۔
اسی لئے آج ہی آپ آسٹر ملک خریدیئے تاکہ اطمینان ہو جائے کہ آپ کا بچہ بہترین
دودھ پا رہا ہے۔یہ خاص کر پاکستان میں بچوں کے لئے نہایت موزوں ہے۔
آسٹر ملک
ماں کے دودھ سے قریب تر
ہر ماں کے لئے مفید مشورہ
سنگترہ کا رس پہلے مہینہ کے بعد سے ہر بچّہ کو دینا چاہئے۔اسمیں وٹامن "سی"
ہوتا ہے جو کہ صحت کے لئے ضروری اور ہاضمہ کے لئے مفید ہے۔ایک چھوٹے چمچہ کے
برابر رس اُسی قدر پانی کے ساتھ ابتدا میں دینا شروع کیجئے۔ضرورت ہو تو
تھوڑی شکر یا گلیکسو کا تھوڑا گلوکوز ڈی بھی ملا دیا کیجئے۔
گلیکسو لیبوریٹریز (پاکستان) لمیٹڈ
کراچی لاہور چٹاگانگ ڈھاکہ

نقد و نظر

ش-ح

گویا دبستاں کھل گیا

مصنف : چودھری محمد علی ردولوی
ناشر : اکادمی پنجاب۔ مال روڈ۔ لاہور
صفحات ۲۸۴ - قیمت ڈھائی روپے۔

یہ چودھری محمد علی ردولوی کے نجی خطوط کا مجموعہ ہے جو اُن کی صاحبزادی ھُما بیگم نے مرتب کر کے مولوی صلاح الدین احمد کے مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اہل ذوق کے لئے اس مجموعے کا دراصل اتناہی تعارف کافی ہے۔ "کشکول محمد علی شاہ فقیر" کی اشاعت کے بعد اس حال میں کہ چودھری صاحب فرلیش اور تحریر و تصنیف سے معذور ہیں، سردست کسے گمان تھا کہ اُن کی تحریر کا ایک ایسا بھرپور مجموعہ اور ہاتھ آجائے گا۔ خانم موصوفہ نے کیا خوب کیا کہ اس کتاب کو مرتب کر دیا جس میں نہ صرف مصنف کی تحریر کے بڑے نادر نمونے محفوظ ہو گئے بلکہ اُردو خطوط کے سرمائے میں بھی ایک اچھوتی اور بڑی وقیع تالیف کا اضافہ ہوا۔ آپ بیتی کا سا انداز بلکہ سچ پُچ کی واردات تو چودھری صاحب کی سبھی تحریروں میں موجود ہے لیکن ان نجی خطوط کو ان کے سوانح کا بھی بڑا دلچسپ باب کہا جائے گا۔ چودھری صاحب جیسی مقبول ادبی شخصیت کے نجی کوائف اُردو کی ادبی دنیا کے لئے جو قدر و قیمت رکھتے ہیں وہ ظاہر ہے۔

اِن ۲۸۴ صفحات میں سو سے اوپر خطوط ہیں جن میں سے اکثر اُن کے عزیزوں کے نام ہیں اور کمتر بعض ادیبوں یا دوسرے دوستوں اور ملاقاتیوں کے نام۔ مدت تحریر ۱۹۳۲ء سے لے کر ایام حال تک ہے۔ اس کے باوجود طبیعت کی شگفتگی اور تحریر کی گرماگرمی میں کہیں بھی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ گویا پوری کتاب ایک مسلسل تصنیف ہے جو ایک ہی کیفیت میں ابھی کے ابھی لکھ کر تمام کی گئی ہے۔ موضوع کسی کی یاد آوری ہو، شکوہ و شکایت ہو، بادکھ بیماری، ادب یا آرٹ کا تذکرہ ہو یا بستی کا کوئی سکینڈل۔ زر زمین کا جھگڑا ہو یا کوئی رومانی واردات، چودھری صاحب کا قلم اُسی البیلے انداز سے پھول بکھیرتا اور رنگ اُڑاتا چلا جاتا ہے۔

اس یادگار مجموعے کے ایک مستقل ادبی تالیف ہونے میں کلام نہیں لیکن یہ کسی قدر تشنہ ضرور ہے — اُمید ہے کہ آئندہ اس کے زیادہ جامع ایڈیشن بھی شائع ہوں گے۔ کتاب مجلد اور ظاہری محاسن سے بھی آراستہ ہے۔

لکھنؤ کا دبستانِ شاعری

از : ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی
ناشر : اُردو مرکز۔ لاہور
مجلد، صفحات ۸۰۰، قیمت ۱۳/۸ روپے

لکھنؤ کا دبستانِ شاعری اُردو ادب کی تاریخ کا ایک اہم باب ہونے کے علاوہ ایک مجموعۂ افکار کا نام ہے جو بعض مستقل ادبی رجحانات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہ رجحانات تمام تر مستحسن نہیں، بلکہ ناقدین ادب نے ان کو بہت کچھ نشانۂ ملامت بنایا ہے لیکن ان کا مطالعہ اپنی جگہ نہایت دلچسپ ہے۔ لکھنؤ کی شاعری میں جذبات و گفتار کی وہ سادگی اور عشق کی گرمی نہ سہی جو دہلی کی خصوصیات شمار کی جاتی ہیں، لیکن اپنی جگہ یہ کلام نہایت پر لطف ہے اور تفنن طبع کے ایسے ایسے سامان رکھتا ہے کہ ان کا جواب دنیا بھر میں نہیں ملتا۔ زبان کی جِلا کا جو عمل دہلی میں قدرتاً جاری رہا تھا اُسے بھی لکھنؤ والوں نے آگے بڑھایا۔ ان میں سے بعض تبدیلیاں، خصوصاً متروکات دہلی میں بھی قبول کئے گئے۔ لیکن رفتہ رفتہ دونوں جگہ کی زبان میں محاورے کا اندک اختلاف ضرور پیدا ہوا اور لکھنؤ میں ہندی کی جگہ فارسی و عربی لغات پر زیادہ زور رہا۔ اگرچہ وہ سلیس زبان۔ جو دلی میں مقبول تھی پھر بھی معیار فصاحت رہی، لیکن زبان کی ترویج اور علمی ترقی کے ساتھ ملک کے طول و عرض میں وہ رجحان بڑھتا گیا جس کا اعتبار لکھنؤ نے قائم کیا تھا۔

زیرِ نظر کتاب جناب ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کا تحقیقی کارنامہ ہے جس میں لکھنوی ادب کا غائر جائزہ لیا گیا ہے اور تاریخی و تہذیبی پس منظر میں اُردو کی دو سو سال کی شاعری کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اِس ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے بہت سے ایسے ماخذ تک بھی دسترس بہم پہنچائی جو اب تک نادریافت تھے۔ یہ ایک ادبی جائزہ ہے، چنانچہ اس میں سوانح سے کم بحث کی گئی ہے اور تصانیف سے زیادہ۔ لیکن اپنی معیّنہ حدود میں یہ کتاب بڑی جامع اور ادب کے طالبعلموں کے لئے نہایت مفید تالیف ہے۔ مورخانہ اعتدال پسندی کے لحاظ سے مولّف کے تنقیدی نکات کہیں بھی گنجائشِ کلام نہیں رکھتے۔ یہ تالیف اُردو ادب کی تاریخ میں بلاشبہ بڑا وقیع اور پائیدار اضافہ ہے۔ آخر میں فہرست ماخذ، اشاریہ اور دوسرے ضمیمہ جات کے اضافے سے اس کی افادیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ لکھنؤ کی تہذیب کے جو مرقعے مولانا شرر نے پیش کئے ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ لیکن اس تہذیب کی خاص پیداوار یعنی شاعری کا یہ پہلا مفصل جائزہ ہے جو لیث صاحب نے تاریخی التزام کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ابھی ان شخصیتوں اور ان کے ادبی کارناموں پر دفتر لکھے جا سکتے ہیں لیکن ایک منضبط مطالعے اور یکجائی تبصرے کے طور پر یہ کتاب ہمیشہ مفید رہے گی۔ کتاب ظاہری محاسن کے لحاظ سے بھی امتیاز رکھتی ہے اور قدر کے قابل ہے۔

معلق شاہراہ : ———— بقیہ صفحہ ۲۸

"بابوجی اب چکر میں نہ پڑو" خان نے کہا "دیر ہو جائے گی" اور سب جیپ میں سوار ہو گئے۔

جیپ پیچھے کی طرف لڑھکنے لگی۔ مسعود بستر پر بیٹھا چٹکی بجا رہا تھا۔ ثمر سیب کھاتے ہوئے، سامنے کوہستان کی طرف حسرت بھری نظر سے دیکھ رہا تھا۔ اسحاق کی نگاہیں چھوٹی چھوٹی گلیاں تلاش کر رہی تھیں۔ تنیا اپنا کیمرہ ٹٹول رہا تھا۔ اور عبداللہ اطمینان سے گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا۔

دکانوں میں فیوڈل لارڈ بے پروائی اور بے حسی سے جیپ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بچے تالیاں بجاتے ہوئے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ دور عورتیں حسرت و حرماں بکھرے سروں میں رو رہی تھیں اور ڈھولک نا چنے کی بجائے اپنے سر پہ ہتھڑ مار رہی تھیں۔ نیچے کنہار ناچ رہا تھا، جیسے وہ ایک تماش بین ہو اور اس تماشے سے محظوظ ہو رہا ہو۔ سڑک گر رہی تھی اگرے جا رہی تھی اور جیپ پھسل رہی تھی' پھسلے جا رہی تھی!

افق تا افق : ———— بقیہ صفحہ ۵۳

اس ملک کی ہر چیز حسین و جمیل و جذاب، اس کے زعماء میں حب الوطنی کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور وہ ایسے جوش و خروش سے سرگرم عمل ہیں کہ ماننا انگشت بدنداں ہے۔ اس کے صدر جنرل اسکندر مرزا بے حد مقبول و محبوب ہیں۔ انہوں نے آیاتِ قرآنی کی ضیا پاش فضاء میں اس جمہوریت کا افتتاح ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو کیا۔

جمال فطرت کی تعریف سے قوت بیان عاجز ہے، لاہور تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں سے جس جنت کا وعدہ کیا ہے۔ لاہور اس کا نمونہ ہے ؛

اہل پاکستان کو ہر عربی چیز سے والہانہ عشق ہے، ان کی بے پناہ محبت صرف پرجوش استقبال پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ وہ عملی طور پر عربوں کے ہر مسئلہ میں دلچسپی لینتے ہیں اور پرخلوص حمایت و تائید کرتے ہیں ؛

ہر عرب اور اسلامی ملک کا فرض ہے کہ وہ پاکستان کے تمام مسائل میں اس کی مدد کریں، خاص طور پر مسئلہ کشمیر پر پاکستان کی ہر ممکن امداد و تائید کرنا چاہیئے۔۔ (معتبر عربی مجلہ "الوعی" کراچی سے)

دور موئی مکھی

یہ جون کا مہینہ ہے۔ اس مہینے میں ہمارے گھر، گلیاں، بازار، اسکول، دفتر سبھی مکھیوں کے بے پناہ حملوں کا شکار ہوتے ہیں۔ جب مکھیاں ہمارے منہ پر آ کر بیٹھتی یا بازوؤں پر رینگتی ہیں تو ایک سنسنی سی پیدا ہوتی ہے اور بڑا ناگوار گزرتا ہے۔ تعجب یہ ہے کہ ہم پھر بھی مکھیوں کے روادار ہوتے ہیں۔ وہ لوگ بھی، جو بقول کسے، ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیں، نہ معلوم ایسے ہی کس کن پاک چیزوں پر بیٹھنے دیتے ہیں۔ لیکن یہ بے پروائی بہت بڑی غلطی ہے کیونکہ مکھی مہلک بیماریاں پھیلاتی ہے جو اپاہج کر دیتی ہیں یا جان ہی لے کر ٹلتی ہیں۔

سمجھدار لوگ جانتے ہیں کہ عام گھریلو مکھی بڑی بڑی خطرناک بیماریوں کے جراثیم پھیلا سکتی ہے۔ مثلاً غذائی زہرباد، اسہال، پیچش، تپ محرقہ، ہیضہ، انتڑیوں میں کرم، ککرے

یہ ہیں مکھیوں کی خاص پرورش گاہیں

آپ کے لئے جو کچھ بھی دام ہوں مکھیوں کے لئے سارا بازار مفت ہے۔
ایسی چیزیں پوٹاشیم پرمینگنیٹ سے دھولینی چاہئیں

تپ دق یا سوکھا اور کئی دیگر بیماریاں بھی -

امید ہے اس مضمون کو پڑھنے والے ان باتوں کو دوسروں تک بھی پہنچائیں گے خصوصاً جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے - یہ ایک قومی اور سماجی خدمت ہے - جسے لازم سمجھنا چاہئیے -

مکھیاں انڈے کہاں دیتی ہیں ؟

مکھیوں کو انڈے دینے کے لئے گرمی اور نمی کی ضرورت ہوتی ہے - یہ دونوں چیزیں صحنوں، چوبچوں، پاخانوں، پیشاب خانوں، نالیوں اور غلیظ باورچی خانوں میں کوڑے کرکٹ اور گندگی کے ڈھیر پر ملتی ہیں۔ یہاں مکھی کو غذا بھی ملتی ہے اور وہ پرورش بھی پاتی ہے - کیونکہ مکھی کا من بھاتا کھاجا انسانوں اور جانوروں کا فضلہ ہے یا گلی سڑی ترکاریاں، پھل اور خوراک - مکھی کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں انڈے دیتی ہے جن میں سے ''لاروا،، یعنی چھوٹے چھوٹے بے پر کے کیڑے جلد ھی نکل آتے ھیں یہ گلتے سڑتے پھل ترکاریوں پر پل کر بڑے ہوجاتے ھیں پھر ان کے پر نکل آتے ھں - یہ مٹیالے رنگ کی انڈے سے ملتی جلتی ننھی سی جانیں ہوتی ہیں - اس حالت سے نکل کر یہ پوری مکھی بن جاتے ہیں جو خوراک کی تلاش میں گندگی کے قریب ترین ڈھیر یا گلتی سڑتی مردار چیزوں اور سبزیوں کی طرف لپک کر جاتی ہیں -

مکھیاں خوراک میں جراثیم کیونکر داخل کرتی ہیں ؟

مکھی ٹھوس چیزیں نہیں کھاسکتی - جب یہ کسی ٹھوس چیز پر آکر بیٹھتی ہے تو اپنے

معدے میں جو کچھ ہو باہر اگل دیتی ہے اور پھر اس اگلے ہوئے لعاب کا اپنی بیٹ کو ٹانگوں سے مل مل کر خوراک میں گھول دیتی ہے اور اپنی نلی جیسی لمبی سونڈ سے اس کو پی جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تصویر بڑی گھناؤنی ہے۔

مکھیوں کو خاص طور پر مٹھائیاں اور دودھ پسند ہیں، جن کو ہمارے بچے بھی پسند کرتے ہیں۔ اسی لئے ہمارے ملک میں، جہاں ہر کہیں مکھیوں کی بھرمار ہے، بچوں کی تعداد اموات بہت زیادہ ہے۔

پہلے خربوزہ تھا اب بیماریوں کی پوٹ ہے!

مکھی کی عمر دو تین ہفتوں سے زیادہ نہیں ہوتی، لیکن اس مختصر عرصے میں بھی یہ کتنی خوفناک تباہی نازل کر سکتی ہے۔ مکھی کی ٹانگوں اور بدن پر بڑے چھوٹے چھوٹے بال ہوتے ہیں جن کو صرف خوردبین ہی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر انکے ساتھ گندگی کے بے شمار ٹکڑے اور بیماری پھیلانے والے جراثیم چمٹے ہوتے ہیں۔ مکھیاں بڑی تیزی سے پھلتی پھولتی ہیں، چنانچہ ایک جوڑا، اگر چھ مہینے زندہ رہے، تو اپنی جیسی پچپن (۵۵) کروڑ اور مکھیاں پیدا کر سکتا ہے!!

مکھیوں پر قابو کیسے پایا جائے؟

چونکہ مکھیاں گندگی پر نشو و نما پاتی ہیں اسی لئے گندگی کو دور کر کے ہم ان کی پرورش گاہوں کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ صفائی کے علاوہ گھر کے اندر باہر مکھیوں کی روک تھام کا اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔

اسی مقصد کے لئے ہر گھر میں ایسے منہ بند

شہری رضاکار صفائی کی مہم پر

صفائی کی مہم میں محکمہ صحت کا ہاتھ بٹائیے

ڈبے میسر ہونے چاہئیں جن میں کوڑا کرکٹ اور گندگی ڈالی جاسکے۔ پاخانوں کو بالکل صاف رکھنا چاہئے۔ جہاں کہیں پانی بھرنے کے لئے باہر جاتے ہوں وہاں پاخانے کا دروازہ ایسا ہونا چاہئے کہ اس میں مکھیاں داخل نہ ہوسکیں اور کبھی کبھار اس کے چوکھٹے پر مٹی کا تیل بھی مل دینا چاہئے۔

اگر آپ کھیتوں یا فارموں کے پاس رہتے ہیں تو آپ کو جانوروں کا گوبر اور کھاد گڑھے میں

یہاں شیشہ بند مٹھائی مکھیوں کی دستبرد سے محفوظ ہے

ڈال کر اس پر مٹی ڈال دینا چاہیئے - کھانے پینے کی تمام چیزیں ڈھانپ کر رکھیں - مثلاً ہوادار نعمت خانوں میں کھانے پینے اور پکانے کے برتن خوب صاف ستھرے رہیں - یہ دھیان رکھیں کہ کہیں بچی کھچی کھانے کی چیزیں یا روٹی کے ٹکڑے فرش کے سوراخوں میں جمع نہ ہوجائیں -

جہاں مکھیاں زیادہ ہوں وہاں ''ڈی-ڈی-ٹی،، ''گیمیکزین،، یا ''فلٹ،، کا ایسا چھڑکاؤ کریں جو دیواروں، دروازوں اور دریچوں پر لگا رہ جائے - یہ بہت کارگر ثابت ہو گا اور اس کا اثر ڈیڑھ سے تین مہینے تک باقی رہیگا۔ مکھی کو معمولی چیز خیال کر کے بے پروائی نہ کریں - یہ آپکی صحت کے لئے بہت بڑا خطرہ ہے - ہم سب کو مکھیوں کے ملیامیٹ کرنے کا تہیہ کرلینا چاہئے - خاص طور پر موجودہ دنوں اور برسات کے موسم میں جب کہ مکھیوں کی خاص طورپر افراط ہوتی ہے *

کراچی :سرکاری اہتمام میں مچھلیوں کا ایک اسٹال

دن بہ دن
حسین جلد...
جی ہاں! آپ کی جلد میں ایک نئی تازگی پیدا ہوگی
رکسونا کے کیڈل آمیز جھاگ کو اپنی جلد پر ملئے
اور دھو ڈالئے۔ آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ کی جلد
دن بہ دن دل کش ہوتی جا رہی ہے۔ بے شک
Rexona
...رکسونا
صابن سے
دل کش اور فرحت بخش خوشبو!
جلد کو ملائم کرنے اور مقوی جلد تیلوں کے ایک خاص مرکب کا ملکیتی نام ہے۔
. 12-193 UD

ان کی تندرستی اہم ہے
اسی وجہ سے میں ہمیشہ ڈالڈا
سے کھانا تیار کرتی ہوں
اتنے ہی وٹامن جتنے کے اصلی گھی میں
اب ڈالڈا برانڈ وناسپتی میں بہت زیادہ
غذائیت ہے۔ ڈالڈا کے ہر اونس میں وٹامن اے کی
اتنی ہی مقدار موجود ہے جتنی کہ اچھے اور خالص گھی میں
ہوتی ہے۔ ڈالڈا میں وٹامن ڈی بھی موجود ہے! آپ کے
بچوں کی صحت مند پرورش کے لئے ان کی غذا میں ان
دونوں وٹامن کی موجودگی ضروری ہے
ہمیشہ محفوظ اور پاک و صاف
ڈالڈا برانڈ وناسپتی کو عمدہ نباتی تیلوں سے تیار
کر کے حفظان صحت کے اصولوں کے تحت سربمہر اور
ہوا بند ڈبوں میں بھرا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ تازہ اور
صاف ستھرا ہے۔ اپنے تمام کھانے ڈالڈا سے تیار
کیجئے۔ اور اپنے گھر والوں کو صحت مند رکھئے۔
ڈالڈا برانڈ وناسپتی
کھانوں کو بہتر بناتا ہے

میری قمیص
پٹخنا بند کرو...
چٹاخ! پٹاخ! تار تار جھالر،
ٹوٹے ہوئے ہک! پھٹی آستیں
میں اس طرح اپنی قمیص دُھلوانا نہیں چاہتی
سن لائٹ صابن استعمال کیجئے
جی ہاں- جب سن لائٹ صابن کافی مل سکتا ہے تو کپڑوں
کو اسطرح کوٹ پیٹ کر دھونیکی کیا ضرورت سن لائٹ
کے جلد اثر کرنیوالے جھاگ سے کوٹے پیٹے بغیر میل خود بخود
صاف ہو جاتا ہے- کپڑے بھگوئیے، سن لائٹ صابن ملئے اور
دھو ڈالئے بس آپکا کام ختم ہو گیا- اپنے تمام کپڑے سن لائٹ صابن
سے دھوتے-!
یہ آپ کے ہاتھ کی جلد کے لئے بھی مضر نہیں ہے
سن لائٹ صابن
SUNLIGHT SOAP
پٹخے بغیر کپڑوں کو
سفید اور اجلے
دھوتا ہے
S. 13-103 UD

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳، کراچی نے شائع کیا۔ مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ۔ کراچی
مدیر: رفیق خاور

ادارہ مطبوعات پاکستان کی تازہ پیشکش

وحید الہ آبادی (مرحوم)	ڈاکٹر محمد باقر	سوامی کلجگانند
پنڈت ہری چند اختر	محمد طاہر فاروقی	ماہر القادری
شیر افضل جعفری	روشن صدیقی	قمر جمیل
سجاد حارثی	یوسف بخاری	عبدالعزیز فطرت

سوات

مغربی پاکستان کی دل آویز قدرتی وادی

یں لکس
ٹائلٹ صابن
تعمال کرتی ہوں"
صبیحہ
کہتی ہے
فلمستان اداکارہ
"ناجی"
LUX
TOILET SOAP

قوت کا منصوبہ
معاشی اعتبار سے خود مکتفی ہونے نیز عوام کا معیار زندگی بہتر بنانے
کیلئے یہ ضروری ہے کہ پانی اور قوت کے تمام وسائل سے پورا پورا فائدہ
اٹھایا جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بہت سے ایسے ہمہ مدعا اداروں کی تشکیل
کی گئی ہے جن کا مقصد پانی سے برقی قوّت کے حصول، سیلاب کے
انسداد اور نظام آب پاشی کی توسیع کے علاوہ پانی کے نکاس کا
بندوبست کرنا اور نقل وحمل کی آسانیاں پیدا کرنا ہے۔
پٹرولیم سے بنی ہوئی چیزوں کی حتی المقدور باکفایت تقسیم کاری کے ذریعہ
برماشیل بھی پاکستان کی نشوونما اور ترقی میں برابر کی شریک ہے۔
برماشیل ترقئ پاکستان کا ایک حصہ ہے
BSP-390

ماہِ نو

جلد ۱۰ — شمارہ ۴

جولائی ۱۹۵۷ء

مدیر: رفیق خاور

نائب مدیر: ظفر قریشی

سالانہ چندہ
ساڑھے پانچ روپے

فی کاپی — آٹھ آنے

ادارۂ مطبوعات پاکستان
پوسٹ بکس ۱۸۳ - کراچی

	عنوان	مصنف	صفحہ
اداریہ:	آپس کی باتیں		۶
مقالات:	بہادر شاہ ظفر کی شاعری	محمد طاہر فاروقی	۷
	ملی ضروریات اور ملی زندگی	ڈاکٹر محمد باقر	۱۳
قطعہ:	شہر آشوب	وحید الدین وحید الہ آبادی مرحوم	۱۶
	رباعی	انیس مرحوم	۱۷
غزلیں:	پنڈت ہری چند اختر	روش صدیقی	۱۷
افسانہ، ڈرامہ:	تمثال (عربی سے)	محمود تیمور (مصری) مترجمہ: عطا حسین	۱۸
	زخمِ دل (ڈرامہ)	رحمٰن مذنب	۲۲
نظم:	ملتان	شیر افضل جعفری	۳۱
	راوی	محمد عظیم بھٹی	۳۷
	قول و قرار (پنجابی سے)	سائیں فضل - مترجمہ پرویز پروازی	۳۷
	لو	عبدالعزیز فطرت	۳۸
	اندھیرا	عاصمہ حسین	۳۸
ثقافت:	خطاطی (۲)	سید یوسف بخاری	۳۹
غزلیات:	ماہر القادری • شاد عارفی • قمر جمیل		
	عبداللہ خاور		۴۳-۴۵
افق تا افق:	(چیدہ اقتباسات)		۵۳
مقالہ:	بھگت کبیر	سوامی کلجگانند	۴۹
بہتر زندگی کیلئے:	(مصور فیچر) قدم دیکھ بھال کر رکھئے		۵۷
سرورق:	« طلوع » نقش: صغریٰ ربابی		

✡ ✡ ✡

آپس کی باتیں

ہم سوچ رہے تھے کہ ایک ہی خط جو کسی قوم یا خطے میں رائج ہو کس طرح دور دور تک پہنچ کر ایسے ایسے روپ بدلتا ہے کہ وہ سب بالکل الگ معلوم ہوتے ہیں گویا اُن کا اصل خط یا ایک دوسرے سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ بالخصوص جبکہ وہ چینی اور جاپانی خطوط کا روپ دھار کر ہمارے سامنے آئیں۔ اب ایک ایسی ہی چونکا دینے والی بات نے اس سوچ بچار کو اور بھی تازیانہ لگایا ہے یعنی مغرب کے کئی مشہور ادبی شاہکاروں کا سرچشمہ مشرق ہی کی افسانہ خیز اور داستان پرور سرزمین ہے۔ یہ تو خیر سب جانتے ہیں کہ دنیا میں تہذیبی لین دین کا سلسلہ شروع ہی سے جاری رہا ہے اور چراغ سے چراغ برابر جلتے چلے آئے ہیں۔ ایک کے بعد دوسری قوم نے دوسری تہذیبوں کے آثار کو اپنایا اور سمویا ہے، لیکن رفتہ رفتہ یہ حقیقت نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ بالخصوص اس وقت جب کسی قوم یا تہذیب کا آفتاب نصف النہار پر ہو اور دوسری قومیں اور تہذیبیں اس کے سامنے گہنا جائیں۔ چونکہ تاریخ کا تازہ ترین دور مغربی تہذیب و تمدن کے عروج ہی سے مرتب ہوا تھا، اس لئے اس کے متعلق بھی مدتوں حسنِ ظن رہا کہ اس کے مظاہر تمام تر اسی کی طبعی صلاحیتوں کے مرہونِ منت ہیں، لیکن آج اس میں مشرقی قوموں کے فیضان کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ اناجیل، الف لیلہ، واقعۂ معراج وغیرہ کی حد تک تو یہ فیضان اظہر من الشمس ہے اور عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن کتنے ہی امور ایسے ہیں جن میں یہ فیضان دبیز پردوں میں چھپا ہوا ہے۔ بعض محققین نے مغرب کے کتنے ہی اساطیر اور داستانوں کا سراغ ایران قدیم کے قصص و حکایات سے لگایا ہے ÷

زیر نظر شمارہ میں ایسا ہی انکشاف مغرب کی چند معرکہ آرا تصانیف کے بارہ میں کیا گیا ہے جن کو ہم تمام تر طبع زاد خیال کرتے ہوئے یہ سمجھتے رہے ہیں کہ جدت طرازی اہلِ مغرب ہی کا حصہ ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ مشرق میں ایسے گنج ہائے گراں مایہ اور بھی ہوں جن سے دانایانِ فرنگ نے استفادہ کیا۔ ایسے نوادر پر توجہ لازم ہے تاکہ ہم یہ سمجھ سکیں کہ فکر مشرق نے کس حد تک مغربی تہذیب و تمدن کی آبیاری کی ہے ÷

پچھلی بار "افق تا افق" کے زیر عنوان 'عربی سے جو چیدہ اقتباسات پیش کئے گئے تھے وہ ادارہ کے ایک فاضل رکن جناب عطا حسین نے "ماہ نو" کے لئے ترجمہ کئے تھے۔ موصوف نے ہمیں اُم الالسنہ کے علمی و ادبی نوادر سے روشناس کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اور متفرق تراشوں کے علاوہ وقتاً فوقتاً اہم شاہکاروں سے بھی نوازتے رہیں گے۔ اب کے انہوں نے ہمارے لئے نامور افسانہ نویس "محمود تیمور" کے ایک تازہ شاہکار کا ترجمہ کیا ہے جو ہم اس شمارہ میں پیش کر رہے ہیں ÷

اس شمارہ میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے یادگاری سلسلہ کی چند اور کڑیاں پیش کی جا رہی ہیں، جو اُمید ہے دلچسپی کا باعث ہوں گی۔ ان میں سے ایک ظفر کی شاعری پر خاصا دلچسپ مضمون ہے۔ بہادر شاہ ظفر صرف خاندان مغلیہ کا آخری تاجدار ہی نہ تھا بلکہ اردو کے باکمال شعراء کے سلسلہ میں بھی ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ اس کا کلام مختلف حیثیتوں سے توجہ کا مستحق ہے، گو اب تک بہت کم ناقدین نے اس پر نظر ڈالی ہے۔

اقلیتیں پاکستان کی ایک مقدس امانت ہیں۔ ان میں سے ایک "کبیر پنتھی" ہیں جو جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کے زیر سایہ پوری آزادی سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہمیں مسرت ہے کہ اب کی اس اقلیتی فرقہ کے ایک نمائندہ سوامی کلجگانند ہماری ادبی محفل میں شریک ہو رہے ہیں ÷

سرورق پر جو نقش پیش کیا جا رہا ہے، ایک پاکستانی مصورہ صغریٰ ربابی کے فن کا نمونہ ہے۔ اس میں شوخیٔ تصور کے ساتھ شوخیٔ اظہار کی رعنائیوں کو بھی کچھ کم دخل نہیں۔ اس میں تجرید اور واقعیت، سادگی و پرکاری، اس قدر گھل مل گئے ہیں کہ دیکھتے ہی مکمل وحدت کا احساس ہوتا ہے۔ اور "طلوع" کا تصور یک دم جھلک جاتا ہے ÷

ڈاکٹر باقر نے "ملی ضروریات اور ملی زبان" کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ بعض بنیادی اصلیتوں کو چھوتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ کاغذی تجویزیں پیش کرنے اور خیالی گھوڑے دوڑانے کی بہ نسبت کوئی عملی قدم اٹھانا یقیناً زیادہ کارآمد ثابت ہوگا ÷

مصور فیچر کے لئے تصاویر اور چارٹ ہمیں ٹریفک پولیس (کراچی) نے عنایت کئے ہیں جس کے لئے ہم اس کے ممنون ہیں ÷

بہادر شاہ ظفر کی شاعری

محمد طاہر فاروقی

بہادر شاہ ظفر روشن دل، دانشمند، بیدار مغز اور بلند حوصلہ انسان تھے لیکن ان کی ساری زندگی مجبوری اور بے بسی میں گزری۔ مشہور ہے کہ "بادشاہی شاہ عالم از دلی تا پالم" لیکن یہ حکومت ان کے والد اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں تو قلعۂ معلّی کے اندر ہی محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ بلکہ قلعہ کے اندر بھی انگریزوں کی سازشیں اور ریشہ دوانیاں چین سے نہیں بیٹھنے دیتی تھیں۔ بہادر شاہ کے تخت نشیں ہونے کے بعد یہ حالات اور بگڑتے گئے۔ ڈھلتے سورج کو روکنا کسی کے بس کا نہیں ہوتا، مگر بہادر شاہ ایک حسّاس، غیور اور صاحبِ دل شخص تھے۔ اس لئے اپنی بیچارگی و بے بسی پر ان کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ حالات و واقعات کی تلخی و ناخوشگواری نے طبیعت پر گہرا اثر ڈالا، تو انہیں تصوف و شاعری کے دامن میں پناہ نظر آئی۔ درویشی اور شاعری سے ان کو فطرتاً بھی مناسبت تھی۔ پھر مرشد و استاد ملے حضرت شاہ نصیرالدین عرف کالے صاحب (خلیفہ حضرت مولانا فخرالدینؒ) اور شاہ نصیر جیسے کاملینِ فن، چنانچہ بہادر شاہ ایک سچے صوفی اور کامل شاعر کے مرتبہ پر پہنچ گئے۔

شاعری میں ظفر کو چار استادانِ فن سے تلمذ حاصل ہوا، شاہ نصیر، کاظم حسین بیقرار، ذوق اور غالب۔ بیقرار سے مشورے کا زمانہ تھوڑا ہے اور مرزا غالب کو غزلیں بالکل آخر زمانے میں دکھائی گئی تھیں، جبکہ ظفر، عمر اور شاعری کی پختگی حاصل کر چکے تھے۔ اس لئے یہ کہنا بیجا نہیں کہ ان کے شاعرانہ رنگ کو نمایاں کرنے میں ان کی اپنی طبیعت کے بعد جو اثر ہو سکتا ہے وہ شاہ نصیر اور استاد ذوق کا ہے۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو ان کا اصلی رنگ ان دونوں سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

آزاد نے ظفر کے چاروں دیوان ان سے چھین لئے ہیں۔ وہ ابتدائی دیوان کو شاہ نصیر کی تصنیف اور باقی ساڑھے تین دیوان کو ذوق کا فیض بتلاتے ہیں۔ مگر یہ الزام لگا کر انہوں نے ظفر ہی نہیں، شاہ نصیر اور ذوق پر بھی ظلم کیا ہے۔ ظفر کے کلام پر ان کے استادوں کا اثر ضرور تلاش کیا جا سکتا ہے، مگر سارا کلام ان استادوں کی طرف منسوب کر دینا ذوق اور محمد حسین آزاد کے ساتھ زیادتی ہے۔ اس کے برعکس یوں کہنا چاہئے کہ جس طرح غالب کی آخری شاعری کو سہلِ ممتنع بنانے میں دوسرے اسباب کے ساتھ قلعہ سے وابستگی کو دخل تھا، اسی طرح ذوق کو قلعۂ معلّی کے تعلق ہی نے روزمرہ اور محاورے کا بادشاہ بنایا تھا۔ ویسے بھی ذوق کے کلام میں جیسی پرواز خیال، تازگی مضامین، عالی ادا فارسی ترکیبیں اور جوش و خروش پایا جاتا ہے (غزلوں سے زیادہ قصائد میں) ظفر کے ہاں ان کی تلاش بیکار ہے، بلکہ بقول مولانا حالیؔ "ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں اوّل سے آخر تک یکساں ہے۔ لیکن اس میں تازگی خیالات کم پائی جاتی ہے"۔ اس کے سوا ان کے ہاں جو معاملہ بندی، محاکات، درد و الم اور سوز و گداز پایا جاتا ہے، اس سے شاہ نصیر اور استاد ذوق کا کلام یکسر عاری ہے۔

ذوق نے شکایت کی ہے کہ:

> ذوق مرتب کیونکر ہو دیوان، شکوۂ فرصت کس سے کریں
>
> باندھے گلے میں ہم نے اپنے آپ ظفر کے جھگڑے ہیں

جاننے والے جانتے ہیں کہ ان جھگڑوں کے معنی دربارداری و حضوری کے ہیں نہ کہ دیوان تصنیف کرنے کے۔

دبستانِ دہلی کا یہ دور اردو شاعری کا عہدِ زرّیں ہے۔ ذوق، مومن اور غالب نے میر، سودا اور درد کے ورثے کو چار چاند لگا دئے تھے۔ ہم ظفر کی شاعری کو ان استادوں کی صف میں تو جگہ نہیں دے سکتے، لیکن ان کے بعد شیفتہ، ممنون، اور تسکین کے ساتھ ان کا نام ضرور لیا جائے گا۔ بلکہ اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے یہ دور ظفر کی شاعری کے بغیر نامکمل رہ جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ظفر

مصنوعی گر بھی تھے اور فطری شاعر بھی۔ ان کی شاعرانہ صناعی یا صناعانہ شاعری شیخ ناسخ اور شاہ نصیر کا رنگ دکھاتی ہے تو ان کی فطری شاعری میر و جرأت کی روش پر چل کر تغزل کے روپ کو نکھارتی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ تصور کیجئے کہ بہادر شاہ کیسی مصیبت اور بے بسی کا شکار تھے۔ دشمنوں کی مکاریاں اور سازشیں تو الگ رہیں، اپنوں کی بے وفائی و غداری ہر لحظہ ان کے حساس دل پر ٹھیس لگاتی ہوگی۔ اور دنیا کی بے ثباتی، حالات کی بے اعتباری اور زمانے کی نیرنگی نے ان کی طبیعت پر گہرے نقش ثبت کئے ہوں گے۔ اسی لئے انہوں نے جرأت کے رنگ سے ہٹ کر میر کی قلمرو میں بھی قدم رکھا۔ اور سچ یہ ہے کہ اپنے اس رنگ کی شاعری میں وہ اپنے استادوں کو کہیں پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ پھر یہ کہ تغزل اور معاملہ بندی کے ساتھ حزن و یاس اور سوز و گداز کا یہ امتزاج دوسرے باکمالوں میں آسانی سے دستیاب نہ ہوگا۔

بات یہاں تک آگئی ہے تو ظفر کی شاعری پر نظر ڈالنے سے پہلے ان کی ایک غزل سن لیجئے۔ جو ان کے اس پختہ رنگ کی پوری طرح آئینہ دار ہے۔ فرماتے ہیں:

دیا اپنی خودی کو جو ہم نے اٹھا، وہ جو پردہ سا بیچ میں تھا نہ رہا
رہے پردے میں اب نہ وہ پردہ نشیں کوئی دوسرا اس کے سوا نہ رہا
نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر، رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا
ہمیں ساغر بادہ کے دینے میں اب کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہدِ نشاط، یہ دورِ طرب نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا
اسے چاہا میں نے کہ روک رکھوں، مری جان بھی جائے تو جانے نہ دوں
کئے لاکھ فریب کروڑ فسوں نہ رہا نہ رہا نہ رہا نہ رہا
لگے یوں تو ہزاروں ہی تیر ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
ولے ناز و کرشمہ کی تیغِ دو دم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا
ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا وہ ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

ظفر کا ۱۸۵۷ء سے پہلے کا کلام چار جلدوں میں چھپ چکا ہے۔ کہتے ہیں پانچواں دیوان ۱۸۵۷ء کی نذر ہو گیا، مگر اس کے بعد کے پانچ سال کا کلام بالکل مرتب نہ ہو سکا جس وقت سے کہ انہیں ہمایوں کے مقبرے سے حراست میں لیا گیا تھا، آخر تک۔ وہ قید و بند ہی میں رہے۔ ۱۸۵۸ء کے آخر میں رنگون بھیجے گئے تھے۔ راستہ گوروں کی سنگینوں اور پستولوں کی چھاؤں میں کٹا تھا۔ وہاں بھی آخری دم تک آتش و آہن کی بہ حفاظت ان پر سایہ ڈالے رہی۔ اس زمانے میں ظفر نے جو کچھ کہا ہوگا، اس میں اپنے دل جگر کے ٹکڑے نکال کے کاغذ پہ بکھیر دئے ہوں گے۔ یاس و حسرت، درد و اثر اور سوز و گداز کے ایسے مرقعے، ایسی آپ بیتی اور کہاں مل سکتی ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ظفر کا کچھ کلام رنگون سے دہلی آتا رہا تھا۔ کیا عجب کہ اب بھی نامعلوم مقامات پر محفوظ ہو۔ مگر افسوس کہ اب تک اس کو مہیا نہ کیا جا سکا، ورنہ ادب میں منفرد حیثیت کی چیز ہوتا۔

ہمارے شعرا کے دیوانوں میں ہموار و ناہموار، پست و بلند اور اچھے برے سبھی طرح کے اشعار پائے جاتے ہیں۔ میر کے چھ دیوان اور مصحفی کے سات دیوان ان کی استادی کی دلیل ضرور ہیں، مگر ان کی شاعری ان دیوانوں کے پست اشعار دیکھ کر محجوب ہو کر رہ جاتی ہے۔ اگر آج اس ترقی یافتہ دور میں بھی شعرا کی غزلوں میں یہ کمزوری موجود ہے، تو اس زمانے میں تو پرگوئی بھی ایک ہنر سمجھی جاتی تھی۔ مگر کسی شاعر کے متعلق رائے قائم کرتے وقت ہم اس کے بھرتی کے اشعار سے نظر چرا جاتے ہیں۔ تو پھر کیا سبب کہ ظفر کے معاملے میں بھی ہم اسی اصول کو

بھڑکی ہے بے طرح یہ ظفرؔ آج دل کی آگ / آگے تو شعلہ سا کئی بار اٹھ کے رہ گیا
میں اس کو دیکھ کے یہ محو ہوں، کہ حیراں ہوں / جو کچھ وہ پوچھے گا مجھ سے جواب کیا دوں گا
نہ پہنچا تو نہ پہنچا طالبِ دیدار تک اپنے / تری تکتے ہی تکتے راہ، وقتِ واپسیں پہنچا

ایک مسلسل غزل میں رقاصہ کے ناچ گانے کا منظر پیش کرتے ہیں۔ چند شعر سنیئے:

تو جو بنابی پہ کل رات کھڑا گاتا تھا / دائرہ مہ بھی لیئے ساتھ دئے جاتا تھا
بندھ گئی تھی وہ ہوا گانے کی تیرے کہ مرا / ساتھ ہر تان کے جی تھا کہ اڑا جاتا تھا
کیا کہوں رقص کا عالم عجب انداز کے ساتھ / ساتھ ٹھوکر کے تری ٹھوکریں دل کھاتا تھا
ہاتھ کو ہاتھ پہ تو رکھ کے لگا جب چلنے / ہاتھ ہم ملتے تھے، دل تھا کہ ہلا جاتا تھا
آنکھ چاہت کی ظفرؔ کوئی بھلا چھپتی ہے
اس سے شرماتے تھے ہم، ہم سے وہ شرماتا تھا

ایک اور مسلسل غزل ہے۔ ظفرؔ سے پہلے اس زمین میں طپشؔ، جرأتؔ وغیرہ لکھ چکے تھے۔ ان کی تقلید میں ظفرؔ نے بھی مطربہ کا سراپا لکھا ہے۔ اور موازنہ کیجیئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ظفرؔ نے اپنے لئے ان سے بچ کر راہ نکال لی ہے۔ چند متفرق شعر ملاحظہ ہوں:

شمشیر برہنہ مانگ غضب، بالوں کی مہک پھر ویسی ہے / جوڑے کی گندھاوٹ قہر خدا، زلفوں کی لٹک پھر ویسی ہے
ہر بات میں اس کی گرمی ہے، ہر ناز میں اس کے شوخی ہے / قامت ہے قیامت چال پری، چلنے میں پھڑک پھر ویسی ہے
وہ گائے تو آفت لائے ہے، ہر تال میں لیوے جان نکال / ناچ اس کا اٹھائے سو فتنے، گھنگرو کی جھنک پھر ویسی ہے
ہر بات میں ہم سے وہ جو ظفرؔ کرتا ہے رکاوٹ مدت سے / اور اس کی چاہت رکھتے ہیں ہم آج تلک پھر ویسی ہے

محاکات کی ان مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیفیات، احساسات، واردات اور تاثرات کی تصویر کشی ظفرؔ کو کیسا کمال حاصل ہے سادہ الفاظ، سلیس انداز اور نازک طرز ادا نے ان اشعار میں کیسی کچھ تاثیر بھر دی ہے۔ یہیں سے ظفرؔ کی ایک اور خصوصیت معلوم ہوتی ہے کہ وہ مسلسل غزلیں بھی لکھتے ہیں۔ کئی مثالیں پہلے گزر چکیں۔ ایک اور مشکل زمین میں ان کی یہ مسلسل غزل مشہور ہے، جو اردو ادب میں انفرادی حیثیت رکھتی ہے اور جسے خاصے کی چیز سمجھنا چاہیئے۔ طرزِ بیان کی یہ جدت و ندرت ظفرؔ پر ختم ہے۔ ملاحظہ ہو:

تا درِ جاناں ہمیں اول تو جانا منع ہے / اور گئے تو حلقۂ در کا ہلانا منع ہے
حلقۂ در گر ہلایا بھی تو بولے کون ہے / اب بتائیں کیا کہ نام اپنا بتانا منع ہے
نام بتلایا جو میں نے تو وہ سن کر چپ رہے / پھر پکاریں کس طرح سے غل مچانا منع ہے
غل مچا کر گر پکارا بھی تو جھنجھلا کے کہا / جاؤ کیوں آئے تمہیں گھر میں بلانا منع ہے
اور بلایا بھی تو پھر جائیں وہاں ہم کس طرح / وہ جہاں ہیں، ہم کو واں تک بار پانا منع ہے
بار پا کر کچھ اگرچہ ہم گئے بھی واں تلک / آنکھ اٹھا کر کیونکہ دیکھیں آنکھ اٹھانا منع ہے
سامنے بھی وہ کسی صورت سے گر آئے تو پھر / بولنا ہنسنا تو کیا واں مسکرانا منع ہے
مسکرائے بھی تو کچھ چپکے ہی چپکے غنچہ وار / دل میں کیا کیا مدعا اور لب ہلانا منع ہے
لب ہلائے بھی تو کی کچھ بات منہ سے اور ہی / پڑھنا ہر مطلب پہ شعر عاشقانہ منع ہے
عاشقانہ شعر بھی کوئی پڑھا تو پڑھ کے پھر / آہ بھرنا منع ہے، آنسو بہانا منع ہے
آہ بھر کر کچھ اگر آنسو بہائے بھی تو پھر / وہ جو دل کی بات ہے اس کا جتانا منع ہے

بات گر دل کی جتائی بھی تو پھر ہوتا ہے کیا
اے ظفرؔ ایسی جگہ دل ہی لگانا منع ہے

ظفرؔ کے کلام میں تشبیہات و تمثیلات بھی پائی جاتی ہیں۔ اور بڑی خوبصورتی سے نظم ہوئی ہیں۔ سادگی، موزونیت اور قریب الفہم ہونا ان کی نمایاں خصوصیت ہے۔ پہلے ایسی کچھ مثالیں گزر چکی ہیں۔ چند شعر اور دیکھئے۔ پہلے شعر میں تو مثال کی تاریخی صداقت نے سادگی میں پرکاری کا رنگ بھر دیا ہے:۔

اعتبارِ صبر و طاقت خاک میں رکھوں ظفرؔ　　فوجِ ہندوستان نے کب ساتھ ٹیپو کا دیا!

بھڑکی ہے بے طرح یہ ظفرؔ آج دل کی آگ　　آگے تو شعلہ سا کئی بار اُٹھ کے رہ گیا

ٹکڑے نہیں ہیں آنسوؤں میں دل کے چار پانچ　　سرخاب بیٹھے پانی میں ہیں مل کے چار پانچ

جوں بوئے گل رفیقِ نسیمِ چمن ہیں ہم　　اے ہمدمو! وطن میں غریب الوطن ہیں ہم

اس چمن میں کیا کرو گے میکشو ہنس بول کے　　غنچہ ساں خاموش خون دل کو پی کے ہو رہو

جگر پر داغ، لب پر دُود دل۔ اور اشک دامن میں　　تری محفل سے ہم مانندِ شمعِ صبحدم نکلے

لالۂ کہسار نے جوشش چراغاں کی طرح　　خوب تربت پر تری اے کوہکن کی روشنی

غنچے کی مٹھی میں زر ہے اور نہیں دستِ کرم　　تنگیٔ دل اور ہے، اور تنگ دستی اور ہے
ہستیٔ یک دم پہ اپنی تو جو ہنستا ہے شرر　　تیری اس غفلت پہ ہنستی تیری ہستی اور ہے

غافلو اس اپنی ہستی پر کہ ہے نقش بر آب　　موج کی مانند کیوں پھرتے ہو بل کھاتے ہوئے

تصوف کا رنگ ظفرؔ پر اچھی طرح چڑھا ہوا تھا۔ انہوں نے ایک بڑے مرشد کا ہاتھ پکڑا تھا، جن سے ان کو کمال درجے کی عقیدت تھی اور ان کے فیض سے انہوں نے سلوک کی منزلیں طے کی تھیں۔ بہت سے مقامات ان کے لئے حال کا درجہ رکھتے تھے۔ اس لئے یہاں صرف قال ہی نہیں ہے۔ مگر یہ ان کا پسندیدہ رنگ نہیں۔ اس لئے ایسے مضامین ان کے ہاں کم ملتے ہیں۔

سب رنگ میں اس گل کی مرے، شان ہے موجود　　غافل تو ذرا دیکھ وہ ہر آن ہے موجود
نہیں موقوف شیخ و برہمن پر۔ دیر و کعبہ پر　　ہر اک سو جلوہ گر ہے حق جدھر چاہو ادھر دیکھو
اے ظفرؔ اس پردے میں کچھ کہہ رہا ہے نے نواز　　نے یونہی کرتی نہیں شور و فغاں بے فائدہ
توبہ اے ساقی نہیں پینے کا میں جامِ شراب　　مجھ کو اپنے بادۂ وحدت کی مستی خوب ہے
ظاہر ہیں کیا ظہور کے مظہر نئے نئے　　جلوے ہیں اس کے پردے کے اندر نئے نئے

شرابِ عشق سے کیفیتِ بقا ئے ابد وہ دیکھے آپ کو جو یاں فنا سمجھ کے پیئے
خوابِ عدم سے چونکے ہیں مشتاق ہم ترے دیکھا نہ تجھ کو اور اسی حسرت میں سو گئے

اخلاقیات کے مضامین ظفر کے کلام میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ دنیا کے نشیب و فراز سب ان پر گزرے تھے۔ ابنائے زمانہ کی غداری اور بیوفائی سے ان کو سابقہ پڑ چکا تھا۔ بیگانوں کے جور و ستم کے ساتھ بے مہری اور بے مروتی ان کا شب و روز بن چکی تھی، جس نے یقیناً دنیا سے ان کا دل کھٹا کر دیا ہوگا۔ چنانچہ دنیا کی بے ثباتی، ابنائے زمانہ کی بیوفائی، اور دوسرے اخلاقی مضامین پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب باتیں ان کے دل سے نکلی ہیں:

نہ کوئی یار پایا اور نہ کوئی آشنا پایا جسے یاں دوست جانا اس کو دشمن جان کا پایا
پایا نہ بجز داغِ سیہ کاریٔ یک عمر نقشِ قدمِ قافلۂ عمرِ رواں ہیچ
اپنی نادانستی میں چوکے نہیں تدبیر سے ہم کیا کریں بس نہیں لاچار ہیں تقدیر سے ہم
اس چمن میں کیا کروگے میکشو ہنس بول کے غنچہ ساں خاموش خونِ دل کو پی کے ہو رہو

جذبات نگاری ظفرؔ کی ایک اور خصوصیت ہے۔ وجدانی کیفیات، سچے جذبات، داخلی کیفیات اور قلبی تاثرات کو بیان کرنے میں ان کو کمال حاصل ہے، جس ان کا انداز ادا سادگی و پرکاری کی تصویر بنا دیتا ہے۔ یہ ان کا خاص رنگ ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے:

ی نے اس کو سمجھایا تو ہوتا کوئی یاں تک اسے لایا تو ہوتا
جو کچھ ہوتا سو ہوتا تو نے تقدیر وہاں تک مجھ کو پہنچایا تو ہوتا
ضبطِ فریاد کروں گریہ کو روکوں لیکن دلِ بیتاب کو تھاموں، یہ نہیں ہو سکتا
نہ پوچھ مجھ سے ظفرؔ تو مری حقیقتِ حال اگر کہوں گا ابھی تجھ کو میں رلا دوں گا
یہ کراہا ترا بیمارِ الم درد کے ساتھ کسی ہمسائے کو بیمار نے سونے نہ دیا
کیا کہوں کیونکہ ترے کوچے میں ہو کر آیا تجھ کو پایا جو نہیں خواب میں رو کر آیا
قسم خدا کی تجھے قاصدا کہ یہ پیغام کہا ہے یار نے یا تو نے اپنے جی سے کہا
ظفرؔ وہ دشمنِ جاں ہے اسے نہ جانیو دوست ترے جتانے کو ہم نے یہ دوستی سے کہا
کچھ خبر قاصد نے دی ایسی کہ سنتے ہی جسے دل سے میں مجھ سے مرا دل بے خبر ہونے لگا
کوچۂ جاناں میں جانا ہی پڑے گا ہو سو ہو کیا کروں بیتاب دل پھر اے ظفرؔ ہونے لگا

ایک غزل ٹھیٹھ بولی میں ہے۔ یہ رنگون کے زمانے کی یادگار بتائی جاتی ہے۔ اس کی بابت بعض حضرات کو شبہ ہے کہ یہ ظفرؔ کی زبان نہیں، مگر یہ اعتراض درست نہیں۔

کون نگر میں آئے ہم، کون نگر کے باسے ہیں جائیں گے اب کون نگر کو من میں اپنے ہراسے ہیں
دیس نیا ہے بھیس نیا ہے رنگ نیا ہے ڈھنگ نیا کون آنند کرے ہے واں اور رہنے کون اداسے ہیں
کیا کیا پھول دیکھے ہیں ہم نے اس پھلواری میں اب جو پھولے اس میں پھول اور ہی ان میں باسے ہیں
دنیا ہے یہ رین بسیرا، بیت گئی، رہی تھوڑی سی
ان سے کہہ دو سو جاویں، نیند میں جو بن ماسے ہیں

آپ نے دیکھا، جرأت اور میر دونوں کا رنگ کس فطری اور موثر انداز میں ظفرؔ کے ہاں موجود ہے۔ صحیح تغزل کے لحاظ سے ہم ان کو تپش، جرأت اور مومن کی صف میں جگہ دیں گے۔ اور درد و اثر، سوز و گداز کے اعتبار سے ان کا نام میرؔ کے بعد لینا چاہیئے۔

ماہ نو، کراچی۔ جولائی ۱۹۵۷ء

ملّی ضروریات اور ملّی زبان

ڈاکٹر محمد باقر

جب ہم اُردو کو ایک ممتاز درجہ عطا کرنے کا تقاضا کرتے ہیں تو یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ قوم کے سامنے وہ مسائل بھی پیش کریں جن کی مدد سے جلد از جلد اُردو کو تمام مِلّی ضروریات کی کفالت کے قابل بنایا جا سکے۔ عملی طور پر ہم نے اُن مشکلات کا جائزہ بے تعصبی سے کبھی نہیں لیا جو اس زبان کو مِلّی زبان بنانے کے راستے میں حائل ہیں۔ اور اب جبکہ ہم نے ملک کی کثیر آبادی کے لئے اِسے مِلّی زبان قرار دینے کا سرکاری فیصلہ کر لیا ہے، میں اُردو کے بہی خواہوں کے لئے چند عملی تجاویز پیش کرنا چاہتا ہوں جو کسی طرح کا خرچ کئے بغیر اُردو کو مِلّی مقام دلا سکتی ہیں۔ بشرطیکہ ہماری آرزو اور دلی خواہش ایمانداری سے یہی ہو کہ ہمیں اُردو کو آگے بڑھانا ہے اور علاقائی زبانوں کے راستے میں کھڑا ہونا نہیں۔ کیونکہ تعمیری طرزِ فکر بہرصورت یہی ہو سکتا ہے کہ علاقائی زبانوں پر پتھر پھینکنے کی بجائے اُردو کے عاشق اردو کی پیش رفت کے لئے فداکاری کے جذبے سے ساعی کریں۔

غالباً یہ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں بیسیوں ملازمین موجود ہیں جو اُردو کے دل و جان سے شیدا ہیں اور اُن کی انتہائی خواہش یہ ہے کہ دفتری کام کے لئے اُردو استعمال ہونی چاہیئے۔ لیکن یہ سب لوگ اس دور کی پیداوار ہیں جب ملک و ملت میں انگریزی کا اقتدار تھا۔ یہ لوگ انگریزی زبان میں ہی آج کل کی طرح تعلیم اور ڈگریاں حاصل کئے ہوئے ہیں۔ اور ان کی زبان اور قلم انگریزی زبان میں ہی آسانی سے حرکت کرتا ہے۔ لہٰذا انہیں دفتر کا کاروبار انگریزی میں چلانے سے بڑی سہولت ہوتی ہے اور جب کبھی اِس کاروبار کو اُردو میں منتقل کرنے کی خواہش ان کے دل میں چٹکیاں لیتی ہے اُس وقت یہ ایماندار آدمی محض اس بنا پر اس خیال کو دل سے نکال دیتے ہیں کہ ہمیں تو صحیح اُردو لکھنا اور بولنا نہیں آتی۔ یہ اپنی انتہائی آرزو کے باوجود دفتر کا کام اُردو میں منتقل کرنے پر آمادہ نہیں ہو پاتے۔ مثال کے طور پر جب کلرک سے فائل مانگنے کے لئے اردو میں کوئی مستند اصطلاح موجود نہیں اور PUT UP THE FILE کا کوئی مسلّمہ ترجمہ نہیں تو افسر اُردو میں دفتر کو کیا ہدایت دے جو گذشتہ تیس برس سے انگریزی کے یہ چار کلمات کاغذوں پر لکھتا چلا آیا ہے، انگریزی میں دفتری کاروبار چلانے کے لئے ایسے بے شمار اصطلاحات اور مختصر جملے رائج ہو چکے ہیں جن کا صحیح ترجمہ آپ ڈھونڈتے رہیں اور پھر ان افسروں اور کلرکوں تک پہنچاتے رہیں تو اس میں بہت دیر لگیگی۔ مثلاً (PUC) اختصار ہے PAPER UNDER CONSIDERATION کا۔ انگریزی کا یہ جملہ فعل کے بغیر دفتری ضرورت کے لئے مرتب کیا گیا ہے۔ اگر ہم اس فکر میں رہیں کہ جب تک صحیح اُردو میں تمام دفتری اصطلاحات کا ترجمہ نہ کر لیں اُس وقت تک دفتری نظام نہیں بدلنا چاہیئے تو اس میں ہمیں کبھی کامیابی نہ ہوگی اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ہم ایک غریب ملک کے رہنے والے ہیں اور انگریز کے دیئے ہوئے دفتری نظام کی تمام لسانی ضروریات کو اُردو میں منتقل کرنے کے لئے بے شمار روپے کی ضرورت ہے یا ایک مسلسل طویل مدت درکار ہے جن میں سے ایک بھی میسر نہیں۔ آپ پوچھینگے پھر ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ میرا جواب بالکل عملی ہے۔ آپ دفتر کو اجازت دے دیں کہ وہ جیسی بھی اُردو لکھ یا بول سکتا ہے اس کو برتنا شروع کر دے۔ اِس طرح آپ بغیر کسی دقت کے اور کوئی سرمایہ یا وقت خرچ کئے بغیر فی الفور دفتری نظام کو اُردو میں منتقل کر دینگے۔ اگر آپ اس تجویز کو قبول کر کے عمل کرنا شروع کر دیں تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ دفتری نظام میں استعمال ہونے والے مذکورہ بالا دو جملوں کے لئے اردو میں کچھ اس قسم کے کلمات لکھے جائینگے:۔

(۱) فائل پیش ہو۔ (۲) فائل میز پر رکھو۔ (۳) فائل دکھاؤ۔ (۴) فائل لاؤ۔ (۵) متعلقہ کاغذ لاؤ۔ (۶) فل = ف، ل (فائل لاؤ کا مخفف)۔

(۱) کاغذ زیر غور ہے۔ (۲) زیر غور کاغذ۔ (۳) فیصلے کے لئے کاغذ۔ (۴) کاغذ فیصلے کے لئے۔ (۵) زغک = ز۔ غ۔ ک (زیر غور کاغذ)

لیکن یہ سب کلمات اُردو میں ہونگے اور ہر اُردو جاننے والا انہیں سمجھ سکے گا۔ انہیں کلمات اور جملوں میں سے آگے چل کر ایک ایک جملہ مستند

اور قابل قبول شکل اختیار کر جائیگا۔ اور بالکل اسی طرح جیسے کہ انگریزی زبان میں صرف دفتری کاروبار کے لئے مخصوص اصطلاحات اور جملے وضع کئے گئے تھے، اُردو میں بھی رفتہ رفتہ یہ اصطلاحات اور جملے مرتب ہو جائیں گے ؛

یہ صرف دو مثالیں تھیں۔ دفتری نظام کی ابتدا کاغذ اور فائل سے ہوتی ہے اگر کاغذ اور فائل کو چلانے کے لئے شروع شروع میں ہر قسم کی قابل فہم اُردو استعمال کرنے کی اجازت اُسی طرح دے دی جائے جیسے انگریز کے زمانے میں معروف ناخواندہ نہال چند المعروف بہ نہالا، گارڈ کو ہر قسم کی انگریزی میں تار دینے کی اجازت تھی تو آپ دیکھینگے کہ دفتری کام کے لئے ہر قسم کی موزوں اصطلاحات چند دنوں کے عرصہ میں ظہور پذیر ہو جائینگی۔ اگر آپ اس انتظار میں رہے کہ پہلے تمام دفتری اصطلاحات کا ترجمہ اُردو میں کیا جائے پھر انہیں شائع کیا جائے اور پھر انگریزی داں افسروں اور اہل کاروں کو مطبوعہ اصطلاحات حفظ کرائی جائیں تو یہ کام ہو چکا۔ اُردو سے محبت رکھنے والوں کو ناخواندہ اور نیم خواندہ افسروں اور کلرکوں کی زبان کے سلسلے میں فراخدلی سے کام لینا ہوگا، تب یہ بیل منڈھے چڑھیگی۔ ورنہ اگر آپ ہر انگریزی لفظ اور جملے کے لئے معیاری اُردو وضع کرنے کے انتظار میں رہے تو دفتری نظام کبھی اُردو میں منتقل نہ ہو سکیگا۔ اگر دفتری نظام اردو میں منتقل نہ ہوا اور دفتری کارکن اُردو میں لکھنے اور بولنے میں حجاب محسوس کرتے رہے تو اُردو اس ملک میں کبھی ملی مقام اور رتبہ حاصل نہ کر سکیگی۔ غالباً یہ عام طور پر معلوم ہے کہ حکومت نے زر کثیر صرف کر کے ایسے ادارے بھی قائم کئے تھے جن کا کام صرف دفتری اصطلاحات کے اُردو بدل مہیا کرنا تھا۔ ان اداروں نے بڑی نیک نیتی اور سرگرمی سے کام بھی کیا ہے۔ دوسری اطلاع کے مطابق ہزاروں الفاظ کا ترجمہ بھی کر چکے ہیں لیکن یہ فہرستیں چھپ جانے کے بعد کس طاق نسیاں کی زینت بنی ہیں یہ کچھ وہی لوگ بتا سکتے ہیں جن کی خدمت میں یہ فہرستیں بھیجی گئی ہیں۔ لیکن ایک نتیجہ ظاہر ہے۔ سرکاری مشینری کا ادنیٰ سے ادنیٰ ملازم اور کارکن ابھی تک (PUC) کے استعمال سے باز نہیں آیا۔ کیونکہ اگر اس نے ان چھپی ہوئی فہرستوں کو پڑھا بھی ہے تو ان اصطلاحات کو ضرورت کے وقت استعمال کرنے کی ہمت اس لئے نہیں کرتا کہ اس کا ماتحت اور افسر دونوں اس سے نابلد ہیں ؛

ظاہر ہے کہ ان حالات میں صرف ایک ہی عملی راستہ ہے کہ ہم دفتری اصطلاحات کے ترجمے کے ادارے قائم کرنے کی بجائے دفتروں کے کارکنوں کو اجازت دے دیں کہ وہ اُردو میں اپنے مافی الضمیر کو فائلوں پر منتقل کریں اور رفتہ رفتہ ہم اس بلند سطح پر پہنچ جائینگے جہاں انگریزی اب پہنچی ہوئی ہے ؛

اُردو کو ملی زبان بنانے کے لئے دفتری نظام کے تعاون کی نہ صرف شدید ضرورت ہے بلکہ یہ اولین مرحلہ ہے جسے جلد از جلد طے ہو جانا چاہیئے کیونکہ جب تک کوئی غیر ملکی زبان دفتری نظام پر قابض رہے گی اس وقت تک اُردو کو ملی مقام دلانا ناممکن ہوگا ؛

دفتری نظام کے بعد دوسرا اہم مرحلہ ذریعۂ تعلیم کا ہے۔ اُردو کے بہی خواہوں کے شدید اصرار کے باوجود ابھی اُردو ذریعۂ تعلیم مقرر نہیں ہو سکی اور اعلیٰ تعلیم میں تو یہ نہ ہونے کے برابر مسدود ہے۔ ابھی تک اعلیٰ ملازمتوں کے مقابلے کے امتحانوں میں اُردو، عربی، فارسی اور اسلامیات کے پرچے اور امتحان انگریزی میں ہو رہے ہیں لیکن بعض یونیورسٹیوں نے ان مضامین کی تدریس اور امتحان اُردو میں منتقل کر دیئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل طلباء اعلیٰ ملازمتوں کے مقابلے کے امتحانوں میں شریک ہی نہیں ہو رہے۔ اب یہ ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے کہ کم از کم ان مضامین کے امتحانات ملازمتوں کے لئے اُردو میں ہونے چاہئیں ؛

یہ ضمنی بحث تھی، کہنا یہ مقصود ہے کہ جس طرح دفتری نظام کو کسی لاگت کے بغیر اُردو میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح ذریعۂ تعلیم کو بھی اُردو میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور ایک اس بڑی رکاوٹ کو دور کیا جا سکتا ہے جو اُردو کو ملی زبان بنانے کے راستے میں حائل ہے۔ اُردو زبان کی عمر چونکہ بہت کم ہے اور دنیا کے متمدن ممالک نے اس قدر ادب اور علمی سرمایہ پیدا کر لیا ہے کہ اگر سالوں کے اعتبار سے محاسبہ کیا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ اُردو زبان کا علمی سرمایہ انگریزی سے کئی صدی پیچھے ہے۔ یہ کوئی ایسی عیب کی بات نہیں کیونکہ اُردو سے بہت قدیم زبانیں مثلاً عربی اور فارسی بھی گذشتہ سات سو سال سے اس علمی سرمایہ سے اس لئے محروم رہی کہ ان کے ہاں اس عرصہ میں کوئی سائنسی تحریک پیدا نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اگر ہم صرف انگریزی کے علمی سرمایہ کو اُردو میں منتقل کرنے لگیں تو گذشتہ سات سو سال کے تمام علمی کام کو اُردو میں ڈھالنے میں جو وقت صرف ہوگا اس میں علمی دنیا اور آگے نکل جائیگا۔ پھر اس کے لئے کثیر سرمایہ اور کثیر التعداد علمی کارکنوں کی ضرورت ہوگی، جو ہمیں میسر نہیں۔ اس لئے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ علوم کو اُردو میں منتقل کرنے کا منصوبہ بظاہر قابل عمل نہیں۔ اس لئے اسے ترک کر دینا چاہیئے اور دفتری نظام کو اُردو میں منتقل کرنے کی جو تجویز اوپر پیش کی گئی ہے،

یہاں بھی وہی اختیار کرنی چاہیئے۔ یعنی ایک عام اجازت ہونی چاہیئے کہ تمام مضامین اور تمام درجوں کے اساتذہ اُس اُردو میں تدریس شروع کر دیں جو وہ بول اور لکھ سکتے ہیں۔ اس تجویز پر عمل کرنے سے تدریس کے لئے معیاری زبان بولی اور لکھی نہیں جائے گی۔ مقامی صورتِ حالات کے پیشِ نظر اس تدریس کے دوران میں لوگ سندھی، بلوچی، پنجابی اور پشتو کے الفاظ بھی اُردو میں استعمال کریںگے۔ لیکن یہ بوثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ تدریس ملکی زبان میں ہوگی۔ اس میں انگریزی کی اصطلاحات بھی ملی ہوئی ہونگی، لیکن چند سال کے تجربے کے بعد آپ دیکھیں گے کہ تمام علوم اور ادبیات کی تدریس نہایت مستند اور منجھی ہوئی پاکستانی اُردو میں ہونے لگیگی۔ علوم کی اصطلاحات اب بین الاقوامی مرتبہ اختیار کر چکی ہیں۔ وہ ہر زبان میں ایک ہی انداز میں لکھی جا رہی ہیں۔ ان کی علامات بھی سارے یورپ، امریکہ اور انگلستان میں ایک ہی ہیں۔ مثلاً آکسیجن کو ساری دنیا میں آکسیجن ہی لکھا جا رہا ہے۔ اور اس کے لئے O (او) کی علامت استعمال کی جا رہی ہے۔ ان اصطلاحات اور علامات کو اُردو میں ترجمہ کرنے کی نہ ضرورت ہے اور نہ یہ ممکن ہے۔ اس لئے ان کو اپنی اصلی شکل میں بحال رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن علمی نظریات اور مفاہیم کو اردو میں آسانی سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ تجربہ شروع کر دیا جائے تو چند سالوں میں ایسے شاگرد پیدا کئے جا سکتے ہیں جو استاد بن کر معیاری پاکستانی اُردو میں تالیف و تصنیف کر سکیں گے۔ اور پھر رفتہ رفتہ یہی لوگ اور ان کے شاگرد تحقیق کے کام کی طرف بھی متوجہ ہو سکتے ہیں لیکن اگر ہم اس انتظار میں رہے کہ پہلے تمام علوم کو معیاری اُردو میں منتقل کیا جائے اور پھر ایسے استاد بنائے جائیں جو اس معیاری اُردو میں علوم کی تدریس کر سکیں تو ہم اُردو کو ملی زبان بنانے کے راستے میں وہ دیوار کھڑی کر دینگے جس کو کوئی آدمی عبور نہ کر سکیگا اور ہم ہر وقت اس چکر میں رہیں گے کہ پہلے علم کو اُردو میں منتقل کیا جائے، پھر اُردو میں اس علم کے اُستاد پیدا کئے جائیں۔ اور پھر اس علم کی اُردو میں تدریس کی جائے۔ یہ ایسی ذمہ داریاں ہیں جن سے ایک ترتیب ملک اور ترتیب ملت عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ اگر ہمیں کسی زبان کو ملی درجہ دینا ہے تو ہمیں آج سے اُس میں تدریس شروع کر دینا چاہیئے۔ اسی میں طلباء کو نوٹ لکھوانے چاہئیں۔ اسی میں لکچر دینا چاہیئے اور اسی میں امتحان لینا چاہیئے۔ اگر آج نہیں تو دس سال کے بعد یہ سارے کام معیاری اُردو میں ہونے لگیں گے۔ ضرورت اپنی حاجت روائی کے لئے خود کلمات ایجاد اور وضع کر لے گی۔ اور یہ کلمات بالآخر رواج اور استناد کے درجے بھی حاصل کر لیں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ لسانی اعتبار سے ملی ضروریات میں سب سے اہم یہی دو ضروریات ہیں۔ اگر ان کو پورا کر لیا گیا تو ملی زبان نعروں کے بغیر عالمِ وجود میں آجائے گی۔ اگر دفتری اور تدریسی نظام کو کسی لاگت اور کوفت کے بغیر اردو میں منتقل کر دیا گیا تو ملی زبان از خود پیدا ہو جائے گی۔ آیئے کوشش کریں کہ لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ دفتری کاروبار اور تدریس کو اُس اُردو زبان میں کرنے لگیں جس کو پشاور سے لے کر کراچی تک سب لوگ بولتے، سمجھتے، لکھتے اور پڑھتے ہیں۔ اگر ہم معیاری زبان اور معیاری اصطلاحات پر مُصر رہے اور ان کے معرضِ وجود میں آنے کے منتظر رہے، تو ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونگے۔ اگر ہمیں اُردو سے محبت ہے تو لاگت کے بغیر بھی اُردو کو آگے بڑھانا چاہیئے ؛

قطعۂ شہر آشوب

(اودھ کی ضبطی اور لکھنؤ کی بربادی پر وحید الدین وحید الہ آبادی، استاد حضرت اکبر الہ آبادی، کا نوحۂ پرسوز)

لالۂ خوش رنگ تھا جانِ چمن کیا ہو گیا — جلوۂ شمعِ شبستانِ چمن کیا ہو گیا

کیا ہوئی وہ نرگسِ شہلا کی چشمِ سرمہ سا — دیدۂ شوخ غزالانِ چمن کیا ہو گیا

سنبلِ سیراب کا کیا ہو گیا وہ پیچ و تاب — گیسوئے مرغولہ مویانِ چمن کیا ہو گیا

اے صبا نشو و نمائے غنچہ و گل کیا ہوئی — آب و رنگ خوبرویانِ چمن کیا ہو گیا

تختہ ہائے ارغوان و لالہ و گل کیا ہوئے — کشورِ آباد سلطانِ چمن کیا ہو گیا

بلبلوں کے غنچۂ دل میں نہیں بوئے نیاز — عشوۂ رنگیں ادایانِ چمن کیا ہو گیا

اپنے موقع پر نظر آتا نہیں کوئی نہال — انتظامِ نخلبندانِ چمن کیا ہو گیا

وہ روانی موجۂ انہارِ گلشن میں نہیں — جوہرِ شمشیر عریانِ چمن کیا ہو گیا

جس کو دیکھو بے اجازت اب وہ رکھتا ہے قدم — انتظامِ اہلکارانِ چمن کیا ہو گیا

کیا ہوئی وہ باغباں کی عقل جو سابق میں تھی — اب وہ افلاطونِ یونانِ چمن کیا ہو گیا

کس لئے وہ روشنی چشمِ عنادل میں نہیں — سرمۂ گردِ صفاہانِ چمن کیا ہو گیا

جامۂ شادی گلوں کے کون اُڑا کر لے گیا — وہ لباسِ نوعروسانِ چمن کیا ہو گیا

کیا ہوا دامانِ گل میں قطرۂ شبنم جو تھا — وہ دُرِ نایاب نیسانِ چمن کیا ہو گیا

پھیر دی کس سمت گلگوں عزیمت کی عناں — وہ ہجوم نے سوارانِ چمن کیا ہو گیا

کون سے ناواقفوں نے کاٹ ڈالا سرو کو — مصرعۂ موزونِ دیوانِ چمن کیا ہو گیا

کیا ہوئی باغِ جہاں سے خرّمی کی وہ صدا — نغمۂ مرغِ خوش الحانِ چمن کیا ہو گیا

آب و تاب چہرۂ گلہائے خنداں کیا ہوئی — جلوۂ روئے حسینانِ چمن کیا ہو گیا

غنچہ و گل، یار و ساقی، شیشہ و جامِ شراب
اے وحید اپنا وہ سامانِ چمن کیا ہو گیا

٭

رباعی

کیونکر دلِ غمزدہ نہ فریاد کرے
جب ملک کو یوں غنیم برباد کرے
مانگو یہ دعا کہ پھر خداوند کریم
اجڑی ہوئی سلطنت کو آباد کرے

میر انیس

٭

غزل

پنڈت ہری چند اختؔر

محبّت میں تپاکِ ظاہری سے کچھ نہیں ہوتا
جہاں دل کو لگی ہو دل لگی سے کچھ نہیں ہوتا

یہ ہے جبرِ مشیت یا مری تقدیر ہے یا رب
سہارا جس کا لیتا ہوں اسی سے کچھ نہیں ہوتا

کوئی میری خطا ہے یا تری صنعت کی خامی ہے
فرشتے کہہ رہے ہیں آدمی سے کچھ نہیں ہوتا

ترے احکام کی دنیا مرے اعمال کا محشر
یہاں میری وہاں تیری خوشی سے کچھ نہیں ہوتا

رضا تیری، لکھا تقدیر کا، میری زیاں کوشی
کسی کی دوستی یا دشمنی سے کچھ نہیں ہوتا

بہر عالم ترا جبرِ خدائی کارفرما ہے
ہمارے اختیارِ بندگی سے کچھ نہیں ہوتا

مرے دستِ طلب کو جرأتِ گستاخ دے یا رب
یہاں دستِ دعا کی عاجزی سے کچھ نہیں ہوتا

اگر تیری خوشی ہے تیرے بندوں کی مسرت میں
تو اے میرے خدا تیری خوشی سے کچھ نہیں ہوتا

کمالِ آگہی حاصل ہوا تو یہ کھلا اختؔر
کہ دنیا میں کمالِ آگہی سے کچھ نہیں ہوتا

روشؔ صدیقی

وہ اجنبی نگاہ بڑا کام کر گئی
شائستگی سے عمرِ تمنا گذر گئی

آشفتگانِ عشق کی راہیں کچھ اور ہیں
کچھ دور ساتھ چل کے قیامت ٹھہر گئی

اک دردِ مشترک سے عبارت ہے زندگی
سب پہ گذر رہی ہے جو ہم پہ گذر گئی

وہ سادگی کہ لغزشِ آدم کہیں جسے
تصویرِ خیر و شر میں عجب رنگ بھر گئی

اب تک نہیں ہے ہوش عروسِ بہار کو
وہ بوئے پیرہن اِدھر آئی اُدھر گئی

ہم خلوتِ خیال سے نکلے تو کیا ہوا
تھا عالمِ خیال جہاں تک نظر گئی

اتنا بھی ہوش کس کو تری جستجو میں تھا
کب سر جھکا کے گردشِ دوراں گذر گئی

دنیا نہ اب سُنے گی صدائے شکستِ دل
جب خامشی ہی شرطِ محبت ٹھہر گئی

کیا حسنِ اہتمامِ مشیت ہے اے روشؔ
ترتیبِ حادثات سے دنیا سنور گئی

عربی افسانہ

حمّال

محمود تیمور

مترجمہ عطا حسین

موسمِ گرما کا دم واپسیں تھا۔ خوش باش لوگ پہاڑوں کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ اکتوبر کی سرد ہوائیں کوہسارِ لبنان کے لئے جامۂ سیمیں تیار کر رہی تھیں۔ چاروں طرف سنّاٹا چھایا ہوا تھا، ایک بلند پہاڑ کے دامن میں واقع گاؤں شلغون حیات آفریں سکون میں غرق تھا، جسمانی اور روحانی آسودگی کے لئے چند دن اس گاؤں میں ٹھہر گیا۔

میرا معمول تھا کہ میں شام کو غروبِ آفتاب کے وقت سیر کے لئے اپنی قیام گاہ سے باہر نکل پڑتا، پہاڑی راستے کے نشیب و فراز کو طے کرتا ہوا ساحلِ سمندر تک اُتر آتا۔ تھوڑی دیر سستانے کے بعد پھر اپنی منزل کا رُخ کرتا۔

ایک دن سمندر کے کنارے اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا قدرتی نظاروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا، ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں افق کی پہنائیوں کو رنگا رنگ کر رہی تھیں، آلودگیوں سے پاک پُرسکون فضا کائنات کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے تھی، رات کی تیرگی جب شفق کی لالی کی طرف لپکنے لگی تو میں اپنی منزل کی طرف گامزن ہو گیا، چند قدم چلنے کے بعد مجھے وحشت محسوس ہونے لگی۔ چاروں طرف دیکھا تو کوئی نظر نہیں آیا۔ میری تنہائی مجھے ڈستی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ کائنات میں میرے علاوہ کسی کا وجود نہیں، ایک عجیب ناقابلِ بیان خوف مجھ پر مسلط ہونے لگا، ہوا کی سرسراہٹ میرے دل میں وسوسے پیدا کرتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سرسراہٹ نہیں بلکہ عاشقانِ نامراد کی آہیں چرخِ نیلگوں میں سرگرداں ہیں اور یکلخت میرا سارا جسم کانپ اُٹھا۔ مجھے اپنی وحشت انگیزی اور خوف زدگی پر حیرت ہونے لگی اور اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا۔

انبارِ اوہام سے نجات پانے کے لئے میں نے اپنا سر آسمان کی طرف اُٹھایا تو ماہِ نو شرمیلی دلہن کی طرح جلوہ نمائی کر رہا تھا، اس کی ہلکی ہلکی ضو فشانی نے فضا کو حد درجہ رومان انگیز بنا دیا تھا۔ اس سے مختصر سے فاصلہ پر شام کا ستارہ گویا اس حسینہ کا تعاقب کر رہا تھا۔ ایسی روح پرور فضا اور یہ وحشت زدگی ــــ مجھے اپنے آپ سے شرم سی محسوس ہونے لگی۔ غیر ارادی طور پر میرے قدم پہاڑی راستے کی طرف اُٹھنے لگے۔ ہوا کی خنکی اور نرم نرم چاندنی سے طبیعت میں شگفتگی اور سکون سا محسوس کرنے لگا۔ ستارۂ زہرہ عروسِ نو کا والہانہ تعاقب کر رہا تھا۔ اس کے تعاقب نے میرے جذبات میں شوق اور تمنّاؤں کا ایک ہنگامہ سا بپا کر دیا۔ میرے قدم خود بخود تیز ہو گئے۔ دور کہیں ایک آدمی چڑھتا ہوا نظر آیا۔ مجھے حیرت یہ تھی کہ یہ شخص ہموار سڑک کو چھوڑ کر دشوار گذار چڑھائی پر لمبے لمبے ڈگ کیوں بھر رہا ہے۔ میں نے سوچا ہو نہ ہو یہ آدمی ضرور پہاڑی قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے، ورنہ ایک

اجنبی شخص ہموار راہ سے گریز کر کے ایسی خطرناک پگڈنڈی اختیار نہیں کر سکتا، کبھی کبھی جھاڑیوں اور درختوں میں روپوش ہو جاتا۔ مجھے ایسا گمان ہوتا کہ وہ آدمی نہیں بلکہ کوئی روح بھٹک رہی ہے اور میرے جسم میں خوف کی لہر سرایت کر جاتی، کبھی خیال آتا یہ شخص ڈاکو ہے جو لوگوں کی نظروں سے بچ بچا کر کسی مہم پر جا رہا ہے، کبھی یہ بھی سوچا کہ شاید یہ شخص اسپورٹس کا دلدادہ یا کوہ پیمائی سے شغف رکھتا ہے۔ پھر سوچا کہ مجھے کیا پڑی ہے، ہوا کرے، لیکن میرے ذوقِ تجسس نے مجھے چین نہ لینے دیا۔ غیر شعوری طور پر میری نگاہیں اُس کا تعاقب کرتی رہیں، حتیٰ کہ ایک موڑ پر ہمارا تصادم ہو گیا۔ سفید ڈھلی ہوئی چاندنی میں اُس پر نظر ڈالی اور اس کے حُلیہ کا ایک سرسری جائزہ لیا۔ خدوخال سے پتہ چلتا تھا کہ وہ پہاڑی ہے، اُس نے شلوار زیب تن کی ہوئی تھی، سر ایک خفیف عمامے سے مزین تھا، کمر جھکی ہوئی تھی، پیٹھ پر ایک تھیلہ تھا جو عام طور پر حمال رکھتے ہیں، اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ تھیلے میں کوئی وزن دار چیز اُٹھائے لئے جا رہا ہے۔ میرے ذہن میں عجیب عجیب وسوسے اور خیالات سر اُٹھانے لگے؛ اتنا بھاری بوجھ لادے ہوئے اس اندھیرے میں یہ شخص ہموار راستے سے کترا کر خطرناک گھاٹیوں کو کیوں اختیار کرتا ہے؟ اس خیال نے میرے ذوقِ تجسس کو ایک تازیانہ لگایا اور میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا تاکہ اس سے جا ملوں، لیکن وہ اتنی پھرتی سے چھلانگیں مار رہا تھا کہ میں اُسے نہ پکڑ سکا۔ آخر ایک چوراہے پر جا کر وہ ٹھہر گیا۔ میں بھی اس کی طرف لپکا اور بالکل اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنی جبیں سے پسینہ صاف کر رہا تھا۔ اپنے خدوخال سے نہایت باوقار اور نرم دل معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے فوراً سلام کیا اور اپنی جیب سے سگریٹ نکال کر پیش کیا۔ اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے سگریٹ قبول کر لیا اور فوراً ماچس کی تیلی جلا کر میرا سگریٹ بھی سلگا دیا۔ اُس کے خوش کن سلوک نے میرا حوصلہ بڑھایا، میں نے کہا:۔

"کیا بات ہے تم ہموار راہ کو چھوڑ کر خطرناک اور تنگ راستے پر چلتے ہو؟"

"میں ان رستوں سے خوب واقف ہوں، اختصار کی غرض سے اس راستے پر چلتا ہوں۔" ایک لمبا کش لیتے ہوئے اس نے جواب دیا، اور پوچھا:

"کیا تم اُن خوش باش لوگوں میں سے ہو جو ہر سال یہاں گرمیاں گزارنے کی غرض سے آتے ہیں؟"

"ہاں" میں نے جواب میں کہا۔

"مگر موسم تو ختم ہو گیا۔"

"میں ذرا تنہائی پسند ہوں، مجھے ایسے ہی میں لطف آتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے، کبھی کبھی انسان کو خدا کی مخلوق سے فرار تلاش کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے کاندھوں سے تھیلہ اُتارنے لگا۔ میں نے بڑھ کر اس کی مدد کرنا چاہا، مگر اس نے مجھے منع کرتے ہوئے کہا:

"بھائی سالہا سال سے میں یہ کام کر رہا ہوں، اب تکلیف کا احساس نہیں رہا...."

اس نے اپنا تھیلہ پیٹھ سے اُتار کر زمین پر رکھ دیا اور اس کی گرہ کھول کر تھیلہ میں جو کچھ تھا اس میں سے ایک ایک کر کے لاپروائی سے پھینکنے لگا۔ جو چیز اس طرح پھینکی جا رہی تھی میں اُسے دیکھ کر مبہوت و ششدر رہ گیا۔ پتھر کے ٹکڑے، روڑے بیکار!

میں نے کہا:

"کیا یہی بیکار چیزیں اٹھا لائے تھے؟"

"میں کبھی کبھی اپنی پیٹھ پر پتھر لاد لیتا ہوں جس کی کوئی قیمت نہیں اور کبھی کبھی ایسا سامان بھی اُٹھا لاتا ہوں جس کی قیمت ہوتی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا لیکن اس کے کھڑے ہونے کے انداز ایسے تھے گویا وہ کوئی بھاری بوجھ اُٹھائے ہوئے ہے۔ میری نگاہیں اُس کا جائزہ لے رہی تھیں، وہ میری حیرت کو تاڑ گیا، چنانچہ میرے بغیر پوچھے اس نے کہا:

"جنابِ من آپ جانتے ہیں کہ میں ایک حمال ہوں، ابتدائے جوانی سے بوجھ ڈھونے کا کام کرتا ہوں، روزانہ صبح اپنے گھر سے نکلتا ہوں اور شام کو لوٹ آتا ہوں، پہاڑ پر مقیم گاؤں والوں کو ضروری چیزیں مہیا کرتا ہوں۔"

آس پاس پڑے ہوئے پتھر کے ٹکڑوں کو دیکھ کر میں نے کہا۔

"کیا گاؤں والوں نے تم سے آج یہ پتھر منگوائے تھے؟ اُن کو ایسی کیا ضرورت تھی کہ تم اُن کو ساحلِ سمندر پر واقع گاؤں سے اٹھا کر لاتے؟"

"آج میں بیکار رہا، مجھے کوئی کام نہیں ملا۔"

"تو یہ پتھر کس لئے؟"

"جب مجھے ایسی کوئی چیز نہیں ملتی جو لوگوں کے کام آئے تو میں یہ بیگار اُٹھالاتا ہوں جس سے کوئی فائدہ نہیں۔"

یہ سن کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں نے ذرا چیخ کر کہا:

"بخدا! تم کیا کہہ رہے ہو؟ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا!"

"میں نے ابھی آپ سے عرض کیا کہ آج مجھے چھٹی ہے یعنی زبردستی کی چھٹی، کوئی کام نہیں۔ کسی نے مجھ سے کوئی چیز نہیں منگوائی، تو پھر میں کیا کرتا۔ یہی پتھر اُٹھالایا، بیکار بوجھا!"

میں نے فوراً کہا:

"تو کیا ہوا، اگر کوئی چیز نہیں لانا تھا تو تم آرام کرتے۔ آخر یہ بیگار کیوں؟"

ایک لمبی آہ بھر کر اُس نے کہا:

"افسوس ہے ... مگر کیا کروں۔ جب مجھے اس پہاڑ پر چڑھنا ہوتا ہے کچھ نہ کچھ میری پیٹھ پر لادنا ہی چاہئے، پتھر بھاری ہوتے ہیں، تھوڑی ہی تعداد میں میرا کام ہو جاتا ہے۔"

کیا معنی؟ ... اور میرا کام ہو جاتا ہے ... ؟"

میں نے ہڑبڑا کر پوچھا۔

وہ میرے قریب ہو گیا اور دھیمے دھیمے لہجہ میں کہنے لگا:

"بھائی بوجھ ڈھوتے ڈھوتے میری جوانی گذر گئی، بڑھاپا آگیا اور میں حمالی کرتا رہا، حتیٰ کہ پیٹھ ٹیڑھی ہو گئی۔ میں اور لوگوں کی طرح سینہ تان کر سر اُٹھا کر نہیں چل سکتا۔ کوئی نہ کوئی بوجھ مجھے اٹھانا ہی چاہئے۔ ورنہ توازن قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کے بغیر میرے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں، ٹھیک سے چل نہیں سکتا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وادی میں گرا جا رہا ہوں ...... اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟"

میں نے بغیر سوچے سمجھے جواب دیا:

"مجھے معلوم نہیں .... اپنے معاملات کو تم خود ہی بہتر سمجھ سکتے ہو.... ہو سکتا ہے جو تم کہتے ہو وہ ٹھیک ہو۔"

میری بےبسی پر رحم کھاتے ہوئے اُس نے کہا:

"بوجھ ڈھونا میری زندگی کا ایک اہم جزو بن گیا ہے، اس کے بغیر زندگی کا احساس نہیں ہوتا۔ بوجھ ہی کے ذریعہ میں اپنی زندگی میں توازن اور ہمواری قائم رکھ سکتا ہوں، اس کے بغیر چارہ نہیں، زندگی بے مصرف ہو جائے گی!"

"کیا تم اس سے خوش ہو؟" میں نے دریافت کیا۔

"خوش کیوں نہیں؟ زندگی بھر یہی کرتا رہا ہوں، مجھے اس سے فائدہ پہنچا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس سے فائدہ پہنچا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس کام سے محبت ہو گئی ہے۔ اور کیا، انسان جس چیز کا ضرورت مند ہوتا ہے، وہ اس سے نفرت کرتا ہے؟"

اس کے لہجے میں حد درجہ متانت اور سنجیدگی تھی، اس کی نگاہوں میں بصیرت افروز چمک تھی۔ اس کی حرکات میں خود اعتمادی نمایاں تھی، میں ایک گہری سوچ میں پڑ گیا ..... ایک اتنا سا دہ انسان .... ایک حمال، کیا بساط ہے اس کی۔ مگر ایسی فلسفیانہ موشگافی اور حکمت پرور باتیں صرف فلسفی یا حکیم ہی کر سکتا ہے۔ اس معمولی سے انسان نے زندگی کو برتا ہے، زندگی نے اس کو برتا ہے، زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے اُس نے گریز نہیں کیا، اپنے فطری شعور کو معاف زندگی سے وابستہ کر رکھا ہے۔ اس نے اپنی فطری صلاحیتوں کو زندگی سے گریز کرنے میں صرف نہیں کیا۔

پاکستان کے عوامی رقص

مشرقی پاکستان

مغربی پاکستان
جھومر
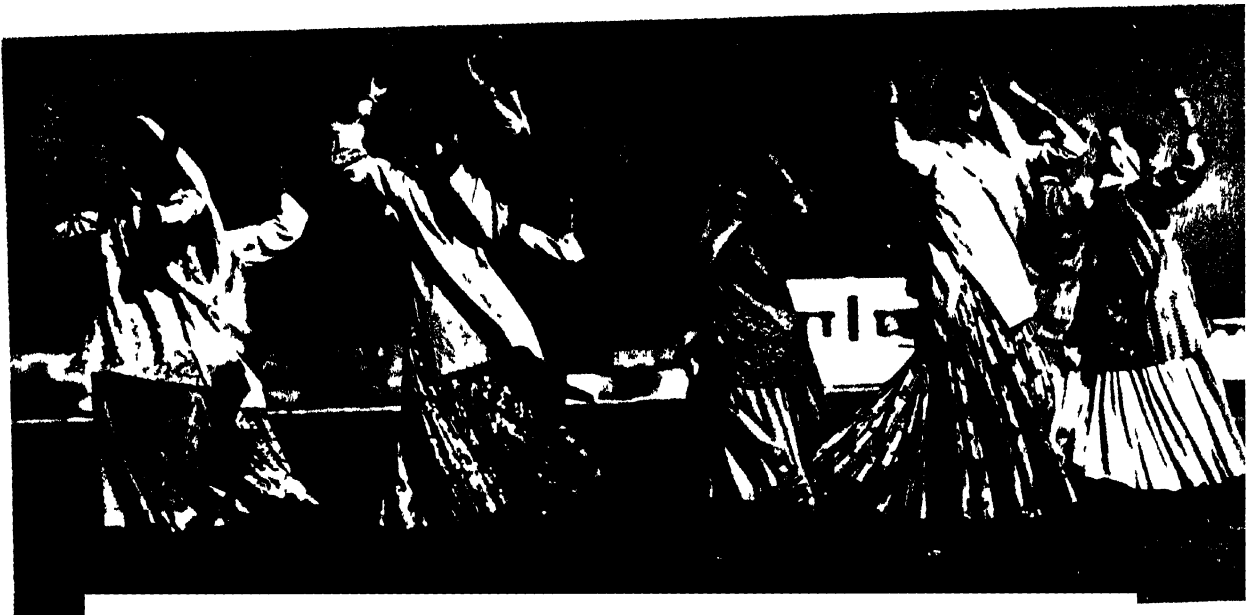
مُلتان

مغربی پاکستان کا قدیم علمی روحانی اور ثقافتی مرکز

مساجد اس شہر کے آثار میں امتیاز رکھتی ہیں ۔
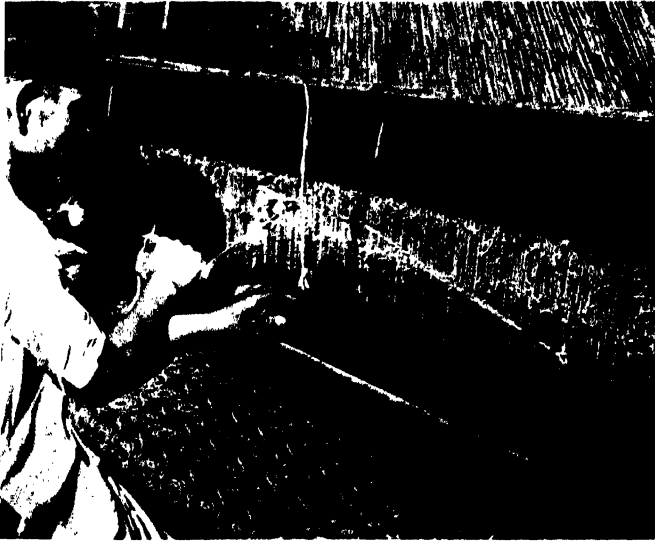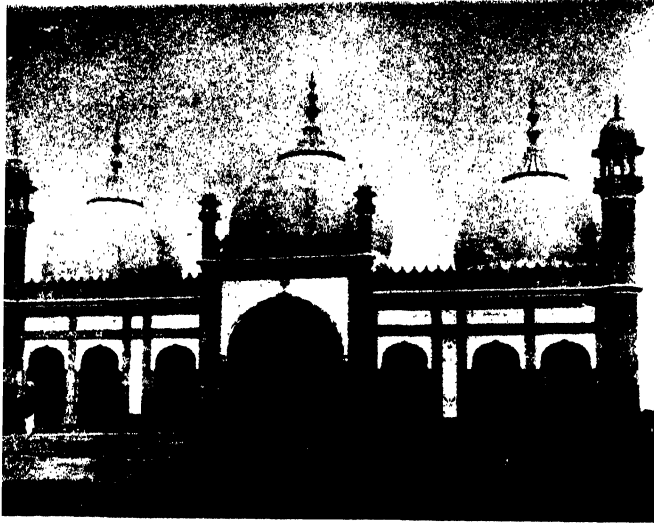
ایک مقبول صنعت قالین بافی

روغنی ظروف پر نقش و نگار

شہر کا نظارہ

ملتان

شیر افضل جعفری

ہر طرح دار یہاں سروِ رواں ہوتا ہے
حُسن والوں پہ چناروں کا گماں ہوتا ہے

گُھچۂ خاک[1] کی چوٹی پہ یہ باغاتِ بریں
ان کے ہر پھول پہ جنّت کا نشاں ہوتا ہے

پاک روضوں پہ یقیں مست دعاؤں کا جلوس
دھوم سے جانبِ افلاک رواں ہوتا ہے

مکتبِ نشترِ[2] جاں بخش کی پھلواری میں
عشق مرہونِ مسیحا نفساں ہوتا ہے

جگمگاتا ہے جبینوں سے حسین آگاہی[3]
شب کو بازار میں پیرس کا گماں ہوتا ہے

مصرِ تنّوں کی زلیخاؤں کی زلفوں کی طرح
روپ نگری کے چراغوں کا دھواں ہوتا ہے

شہر کی سانولی گلیوں سے بہلنے کے لئے
کتنا بے تاب دلِ کاہکشاں ہوتا ہے

موٹریں چھم سے ٹہلتی ہیں کھُلی سڑکوں پر
اُن کی رفتار پہ قربان جہاں ہوتا ہے

جب غزالانِ کنول رنگ پہ آتا ہے نکھار
روکشِ بابِ حرم کوئے بتاں ہوتا ہے

آسمانوں سے نگاروں کی زیارت کے لئے
قافلہ چاند ستاروں کا رواں ہوتا ہے

گنگنائے جو حیا جھوم کے سندھڑے میں غزل
میر و غالب کا اثر نذرِ لباں ہوتا ہے

اور جب تیرِ نگہ کوئی چلانا چاہے
آسماں شوق سے جھکتا ہے کماں ہوتا ہے

بزمِ یاراں پہ پری چہرہ میں آجائے تو
شاعرِ جھنگ کا ایمان جواں ہوتا ہے

گیسوئے ناز کو خوشبو میں رچانے کے لئے
لکۂ ابرِ کرم عطر فشاں ہوتا ہے

دلکش و دلبر و دلدار و دل افروز و حسیں
لعبتِ ناز کا اندازِ بیاں ہوتا ہے

آم کی نازلی شاخوں کے بسنتی رخسار
چوم لیتا ہے تو بوڑھا بھی جواں ہوتا ہے

جس گھڑی مست فضاؤں میں گھٹا لہرائے
ہر طرف طنطنۂ پیرِ مغاں ہوتا ہے

گرد و گرما کی ترائی پہ برستا بادل!
ذرّے ذرّے کیلئے رطلِ گراں ہوتا ہے

مور سے ناچنے لگتے ہیں دلوں میں اکثر
جب کبھی زمزمہ خواں ابرِ رواں ہوتا ہے

کشتیٔ دعا می و پرواز[4] کا مُلتاں افضل
حُسن و رومان کے فردوس کی جاں ہوتا ہے

---

[1] مٹی کی چھوٹی سی پہاڑی [2] نشتر میڈیکل کالج [3] مشہور بازار [4] ملتان کے تین خوش گو شاعر۔

ڈرامہ:

زخمِ دل

رحمان مذنب

پہلا منظر

تاریک کمرہ۔ ونگ میں سے ہلکی ہلکی روشنی آرہی ہے، باہر مینہ پڑ رہا اور بجلی کڑک رہی ہے نفیس بیگم ہاتھ میں ٹارچ، الماریاں کھکھیڑ رہی ہے۔ ان سے ہٹ کر میز کی درازیں دیکھنے لگتی ہے جیسے کچھ ڈھونڈ رہی ہو ــــ دیر تک تلاش جاری رہتی ہے۔

کمرے کو مدھم تیلی بتیوں سے نیم روشن کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ تماشائیوں کو بتیاں نظر نہ آئیں۔ اس صورت میں ونگ کی روشنی درکار نہ ہوگی۔

طاہرہ:۔ آج تو حد ہی ہوگئی ہے۔ توبہ، اتنی دیر، اتنی دیر! گیارہ بج رہے ہیں۔

نفیس بیگم:۔ جبھی تو کہتی ہوں جا کر سو جا۔ آخر صبح کب اٹھے گی۔

طاہرہ:۔ نیند بھی تو آئے۔

نفیس بیگم:۔ لیٹے گی تو نیند آ ہی جائے گی۔

طاہرہ:۔ لیٹوں کیسے؟ دیکھو، رات کیسی ڈراؤنی ہے! ذرا بھی تو روشنی نہیں اور ادھر بجلی بھی گل ہے

نفیس بیگم:۔ زیادہ باتیں نہ بنا، جا کر لیٹ رہ!

طاہرہ:۔ موم بتیاں ہی تو مل جائیں۔

نفیس بیگم:۔ وہی تو میں ڈھونڈ رہی ہوں۔ جانے کہاں پڑی ہیں کم بخت؟ (الماری کھولتے ہوئے) اس میں ڈھیروں سے پڑی رہتی تھیں اور اس وقت نام کو بھی نہیں۔ جانے کہاں غائب ہوگئی ہیں؟

طاہرہ:۔ واہ، امی! تمہیں تو جیسے کچھ پتہ ہی نہیں۔ روز ابا جان دو دو چار چار کر کے یہاں سے لے جایا کرتے تھے، ختم ہوگئی ہوں گی۔

نفیس بیگم:۔ (خفگی میں) لڑکی! ہوش کی دوا کر! تو اپنا کام چھوڑ کر دوسروں کے کاموں میں کیوں دلچسپی لیتی ہے؟ تجھے اپنے کام سے کام ہونا چاہیئے۔ تجھے اس سے کیا کہ دوسرا کوئی کیا کرتا ہے؟

طاہرہ:۔ تم تو بس یہی چاہتی ہو کہ ابا جان کے قریب بھی نہ پھٹکوں۔ ان سے دور دور ہی رہوں۔ آخر کیا بات ہے ابا جان میں؟

نفیس بیگم:۔ بس چپ رہ، یونہی اوائی توائی نہ بکا کر؟

طاہرہ:۔ اس میں اوائی توائی کی کیا بات ہے؟ لڑکیاں اپنے ماں باپ کے کاموں میں دلچسپی لیا ہی کرتی ہیں۔

نفیس بیگم:۔ (ایک دراز میں سے موم بتیاں نکال کر) لے پکڑ، مل گئیں موم بتیاں! انہیں جلا!

طاہرہ:۔ لاؤ!

(طاہرہ کھونٹی سے لٹکے ہوئے کوٹ میں سے دیا سلائی نکالتی، موم بتیاں جلاتی اور انہیں میز اور مچان پر جماتی ہے)

نفیس بیگم:۔ کچھ تو سہارا ہوا ورنہ اندھیرے نے تو ناک میں دم کر رکھا تھا۔ توبہ! اندھیری رات بھی کتنی خوفناک چیز ہے اور ایسے میں کوئی مرد بھی نہیں یہاں۔

طاہرہ:۔ اور پھر ابا جان نے مکان بھی کس اجاڑ میں بنوایا ہے۔ نزدیک میں کچھ آبادی بھی نہیں۔ پکی سڑک تک تو ہے نہیں۔

نفیس بیگم:۔ بیکار باتیں نہ کیا کر!

طاہرہ:۔ واہ، تم انہیں بیکار ہی کیا کرو، اچور آ جائیں پھر؟

نفیس بیگم:۔ کوتوال کیا ہوتا ہے؟ تیرے ابا جان ..... آخر کچھ اپنا فکر ہوتا ہے۔ چور اناڑی تو نہیں ہوتے۔ گھر گھر کی خبر رکھتے ہیں اور دیکھ دیکھ کر چوری کرتے ہیں (دراز میں سے پستول نکالتے ہوئے) جہاں پستول ہو وہاں چوروں کا کیا کام؟

طاہرہ:۔ آخر ابا جان کیا کرتے ہیں؟

نفیس بیگم:۔ (پگلی!) انہیں کاروبار کا کوئی گھاٹا ہے۔ مال ذرآمد برآمد کرتے ہیں، ٹھیکیداری کرتے ہیں۔ آڑھت کرتے ہیں۔ جا، سو رہ جا کر!

طاہرہ:۔ وہ تو ٹھیک ہے سب کچھ لیکن ابا جان رات گئے کیوں آتے ہیں؟ رات کو کیا کاروبار کرتے ہیں؟ ابھی تک نہیں

آئے ۔

نفیس بیگم :۔ بیٹھ گئے ہوں گے کہیں یاروں دوستوں میں۔ کر رہے ہوں گے بیت بازی یا چھانٹ رہے ہوں گے سیاست۔ محفل باز تو وہ اول درجے کے ٹھیرے ۔

طاہرہ :۔ میرا تو آج دل دھڑک رہا ہے، نا جانے کیوں ؟

نفیس بیگم :۔ تو میری بات نہیں سنتی نا۔ جا، کمرے میں جا کر سو جا !

طاہرہ :۔ تم ابا جان سے کیوں نہیں کہتیں کہ رات کو باہر نہ رہا کریں ؟

نفیس بیگم :۔ کاروباری، آدمی کا کوئی ٹیک نہیں۔ اس کے لئے رات دن ایک برابر ہے ۔

طاہرہ :۔ واجد تو کچھ اور ہی کہتا ہے ۔

نفیس بیگم :۔ (چونک کر) کیا کہتا ہے واجد ؟

طاہرہ :۔ (گھبرا کر) وہ، وہ..... اس نے.... اس نے کوئی اچھی بات تو نہیں کی ۔

نفیس بیگم۔ (متفکر ہو کر) کچھ پتہ بھی لگے ۔

طاہرہ :۔ اس نے.... اس نے کہا تھا کہ ابا جان سمگ لنگ کرتے ہیں۔

نفیس بیگم :۔ بکتا ہے۔ اس کا باپ سمگ لنگ کرتا ہوگا ۔

طاہرہ :۔ میں نے اس سے سخت لڑائی کی ۔

نفیس بیگم :۔ اسے تجھ سے ایسی بات کہتے شرم نہ آئی ؟

طاہرہ :۔ اس نے کوئی اپنی طرف سے تھوڑی کہی تھی۔ وہ کیوں ایسی بات کہتا۔ وہ تو اس نے چچا جان سے سنی تھی ۔

نفیس بیگم :۔ تو تو واجد کی طرفداری ضرور کرے گی۔ یہ سب آوے کا آوا بگڑا ہے۔ اس کے چچا جان کہاں کے پارسا ہیں ؟ جوئے اور شکار کے سوا انہیں کیا آتا ہے ؟

طاہرہ :۔ میں جانتی ہوں۔ ناحق واجد کی طرفداری نہیں کرتی۔ میں نے تو وہ خبر لی کہ معافی مانگتا ہوا گیا ہے ۔

نفیس بیگم :۔ جا، اب جا کر سو، صبح اٹھنا ہوگا ۔

طاہرہ :۔ تم بھی تو سو جاؤ !

نفیس بیگم :۔ تو بڑی ضدن ہے۔ مجال ہے جو بات مانے ۔

طاہرہ :۔ تم سوؤ گی تو میں سوؤں گی۔ آج تو یونہی ہوگا ۔

نفیس بیگم :۔ تجھے پتہ تو ہے مجھے نیند نہیں آتی۔ سوؤں کیسے ؟

طاہرہ :۔ آخر تمہیں کیوں نیند نہیں آتی ؟ ماشاءاللہ اتنی عمر، صحت ہے، سرخ انگارے کی طرح چہرہ دمکتا ہے۔ اپنی عمر سے بھی کم کی لگتی ہو۔ عورتیں، تمہیں دیکھ کر میری بہن بتاتی ہیں، اس پر بھی نیند نہ آئے تو تعجب کی بات ہے۔ جانے کیا بھید ہے ۔

نفیس بیگم :۔ تو بڑی باتونی ہے۔ آج تجھے کیا ہوا ہے ؟ سونے کا نام نہیں لیتی اور مغز چاٹے جاتی ہے۔ نہیں سوتی تو نہ سو، اپنے کمرے میں جا ! مجھے ابھی بہت کام کرنا ہے۔ ان کا سارا حساب جوڑنا ہے۔

طاہرہ :۔ توبہ امی ! تمہیں تو روپیہ گننے اور حساب جوڑنے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں۔ ابا جان تو جیسے بس روپیہ لانے کا کام کرتے ہیں، باقی کام تم کرتی ہو۔

نفیس بیگم :۔ تیرا بھلا ہو، اپنا کام کر ! ہمارے معاملے میں دخل نہ دے ! جا کر اپنے کمرے میں سو جا !

طاہرہ :۔ (جماہیاں لیتے لیتے اور اٹھتے اٹھتے) جانا ہی پڑے گا (موم بتی اٹھاتے اٹھاتے بجلی کڑکتی ہے) اوئی اللہ، موسم کتنا خراب ہے۔ جانے ایسے میں ابا جان کیوں باہر رہتے ہیں ؟

نفیس بیگم :۔ لڑکی زبان بند کر ! تجھے کیا خبر کہ دنیا کا دھندا ہر حال میں چلتا ہے ۔

طاہرہ :۔ ایسے گندے موسم میں اور پھر وقت ہو آدھی رات کا، جانے ایسے میں کونسا دھندا چلتا ہوگا ؟

نفیس بیگم :۔ جا بابا ! تو جیتی میں ہاری، اپنے کمرے میں جا !

طاہرہ :۔ لو تنگ آ گئی ہو تو جا رہی ہوں ۔

نفیس بیگم :۔ بڑی تیری مہربانی ہے ۔

(طاہرہ چلی جاتی ہے۔ نفیس بیگم کھٹ سے دروازہ بند کرتی ہے)

— وہی ہوا جس کا ہر وقت دھڑکا رہتا تھا۔ لاکھ چھپایا۔ آخر بھانڈہ پھوٹ کر ہی رہا۔ طاہرہ کیا کہے گی کہ سمگلر کی بیٹی ہے ؟

پُر اسرار موسیقی ———— زور کا قہقہہ، ونگ میں سے نفیس بیگم کی ہمزاد آتی ہے ۔

ہمزاد :۔ ہوں، تجھے طاہرہ کا خیال آ گیا، اپنا خیال نہ آیا۔ تو سمگلر کی بیوی نہیں ؟

نفیس بیگم :۔ (مغموم ہو کر) میرا کیا ہے ؟ میں تو اپنی لٹیا ڈبو بیٹھی۔ طاہرہ کا

خیال آتا ہے۔ وہ تو ابھی کنواری ہے۔ ابھی اس نے دیکھا ہی کیا ہے؟ مجھ سے کوئی کچھ نہیں کہتا۔ اسے طعنے ملنے لگ گئے ہیں، وہ یہ طعنے کیسے سن سکے گی؟

ہمزاد :۔ (ہنس کر) ہونہہ، طعنوں سے کیا ہوتا ہے۔ سمگ لرکی لڑکی ہے، اسے ذرا حرافہ بنا! اس میں تندی تیزی بھرا سب سے نمٹ لے گی۔

نفیس بیگم :۔ (سہم کر) نہیں نہیں، میں اسے ایسا نہ بناؤں گی۔ اس طرح تو وہ پریشانیوں میں پڑ جائے گی۔ بدنام ہو جائے گی۔

ہمزاد :۔ پریشانی اور بدنامی! تو نے دیکھ لیا، کبھی کبھی پیسہ بھی بیکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ بدنامی اور پریشانی دور نہیں کر سکتا۔ دیکھ تو اس وقت کتنی عاجز ہے! تیری سونے چاندی سے بھری ہوئی یہ تجوری پریشانی اور بدنامی دور نہیں کر سکتی۔

نفیس بیگم :۔ دیکھ لیا، سب کچھ دیکھ لیا۔

ہمزاد :۔ یاد ہے، تجھے کبھی فرحت علی سے پیار تھا؟

نفیس بیگم :۔ غلط، بالکل غلط۔ مجھے کبھی فرحت علی سے پیار نہ تھا۔

ہمزاد :۔ تو نے ٹھیک کہا۔ میں ہی بھول گئی تھی۔ واقعی تجھے فرحت علی سے محبت نہ تھی لیکن بات یہ ہے۔ تو بڑی شوخ، چنچل تھی اور رقاملہ بھی۔ تو نے کبھی غلط انداز سے اسے دیکھا اور وہ گھائل ہو گیا۔ مشرق میں تو یوں عام ہوتا ہے۔ یہاں لوگوں کے دل ذرا کمزور ہوتے ہیں۔ پھر تو نے اسے اپنا قدردان جانا اور... تو نے چاہا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قدردان رہے، تجھ پر مرتا رہے۔ تو نے کبھی کبھی اسے طرح بھی دی اور وہ بے چارہ غلط فہمی کی تلوار سے ذبح ہوتا رہا۔ وہ سمجھتا رہا کہ تجھے بھی اس سے پیار تھا اور... جب اس نے پچاس ہزار حق مہر کے مانے، تیرے نام کوٹھی لکھنے کو تیار ہوا تو تیرے والد تجھے اس سے بیاہنے کو تیار ہو گئے۔

نفیس بیگم :۔ ہاں تیار ہو گئے۔ ماں باپ ہمیشہ اپنی اولاد کا سکھ چاہتے ہیں، انہوں نے یہ سب میری ہی بھلائی کے لئے کیا۔

ہمزاد :۔ بے شک لیکن تو نے انہیں بھلائی کرنے ہی نہیں دی۔ تو نے انہیں مایوس کیا۔ خیر، اس وقت نہ سہی بعد ہی میں سہی غلطی کا خمیازہ بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ تو نے... یاد ہے تو نے کیا کہا تھا؟

نفیس بیگم :۔ کہا ہوگا کچھ؟

ہمزاد :۔ تو نے کہا تھا، دولت ہی سب کچھ نہیں، اور پھر تو آوارہ اکرم کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی جو آج تک سدھر نہ سکا، آج تک جس کے وہی لچھن ہیں۔ تیرے باپ نے مخالفت کی لیکن تو نے اس کی نہ چلنے دی۔ تو نے ماں کو اپنے حق میں ہموار کر لیا۔ اکرم اس کا بھتیجا تھا۔ تو جذبات میں بہہ گئی اور آج تک تیرے جذبات کا حشر تیرے سامنے ہے۔

نفیس بیگم :۔ ہاں، میرے سامنے ہے۔ میں نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ میں بالکل نہیں گھبراتی۔ انسان اپنے کئے کی سزا بھگت لیتا ہے۔

ہمزاد :۔ لیکن یہ تجھے خبر نہیں کہ شادی بیاہ کی غلطی پر عمر بھر سزا بھگتنا پڑتی ہے۔ ہاں۔ شادی بیاہ کی غلطی دنیا کی سب سے بڑی غلطیوں میں سے ہے۔ دیکھ لے تو کس بری طرح اپنی زندگی سے کھیل رہی ہے۔ ہر وقت اپنے خاوند کے لئے دعائیں مانگتی رہتی ہے۔ رات رات بھر اس کا انتظار کرتی ہے۔ ہر وقت ڈرتی رہتی ہے کہیں وہ پکڑا نہ جائے، کہیں کوئی آفت نہ ٹوٹ پڑے۔

نفیس بیگم :۔ میں نے دل کی بات مانی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ دل یوں خراب کیا کرتا تھا۔

ہمزاد :۔ دل... یہ دھڑکتا ہوا ایک چھوٹا سا ٹکڑا زندگی تو کیا، دنیا کا نظام بدل دیتا ہے۔ تو بیچاری کہاں کی افلاطون ہے۔ یہ تو بڑے بڑے انسانوں کو چکر میں ڈال دیتا ہے اور پھر چکی کے پاٹ کی طرح انہیں پیس کر رکھ دیتا ہے۔ یہ دل...... نادان! اس کی دھڑکنوں میں تو زمین اور آسمان کے انقلاب پوشیدہ ہیں۔ یہ دھڑکتا ہے تو زندگی کا تیتی ہے۔ دیکھ لے! دل نے تیرا کیا حال کیا اور فرحت علی کا کیا حال کیا۔ آج تک اسے تیرا انتظار ہے۔

نفیس بیگم :۔ چپ رہ! میں اپنے شریک حیات کی ہوں۔ فرحت علی کو مجھ پر اور مجھے اس پر کوئی حق نہیں۔

ہمزاد :۔ شریکِ حیات؟ آہاہاہاہا۔ نا سمجھ! تو اسے شریکِ موت کہہ! اسے کب زندگی پر بھروسہ ہے؟ بھروسہ ہے تو بس موت پر۔

نفیس بیگم :۔ (طنز مار کر) تجھے ذرا خوف نہیں جو یہ منحوس خبریں سناتی ہے۔

ہمزاد :۔ بس نکال لی ہوس؟ تو مظلوم ہے۔ تو کچھ کر بھی تو نہیں سکتی۔ خیر تیرا قصور نہیں۔ مشرق کی مٹی ہی ایسی ہے جہاں عورتیں خاوند کو خدا مانتی ہیں، غلط خدا کا انتخاب کرتی ہیں اور پھر پچھتاتی بھی نہیں۔

نفیس بیگم :۔ دفع ہو! تیری باتیں مجھے اچھی نہیں لگتیں۔

ہمزاد :۔ فرحت علی تیرا انتظار کر رہا ہے اور ...... ہاں۔ تجھے اب عقل آ گئی ہے۔ تجھے اب اپنی طاہرہ کا خیال ہے۔ نیک خیال ہے۔ اگرچہ طاہرہ بھی وہی کر رہی ہے جو تو نے کیا لیکن حالات مختلف ہیں۔ طاہرہ کے حالات تجھ سے بہتر ہیں۔ اسے اپنے دل کی بات پوری کر لینے دے، مضائقہ نہیں اور ...... اور ہاں، اکرم سے کہیو! فرحت علی کو طاہرہ سے کوئی دلچسپی نہیں، کوئی دلچسپی نہیں (ہنس کر) اسے تو تجھ سے دلچسپی ہے۔ (دروازے پر دستک) لے وہ آ گیا، میں چلی۔

نفیس بیگم :۔ شکر ہے، چڑیل ٹلی۔

(چٹخنی گراتی ہے۔ اکرم خاں کی آمد)

ارے یہ خون؟ (چیخ مار کر) اوئی میرے اللہ۔

اکرم خاں :۔ ہاں، ہاں۔ چپ رہو (ہانپ کر) چپ رہو (کراہ کر) ہائے بیگم! دروازے اچھی طرح بند کر دو!

(چارپائی پر گر پڑتا ہے۔ نڈھال ہو رہا ہے۔)

نفیس بیگم :۔ کیا ہوا؟

اکرم خاں :۔ دواؤں کا ڈبہ فوراً لاؤ!

نفیس بیگم :۔ کسی ڈاکٹر کو بلاؤں؟

اکرم خاں :۔ صرف وہ کرو جو میں کہوں۔ ڈاکٹر کو بلا کر کوئی نئی آفت کھڑی کرو گی۔ سارا بھانڈہ ہی پھوٹ جائے گا۔ پولیس سے اس نے کہہ دیا تو بس پھر کام ہی تمام ہے۔

(اکرم خاں کپڑے اتارتا ہے۔ سارا بدن لہولہان ہو رہا ہے۔ نفیس بیگم دواؤں کا ڈبہ لا دھرتی ہے)۔

نفیس بیگم :۔ یہ لو ڈبہ! کیا کروں؟

اکرم خاں :۔ گرم گرم دودھ لاؤ! اس میں گلو کوز اور اوولٹین اچھی طرح ملا دو!

نفیس بیگم :۔ ایک منٹ میں لاتی ہوں۔

(بجلی کے چولہے پر کام کرنے لگتی ہے۔ اکرم خاں گاؤ تکیے کا سہارا لے کر لیٹے لیٹے روئی سے زخم پونچھتا ہے۔ لہو سے لتھڑی ہوئی روئی کے ڈھیر لگتے چلے جاتے ہیں۔ زخموں پر دوا لگاتا ہے۔)

(مڑ کر دیکھتی اور چیخ مارتی ہے) تم ...... تم تو لہولہان ہو رہے ہو۔

اکرم خاں :۔ بیگم! ہوش کی دوا کرو! آخر ایسا کیا غضب ہو گیا جو تم چیخ اٹھیں۔ جھٹ پٹ دودھ پلاؤ!

نفیس بیگم :۔ توبہ، اتنے زخم کاہے کے ہیں؟ کیا ہوا تھا؟ ڈاکٹر کو لانے دو!

اکرم خاں :۔ (کراہتے ہوئے) کیسے لاؤ گی؟ کسی اجنبی سے علاج نہیں کروا سکتا۔ میرا اپنا ڈاکٹر جو راز میں شریک ہے وہ یہاں نہیں۔ کہیں باہر گیا ہوا ہے۔ آ جائے تو اسی سے علاج کراؤں گا۔ ورنہ آپ ہی کچھ تدبیر کر دوں گا۔ تم پٹیاں تیار کر دو!

نفیس بیگم :۔ (دودھ پکڑاتے ہوئے) کوئی زخم سا زخم ہیں! میرے اللہ، کیا ہو گا؟

(بڑا زخم چھپا لیتا ہے جو دل کے قریب آیا ہے)

اکرم خاں :۔ گھبرانے سے کچھ نہ ہو گا۔ حوصلے سے کام لو! زخم تو خیر کافی آئے ہیں لیکن یہ جو دل کے قریب ہے یہ ذرا خطرناک ہے۔ خیر یہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ آدمی میں ہمت ہو، ذرا وہ جی کڑا کرے تو ہر آفت ٹل جاتی ہے۔

نفیس بیگم :۔ تمہیں یقین ہے کہ یہ زخم ٹھیک ہو جائے گا؟

اکرم خاں :۔ یقین ہے، بالکل یقین ہے۔ یہ زخم ٹھیک ہو جائے گا۔ اس سے بڑے بڑے زخم ٹھیک ہو گئے۔ یہ کیا چیز ہے؟

نفیس بیگم :۔ خون بھی تو بند ہو۔

اکرم خاں :۔ بند ہو جائے گا۔ آخر زخم ہے۔ تھوڑا تھوڑا خون تو رستا ہی ہے۔ تم حوصلے سے کام لو!

(پٹیاں باندھتا ہے۔ دل کے زخم پر چھپا کر پٹی باندھتا ہے)

نفیس بیگم :۔ مجھ سے بڑھ کر کس کا حوصلہ ہو گا؟ حوصلے سے کام لیتے لیتے پتھر کا دل بنا لیا۔ آنکھیں بھی پتھر کی ہیں، دل بھی پتھر کا ہے۔

اکرم خاں :۔ مجھے ایسے ہی دل کی ضرورت ہے۔ ڈرامت کرو! تم

کسی بزدل کی بیوی تو نہیں ۔

نفیس بیگم :۔ ایسے زخمی تو کبھی نہ ہوئے تھے ۔ آج کیا ہوا ؟

اکرم خاں :۔ لڑائی ۔ اُف ! کوئی لڑائی تھی ۔ ایسی گھمسان کی لڑائی کبھی نہ ہوئی تھی ۔

نفیس بیگم :۔ مال نہیں لائے ؟

اکرم خاں :۔ ارے ، وہ تو باہر ہی بھول آیا ۔ سیڑھی پر رکھا ہے ۔ دروازہ کھول کر اٹھا لاؤ !

چٹخنی اتار کر ایک اٹیچی کیس لاتی ہے ۔ چٹخنی پھر چڑھا لیتی ہے ۔

نفیس بیگم :۔ بڑا وزنی ہے یہ اٹیچی کیس ! تم اسے کیسے لائے !

اکرم خاں :۔ لے ہی آیا کسی طرح ۔ میں ہاکو تیلی کے یہاں بیٹھا تھا ۔ میرے آدمی مال لے کر آئے ۔ طے کیا کہ رات بھر کام چلے گا ۔ آدمی بارڈر پار جائیں گے اور مال لائیں گے ۔ کم از تین چار پھیرے اور ہو جائیں گے ۔ میرے آدمی دوسرے پھیرے جانے ہی کو تھے کہ بارڈر پولیس آ گئی ۔ جانے اسے کس نے خبر کی ہم سب ہتھیاروں سے لیس تھے ۔ سیدھے ہو گئے ۔

دینا گوجر ہے نا میرا آدمی ؟

نفیس بیگم :۔ ہاں ، وہ لمبا تڑنگا جن بھوت کی شکل والا ۔

اکرم خاں :۔ ہاں ہاں وہی ۔ اسے مال تھما کر بھگا دیا ۔ وہ تو کسی نہ کسی طرح نکل گیا ہم پھنس گئے ۔ زبردست لڑائی ہوئی ۔ بے چارہ ہاکو تیلی مارا گیا ۔ مجھے سنگین لگی نتھو ، خیرا ، رلدو ، سب کے سب بری طرح زخمی ہوئے لیکن ہم بچ کر نکل کر آئے پاس ہی گنوں کا بڑا ڈبل کھیت تھا ۔ اس نے ہمیں بچا لیا ۔

نفیس بیگم :۔ شکر ہے کوئی پکڑا نہیں گیا ۔

اکرم خاں :۔ نہیں ، کوئی پکڑا نہیں گیا ۔ آج تو تقدیر ہی الٹ گئی ورنہ کتنا شاندار موسم تھا ! ایسا موسم تو بڑی دعائیں مانگ مانگ کر نصیب ہوتا ہے ۔ چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا ۔ موسلا دھار مینہ برس رہا تھا ۔ ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے ۔ ایسے میں تو لاکھوں کا مال ادھر سے ادھر ہو جاتا اور پتہ نہ چلتا ۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ ڈیڑھ دو لاکھ کا مال رات ہی رات کھینچ لوں گا ۔

نفیس بیگم :۔ اب تو یہ دھندا روز بروز مشکل ہو رہا ہے ۔ اخبار پڑھو تو آئے دن کسی نہ کسی کے پکڑے جانے کی خبر چھپتی ہے ۔

اکرم خاں :۔ کام کرنے کا تو مزا ہی اب ہے ۔ اناڑی پکڑے جائیں گے ۔ کاریگر کاریگر رہ جائیں گے ۔

نفیس بیگم :۔ بڑا خطرناک کام ہے یہ !

اکرم خاں :۔ جتنا خطرناک یہ کام ہے ۔ اس سے زیادہ میں خطرناک ہوں اور پھر جو لوگ میرے گروہ میں شامل ہیں اور ادھر سے ادھر مال کرتے ہیں وہ بڑے زبردست ہیں ۔ دینے گوجر نے پانچ خون کئے ہیں ۔ ہاکو بے چارہ مر گیا ۔ بڑا اچھا آدمی تھا ۔ اس کا گھر ہمارا قلعہ تھا کسی کی مجال تھی کہ اس گھر کی طرف ٹیڑھی نظر سے دیکھے سب اس سے ڈرتے تھے ۔ علاقے میں ایسا ڈاکو نہ ہوگا ۔ نتھو اور خیرا بڑے دلیر ہیں ۔ اول درجے کے بدمعاش ہیں اور نشانچی بھی پرلے درجے کے ہیں ۔ میں کہتا ہوں ، ایک ایک آدمی ہیرا ہے اور اپنے ہنر میں یکتا ۔ قسمت بری نکلی ، ورنہ کام میں کوئی نقص نہیں ۔

نفیس بیگم :۔ مجھے تو اب بڑا ڈر لگتا ہے ۔ یہ دھندا برا ہے ۔ بہت برا ہے ۔

اکرم خاں :۔ نفیس ! یہ تم کہہ رہی ہو ؟ یاد نہیں کہ تمہارے والد تم سے میری شادی نہ ہونے دیتے تھے ۔ مجھے آوارہ کہتے تھے ۔ میری مفلسی کا مذاق اڑاتے تھے ۔ نفیس ! آوارگی کیسی بے کار اور فضول شے ہے ۔ جسے عمر ضائع کرنی ہو ، وقت برباد کرنا ہو وہ آوارگی کرے لیکن دیکھ لو ! نفیس ! دیکھ لو ! میں نے آوارگی کو کتنا قیمتی اور کارآمد بنا دیا ۔ میری آوارگی سونا چاندی پیدا کرتی ہے ۔ میں نے سب کی زندگی سنوار دی اس آوارگی کو انمول کہو ! لاکھوں روپے کی چیز ہے ۔ اس وقت تمہارے پاس کچھ نہیں تو پچاس ہزار کے زیور ہوں گے ۔ یہ مکان چالیس ہزار کا ہے ۔ طاہرہ کی شادی کے لئے بیس ہزار کی رقم محفوظ ہے ۔ پندرہ ہزار کے زیور اس کے لئے بنوائے ہیں تمہیں کس بات کی کمی ہے ! نفیس ! شکر کرو کہ آوارہ ہوں ۔ آج یہی آوارگی کام آئی ۔ آوارہ نہ ہوتا تو شاید بھوکوں مرتا اور کوڑی کوڑی کو ترستا

نفیس! میں دعوے سے کہتا ہوں جتنا فائدہ ہم نے آوارگی سے اٹھایا ہے کسی نے نہیں اٹھایا ہے۔ میری جان! یہ تو ایک نعمت ہے، نعمت۔

نفیس بیگم :۔ کچھ بھی ہو، اب یہ دھندا بند کر دینا چاہیئے! ہر وقت جان کا خطرہ رہتا ہے۔

اکرم خاں :۔ خیر، یہ پھر سوچنے کی باتیں ہیں۔ پہلے یہ زخم تو ٹھیک ہوں۔ آج تک کچھ نہ ہوا تھا۔ سارا خطرے کا کام میرے آدمی کرتے تھے۔ میں تو صرف ہاکو تیلی کے گھر ہی جاتا تھا۔ آدمی مال لے آتے تھے۔ میں ٹھکانے لگاتا تھا۔ خیر، آ گیا ایسا بھی موقعہ۔ وقت کی بات ہے۔ تقدیر پر کس کا زور چلتا تھا۔ نفیس! موت سے ڈرنا بزدلی ہے (اس دوران میں نفیس بیگم خون والی روئی اور چندیاں وغیرہ اٹھا کر ایک طرف گٹھڑی میں باندھتی اور اسے چھپا کر رکھ دیتی اور پھر فرش گیلے کپڑے سے پونچھ دیتی ہے) موت سے کون بچا ہے؟ جان کا خطرہ کسے نہیں؟ سڑک پر چلتے چلتے آدمی حادثے کا شکار ہو جاتا ہے۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے ہارٹ فیل ہو جاتا ہے۔ موت ہر وقت اور ہر کہیں منڈلاتی پھرتی ہے۔ اس کا کوٹہ مقرر ہے۔ جائز ناجائز ہر طریقے سے وہ اپنا کوٹہ پورا کرتی ہے۔ کہیں گاڑیوں کی ٹکر ہوتی ہے کہیں لاریاں الٹ جاتی ہیں، کہیں ہوائی جہاز تباہ ہو جاتے ہیں کہیں سیلاب آ جاتے ہیں کہیں وبا پھیل جاتی ہے کہیں قحط پڑ جاتا ہے۔ نفیس! ہر طرف موت کا راج ہے۔ موت سے کون بچتا ہے۔ جان کے خطرے کی بات نہ کیا کرو!

نفیس بیگم :۔ تم بڑے ضدی ہو۔

(اسٹیج کے قریب سخت مایوس اور نڈھال ہو کر الماری کے سہارے کھڑی ہو جاتی ہے۔ ہمزاد آتا ہے)

ہمزاد :۔ جسے تو شریک حیات کہتی ہے وہ شریک موت ہے۔ نادان! یہ شاندار محل ریت کی بنیادوں پر کھڑا ہے۔ اس پر کوئی بھروسہ نہیں اور اگر یہ محل گر پڑا اور اگر اکرم مر گیا (نفیس بیگم چیختی ہے)

اکرم خاں :۔ نفیس! کیا ہوا؟ کیوں چیختی ہو؟

نفیس بیگم :۔ کچھ نہیں، کچھ نہیں۔ یونہی خیال آ گیا تھا۔

اکرم خاں :۔ نفیس! تم کمزور دل تو نہیں جو یوں چیخنے چلانے لگ گئیں۔

نفیس بیگم :۔ نہیں نہیں، میں کمزور دل نہیں، شیطان بڑے وسوسے ڈالتا ہے۔

اکرم خاں :۔ اس کا علاج یہ ہے کہ آدمی خود شیطان بن جائے۔

نفیس بیگم :۔ ہاں ہاں یہی علاج ہے۔

اکرم خاں :۔ آنسو پونچھ لو!

(نفیس آنسو پونچھنے لگتی ہے)

ہمزاد :۔ یہ مشرق بھی کیا دیس ہے! یہاں خاوند عورت کا خدا ہوتا ہے۔ خاوند نہ رہے تو عورت کی مٹی پلید ہوتی ہے۔ وہ دو کوڑی کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ مٹی میں مل جاتی ہے۔ شریف عورت کچھ بھی تو نہیں کر سکتی۔ وہ اپنے خاوند کے بغیر کوئی ہستی نہیں رکھتی۔ نفیس بیگم! گھبرا نہیں۔ تیرا ایک سہارا اور بھی ہے جسے آج تک تو نے سہارا نہیں سمجھا۔ وہ تیرا انتظار کر رہا ہے۔ طاہرہ سے اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ اسے تجھ سے دلچسپی ہے۔

نفیس بیگم :۔ (تھپڑ مار کر) خاموش، بدتمیز!

اکرم خاں :۔ نفیس! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم نے کسے تھپڑ مارا؟ کسے بدتمیز کہا؟ اس کمرے میں تو کوئی بھی نہیں۔

نفیس بیگم :۔ میں نے شیطان کو تھپڑ مارا۔

اکرم خاں :۔ چھوڑو اس شیطان کا پیچھا! کیا رکھا ہے اس میں؟

دروازے پر دستک

دیکھو! کون ہے؟

نفیس بیگم :۔ دیکھتی ہوں (دروازے کے پاس جا کر) کون؟

آواز :۔ (زیر لب، رازدارانہ لہجے میں) بڑی حویلی والوں کے آدمی ہیں ہم۔

نفیس بیگم :۔ (اکرم خاں) بڑی حویلی والوں کے آدمی ہیں۔

اکرم خاں :۔ آنے دو!

نفیس بیگم کھٹکا اتارتی ہے۔ دو آدمی داخل ہوتے ہیں۔

کہو، دام لائے؟

پہلا آدمی :۔ کبھی دام کے بغیر بھی آتے ہیں؟ مال کتنے کا ہے؟

اکرم خاں :۔ (ضبط کر کے) چالیس کا

دوسرا آدمی :۔ پچیس ابھی لو! (ڈبیا کیس کھول کر اس میں سے ہزار ہزار کی پچیس گڈیاں نکالتے ہوئے) پندرہ کل، دس سے پہلے پہلے

پہنچا دیں گے۔

اکرم خاں :۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ وہ دھرا ہے مال الماری کے پیچھے، لے جاؤ نا!

دونوں آدمی جا کر اٹیچی کیس نکال لیتے ہیں۔

پہلا آدمی :۔ ہوا نہ دھندا؟ ایک کے سو بن گئے۔

اکرم خاں :۔ بٹیا! کر و تب جانیں، گولیوں کی بوچھاڑ میں سے گزرو، تو پتہ چلے کہ کیا دھندا ہے۔

دوسرا آدمی :۔ ہمیں سب معلوم ہے۔ کام تو سارا آپ کے آدمی کرتے ہیں۔ آپ تو الگ بیٹھے رہتے ہیں۔

اکرم خاں :۔ کبھی چل کے دیکھو میرے ساتھ، سب کچھ معلوم ہو جائے گا کہ میرے آدمی کیا کرتے ہیں اور میں کیا کرتا ہوں۔

پہلا آدمی :۔ چلیں گے، اور ضرور چلیں گے۔

اکرم خاں :۔ چلنا!

دوسرا آدمی :۔ اچھا۔

دونوں چلے جاتے ہیں نفیس بیگم چٹخنی چڑھاتی ہے؟

اکرم خاں :۔ شکر ہے، مصیبت ٹلی۔ جب تک مال ٹھکانے نہ لگے خطرہ ہی رہتا ہے۔

نفیس بیگم :۔ (اطمینان کا سانس لے کر) اب لعنت بھیجو اس دھندے پر! ذرا گھر کی خبر لو! جوان لڑکی بیٹھی ہے۔ اس کے بیاہ کی فکر کرو! زمانہ برا ہے۔ خدانخواستہ کسی نے بہکا دیا تو عمر بھر کی رسوائی ہو جائے گی۔

اکرم خاں :۔ ٹھیک ہو جاؤں تو اس کا بیاہ کر دوں گا۔ میں تو برباد ہوں، طاہرہ کی زندگی کیوں برباد کر دوں؟

نفیس بیگم :۔ اس وقت رشتہ بھی اچھا مل رہا ہے۔

اکرم خاں :۔ ہاں حکیم فرحت علی خوب آدمی ہے۔ دس پندرہ لاکھ نقد ہیں اس کے پاس۔ چار جنگی حویلیاں ہیں۔ ایک پورا بازار اس کا ہے۔ موٹر اور نوکر چاکر والا ہے۔

نفیس بیگم :۔ اسے چھوڑو! اپنا واجد ٹھیک ہے۔ عزیزوں میں اس سے قابل اور شریف کوئی لڑکا نہیں۔

اکرم خاں :۔ اے نفیس! تم نے بھی کس بدھو کی بات کی؟

نفیس بیگم :۔ واہ بدھو کیسے ہوا؟

اکرم خاں :۔ اس نے اتنی تعلیم پائی، اتنی کتابیں پڑھیں، اور کمائی کل تین سو روپلی ماہوار۔

نفیس بیگم :۔ اپنا عزیز تو ہے، بھلامانس تو ہے؟

اکرم خاں :۔ عزیز اور بھلے مانس کو لے کر کوئی چاٹے؟

نفیس بیگم :۔ اٹھارہ سال کی لڑکی اور چالیس سال کا میاں، ہونہہ۔

اکرم خاں :۔ تم نہیں سمجھتیں۔ دولت نوجوانوں کے پاس نہیں ہوتی۔ نوجوانوں کے پاس فقط جوانی ہوتی ہے۔ میں نے طاہرہ کو شہزادیوں کی طرح پالا ہے۔ خاوند کے یہاں آرام نہ ملا تو وہ پریشان ہو گی نفیس! طاہرہ بڑی نازک مزاج ہے۔

نفیس بیگم :۔ کچھ بھی ہو، فرحت علی سے رشتہ نہ کرو!

اکرم خاں :۔ (کراہ کر، تعجب سے) وجہ؟ فرحت علی بدچلن ہے، بدکار ہے، کیا ہے؟

نفیس بیگم :۔ وہ اسے سکھ نہ دے گا۔

(ہمزاد آ کر کہتی ہے، "اسے کسی کا انتظار ہے"۔ اور چلی جاتی ہے۔ وہ، اور ڈھب کا آدمی ہے)

اکرم خاں :۔ خیر، مجھ پر بات چھوڑ دو! ہائے، یہ زخم!

نفیس بیگم :۔ ہلو نہیں، یونہی رہو!

اکرم خاں :۔ ٹیس اٹھ رہی ہیں۔ میرے پاس بیٹھ جاؤ!

نفیس بیگم :۔ لو

سین بدلتا ہے

دوسرا سین

وہی کمرہ لیکن حلیہ نیا ہے۔ میز پر دوا کی چھوٹی بڑی چھوٹی شیشیوں کا ڈھیر لگا ہے۔ روئی اور پٹیوں کے بنڈل رکھے ہیں۔ چھری، سلی اور کھرل بھی موجود ہیں۔

نفیس بیگم سہارا دے کر اکرم خاں کو اٹھاتی اور آرام کرسی پر بٹھاتی ہے۔ اکرم خاں چادر بدلتا ہے۔

نفیس بیگم :۔ شکر ہے، کچھ گھاؤ ٹھیک تو ہوئے۔

اکرم خاں :۔ ہاں، بس وہی ذرا ٹھیک نہیں جو دل کے پاس ہے۔ آج پھر اس سے خون رِسا ہے۔

نفیس بیگم :۔ دل تو چیز ہی ایسی ہے۔ اس کے گھاؤ سے خدا بچائے!

اکرم خاں :۔ واجد کو بلا لو! دیکھیں کیا کہتا ہے۔ تم نے اسے میرا پیغام

پہنچایا اور وہ آیا۔

نفیس بیگم :۔ تمہارا فیصلہ اسے منظور نہیں۔

اکرم خاں :۔ یہ بھی خوب ہے۔ فیصلہ میرا اور اس کی منظوری دے — واجد! خیر، اسے بلاؤ ذرا!

نفیس بیگم دنگ کے قریب جا کر آواز دیتی ہے۔ واجد حاضر ہوتا کہہ کر داخل ہوتا ہے۔ کیا بات ہے بھائی؟

واجد :۔ پھوپھی جان نے جو خبر سنائی ہے اگر وہ ٹھیک ہے تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھ میں کیا نقص ہے؟

اکرم خاں :۔ واجد! سوال نقص کا نہیں خوبی کا ہے۔ میں وہ آدمی ہوں جس کی نظر میں نقص کوئی شے نہیں، صرف خوبی ایسی شے ہے جس کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ بیٹھ جاؤ اور تحمل سے سنو!

واجد :۔ جی، بس میں یونہی ٹھیک ہوں۔

اکرم خاں :۔ اچھا تو کھڑے رہو اور سنو! جانتے ہو طاہرہ عمر بھر کس طرح رہی؟ اس کے اخراجات کا کچھ اندازہ ہے۔

واجد :۔ ہوں یہ بات ہے۔ میں پوچھتا ہوں کیا تین سو روپے میں اچھی طرح گذارہ نہیں ہو سکتا؟

اکرم خاں :۔ تین سو زیادہ ہوتے ہیں کہ تین ہزار؟

واجد :۔ خوب، بات گنتی کی ہے، شرافت کی نہیں۔

اکرم خاں :۔ کون اولاد کی بہتری نہیں چاہتا؟

واجد :۔ لیکن صرف پیسہ ہی تو بہتری کی چیز نہیں، انسانیت بھی کچھ ہوتی ہے۔

اکرم خاں :۔ اگر انسانیت عالیشان مکان بن سکتی ہے، موٹر گاڑی بن سکتی ہے، اوڑھنا بچھونا بن سکتی ہے تو بڑی اچھی چیز ہے ورنہ پھر اس ڈھول کے پول کی مجھے ضرورت نہیں۔

واجد :۔ آپ کے لئے انسانیت کوئی چیز نہیں۔ دنیا میں آگ لگی ہے اور انسانیت اس میں جل رہی ہے۔ آپ جیسے لاکھوں انسان پیسے کی چمک دمک پر فریفتہ ہیں، خیر، اسے چھوڑئیے! اپنے وعدے یاد کیجئے! (نرم لہجے میں) میں طاہرہ سے بیاہ کروں گا۔

اکرم خاں :۔ کس کتاب میں لکھا ہے؟

واجد :۔ دل کی کتاب میں۔

اکرم خاں :۔ دل؟ دل بڑی بری چیز ہے اور اس کا گھاؤ؟ اف، بڑی مشکل سے اچھا ہوتا ہے۔ دل نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ آدمی زیادہ سکھی ہوتا، زیادہ صحیح اور سالم رہتا۔ (بہ مشکل ہنستے ہوئے) خیر، وہ کچھ اور بات تھی جو میں نے کہی۔ یہ تو تمہارے دل کی بات ہے برخوردار! اس بیسویں صدی میں دل کو لئے پھرتے ہو؟ دل کے دن لد گئے۔ یہ دل، یہ تمہارا دل دھوکے کا آلہ ہے۔ تم بچے ہو۔ طاہرہ بھی بچی ہے۔ اس نے بھی دل کا نام لیا تھا

واجد :۔ خاندان بھر میں کسے خبر نہیں کہ ہم میں پیار ہے۔

اکرم خاں :۔ (تیزی سے) یہ سب دھوکے کا کھیل ہے۔ پیار کا ہلولا بیکاروں کے کام کی شے ہے۔ اندھا دھند، بے سوچے سمجھے اناڑیوں کی طرح پیار کرنا حماقت ہے۔ اگر پیار کو حکیم کا نسخہ سمجھتے ہو تو اپنے حالات کے مطابق کسی لڑکی سے پیار کر لو!

واجد :۔ حالات تو بالکل ٹھیک ہیں۔ ہمارا پیار حالات کے عین مطابق تو ہے۔ ہم دونوں ایک گھر میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں ایک ساتھ کھیلے۔ ہم نے ایک دوسرے کو جانا پہچانا اور پھر...... بڑے ہو کر بھی مدت تک ایک ساتھ رہے۔ آپ ہی نے طاہرہ کو میرے ساتھ کالج میں داخل کر دیا اور مجھے اس کا خیال رکھنے کو کہا اور پھر... پھر ہم پچھلے چار سال تک انہی کمروں، انہی چار دیواریوں میں بیٹھ کر کتابیں پڑھتے رہے۔ آپ کو یاد نہیں، میں نے کس محنت سے طاہرہ کو تیاری کروائی۔ وہ یونہی تو اول درجے میں پاس نہیں ہوئی۔ آپ ہی نے باپ بن کر کہا تھا، جس طرح ہم بچپن سے ایک چلے آ رہے ہیں آئندہ بھی ایک رہیں گے۔ جو پودا یوں سینچ سینچ کر درخت بنا ہو اور جس میں دو ہستیوں کی روح کھپی ہو آپ اسے اکھاڑ پھینکیں گے؟

اکرم خاں :۔ تمہارا احسان بجا۔ کہو تو کاغذ پر لکھ دوں۔ چاہو تو معاوضہ لے لو۔

واجد :۔ پیسہ پیسہ پیسہ۔ آپ کو ہر چیز پیسے کی صورت میں نظر آتی ہے۔ آپ کے نزدیک یہ دنیا اور اس کا سب کچھ پیسے کی طرح گول ہے۔ ہر چیز کو پیسے کے پیمانے سے ناپتے ہیں آپ۔ میں پھر کہتا ہوں، پیسہ ہی سب کچھ نہیں۔ ذریعہ ہے، زینہ ہے لیکن مدعا نہیں، مقصد نہیں، منزل نہیں۔ آپ نہیں مانتے تو مت مانئے لیکن میں اس انمول چیز کو نہیں بیچ سکتا جس سے میری یادہ

کے خزانے بھرپور ہیں، جس سے میرے خیالات اور تصورات آباد ہیں۔

اکرم خاں :۔ تم پیسے کے دشمن ہو جن کے پلے پیسہ نہیں وہ یونہی اسے کوستے ہیں لیکن پیسہ ہی ایسی چیز ہے جو دن کی طرح روشن ہے، جس کا پیمانہ اندھے تک دیکھتے ہیں۔ یہ دنیا اچھی ہو یا بری، پیسے کے بغیر بے کار ہے۔ اور وہ . . . . وہ جسے تم پیار کہتے خلوص کہتے ہو اور جسے دل کی بات کہتے ہو، جس کا تم ورد کرتے ہو وہ، وہ تمہارے سوا کسی کو نظر نہیں آتی۔ وہ چیز کس کام کی جو صرف تمہارے مطلب کی ہو، جس کا مطلب تمہارے سوا کوئی نہ سمجھے؟

نفیس بیگم :۔ واجد بیٹے! تمہارے پھوپھا ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ ان کی باتوں کا برا نہ ماننا!

واجد :۔ (تلخ ہو کر) میری باتوں کی کوئی قیمت ہی نہیں، ایسی ہی بیکار ہیں یہ باتیں؟ طاہرہ سے تو پوچھیے!

اکرم خاں :۔ طاہرہ سے پوچھیں؟ گویا ہم اپنی اولاد کو تباہی کے گڑھے میں پھینک رہے ہیں۔ ہمیں اپنی اولاد اچھی نہیں لگتی؟ ہم اپنی اولاد کا بھلا نہیں چاہتے؟ واجد! کیا ہم قصائی ہیں؟

واجد :۔ آپ جانئے! آپ کا یہ فلسفہ آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ پیسہ انسان کو سنوار نہیں سکتا۔ دنیا کو سنوارنے والوں نے اسے پیسے سے نہیں سنوارا۔ سنوارنے والی چیز دل ہے، خلوص ہے، پیار ہے۔

اکرم خاں :۔ یہ دل، یہ خلوص اور یہ پیار ماں باپ کے پاس ہوتا ہے پیدائش سے ہوتا ہے اور اسی سے وہ اپنی اولاد کی زندگی سنوارتے ہیں۔ دل، خلوص اور پیار کو ہم سمجھتے ہیں، ہم ماں باپ۔ تم کیا سمجھوگے جو اسے کھیل جانے۔ برخوردار! ابھی پیار کے معنی سمجھو! یہ کھیل نہیں۔ بڑی کٹھن چیز ہے پیار۔ اس کی منزل اور اس کا انجام تم نہیں جانتے! جاؤ کام کرو! نادان لڑکے! اپنی عقل کو ابھی اور پختہ کر لو!

واجد :۔ بہت اچھا

(زور سے دروازہ بھیڑ کر نکل جاتا ہے)

نفیس بیگم :۔ بڑے غصے میں گیا ہے لڑکا۔

اکرم خاں :۔ کیا کرے گا؟

نفیس بیگم :۔ یہ عمر، جوانی کا زمانہ، اس میں انسان سبھی کچھ کر سکتا ہے۔ تم نے اس کے آخری الفاظ سنے؟ اس کا لب و لہجہ کتنا خطرناک تھا۔ تم نے اس کا چہرہ اچھی طرح نہیں دیکھا، بالکل آگ تھا جیسے وہ برسنا چاہے۔ مجھے۔ مجھے تو خوف لگتا ہے۔

اکرم خاں :۔ یہ کل کا چھوکرا کیا کرے گا؟ یہ کس کھیت کی مولی ہے؟ (کراہ کر) اف، یہ زخم!

نفیس بیگم :۔ ناحق لڑکے سے الجھے۔ اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس بری طرح زخمی ہوئے ہو، تمہیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔ ذرا سنبھلنے لگے تھے کہ پھر طبیعت پر بوجھ ڈال لیا۔ خدا کے لئے خاموشی سے آرام کرو! اب میں تمہیں کسی سے ملنے نہ دوں گی اس کل کے چھوکرے سے الجھنے کی ضرورت نہیں۔ تم کچھ کر بھی تو نہیں سکتے۔

اکرم خاں :۔ ہاں، مجھے کسی سے نہ الجھنا چاہیے۔ آرام کرنا چاہیئے۔ میری حالت کا یہی تقاضا ہے۔ یہ زخم! ڈرتا ہوں کہیں بڑھ نہ جائیں اور پھر یہ جو دل کے پاس ہے، یہ تو خاصا خطرناک ہے۔

نفیس بیگم :۔ خدایا کیسے ٹھیک ہوگا یہ تمہارا زخم!

اکرم خاں :۔ ہوں، کیسے ٹھیک ہوگا؟ ٹھیک ہو جائے گا۔ اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔ میری قوتِ ارادی سے ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر میں نہ مرنا چاہوں تو نہیں مر سکتا۔ نفیس! دیکھ لینا میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔

نفیس بیگم :۔ خدا کرے تم ٹھیک ہو جاؤ اور بڑی جلدی ٹھیک ہو جاؤ! میں نیاز دوں گی، کم سے کم دس دیگ کی نیاز دوں گی بزرگوں کی مہربانی سے تم ٹھیک ہو جاؤ لیکن میں کہتی ہوں

اکرم خاں :۔ کیا کہتی ہو؟

نفیس بیگم :۔ جب تک ٹھیک نہیں ہو جاتے اور . . . . تم میں پوری طرح جان نہیں آ جاتی کوئی نئی الجھن نہ پیدا کرو! واجد سے مت بگاڑو!

اکرم خاں :۔ نفیس سنو! کان کھول کر سنو! میں ٹھیک ہو جاؤں یا نہ ہو جاؤں یہ بات اپنی جگہ رہی لیکن میں کسی سے نہیں ڈرتا کسی سے نہیں دبتا۔ یہ زخم مجھے کچھ نہیں کرنے دیتا لیکن موقعہ آن پڑا تو میں

اس کی بھی پروا نہ کروں گا۔ میں نے کبھی جان کی پروا نہیں کی۔
جان کی پروا بزدل کرتے ہیں۔ اکرم خاں بزدل نہیں۔

نفیس بیگم:۔ مجھے واجد کے تیور ٹھیک نہیں لگتے۔

اکرم خاں:۔ بچہ نہ بنو وہ کیا کرے گا؟

نفیس بیگم:۔ ماموں جان بتا گئے تھے کہ جب سے اس نے تمہارے انکار کی خبر سنی ہے دیوانہ ہو رہا ہے۔ آنکھوں میں خون اترا اترا رہتا ہے۔ تمہارے سامنے اس نے بڑے ضبط سے کام لیا۔ ورنہ کہتے ہیں کہ اس کے حواس بجا نہیں رہے۔ خود ہی سوچو جس نے اتنے سال طاہرہ سے محبت کی بچپن سے لے کر اب تک اس کے ساتھ رہا وہ اسے کیسے بھولے؟ جو محبت کرتا ہے وہ اندھا ہو جاتا ہے۔ وہ کچھ کر نہ بیٹھے۔

اکرم خاں:۔ یہی تو میں پوچھتا ہوں وہ کیا کر بیٹھے گا۔

نفیس بیگم:۔ اتنے سال کی محبت! توبہ، تم جذبے کی گہرائی کو نہیں سمجھتے! یہ بھی زخم کی طرح ہوتا ہے۔ جتنا گہرا ہوتا ہے اتنا ہی خطرناک ہوتا ہے، جان لیوا ہوتا ہے۔ کوئی لڑکا سترہ اٹھارہ سال کے تعلقات کے بعد لڑکی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ البتہ جان پر کھیل سکتا ہے۔

اکرم خاں:۔ اسے جان سے کھیلنے دو! ایسے احمق کا کوئی علاج نہیں۔ افیم کھالے، دریا میں کود پڑے، گاڑی تلے سر رکھ دے، پستول مار لے!

نفیس بیگم:۔ پستول؟ کہیں وہ فرحت علی کو پستول نہ مار دے۔ مجھے نہ مار دے۔ تمہیں نہ مار دے۔

اکرم خاں:۔ اگر وہ ایسے فضول ارادے کا مالک ہے تو اسے کہو مجھے مارے اور پھانسی لگ جائے۔ جاؤ، اس چھوکرے سے جا کر کہو! میری اور اپنی جان سے کھیل جائے۔ میں موت سے ڈرنے والا نہیں۔ میں آج تک موت سے نہیں ڈرا۔ میرا کاروبار ہی ایسا ہے سمگلر کبھی موت سے نہیں ڈرتا۔ وہ تو بلکہ موت کے پنجوں میں پنجے ڈال کر اس سے لڑتا ہے۔ جب ہم گھر سے نکلتے ہیں موت ساتھ ساتھ چلتی ہے اور پھر موت سے بچنے کے لئے ہم نہ دوسروں کو موت کا شکار بناتے ہیں۔ کون جانے اپنی جان بچانے کے لئے ہم نے کتنے خون کئے۔ اگر میری موت بزدل کے ہاتھوں لکھی ہے

تو یونہی سہی۔ کبھی کبھی بہادروں کا یہی انجام ہوتا ہے۔

نفیس بیگم:۔ تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟

اکرم خاں:۔ نفیس! سمگلر مجھے اپنا سردار مانتے ہیں۔ میں مجرم ہوں لیکن باپ تو ہوں۔ شاید مجرم باپ اپنی اولاد کے بارے میں اسی طرح سوچتا ہو۔

نفیس بیگم:۔ یوں مت سوچو بلکہ یوں سوچو کہ طاہرہ بھی مان جائے وہ واجد کو چھوڑ کر حکیم فرحت علی سے بیاہ نہ کرے گی۔ یہ اور بات ہے کہ تم سے خوف زدہ ہو کر چپ ہو رہی ہے۔ آخر تم سے ڈرتی ہے لیکن اس کے جذبات کا خیال رکھنا چاہیئے!

اکرم خاں:۔ نفیس! جو عمر بھر کانٹوں پر چلتا رہے وہ کسی اور انداز سے سوچتا ہے۔ میں اناڑیوں اور ڈرپوکوں کی طرح نہیں سوچ سکتا۔ میری زندگی اور میری سوچ کا ایک ہی انداز ہے۔ ایسی ہی میری باتیں ہیں۔ جس طرح میں اپنی زندگی کو نہیں بدل سکتا اسی طرح اپنی سوچ اور اپنی باتوں کو نہیں بدل سکتا۔ طاہرہ کو ایک دولت مند شوہر کی ضرورت ہے تاکہ وہ بڑی عورت بن جائے، سوسائٹی میں نام پیدا کرے۔ قومی انجمنوں کی باگ ڈور سنبھالے کہیں صدر بنے کہیں سکرٹری۔ سیاست میں حصہ لے۔ اور پرواز کرے۔ تم چاہتی ہو وہ تین سو روپے کے واجد سے بیاہ کرے اور پھر... اور پھر سکڑ کر رہ جائے، کنوئیں کا مینڈک بن جائے۔ پر کٹی لڑکی کیا کر سکتی ہے؟ نفیس! مجھے یہ منظور نہیں، ہرگز منظور نہیں۔ میری تو یہ آرزو ہے کہ وہ نام پائے۔ نفیس! وہ... وہ میری بیٹی ہے۔ اسے میرا نام روشن کرنا ہے۔ ان داغوں کو... ان داغوں کو مٹانا ہے جو... میں نے... خاندان کی پیشانی پر لگائے ہیں۔ طاہرہ کو بڑے کام کرنے ہیں۔ تین سو روپے میں یہ کام نہیں ہو سکتے

نفیس بیگم:۔ واجد ساری عمر تین سو روپے پر تو نہیں پڑا رہے گا۔

اکرم خاں:۔ نفیس! کبھی کبھی تو تم بالکل بچہ ہی بن جاتی ہو۔ واجد آخر کو کونسا تیر مارے گا۔ ریٹائر ہو کر بھی واجد کی اتنی آمدنی نہ ہوگی جتنی فرحت علی کی ہے اور پھر، اگر کل کلاں کو واجد مر گیا تو؟ طاہرہ کے ہاتھ کیا لگے گا؟ فرحت مرا تو لاکھوں چھوڑ مرے گا۔ یہ باتیں سوچنے والی ہیں نفیس! سوچنے والی۔

(دروازے پر دستک

دیکھو! چور دروازے پر کس نے دستک دی۔ کون آیا۔

نفیس بیگم :- (زیرلب، رازدارانہ لہجے میں) کون ؟

آواز :- بڑی حویلی والوں کے آدمی ہیں۔ فوراً دروازہ کھولئے! غضب ہو گیا

(نفیس بیگم گھبرا کر چٹخنی اتارتی ہے۔ دو آدمی داخل ہوتے ہیں)

پہلا آدمی :- خان صاحب! غضب ہو گیا کسی اصیل نے مخبری کر دی اور پولیس نے حویلی پر چھاپہ مار دیا۔ مال برآمد ہو گیا ہے۔ للو جان پکڑے گئے ہیں۔ آپ اپنا بندوبست کر لیں اور فوراً گھر چھوڑ دیں۔

نفیس بیگم :- اوئی اللہ، یہ کیا ہوا ! یہ تو زخموں سے چور ہیں، کہیں جا ہی نہیں سکتے۔

اکرم خاں :- (ہنس کر) نفیس! تمہیں گھبرانے کی عادت نہ بھولی۔ حوصلے سے کام لو، حوصلے سے! ایک ہزار روپے نکال دو! میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔ مجھے کوئی ڈر خطرہ نہیں۔

دوسرا آدمی :- آپ فوراً چلے جائیں! دیر مت کیجئے! پولیس اب آپ ہی کا پیچھا کرے گی۔

اکرم خاں :- مجھے کوئی غم نہیں۔ پولیس میری ہوا کو بھی نہ چھو سکے گی۔

(اکرم خاں مسکرا کر اٹھتا ہے نفیس بیگم ایک ہزار کے نوٹ لا کر دیتی ہے)

نفیس! ہمت نہ ہارنا! بیٹی طاہرہ، میری شہزادی کو اداس نہ ہونے دوں گا۔ میں آ ؤں گا، بہت جلد آ ؤں گا اور تندرست ہو کر آ ؤں گا۔ چوکس ہو کر رہنا! اچھا! تم تو میری راج دلاری ہو، میری اچھی بیوی ہو۔ غم نہ کرنا، ہوں، حوصلہ رکھنا، حوصلہ!

نفیس بیگم :- خدایا، یہ کیا ہو رہا ہے ؟

اکرم خاں :- نفیس! جو کچھ ہوگا بہتر ہوگا۔ خدا حافظ!

(اکرم خاں چلا جاتا ہے۔ نفیس بیگم کے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ ضبط کرتی ہے۔ منہ چھپا کر شدتِ غم کے مارے تیزی سے اندر چلی جاتی ہے)

تیسرا منظر

(طاہرہ کا کمرہ ــــ سامنے آرائشی میز رکھی ہے جس پر میک اپ کا سامان بے ترتیب پڑا ہے۔ دونوں طرف بڑی بڑی کپڑوں والی الماریاں ہیں، طاہرہ ایک الماری کھولے کھڑی اور ایک دوپٹے کی خاطر تمام کپڑے اتھل پتھل کر رہی ہے ــــ کپڑے اٹھاتی اور فرش یا صوفے پر پھینکتی جاتی ہے۔ نیچے سے دوپٹہ نکالتی ہے۔

واجد، چست لباس پہنے، ایک جانب کھڑا ہے۔ خوب سمارٹ نظر آ رہا ہے)

واجد :- کیا یہ سب کچھ خواب تھا ؟ سب کچھ جھوٹ تھا ؟ ہماری ملاقاتیں وقت ضائع کرنے کے لئے تھیں ؟ ہم یونہی ساری ساری رات جاگتے رہے ؟ کیا صرف امتحان کی خاطر کتابیں مل کر چاٹتے تھے؟

طاہرہ :- تم تو خواہ مخواہ جوش میں آ رہے ہو۔ میں نے جو کہا، مجھے کچھ پتہ نہیں۔

واجد :- یہ بھی کوئی ماننے والی بات ہے ؟ گھر میں تمہارے خلاف سازش ہو رہی ہو اور تمہیں خبر نہ ہو۔

طاہرہ :- اللہ، مجھے کچھ پتہ نہیں، مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے ابا اور امی مجھے اپنی باتوں کی کبھی خبر نہیں دیتے۔ وہ تو مجھے بالکل دودھ پیتی بچی سمجھتے ہیں۔ پوچھ بیٹھوں تب بھی کچھ نہیں بتاتے۔ تمہیں معلوم تو ہے وہ اپنی باتیں اپنے تک ہی رکھتے ہیں

واجد :- طاہرہ! میں دیوانہ ہو جاؤں گا۔ تمہارے ماں باپ بدل گئے ہیں۔ جانے کس کے سونے چاندی نے انہیں بہکا دیا ہے۔

طاہرہ :- مجھے کچھ پتہ ہو تو کہوں۔

واجد :- میں دیوانگی میں کچھ کر نہ بیٹھوں۔ طاہرہ! میرا دماغ ٹھیک کام نہیں کرتا۔ میں بہت بری بری باتیں سوچا کرتا ہوں۔ جب میں اپنے مستقبل کا تصور کرتا ہوں اور اس میں تمہیں نہیں پاتا تو اندھا ہو جاتا ہوں۔ مجھے موت کے سوا دوسرا راستہ نہیں سوجھتا۔ میرے ہاتھوں . . . میں، میں کہتا ہوں میں کچھ کر نہ بیٹھوں۔

طاہرہ :- تم وہی کے وہی رہے۔ ذرا نہ بدلے۔ تمہارا دماغ واقعی خراب ہے۔ تم اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہو۔ اگر اسی طرح فضول باتوں میں دھیان لگاتے رہے تو ایک دن آپے سے باہر ہو جاؤ گے اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندگی برباد کر بیٹھو گے۔

واجد :۔ زندگی اب بھی برباد ہے۔

طاہرہ :۔ کیسے؟

واجد :۔ میں کہتا ہوں، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہارے ماں باپ تمہارا بیاہ کسی اور سے کر رہے ہیں؟

طاہرہ :۔ تم سے کس نے کہا ہے؟

واجد :۔ تمہارے ابا جان نے کہا ہے۔ وہی جو تم سے کچھ نہیں کہتے۔ انہوں نے مجھ سے سب کچھ کہہ دیا ہے۔ صاف انکار کر دیا ہے۔

طاہرہ :۔ کہا ہوگا لیکن اتنا ضرور ہے کہ ابا جان کو مجھ سے زیادہ میرا خیال ہے۔ اگر انہوں نے کوئی فیصلہ کیا ہے تو اسے اٹل جانو! وہ بڑے سخت ہیں۔ ایک ہی گھڑکی میں جان قبض کر لیتے ہیں۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتے۔ ان سے سب ڈرتے ہیں۔ ان کے سامنے کوئی نہیں بول سکتا۔ اف! وہ اتنے زبردست ہیں، اتنے زبردست کہ ان جیسا کوئی زبردست نہیں۔ ان کی آنکھیں کیسی ڈراؤنی ہیں۔ بابا! ہم تو دیکھ کر ڈر جاتے ہیں۔

واجد :۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ جب میں دیوانہ ہو جاتا ہوں تو مجھے بھی کچھ نہیں سوجھتا۔ طاہرہ! میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے پھر کیا ہو جاتا ہے۔ طاہرہ! میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا، نہیں چھوڑ سکتا۔

طاہرہ :۔ تم تو بلا وجہ رائی کا پہاڑ بنانے کے عادی ہو۔ اپنے ہی آپ دل میں کوئی خیال جما لیتے ہو اور الٹا سیدھا نتیجہ نکال بیٹھتے ہو۔ ذرا ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتے ہو۔ صبر کی تو عادت ہی نہیں۔ نہ آگے کا سوچتے ہو نہ پیچھے کا۔ بس جان پر کھیلنے پر تیار ہو جاتے ہو۔

واجد :۔ ٹھیک ہی کہتی ہو۔ سائیکولوجی پڑھی ہے نا تم نے۔ مجھ سے جو چوک ہوئی اس کی سزا بھگتوں گا۔ آج تو تمہیں بھی نئی نئی باتیں سوجھ رہی ہیں۔ کیا خبر تھی کہ تم بھی شریکِ سازش ہو۔

طاہرہ :۔ پھر بے پر کی اڑانے لگے۔ یونہی ذرا سی بات کی اور اس پر اڑ گئے۔ تحمل سے کام لو! ابا تو کراچی گئے ہیں۔ ان سے کون بات کر سکتا ہے۔ البتہ امی سے بات کر دوں گی۔

واجد :۔ بس ایک بات یاد رکھنا! دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے میں تمہیں نہ چھوڑوں گا۔ تم میرے لئے موت اور زندگی کا مسئلہ ہو۔ میں کہتا ہوں، اس مسئلے کو سلجھاؤ ورنہ ——

طاہرہ :۔ (برہم ہو کر) ورنہ کیا؟ تم کیسے ہو کہ سمجھتے ہی نہیں۔ اپنی جان کے دشمن بنے بیٹھے ہو۔ جانے کون تمہیں الٹے پلٹے مشورے دیتا ہے! جاؤ، مجھے معاملہ سلجھانے دو۔ تاؤ میں آ کر بات بگڑتی ہے، بنتی نہیں۔

واجد :۔ جاتا ہوں۔ طاہرہ! خدا کے لئے میں ہاتھ جوڑتا ہوں معاملے کو سنوار دو!

طاہرہ :۔ تم جاؤ تو سہی۔ مجھے کچھ سوچنے کی فرصت ملے۔

واجد :۔ لو جاتا ہوں۔

(واجد چلا جاتا ہے۔)

(طاہرہ ویسے ہی کپڑے جھوڑ جھاڑ کے آئینہ دیکھنے لگتی ہے۔ بناؤ سنوار کے بعد باہر چلی جاتی ہے)

چوتھا منظر

وہی تیسرے منظر والا کمرہ۔ نفیس بیگم اور جنت داخل ہوتی ہیں۔ نفیس بیگم آرائشی میز کو جا کر دیکھتی اور اس کا بے ترتیب سامان ٹھیک کرتی ہے۔

نفیس بیگم :۔ یہ پاؤڈر کا ڈبہ کھلا پڑا ہے۔ لپ سٹک نیچے گری پڑی ہے، سرخی کی ڈبیہ اور نیل پالش، یہ بھی کھلی پڑی ہیں۔ یہ لڑکی اتنی بڑی ہو گئی ہے لیکن ذرا ہوش نہیں، اسے میک اپ کیا اور سامان اٹھا کر پٹک دیا۔ کبھی چیزیں قرینے سے نہیں رکھتی۔ ادھر کپڑے اسی طرح بکھرے پڑے ہیں۔ یہ لڑکی کیا کرے گی؟

جنت :۔ ہے تو آخر تمہاری لڑکی۔

نفیس بیگم :۔ یہ ناتجربہ کار اور بے پروا لڑکیاں کس کام کی؟

جنت :۔ بیاہ کر دو گی تو آپ ہی تجربہ آ جائے گا۔

نفیس بیگم :۔ جو مجھے تجربہ ہے وہ اسے کہاں حاصل؟

جنت :۔ اب اپنا مقابلہ تو نہ کرو!

نفیس بیگم :۔ اور پھر۔۔۔ یہ کیسے ۔۔۔۔۔ میں کہتی ہوں بس یہ واجد ہی کے لائق ہے۔ وہ بھی ناتجربہ کار یہ بھی ناتجربہ کار۔

جنت :۔ تو کیا کسی اور سے بیاہنے کا خیال نہیں؟

نفیس بیگم :۔ (قطعیت کے ساتھ) نہیں، ہرگز نہیں جنت! میں سچ کہتی ہوں۔ طاہرہ کسی اور کے ساتھ گزارہ کر ہی نہیں سکتی۔ بیاہنے کو تو کسی اور کے ساتھ بیاہ دوں لیکن ڈرتی ہوں کہیں بیاہ ناکام نہ رہے۔

جنت :- اڑتی اڑاتی سی خبر سنی تھی کہ حکیم فرحت علی سے ساز باز ہو رہی ہے۔

نفیس بیگم :- یہ سب بکواس ہے، حکیم فرحت کے مزاج اور طاہرہ کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اور پھر . . .

جنت :- اور پھر کیا؟

نفیس بیگم :- فرحت علی کو کسی کا انتظار ہے؟

جنت :- کس کا انتظار ہے؟

نفیس بیگم :- جسے اس کا انتظار نہیں۔

جنت :- تو کیا وہ اس سے ملے گی نہیں؟

نفیس بیگم :- نہیں۔

جنت :- کیوں؟

نفیس بیگم :- چھوڑو ان باتوں کو! آؤ ذرا میری مدد کرو! اکرم خاں کی تصویر اتار کر صاف کروں گی۔

جنت :- صاف تو ہے۔

نفیس بیگم :- اور صاف کروں گی۔ شادی کے دن کی ہے۔ اسی لئے دولہا کا لباس پہن رکھا ہے۔

(میز پر اسٹول رکھ کر نفیس بیگم پڑھتی ہے جنت اسٹول پکڑ لیتی ہے)

ارے رے رے! اس کے پیچھے تو گرد ہی گرد ہے۔ کئی دن سے صاف نہیں ہوئی۔

(قدرے گرد اڑتی ہے)

جنت :- چلو! اب صاف ہو جائے گی۔

نفیس بیگم :- اب تو صاف ہو گئی ہے . . . لو ذرا ایک ہاتھ سے پکڑنا اسے!

جنت :- لاؤ پکڑاؤ!

نفیس بیگم :- لو پکڑو!

جنت :- لو پکڑ لی! اترو آؤ احتیاط سے

نفیس بیگم :- (نیچے اتر کر) لاؤ، پکڑاؤ تصویر!

جنت :- لو!

نفیس بیگم :- میں اسے صاف کرتی ہوں۔ تم ذرا سنگار میز کی نچلی دراز میں سے ہار نکال لاؤ۔ تصویر کو ہار پہنائیں!

جنت :- اوہوں۔ میاں کی تصویر کے کیا کیا نخرے کرتی ہو۔

نفیس بیگم :- تم لپک کر ہار تو لے آؤ!

جنت :- لاتی ہوں۔

(برابر کے کمرے میں جاتی ہے۔ دراز کھٹ سے کھولنے اور بند کرنے کی آواز)

جنت :- (دور سے) کونسا ہار لاؤں؟ یہاں تو تین ہار پڑے ہیں؟

نفیس بیگم :- وہ جس میں سنہری اور روپہلی پتیاں ہیں اور بیچ میں گلابی پتیاں ہیں۔ وہ سب سے بڑے والا۔

جنت :- ہاں، ہاں ہے۔ یہ رہا۔

نفیس بیگم :- ہاں، بس لے آؤ اسی کو!

(آجاتی ہے)

جنت :- ہار قیمتی لگتا ہے

نفیس بیگم :- اصلی سونے اور چاندی کی پتیاں ہیں اس میں۔

جنت :- بڑا خیال رکھتی ہو تصویر کا!

نفیس بیگم :- اس سے گھر کی رونق قائم ہے۔

جنت :- اور تم سے کچھ نہیں! اللہ، تم تو گھر کی جان ہو۔ بس گلاب کا پھول ہو کتنی خوبصورت لگتی ہو! انہیں کون بیاہتا کہے؟

نفیس بیگم :- میرے بیاہ کا کیا کہتی ہو! خدا ہی جانتا ہے، کس طرح دن گزرتے ہیں۔

جنت :- سمگلنگ کا دھندا تو بہت ہی برا ہے۔

نفیس بیگم :- کیا کہوں تم سے! ہفتوں ہفتوں غائب رہتے ہیں اور پھر ہر وقت جان کا خطرہ رہتا ہے۔ کئی دفعہ پولیس سے جھڑپ ہوئی۔ ان کے کتنے ہی ساتھی مارے گئے۔ لیکن جنت! کیا خبر، کب شامت آجائے! ایک بار بھی پکڑے گئے تو اگلی پچھلی کسر نکل جائے گی۔ ان کی ٹولی بڑی خطرناک ہے۔ بڑے بڑے ڈاکو اور خونی شامل ہیں۔ کئی سزا یافتہ مجرم اور جیل کے بھگوڑے بھی ہیں۔

جنت :- سچ تو یہ ہے، پیسے کے زور پر بات بنی ہوئی ہے۔ پیسہ نہ ہو تو لوگ اکرم خاں کی ذرا عزت نہ کریں۔

نفیس بیگم :- پیسہ ہے، کوٹھی ہے، سب کچھ ہے لیکن قرار نہیں ہر وقت دھڑکا رہتا ہے، کہیں نیکی بدی نہ ہو جائے۔

جنت :- میں نے تو سنا ہے، اکرم کی ٹولی اور پولیس میں زبردست لڑائی ہوتی ہے۔ پان سات بھن گئے ہیں۔

نفیس بیگم :۔ یہ تم سے کس نے کہا؟

جنت :۔ واجد نے۔

نفیس بیگم :۔ (قہقہہ مار کر) بڑا معتبر مخبر ملا تمہیں بھی! وہ تو بے پر کی ہانکتا ہے۔

جنت :۔ اس نے کہا تھا اکرم خاں کو بڑے سخت گھاؤ آئے ہیں۔

نفیس بیگم :۔ جھوٹ، بالکل جھوٹ۔ وہ تو خدا کے فضل سے بالکل ٹھیک ہیں۔

جنت :۔ ٹھیک ہوں بہن! خاوند سے ہی ساری بہار ہے۔

نفیس بیگم :۔ ہاں جنت! خاوند سے ہی بہار ہے۔ اپنی اپنی قسمت جتنی مجھے خاوند کی قدر ہے شاید ہی کسی کو ہو۔

(گھنٹی بجتی ہے)

جنت :۔ جنت دیکھنا کون ہے؟

جنت :۔ (دنگ کے قریب جا کر دیکھتے اور پلٹتے ہوئے) ماما نے اسے اندر بھیج دیا۔ کوئی عورت ہے۔

نفیس بیگم :۔ آئیے۔

(ایک بڑھیا داخل ہوتی ہے)

بڑھیا :۔ اے بی بی! حکیم جی کے یہاں سے آئی ہوں۔ پچھوایا ہے، آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟

نفیس بیگم :۔ کہہ دو بالکل ٹھیک ہے۔

بڑھیا :۔ پوچھتے تھے، نبض دکھانے اب آپ کب آئیں گی اور . . . . . یہ بھی پوچھتے تھے کہ آپ نبض دکھانے آئیں گی یا ہم نبض دیکھنے آئیں اور . . . . اور پتہ نہیں کیا کہہ رہے تھے۔ وہ . . . وہ انتظار . . . جانے کس کے انتظار کا کہہ رہے تھے، خیر، کچھ انتظار کی بات تھی۔

نفیس بیگم :۔ بس بس، جا کر کہہ دو ہمیں بالکل آرام ہے نبض دیکھنے دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہاں بس جاؤ۔

بڑھیا :۔ پوچھتے تھے جو دوا آپ لائی تھیں وہ ٹھیک سے پی تو رہی ہیں۔

نفیس بیگم :۔ ہاں، پی رہی ہوں ٹھیک سے۔

بڑھیا :۔ بس بس، اچھا کہہ رہی ہیں آپ۔ دوسری بات پوچھ کے آؤں تو کہوں۔

نفیس بیگم :۔ بس بس کوئی ضرورت پوچھنے کی نہیں۔ اب مت آنا۔ بس چلتی بنو بوا!

بڑھیا :۔ اے لو بی بی۔ چل دی بس۔ اب تو خوش ہو؟

(چلی جاتی ہے ـــــ طاہرہ بدحواسی کے عالم میں آتی ہے)

طاہرہ :۔ امی، امی! میں واجد کے سوا اور کسی سے شادی نہ کروں گی؟

نفیس بیگم :۔ ہوا کیا ہے۔

طاہرہ :۔ میں اب ابا جان کی بات بھی نہیں مانوں گی۔

نفیس بیگم :۔ پتہ لگے، کیا ہوا ہے؟

طاہرہ :۔ میں نے خواب دیکھا ہے، عجیب و غریب خواب!

نفیس بیگم :۔ کیا خواب دیکھا ہے؟

طاہرہ :۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ کالی کالی بدلیاں سب طرف سے گھر آئی ہیں بجلی زور زور سے کڑک رہی ہے اور لوگ کسی کا جنازہ لئے آ رہے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے جنازہ اندھیرے میں غائب ہو جاتا ہے۔

نفیس بیگم :۔ غائب ہو جاتا ہے اندھیرے میں؟

طاہرہ :۔ جنازہ، اندھیرا، بجلی کی کڑک . . . الٰہی یہ سب کیا ہے، یہ سب کیا ہے؟

جنت :۔ خوابوں کی بھی بھلی کہی۔

نفیس بیگم :۔ جنت! خوابوں سے بہت ڈرتی ہوں۔ ایک دفعہ میں نے خواب میں جنازہ دیکھا تھا اور تب میرے باپ کا انتقال ہوا تھا۔ یہ خواب، یہ جنازوں کے خواب بہت برے ہوتے ہیں۔

جنت :۔ یہ خواب وہم کے سوا کچھ نہیں۔

طاہرہ :۔ لیکن امی! آخر میں سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔

نفیس بیگم :۔ ٹھیک ہو گیا؟

طاہرہ :۔ ہاں، ہاں بالکل ٹھیک ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے اندھیرا غائب ہو گیا۔ بادل چھٹ گئے۔ چاندنی ہی چاندنی پھیل گئی اور پھر، اور پھر امی! مجھے پر لگ گئے ـــ پری بن گئی اور اڑنے لگی۔ اور، امی! اڑتے اڑتے چاند ستاروں تک جا پہنچی پھر، اور پھر امی! پھولوں کی بارش ہونے لگی اور مزے کی بات یہ ہے کہ پھولوں کا ڈھیر لگ گیا، بڑا اونچا ڈھیر۔ اور امی اس ڈھیر میں سے واجد نکل آیا۔

نفیس بیگم :۔ اچھا ہوا، بہت اچھا ہوا۔

نفیس بیگم :- لیکن میری طبیعت گھبرا رہی ہے میرے دل کو کیا ہو رہا ہے
یہ خواب، وہ جنازہ! مجھے کیا ہو گیا۔ میرا دماغ ٹھیک نہیں۔
طاہرہ! نہیں نہیں جنت! جنت! مجھے وہ جنازہ نظر آ رہا ہے
جنت! اسے بلا لاؤ! جنت! حکیم فرحت علی کو بلا لاؤ! میرا
دل بیٹھا جا رہا ہے بیٹھا جا رہا ہے۔

(گر پڑتی ہے)

جنت :- غش آ گیا۔ طاہرہ! تو سنبھال ذرا۔ منہ پہ پانی کے چھینٹے
ڈال میں حکیم فرحت علی کو بلا لاؤں!

طاہرہ :- خالہ جنت! ذرا جلدی آنا بہت جلدی۔ میں نے کیوں
اپنا خواب انہیں سنایا۔

جنت :- حوصلے سے کام لے لڑکی! کوئی بات نہیں۔ دل کو صدمہ
پہنچا ہے۔ میں حکیم کو لاتی ہوں۔ ابھی لاتی ہوں۔

(چلی جاتی ہے)

آخری سین

(اکرم خاں اپنی حویلی کے سامنے ــــ ہتھکڑی لگی ہے۔
پولیس انسپکٹر اور دو سپاہی اسے لے کر آئے ہیں)

اکرم خاں : سنئے!

انسپکٹر :- کہئے!

اکرم خاں :- میرا یہ زخم جو دل کے قریب ہے بڑا سخت ہے۔ بس نہ جانے
کس طرح یہاں تک آیا ہوں۔ مجھے بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔
مجھے آگے مت لے جائیے!

انسپکٹر :- دیکھئے! آپ کے زخم کو ڈاکٹر نے دیکھا تھا پہلے یہ واقعی
بڑا سخت تھا لیکن مرہم پٹی سے قریب قریب اچھا ہو چکا ہے
ڈاکٹر کے مشورے پر ہم آپ کو لائے ہیں اور آپ جانتے ہیں
کہ آپ پیدل تو نہیں آئے۔

اکرم خاں :- آپ نہیں مانتے۔ ڈاکٹر کی بات کو چھوڑیئے! میری حالت
بہت خراب ہو رہی ہے۔

انسپکٹر :- راستے میں خراب نہ ہوئی، خراب ہوئی تو مکان کے پاس آ کر۔

اکرم خاں :- جی ہاں۔ میرے پاؤں سن ہو گئے ہیں ایک قدم بھی نہیں
چل سکتا۔ اور پھر سیڑھیاں چڑھنے کا تو سوال ہی پیدا
نہیں ہوتا۔

انسپکٹر :- اس کا بندوبست ہو سکتا ہے ہم اسٹریچر منگوا لیں گے۔
اس پر بٹھا کر آپ کو لے جائیں گے۔

اکرم خاں :- میں آپ کی منت کرتا ہوں کہ مجھے مکان کے اندر لے جائیں۔

انسپکٹر :- مجھے مکان کی تلاشی لینی ہے، آپ کی موجودگی میں۔

اکرم خاں :- مکان میں کچھ نہیں، بخدا کچھ نہیں۔

انسپکٹر :- نہ سہی۔ ذرا چل کر اتنا تو دیکھ لو کہ جہاں سے یہ روشنی
آ رہی ہے وہاں کہیں آپ کے جرم کی سیاہی تو نہیں چھپی بیٹھی۔
کسی گوشے میں، الماری کے کسی خانے میں، کسی تجوری میں
کہیں نہ کہیں آپ کے جرم کا سراغ ضرور ملے گا۔

اکرم خاں :- اللہ مجھ پر رحم کھائیے! میں اس روشنی میں نہیں جا سکتا۔ روشنی
مجھے راس نہیں۔ میں کسی کو اپنا منہ نہیں دکھا سکتا۔

انسپکٹر :- ہم آپ کو دکھائیں گے کہ یہ عالیشان عمارت، یہ روشنیوں والا
محل آپ کے گناہوں کی کہانی ہے۔ آپ کو اس پر ناز ہے۔
ہم آپ کو ہی نہیں، تمام دنیا کو دکھائیں گے کہ یہ محل آپ نے
کس طرح تعمیر کیا۔ یہ محل جرموں اور گناہوں کی بنیادوں پر
کھڑے ہیں۔ یہ بے نظیر محل آپ ایسے شرفا کا اشتہار ہیں۔ ہم
اس کی تصویر لیں گے۔ ہم آپ کی بھی تصویر لیں گے اور دنیا کو
پیش کریں گے۔ شاید آپ کے بھائی بندوں کو عبرت حاصل
ہو۔ آج آپ کو اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ دولت وہی
اچھی ہے جو جائز طریقے سے حاصل کی جائے اور سکھ اسی
حالت میں نصیب ہوتا ہے جبکہ نیکی کی راہ اختیار کی جائے۔
ہم آپ کو سبق دیں گے۔ چلئے اپنے عالیشان محل کا دروازہ
کھٹکھٹائیں تاکہ گھر والے آپ کے استقبال کو نکل آئیں۔

اکرم خاں :- یہ مجھ سے نہ ہو گا۔ میرے قدم اس گھر میں نہ جائیں گے۔
یہاں میری بیوی رہتی ہے۔ میری بیٹی رہتی ہے۔ میں اس
حالت میں کبھی بھی ان کے سامنے نہیں جا سکتا۔ وہ مجھے دیکھ کر
پاگل ہو جائیں گے۔ ان کی نبضیں بند ہو جائیں گی۔ وہ کبھی
تصور ہی نہیں کر سکتیں کہ مجھے ہتھکڑی لگ سکتی ہے۔

انسپکٹر :- تو کیا ایک سمگلر، ایک مجرم کے گلے میں پھولوں کے
ہار ڈالے جائیں۔ اسے وطن کا خادم اور قوم کا رہنما
خیال کیا جائے۔ اس کی پوجا کی جائے۔ ایک سمگلر

(باقی صفحہ ۵۴ پر)

قول و قرار

سائیں فضل
مترجم: پرویز پروازی

تری الفت میں تو مر کے بھی جی لوں گا میں
درد سہہ لوں گا سبھی، ہونٹ بھی سی لوں گا میں
الفتِ یار میں جو زہر ہے پی لوں گا میں
میرے محبوب تجھے چھوڑ نہیں سکتا میں
جلوۂ حسن سے منہ موڑ نہیں سکتا میں

میرے اشعار کو خوں رنگ بنایا تو نے
غم و ادبار میں وعدوں کو نبھایا تو نے
مجھے ہر حال میں جینا بھی سکھایا تو نے
میں تجھے چھوڑ کے اے جان کہاں جاؤں گا
یہ تجلّائے جہاں تاب کہاں پاؤں گا

میرے محبوب مجھے جان سے پیارا تو ہے
دکھ بھرے دہر میں جیون کا سہارا تو ہے
شبِ تاریک میں امید کا تارا تو ہے
میں تجھے چھوڑ نہیں سکتا، نہیں چھوڑوں گا
تا دمِ زیست کبھی تجھ سے نہ منہ موڑوں گا

(پنجابی سے)

"راوی"

محمد عظیم بھٹی

گیت کے مختلف بندوں میں خیالات کے تسلسل کے اعتبار سے کوئی ربط نہیں، البتہ ہر بند کے آغاز میں ایک ہی مصرع دوہرانے سے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے
(ہمارے خیال میں ان بندوں کو ٹپوں کا اردو روپ سمجھنا چاہیئے۔ مدیر)

راوی کے نیلے پانی میں
پھولوں کے پودے بہتے ہیں
دنیا کے ستم خاموشی سے
ہم تیری خاطر سہتے ہیں

راوی کے نیلے پانی میں
وہ بگلا تیر رہا ہے کیا؟
پردیس میں جا کر ساجن رے
تو ہم کو بھول گیا ہے کیا؟

راوی کے نیلے پانی میں
یہ کیسا سیلاب آیا ہے؟
ہم بے گھر ہو کے پھرتے ہیں
کس پاپ کا بدلہ پایا ہے؟

راوی کے نیلے پانی میں
ہاتھوں سے گھڑا اک چھوٹ گیا
جب ساجن تیری یاد آئی
پلکوں سے آنسو ٹوٹ گیا

اندھیرا

عاصم حسین

اندھیرے کو چوما
بہت پیار سے روشنی نے
کہا مجھ کو دنیا کی نظر میں
بنا دیتی ہیں آپ روشن
وہ میری تجلی میں اپنی ضیا دیکھتی ہیں
وگرنہ نگاہوں میں میری فسوں کیا ؟
نگاہیں۔ شعاعیں لرزتی لرزتی !
پیا اُن سے پروانوں کی انجمن میں
یہ پروانے۔ جانیں ہمکتی ہمکتی
یہ ہنگامہ ہائے جنوں کیا ؟
مگر تجھ میں اپنا ہی جوبن ہے۔ اپنی پھبن ہے
سیاہی میں پنہاں وہ لیلائیاں ہیں
کہ ہر آنکھ دل سے یہی چاہتی ہے
کہ وہ تجھ کو سرمہ بنا کر
بہ صد شوق تحلیل کر لے
نظر کی سلائی سے آنکھوں میں بھر لے
کہ جب زندگی بجھ بجھا کر
زمانے پہ چھاتی ہے بادل دھواں دھار بن کر
تو پھر تیرے دامن میں ہی چین پاتی ہے دنیا
تجھے اپنے دل سے لگاتی ہے دنیا !

پَو

عبدالعزیز فطرت

مجھ سے اُمڈی ہوئی مدہوش گھٹا کہتی ہے
ضبط عنوان ہے امید کے افسانوں کا
پھیلی پھیلی ہوئی راہوں سے بہار آئے گی
سرخوشی بن کے خیالوں کا نکھار آئے گی
گریہ بیکار ہے سہمے ہوئے انسانوں کا

چھپتی چھپتی ہوئی تاروں کی ضیا کہتی ہے
نظمِ ہستی میں محبّت کی ادا ہے موجود
ظلمتیں اپنی خرابی سے ہیں خود ہی مایوس
کیا فضاؤں میں تغیّر نہیں ہوتا محسوس
ذرّوں میں صورتِ خورشید ضیا ہے موجود

نااُمیدی سے یہ کیوں پوچھیئے کیا کہتی ہے
ظلمتیں پردۂ اخفا میں چلی جائیں گی
سینۂ سنگ سے خود ہوں گے گلِ تر پیدا
موجِ خوابیدہ کے دامن سے سمندر پیدا
کرنیں پھر تازہ تب و تاب سے لہرائیں گی

* * *

ثقافت:

خطاطی

(۲)

سید یوسف بخاری

آشوری دور سے دورِ ساسانیاں تک ایران کا خط مسماری تھا، اس کے بعد پہلوی ہوا۔ محققین عرب کے بقول ایران میں قبل اسلام سات قلم (جدول ۱۶) جاری تھے اور ان خطوط کا ضمیمہ "زوارشن" تھا یعنی بوقت ضرورت ان خطوط میں مخصوص ہجّوں سے کام لیا جاتا تھا۔ خراسان مامون الرشید کے زمانہ ہی میں علم و فن کا مرکز بن چکا تھا۔ مامون کی وفات کے بعد خاندان طاہریہ۔ دیالمہ۔ سلاجقہ۔ سامانیہ اور غزنویہ میں اور بھی قابلِ رشک ترقی ہوئی، یہاں تک ایرانیوں کو تصنیف و تالیف میں عربوں پر سبقت حاصل ہوگئی۔ علاوہ ازیں بغداد کے اصلاح یافتہ عربی خطوط (جدول ۱۷) جن کو ابن بوّاب اور یاقوت مستعصمی نے مہذب اور مکلّف کیا تھا، وہ سب کے سب ایران میں جاری ہوگئے۔ اس کے بعد حسن بن حسین بن علی فارسی نے ۳۷۰ھ (عہدِ شاہانِ دیالمہ) میں نسخ، رقاع، ثلث اور توقیع کے اختلاط سے ایک جدید ایرانی قلم "تعلیق" جاری کیا، نیز محقق سے ایک اور قلم نکلا جو "مطلق" کہلایا۔

دشتی۔ دیوانی۔ فارسی۔ ایران کے پہلو بہ پہلو دولتِ عثمانیہ (ٹرکی) نے بھی ان ایرانی قلموں کو خوش آمدید کہی۔ چنانچہ ان کے رواج پانے کے بعد اہل ٹرکی نے ان خطوط کی روشنی میں دشتی، دیوانی اور فارسی تین قلم ایجاد کئے، نیز ثلث اور رقاع کو بھی جاری رکھا۔

قلم تعلیق کے اساتذہ میں نجم الدین ابوبکر راوندی، خواجہ تاج سلیمانی اور میر عبدالحیٔ ہوئے۔ آخر الذکر ابوسعید مرزا گورگانی کے دفترِ انشاء میں افسر تھے۔ اور متاخرین میں اشرف خاں خوش نویس دربارِ اکبری تھا۔

نستعلیق:۔ قدرت نے اہلِ عجم کی سرشت میں حُسن و اجتہاد کا مادہ بڑی فیاضی کے ساتھ ودیعت کیا ہے چنانچہ ایرانی خطوط سے بھی اُن کی حُسن پرستی اور جدت پسندی کا اظہار ہوتا ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ خطِ نسخ کے دائرے بالکل یکساں اور حروف ناہموار ہیں یعنی دائرے گول ہونے کے بجائے ان کا نچلا سرا کچھ اس طرح چپٹا ہو جاتا ہے کہ زاویے نمودار ہونے لگتے ہیں، لہٰذا انہوں نے نسخی حروف میں بھی اپنی فطری صلاحیت سے کام لیکر نقاشی اور مصوری کی شان پیدا کی یعنی دائرے گول بنائے، حروف کی نوکیں، گردنیں اور زیریں حصہ باریک کر دیا۔ اس کا نام انہوں نے "نستعلیق" رکھا۔ ذرا اس ندرتِ حسن و خیال کو بھی دیکھئے کہ قلم کی پرکاری کے ساتھ ساتھ انہوں نے لفظی ترکیب میں بھی کس قدر نفاست سے کام لیا ہے کہ نسخ اور تعلیق کے درمیان جو (خ) کی خلیج حائل تھی اسے دُور کر کے باقیات میں ایک جامع اور دلربا نستعلیق باقی رکھا جس میں بلاشبہ تمام قلموں کی شان اور باریکیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

شکستہ:۔ نستعلیق اگرچہ سب سے حسین اور جامع خط تھا لیکن اس کی کتابت دیر طلب اور صبر آزما تھی، اس لئے تقریباً ۱۰۱۱ھ میں مرتضیٰ قلی شاملو حاکمِ ہرات نے عام دفتری مراسلت کے لئے خطِ شکستہ جاری کیا۔

شفیعہ:۔ آقا کی تقلید اور پیروی میں مرتضیٰ قلی کے میر منشی "شفیعا" نے اپنے آقا کے خطِ شکستہ میں ایک حُسنِ خاص پیدا کر کے اس کا نام شفیعہ رکھا جو اب تک حسب سابق مشہور ہے۔

دراصل نستعلیق کتابی خط ہے جو ایران اور ہند و پاکستان وغیرہ میں جاری ہے اور مراسلت کا قلم شفیعہ ہے۔ نستعلیق کے حُسنِ قبول اور ٹکسالی خط ہونے کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوگی کہ لفظ نستعلیق سے کئی محاورات ایجاد ہوئے جو ہمارے ادب میں رائج اور زباں زدِ عوام ہیں مثلاً فلاں شخص بڑا ہی نستعلیق ہے یعنی باعتبار اخلاق و عادات نہایت مہذب انسان ہے۔ الغرض دنیائے اسلام کا مشترکہ مقدس خطِ عربی نسخ ہے۔ اس کے بعد نستعلیق کا درجہ ہے۔ ممالکِ اسلامیہ کے علاوہ دولتِ عثمانیہ (ٹرکی) مملکتِ مصر، عراق، حجاز، نجد، یمن، شام، الجزائر، مراکش

تیروان، ٹونس، طرابلس، سوڈان، زنجبار، حبش، حوسیہ، مڈگاسکر، بلجاشیہ، اندلس (مرحوم)، روس، فرانس، لندن، جرمنی، ہالینڈ، امریکہ، جزیرہ جاوا، ملایا، کردستان اور افغانستان، وغیرہ میں بھی نسخ اور نستعلیق دونوں کا رواج ہے۔ سیاسی و تجارتی مصلحتوں اور ضرورتوں کے پیش نظر مذکورہ ممالک میں نہ صرف عربی زبان میں گفتگو کرنے والے موجود ہیں بلکہ ان خطوط میں تعلیم اور نادر و نایاب عربی، فارسی، اردو کی کتابت اور طباعت بھی جاتی ہے۔

کتابت کی تاریخ بیان کرنے کے بعد ضروری ہے کہ اوّل نستعلیق کے مشہور اساتذۂ ایران کا تذکرہ کیا جائے، بعدازاں عہدِ دولتِ مغلیہ پر ایک نظر ڈالی جائے جہاں یہ خط آخری بار پروان چڑھا اور اپنی پوری عمر کو پہونچا یعنی لاہور، اکبرآباد (آگرہ)، دہلی اور لکھنؤ میں فنِ خطاطی کے چار مدرسے قائم ہوئے جہاں سے متعدد ماہرینِ فنِ خطاطی اور نامور شیریں قلم اور جواہر رقم پیدا ہوئے۔ انہی کی بدولت یہ فنِ لطیف آج تک زندہ اور تابندہ ہے۔

ایران میں نستعلیق کے حسب ذیل پانچ امام ہوئے :-

خواجہ میر علی علوی تبریزی : ان کو خطِ نستعلیق کا موجد کہا جاتا ہے۔ یہ عہدِ تیموریعنی (۷۷۱ / ۸۰۷ھ) کے نامور خطاط اور خوش فکر و خوش گو شاعر تھے، ابوالفضل اپنے دیباچہ "مرقع بادشاہی" (البم قطعات خوش نویسان ہند و ایران مرتبہ بادشاہ جہانگیر) میں لکھتا ہے کہ اس نے امیر تیمور کے زمانے سے قبل کی نستعلیقی وصلیاں دیکھی تھیں۔ یہ شہادت یقیناً معتبر ہے اس لحاظ سے نستعلیق کا موجد کوئی اور تھا۔ وہ کون تھا؟ یہ ہنوز تحقیق طلب ہے۔ تاہم میر علی نستعلیق کے مصلحِ اوّل ضرور تھے یہ اس کا ثبوت ہمیں مولینا غلام محمد دہلوی کے "تذکرۂ خوش نویسان" سے ملتا ہے۔ وہ لکھتے کہ گو میر علی نستعلیق کے موجد نہیں ہیں لیکن انہوں نے اس قلم کے قواعد مقرر کئے اور اس کے مطابق نستعلیق کی نوک پلک میں حسن اور نزاکت پیدا کی۔ میر علی کے مقلدین میں ایرانی، ہندی اور ترکی تینوں شامل ہیں۔ ان کی وصلیوں کا ایک بڑا ذخیرہ ایران اور انڈیا آفس لندن کی لائبریریوں میں موجود ہے۔ میر علی ہروی، ملّا علی شیرازی اور میر علی خراسانی ان کے ہم نام و ہم عصر خطاطوں کے علاوہ سلطان علی مشہدی ان کے نامور شاگرد تھے۔

سلطان علی مشہدی :- یہ نستعلیق کے امام دوم تھے۔ سلطان حسین تیموری کے عہد میں ہوئے۔ سلطان نے ان کو "قبلۃ الکتاب" کا خطاب دیا تھا۔ متعدد کتابیں، وصلیاں اور فنِ خطاطی پر ایک جامع رسالہ یادگار چھوڑا۔ "تاریخ تیموری" انہی کی تحریر کردہ ہے جس کی تصاویر مشہور مصوّر بہزاد نے تخلیق کی تھیں۔ بابر نے بھی اپنی تزک میں ان کے کمالات بیان کئے ہیں۔

سلطان علی کے شاگرد یہ ہیں :- سلطان محمد خنداں، سلطان محمد نور، علاء الدین محمد ہروی، مولینا عبداللہ ہروی، زین الدین محمود عبدی نیشاپوری، محمد قاسم شادی شاہ، اور میر علی الکاتب ہروی، ان میں آخری زیادہ ممتاز ہیں +

میر علی الکاتب ہروی : یہ نستعلیق کے امام سوم کہلاتے ہیں۔ خطاطی کے ساتھ شاعری میں بھی کمال حاصل تھا۔ مجنوں تخلص تھا۔ فنِ خطاطی پر دو رسالے نظم کئے جو بہت مشہور رہیں۔ ۹۰۹ھ میں ایک اور رسالہ رسم الخط پر لکھکر سلطان مظفر کے نام معنون کیا۔ یہ رسالہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ جب سلطان عبدالعزیز بخارا کے درباری ہوئے تو سلطان کی فرمائش پر دو کتابیں "گلستانِ سعدی" اور "مطلع الانوار" امیر خسرو رقم کیں۔ "گلستان" پیرس کی لائبریری اور "مطلع الانوار" خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ ابوالفضل نے بھی ان کو نستعلیق کا استاد تسلیم کیا ہے "مرقع بادشاہی" (جہانگیر) میں بھی ان کی چند وصلیاں شامل ہیں۔ زیادہ معتبر روایت کے بموجب ۹۵۷ھ میں وفات پائی +

میر علی کے بعد نستعلیق کے مشہور خطاطوں میں ملّا محمد حسین تبریزی، میر سید احمد مشہدی، ملّا حسن علی مشہدی، ملّا شاہ محمد نیشاپوری اور مرزا ابراہیم اصفہانی ہوئے جن کا مرتبہ جدا جدا ہے +

میر عماد الحسینی قزوینی :- یہ نستعلیق کے امام چہارم ہیں۔ ان کو بابا شاہ اصفہانی سے تلمذ حاصل تھا اور ملّا محمد حسین تبریزی اور سلطان علی مشہدی کے مقلد تھے۔ شاہ عباس صفوی کے دربار سے متعلق تھے۔ ان کے متعلق ایک روایت اس طرح مشہور ہے کہ جب ان کو شاہ عباس نے "شاہ نامہ فردوسی" نقل کرنے کے لئے کہا تو انہوں نے اپنے لئے ایک آراستہ باغ مخصوص کرایا جس کے حوض میں شاہی خرچ سے عرقِ گلاب اور کیوڑہ بھرا گیا۔ یہ وقتاً فوقتاً تبدیل بھی ہوتا تھا، اس اہتمام اور تکلف کے ساتھ میر عماد نے تین سال کی مدت میں صرف چھ جزو مکمل کئے۔ حاسدوں اور اُمراء عماد کی تاک میں تھے، انہوں نے موقع پاکر شاہ کو بھڑکایا اور کہا کہ تین سال میں چھ لاکھ روپے کی رقم خطیر خرچ ہو چکی ہے اور ابھی صرف چھ جزو

لکھے گئے ہیں۔ حواشی پر ابھی طلائی کام بھی نامکمل ہے۔ بادشاہ ان خوشامدیوں کی باتوں میں آکر غضب ناک ہوا اور میر عماد کو حکم دیا کہ نصف یوم میں چھ لاکھ روپیہ واپس خزانۂ شاہی میں داخل کیا جائے۔ میر عماد اس اچانک عتاب شاہی سے متاسف تو ضرور ہوئے لیکن اسی وقت چند نقیبوں کے ہمراہ ایک سواری میں بیٹھ کر شہر گئے، نقیبوں نے صدا بلند کی "امروز تحریرِ عماد ارزاں است" چند ہی گھنٹوں میں وہ چھ جزو مقراض زدہ ہو کر ایک ایک دو دو سطروں کی شکل میں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئے۔ مقررہ وقت سے قبل چھ لاکھ روپیہ خزانۂ شاہی میں جمع ہوگیا۔ بادشاہ یہ اطلاع پاکر اور بھی برافروختہ ہوا۔ بعد میں اپنی رسوائی اور بدنامی کے خوف سے اس نے میر عماد کو ایک حمام میں قتل کرا دیا۔ اس وقت اس کی عمر ۶۳ سال کی تھی۔ سالِ وفات ۱۰۲۴ھ / ۱۶۱۵ء ہے جو عہدِ جہانگیر تھا۔ شہنشاہ جہانگیر نے جب یہ دردناک واقعہ سنا تو رو پڑا اور کہا کہ اگر شاہ عباس اس کو قتل کرنے کی بجائے میرے پاس بھیج دیتا تو میں شاہ کو عماد کے ہم وزن موتی بھیج دیتا÷

آقا عبد الرشید دیلمی: میر عماد کے حقیقی بھانجے، داماد اور شاگرد تھے۔ آقا رشید کے نام سے مشہور ہوئے، اپنے فن میں اتنے کامل تھے کہ استاد و شاگرد کی وصلیوں میں امتیاز دشوار تھا۔ میر عماد کے واقعۂ شہادت اور اپنے قتل کے اندیشہ سے ایران سے راہ فرار اختیار کی، ہندوستان تک پورا سفر گھوڑے پر کیا، بحالتِ تباہ شاہجہاں کے حضور میں اکبر آباد آئے۔ بعض مورخوں کا قول ہے کہ اول لاہور پہونچے اور کچھ مدت وہیں قیام کیا۔ اس اثنا میں وہاں اُن کے متعدد شاگرد ہوئے۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو نستعلیق کا پہلا مرکز لاہور کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ آگرہ پہونچتے پہونچتے لباس و جامہ زبوں اور تار تار ہو چکا تھا اور یہ زبوں حالی باریابی میں مانع ہو رہی تھی۔ نذرِ شاہی کے لئے بھی کچھ درکار تھا۔ آقا رشید نے قدرے غور و تامل کے بعد قلم و دوات طلب کی اور ایک قطعہ کاغذ پر یہ اشعار لکھے ؎

ایا خجستہ خصالے کہ ساکنانِ فلک	بر آستانِ تو دارند میلِ دربانی
چہ حاجت است کہ گویم حالِ خستۂ خود	کہ حالِ خستہ دلاں را تو خوب میدانی

یہ پرزۂ کاغذ آقا رشید کے حق میں سچ مچ کاغذی پیرہن ثابت ہوا، جب یہ پیکرِ تصویرِ غم بادشاہ کے روبرو حاضر ہوا تو شوخیٔ تحریر خود منہ سے بول اٹھی، نقش خود فریادی بن گیا۔ شاہ جہاں نے آقا رشید کو دربار میں داخل کیا، دارا شکوہ کی اتالیقی بخشی اور پندرہ سو روپیہ ماہوار مشاہرہ مقرر کیا۔ بعد میں خدمتِ بیوتات سپرد ہوئی۔ گردش دور ہوئی، امیرانہ شان و شوکت کے ساتھ رہنے لگے۔ آگرہ میں کئی شاندار عمارتیں اور مسافر خانے تعمیر کرائے۔ آخر دم تک شغلِ کتابت جاری رہا، شاگردوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ ہند و پاکستان کے چاروں دارالسلطنتوں، لاہور، آگرہ، دہلی، اور لکھنؤ میں اس فنِ لطیف کے چار مدرسے قائم ہوئے۔ اُن کی وصلیاں جواہر کے مول فروخت ہوئی تھیں۔ سنہ ۱۰۸۱ھ میں بمقام آگرہ بعہدِ اورنگ زیب وفات پائی÷

یہ تھی ایران میں خطاطی کی نشو و نما کی مختصر روداد۔ اس کے بعد امیر تیمور کا ستارہ چمکا اور نہ صرف ایران بلکہ برصغیر پاک و ہند کی قسمت بھی اسی خاندان کے ساتھ وابستہ ہوگئی۔ یہ خاندان خود ہی صاحب ذوق نہیں بلکہ اہلِ کمال کا بھی بے حد قدردان تھا۔ اس لئے اس کے زیر سایہ علوم و فنون کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ بالخصوص برصغیر پاک و ہند میں خاندان مغلیہ نے ہنر پروری اور مردم نوازی کی ایسی روایات قائم کیں جن کی مثال بہت کم نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دربار مغلیہ ہر قسم کے اہلِ کمال کا مرجع و مآب بن گیا جن میں خطاطی کے ماہرین بھی شامل تھے۔ ان ماہرین خطاطی کا سلسلہ آخری وقت تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ اس خاندان کا آخری چشم و چراغ بہادر شاہ ظفر خود اس فن میں طاق تھا۔ ان ماہرین فن کے کمالات کی داستان خاصی طویل ہے۔ اس لئے ہم اس کو کسی اور موقع پر اٹھا رکھتے ہیں (شجرۂ خطوط اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)÷

شجرۂ خطوط

مقدس ہیروغلیفی
فینیقیہ
سامری
سمیری
حبشی
قدیم چینی
نبطی
تدمری
ارامی
قدیم یونانی
تموری
صفوی
کوفی جدید
نسخ
محقق
ریحان
ثلث
توقیع
رقاع
غبار
شجرۂ خطوط ایرانی
قدیم ترین مسماری
شش قلم عہد اسلام رائج ایران
تعلیق
نستعلیق
شکستہ
شفیعہ
ملفق
خطوط دولت عثمانیہ ترکی
ثلث
رقاع نسخ توقیع
ریحان محقق
دیوانی
فارسی
دشتی
الریاسی
النصف
الثلث
المرسم
الناسخ
مقطوع
رقاع
غبار
ہفت قلم قدیم ایران
قصص
زیتون
خرفاج
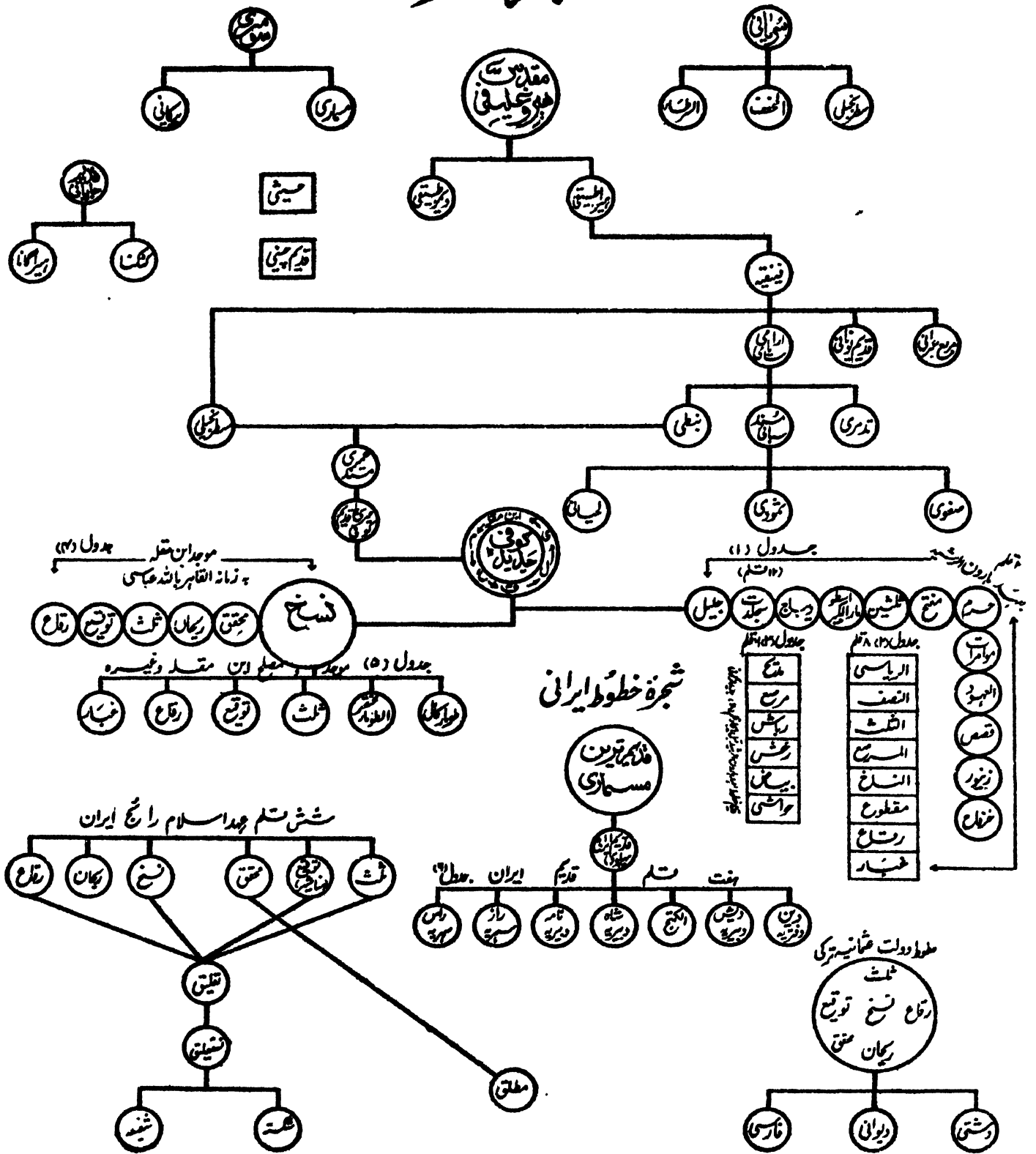
ماہر القادری

میں کیا کروں مرے دل کی عجیب حالت ہے
تری نوازشِ پیہم سے بھی شکایت ہے

قبول ہو کہ نہ ہو پھر بھی ایک نعمت ہے
وہ سجدہ جس کو ترے آستاں سے نسبت ہے

کبھی گلہ تری بیگانگی سے تھا مجھ کو
جو اَب ہوئی ہے توجہ تو اک قیامت ہے

غروبِ شام کے منظر کو دیکھنے والو!
اسی طرح سے مسافر کی شامِ غربت ہے

ترے جمال کی آئینہ داد کیا دے گا
کہ آئینہ کو تو خود اعترافِ حیرت ہے

یہ خواب ہے وہ تماشا یہ وہم ہے وہ طلسم
مجاز اپنی جگہ پھر بھی اک حقیقت ہے

میں اس کے ناز اٹھاؤں کہ دوں صلائے نیاز
وہ حسن جو مری تقدیر سے محبت ہے

نگاہِ ناز! ترے حسنِ التفات کے بعد
مری طرف سے تغافل کی بھی اجازت ہے

رہِ طلب میں قدم رکھ دیا تو ہے ماہر
اب اس کے بعد مری کوششوں کی قسمت ہے

شاد عارفی

تجربے جن کو جنوں کے نہ گریبانوں کے
طنز کرتے ہیں وہ حالات پہ دیوانوں کے

کہہ رہے ہیں کہ پڑو پاؤں نگہبانوں کے
آپ ہمدرد ہیں!!! ہم سوختہ سامانوں کے

کھل گئے بھید جو رندوں پہ جہاں بانوں کے
ڈھیر لگ جائیں گے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

جمگھٹے بیچ کے گذرتے ہوئے انسانوں کے
قہقہے اور بڑھا دیتے ہیں دیوانوں کے

موسمِ گل سے خزاں نے وہ سیاست کھیلی
گلستانوں کے ہوئے ہم نہ بیابانوں کے

میں نے سمجھا تھا شگوفوں کو دلِ صد پارہ
جب کیا غور تو ٹکڑے تھے گریبانوں کے

وہی اخلاق کو ایماں کو بناتے ہیں سپر
وہ جو اخلاق کے قائل ہیں نہ ایمانوں کے

شرطِ اوّل ہے مسلمان کا انساں ہونا
وہ مسلمان کے دشمن ہیں کہ انسانوں کے

جن کو آہوں کی طرح ضبط کیا جاتا ہے
ترجماں اشک ہی بنتے ہیں اُن ارمانوں کے

جس توقّع پہ خوشامد میں لگے رہتے ہو
اختیارات سے باہر ہے نگہبانوں کے

کہہ رہے ہو جسے تم ابرِ بہاری اے شاد
میں سمجھتا ہوں کہ آثار ہیں طوفانوں کے

قمر جمیل

زنجیر بپا حباب جیسے
ہم پھر بھی ہیں آفتاب جیسے

اے دامنِ گل گواہ رہنا
کچھ داغ بھی ہیں گلاب جیسے

یہ دشت میں گھومتا بگولہ
مجھ آبلہ پا کا خواب جیسے

یوں دل میں ترا خیال آیا
صحرا میں کھلے گلاب جیسے

ہر رات کسی کی یاد آئی
وہ یاد بھی کیسی خواب جیسے

ہر موجِ سکوں کو ایسے دیکھا
سمجھا ہی نہیں سراب جیسے

ہر قطرۂ خوں میں جل رہی ہے
اک کیفیتِ شباب جیسے

کانٹوں سے جمیل ہم بھی نکلے
پر اتنے جدا، گلاب جیسے

عبداللہ خاور

ملکوں ملکوں خوار و زبوں ہیں عشق کے راج دلارے
کس منزل پر حسنِ گریزاں، کوئی تجھ کو پکارے ؟

شمعِ جنوں اب کر لوں فروزاں، رات اندھیری آئی
بجھ بجھ جاتے ہیں رستے میں، ہوش کے جھوٹے تارے

اجنبی بن کر اب جو گذرا، میرے قدم تھرائے
روح کبھی مانوس تھی جن سے آہ وہی گلیارے

جوشِ بہاراں تیری پھبن ہے، یا ہے قہر نمو کا
چشمِ نظارہ جل اٹھی ہے، پھول ہیں یا انگارے

پیدا کوئی بھی آہٹ ہو، قلب دھڑک اٹھتا ہے
ڈوبتی جاتی ہے وہ صدا پھر، لے کر ارماں سارے

میں یہ سمجھا تھا، ہیں یہ شعلے میرے ہی دل میں پنہاں
چاند کی نگری بھی ہے فروزاں پا کر تیرے اشارے

قوسِ قزح کے رنگ کی صورت کیوں ہے مجھ سے گریزاں
فکر کا صورت گر نہ بنا لے تجھ سے سوا نظارے

تیرا تغافل دائم تو مت چھیڑ وفا کے نغمے
جیتے ہیں اور جیتے رہیں گے یونہی ترے دکھیارے

ڈوب گیا ہوں اُن آنکھوں میں حیرت کیا ہے خاور
اُڑتے پنچھی رُک جاتے ہیں، اکثر جھیل کنارے

آرٹ کونسل پاکستان کے زیرِ اہتمام کراچی میں پاکستانی مصوّر
شاکر علی کی تصاویر کی نمائش

"مشرقی پاکستان ایسوسی ایشن" نے کراچی میں
ایک رنگارنگ تفریحی پروگرام پیش کیا۔

معاہدۂ بغداد کے ممالک کی اقتصادی کمیٹی کا اجلاس کراچی میں۔

وزیراعظم پاکستان کا کمیٹی سے افتتاحی خطاب

معاہدہ بغداد کی اقتصادی کمیٹی میں معاہدات پر دستخط۔

وزیراعظم جاپان کا حالیہ دورۂ پاکستان

زخمِ دل

بقیہ صفحہ ۳

اور ایک مجرم سے اس کے سوا اور کیا سلوک کیا جاتے ۔
دوست! گھبرایئے نہیں! یہ ہتھکڑی نہیں آپ کا زیور ہے ۔
دروازہ کھٹکھٹاتا ہے!

اکرم خاں :۔ آپ مجھے اس کے لئے مجبور نہیں کر سکتے!

انسپکٹر :۔ اگر میری شرافت اور نرمی کا اثر قبول نہیں کرنا چاہتے تو میں سختی بھی کر سکتا ہوں ۔ آخر آپ ایک سمگلر ہی تو ہیں ۔ میں آپ کو جبراً اندر لے جاؤں گا ۔ کانسٹبل! انہیں اندر لے چلو!

اکرم خاں :۔ (چلا کر) مجھ میں تاب نہیں کہ میں اپنی بیوی اور بچی کے سامنے یوں جاؤں ۔ (گھبرا کر، ہانپ کر) میں نہ جاؤں گا ۔ میں اتنی بڑی ذلت گوارا نہیں کر سکتا ۔ ہائے میرا دل، میرا یہ زخم! میں اپنے قابو میں نہیں ۔ میرا سر چکرا رہا ہے ۔ یہ محل یہ میرا نہیں ۔ اسے ڈھا دو، گرا دو یہ ریت کا تودہ ہے ۔ مجھے اس سے کوئی تعلق نہیں ۔

انسپکٹر :۔ کیا ہوا ہے تمہارے دل کو؟ بہانے بناتے ہو! سمجھتے ہو کہ میں تمہاری چال میں آجاؤں گا ۔

اکرم خاں :۔ (دل پکڑ کر) دل بیٹھا جا رہا ہے ۔ مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جاتا (بیٹھ جاتا ہے) میرے زخم سے خون رسنے لگا میرے دل کو کیا ہوا؟ یہ روشنی کیوں بجھ گئی؟ یہ کون چیخا؟ یہ کس کی چیخ ہے؟ یہ لوگ کیوں رونے لگے؟

انسپکٹر :۔ کانسٹیبل! انہیں اٹھا کر اندر لے چلو!

اکرم خاں :۔ بڑے شوق سے ۔ زندہ نہ سہی مردہ ہی سہی ۔ اس لاش کو جہاں چاہو لے جاؤ!

(گر پڑتا ہے اور دم توڑ دیتا ہے)

انسپکٹر :۔ ہیں، اسے کیا ہوا؟ غش کھا گیا ہے؟

سپاہی :۔ (نبض پکڑ کر) یہ تو ختم ہے ۔

انسپکٹر :۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

(ڈراپ سین)

سیدھی
پیٹھ اور مضبوط
اعضاء کے لئے
اپنے
ننھے بچے کو یہ
خالص دودھ
دیجئے
OSTERMILK
آسٹرملک ایک خالص قوت بخش اور مقویات والا دودھ ہے جو کہ اُن
بچوں کے لئے بیحد ضروری ہے جنکو کہ مائیں چھاتی کا دودھ کامیابی سے نہیں پلا سکتی
ہیں۔ ہڈیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے اسمیں وٹامن "ڈی" ملایا جاتا ہے اور
لوہا اس لئے ملایا جاتا ہے کہ بچے خون کی کمی والی بیماری سے محفوظ رہ سکیں۔ بچوں کو
سیدھی پیٹھ اور مضبوط بازوؤں کیلئے ایسی ہی قوت بخش غذا کی سخت ضرورت ہے۔
اسی لئے آج ہی آپ آسٹرملک خریدیئے تاکہ اطمینان ہو جائے کہ آپکا بچہ بہترین
دودھ پا رہا ہے۔ یہ خاص کر پاکستان میں بچوں کے لئے نہایت موزوں ہے۔
آسٹرملک
ماں کے دودھ سے قریب تر
ہر ماں کے لئے مفید مشورہ
سنگترہ کا رس پہلے مہینہ کے بعد سے ہر بچہ کو دینا چاہئے۔ اسمیں وٹامن "سی"
ہوتا ہے جو کہ صحت کے لئے ضروری اور ہاضمہ کے لئے مفید ہے۔ ایک چھوٹے چمچہ کے
برابر رس اُسی قدر پانی کے ساتھ ابتدا میں دینا شروع کیجئے۔ ضرورت ہو تو
تھوڑی شکر یا گلیکسو کا تھوڑا گلوکوز ڈی بھی ملا دیا کیجئے۔
گلیکسو لیبوریٹریز (پاکستان) لمیٹڈ
کراچی لاہور چٹاگانگ ڈھاکہ
R. 61

ترقی کے ذرائع

سمندری اور فضائی ذرائع آمدورفت
دوست اقوام میں تجارت اور خیر سگالی بڑھانے میں
مدد دیتے ہیں۔ اسی طرح سڑکیں اور ریلیں دورِ جدید
کی نعمتوں کو ملک کے گوشے گوشے تک پہنچاتی ہیں۔
درحقیقت یہی وہ ترقی کے ذرائع ہیں جن پر پاکستان کی
خوشحالی منحصر ہے۔ کالٹیکس ان ذرائع کو
فروغ دیکر ملک کی ترقی اور خوشحالی میں
اہم حصہ لیتے ہیں۔

CALTEX

معدنی تیل ترقی اور خوشحالی کا سرچشمہ ہے

کالٹیکس پیٹرولیم پروڈکٹس

بھگت کبیر

سوامی کلجگانند

برگزیدہ اور بلند پایہ ہستیاں دنیا میں ہر وقت پیدا ہوتی رہی ہیں۔ بھگت کبیر داس جو آدی باسیوں یعنی اس سرزمین کے اصلی باشندوں میں سے تھے ایسی ہی ایک برگزیدہ ہستی تھے۔ چنانچہ اس دیس کے تمام لوگ مسلمان، ہندو اور دوسری جاتیوں کے پیرو ان کی نیکی پر اعتقاد رکھتے تھے۔ کبیر پنتھیوں کے خیال اور عقیدے کے مطابق بھگت کبیر کی نہ ماں تھی نہ باپ۔ کہتے ہیں کہ ایک جولاہے، نورا اور اس کی بیوی نیما نے انہیں کاشی یعنی بنارس کے ایک تالاب میں ایک کنول پر تیرتے ہوئے پایا۔ نیما نے اس بچہ کو اٹھا لیا اور خدا کی قدرت دیکھئے کہ بچے نے اسی وقت بولنا شروع کر دیا۔ یہ دونوں میاں بیوی بچے کو خوشی خوشی گھر اٹھا کر لے گئے اور اس کو پال پوس کر پروان چڑھایا ؂

جب بھگت کبیر بڑے ہوگئے تو انہوں نے اپنی نیکی کی وجہ سے بہت نام پیدا کیا۔ چنانچہ لاکھوں مسلمان، ہندو، امیر، غریب اُن کے پیرو بن گئے۔ ان کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ انہوں نے فلسفے کی بڑی بڑی پیچیدہ گتھیاں بڑی صفائی سے حل کیں اور وہ اس قدر سیدھے سادے، عام فہم پیرائے میں تعلیم دیتے تھے کہ تمام لوگ اُن کی بات بڑی آسانی سے سمجھ لیتے تھے۔ اُن کا ایک بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے چھوت چھات کے خلاف پرچار شروع کیا اور ذات اور رنگ و نسل کے امتیاز کی مخالفت کی۔ انہوں نے لوگوں کو بتایا کہ تمام انسان برابر ہیں اور ہر انسان کو اس پر پورا پورا عمل کرنا چاہیئے جب وہ اس طرح انسانوں کے بھائی بھائی ہونے کی تعلیم دیتے تھے تو انہیں ایک بہت بڑا غیر معمولی عالم فاضل انسان ہونے کا ذرا بھی احساس نہ ہوتا تھا اور لوگوں پر خواہ مخواہ کوئی دباؤ نہیں ڈالتے تھے بلکہ صرف تلقین اور میٹھی زبان اختیار کرتے تھے ؂

بھگت کبیر کی زندگی بڑی پاکیزہ اور سیدھی سادی تھی۔ وہ تو بس ایک عام آدمی کی طرح زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ اور انہوں نے اپنی ذاتی سعی و کوشش اور جدوجہد ہی سے اس قدر نام پیدا کیا کہ آج تک دنیا میں اُن کا نام عزت سے لیا جاتا ہے ؂

پہلے پہل جتی ستی براہمنوں اور بڑے بڑے گن وان پنڈتوں نے اُن کی مخالفت کی۔ مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف اچھوت اور شودر بلکہ ہزاروں براہمن، پنڈت، سیٹھ، راجہ، مہاراجہ بھی اُن کی عزت کرنے لگے۔ مسلمان، انہیں مسلمان اور ہندو، ہندو تصور کرتے تھے۔ لیکن سچ پوچھیئے تو اُن کا مذہب ایک ہی تھا — خدائی وحدت کا اقرار، اور انسانوں کی مساوات کا پرچار — جیسا کہ انہوں نے کتنے ہی گیتوں اور شعروں میں کہا ہے ؂

بھگت کبیر نے لوگوں کے دلوں سے توہمات کو دور کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ بھوتوں وغیرہ کا عقیدہ اپنے دل سے نکال دیں۔ اِس سلسلہ میں انھیں بڑی کامیابی ہوئی۔ اُن کی تعلیم کا اثر بہت وسیع، دور رس اور نتیجہ خیز رہا۔ ملک میں کتنے ہی ایسے گروہ پیدا ہو گئے جن کا مطمح نظر اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ وہ بنی نوع انسان کی محبت اور خدمت کا دم بھریں اور اپنے مرشد کبیر داس کی تعلیم کو پورا کریں۔ ان میں بعض گروہوں کے نام نانک پنتھی، سدا ست نامی، شری نرائن، شرینا بادی، دادو پنتھی، دریا داسی وغیرہ وغیرہ۔ اِن مختلف متوں کی کتابیں بھگت کبیر کی تعلیمات سے بھری پڑی ہیں۔ کبیر پنتھی اپنی رہنمائی کے لیئے صرف ایک ہی کتاب کو تعلیم کرتے ہیں۔ اس کا نام "خاص گرنتھ" ہے جو اکیس[۲] ابواب پر مشتمل ہے۔ چنانچہ گو کبیر پنتھی دوسرے تمام متوں کی مذہبی رتیوں رسموں میں شریک ہوتے ہیں، مگر وہ پڑھتے صرف اپنی کتاب ہیں ؂

بھگت کبیر جس طرح بڑے پراسرار طور پر دنیا میں نمودار ہوئے تھے اسی طرح غیر معمولی طور پر رخصت بھی ہوئے۔ کہتے ہیں کہ جب وہ سرگباش ہو گئے تو ہندو مسلمان اُن کی میت پر جمع ہوئے۔ ہندو چاہتے تھے کہ وہ انہیں اپنے دھرم اور طریق کے مطابق اُن کی لاش کو جلائیں اور مسلم انہیں اپنے دستور کے مطابق سپرد خاک کرنا چاہتے تھے۔ اِس سے جھگڑا پیدا ہوا۔ کہتے ہیں کہ جب یہ جھگڑا ہو رہا تھا تو بھگت کبیر دفعتاً اُٹھ کھڑے ہوئے اور کچھ دیر توحید اور اتحاد پر تقریر کرتے رہے۔ اس میں بھگت کبیر نے اِس امر پہ زور دیا کہ لوگ اُن کی تعلیم کو اس قدر جلد

بھول گئے۔ یہ کہہ کر وہ یک لخت غائب ہو گئے!

بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ وہ آسمان کی طرف چلے گئے۔ بہرکیف اُن کی تعلیم کا نتیجہ ہوا کہ ہندو مسلمانوں نے اُن کی میت پر جھگڑنا چھوڑ دیا۔ انہوں نے اُن کی ارتھی پر پھول برسائے۔ ہندوؤں نے اُن کی یاد میں "کبیر چورا" کے نام سے بنارس میں ایک مندر تعمیر کیا۔ کاشی کے مہاراجہ بیر سنگھ نے اس جگہ ایک بہت خوبصورت عمارت تعمیر کی۔ اب بھی اس جگہ ہر سال ایک میلا منایا جاتا ہے۔

بھگت کبیر کی میت سے مسلمانوں کو جو پھول ہاتھ لگے اُن کو نواب بجلی خاں اپنے ساتھ لے گئے اور انہیں یوپی کے ضلع گورکھپور کے ایک گاؤں میں دفن کیا گیا جس کا نام مگر گاؤں ہے۔ اس جگہ ایک بہت عالیشان مقبرہ بھی تعمیر کیا گیا۔ یہاں بھی ہر سال بھگت کبیر کی یاد میں ایک میلا ہوتا ہے۔ کبیر پنتھی ان دونوں جگہوں کو بڑا متبرک خیال کرتے ہیں اور کبھی یہاں کبھی وہاں زیارت کے لئے جاتے ہیں۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، بھگت کبیر کا طریق تعلیم بہت ہی نرالا تھا۔ ہندوؤں کو وہ یہ کہتے ہیں کہ بتوں کی پوجا اور مالا جپنا کوئی کام نہیں دیتا تاوقتیکہ آدمی کا من پوتر نہ ہو

گنگا پھرا ہردوار کا گدڑی لیا من چپار کا ۔۔۔ بھٹکا پھرا تو کیا ہوا جن عشق میں سر نا دیا

مسلمانوں کو بھی وہ اسی انداز سے تعلیم دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ حج کرنا اور تسبیح کے دانے گننا بھی کوئی ذمہ نہیں دیتے جب تک کہ انسان کا دل پاک صاف نہ ہو اور انسان کی عبادت میں خلوص کو کوئی دخل نہ ہو۔

سنت داد و کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ بچھڑوں کی بستیاں دریاؤں میں اشنان وغیرہ سب بیکار ہیں۔ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ گنگا یا جمنا میں ایک یا دو بار اشنان کرنے سے مرنے کے بعد سورگ میں پہنچ جائیں گے وہ غلطی پر ہیں۔ کیونکہ کچھوے اور مگرمچھ یاں تو عمر بھر انہیں دریاؤں میں رہتے ہیں۔ اس حساب سے تو انہیں کسی بہت ہی بڑے مہا سورگ میں پہنچ جانا چاہئے! غرض ان کی ساری تعلیم ایسے سیدھے سادے اور بہت موثر، دل میں گھر کرنے والے پیرائے میں تھی۔

بھگت کبیر کی تعلیمات کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال میں کتنے ہی مذہبی مت پیدا ہو گئے جن کا مدعا یہ تھا کہ وہ توحید اور اتحاد کے لئے بنی نوع انسان کی کوششوں کو جاری رکھیں۔ صرف مردوں ہی نے بھگت کبیر کی پیروی نہیں کی بلکہ عورتوں نے بھی اُن کے بلند مقاصد اور افکار کا پرچار شروع کیا۔ ان برگزیدہ پیشواؤں میں صرف براہمن ہی نہ تھے بلکہ دوسرے فرقوں اور طبقوں کے لوگ بھی جنہوں نے چھوت چھات، فرقہ پرستی، رنگ و نسب اور مقامیت کے خلاف جدوجہد کو جاری رکھا۔ اُن کا منتہائے مقصود صرف ایک تھا۔ محبت اور حقیقی مساوات، یعنی یہ کہ تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

آدی باسیوں یعنی اچھوتوں کا دھرم ایک ہی ہے یعنی اتحاد (سنت دھرم)، اس کی سرگرمیاں اور اصول ایک جمہوری پنچایتی نظام کے تحت ہیں۔ گرو کا تقرر انتخاب سے عمل میں آتا ہے۔ گرو کا آشرم نہ صرف عبادت گاہ ہوتا ہے، بلکہ امیر و غریب سب کے لئے سرائے یا مہمان خانہ بھی ہوتا ہے، جہاں ہر روز ہزاروں لوگ کھانا کھاتے ہیں اور وہ بھی مفت۔

بھگت کبیر اُن سادھوؤں، سنتوں اور فقیروں کی بہت خدمت کرتے تھے جو خدا کی عبادت بجا لاتے تھے اور مذہبی خدمات سرانجام دیتے تھے۔ وہ اُن کی آرام و آسائش کا خاص دھیان رکھتے تھے۔ براہمنوں کو یہ بات پسند نہ تھی۔ کیونکہ بھگت کبیر ان موٹے تازے برہمنوں کو کبھی کھانے پینے کی دعوتوں پر بلانے کی زحمت نہ دیتے تھے۔ براہمنوں کے متعلق اُن کا قول یہ تھا کہ جتنا دھن انہیں ملے وہ اتنا ہی اور مانگتے ہیں۔ اس سے براہمن بہت ناراض ہوئے اور انہوں نے اُن کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ جب وہ اپنے مقصد میں ناکام ثابت ہوئے تو انہوں نے اُن کو رسوا کرنے کے لئے ایک اور چال چلی۔ انہوں نے کچھ دے دلا کر ایک عورت کو یہ اعلان کرنے پر آمادہ کیا کہ بھگت کبیر اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ بھگت کبیر نے اس کی ذرا بھی پروا نہ کی۔ اس کے برعکس وہ اس عورت کا ہاتھ پکڑ کر کھلے بازار میں چلنے لگے اور اس کو لیکر سیدھے راجہ کے دربار میں گئے۔ راجہ بھگت کبیر کی بہت عزت کرتا تھا۔ جب اس نے یہ ماجرا دیکھا تو اُسے بھگت کبیر پر شبہ گذرا اور اس نے ان کو پرنام بھی نہ کیا۔ بھگت کبیر کچھ دور بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے کلسے سے زمین پر کچھ پانی چھڑکا۔ راجہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ باندھ کر اس کا سبب پوچھنے لگا۔ کبیر نے اسے بتایا کہ اس کا مقصد نقصان پہنچانا نہیں، بلکہ صرف فائدہ پہنچانا ہے کیونکہ اس وقت کسی مندر کو آگ لگی ہوئی تھی۔ اس بات کی فوراً ہی تصدیق ہو گئی کیونکہ مندر جلنے سے بچ گیا اور اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اس کے بعد راجہ بھگت کبیر کی اور بھی زیادہ عزت کرنے لگا۔

حمال ——— بقیہ صد ۲۰

میرے ذہن میں یہ خیالات اُبھر رہے تھے اور میں اس کے ساتھ ساتھ باقی راستہ طے کر رہا تھا۔ چاند غائب ہو چکا تھا، تیرگی ساری کائنات کو اپنی آغوش میں لے رہی تھی۔ تمام کا نارہ ماتم کسار تھا کبھی کبھی تیز ہوا کی سرسراہٹ مجھے چونکا دیتی اور یکلخت میرے ذہن میں اُس حمال کے یہ الفاظ اُبھر آتے:

"بوجھ ڈھونا میری زندگی کا ایک اہم جزو بن گیا ہے، اس کے بغیر زندگی کا احساس نہیں ہوتا، بوجھ ہی کے ذریعہ میں اپنی زندگی میں توازن اور ہمواری قائم رکھ سکتا ہوں، اس کے بغیر چارہ نہیں۔ زندگی بے مصرف ہو جائے گی۔"

اس کی پشت پر ہاتھ رکھتے ہوئے میں نے کہا:

"میرے دوست، یہ نہ سمجھنا کہ اس دنیا میں تو ہی ایک ایسا آدمی ہے جو یہ بوجھ اُٹھاتا ہے، ہر شخص کو کچھ کرنا پڑتا ہے، زندگی بذاتِ خود ایک بوجھ، ایک بارِ ثقیل ہے۔ کسی متنفس کو اس سے مفر نہیں۔ مگر اہم حقیقت یہ ہے کہ اس بارِ گراں کو اُٹھانے میں اُستواری اور توازن قائم رکھنا ناگزیر ہے، اس کے بغیر زندگی کا کوئی کام ٹھیک نہیں ہو سکتا اور نہ مسرت و اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔"

بوڑھا حمال میری باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا، اس کے چہرے پر مسرت و اطمینان کے آثار ظاہر تھے، میں نے کہا:

"تو بھائی، تم صرف اکیلے نہیں ہو جو زندگی میں توازن قائم رکھنے کے لئے پتھر اُٹھا لیتے ہو، ہر شخص کو کوئی نہ کوئی بوجھ اُٹھانا پڑتا ہے۔"

اب وہ میرے مکان کے دروازے تک پہنچ چکا تھا، میں نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا:

"اے میرے دوست، اے انسان، تو نے آج مجھے انسانیت کا ایک انوکھا تصور دیا ہے، تو پیکرِ انسانیت ہے۔ تو اپنے اعمال سے اس کی تشریح کرتا ہے، میں تجھے سلام کرتا ہوں۔" اس کے چہرے پر نہایت عمیق سکون اور اطمینان کے آثار تھے۔

"زندگی کا بارِ گراں اُٹھانے میں خدا تمہاری مدد کرے! السلام علیکم۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ (انوکھی سے)

افق تا افق

ابنِ طفیل : (کامل گیلانی)

نگارشات ابن طفیل سے فن افسانہ نگاری پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں ان کا احاطہ بہت دشوار ہے، بایں ہمہ بعد میں آنے والے ادیبوں نے ابن طفیل کے طرز سے جو استفادہ کیا ہے اس کا کسی حد تک جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ یہ استفادہ صرف مشرقی ادیبوں تک ہی محدود نہیں بلکہ بعض مغربی اہلِ قلم بھی اس سے فیضیاب ہوئے ہیں مثلاً "تارزن" کے مؤلف نے اپنے ہیرو کی تربیت کا تصور ابن طفیل کی کہانی "حی بن یقظان" سے لیا ہے۔ اسی طرح مشہور انگریز ادیب "ڈینیل ڈیفو" نے "روبنسن کروسو" کی تخلیق میں ابن طفیل کی تقلید کی ہے۔ لیون گوئٹے (LEON GOETHE) "حی بن یقظان" کے مقدمہ میں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "روبنسن کروسو" میں "فرائی ڈے" کا کردار ابن طفیل کے "ابسال" کا پرتو ہے۔ اسی طرح "روبنسن کروسو" میں جو فلسفیانہ نکتہ سنجی اور حکیمانہ موشگافیاں پائی جاتی ہیں وہ "حی بن یقظان" ہی سے ماخوذ ہیں۔ اگرچہ اس کا اسلوب عصرِ جدید کے تقاضوں کے مطابق ہے، پھر بھی جہاں تک ماخذ کا تعلق ہے اس کی بنیاد "حی بن یقظان" پر قائم ہے۔

اسی طرح برن یونیورسٹی کے پروفیسر رڈولف ویس نے اپنے قصہ "خاندان سوئٹزرلینڈ یا سوئٹزرلینڈ کا روبنسن" کے لئے حی بن یقظان کا تتبع کیا ہے۔ سوفٹ اپنی کہانی "گلیورز ٹریولز" کی تالیف میں ابن طفیل ہی کا مرہونِ منت ہے۔

"حی بن یقظان" کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ پوکوک نے سب سے پہلے اس کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا جس سے اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا گیا۔ بعد ازاں اس کے جرمن اور ہسپانی ترجمے ہوئے۔ سنہ ۱۹ء میں اس کا ترجمہ عبرانی زبان میں بھی شائع ہوا۔ اشویل نے اپنے انگریزی ترجمہ کے مقدمہ میں ابن طفیل پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ابوبکر ابن طفیل مشہور مسلمان فلسفی ہے۔ اس نے اپنے قصہ میں ارتقاءِ عقلِ انسانی کے مدارج واضح کئے ہیں اور نہایت چابک دستی سے رازہائے کائنات کا انکشاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی دقتِ مشاہدہ حوادثِ کون و مکاں کی تفسیر میں ظاہر و بین ہے۔

شعر کا اثر : (قاضی محمد زاہد حسین)

اگرچہ اسلام نے شاعری میں بے راہ روی اور کج خیالی کو منع کیا ہے لیکن جہاں تک اس کے افادی پہلو کا تعلق ہے شعر کو صرف جائز ہی نہیں قرار دیا بلکہ شاعروں کی ہمت افزائی بھی کی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حسان بن ثابت اور عبداللہ بن رواحہ کو اپنے عین اعتبارِ خاص میں رکھتے تھے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم عہدِ جاہلی کے اچھے شعروں کی سماعت فرماتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ خلفاء یا امراء کو ان کی حاجت روا کئے بغیر چارہ نہ ہوتا اور ایسی نتیجہ خیز تاثیر شعر ہی میں پائی جاتی ہے۔

("الوعی" سے)
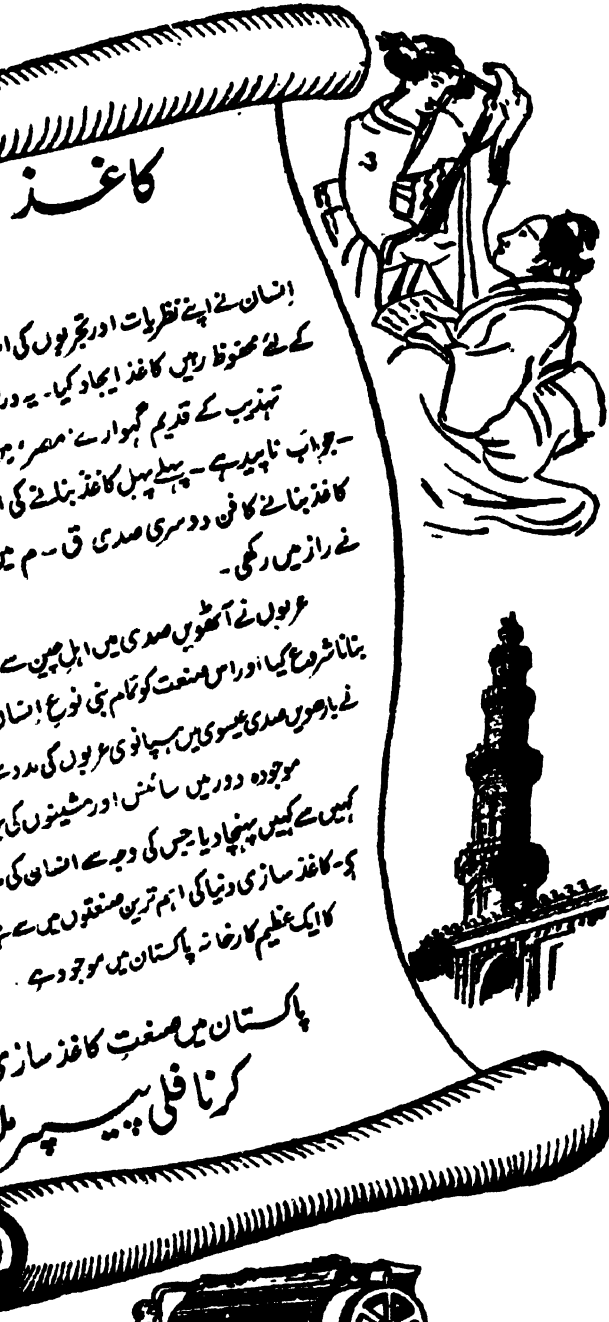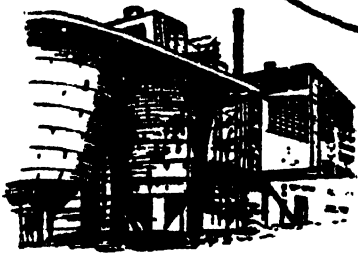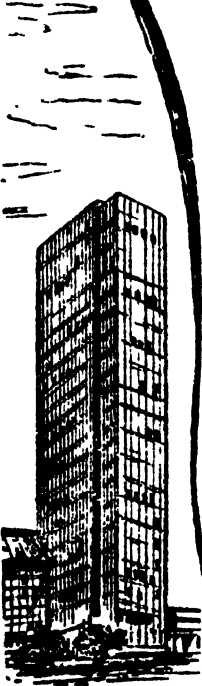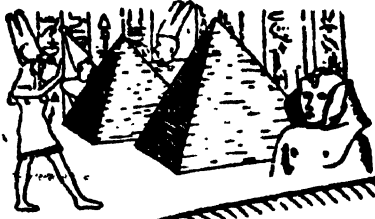
کاغذ
ترقی کی بنیاد
انسان نے اپنے نظریات اور تجربوں کی اشاعت کی خاطر اور اس مقصد سے کہ وہ آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ رہیں کاغذ ایجاد کیا۔ یہ درحقیقت ترقی کی راہ پر پہلا قدم تھا۔ تہذیب کے قدیم گہوارے "مصر" میں "پے پائرس" نام کے ایک پودے کی جڑ سے — جو اب ناپید ہے — پہلے پہل کاغذ بنانے کی ابتدا ہوئی۔ لیکن ریشہ دار اشیا سے کاغذ بنانے کا فن دوسری صدی ق-م میں چین سے شروع ہوا جس کی ترکیب انہوں نے راز میں رکھی۔
عربوں نے آٹھویں صدی میں اہل چین سے اس فن کو حاصل کر کے تجارتی پیمانے پر کاغذ بنانا شروع کیا اور اس صنعت کو تمام بنی نوع انسان کے استفادے کے لئے فروغ دیا۔ اہل یورپ نے بارھویں صدی عیسوی میں ہسپانوی عربوں کی مدد سے اس صنعت کو اور زیادہ وسعت دی۔
موجودہ دور میں سائنس اور مشینوں کی غیر معمولی ترقی نے کاغذ سازی کی صنعت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا جس کی وجہ سے انسان کی مادی اور علمی ترقی میں بے حد مدد مل رہی ہے۔ کاغذ سازی دنیا کی اہم ترین صنعتوں میں سے ہے اور ہم فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ مشرق میں کاغذ کا ایک عظیم کارخانہ پاکستان میں موجود ہے۔
پاکستان میں صنعتِ کاغذ سازی کے پیشرو
کرنافلی پیپر ملز لمیٹڈ
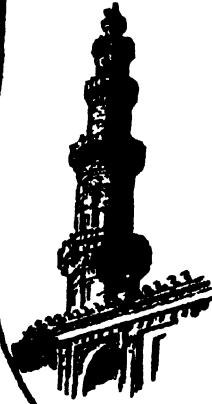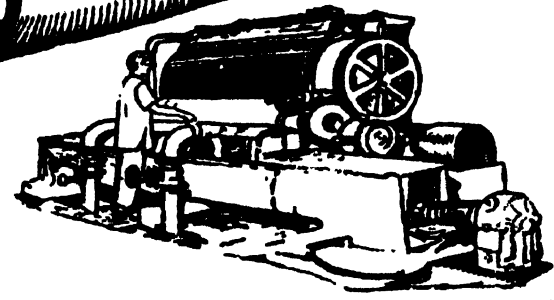
KP-5

UNITED

میری قمیص
پٹخنا بند کرو...
چٹاخ! پٹاخ! تار تار جیب نر،
مڑے ہوئے ہک! پھٹی آستیں
میں اس طرح اپنی قمیص دھلوانا نہیں چاہتی
سن لائٹ صابن استعمال کیجیے
جی ہاں! جب سن لائٹ صابن کافی مل سکتا ہو تو کپڑوں
کو اسطرح کوٹ پیٹ کر دھونیکی کیا ضرورت سن لائٹ
کے جلد اثر کرنیوالے جھاگ سے تو میل پیٹے بغیر میل خود بخود
صاف ہو جاتا ہے۔ کپڑے بھگوئیے، سن لائٹ صابن ملئے اور
دھو ڈالئے بس آپکا کام ختم ہو گیا۔ اپنے تمام کپڑے سن لائٹ صابن
سے دھوئیے۔
یہ آپ کے ہاتھ کی جلد کے لئے بھی مضر نہیں ہے
سن لائٹ صابن
SUNLIGHT SOAP
پٹخے بغیر کپڑوں کو
صاف شفاف اور اجلے
دھوتا ہے
S. 13—183 UD

دن بہ دن
حسین جلد...
جی ہاں: آپ کی جلد میں ایک نئی تازگی پیدا ہوگی
رکسونا کے کیڈل آمیز جھاگ کو اپنی جلد پر ملیے
اور دھو ڈالیے۔ آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ کی جلد
دن بہ دن دل کش ہوتی جا رہی ہے۔ بے شک
... رکسونا
صابن سے
Rexona
دل کش اور فرحت بخش خوشبو!
جلد کو ملائم کرنے اور مقوی جلد تیلوں کے ایک خاص مرکب کا ملکیتی نام ہے۔

قدم دیکھ بھال کر رکھئے

کسی صاحب کو اپنی کار کے لئے ڈرائیور کی ضرورت تھی۔ انہوں نے اشتہار دیا۔ تین امیدوار آئے۔ ان صاحب نے تینوں سے پوچھا:

"فرض کیجئے۔ آپ کسی پہاڑی راستے پر کار چلا رہے ہیں۔ ایک طرف دو قدم پر گہرا
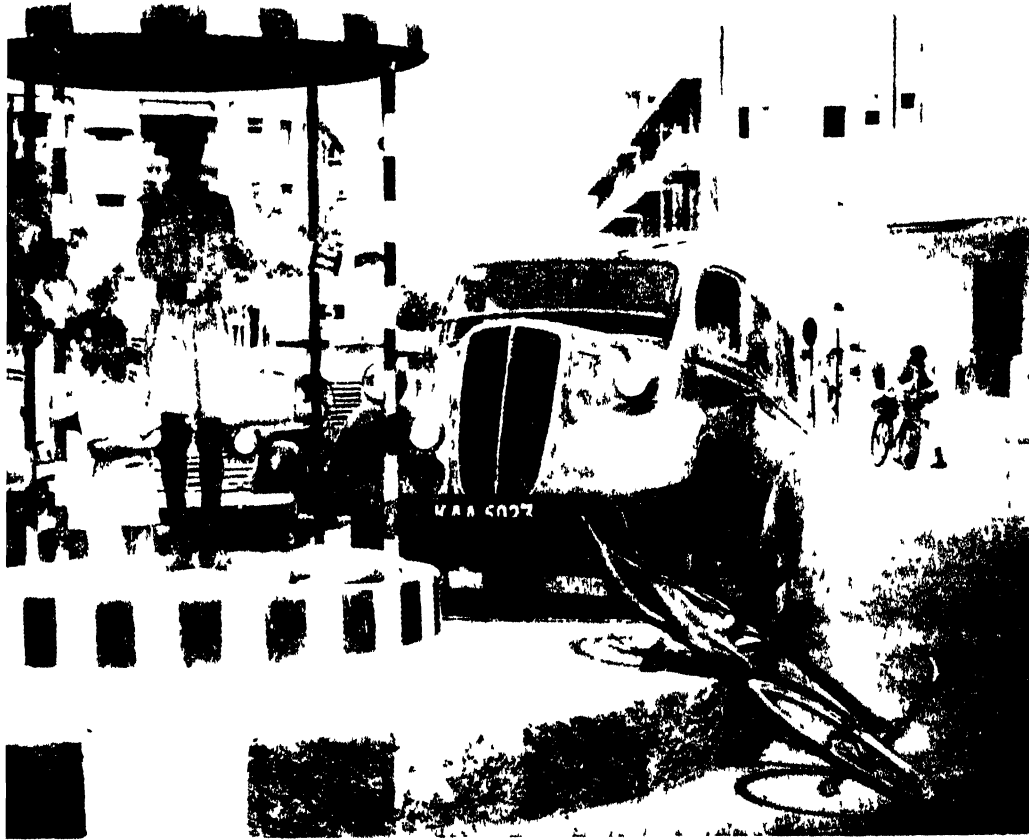
ٹر ڈرائیور یا سائیکل سوار، ں کا بھی قصور ہو، نتیجہ نوں کے حق میں برا ہوا

کھڈ ہے۔ آپ وہاں کار کو کتنا تیز چلا سکتے ہیں اور کھڈ کے کنارے کے کتنے قریب سے گاڑی کو سلامتی سے گذار سکتے ہیں؟"

پہلے امیدوار نے جواب دیا: "جناب آپ کی عا سے تیس میل کی رفتار سے چلا لوں گا اور کنارے سے ایک فٹ بھر سے زیادہ جگہ نہیں مانگوں گا"۔

دوسرے امیدوار صاحب ان کے قریب نکلے، کہنے لگے: "حضور، پچاس میل کی رفتار سے چلاؤنگا اور کھڈ سے بس چھ انچ زمین چھوڑوں گا۔ یہ چلاؤں تو نام بدل دیجئے"

تیسرا امیدوار آہستگی سے بولا:

"جناب کہہ نہیں سکتا۔ کبھی کوشش نہیں کی"۔

بتائیے۔ وہ نوکری کسے ملی ہوگی؟

بے تحاشا تیزی کا نتیجہ
''اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن''

یہ موٹروں ، گاڑیوں کی ریل پیل کا زمانہ ہے اور یہ ایجادیں ہم پر نازل بھی کچھ اچانک ہوئی ہیں ۔ بڈھے ٹھڈے لوگ جو تانگوں، شکرموں کے عادی ہیں انہیں دیکھتے ہی بوکھلا جاتے ہیں ان کا بھی ذکر چھوڑئیے ، اچھے سمجھدار جوان لوگوں کا یہی حال ہے کہ پیدل یا سوار سڑک پر آتے ہیں تو ہوش گھر بھول آتے ہیں ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اخبار میں آدھا صفحہ ٹریفک کے حادثوں کی خبروں سے پر ہوتا ہے ۔ گھر سے نکلے تو پھر خدا ہی ہے جو سلامت لائے ۔

اگر ہم ٹریفک کے قاعدے سمجھ لیں ۔ اور ان پر عمل کریں تو اس میں ہمارا اپنا فائدہ ہے

یہ بھی عام سمجھ کی بات ہے کہ ہمیں اپنی گاڑی کو ہر نقص سے مبرا رکھنا چاہئے ۔ کسی بھی اچھی گیریج میں گاڑی لے جائیے ۔ وہ دیکھ لیں گے کہ کوئی کل پرزہ ڈھیلا تو نہیں ۔ پر بریک خصوصاً ہمیشہ نہایت اچھی حالت میں ہونے چاہئیں اسی طرح ڈرائیور کو چاہئے کہ اپنا معائنہ کراتا رہے۔ آیا گاڑی چلاتے وقت اس کے اوسان بجا رہتے ہیں ، ھاتھ پاؤں کی اضطرابی حرکات موقع محل کے مطابق ہوتی ہیں ، نظر بالکل ٹھیک کام کرتی ہے ، رات کو ٹھیک دکھائی دیتا ہے اور صحت میں کوئی اور خرابی تو نہیں ۔ اگر کوئی شخص اس امتحان میں پورا نہیں اترتا تو سلامتی کا تقاضا یہ ہے کہ یہ کام ان پر چھوڑدے جو چاق و چوبند ہیں اور اس کام کے زیادہ اہل ہیں ۔

اگر آپ پیدل چل رہے ہیں تو سڑک پار کرنے سے پہلے دائیں طرف نظر ڈالئے ۔ پھر بائیں طرف اور پھر ایک بار دائیں طرف، تب قدم اٹھائیے ۔ بعض اوقات کوئی کار دور معلوم ہوتی ہے لیکن اسکی رفتار کا آپ کو اندازہ نہیں ہوتا ، ہوسکتا ہے وہ اتنی تیز آرہی ہو کہ پلک جھپکنے میں آپ کو آلے ۔ لہذا سڑک کے بیچوں بیچ سیاست کی گتھیاں سلجھائیے نہ بینگن اور بھنڈی کے بھاؤ پر بحث کیجئے !

اگر آپ گاڑی چلا رہے ہیں تو ایک بات یاد رکھئیے ۔ صرف آدھی سڑک آپ کی ہے اور اس میں بھی دوسروں کو حصہ دینا ہے ۔ اونٹ گاڑیوں کو ، گدھا گاڑیوں کو ، گھوڑا گاڑیوں کو ، آدھی سڑک سامنے سے آنیوالی گاڑیوں کے لئے ہے اور اس میں بھی گاڑیوں کے ساتھ ساتھ گدھے ، گھوڑے شریک ہیں ۔ ایک

ایک اور عبرت ناک سانحہ

بڑا اصول یہ یاد رکھئے کہ کسی گاڑی سے آگے نکلنے کی کوشش خطرناک، بلکہ جان لیوا ہے اور پہاڑی پر یا موٹر پر تو ہرگز ہرگز ایسا نہ کرنا چاہئے - پھر یہ ہے کہ سامنے سے گاڑیاں آرہی ہوں تو روشنی تیز مت چھوڑئے ورنہ چکاچوند سے ان گاڑیوں کے ڈرائیوروں کی آنکھیں چندھیا جائیں گی اور نتیجہ ان کے لئے بھی اور آپ کے لئے بھی خطرناک ہوگا - دوسروں کی سلامتی سے آپ کی سلامتی بھی وابستہ ہے-

لیکن سڑک پر چلنے کا سلیقہ کوئی کالا علم نہیں - روز مرہ کی سمجھ بوجھ کی باتیں ہیں - یہ تو سب جانتے ہیں کہ ایک وقت میں ایک جگہ میں بس ایک چیز سما سکتی ہے، دو نہیں - پھر بھی بعضے خوش فکرے اس آزمودہ کو آزمانے کی کوشش کرتے ہیں - وہ بھی دیو پیکر، قوی ہیکل گاڑیوں کے ساتھ جن کے نیچے ہڈیاں سرمہ ہوجائیں - آپ دن میں کسی بھی وقت کسی بھی چوراہے پر کھڑے ہوکر دیکھیں - ہر شخص اس کوشش میں نظر آئیگا کہ دوسروں سے پہلے سڑک پار کرے اور ایک آپا دھاپی مچی ہوگی - علامہ اقبال کے مصرع کی کیفیت ہوتی ہے : ''بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق !،، لیکن یہ ''آتش نمرود نہیں سڑک ہے اور سڑک پر جان عزیز سے کھیلنا عشق نہیں بےوقوفی ہے - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نکلے ہیں کہیں کے ارادے سے اور پہنچے ہیں ہسپتال یا، (سب کی جان سے دور) ، مردہ خانے میں !

اگر آپ گاڑی میں جا رہے ہیں تو عقل کا تقاضا ہے کہ چوراہے کے پاس پہنچ کر رفتار دھیمی کرلیں - اور پھر دیکھیں کہ کسے پہلے راستہ ملنا چاہئے - اگر مصلحت اور ہوش کا تقاضا ہو تو اپنی باری، اور حق چھوڑ کر پیچھے رہنے میں کچھ ہرج نہیں - بھلا دوسروں

ایک اور قلابازی

حادثات کی
رفتار
۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۶ء تک
(صرف کراچی میں)

کو پیچھے دھکیل دینا اچھا ہے کہ جان کی سلامتی؟ اگر خدانخواستہ آپ کی جان جاتی ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آپ راستی پر تھے — جان تو واپس آنے سے رہی - اگر خدانخواستہ ٹکر ہونی ہی ہے تو آہستہ ہونے میں یہ تو ہوگا کہ نقصان کم ہوگا، چوٹ کم آئے گی - یہ ٹھیک ہے کہ جب سینکڑوں گھوڑوں کی قوت کی گاڑی آپ کے ہاتھ میں ہو اور بس ایک پیڈل دبانے سے الہ دین کے جن کی طرح دوڑنے کو تیار ہو تو اپنے اوپر ضبط رکھنا دشوار ہوتا ہے لیکن انسانی ذمہ داری بھی ایک چیز ہے - آپ کے ہم جنسوں کے جسم و جان آپ کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں، ذرا سی سوئی چبھنے سے اتنا درد ہوتا ہے اگر آپ کی گاڑی کسی غریب کے گوشت، ہڈیوں اور خون کو ایک کر دے تو کیا ہوگا؟ اس ہولناک کیفیت کا تصور کرنے ہی سے جھرجھری آتی ہے - اور بے احتیاطی سے یہ حادثہ دوسرے کے ساتھ ساتھ آپ کو بھی تو پیش آسکتا ہے - لہذا اس ہلاکت آفریں دیو یعنی اپنی گاڑی کو قابو میں رکھیے - گاڑی کو اندھادھند بھگائیے نہیں کیونکہ اکثر حادثے اسی وجہ سے ہوتے ہیں - آپ کے مقامی حکام نے رفتار کی جو حدیں مقرر کر رکھی ہیں ان کے اندر رہئیے - جان ہے تو جہان ہے - اپنی جان بچائیے، اور دوسروں کو بھی اس کا بھید بتائیے -

ہم میں سے جو کوئی ان اصولوں کو، جن کی بنیاد عام سمجھ بوجھ پر ہے، سمجھ لے گا تو جانو کہ اسے سڑک پر چلنے کا سلیقہ آگیا - ان اصولوں کی پابندی میں آپ پہل کیجئے - دوسروں کا منہ مت دیکھئیے - ہوسکتا ہے دوسرا آدمی یہی انتظار کر رہا ہو کہ آپ پہل کریں تو وہ بھی کرے -

لہذا **کل** سے نہیں آج سے اور **آج** کیا،
ابھی سے عمل شروع کیجئے *

...اور کھیل کے بعد
لائف بوائے صابن
سے غسل کیجیے
LIFEBUOY
SOAP
LIFEBUOY SOAP
L 14—193 UD

ان کی تندرستی اہم ہے
اسی وجہ سے میں ہمیشہ ڈالڈا
سے کھانا تیار کرتی ہوں
اتنے ہی وٹامن جتنے کے اصلی گھی میں
اب ڈالڈا برانڈ وناسپتی میں بہت زیادہ
غذائیت ہے۔ ڈالڈا کے ہر اونس میں وٹامن اے کی
اتنی ہی مقدار موجود ہے جتنی کہ اچھے اور خالص گھی میں
ہوتی ہے۔ ڈالڈا میں وٹامن ڈی بھی موجود ہے! آپ کے
بچوں کی صحت مند پرورش کے لئے ان کی غذا میں ان
دونوں وٹامن کی موجودگی ضروری ہے
ہمیشہ محفوظ اور پاک و صاف
ڈالڈا برانڈ وناسپتی کو عمدہ نباتی تیلوں سے تیار
کر کے حفظان صحت کے اصولوں کے تحت سربمہر اور
ہوا بند ڈبوں میں بھرا جاتا ہے اسی وجہ سے یہ تازہ اور
صاف ستھرا ہے۔ اپنے تمام کھانے ڈالڈا سے تیار
کیجئے۔ اور اپنے گھر والوں کو صحت مند رکھئے۔
ڈالڈا برانڈ وناسپتی
کھانوں کو بہتر بناتا ہے

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی نے شائع کیا - مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ - کراچی
مدیر: رفیق خاور

مشرقی پاکستان

معدنی دولت کی تلاش (تیل)

کوہ و دریا

ادارہ

مطبوعات پاکستان

کی

تازہ پیشکش

مجلد صفحات

۱۰ روپے ۸ آنے

ادارہ مطبوعات پاکستان،

پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳

کراچی

جگر مراد آبادی ابوالفضل صدیقی ابوسعید قریشی

ضمیر جعفری محبوب خزاں شائستہ بیزار

کمال احمد رضوی احسن علوی عارف [illegible]

نومبر ۱۹۵۷ء

No [illegible]

میں لکس ٹائیلٹ صابن
استعمال
کرتی ہوں
مسرت نذیر
کہتی ہے
LUX
TOILET SOAP
فلمی ستاروں کا حسن بخش صابن
LTS 193UD

آنکھیں
جو ہر اُفق سے آشنا ہیں
کلپر کے تمام ہوابازوں کے چہروں سے تجربہ کی جھلک نمایاں
ہوتی ہے
اور یہ تجربہ سالہا سال سات آسمانوں اور سات سمندروں کے درمیان
فضا میں پرواز کرتے ہوئے موسمی کیفیات کو بغور دیکھنے ہی سے حاصل ہوتا ہے۔
جب آپ طیارے میں سفر کرتے ہیں تو اپنے ہواباز کے چہرے پر آپ اسی
تجربہ کی جھلک دیکھنا چاہتے ہیں اور یہی ایک بہت بڑی وجہ ہے کہ اکثر لوگ جب
کہیں ہوائی جہاز پر سفر کرنا چاہتے ہیں تو وہ پین امریکن ہی کو منتخب
کرتے ہیں کیونکہ ہر کلپر طیارے کے ڈیک پر، سمندروں پر پرواز کا تجربہ رکھنے والے
کم از کم تین ایسے قابل ہواباز موجود ہوتے ہیں جن کو دُنیا میں ہوابازی کے صحیح
اور ٹھوس معیار کے مطابق ٹریننگ دی گئی ہے۔
پرواز کے دوران ہر کلپر طیارہ ہوابازی کے ان ماہرین کی نگرانی میں رہتا ہے
جو زمین پر تعینات ہیں اور جن کا زبردست امدادی عملہ دُنیا بھر میں پھیلا ہوا ہے۔
پین امریکن کے ایسے ماہرین کی تعداد ۱۷۶۰۰ ہے۔
آسمان میں ہوں یا زمین پر یہی وہ لوگ ہیں جن کی مسلسل کوششوں سے ریاستہائے متحدہ
یا ہمارے عالمگیر سسٹم کے ۸۱ ممالک (جن میں ہمارے چھ سو سے زائد دفاتر موجود ہیں) میں سے
کسی بھی ملک کو ملانے والی ہر سروس نہ صرف تیز رفتار ہے بلکہ اس کی ایک جگہ سے
دوسری جگہ متعدد بار آمد و رفت بھی ممکن ہو گئی ہے۔
یاد رکھئے جب آپ پین امریکن کے طیارے میں سفر کرتے ہیں تو
گویا آپ ایک ایسی واحد ایرلائن سے سفر کرتے ہیں جس نے
بحرِ اوقیانوس کو ساٹھ ہزار بار عبور کیا ہے۔
نشست مخصوص کرانے کے لئے اپنے ٹریول ایجنٹ سے
بات چیت کیجئے یا اس پتہ پر پین امریکن سے معلومات حاصل کیجئے۔
کراچی: وکٹوریا روڈ، ٹیلیفون نمبر ۵۰۲۸۱
٭ ٹریڈ مارک پین امریکن ورلڈ ایرویز انکارپوریٹڈ۔
ماہر ہواباز جان میٹس جو ایک
کلپر کپتان ہیں اور جنہوں نے
۵۰۰ سے زیادہ مرتبہ بحرِ اوقیانوس
کو عبور کیا ہے۔
PAA
دُنیا کی سب سے زیادہ تجربہ کار ایرلائن
PAN AMERICAN
PAA 910

ماہِ نو

جلد ۱۰ — شمارہ ۸

نومبر — ۱۹۵۷ء

مدیر:

رفیق خاور

نائب مدیر:

ظفر قریشی

★

سالانہ چندہ

ساڑھے پانچ روپے

فی کاپی — آٹھ آنے

ادارۂ مطبوعات پاکستان

پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

★

اداریہ:	آپس کی باتیں		۶
بہ یادِ لطیفؒ:	سُر سَسّی (چند اقتباسات)	شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ مترجمہ: رفیق خاور	۷
غزل:	جگر مرادآبادی		(مقابل ص ۳۳)
ادب:	اردو کی دو جہادی نظمیں	سعیدہ بانو	۱۰
	مومن کا اندازِ فکر و بیان	حکیم سید محمود رضوی	۱۴
افسانے، ڈرامہ، رپورتاژ	سردار! (افسانہ)	ابوالفضل صدیقی	۱۹
	عتاب (افسانہ)	ابوسعید قریشی	۱۶
	حق بحقدار رسید (ڈرامہ)	کمال احمد رضوی	۲۸
	جہلم کے اس پار (رپورتاژ)	عارف حجازی	۴۱
نظم:	اکیلی بستیاں	محبوب خزاں	۴۵
غزلیات:	سید ضمیر جعفری •	عبداللہ خاور	
	شائستہ بیزار •	احسن علوی	۴۵ ۴۷
مصور فیچر:	چاندی بوئیے، سونا کاٹیے!		۴۹
عوامی گیت	"سسّی" (ملتانی سے)	نور اگر تونسوی	۵۳
	بدلہ: ملغلرے (راز و نیاز)	محمد جی: مترجمہ عاصمہ حسین	۲۷
سرورق:	مسجد اور روضہ شاہ عبداللطیف بھٹائی رح	رنگین عکس: آفتاب	

★

آپس کی باتیں

آزادی کی لگن اُس دور میں بھی ہمارے ساتھ رہی جو ہماری تاریخ کا تاریک ترین دور تھا۔ اس کی آگ ہمارے دلوں میں برابر شعلہ زن رہی۔ اس کا ثبوت دیگر امور کے علاوہ ان ولولہ انگیز جہادی نظموں سے بھی ملتا ہے جو ۱۸۵۷ء کے آشوبِ عظیم سے پہلے لکھی گئیں۔ یہ وہ شعلہ آفریں نظمیں ہیں جنہوں نے تمام برصغیر میں آگ لگادی اور حریت کے شیدائیوں کے سینہ میں یہ جذبہ پیدا کردیا کہ وہ حصولِ آزادی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے میں بھی تامل نہ کریں گے۔ اگر آج ہم ایک آزاد قوم کہلانے پر فخر کناں ہیں تو یہ انہی آتش پاروں کا نتیجہ ہے جو حرارتِ سوزِ دروں سے پیدا ہوئے۔ انہوں نے کاروان کے دل میں احساسِ زیاں کے ساتھ ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچنے کی زبردست لگن بھی پیدا کردی اور اُس راستہ پر ڈال دیا جو اُس تک رسائی کا واحد ذریعہ تھا۔ اسی لئے ہم ان ادبی پاروں کی تہ دل سے قدر کرتے ہیں۔ جہاں کہیں یہ گوہرہائے گرانمایہ ہاتھ آئیں ان کو فراہم کرنا اور سینت سینت کر رکھنا ہمارا قومی فرض ہے۔ اس شمارہ میں "اردو کی دو جہادی نظمیں" کے زیرِ عنوان چند ایسے ہی قلمی نوادر پیش کئے جارہے ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ محض اشرافی قوتوں کی دوبارہ حصولِ اقتدار کی کوشش ہی نہ تھا بلکہ اس میں عوام کے بے لوث جذبۂ آزادی اور شوقِ جہاد کو بھی دخل تھا جو روایت پرستی کی بنا پر ہی سہی اپنے ملک و قوم کو غلبۂ فرنگ سے آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ کچھ عجب نہیں کہ مزید تلاش سے ایسے اور بھی نقوش دستیاب ہوں اور اُس تصویر کو زیادہ جامع بنانے میں مدد دیں جو ہم نے ۵۷ء کے یادگار نمبر (مئی ۱۹۵۷ء) میں پیش کی تھی۔

پچھلے دنوں پاکستان بھر میں عید میلاد جس اہتمام سے منائی گئی وہ پیغمبرِ اسلامؐ سے بے پایاں عقیدت کا ولولہ انگیز مظاہرہ ہے۔ یہ درحقیقت اس سرچشمۂ فیض سے منسلک رہنے کے جذبہ و شوق کا نتیجہ ہے جس نے ہمیں اسلام کی نعمتِ عظمیٰ سے مشرف کیا۔ اس شمارہ میں خانۂ کعبہ کی جو تصویر پیش کی جارہی ہے وہ اسی جذبہ کی آئینہ دار ہے ؎

گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ
ذرۂ آفتابِ تابانیم

وادیٔ مہران (مغربی پاکستان) کا شاعرِ اعظم شاہ بھٹائیؒ پاکستان بھر میں روز افزوں مقبولیت حاصل کر رہا ہے اور ایسا ہونا لازم ہے کیونکہ بھٹائیؒ کی شاعری کے سوتے اس سرچشمہ سے پھوٹتے ہیں جو تمام نوعِ انسان کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ وجدانی احساسات اور بنیادی کیفیات شاہ صاحب نے جو حقائق و بصائر پیش کئے ہیں وہ ہماری زندگی کی ان اقداروں اور تقاضوں سے گہرا تعلق رکھتے ہیں جن سے ہم آئے دن دوچار ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر ہم قارئین کو وقتاً فوقتاً ان کا کلام تبرکاً پیش کرتے رہتے ہیں۔ اس شمارہ میں بھی جس کا سرورق ان کے حالیہ عرس کی مناسبت سے روضۂ شریف کے رنگین عکس سے مزین ہے، ان کے ایک طویل شاہکار "سر سسئی" کی چند جھلکیاں پیش کی جارہی ہیں۔ بھٹائیؒ کو بالعموم ایک صوفی خیال کیا جاتا ہے لیکن انہیں اقبالؒ کی اصطلاح میں بندۂ مومن کہنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ ان کی روحانیت ایک منفی قسم کی روحانیت نہیں، جس کا سروکار تمامتر رموزِ غیب یا کشف و کرامات سے ہو۔ وہ رومیؒ کی طرح فعال روحانیت کے قائل ہیں جس کا دوسرا نام ایمان ہے جو خالص توحید کا لازمی نتیجہ ہے اور جس سے ہماری زندگی میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بار بار زندگی کی حقیقی آزمائشوں کا ذکر کرتے ہیں جن میں ایک اعلیٰ سیرت کا انسان ہی کامیاب ہوسکتا ہے۔ اس طرح شاہ بھٹائیؒ کا روحانی سلسلہ براہِ راست پیغمبرِ اسلامؐ تک پہنچتا ہے، اور ان کی تعلیم بھی انہی کی ایمان افروز تعلیم کا پرتو ہے۔

ماہ نو، کراچی، نومبر ۱۹۵۷ء

بیادِ لطیفؒ:

سُر سسئی

شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ
مترجمہ: رفیق خاور

کافیوں اور وائیوں کے علاوہ بھٹائیؒ کے "رسالو" کا ایک اہم حصہ وہ نظمیں ہیں جن کو وہ "سُر" کے نام سے یاد کرتے ہیں، مثلاً سُر سسئی، سُر ماروی، سُر سوہنی، سُر امین، سُر حسینی وغیرہ۔ ان کا صحیح اندازہ ان کے مطالعہ سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہ سُر درحقیقت راگ کی نہیں اور نہ ان کا راگ سے کوئی نمایاں تعلق ہے۔ شاید بعض سُر مثلاً سُر امین، سُر سورٹھ، سُر کلیان کا تعلق اس نام کے معروف راگوں سے ہو اور ان عنوانوں سے لکھی ہوئی نظمیں ان راگوں میں گائی جاتی ہوں، کیونکہ لطیف دور کی یادگار ہیں جب شاعری اور گائکی آپس میں بالکل گھلی ملی ہوئی تھیں لیکن سُر سسئی یا سُر ماروی میں کوئی ایسا واضح رشتہ نظر نہیں آتا۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ سُر سے مراد لَے یا نظم ہے ؛

جہاں تک نظموں کا تعلق ہے ان کی کیفیت بھی انوکھی ہے۔ وہ نہ تو پوری طرح غنائیہ ہیں نہ ڈرامائی۔ شاعر ان میں براہِ راست اپنے احساسات یا افکار پیش نہیں کرتا، بلکہ جو کچھ کہتا ہے اپنے کرداروں کی زبانی کہتا ہے، ماسوا ان مقامات کے جہاں ڈرامانگار خود کردار بن کر "لطیف چیئی" یا "سید چیئی" کے تحت اس کا پارٹ ادا کرتا ہے اور حالات پر تبصرہ کرتا ہے۔ یا پھر وہ ان کی بپتا یا کتھا کے بعض پہلوؤں کو پیش کرتا ہے۔ گویا نظم کی غنائیت دو طرح کی ہے۔ ایک شاعر کی اپنی کیفیات کی بالواسطہ ترجمانی اور دوسری کرداروں کے احساسات کی ترجمانی انہی کی زبانی۔ براؤننگ کی طرح اس کی شاعری بھی "افتادوں" کی شاعری ہے۔ بنیادی حیثیت سے وہ ایک "درانے سے دراز" ہے۔ ایک عارف جس کو صرف اپنے دھنی (واحد، مالک، قدیم) ہی سے سروکار ہے۔ اور وہ اپنی روح کو زیادہ سے زیادہ قوی بنانے کے لئے حق سے قریب اور غیر حق کی کدورتوں سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ لہٰذا اس کا مطمحِ نظر "روح" کی توانائی ہے۔ اس کے لئے انسان کی زندگی کا سب سے اہم معاملہ اپنی روح کو بے داغ رکھنا ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ توانائی پیدا کرے۔ اس کی بہترین علامت ماروی ہے جو کسی قیمت پر بھی اپنی آن یعنی روحانی وجاہت بلکہ وسیع ترین معنوں میں اپنی خودی کو ان عناصر کے حوالے نہیں کرنا چاہتی جو اس کے منافی ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمیں بے اختیار ایک مغربی مصنف کے یہ الفاظ یاد آتے ہیں کہ "اگر ہم سب کچھ پا لیں لیکن اپنی روح کو کھو بیٹھیں تو ہمیں کیا حاصل ہوگا؟" درحقیقت بھٹائیؒ کی "روح" خودی یا ذات ہی کا دوسرا نام ہے۔ اور اس کو ان تمام تخریبی عناصر سے محفوظ رکھنا جو اس کی نفی کرتے ہیں، اس کا محبوب ترین نصب العین ہے۔ وہ سوہنی کی اس لئے تعریف کرتا ہے کہ اس نے دنیا کی پروا نہ کی، ذاتی آفات و مصائب کی پروا نہ کی، طوفانِ حوادث کی پروا نہ کی، بلکہ اپنے محبوب جس کو ہم عام معنوں میں نصب العین بھی قرار دے سکتے ہیں، کے عشق میں سرشار ہو کر اپنی قوتِ ارادی کا علم بلند کرتے ہوئے تمام انسانی اور قدرتی طوفانوں کے خلاف سینہ سپر ہو گئی۔ سسئی کو صرف اتنا افسوس ہے کہ اس نے ذرہ بھر غفلت کی اور اس کا محبوب اس کے ہاتھوں سے جاتا رہا۔ یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد۔ تاہم وہ برابر اپنے محبوب کی لگن میں محو ہے، اس کی تلاش میں خندہ پیشانی سے ہر قسم کی مصیبتیں سہتی ہے، اس کی نظر ایک بلند مقام پر ہے، وہ ناامید نہیں ہوتی اور اپنی جان تک دینے سے دریغ نہیں کرتی۔ اسی طرح مومل کو بھی افسوس ہے کہ اس نے معمولی لذت کے لئے اپنی روح کی عظمت گنوا دی۔ غرض بھٹائیؒ کا مدعا یہ ہے کہ وہ کبھی اپنی زبان، کبھی خارجاً شاعر کی حیثیت سے اور کبھی کرداروں کی زبانی کسی افتاد کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرے اور ہر رخ، ہر حیثیت سے ایک ہی بنیادی حقیقت ——— روح کا عروج یا زوال ——— واضح کرے۔ وہ روح کی دھوپ چھاؤں، اجالوں، اندھیروں کا شاعر ہے۔ اسی لئے اس کی تکنیک براؤننگ سے ملتی جلتی ہے جس کا عقیدہ یہ تھا کہ "ہر انسان کے لئے بہترین موضوع انسان ہی ہے"۔ اس کے بعض پارے ڈرامائی خود کلامی معلوم ہوتے ہیں، اگرچہ ان میں پلاٹ یا کرداری تجزیہ کا وہ اہتمام نہیں جو براؤننگ میں ہے اور جو اسی کا حصہ ہے ؛

سُر سسئی میں زیادہ تر کلام سسئی ہی کی زبانی ہے یا "لطیف جیتی" کے زیر تحت بھٹائی کی زبانی۔ کہیں کہیں پوری طرح یہ واضح نہیں ہوتا کہ متکلم کون ہے، شاعر یا سسئی۔ پھر بھی ہم ایسے پاروں کو سسئی ہی سے منسوب کرسکتے ہیں۔ شاہ لطیف کے کلام میں کردار اور شاعر کا یوں خلط ملط ہونا بہت عام ہے، اسلئے کہ وہ اپنے کرداروں کے پردہ میں خود ہی بولتے ہیں۔ ان کا سایہ کبھی ان سے پرے نہیں ہوتا، جیسا کہ ابتدائی قسم کی تمثیلوں میں عموماً ہوتا ہے۔ ڈراما نگار خود اسٹیج پر آدھمکتا ہے اور اداکاری کا لباس پرے پھینک کر خود اداکار بن جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنا اور کردار کا معاملہ واحد سمجھتا ہے۔ اس کے لئے ڈرامہ غنائیہ سے دور نہیں۔ پردہ تو محض نام کا ہے لہٰذا بھٹائی کی نظمیں، ڈراما، غنائیہ اور واقعہ نگاری کا ملغوبہ ہیں۔

"افتادوں" کا شاعر ہونے کے معنی یہی ہیں کہ بھٹائی کوئی داستان گو نہیں۔ وہ افسانہ برائے افسانہ کا قائل نہیں۔ اس کی داستانیں ہم پہلے ہی جانتے تھے، صرف وہ کیفیتیں جو کسی افتاد سے التزاماً یا امکاناً پیدا ہوسکتی ہیں، اس کی شاعری کا موضوع ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہ صاحب بنیادی حیثیت سے نہ ڈراما نگار تھے نہ داستان گو، وہ پیغامبر تھے۔ وہ مردِ حق پرست جس کا تمام تر زور روح کی سطوت پر تھا اور جو دھنی کی عبودیت پر بھی اسی لئے زور دیتے تھے کہ انسان کی روح اپنے مرتبۂ عالی کو پہنچ جائے۔ یہ پیغامبر، یہ مردِ خودی پرست ہر وقت اپنے کلام کے پاس رہتا ہے۔ وہ اس میں پوری طرح رچا ہوا ہے۔ بھٹائی کا مسلک صوفیانہ خلوت پسندی اور تجرد نہیں۔ اگر وہ روح کی توانائی پر زور دیتے ہیں تو صرف اس لئے کہ ہم زندگی میں اس کا مصرف پیدا کریں۔ ان کی بہترین ہیروئن سسئی زندگی ہی کی ایک افتاد کا سامنا کرتی ہے۔

سُر سسئی چھیالیس چھوٹے بڑے بندوں پر مشتمل ہے۔

سسئی

(۱)

کیا چیخوں میں، کیا چلاؤں
لوگ کہیں گے دیوانی ہے
اچھا یونہی سہی، کہنے دو
مستانی ہے، مستانی ہے

چیخیں مری دلدوز ہیں پھر کیا
لوگ انہیں سن سن کر آئیں
برا بھلا کہتے ہیں کہہ لیں
ان باتوں پہ شرم دلائیں

اس میں لاج کی بات ہی کیا ہے
بڑھے چلے جاؤں گی برابر
خواہ بدن ہو پارہ پارہ
اپنے پیا پیارے کی رہ پر

(۲)

ضبط کروں کتنا ہی میں
کیسے رہوں بن ماہی میں
غم ہی غم ہے ٹوٹ پڑا
دل پہ مرے دندا رہنا

جا اے آنے والے کل
تیرے سب وعدے چھل بل
ان پہ بھروسہ کیسے کروں
جیون کو ترساتی رہوں
کل تک صبر کروں مشکل
ہائے یہ میرا بیاکل دل
جانی آ، کل تک مل جا
یا مجھے موت کی راہ دکھا
درشن دے یا موت مجھے
ڈھونڈتی ہوں ہر اور تجھے
مان لے مان لے بات مری
مجھ کو دکھا صورت اپنی

سید:

اے دکھیا، اے غم کی ماری
بھول بھی جا یہ غم کی باتیں
چھوڑ دے اپنی سیج سجیلی
دیکھ یہ جلتی بھنتی چٹانیں

ان پہ چل کر ڈھونڈھ نشانی
تینوں راجن کے پاؤں کی
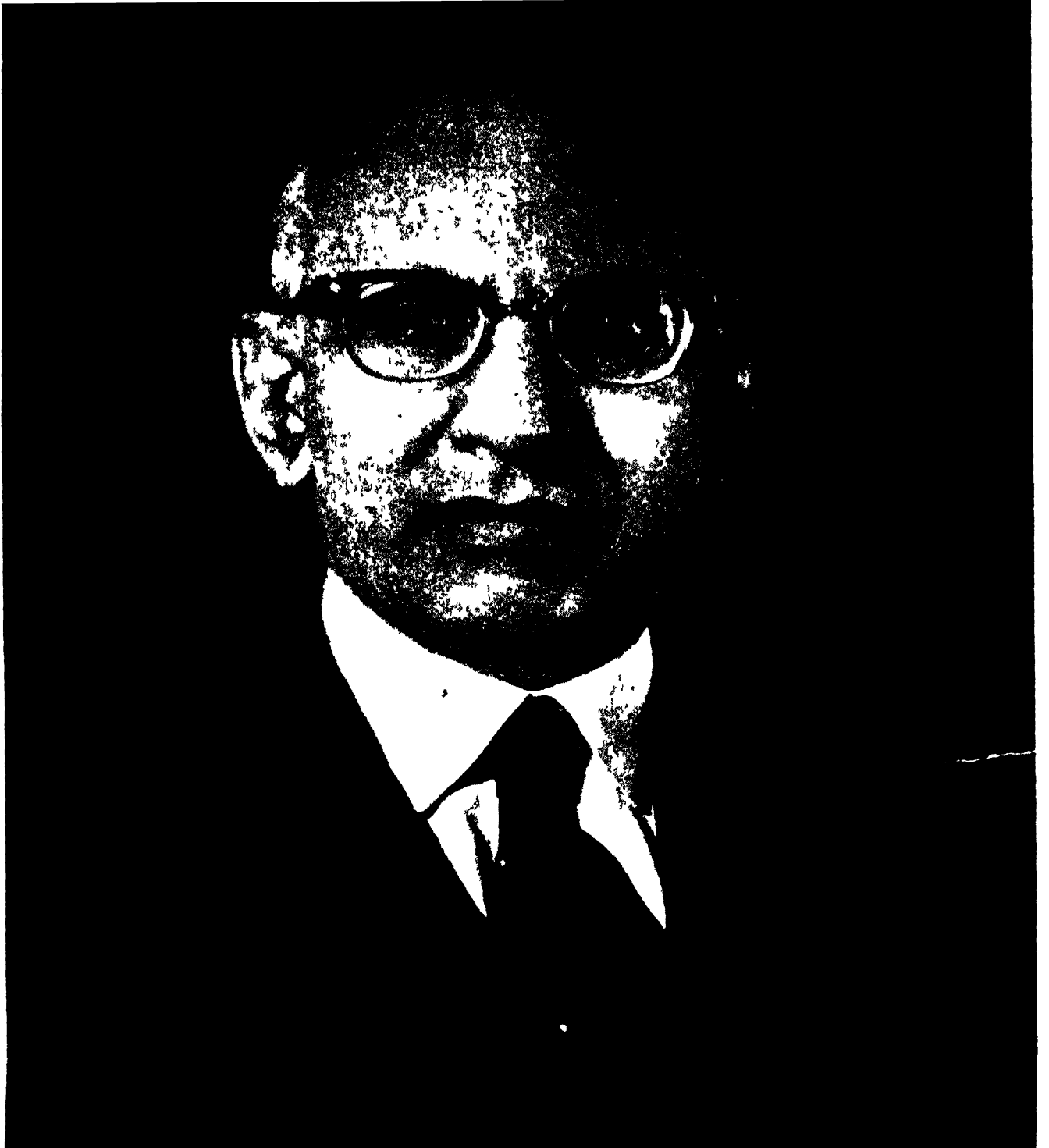
جناب ابراہیم اسماعیل چندریگر، پاکستان کے نئے وزیر اعظم

واحد ٹیکسٹائل ملز کراچی کے سالانہ جلسہ میں صدر جمہوریہ پاکستان، اسکندر مرزا، حاضرین سے خطاب کر رہے ہیں

پاکستان و جاپان کے مابین تجارتی معاہدہ پر دستخط

تعلقات دولت مشترکہ کے برطانوی انڈر سیکرٹری نے پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کے ڈاکیارڈ کراچی کا معائنہ کیا

دیکھو ہرا پ سے اس دکھیا کے
چیخ اٹھی ہے گھاٹی گھاٹی

مرجائے تو جنگل جنگل
سارے ہرن رہ رہ کے پکاریں
ہائے اس دکھیا نے مرکر
دکھیا کیں ہرنوں کی ڈاریں

مرگئے ہم اس کے مرنے سے
اس کی موت نے ہم کو مارا
اس کا دکھ ہم سب کا دکھ ہے
سائیں سائیں کرے بن سارا

اے دکھیاری تیرے کارن
بنجر ہے یہ سب ویرانہ
برکھا برسے دھائیں دھائیں
پھر بھی اُگے کب ایک بھی دانہ

پھل پھلواری دین ہیں اس کی
جو ہے کل جگ کا اَن داتا
ہاتھ اسی کے سامنے پھیلا
مانگیں تو اس سے رزق سدا

(۳)

مسی: خدا کرے کہ کہیں پھر وہ روزگار آئے
کہ یار بچھڑے ہوئے یار کے کنار آئے
چلو چلو، اسی رہ پر چلو کہ دل نہ کہیں
امید باختۂ فصلِ خوشگوار آئے
امید آج اُبھرتی ہے دل میں رہ رہ کر
بچھاؤں راہ میں آنکھیں جو وہ نگار آئے
بچھایا میں نے ہے آنکھوں کو راہِ جاناں میں
خوشا جو اس کا قدم سوئے رہگزار آئے

نہ جانے ان کو گئے آج کتنے جگ بیتے
کبھی تو بھول کے یارب وہ شہسوار آئے
گیا جہاں سے مرا دوست پھر وہیں آئے
پیالہ گھوم کے پھر سوئے بادہ خوار آئے
مری امید بھی اتنی ہے جتنا نام ترا
کمالِ صبر سے ہی روح کو قرار آئے
تسلئ دلِ مایوس ہے ترے دم سے
ترا ہی نام ہے جو لب پہ بار بار آئے
ہے نقش دل پہ جو میرے رضائے مولیٰ کا
مری امید بھی ایسی ہی سازگار آئے
نہ تیرے در سا کوئی در نہ آسرا تجھ سا
ترے حضور ہر اک پیکر نزار آئے
بہت ہی دیکھے ہیں دروازے اور درگاہیں
کہاں سے تجھ سا الٰہی کرم شعار آئے
نہ چھوڑ اپنے کرم سے تو اس کے دامن کو
جو پاس تیرے بہ ایں حال اشکبار آئے
ہر ایک بے کس و تنہا کی تو ہے پشت و پناہ
نہ پاس کیوں ترے جاں بہر زینہار آئے

(۴)

کر آہ و فغاں، کر آہ و فغاں، مت روک زباں، مت روک زباں
اونٹوں کی قطاروں میں کھوئی، بھولیں نہ کہیں تجھ کو سیاں
برکا رئیو ہی بیٹھی ہے کیوں؟
بیٹھی ہے ہات پہ ہات دھرے، کیا طور یہی ہیں پریمی کے؟
جس دل میں لگن ہو پیارے کی، بیٹھا رہے اتنی غفلت سے
ہاں سارے بندھن توڑ بھی دے
ہیں دور وہ تجھ سے بنتوں سے، وابستہ جو بھنبھور سے ہیں
کیا ان سے تیرا لینا ہے، جو دور ترے چت چور سے ہیں
ہے پی کے ہاتھ ترا درماں
ہمسایوں کو معلوم نہیں، دن بن گئی تیری رات حزیں
تو اپنے من میں جانتی ہے، پریتم سے ہے روشن تیری جبیں
تری آن ہے پریتم کے دم سے

اردو کی دو جہادی نظمیں

سعیدہ بانو

دنیا میں ملکیت کے ساتھ لڑائی جھگڑے کا آغاز ہوا۔ ابتدا میں یہ لڑائیاں افراد کے درمیان رہیں۔ بعد میں انہوں نے ترقی کرتے کرتے بین الاقوامی شکلیں اختیار کرلیں۔ شاعری چونکہ راست جذبات کو اکساتی اور بھڑکاتی ہے اس لئے میدانِ جنگ میں شاعروں کی موجودگی بھی ضروری تصوّر کی جانے لگی۔ یہ لوگ رجزیہ اشعار لکھتے اور لڑنے والوں کو بزرگوں کے کارنامے سنا کر جوش دلاتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ بزدل سے بزدل شخص بھی مرنے مارنے کو تیار ہو جاتا۔

علامہ شبلی کا بیان ہے کہ "عربی شاعری کی ابتدا رجز سے ہوئی ہے یعنی میدانِ جنگ میں دو حریف جب مقابلہ کے لئے بڑھتے تھے تو جوش میں فخریہ فقرے زبان سے نکلتے تھے۔ یہ دو چار شعر سے زیادہ نہیں ہوتے تھے لیکن طبل جنگ کا کام دیتے تھے"۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ متذکرہ بالا خصوصیت عرب ہی تک محدود نہیں تھی۔ یونان اور ہندوستان میں بھی شاعر اور بھاٹ میدانِ جنگ پر پرجوش اشعار پڑھ کر اپنی فوج والوں کو ہمت دلاتے اور بعض موقعوں پر شکست کے آثار دیکھ کر اس جوش وخروش سے ہمت دلاتے کہ جنگ کا پانسہ پلٹ جاتا اور شکست فتح میں بدل جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی قبیلہ میں کوئی شاعر پیدا ہوتا تو بڑی خوشیاں منائی جاتیں اور شاعر کی عزت دیوتاؤں کے مانند کی جاتی تھی۔

بدقسمتی سے اردو شاعری نے فارسی شاعری کے آغوش میں پرورش پائی جس کی نشوونما تمام تر درباروں میں ہوئی اس لئے یہ دونوں اس جوش وخروش سے محروم رہیں جو ریگستانی عربی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان میں میدانی دریاؤں کی سی نرم روی اور آہستہ خرامی ہے، پہاڑی چشموں کی سی گھن گرج اور طوفانی جوش نہیں۔

شاہ نامہ فردوسی کے مانند اردو میں کئی جنگ نامے اور جنگوں کے حالات مثنویوں کی شکل میں لکھے گئے لیکن ان میں بھی وہ قوت نہیں جو فردوسی کے رزمیہ اشعار میں ہے۔ اس کا سبب نقالی اور حقیقی سپاہیانہ زندگی سے بُعد ہے کیونکہ ہمارے شاعر گھر میں بیٹھ کر فکرِ سخن کرتے تھے اور عملی طور سے جنگ میں حصہ لینا تو کجا انہوں نے دور سے بھی جنگ کے مناظر نہیں دیکھے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ہماری شاعری میں رزمیے، رجزیے اور جہادیے نہ ہونے کے برابر ہیں البتہ شکووں اور شکایتوں کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔

ہندی مسلمانوں کی تاریخ میں ٹیپو سلطان اور انگریزوں کی جنگیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس دور میں کئی رزمیہ نظمیں لکھی گئی تھیں جو انگلستان اور ہندوستان میں ہونے کے باعث ہماری دسترس سے باہر ہیں۔

اس کے بعد شاہ ولی اللہ اور ان کے متبعین کا دور آیا اور وہ جنگیں ہوئیں جنہیں "وہابی" جنگوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس تحریک سے متعلق کثیر مقدار میں ادب موجود ہے لیکن تقریباً سب کا سب پٹنہ، علی گڈھ، رامپور اور حیدرآباد دکن کے سرکاری اور نجی کتب خانوں میں ہے جس کے بارے میں ہم سوچ تو سکتے ہیں لیکن اس سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت سے کشمکش کی یہ داستان بڑی المناک اور سبق آموز ہے حقیقت یہ ہے کہ انگریز حکمرانوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کی سب سے پہلی عوامی کوششوں کا سہرا انہی سرفروش مجاہدوں کے سر ہے۔

ان جنگوں سے متعلق کئی شاعروں نے نظمیں لکھی ہیں جن میں "نصاریٰ" سے جہاد کرنے، ان کی حکومت کو ختم کرنے اور آزادی حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ بیدین نصاریٰ سے نجات حاصل کرنا تمہارا مذہبی فریضہ ہے۔ ان جہادی نظمیں لکھنے والے شعرا میں سب سے ممتاز

شخصیت حکیم مومن خاں مومن مرحوم کی ہے جن کا جہادیہ ملاحظہ ہو۔

پلا ساقی مجھکو شرابِ طہور
کہ اعضا شکن ہے خمارِ فجور

کوئی جرعہ دے دیں فزا جام کا
کہ آجائے بس نشۂ اسلام کا

برنگِ مے ایماں کو آجائے جوش
نہ اپنا رہے اور نہ دنیا کا ہوش

یہی اب تو کچھ آگیا ہے خیال
کہ گردن کشوں کو کروں پائمال

بہت کوشش و جاں نثاری کروں
کہ شرعِ پیمبر کو جاری کروں

دکھادوں بس انجام الحاد کا
نہ چھوڑوں کہیں نام الحاد کا

نہ کیونکر ہوں اس کام میں بے شکیب
ظہورِ امامِ زماں ہے قریب

وہ خضرِ طریقت رسولِ خدا
کہ جو پیرو اس کا ہے سو پیشوا

وہ نورِ مجسم وہ ظلِ اللہ
کہ سائے سے جن کے خجل مہر و ماہ

زہے سید احمد قبولِ خدا
سرِ امتحانِ رسولِ خدا

نکو گوہری کا نہ پوچھو شرف
علیؓ و حسینؓ و حسنؓ کا خلف

رہے حشر تک زندہ و نیک ذات
ہے کفار کی موت اس کی حیات

خدا نے مجاہد بنایا اسے
سرِ قتلِ کفار لایا اسے

دم اس دستِ بازو پہ دیوے اجل
لبِ تیغ کے بوسے لیوے اجل

جلو میں ہمیشہ رواں ہو ظفر
رکاب اسکی پکڑے رواں ہو ظفر

کہوں کیا لوائے امارت کا اوج
کہ ہیں غوث و ابدال سب اہلِ فوج

خبردار ہو جاؤ اے اہلِ دل
کہ رحمت برستی ہے اب متصل

ہوا مجتمع لشکر اسلام کا
اگر ہوسکے وقت ہے کام کا

ضرور ایسے مجمع میں ہونا شریک
کہ خوش تم سے ہو وحدہٗ لاشریک

جو داخل سپاہِ خدا میں ہوا
فدا جی سے راہِ خدا میں ہوا

حبیبِ حبیبِ خداوند ہے
خداوند اس سے رضامند ہے

امامِ زمانہ کی یاری کرو
خدا کے لئے جاں نثاری کرو

کسی کو نہیں ہے اجل کی خبر
کہ آجائے بیٹھے ہوئے اپنے گھر

تو مقدور کس کا کہ آنے نہ دے
تنِ خستہ سے جاں کو جانے نہ دے

قیامت کو اٹھو تو تم بامراد
لب الحمد سے اور دل شاد شاد

عجب وقت ہے یہ جو ہمت کرو
حیاتِ ابد ہے جو اس دم مرو

جو ہے عمر باقی تو غازی ہو تم
سزاوارِ گردن فرازی ہو تم

یہ ملکِ جہاں ہے تمہارے لئے
نعیمِ جناں ہے تمہارے لئے

شراکت یہاں کی ہے طالع کا اوج
کہ ایسا امام اور ایسی ہے فوج

سعادت ہے جو جانفشانی کرے
یہاں اور وہاں کامرانی کرے

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب　　یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
الٰہی اگرچہ ہوں میں تیرہ کار　　پہ تیرے کرم کا ہوں امیدوار
تو اپنی عنایت سے توفیق دے　　عروجِ شہید اور صدیق دے
کرم کر نکال اب یہاں سے مجھے　　ملا دے امامِ زماں سے مجھے
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں　　مری جاں فدا ہو تری راہ میں
میں گنجِ شہیداں میں مسرور ہوں　　اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں

اس قسم کی نظموں اور وہابی تحریک کے مبلغوں نے سوئے ہوئے مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف بیدار کر دیا اور بدیسی حکمرانوں کو نکال باہر کرنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ جن راجاؤں اور نوابوں کو ان کی حکومتوں سے محروم کر کے انگریزوں نے اپنی شاطرانہ چالوں سے ان کے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا وہ تو بیزار تھے ہی، عوام بھی عیسائی پادریوں کی چیرہ دستیوں اور "کمپنی بہادر" کی بیجا حمایت نیز معاشی استحصال اور عام بیروزگاری کے باعث بے چین تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح بھی بدیسی حکومت کا خاتمہ ہو جائے۔ چنانچہ ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک برصغیر میں متعدد مقامی شورشیں ہوئیں جنہیں بڑی سختی سے کچلا گیا۔ لیکن چونکہ وہابی تحریک مقامی تحریک نہیں تھی اس لئے اس کے مبلغوں نے شمال ہی نہیں دکن میں بھی جا کر ایک ایک گاؤں میں نصاریٰ کے خلاف جذبہ پیدا کر دیا۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جب نصاریٰ اور نصاریٰ کی حکومت کے خلاف جنگ شروع ہوئی تو یہ نہ صرف نوابوں اور راجاؤں کی جنگ تھی بلکہ ایک عوامی جنگ بھی تھی جس میں سپاہیوں نے بھی حصہ لیا تھا اور کسانوں نے بھی، علماء اور پنڈتوں نے بھی حصہ لیا تھا اور عام شہریوں نے بھی۔

افسوس اس زمانہ میں مسلمانوں اور ہندوؤں نے جو کتابیں لکھی تھیں ان میں سے انگریزی حکومت کے خلاف کتابیں تقریباً تمام کی تمام تلف ہو چکی ہیں البتہ انگریزوں کی حمایت میں جو کچھ لکھا اور لکھوایا گیا بکثرت موجود ہے جس کے باعث تصویر کا صرف ایک ہی رخ نظروں کے سامنے آتا ہے۔ میرا اندازہ ہے اور بڑے بوڑھوں سے سنا بھی یہی ہے کہ اس زمانہ میں بہت سے "جنگی اشعار" لکھے گئے تھے جو انگریزوں کی فتح کے بعد بمشکل کسی کی زبان سے سنے گئے۔ اگر کوئی سناتا بھی تو بہت احتیاط سے، ادھر ادھر دیکھ کر۔ چند "اشعار" یا نعرے ملاحظہ ہوں۔ یہ میں نے بچپن میں سنے تھے:

ایک دو تین
گھوڑے پہ زین
بھاگ جاؤ وارن ہیسٹین　　(وارن ہیسٹنگز)
لبالب پیالہ بھرا خون سے
فرنگی کو مارا بڑی دھوم سے

ان اشعار میں آپ فنی خوبیاں نہ تلاش کیجئے بلکہ کہنے والوں کے جذبہ کو دیکھئے کیونکہ ان کے کہنے والے پرجوش سپاہی تھے شاعر نہ تھے۔

اسی سلسلہ میں ایک اور جہادیہ نظم پیش کی جاتی ہے۔ یہ مولوی لیاقت اللہ الٰہ آبادی کی ہے جو الٰہ آباد میں مدرس اور ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جہاد کے پرجوش مبلغ تھے۔ "تاریخ محاربۂ عظیم" کا مؤلف کنہیا لال لکھتا ہے کہ موصوف الٰہ آباد میں جگہ جگہ وعظ کرتے پھرتے تھے اور انہوں نے وہاں کے باشندوں میں نصاریٰ کی حکومت کے خلاف انتہائی جوش پیدا کر دیا تھا۔ یہ نظم صرف سنائی ہی نہیں جاتی تھی بلکہ جگہ جگہ دیواروں پر چسپاں بھی کر دی گئی تھی۔ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ کھڑے ہو کر اسے پڑھتے اور "دین۔ دین" کے نعرے لگاتے ہوئے آزادی کی راہ میں لڑنے کے لئے تیار ہو جاتے۔ اس جہادیہ میں قرآن و حدیث کے ذریعہ جہاد کی تلقین کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ "اب وقت آگیا ہے کہ ہماری بات سنو اور تلوار کو بڑھ کر مارو"۔

بہرحال یہ جہادیہ ملاحظہ ہو:—

بعد تحمیدِ خدا نعت رسولِ اکرم
یہ رسالہ ہے جہاد یہ کہ لکھتا ہے قلم

واسطے دین کے لڑتا نہ پئے ملکِ بلاد
اہلِ اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد

ہے جو قرآن و احادیث میں خوبیٔ جہاد
ہم بیاں کرتے ہیں تھوڑا سا اسے کر لو یاد

فرض ہے تم پہ مسلمانو جہادِ کفار
اس کا سامان کرو جلد اگر ہو دیندار

جس کے پیروں پہ پڑی گردِ صفِ جنگِ جہاد
وہ جہنم سے بچا' نار سے وہ ہے آزاد

جو مسلمان رہِ حق میں لڑا لحظہ بھر
روضۂ خلدِ بریں ہو گیا واجب اس پر

اے برادر تو حدیثِ نبوی کو سن لے
باغِ فردوس ہے تلوار کے سائے کے تلے

دل سے اس راہ میں پیسا کوئی دیویگا اگر
سات سو اس کو خدا دیوے گا روزِ محشر

زر بھی گر خرچ کیا اور لگائی تلوار
پھر تو دیوے گا خدا اس کے عوض سات ہزار

جو کہ مال اپنے سے غازی کو بنا دے اسباب
اس کو بھی مثلِ مجاہد کے خدا دیگا ثواب

جو نہ خود جا دے لڑائی میں نہ خرچے کچھ مال
اس پہ ڈالے گا خدا بیشتر از مرگ وبال

جو رہِ حق میں ہوئے ٹکڑے نہیں مرتے ہیں
بلکہ وہ جیتے ہیں جنت میں خوشی کرتے ہیں

مدت العمر کے مٹتے ہیں گناہِ شہدا
کیوں نہ ہو جنگ میں کٹواتے ہیں سر بہرِ خدا

فتنۂ قبر و غمِ صور و قیامِ محشر
ایسے صدموں سے شہیدوں کو نہیں ہے کچھ ڈر

حق تعالیٰ کو مجاہد وہ بہت بھاتے ہیں
مثلِ دیوار جو صف باندھ کے جم جاتے ہیں

اے مسلمانو! سنی تم نے جو خوبیٔ جہاد
چلو اب رن کی طرف مت کرو گھر بار کو یاد

مال و اولاد کی اور گھر کی محبت چھوڑو
راہِ مولا میں خوشی ہو کے شتابی دوڑو

گھر پھرے جیتے تو گھر بار میں پھر آؤ گے
اور گئے مارے تو جنت کو چلے جاؤ گے

دین اسلام بہت سست ہوا جاتا ہے
غلبۂ کفر سے اسلام مٹا جاتا ہے

زورِ شمشیر سے غالب رہا اسلام مدام
سستی اگلے جو کبھی کرتے تو ہوتا گمنام

کب تلک گھر میں پڑے جوتیاں چٹکاؤ گے
اپنی سستی کا جز افسوس نہ پھل پاؤ گے

اب تو غیرت کرو نامردی کو چھوڑو یارو
لو چل چل کے امام اپنے سے کافر مارو

بارہ سو برس کے بعد آئی یہ دولت آگے
حیف اس دولتِ بیدار سے مومن بھاگے

یعنی اسباب لڑائی کا جو کچھ تھا درکار
سب دیا تونے ہمیں اور کیا سردار

بات ہم کام کی کہتے ہیں سنو تم یارو
وقت آیا ہے کہ تلوار کو بڑھ کر مارو

○

مومن کا اندازِ فکر و بیان

سید محمود رضوی

ہبوطِ آدم سے لے کر اس وقت تک انسانی ذہانتیں حقیقتوں کی مضبوط اساس کو متزلزل نہیں کر سکیں۔ ارسطو کا فلسفہ ہو یا امام غزالی کا علم الکلام یا ابن سینا کی حکمت آمیز کاوشیں، امراء القیس کی جذباتی شاعری ہو یا رودکی کا شباب انگیز کلام۔ زندگی کے ہر ہر گام پر انداز بیاں بدلتے رہے ہیں لیکن حقیقتیں اپنے مقام پر جوں کی توں قائم و دائم ہیں۔ شاعری زندگی کے کسی دور میں بھی حقیقت تسلیم نہیں کی جاتی رہی بلکہ علماء فصاحت و بلاغت اسے اظہارِ حقیقت کا ایک وہبی ذریعہ سمجھتے رہے ہیں، الفاظ کے ذریعے افکار اور تخیلات کی شیرازہ بندی کا نام شاعری ہے یا ژرف بین نظروں سے انسان کے قلب و ضمیر میں جھانک کر احساسات، جذبات اور خواہشات عواطف و امیال کی کیفیات کو خطوط و حروف کا پابند بنا دینا ہی مقصود ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اصول جو حقیقتوں کے اظہار کے لئے علمائے عصر مقرر کرتے رہے ہیں اُن میں ضروریات ادب و شعر کے لحاظ سے اختلافات ہوتے رہے ہیں مگر یہ نہیں ہو سکا کہ حقائق کی نوعیتیں مختلف ہو گئی ہوں۔ یا پسند و عدم پسند کے پندار بہ جبر کسی کے دل و دماغ میں ٹھونسے جا سکے ہوں۔ انہی محسوسات کو اصول تنقید کے لئے مختلف اصطلاحات کا نام دے کر علم تنقید عالم وجود میں آیا۔ یہ امکانات اظہار حقیقت کے لئے کیونکر تخلیق ہوئے اور ان میں تحریف اور ترمیم کیوں ہوتی رہی۔ تو ایک صاحب بصیرت انسان اس کا یہی جواب دے سکتا ہے کہ مشاہدات اور کیفیات ایک مخصوص ماحول کی منت پذیر ہوتی ہیں، انسانی ذہانتیں جو ماحول کی گرم و سرد آغوش میں تربیت پاتی ہیں اُس پر خارجی اثرات نہیں ہوا کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری کو جزو پیغمبری سمجھا گیا ہے اور شاعر کی دماغی صلاحیتوں کو مادی تربیتوں سے کہیں ارفع و اعلیٰ ماننے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ ثابت ہوا شاعر اکتساب و تحصیل کی ضروریات سے بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ تمام صلاحیتیں عالم لاہوت سے لے کر اس کائنات ارضی پر آتا ہے۔

اس مختصر مقالے میں مجھے مومن کی شاعری پر ایک ناقدانہ نظر ڈالنا ہے۔ حکیم مومن خاں مومن ایک معزز خاندانِ اطباء کا فرد تھا۔ اس خاندان کی طبی عظمتیں سلطنت مغلیہ کے درباروں کی زینت تھیں۔ یہ خاندان جہاں دنیا بھر کی فضیلتوں کا مجموعہ تھا وہاں فکرِ معاش سے بھی بے نیاز تھا اور دنیا بھر کی فراغتیں اور آسائشیں بھی اس کو میسر تھیں۔ مومن نے ایسے ہی صحت مند اور علمی خاندان میں آنکھ کھولی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایک فاضل علوم عربی و فارسی ہونے کے علاوہ حاذق طبیب بھی تھا۔ نیز وہ طبعاً خوددار، غیور اور بلند فطرت انسان بھی تھا۔ گو سلطنت مغلیہ کی بجھتی ہوئی شمع اُس کے لئے پریشان کن ضرور تھی مگر بلند ہمتی ایک فطری جذبہ ہوتا ہے اور مومن بھی اس سے عاری نہ تھا۔ بہادر شاہ ظفر نام کو بادشاہ تھا۔ قلعہ کی چہار دیواری تک حکومت باقی رہ گئی تھی۔ دلی کے بڑے بڑے ساہوکاروں کا مقروض ہو چکا تھا۔ ایسے حالات میں مومن کی رفیع نظریں بھلا اپنے ذوق کا سامان کہاں پا سکتی تھیں۔

چونکہ مومن ایک صاحب ثروت و متموّل خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور وہ تمام تعیش انگیز اسبابِ عیش و تنعم مہیّا تھے جو اس وقت کے کھاتے پیتے خوش ذوق امراء کی زندگی میں دخیل ہو چکے تھے۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ گام گام پر اُس نے مادّی عشق کی لذتیں بھی چکھیں اور حسن کے عشوۂ ترکانہ سے دل کو ہمیشہ مجروح پایا۔ اس کے حسن و عشق کے چرچے دلّی کے گلی کوچوں میں موضوعِ سخن بن چکے تھے۔ اور یہی انفعالی تاثرات اُس کی شاعری میں بھی روح کر بلاغت کی جان بن گئے۔ یہ صحیح ہے کہ مومن کا بیشتر کلام گہری فکر اور دقتِ خیال سے لبریز نہیں، لیکن اس کے باوجود اُس کا مقام ہم عصر شعراء میں سب سے بلند نظر آتا ہے مومن کا گوہر بار قلم شاعری کے تمام اصناف پر حاوی رہا جن میں قصیدے تھے مثنویاں تھیں معمّے تھے تاریخیں تھیں رباعیات تھیں مگر اِن سب پر رنگِ تغزل کی گل کاریاں نمایاں نظر آتی ہیں وہ طبعاً ایک غزل گو شاعر تھا۔ اس نے جہاں حسن و عشق کی واردات غزل کی زبان میں کہیں اُس میں کسی قسم کے ثقیل ترکیب، ابہام اور مغلق جذبات و اظہار کا دخل نہیں اور نہ اُس نے اپنے محبوب کے لئے حقیقت کا لباس تجویز کرنے کا زاری راستہ اختیار کیا۔ اُس نے اس کائناتِ ارضی میں شاہدِ مجاز کو لباس مجازہی میں دیکھا اور جو عناصر ترکیبی ایک انسان کے لئے ہو سکتے ہیں اُن کو بھی ویسا ہی سمجھا۔ یہی وجہ ہے اس کے اشعار نے اُس کی قلبی وارداتوں کو روایتی تصوف کا سہارا لے کر حسن و عشق کے ساتھ کوئی مذاق نہیں کیا۔

اس کے کلام کے معجزانہ ایجازِ بیان اور استعارے ہر صاحبِ ذوق و نظر کو دعوتِ مطالعہ دیتے ہیں جن سے مومن کی انفرادیت الگ جھلکتی نظر آتی ہے۔ مومن کا کلام دیکھئے کہ اس نے کہاں تک دنیا بھر کی عظمتیں سمیٹ کر شعر کے لباس میں رکھ دیں۔ چند متفرق شعر پیش ہیں:۔

اہل بازارِ محبت کا بھی کیا سودا ہے — عشرتِ عمر ابد قیمتِ غم دیتے ہیں
دیتے تکلیف شبِ ہجر میں آ اپنے پاس — نقدِ جاں پیش کشِ مرگ کے قابل نہ ہوا
شعلۂ دل کو ناز تابش ہے — اپنا جلوہ ذرا دکھا دینا
یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا — میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا
اربابِ ہوس ہار کے بھی جان پہ کھیلے — کم طالعیٔ عاشقِ جانباز تو دیکھو
سرشکِ اعتراضِ عجز نے الماس ریزی کی — جگر صد پارہ ہے اندیشۂ خوں گشتہ طاقت کا

آپ نے غور کیا ہوگا کہ ان اشعار میں بیدل و عرفی کے تتبع میں فارسی تراکیب کو کس بے تکلفانہ انداز سے استعمال کیا گیا ہے اور ہر شعر کا حسن بڑھ گیا ہے۔ بلکہ ان کی وجدانی اثرانگیزی اور ندرت پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑا۔ ایک معصوم اور نوجوان دل میں ارتقاءِ عشق اور سوز و سازِ ہجر اور نیازِ محبت کی کیفیتیں کس مجنونانہ انداز میں انگڑائیاں لیتی ہیں اس کو ایک وہبی شاعر ہی محسوس کر سکتا ہے۔ والہانہ خود فراموشی اور شوق و جذب کی لامحدود وسعتیں بیان کرنا صرف اور صرف مومن ہی کا حصہ ہے۔ اور پھر کتنے سادہ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ چند متفرق اشعار ملاحظہ ہوں:۔

وہ حالِ زار ہے میرا کہ گاہ غیر سے بھی — تمہارے سامنے یہ ماجرا بیاں نہ ہوا
دیدۂ حیراں نے تماشہ کیا — دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا
سحر تک شام سے کچھ بن ہی حالت رکھی دل نے — نہ مجھ کو چین دیتا تھا نہ آپ آرام لیتا تھا
سینہ پہ ہاتھ دھرتے ہی کچھ دم پہ بن گئی — لو جان کا عذاب ہوا دل کو تھامنا
کیا مخل ہوں اب علاجِ بے قراری کیا کروں — دھر دیا ہاتھ اس نے جب دل پر تو دل دھڑکا کیا
جانے دے چارہ گر شبِ ہجراں میں مت بلا — وہ کیوں شریک ہو مرے حالِ تباہ میں
کہاں ہے تابِ نازِ برق اے کاش — جلا دے آتشِ گل آشیاں کو
شب رہے تجھ بن نہ بس بے چین و بے آرام ہم — صبح تک رو دیا کئے لے لے کے تیرا نام ہم
نارسائی سے دم رکے تو رکے — میں کسی سے خفا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

اب تک میں نے مومن کا جو کلام پیش کیا ہے، وہ غزلیات کے اشعار ہیں۔ لیکن جہاں اس نے دیگر اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان میں بھی غزل کا رنگ ہی نمایاں ہے۔ قصیدے کے چند اشعار ہیں:

تم اور حسرتِ ناز آہ کیا علاج کروں — میں نیم جاں نہ رہا امتحان کے قابل
چلا ہی جاتا ہوں میں گو چلا نہیں جاتا — غضب ہے شوقِ رسائی و دوریٔ منزل
خدا سے ڈر بتِ بیدرد ہے یہ کیا انصاف — کہ تو جفا سے نہ ہو اور وفا سے ہوں میں خجل
وہ تند خو کہ اگر جور سے پشیماں ہو — تو بہرِ عذر کہے نازہائے تاب گسل

بدگمانی نے دعا سے بھی رکھا محروم آہ — رازِ دل غیر سے کس طرح میں کرتا اظہار

(باقی صفحہ ۴۷ پر)

ماہِ نو، کراچی، نومبر ۱۹۵۷ء

افسانہ:

عتّاب

ابوسعید قریشی

اس کا نام لونگینہ تھا۔ تھا تو نہیں لیکن اس کے بدن سے، اس کے سانس سے، جہاں سے وہ گذری ہو وہاں کی ہوا سے، اس مٹی سے جو اس کے پاؤں سے چھوتی ہو لونگوں کی سی خوشبو آیا کرتی تھی۔ اسی لئے وہ لونگینہ کے نام سے مشہور ہو گئی تھی۔ خود اس کو بھی اپنا یہی نام یاد رہ گیا تھا۔
اور یہ لونگینہ کی ہر بات نرالی تھی۔ اس کے قبیلے کے لوگ، مرد عورتیں سبھی، پانی کے بجائے بھی شراب پیتے تھے۔ لیکن لونگینہ شراب کے نام پر بھی ناک بند کر لیتی تھی۔ وہ کہا کرتی کہ اگر آدمی کو انگور کا عرق ہی پینا ہے تو اسے مٹکوں اور مشکیزوں میں بند کر کے اس میں تعفن پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ قبیلے کے بڈھے اس سوال کا یہی جواب دے سکے تھے کہ یوں نہ کیا جائے تو نشہ کیسے ہو! لیکن لونگینہ کی آنکھوں میں، بن پیے شراب کی سی مستی، اور چال میں رقص کی سی کیفیت کہاں سے آ گئی تھی، یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

اُس کی بہت سی باتیں ان کی سمجھ سے باہر تھیں۔ مثلاً وہ ہر روز نہاتی کیوں تھی؟ اُن کے جسم تو ان گنت ندیوں اور چشموں کے باوجود برسوں پانی کے لمس سے نا آشنا رہتے تھے مگر لونگینہ — جب آس پاس کی پہاڑیاں برف سے ڈھنپ جاتیں اُن دنوں بھی، اور ندیوں کی سطح پر جب برف کی ہوائیاں تیرنے لگتیں اُس زمانے میں بھی، کئی بار سنگ مرمر کی چٹانوں کے پاس غوطہ لگاتے دیکھی گئی تھی قبیلے کے ایک شاعر نے اسے ندی میں نہاتے دیکھ کر کہا تھا کہ سنگِ مرمر کی چٹان موجوں کی حدت سے پگھل کر لہروں کی باہوں میں بہہ کر عورت کے قالب میں ڈھل گئی ہے۔

یہ بات بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ اپنی قوم کے سب سے متمول سردار کی چہیتی بیٹی ہونے کے باوجود لونگینہ کوڑیوں کی ٹوپی کیوں نہیں پہنتی تھی۔ حالانکہ کوڑیوں کی تعداد تو ان کے ہاں عزت اور آبرو کی علامت تھی۔ اس کو اس بات کی بھی پروا نہیں تھی کہ اس سادگی سے شادی کی منڈی میں میری قیمت گر جائے گی۔ کوڑیوں کی ٹوپی پہننے کے بجائے وہ اپنے بالوں میں پھول گوندھے پھرتی۔ آج گلاب ہے تو کل بنفشہ اور پرسوں جوڑے میں کنول کی جوت جگمگا رہی ہے۔

"عجیب لڑکی ہے!" لوگ کہا کرتے۔

وہ ہر اعتبار سے عجیب تھی۔ مرغِ زریں کی طرح وہ چاندنی راتوں میں باہر نکل کر گھومتی۔ اسے جنگلی جانوروں کا بھی ڈر نہیں تھا۔ ریچھ اور چیتے بستی کے بڈھے گوالے کا کہنا تھا کہ لونگینہ کی آنکھوں سے چیتا بھی آنکھ نہیں ملا سکتا۔ میں نے کالے چیتے کو اس کے قدموں میں پالتو بلی کی طرح لوٹتے دیکھا ہے۔ لڑکی نہیں ساحرہ ہے! وہ سچ مچ عجیب تھی۔ ہرنوں کی طرح، جن کی ناف میں مشک ہوتا ہے، ہوا کے الہڑ جھونکوں، آوارہ بادلوں اور ندی کی چنچل موجوں کی مانند اس کو قرار نہیں تھا۔

سرما کی یخ بستہ راتوں اور برّاق دنوں میں لونگینہ برف پوش ڈھلوانوں پر چلتی چلی جاتی۔ دیکھنے والے کے سامنے شعلہ سا لپکتا، تارا سا ٹوٹتا، بجلی سی چمکتی اور وہ اس فراز سے اس نشیب اور اس وادی سے اس چوٹی پر پہونچ جاتی اور کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا کہ وہ بھی کسی بلند پہاڑ کی چوٹی تھی جس تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں۔

اس کی ہر بات ناقابلِ فہم تھی۔ اس کی ہمسن قبیلے کی دوسری نوجوان لڑکیاں جب آپس میں کپکپی پیدا کرنے والی کہانیاں کہتیں۔ کبھی اس گبھرو کو دیکھ کر مدہوش ہو جاتیں اور تاکستانوں کے سایوں سے سرشار ہو کر نکلتیں۔ تو لونگینہ کے جوڑے سے پھولوں کی فقط چند پتیاں، زرِ گل کے چند ذرے گرتے اور جیسے ان سرگوشیوں اور دزدیدہ مسکراہٹوں کا انجام دکھانے کے لئے وہ انگلی سے آن

بچوں کی طرف اشارہ کرتی جو کیچڑ کے کیڑوں کی طرح ادھر ادھر رینگ رہے ہوتے جن میں بعض اوقات ان کی مائیں بھی تمیز نہ کر سکتیں، ان کے چہرے لکڑی کے مجسموں کے چہروں کی طرح بالکل ایک سے نظر آتے، جن سے قوم کے قبرستان پٹے پڑے تھے۔ یہ بچے دراصل پورے قبیلے کی اولاد ہوتے جس کے رسم و رواج کے مطابق ان لوگوں کو بھی ہجر و فراق کی اذیتوں اور عنفوان شباب کی ظلم کا احساس نہیں ہوتا تھا جن کے پاس بیویاں خریدنے کے لیے کوڑیاں، مویشی یا زمین نہیں ہوتی تھی۔ اس بارے میں ان کے یہاں ایک ضرب المثل تھی کہ بھوک اور پیاس میں آدمی چوری بھی تو کرتا ہے ÷

لونگینہ، بادلوں میں چمکنے والی بجلی، زمین کو ہلا دینے والے بھونچالوں اور چاند اور سورج کے گہنا جانے کی طرح پراسرار تھی۔ اس کا نام سن کر، اس کو دیکھ کر نوجوانوں کا رواں رواں ہانپنے لگتا۔ اس کی خاطر آس پاس کی وادیوں کے بڈھے بڈھے سردار بھی کیا کچھ دینے کو تیار نہیں تھے۔ سنہری سیبوں کے پیڑ، مشکیزے، دودھ دینے والی گائیں، بادلوں سے نرم اور برف کے گالوں سے سفید اون والی بھیڑیں، دنبے۔ جن کی چکتیاں چھوٹی چھوٹی گاڑیوں پر رکھنا پڑتیں، اور کوڑیوں کے ہار .... لیکن لونگینہ نے ہر گاہک کو یہ کہہ کر ہانک دیا تھا کہ میں بھیڑ بکری نہیں ہوں کہ مجھے خریدا جا سکے۔ اس پر کسی نے کہا تھا کہ اس کو بیاہنے تو کوئی دیوتا ہی آئے گا۔ یہ تو گش استری ہے!

اُس دن لونگینہ کو یہ الفاظ اچانک یاد آ گئے۔

متواتر تین دن سے شراب پانی کی طرح بہہ رہی تھی، بکروں کے چکنے گوشت کی سوندھی سوندھی خوشبو بنفشہ اور گلاب کی خوشبو میں ملی ہوئی تھی تاکستانوں کے سایوں میں حشر بپا تھا روایات کے مطابق جشن بہار کی خوشی میں رہی سہی پابندیاں بھی اُٹھ چکی تھیں۔

ناچتے گاتے اور پیتے ان کو تین دن بیت چکے تھے۔ اور گلوں کو چراگاہوں کی جانب بھیجنے کی تقریب میں آدمی بھی ریوڑ بن گئے تھے۔ رقص کی تیسری رات کے بعد صبح ہوتے ہی گڈریوں کو اپنی منزل کی طرف کوچ کرنا ہوتا۔ سفر کی صعوبتوں اور خطروں کے باوجود یہ سفر ہر سال اختیار کیا جاتا۔ تاکہ اپنے یہاں کا چارا سردیوں کے لئے محفوظ رہے، ریوڑ پیٹ بھر کے کھائیں، چکتیاں بھاری ہوں گوشت چکنا اور اون نرم۔ اور برفوں کے زمانے میں چربی، گوشت، مشکیزوں، پوستین اور جوتوں کی قلت نہ ہو۔ چنانچہ آس پاس کی وادیوں سے تندرست اور نوجوان گڈریے اپنے ریوڑوں کو لے کر لونگینہ کے قبیلے کی وادی میں جمع ہو جاتے۔ یہ وادی علاقے کی تمام وادیوں کا سنگم تھی۔ یہیں سے آگے چراگاہوں کو راستے جاتے تھے۔ گڈریوں کی تعداد جانوروں کی گنتی پر منحصر ہوتی اور قرعہ اندازی کے ذریعے ان کا ایک سردار مقرر کر دیا جاتا ———— رقص کی آخری شب جشن اپنے عروج پر ہوتا۔ رگوں میں شراب کی گردش تیز تر ہو جاتی۔ خون میں ایاغ روشن ہوتے اور اپنے پرائے کی تمیز سرے سے مٹ جاتی۔ اسی بدمستی کے عالم میں گش کے مندر سے ناقوس کی آواز آتی اور صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی ریوڑ کے رکھوالوں کی ٹولی گش کے سامنے اپنی مہم کی کامیابی کے لئے دعا مانگنے کے بعد اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاتی۔

لیکن لونگینہ اس ہاؤ ہو میں کبھی شریک نہیں ہوتی تھی۔ اس کی ہر بات نرالی تھی۔ وہ گش کے مندر سے ذرا ہٹ کر کھڑی حقارت سے اس ہجوم کو دیکھا کرتی جو جشن میں تو بالکل ہی دیوانہ ہو جاتا تھا۔ اور سوچتی کہ ان نوجوانوں میں، جن سے ریوڑ کی بدبو آتی ہے، آخر کیا بات ہے کہ لڑکیاں خود کو ان کے سپرد کرنا اپنی خوش قسمتی تصور کرتی ہیں! ایسے ہی موقع پر کسی نے کہا تھا کہ لونگینہ کا تو دماغ خراب ہے کہ آدمیوں کو ریوڑ بتاتی تھی۔ اس کو بیاہنے تو کوئی دیوتا ہی آئے گا۔

اُس روز جب جشن کی تیسری رات ختم ہو چکی تھی۔ اور گلہ بان، گش کے معبد سے دعائیں مانگ کر نکل رہے تھے، لونگینہ کو اپنے بارے میں ان کی یہ پھبتی یکایک یاد آ گئی۔ لونگینہ کی نگاہیں اس سے یوں چمٹ گئیں جیسے بھیڑوں کے تھنوں سے ان کے بچے چمٹ جاتے تھے۔ نوجوان کے بال اُن پہاڑی بکروں کی طرح نہیں تھے جن سے باقی گڈریوں کی شکل ملتی تھی اور جن کو دیکھ کر لونگینہ کے کانوں کی لویں سرخ ہو جایا کرتی تھیں۔ عجب بدتمیز جانور تھے یہ پہاڑی بکرے۔ بدبودار جٹے ہوئے، چکنے بال۔ داڑھیاں جیسے ... لیکن اُس نوجوان کے بال صاف ستھرے چمکیلے اور کٹے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں روشن تھیں اور ان کے نیچے وہ حلقے نہیں تھے، گیلی مٹی پر کنچوؤں کے

نشان بھی تھے جو کافروں کی وادی میں ہر کسی کی آنکھوں کے نیچے نظر آتے تھے۔ اس کے کپڑوں پر شراب اور قے کے داغ بھی نہیں تھے، جن سے گذشتہ تین راتوں میں کوئی دامن نہیں بچا تھا۔ اس کے چہرے کی جلد اوروں کی طرح زرد اور پیلی نہیں تھی بلکہ دف پر منڈھی ہوئی کھال کی طرح کھنچی ہوئی تھی۔ اس کی گردن کسی تندرست بیل کی طرح تھی اور ہونٹ جمے ہوئے تھے۔ کمر میں خنجر تھا، ہاتھ میں بھالا — اس کو دیکھ کر لونگینہ کو خیال آیا جیسے واقعی کوئی دیوتا زمین پر اتر آیا تھا۔ اور اس کو پھر وہ الفاظ یاد آگئے۔ وہ پھبتی پھر اس کے کانوں میں گونج آئی کہ اسے بیاہنے تو کوئی دیوتا ہی آئے گا۔ یہ تو کُش استری ہے!

لونگینہ کی انگلیاں، نرگس کی پنیوں کو، جو کچھ دنوں سے اس کا محبوب پھول تھا، نوچتی نظر آئیں۔ اور اس کی پلکیں جھپکنا بھول گئیں — تماشائیوں نے دم سادھ لیا۔

خود کو نظروں میں گھرا ہوا دیکھ کر نوجوان چونکا اور نیزے پر اس کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ اس کی نگاہیں ہجوم سے ہوتی ہوئی لونگینہ پر پڑیں۔ ان میں تیر کی تیزی تھی، آبشار کا دباؤ تھا، تلوار کی کاٹ تھی — لونگینہ لرزہ براندام ہوگئی۔ ہونٹ کھلے اور کپکپائے۔ اس نے ایک اچٹتا ہوا سانس لیا۔ اور اس کی آنکھیں جنہوں نے کبھی کسی کو جی بھر کے اپنی طرف دیکھنے بھی نہیں دیا تھا۔ اور تمسخر، استہزا یا ہنسا ہٹ کے سوا جن میں اور کوئی جذبہ نظر نہیں آیا تھا۔ اور جنہیں رونا نہیں آتا تھا شبنم آلود ہوگئیں۔ اس کی انگلیاں عشق پیچاں کی طرح آپس میں لپٹی نظر آئیں اور اس کا سراپا سپردگی کی صدا بن گیا — مگر نوجوان نے منہ پھیر لیا!

وہ اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ اس کے قدموں کی چاپ یہ کہہ رہی تھی کہ ہمیں رکنے کی فرصت نہیں ہے۔ اس کے نیزے کی انی نیلے آسمان میں کوہ نارسا کی چوٹی کی طرح چمک رہی تھی اور اس سے چھوٹتی ہوئی شعاعیں گلے کو آپ سے آپ سیدھے راستے پر لئے جا رہی تھیں — اور گڈریوں کی ٹولی اور ریوڑ کے پیچھے پیچھے لونگینہ تھی۔ اپنی دھن میں مست، لوگوں کی نگاہوں سے لاپروا جواب شہد کی مکھیوں کی طرح اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔

دفعتاً لونگینہ کے ہونٹوں سے ایک درد بھرا نغمہ سنائی دیا۔ وہ جس کی آواز میں نخوت، رعونت، انانیت .... سبھی کچھ تھا لیکن ایک درد ہی نہیں تھا، وہ جسے کو سنگدل، سفاک اور بے مہر کے طعنے دیئے جاتے تھے، نہ جانے اس کی آواز میں یہ سوز کہاں سے آگیا تھا، جس کی گرمی سے پہاڑوں کی برف بھی پگھلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس آواز میں جانے کیا جنوں تھا، کیسی وحشت تھی کہ کافروں نے، جن کے جسم سے کپڑے کسی وقت بھی علیحدہ نہیں ہوتے تھے، اپنے گریبان چاک کر ڈالے۔ مگر لونگینہ پکارے چلی گئی:

اے میرے عناب کے پھول آ
آ کہ میں اپنی خوشبوئیں تجھے بخش دوں

اور کافروں نے پہلی بار عناب کا نام سنا جس کے پھولوں میں خوشبو نہیں ہوتی۔ وہ نوجوان گڈریئے کی سرد مہری سے کانپ اٹھے۔ ان کے دماغ میں لونگینہ کے بدن کی خوشبوئیں بیدار ہوگئیں۔ وہ آپس میں باتیں کرنے لگے کہ یہ نوجوان کس قدر کور ذوق اور قدر ناشناس ہے کہ ان وادیوں کا بہترین پھول آپ سے آپ اس کے قدموں میں جا پڑا ہے لیکن یہ اسے دیکھنے تک کا روادار نہیں۔ اس کی ناک بند ہے شاید اور یہ رنگوں کا اندھا ہے — مگر رکھوالے نے ایک نہ سنی۔ اور لونگینہ اپنا نغمہ الاپتی گئی۔

اے میرے عناب کے پھول آ

لیکن اس دعوت، اس ترغیب، اس فریاد کا گلہ بان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ نغمے کے زیر و بم کے لئے اس کے کان بہرے ہو چکے تھے۔ وہ صرف اس ریوڑ کی آواز سن رہا تھا جس کی حفاظت کا کام اس کے سپرد ہوا تھا۔

لونگینہ کی رفتار تیز ہوگئی۔ برفانی غزالوں کی طرح جو اپنے نافے کی خوشبو سے مست ہوتے ہیں، وہ چوکڑیاں بھرنے لگی۔ اس نے دیکھتے دیکھتے گڈریئے کو جا لیا۔ اور خشک جھاڑیوں میں اس کے قدموں میں گر پڑی۔ اس کے بازو تھام لئے، ان پر اپنی آنکھیں ملنے لگی، انہیں

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

ماہ نو، کراچی، نومبر ۱۹۵۷ء

افسانہ:

سردار!

ابوالفضل صدیقی

ہ

سو برس سے اوپر عمر ہو گئی تھی پھر بھی پہاڑ کے پہاڑ بنے ہوئے تھے۔ اور پہاڑ بھی کائی سے ڈھکا ہوا۔ کالا چمڑا جو کسی زمانہ میں سنگِ موسیٰ کی چٹان کی طرح دمکا کرتا ہوگا، اب تو بھورا بھورا سیاہی مائل مٹیالا سا ہو گیا تھا اور دور سے ایسا معلوم ہوتا جیسے اوپر سے نیچے تک میلی جھولی پڑی ہوئی ہے جس کی شکنوں میں دھڑیوں دھول بھری ہوئی ہے۔ ننھی ننھی گول گول آنکھیں اور بھی اندر جا پڑی تھیں اور دونوں جانب کنپٹیوں کے گڑھے بہت نمایاں اور زیادہ گہرے ہو گئے تھے۔ کسی زمانہ میں جو دانت چیرنے پھاڑنے اکھاڑنے میں غضب ڈھایا کرتے تھے، ان میں سے ایک تو جڑ سے ٹوٹا ہوا تھا اور دوسرا کھٹل ٹھنٹھ کی طرح میلا میلا زردی مائل ترچھا ہوا آگے کو سینگ کی طرح نکلا ہوا تھا، اور یہ بھی بیکار کا بوجھ تھا۔ خود ہی جب کسی قابل نہ رہے تھے اور اپنے اوپر آپ ہی بوجھ تھے تو یہ کیا کرتا۔۔ اور اب تو ان حالوں کو پہنچ گئے تھے کہ مونہہ کے اندر داڑھیں بھی کھٹلی پڑ گئی تھیں اور چبانے تک سے معذور تھے۔

ساری عمر ہمالیہ اور شوالک کے دامن میں بڑی بہادری کے ساتھ سرداری کی تھی اور اپنے زمانہ میں بڑے بڑوں کا، اپنے سے سوائے ڈیوڑھوں تک کا سکہ نہ جمنے دیا تھا، اور اب تو پیری اور صد عیب، ہاتھ پاؤں جواب دے گئے، گوشت تو رہا نہیں پاؤں نے ہڈیوں کھال کا بوجھ لے کر چلنے سے انکار کر دیا؛ کولہوں اور ٹانگوں کا جوڑ چلتے میں چیخ چیخ کر فریادی کرتے، اور نگاہ تو خیر پیدائش ہی سے کوتاہ ہوا کرتی ہے، سونگھنے کی قوت بھی گر گئی اور ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ پیٹ کا دوزخ تو بھڑک بھڑک کر ایندھن مانگتا اور مونہہ کے دانت دشمن ہو گئے، کھاتے میں داڑھیں دکھتیں اور چبانے میں اندر کی کھال دب جاتی، جبڑوں کی حرکت بھی ڈانواڈول سی ہو گئی تھی، نرم غذا تو آسانی کے ساتھ ہاتھ نہ آتی اور سخت کاٹے نہ کٹتی۔ پھر بھی چودھراہٹ بنائے آگے آگے چلتے، ساتھ سنگت میں آدھا پرتا پیٹ بھر ہی جاتا اور اب تو کل کے لونڈے تیز نگاہوں سے دیکھتے پھر ننھی ننھی آنکھیں اندر ہی اندر کلمکا کر بل کھا کے مٹ مار جاتے۔ ایک روز ایک نیا چھورا ساتھ والی سے ٹھٹھولیں کرتا چل رہا تھا اور کچھ وہ بات تو مدتوں سے نہ تھی، پھر بھی بڑ بھس تھی، یا شاید یوں ہی جیسے حسب عادت بڑے بوڑھے لڑکوں کو گھرکتے چلتے ہیں۔ ذرا شوں کر کے ڈانٹ سا دیا، اور وہ نالائق تو سیدھا ہو گیا، اور اس کے سیدھے ہوتے ہی چودھراہٹ کی بھو نکل گئی۔ گنیش مہاراج نے بڑے زور سے پھٹی ہوئی گرج میں ڈانٹ بتائی، مگر ڈانٹ کے ساتھ وہ ناخلف تو الٹا بھڑ گیا، اور اس کے بھڑتے ہی سب نوجوان اور ادھیڑ تک بھڑ گئے، اور نئی نویلیاں تو خوش خوش کھڑی تماشہ دیکھتی رہیں اور ان کے تو جلے دل کے پھپھولے آج پھوٹ رہے تھے، مٹے بوڑھے کھوسٹ نے عمر بھر ساتھ والی کے ساتھ ایک ساعت سہانی نہ گذارنے دی تھی اور جب بہار پر ہوتیں تو غول سے بھٹک کر دور کہیں گھنے جنگل میں جہاں بڈھے کی لمبی ناک کام نہ کر سکے دو چار دن کے لئے ساتھ بھاگ جایا کرتیں اور وہاں بھی ہر وقت دغدغہ لگا رہتا کہ کہیں خرانٹ سونگھ نہ لے۔ مگر اس وقت چار چھ ٹھنڈی بڑی بوڑھیاں جن سے اپنے زمانے میں واسطہ رہا تھا آڑے آ گئیں، ورنہ بڈھے کو مار ہی گرایا تھا، پھر بھی سوکھی ہڈیاں اچھی خاصی کٹ گئیں اور وہ تو خیریت گذری کہ پہلی جھڑ بڈھا روک گیا اور اگر کہیں دوسری جھڑ ہو جاتی اور نیچے آ جاتا تو پھر اٹھائے اٹھ بھی نہ ملتا اور یہیں پڑے پڑے گدھ نوچ لیتے۔

چودھراہٹ کا طلسم ٹوٹتے ہی غول کی قیادت چھوٹ گئی اور چند روز تو روٹھے روٹھے سے دائیں بائیں لگے رہے مگر مہاراج میں کچھ باقی تو تھا ہی نہیں جو ساتھ والیاں منا کر لاتیں، مفت میں گھیر گھار کئے پڑے تھے۔ اور نئے چھوروں کے تیور بدستور بیڈھب تھے۔ دوسرے ہی تیسرے روز مہاراج کو اندازہ ہو گیا کہ قیادت ہاتھ سے نکل گئی۔ جب ان میں سے ایک نے رہنمائی کرنی شروع کر دی اور پھر قیادت سنبھال لی تو صبر آ گیا۔ مگر غول چھوڑتے بھی بن نہ پڑی۔ اتنا شحنہ مرد کی نام۔۔ پون صدی سے غول کے آگے آگے چلنے والا غیور سردار اب دو تین سو گز پیچھے پیچھے چلنے لگا! خیر یہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ آٹھ دس من وزن کا بھاری پیٹ ساتھ لگا ہوا تھا اور اس دوزخ کے اندر جو دو چار چھ من خس و خاشاک پڑ سکتا تھا وہ غول ہی کے سہارے لگے رہنے سے ممکن تھا۔ مگر چند ہی روز میں یہ

بات بھی ناقابل برداشت ہوگئی، خیر کچلا ہوا، بس خوردہ اور روندی ہوئی جھوٹن کھا کر صبر کر لیا، اور سب سے آگے چلنے والے اور بہترین نرم و شیریں تازہ غذا پر سب سے پہلے منہ ڈالنے والے سردار نے اس ہرگز کر کی تکرار کے ساتھ سب سے مکروہ چیز وہ بول و براز کے غلیظ ڈھیر ہوتے جو غول کے ساتھ ساتھ پیچھے چھوٹتے جاتے، چند ہی روز میں لمبی ناک والے مہاراج جی چھوڑ گئے، اور پھر مجبور ہو کر ان کا پیچھا بھی۔ اور چھوڑنے کو تو غول چھوڑ گئے مگر چھوڑتے ہی آنکھیں کھل گئیں، مدتوں سے دوسروں کی ناک کان اور آنکھ نے کام کیا تھا اور مہاراج نے مفت میں رہنمائی کی تھی اور بہترین مال مارا تھا، اعلیٰ سے اعلیٰ چارہ کھایا تھا اور نئی سے نئی پھوٹ نیں ٹٹولی تھیں۔ غول کا پیچھا چھوڑ کر پتہ چلا کہ ہم کیا ہیں، نہ تو سو دو سو قدم کا اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں اور نہ میل دو میل کا سن سکتے ہیں اور خیر چار چھ میل کی سونگھ بھی لیں کہ نرم نرم نمکین نمکین پیڑ کا قطعہ کدھر ہے میٹھی میٹھی ایکھ کے رس بھرے گنّوں والے ہرے بھرے کھیت کون سی سمت ہیں تو پھر بھوک اور بڑھاپے میں دس پانچ کوس کا دھاوا مار کے وہاں پہنچنا کارے دارد، اور پھر گنے کے کھیتوں پر اکیلے دوکیلے کے بس کا کام بھی نہ ہوتا، کسان بڑی بھرپور چوکسائی کرتے، وہاں تو غول کے ساتھ ہی چھاپہ پڑ سکتا تھا اور وہ بھی ترکیب سے کٹیلی باڑھیں اڑا دے اکھیڑ کر ڈگ ڈگ زمین سونگھتے چلتا اور پھونک پھونک کر قدم ڈالتا کہ کہیں گھاس پھونس سے ڈھکی کھائیوں اور گڑھوں میں نہ جا پڑیں جو کسان کاشتہ قطعوں کے قرب و جوار میں جنگلی جانوروں کی گذرگاہوں پر کھود دیتے ہیں۔ اب رہیں برگد، گولر، پیپل کی شاخیں، ان کا توڑنا مروڑنا اور پھر چھیل کر اندر سے گری نکالنا یہ تو ان کے لئے مدتوں سے غول والے کیا کرتے تھے۔ دو ایک دن اس پر بھی کوشش کی، خیر، مگر پہلے تو محنت بہت زیادہ پھر یہ سخت غذا ان کے دانتوں کے بس کا روگ نہ تھی، سمجھ گئے کہ زندگی کے دن بہت تھوڑے باقی ہیں اور کسی دن گھل گھلا کر جہاں تہاں پسرے رہ جائیں گے۔ مگر تقدیر کے لکھے کو کون مٹاتے، مثل مشہور ہے ہاتھی جیتے تو لاکھ کا مرے تو سوا لاکھ کا، ساری عمر ہاتھیوں کی سرداری کی تھی، اخیر عمر میں دیوتا بننا اور دودھ ملائی کھانا قسمت میں لکھا کر لائے تھے، کئی دن کے بھوکے ایک سمت آہستہ آہستہ بڑھتے چلے گئے اور چلتے چلتے شہر کے مضافات میں جا پہنچے۔ اور ڈیڑھ دو دن کے تو چاروں طرف گھنا جنگل لگا ہوا ہے۔ ایک دیہاتی راستہ کے کنارے شام کے وقت تھکے تھکائے گھنے درختوں کے جھنڈ تلے جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ اور بیٹھ کر اچھی طرح سستا بھی نہ پائے تھے کہ شامہ نے تازہ دودھ کی خوشبو لے لی، پنکھا سے کان جلدی جلدی ہلے اور سونڈ کی نوک ہوا میں لہرا لہرا کر خوشبو کی سمت کا تعین کرنے لگی، جب تک کچھ انسانی آوازیں کان میں پڑیں، میٹھی میٹھی اطمینان سے بڑھتی ہوئی آوازیں، اور یکدم پانچ چھ دیہاتنیں دودھ کی مٹکیاں سروں پر دھرے شہر کو جاتی سامنے آگئیں، بالکل ہی ملحق، اتنی قریب کہ اک ذرا کمر سے اچک کر اور سیدھی ٹانگیں آدھی کھڑی کر کے جو سونڈ بڑھائی تو ایک مٹکی سر پر سے سونڈ کی نوک میں پھنس گئی۔ سب نے حیرت اور خوف سے ایک چیخ لگائی اور "گنیش مہاراج!!" گھگھیا پڑیں بعض اپنی مٹکیاں آہستہ سے اتار کر اور کچھ پٹخ کر الٹے پاؤں بھاگ گئیں گنیش مہاراج نے اطمینان کے ساتھ پہلے سونڈ والی مٹکی سونت کر خالی کی پھر دوسری مٹکیاں، اور پھر زمین پر چھلکا ہوا جتنا دودھ چوس ملا سونڈ سے جمع کر کر کے چوس گئے اور نہ معلوم کے دن کے بھوکے پیاسے گنیش مہاراج کا برت دودھ سے کھلا، اور من بھر دودھ پی کر آنکھیں کھلیں، کان بھی تیز ہوئے اور ناک بھی سرسرائی — صبح تک تمام دیہات میں افواہ پھیل گئی کہ گنیش جی نے درشن دئے ہیں۔ اور گنیش جی نے یہاں سے ہٹ کر صبح کو دوسری پگڈنڈی پر درشن دئے اور پھر شام کو تیسری سمت اور تیسرے روز لوٹ کر پھر پہلی جگہ پر آ گئے۔ تین چار روز تو کچھ چھاپوں جیسی صورت رہی مگر ہفتہ بھر بعد تو یہ چیز عقائد میں گھر کرنے لگی اور روز بروز عقیدہ راسخ تر ہوتا گیا۔ پہاڑ کے دامن کے بسوئیا بھولے دیہاتی گنیش درشن کے لئے چڑھاوے لے کر تلاش کرنے لگے، اور گنیش مہاراج کو دودھ پلانا سعادت ہو گئی۔ پھر ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک چڑھاوے کے بعد گایوں بھینسوں کا دودھ دوچند بلکہ سہ چند تک بڑھ جانے کی زریں افواہیں اور ساتھ ہی ساتھ کوتاہی کرنے میں اچھی بھلی دودھار گایوں اور بھینسوں کے خشک ہو جانے کی باتیں پھیلنے لگیں۔ بھلا اس جنگل میں ہاتھی کب نہیں رہتے تھے، مگر پہلے تو شہر سے دور دور رہا کرتے تھے اور پھر گھاس پات کھایا کرتے تھے۔ کہیں کہیں جب موقع مل جاتا سال میں دو چار مرتبہ دھان، گنے، گیہوں، جوار کی فصل پر دھاوا مار دیتے۔ یہ سر سے دودھ اتار کر پینے والی بات تو بڑے بوڑھوں کے تجربوں میں بھی نہ کبھی دیکھی نہ سنی تھی، لہٰذا بات راسخ تر ہوتی گئی اور شہر میں دودھ والوں کی دکان تک پہنچی اور پھر سارے شہر میں گشت کر گئی۔ مقامی اخباروں تک نے گنیش درشن کے عنوان سے خبریں چھاپیں۔ اور گنیش مہاراج کے ایسے دن پھرے کہ کبھی ان کے باپ دادا کو نصیب نہ ہوئے تھے۔ جوں جوں دن بیتے چڑھاوے میں افزونی اور آسانی ہوتی گئی، اور کبھی کبھی تو پیٹ سے اوپر آ جاتا اور بچ رہتا۔ پھر تو گاؤں گاؤں باڑھے والوں نے اپنی اپنی باری اور اپنا اپنا دن مقرر کر لیا، ستن کے نیچے کا خالص دودھ اپنی باری پر چڑھاوے میں جاتا، گنیش مہاراج چاروں سمت دھاوا مارتے، کبھی پورب میں کبھی پچھم میں، کبھی شمال

کی پہاڑیوں میں جا چھپتے اور کبھی جنوب کی گھاٹیوں میں لگ جاتے۔ دودھ ان کے پیچھے پیچھے پھرتا اور وہ دور سے سونگھ کر دودھ کی جانب بڑھتے، کبھی پگڈنڈیوں پر کبھی بڑی سڑک کے کنارے اور کبھی فارسٹ کی سروس روڈ پر اپنا بریک فاسٹ لنچ ڈنر لگا ہوا پاتے اور کھا پی کر آرام کرتے۔

ایک روز شام کے وقت آرام کے ساتھ ایک دیہاتی پگڈنڈی پر لگے ہوئے تھے۔ دو عورتیں آگے پیچھے گھاٹی میں سے سر پہ دودھ کی مٹکیاں لئے حسب معمول شہر کو جاتی ہوئی اوپر کو بڑھیں، نہ تو عورتوں کو ہی گمان تھا کہ اس وقت یہاں پر مہاراج درشن دیں گے اور نہ مہاراج ہی کو چڑھاوے کی کوئی امید تھی مگر جب یکدم سامنے آگئیں تو مہاراج نے ویسے ہی بیٹھے بیٹھے سونڈ بڑھا کر مٹکی پکڑنا چاہی، یا تو عورت کی اونچائی کا اور اپنی سطح کا صحیح اندازہ نہ ہوا یا نہ معلوم کیا بات ہوئی، مٹکی کا موڑھا پھنسنے کے بجائے عورت کی گردن سونڈ میں پھنسی اور جب مہاراج نے مٹکی اٹھائی تو عورت مع مٹکی کے اوپر اٹھی چلی آئی، بس بشکل بیچاری کے مونہہ سے پھنسی پھنسی پھنچی پھنچی آواز میں "ٹن گنیش!" نکلا اور جب تک ہاتھی کی سونڈ کی سہک گرفت ڈھیلی ہو، آنکھیں ہلس آئیں اور زبان باہر نکل آئی اور جب گنیش مہاراج نے اسے زمین پر رکھا تو جان نکل چکی تھی، دوسری اپنی مٹکی پھینک کر بھاگ گئی۔

گنیش مہاراج عورت کے یوں بے حس و حرکت پڑا رہنے پہ ذرا متعجب تو ہوئے، پھر اطمینان کے ساتھ دودھ پی پلا کر چلتے ہوئے۔

دوسرے ہی روز دور دور خبر پھیل گئی کہ گنیش مہاراج نے بھینٹ لے لی اور خیر چڑھاوا تو اور بات تھی مگر بھینٹ کے خوف سے دیہاتیوں کے پتّے پانی ہونے لگے۔ نت نئی افواہوں نے عام ہراس پھیلا دی، خوف کے ساتھ ساتھ چڑھاوے کی مقدار تو بڑھ گئی مگر احتیاط بہت بڑھ گئی، دور سے رکھ کر چلے آتے۔ شہر کو دودھ پہنچنا کم ہو گیا اور افواہیں زیادہ۔ پہلے تو خیر شہر سے مضافات اور دیہات میں اور دیہات سے شہر اور مضافات میں پہنچا کرتیں اور اب تو شہر کے شہر ایک محلہ سے دوسرے محلہ میں پہنچتیں۔ رات گنیش مہاراج نے بھرے بازار میں درشن دئے، دودھ کی دکانوں کے ٹھٹھر اکھیڑ پھینکے، حلوائیوں کی بھینٹ لی اور کڑھائیوں کی کڑھائیاں اُبلتے دودھ کی سونت کر زمین میں دھنس گئے ....

اور خیر شہر میں ہراس تو نہ پھیلنے پائی مگر دودھ کا قحط ہو گیا کیونکہ ڈر کے مارے سو گوالوں میں سے بمشکل پچیس دودھ لے کر شہر آنے کی ہمت کرتے، وہ بھی سر ہتھیلی پر رکھ کر اور شہر میں یہ افواہیں پھیلتیں کہ دودھ کہاں سے آئے، وہ تو سارے کا سارا گنیش مہاراج کے چڑھاوے میں چلا جاتا ہے، ساتھ ساتھ روزانہ ایک سو ایک بھینٹ کی خبر بھی گشت کر جاتی ہے

بہر حال بھینٹ والی بات تو صحیح تھی، ایک سو ایک نہ سہی تو ایک بھینٹ تو لی ہی تھی، حکام ضلع شہر کے اندر سے دودھ کی کمی پر ہی پیچ و تاب کھا رہے تھے، عورت کے مارے جانے سے باقاعدہ قانونی شکل پیدا ہو گئی۔

ادھر محکمہ جنگلات والوں نے خونی ہاتھی کا اپنا علیحدہ فائل چلایا اور سرکاری عہدہ داروں کو تو ہر چیز کا سد باب کرنا تھا، خونی ہاتھی کا استیصال قدم قدم پہ بدل جانے والی افواہوں اور ہراس کا خاتمہ، اور پھر شہر سے دودھ کی کمی کا دور کرنا ——— محکمۂ جنگلات اور عالی عہدہ داروں نے ٹھنگ کی۔ بات عقائد کی حد تک اس وقت تک پہنچتی ہے جب تک قانون کی زد میں نہ آ جائے۔ جنگلات کے قواعد کی رو سے ہاتھی کا شکار مدتوں سے ممنوع تھا، مگر جب ہاتھی خونی ہو جائے تو پھر وہ ہاتھی کب رہتا ہے۔ اگرچہ جنگلات کے ماہر حیوانات اس مخصوص ہاتھی کی جبلت کو عام ہاتھیوں سے بالکل علیحدہ اور منفرد بتاتے تھے، بھلا کسی کتاب یا تجربہ میں یہ آیا تھا کہ ہاتھی دودھ پر ہاتھ مارے! خیر آدمی کے مار دینے کی تو ایک دو مثال پائی بھی جاتی تھی اگرچہ یہ بھی ہاتھی کی جبلت کے منافی تھا، بہر حال عالی عہدہ داروں کو تو اپنا نظم و نسق برقرار رکھنا ہی تھا، دونوں نے مل کر ہاتھی کو مار دینے کا فتویٰ دے دیا۔ اور یہ ڈیوٹی محکمہ جنگلات والوں کی تھی کہ خطرناک جانوروں کا استیصال کریں اگرچہ مقتول عورت کے ورثاء خون کا دعویٰ نہ کرنا چاہتے تھے

جب محکمہ جنگلات والوں نے معذوری ظاہر کی اور بتایا کہ گنیش مہاراج کے مقابلہ پر انہیں دیہاتیوں حتیٰ کہ خانہ بدوشوں سے بھی کوئی مدد نہیں مل سکتی تو پھر عالی عہدہ داروں نے ادھر توجہ کی۔ پہلے تو خود آپس میں نظر دوڑائی تو کمشنری بھر میں کوئی حاکم ایسا نظر نہ آیا جو ڈھنگ کے ساتھ ایک گولی ہاتھی تو ہاتھی جنگلی بکرے پر بھی چلا دے۔ پھر چھاؤنی کی جانب رخ کیا، بڑے بڑے بال باندھی گولی مارنے والے کرنل جنرل میجر کپتان بھی تھے۔ اور یہ نہیں کہ نرے چاند ماری ہی مارنے والے ہوں، تھوڑا بہت شکار بھی کھیل لیا کرتے تھے مگر ہاتھی کا شکار تو اپنے

فن میں منفرد ہوا کرتا ہے اور ہاتھی بھی خونی! ـــــ اور اب تو خیر مفقود تھا۔ اگلے زمانے میں بھی چار چھ ضلعوں میں ایک آدھ ہوا کرتا تھا یا وقت وقت پرانے انگریز فوجیوں میں کوئی افریقہ برما کے جنگلوں کا کھیلا شوقین شکاری نکل آتا تھا۔ شہر تو شہر کمشنری بھر میں کوئی نہ نکلا اور چھاؤنی سے بھی جواب آ گیا اور قانونی ایکشن تو کوئی بھی صبر کر کے بیٹھ جانے کے لئے نہیں لیا جاتا اور پھر یہ تو مسلسل خطرہ تھا، اور مستقل نقصان اور بیم و ہراس۔ لہٰذا حاکم ضلع کے سامنے پوری گتھی بن گیا، بہت نگاہیں ڈالیں، پولیس کے عہدہ داروں سے مشورہ کیا اور ایک صورت نکل ہی آئی، شہر میں ایک کنبہ ایک معزول شدہ شاہی خاندان کے دس بارہ افراد کا اب بھی بستا تھا، مگر بوڑھا تو بوڑھا اس خاندان کے جوان تک گوشہ نشین ہو چکے تھے اور ان میں کا ہر ایک قادر انداز اور بڑا دلیر شکاری تھا، بڑے بڑے فوجی انگریزوں پر ان کی نشانہ بازی اور بہادری کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی لیکن اب تو برسوں سے ان کی بندوقوں کی گریس بھی نہ چھوٹی تھی اور شاید مہینے گذر جاتے اپنی کوٹھی کے کمپاؤنڈ سے بھی باہر آنے کی نوبت نہ آتی اور خاندانی پنشن پر جو حکومت کی معرفت پہنچا کرتی گذر تھی۔

جب اپنے ساتوں آٹھوں ضلعوں میں کوئی آدمی نظر نہ آیا، محکمہ جنگلات والوں نے بھی جواب دے دیا۔ دیہاتی اور خانہ بدوش کام پہلو تہی کر گئے اور چھاؤنی سے بھی صاف انکار کی درخواست سن لی تو حاکم ضلع نے مجبور ہو کر بڈھے خان سے تحریک کی کہ اس موذی کے ظلم سے مخلوق خدا کو نجات دلائے۔

موذی کے ظلم سے مخلوق خدا کو نجات دلانے سے زیادہ بوڑھے خاں کے اندر پڑا دبا ہوا شکاری والا جذبہ بھڑک اٹھا۔ ویسے مدتوں سے بندوق نہ پکڑی تھی اور ہاتھی کے شکار کے لئے بڑی اچھی پریکٹس کر کے جانے کی ضرورت بھی مگر وقت کم تھا، جلدی جلدی پروگرام بنایا، ساتھی تو کوئی باقی نہ تھا، بوڑھے خاں کے بیٹے پوتے، بھائی بھتیجے، ایک سے ایک بڑھ کر گل چلے تھے۔ سب ملا کر درجن بھر شکاریوں کی پارٹی بن ہی گئی۔ سب نے اپنے بڑے رائفلوں کی گریس صاف کرائی، نئے کارتوس حاصل کئے اور پرانے شکاری کپڑے نکالے، جنگل میں کچھ زیادہ اندر جانے کا تو پروگرام نہ تھا پھر بھی رہنمائی کے لئے آدمی تلاش کئے اور باوجود حاکم ضلع کی مدد کے دیہات سے ایک بھی متنفس اس کے لئے طیار نہ ہوا، مجبور ہو کر کچھ کوتوالی کے کانسٹبل اور دس پانچ مضافاتی تھانوں کے چوکیدار اور محکمہ جنگلات کے کچھ پٹرول اور دو ایک رینجر جمع کئے جن کے ذریعہ ہاتھی کی نقل و حرکت اور جبلت کے متعلق معلومات فراہم کیں، اور گنیش مہاراج جنگل میں اندر زیادہ دور نہ جاتے، یہی شہر سے دس پانچ میل ادھر ادھر کہیں لگے رہتے۔ کبھی کبھی ذرا بڑھ کر دوپہر میں کسی پھیلے ہوئے چشمہ کے کنارے گھنے درختوں کی چھاؤں میں کیچڑ کائی میں جا پڑتے اور کہیں گہرا پانی مل جاتا تو کسی جھیل میں دو چار غوطے لگا لیتے اور سونڈ بھر بھر کر پیٹھ پر پچکاریں چھوڑ لیتے اور نہا دھو کر اپنے وقت پر خوشبو نے کر دس پانچ میل کے اندر کہیں نہ کہیں اپنا چڑھاوا پا لیتے اور اب تو معتقدین بھانپتے رہتے اور راستہ پر مٹکیاں چن آتے۔

تاہم ہاتھی کا شکار ہاتھی کا شکار ہے، کوئی ہرن چیتل پاڑھے نیلے کا کھیل نہیں ہے۔ بھاری میگنم اور ایکسپریس کار وائٹ رائفلوں کے علاوہ ہاتھی کے شکار کے اور بہت سے لوازمات اور آداب ہیں۔ جس صبح کو جانے کا پروگرام تھا اس سے پیشتر رات میں خان اور اس کے ساتھی بیٹوں، پوتوں، بھائی بھتیجوں میں مفصل مشورہ ہوا۔ ہر ایک نے تجویزیں پیش کیں مگر اس ہاتھی کے شکار میں نہ ان تمام لوازمات کی ضرورت محسوس ہوتی تھی اور نہ وقت اور موقع تھا، نقل و حرکت اور ہانٹ دو دن سے معلوم ہی ہو رہی تھی اور جنگل دور اور نزدیک سب گھوما ہوا اور اچھی طرح دیکھا بھالا تھا۔ خان اور اس کے چھوٹے بھائی کئی مرتبہ ہاتھیوں کا شکار کر چکے تھے۔ اپنے ہتھیاروں کی ضرب اور گولی لگانے کے پوائنٹ اچھی طرح جانتے تھے، اور صرف گولی ہی لگانا تھی۔ پھر سب سے بڑی آسانی یہ تھی کہ کوئی غول نہ تھا، ہاتھی اکیلا ہی تو تھا۔ بس ایک کیلی دیوار پر ٹھکانے سے دو گولیاں جڑنی تھیں۔ اپنی عمر میں ایسی دس پانچ دیواریں خان ڈھاتے ہوئے تھا، مانا کہ بوڑھا تھا مگر کسی اعتبار سے انیس نہ ہوا تھا، اپنے سب جوانوں سے زیادہ کڑیل بنا ہوا تھا اور پچھتر کی عمر میں پچیس سالہ جذبہ رکھتا تھا۔ مستقل مزاجی سے جو اس عمر کا تقاضا تھی مالا مال تھا، اور بہادری کے ساتھ شکار کے داؤں پیچ، ساری عمر کے عملی تجربہ نے خان کی ضرب کو موت کا طمانچہ بنا دیا تھا، ویسے یہ بات نہیں ہے کہ سبھی مار لئے ہوں اب بھی دس پانچ پرانے ہاتھی جنگل میں ایسے زندہ ہوں گے جنکے کولہوں اور کھوں میں خان کی گولیاں پندرہ پندرہ بیس بیس برس

پرانی گونھیں بنی دھری ہوں گی۔

علی الصبح کچھ زیادہ دور جانا بھی نہ پڑا، یہی دس میل شوالک کی ترائی میں اور خان نے تیقن کے ساتھ گنیش مہاراج کی نشست گاہ معلوم کرلی، اب پھر پارٹی میں مشورہ ہوا اور ایک لڑکے نے تجویز پیش کی کہ باقاعدہ شکار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، پہلے خان ایک دو گولی مار کر دور سے ہاتھی کی ایک یا دو ٹانگیں توڑ دیں، پھر جب وہ مجبور جہاں کا تہاں پڑ جائے تو سب بڑھ کر قریب سے والی مار دیں، قصہ ختم ہو"

"مگر یہ تو بہت ہی اَن اسپورٹنگ اور ہاتھی کے شکار کا سخت مذموم طریقہ ہے"۔ من چلے بوڑھے خان نے کہا۔

"لیکن دیکھئے، ہمیں تو استیصال کرنا ہے" نوجوان بیٹا بولا۔

"تم کچے شکاری ہو، اور مجھ کو تو شکار کا جذبہ لئے جا رہا ہے، یہ شکاری کا کام نہیں قصائی کا کام ہے جو تم بتا رہے ہو" اور خان کے چھوٹے بھائی نے لقمہ دیا۔

"اور یہ چیز شکار جیسے ارفع جذبہ کے سخت منافی ہے"

"نہیں میرا مطلب یہ تھا کہ مخلوق خدا کو اس کی ایذا رسانی سے نجات ہو جائے اور قصہ ختم ہو"

"کیا کہنے میاں! سمجھنے کی بات ہے کہ انہوں نے اسپورٹس بن سمجھ کر ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا تو پھر ہمیں اسپورٹ کے تمام و کمال آداب برتنا چاہئیں اور پھر میں یہ کیوں کروں، ویسے میرے لئے کون سی مشکل ہے۔ بس تم لوگ اپنی اپنی جگہ پر میری ہدایت کے مطابق لگے رہنا، ویسے موقع محل تم سب خود سمجھتے بھی ہو، لیکن جب تک میں اشارہ نہ دوں میرے شکار پر کوئی صاحب فیر نہ کریں خواہ میرے لئے خطرہ ہی کیوں نہ ہو، اور پہلے تو اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی"۔ "ہوں ہمارا مطلب یہ ہے کہ بات بھی بن جائے اور خطرہ . . . " بھتیجہ بولا" اور خان نے بات کاٹ کر کہا "میری زندگی کا شاید یہ اخیر شکار ہو اور میں ایسا ریکارڈ کیوں چھوڑوں جو ساری عمر کے کرے دھرے پر پانی پھر جائے"۔ اور اپنے بوڑھے ملازم شہباز کی جانب داد طلب نظروں سے دیکھا جو چالیس سال خان کے ساتھ کندھے سے کندھا ملائے بندوقوں کا پیر لئے ہاتھیوں، شیروں اور بھینسوں کے شکار میں سایہ کی طرح ساتھ لگا رہا تھا، اور جس پر خان کے ساتھ بارہا موت جھپٹی تھی، اور الٹ کر اوندھے مونہہ جا پڑی تھی۔ اور بوڑھے شہباز نے آنکھ اور گردن کے اشارے سے بہادر آقا کی تائید کی، اگرچہ خود کبھی گولی نہ لگائی تھی اور بندوقیں ہی اٹھائی تھیں۔

دوپہر تک خان گنیش مہاراج کی آرام گاہ کے گرد محاصرہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ گھنے درختوں کی چھاؤں میں کیچڑ پر ڈبکیں لگاتے گنیش مہاراج تو میل بھر سے خطرہ کی بو سونگھ رہے تھے، اور اس بو کو تو ہاتھی خوب ہی پہچانتا تھا۔ کتنے ہی بہادر ساتھی اس کی بھینٹ چڑھ چکے تھے اور خود گنیش مہاراج کے پٹھوں کولہوں اور کوکھوں میں دو چار آدھ آدھ پاؤ کی سوکھی گولیاں دبائے آج تک موجود تھیں، اور اور کچھ تفاصیل تو یاد نہ تھیں، بس خطرہ کا احساس جبلت پر طاری ہو گیا۔ ایک آدھ دھماکا تڑاخا دھکا، پھر کاٹ توڑ جلن اور پھر مہینوں پیپ خون اور مکھیوں کی بھنبھناہٹ اور تکلیف اور پانسو گز سے دور بینوں کی مدد سے بھانپ کر قرارداد کے مطابق خان کی پارٹی تین سمت میں بٹ گئی تھی، چوتھی سمت اونچی پہاڑی کا ڈھلان تھا جس کی تلی پر یہ جوہڑ تھا جس میں گنیش مہاراج پڑے لوٹیں لگا رہے تھے اور رشاد سا تھ دے رہے تھے۔ اوپر جانے کا امکان نہ تھا۔ پارٹی تمام جھاڑیوں اور درختوں میں چھپی چھپی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی اور بوڑھا اپنے پرانے تجربہ کار ملازم کو ساتھ لئے خان بوڑھے گنیش مہاراج کے روبرو عین اس پامال شدہ راستہ پر چل رہا تھا جو گنیش مہاراج کے دوپہر کو نہانے کے لئے جانے کا اور پھر کو اٹھ کر آنے کا تھا، اور ہاتھی تو اپنے راستہ کا بڑا پابند ہوتا ہے۔ گنیش مہاراج نے کیچڑ پانی کا ٹھنڈا مشغلہ چھوڑ کر لمبی سونڈ فضا میں چاروں طرف گھمائی، دائیں بائیں اور سامنے تمام فضا بارود کی بو سے رچی ہوئی تھی اور لحظہ بہ لحظہ تیز تر ہوتی جا رہی تھی، پہلے تو کھڑے ہو کر جلدی جلدی کان ہلائے اور ساتھ ساتھ ننھی ننھی آنکھیں حلقوں میں گھومیں۔ سامنے راستہ پر دیکھنے کی بہت کوشش کی مگر کچھ نہ دکھائی دیا، اور نہ سنائی دیا، ایک ٹیڑی بار بار دائیں سے بائیں اور آگے سے پیچھے بڑے زور سے چلاتی اوپر سے اڑتی رہی اور یہ بھی آدمی کی موجودگی کا سگنل ہوا کرتا ہے، بو اور تیز اور واضح تر ہو گئی اور ٹیڑی جلدی پلٹ کر آنے لگی۔ بوڑھے گنیش مہاراج نے پھر بو پر خطرہ محسوس کیا اور قریب ہی اور پھر آگے پیچھے دائیں بائیں سونڈ گھما کر سونگھا اور پیچھے ڈھلان پر سے آتی ہوئی ہوا صاف سنگھائی دی اور راہ پر کو بڑھا اور پھر لپکنا شروع کیا۔ جب خان جوہڑ سے تین سو گز کے فاصلہ

پر نمودار ہوا تو ہاتھی کو پہاڑی کے ڈھلان پر ایک جھلک لپکتے دیکھا، ایسے ڈھلانوں پر چڑھنا ہاتھی کی جبلت کے منافی ہے۔ خان سمجھ گیا کہ تینوں جانب سے خطرہ محسوس کر کے یہ رخ اختیار کیا ہے اور ہماری پارٹی کی سیدھ بچا کر اوپر اوپر پہنچ کر دائیں بائیں کسی جانب کو مڑے گا، غرض جو موٹے کا نوالہ سمجھ کر چلے تھے وہ بات نہیں ہے، اور جتنا ذکی الحس دودھ کی خوشبو لینے کے معاملہ میں واقع ہوا ہے اس سے زیادہ دشمن کا پسینہ اور بندوق کی بو لیتا ہے۔ بھینٹ لینے کے بعد بھی گنیش مہاراج کو اندازہ نہ ہوا تھا کہ ان سے کتنی بڑی قانونی خطا سرزد ہو گئی ہے۔ اس لئے کہ بھینٹ کے بعد چڑھاوے زیادہ بھی ہو گئے تھے اور آسان بھی، وہ لوٹ کھسوٹ اور اچکے پن والی بات تو بالکل ہی جاتی رہی تھی، اب تو جدھر کو نکل جائے زندگی دودھ ہی دودھ معلوم پڑتی۔ اس دوران میں کچھ نہ کچھ آدمیوں سے وحشت بھی کم ہو گئی تھی۔ وہ دوسری بات تھی کہ سہواً ایک کا گلا گھٹ گیا تھا اور آج یہ بارود کی بو بڑے دنوں بعد ناک میں پہنچی تھی اور اس کے ساتھ بڑی مہیب یادیں اور تکلیف دہ واقعات وابستہ تھے۔ خان کی پارٹی جمع ہو گئی اور دوربینوں کی مدد سے مفرور شکار کے رخ کا تعین کرنے کی کوشش کرنے لگی، مگر جھاڑیوں اور گھنے درختوں میں صحیح پتہ نہ چل سکا، مجبور ہو کر کچھ دور اوپر کی سمت کھوجوں پر چلے مگر اوپر پتھریلی زمین میں نشانات قدم تو نہ مل سکے تاہم جھاڑیوں اور سبزے میں سے گذرتے ہوئے اس کا راستہ صاف معلوم ہوتا تھا۔ چلتے چلتے دوپہر سے سہ پہر اور پھر شام ہونے لگی۔ سورج مغرب کی جھکتی ہوئی پہاڑیوں کے ڈھالوں میں جا پہنچا، جگہ جگہ کھلے حصوں میں درختوں اور جھاڑیوں کے سائے لمبے لمبے ہو کر پڑنے لگے، جنگل میں شام کے وقت مخصوص آوازیں گونجنے لگیں۔ گھاٹیوں اور میدانوں میں سے تمام دن چگ کر ڈھالوں پر پتھروں اور چٹانوں میں بسیرے لینے چکوریں اور مرغیاں کڑکڑا کڑکڑا کر جمع ہونے لگیں اور تھوڑے تھوڑے اڑان کے ساتھ تیز تیز لپکنے لگیں۔ بارہ سنگھے چیتل پاڑے اور جانک جنگل کے اندرونی حصوں سے نکل نکل کر کاشتہ علاقوں سے ملحق جھاڑیوں اور درختوں کے جھنڈوں میں آ گئے بلند پرواز اور تیز پر طوطے تنگ کے تنگ بنا کر بسیرے کے لئے گھنے حصوں کی جانب اڑنے لگے، شوالک رینج کے مشرقی ڈھالوں کی جانب سے بڑی سیاہی ہمالیہ کے سلسلہ کی مشرقی پہاڑیوں سے پڑے پھیلتے ہوئے مہیب دھندلکے سے غت پٹ ہو گئی۔ اور خان کی پارٹی تیزی کے ساتھ ہاتھی کے کھوجوں پر چلتی رہی۔ ہاتھی تو جیسا خان کا خیال تھا کچھ دور ڈھال پر چڑھ کر اور خان کے داہنے ہاتھ والے ساتھیوں کے سروں پر سے تقریباً آدھے میل کے فاصلے سے گذرتا اوپر ہی اوپر مڑ گیا تھا۔ اب خان کی پارٹی نے رفتار تیز کر دی۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور ہزاروں مربع میل میں پھیلی ہوئی ہمالیہ اور شوالک رینج کی وسیع وادی گم ہو جانا چاہتی تھی۔
مغرب کے قریب کھوج اسے ملنا شروع ہوئے جس سے ہاتھی کی رفتار مدھم ہونے کا سراغ ملتا تھا، تجربہ کار خان سمجھ گیا کہ بس اب زیادہ دور نہیں گیا ہو گا۔ تھوڑی دور چل کر خان اور پوری پارٹی کی دوربینوں نے بھانپ لیا۔ تین طرف گھنا جنگل اور ایک جانب ڈھلوان پر ایک چھوٹا سا گانوں اور نیچے درمیان میں ایک زرخیز کاشتہ میدان اور اس میدان کے بیچوں بیچ کھڑے گنیش مہاراج جھوم رہے ہیں۔ شام ہوتے دیکھ کر خان نے اپنی پارٹی کو جلدی جلدی تقسیم کیا، فرق صرف اتنا تھا کہ اب کی ایک جانب یعنی اسی ڈھلوان کی سمت گانوں تھا جس سمت سے پہلے فرار ہوا تھا، پارٹی کو لگتے دیکھ کر اور گنیش مہاراج کو مارنے کے انتظامات دیکھ کر گانوں والوں میں بےچینی پھیلی۔ پہلے سب کے سب گانوں سے باہر جمع ہو گئے اور پھر ڈھلوان سے اتر کر میدان کی جانب بڑھنے لگی۔ بوڑھیوں اور عورتوں نے نوجوانوں کو روکا کہ بارہ نہیں بارہ ہزار بندوقیں آ جائیں بھلا گنیش مہاراج کو مار سکتے ہیں: اور گنیش مہاراج تو گولی الٹی پھیر دینگے" کوئی بولا کہ گنیش مہاراج کے بدن پر گولی گڑھے گی ہی نہیں
اب ہانکا بڑا مکمل ہو گیا، ساتھ ہی ساتھ کچھ ناقص بھی۔ میدان کے دو سمت سے خان کی پارٹی بڑھی اوپر سے گانوں والوں کی چپقلش اور پھر شور ہوا اور مغربی رخ کہ گنیش مہاراج سامنے کو بڑھیں اور سامنے سے خان اور خان کا پرانا تجربہ کار بندوق بردار ملازم شہباز آگے پیچھے بڑھ رہے تھے۔ جگہ جگہ میدان میں کھڑی ہوئی جھاڑیوں کی آڑ لیتے خان اور شہباز آگے پیچھے دونوں بڑھتے رہے، اوپر سے گانوں والوں کا شور فزوں تر ہو رہا تھا، اردگرد سے پارٹی دونوں جانب سے ایک دوسرے کا آمنا سامنا بچائے سمٹ کر میدان کے کناروں پر آ لگی تھی گنیش مہاراج کے معتقدین پیچھے تھے اور دشمن دائیں بائیں اور سامنے۔ چار چار چھ چھ قدم ایک کر کے گنیش مہاراج قلعہ کے برج کی طرح ٹھہرتے، توقف کر کے فضا میں لمبی سونڈ لہرا لہرا کر سونگھتے اور اب تو ہر جانب دشمن ہی کی بو رچی معلوم ہوتی۔ پیچھے کے شور سے زیادہ خائف تھے، دائیں بائیں بو زیادہ گہری اور تیز تھی اور آدمی دکھائی دے جاتے اور سیدھا ہی بڑھنے میں عافیت سمجھ میں آئی اور خان ہاتھی کی جانب کو اور ہاتھی خان کی جانب کو بڑھ رہا تھا، اور بہت جلد ڈھائی سو گز سے سامنا ہو گیا۔ قاعدے کے مطابق خان کو گولی چلانے میں گانوں کی سیدھ

بچانا چاہیئے تھی مبادا گولی بچ کر دیہاتیوں میں گرے، مگر خان کو اپنے ہاتھ پر بھروسہ تھا اور خالی جانے کا کوئی امکان نہ تھا پھر بھی اس سمت کو فیر کرنا قاعدہ کے خلاف تھا، پچاس گز کا فاصلہ ادھر سے گنیش مہاراج نے اُدھر سے خان نے آناً فاناً میں اور طے کر لیا۔ خان سائڈ لے کر کان کے گھگھوئے میں گولی مارنا چاہتا تھا اور ہاتھی ٹینک کی طرح سیدھا بڑھ رہا تھا۔ خان پینترے سے کاٹ کاٹ کر جھاڑیوں کی آڑ لے لے کر سائڈ لینا چاہتا تھا، اور خان کے دس بیس گز ادھر اُدھر ہوتے ہی ہاتھی اک ذرا ٹھٹک کر پھر سیدھا ہو جاتا تھا اور یہاں تک کہ جب معاملہ دو سو گز کے اندر آ گیا تو خان کو شست لے کر ایک گولی آنکھ پر چپکانی ہی پڑی مگر کچھ تو ہاتھی جھوم رہا تھا، کچھ خان کی پریکٹس چھوٹی ہوئی تھی اور ہاتھ میں بھی وہ بات نہ رہی تھی کہ بال باندھی گولی مارے۔ بجائے آنکھ کے گولی بالشت بھر اوپر مستک پر پڑی، بھنا کر ایک پھریری سی لی، بڑے زور سے کان جھٹکے، سونڈ لہرا کر پھر سیدھا ہو گیا اور رفتار کالی آندھی سی! گرج کر بڑے زور سے دانت سیدھا کئے بڑھا اور چارج کیا، اور رخ بدلنے کی ایک اور کوشش میں خان نے تیزی سے پینترا سا بدلا، کچھ جھاڑیوں کی آڑ پکڑنی چاہی اتنی دیر میں ہاتھی نے لپک کر پچاس گز اور لپیٹ لئے، اور سو گز کے اندر موت سے آمنا سامنا ہوا، خان کو سائڈ نہ ملی، پھر آنکھ کی شست لے کر گولی کو دماغ تک پہنچانے کا راستہ تلاش کیا اور اب کی مرتبہ گولی ذرا ہٹ کر ایک جانب کو پڑی اور دونوں آنکھوں کے بیچوں بیچ پیشانی کی چٹان سی ہڈیوں میں جب ہو کر رہ گئی مگر گنیش مہاراج کی آنکھوں کے سامنے تیلیاں سی ناچ گئیں اور خود بھی ایک مرتبہ کو ناچ گئے۔ مگر عاجز ہونے کے بجائے بارود کا بھڑکا ہوا پہاڑ بن گئے سب کچھ الٹ پھینکنے اور ڈھا دینے کی تندی سے چنگھاڑ کر لپکے، اور اب تو دشمن دو ڈگ میں داننت پر تھا، دوسری نال خالی کر کے خان نے شہباز کے ہاتھ سے دوسرا رائفل لیا اور خالی رائفل اس کو دیدیا۔ اتنی دیر میں ہاتھی پچاس گز کے اندر بڑھ رہا تھا، پارٹی سمٹ کے اور بھی قریب آ گئی تھی اور پارٹی میں سے بعض محتاط شکاریوں نے آواز دی "پانوں پر! پانوں پر!" یہ تو خان کو خود بھی سوجھ رہی تھی، اور پانوں تو چاروں ستون سے شروع سے آخر تک سامنے تھے، اور اس سے بہت پیشتر پہلی گولی لگانے سے بھی پہلے خان ہاتھی کو بیکار کر سکتا تھا پہلی ہی جھلک پر ڈھیر ہو جاتا۔ پچاس گز کے اندر بھی خان سائڈ نہ لے سکا اور جب پچیس گز پر معاملہ آ گیا تو خان نے اتنے قریب سے اپنی خارا شگاف گولی کی ضرب کی شدت پر امید کر کے پھر فیر کیا۔ گولی پھر کھوپڑی کی چٹان پر رائیگاں ہی گئی۔ اب خان کے رائفل میں ایک کارتوس باقی تھا، پلٹ کر جو دیکھا تو شہباز اچھل کود اور پینتروں میں دس گز دور ایک جانب علیحدہ ہو گیا تھا اور بھرا رائفل اس کے ہاتھ میں تھا۔ ہاتھی دس گز کے اندر خان پر سونڈ بڑھا بڑھا کر لپٹنے کے لئے لپکتا تھا۔ اور شہباز خان تک پہنچنے کے لئے پینترے کاٹ رہا تھا۔ ادھر پوری پارٹی نے بڑے زور سے چلا کر کہا "پانوں توڑیئے! پانو توڑیے!" مگر خان نہایت اطمینان کے ساتھ بیچ و خم دے کر اور پینترے کاٹ کاٹ کر سونڈ کی لوک سے خود کو بچا رہا تھا اور قلعہ کا قلعہ خان پر دم اٹھا اٹھا کر اخیر جھپٹ کر رہا تھا اور چنگھاڑ چنگھاڑ کر سونڈ سے خون کا دھواں سا اڑا رہا تھا، خان کو خطرہ میں سمجھ کر شہباز نے ایک دفعہ ہاتھی کو بڑے زور سے للکارا، گویا صریحاً اس کی بلا اپنے سر لیکر اسے موقع فراہم کرنے کی کوشش کی۔ ہاتھی اک ذرا ادھر متوجہ ہوا، اور گھوم کر اس پر لپکا سائڈ ملتے ہی خان نے کان کے گھگھوے میں اخیر گولی لگائی، اور گرتے گرتے شہباز ہاتھی کے چنگل میں تھا، گردن سے پکڑ کر سر سے اونچا ہوا میں گھمایا اور زمین پر دھم سے پٹخ دیا۔ اگلا پانوں بڑھا کر پنڈلی دبائی اور دوسری پنڈلی سونڈ میں پکڑ کر جھٹ سے چیر دیا، پھر ایک چیتھڑا سونڈ میں دبا ہی ہوا تھا۔ خالی رائفل ہاتھ میں لئے نہتے خان کی جانب رجوع ہوا اور یکدم دائیں بائیں سے چوبیس گولیوں کی باڑھ نے تڑ تڑ تڑا تڑ سر سے پاؤں تک چھلنی کر دیا اور اراراد دھڑام قلعہ کا قلعہ زمین پر آ رہا۔ اور جب دونوں جانب سے دھوئیں اور گرد کو چیر کر پہنچے تو سونڈ کی لپیٹ میں بوڑھا خان دبا ہوا تھا۔ کو لہو کے بیلوں میں لپٹا ہوا گنے کا پاتا سا ؛

۱۸۵۷ء

کوائف و صحائف

۱۸۵۷ء ہماری ملّی زندگی کی ایک اہم تاریخ ہے جو گزشتہ سو برس سے برابر ہمارے ذہنوں میں تازہ رہی ہے اور آئندہ بھی ہمارے تہذیبی و معاشری تقاضوں کے باب میں رہنمائی کا کام دیتی رہے گی۔ ۱۸۵۷ء نے ہماری سیاسی، معاشری اور ثقافتی زندگی پر کیا اثر ڈالا، اس کا جائزہ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔

عنوانات مطالب:

مذہبی رجحانات	مولانا غلام رسول مہر
تعلیم	ڈاکٹر محمد باقر
سیاسیات	شکور احسن
زبان	ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی
ادب	سید عابد علی عابد
دہلی کے اخبارات	خلیل الرحمٰن داؤدی
بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ	ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی
بہادر شاہ ظفر کے فرامین	ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی
غالب کے مکاتیب	مولانا غلام رسول مہر
انگریز افسروں کے خطوط	(ریڈیو پاکستان لاہور)

کتاب نفیس اردو ٹائپ میں نہایت دیدہ زیب چھاپی گئی ہے۔ سرورق رنگین، دیدہ زیب

قیمت صرف دو روپے

ملنے کا پتہ:- ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

پشتو بدلے:

ملغلرے[1]

(راز و نیاز)

محمد جی
مترجمہ: عاصم حسین

مرد: کل رات میں نے سیر کی اس زلف کے بازار میں
بھونروں کی صورت پرفشاں صد غنچۂ گلنار میں
آشفتہ لب کھولے ہوئے ٹھوڑی کے عشرت زار میں
اور پائی اُن لونگوں کی بو، اُس نشہ آور ہار کی
بھونروں کی صورت سیر کی اس زلف کے گلزار کی

عورت: خوشبو سے میرے ہار کی تو مست اور بے خود ہوا
پھر آم کی صورت مرے بستر پہ آ کر سو گیا
تجھ سے جبھی تو لاگ ہے زلفوں کے چوکیدار کی
کل رات میں نے سیر کی اس زلف کے بازار کی

مرد: گو لاکھ اس کو لاگ ہو، مجھ کو بچالے گا خدا
زلفوں کی ندیاں بند کر، اک پیار ہو مجھ کو عطا
طوطی صفت گلگشت کو جاناں مجھے کر دے رہا
ہاں سیر کرنے دے مجھے اک بار اس انبار کی
کل رات میں نے سیر کی اس زلف کے گلزار کی

عورت: الفت کے گلشن میں اگر لے یار جانے دوں تجھے
پھر کیا عجب باغی ہو تو اور مجھ سے آنکھیں پھیر لے
جب رخ دکھا دیتی ہوں میں بجھ جاتے ہیں روشن دیئے
پھر مجھ کو حق سے دین ہے گیسوئے عنبر بار کی
کل رات میں نے سیر کی اس زلف کے بازار کی

مرد: ہاں حسن کی دولت تجھے بخشی گئی لا انتہا
بس اک نظر میری طرف، خواہاں ہوں تیرے وصل کا
جب سے تری جانب صنم! میں نے رواں قاصد کیا
میرے دل کو ڈس لیا ناگن زلفِ تار کی
کل رات میں نے سیر کی اس زلف کے گلزار کی

عورت: یہ ناگن! اس سے جانِ جاں! میں ہوں کرا سکتی فسوں
تیری محبت میں ہوئی بے چین، محرومِ سکوں
آ پکھلی سے بھاگیں کہیں، غیروں سے میں بیزار ہوں
حاصل مری زلفوں پہ ہے قدرت تجھے یلغار کی
کل رات میں نے سیر کی اس زلف کے گلزار کی

شاعر محمد جی یہاں پکھلی میں استاد زمن
وہ بادشہ ہے اس کو کیا خیلِ گدایاں سے سخن
اشرافِ دہلی. باج دیں، وہ فاتح اقلیم فن
تعریفِ گیسو میں رواں ہے سیل اک اشعار کی
کل رات میں نے سیر کی اس زلف کے گلزار کی

---

[1] پشتو = موتی

ڈراما:

حق بحقدار رسید

کمال احمد رضوی

کردار:

- پاشا صاحب
- رقیہ خاتون
- ریاض
- یاسمین
- کوکب جہاں
- شاہد جمال اور بڑے میاں
- ایک وکیل

پہلا منظر:

نواب ذوالفقار علی خاں مرحوم کی کوٹھی کا وسیع ہال۔

—— پردہ اٹھنے پر ہال میں پاشا صاحب ایک صوفے پر نیم دراز ہیں۔ خاص لکھنوی وضع کے آدمی ہیں۔ انگرکھا اور اس کے نیچے چست پاجامہ پہن رکھا ہے۔ سر پر دو پلے کی ٹوپی اوڑھ رکھی ہے جو ان کی پیشانی پر خم ہو کر ٹکی ہوئی ہے۔ پاؤں میں اعلیٰ درجے کی سلیم شاہی جوتی ڈال رکھی ہے۔

ان کے برابر والے صوفے پر رقیہ خاتون تشریف فرما ہیں۔ پینتیس کی عمر ہے۔ رنگ روغن میں کوئی کمی نہیں آئی۔ صرف آنکھوں کے پپوٹے موٹے ہو گئے ہیں اور منکا ڈھلک آیا ہے۔ چہرے پر ایک خاص قسم کی ملائمت اور بردباری کی علامت ہے۔ ان کے ساتھ ہی صوفے پر ان کا لڑکا ریاض بیٹھا ہوا ہے، عمر کوئی ۱۹ سال ہوگی۔ موٹے شیشے کی عینک لگا رکھی ہے۔ چہرا بھرا، ہائیں فلاسفرانہ۔

پاشا :- (بیزاری کے سانس بھر کر) بڑی راہ دکھلائی اس کم بخت وکیل نے۔

رقیہ :- اتنے بے صبر کیوں بنے جاتے ہو۔ ابھی دیر ہی کہاں ہوئی اتنی۔

پاشا :- لو، اور دیر کیا ہوگی نواب کو دفنائے پورے تین گھنٹے گذر چکے۔

ریاض :- ادھر منکر نکیر نواب صاحب کا حساب کتاب لے رہے ہوں گے، ادھر ماموں جان اپنا حساب کرنے آگئے۔

پاشا :- اماں، تم کالج کے لونڈے اتنے زبان دراز کیوں ہوتے ہو (رقیہ سے) یہ صاحبزادے بڑوں کی باتوں میں اپنی ٹانگ اڑانا پیدائشی حق کیوں تصور کرتے ہیں؟

ریاض :- مگر، ماموں جان! آپ اپنا حساب لینے نہیں آئے تو یہاں اور کیا کرنے آئے ہیں؟ میں نے کون سی غلط بات کہہ دی۔

پاشا :- میاں صاحبزادے، اگر میں اپنا حساب چکانے آیا ہوں تو آپ کی والدہ ماجدہ مع اپنے دو عدد بچوں کے یہاں فاتحہ خوانی کے لئے آئی ہیں؟

رقیہ :- (ریاض کو ڈانٹ کر) ریاض، تم کیوں الجھتے ہو؟ چپ ہو جاؤ نا لوگ یہ تو تو میں میں سنیں گے تو کیا کہیں گے کہ ادھر جنازہ اٹھا نہیں، ادھر لوگ حساب کتاب لینے آگئے۔

پاشا :- لیکن اس کم بخت وکیل سے کوئی پوچھے کہ تیری طرح سب لوگ بیکار تو نہیں۔ اب ہم یہاں بدھوؤں کی طرح بیٹھے ان جناب کے نزول اجلال کا انتظار کر رہے ہیں۔

ریاض :- آپ اس وکیل کا کہاں انتظار کر رہے ہیں ماموں جان، آپ تو اس وصیت نامے کا انتظار کر رہے ہیں جو نواب صاحب مرحوم نے اس وکیل کی تحویل میں دے رکھا ہے۔

پاشا :- ابے بکواس بند کرے گا یا میں تیرے کھینچوں کان۔ چار حرف انگریزی کے کیا پڑھ لئے بقراط بن گئے۔

(دروازے پر گھنٹی کی آواز)

ریاض:۔ لیجئے ایک اور دعویدار آ گئے

(شاہد جمال اندر داخل ہوتے ہیں)

پاشا:۔ اچھا یہ ڈرامہ نگار صاحب بھی آس لگائے ہوئے تھے۔

شاہد:۔ ادھر تو، تو گویا محفل جم چکی ہے!

پاشا:۔ اچھا ہوا کہ آپ بھی رونق بڑھانے تشریف لے ہی آئے۔

شاہد:۔ میں تو صاحب ویسے ہی چلا آیا۔

پاشا:۔ اماں رہنے دو، ویسے ہی تو تم نواب صاحب کی زندگی میں کبھی نہیں آئے۔

شاہد:۔ معاف کیجیے گا، نواب صاحب اپنی زندگی میں گھسنے ہی کب دیتے تھے مجھے یہاں؟

پاشا:۔ تو پھر آپ ان کی موت کے بعد کیا ان کی روح کو خوش کرنے کے لئے آئے ہیں؟

شاہد:۔ خیر مجھے تو وہ کبھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا کرتے تھے۔ میں اس کا اعتراف کرنے میں کوئی خفت محسوس نہیں کرتا مگر آپ کی تو شکل سے وہ بیزار ہوا کرتے تھے۔

پاشا:۔ آدم بیزاری ان کی فطرت جو تھی۔

ریاض:۔ میں نے تو سنا ہے ماموجان کہ وہ آپ کو سرے سے آدمی ہی تصور نہیں کرتے تھے۔

شاہد:۔ تمام زندگی ان کے آگے یہی تو ہاتھ پھیلائے رہتے تھے۔

پاشا:۔ ارے تو لا ولد تھے، اگر میں نے کبھی کبھار کچھ لے لیا تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا ان پر۔ پھر بھی ان کا اپنا بھانجہ تھا۔

رقیہ:۔ اے بھیا، کبھی کبھار کیوں کہتے ہو، پچھلے پندرہ برس سے ان ہی کے سہارے تو جی رہے ہو۔

پاشا:۔ اور یہ تمہارے لونڈے اور لونڈیا کا خرچ بھی تو وہی دیتے تھے۔ اور تم جب سے بیوہ ہوئی ہو تمہارا خرچ کس نے چلایا؟

رقیہ:۔ یہ ان کی لاابالی منشی تھی کہ بیوہ بھانجی کا خیال کیا۔

پاشا:۔ اور انہوں نے جو میری ذات پر خرچ کیا وہ مرے سے نالائقی تھی گویا۔

رقیہ:۔ مگر تم نے ان کے جیتے جی کبھی اپنے ہاتھ پاؤں بھی ہلائے؟ میں تو خیر بیوہ بے کس تھی، اگر انہوں نے میری درمے کبھی مدد کی تو میں اس کی مستحق تھی۔

پاشا:۔ خیر تو اب دیکھ لینا کہ میں بالکل نکھٹو نہیں ہوں۔ نواب نے جو میرے نام رقم چھوڑی ہوگی اس سے ایسا شاندار بزنس کروں گا کہ انشاء اللہ ان کی روح خوش ہو جائے گی۔

رقیہ:۔ بس رہنے دو، تم نے جو تیر چلائے ہیں مجھے معلوم ہے۔ واہی تباہی میں روپیہ اڑانے کے سوا کچھ نہ کرو گے۔

ریاض:۔ ویسے ماموں جان کونسی بزنس کا ارادہ ہے آپ کا؟

پاشا:۔ میرا ارادہ ہے کہ ایک اعلیٰ درجے کا ریستوراں کھولوں۔ میں تو اس کی آرائش کا نقشہ بھی بنوا چکا ہوں۔

ریاض:۔ پھر تو وہاں آپ کے بے فکرے دوستوں کی خوب محفل جما کرے گی۔

رقیہ:۔ ہاں شطرنج بازی کے سوا ان کا اور کام کیا ہے۔

پاشا:۔ اچھا تم لوگوں کو جو روپیہ ملے گا اس سے تو نواب کا شاندار مزار تعمیر کراؤ گی نا!

رقیہ:۔ اگر مزار تعمیر نہیں کرایا تو ان پیسوں سے مجرا بھی نہیں کراؤں گی۔

پاشا:۔ بس منہ پچائے بیٹھی رہو۔

ریاض:۔ امی جان دراصل ان پیسوں سے مجھے ولایت بھجوا رہی ہیں وہاں میں "پرسنل مینجمنٹ ازم" کا کورس کروں گا!

پاشا:۔ پھر تو پورے خدا کی سنوارن جاؤ گے۔

رقیہ:۔ اے کون جانے کتنے ملیں گے کتنے نہیں گے۔ مجھے تو انہیں پیسوں میں یاسمین کی شادی کی فکر بھی ہے وہ ایک تقریب کے بعد ابھی تک یاسمین کالج سے آئی نہیں۔ اس کا اس موقع پر موجود ہونا بہت ضروری ہے۔

پاشا:۔ گڑ موجود ہے چیونٹی خود بخود چلی آئے گی۔ تم فکر نہ کرو۔

ریاض:۔ اچھا شاہد آپ کا ان پیسوں سے کیا کچھ کرنے کا پروگرام ہے؟

شاہد:۔ کیسا پروگرام؟

ریاض:۔ یعنی آپ کو جو روپے ملیں گے ان سے کوئی پبلشنگ ہاؤس کھولنے کا ارادہ تو نہیں!

شاہد:۔ بھئی مجھے تو سرے سے یقین ہی نہیں کہ نواب صاحب مرحوم

نے میرے لئے کوئی رقم چھوڑی ہوگی میں نے آپ لوگوں سے
پہلے ہی عرض کر دیا کہ میں ان کے بہت ہی معتوب عزیزوں
میں سے ہوں۔
ریاض:۔ خیر یہ تو آپ کسر نفسی سے کام لے رہے ہیں۔
شاہد:۔ نہیں۔ یہی اصل واقعہ ہے۔ انہیں میرے لکھنے پڑھنے کا پیشہ
قطعی پسند نہ تھا۔ میں جب بھی ان سے ملا انہوں نے ہمیشہ
یہی کہا کہ میاں یہ کیا الٹی سیدھی کتابیں لکھا کرتے ہو۔ کوئی کام
کیا کرو۔
ریاض:۔ مگر میں آج ان کی کتابوں کی الماری دیکھ رہا تھا اس میں آپ کی
بھی چند کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔
شاہد:۔ واقعی؟ تعجب ہے! انہیں تو میرا ادیب بننا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔
ریاض:۔ آپ کے ایک دو ڈرامے تو میں نے بھی سرسری طور پر رسالوں میں
دیکھے تھے، مگر وہ مجھے بڑے خشک۔ کوئی چٹپٹی سی چیز لکھا کیجئے۔
شاہد:۔ مجھے ایسی چیزیں لکھنا نہیں آتیں۔
پاشا:۔ تو پھر لکھنا بند کر دو کسی حکیم نے تو تجویز نہیں کیا ہے۔
شاہد:۔ دراصل میں اپنے شوق کے تحت لکھا کرتا ہوں۔
پاشا:۔ یہی وجہ ہے کہ تمہاری کوئی مارکیٹ نہیں ہے۔
(گھنٹی کی آواز)
لو یاسمین اور [illegible]
(یاسمین اندر داخل ہوتی ہے)
یاسمین:۔ معاف کیجئے گا۔ آپ لوگوں کو میری وجہ سے زحمت ہوئی خواہ مخواہ
میرا انتظار کرنا پڑا۔ دراصل آج کالج میں الکشن تھا۔ اور میں
چونکہ اس میں سکریٹری ہو گئی ہوں۔۔۔
پاشا:۔ اور [illegible] فوٹوگرافروں اور [illegible] نے آپ کے [illegible]
ایسا ہجوم کر دیا کہ آپ کا انٹرویو ختم ہوتے ہوتے پسینہ نکل آیا۔
رقیب:۔ [illegible] پاشا کا یہ مذاق نہیں بھایا) یاسمین [illegible]
(وہ ان کے ساتھ صوفے پر بیٹھ جاتی ہے۔)
یاسمین:۔ تو سب لوگ آ چکے!
پاشا:۔ سوائے اس بدبخت نابکار وکیل کے۔
یاسمین:۔ (شاہد کو دیکھ کر) اوہو۔ شاہد بھائی بھی آئے ہوئے ہیں۔
آداب عرض کرتی ہوں۔

شاہد:۔ تسلیم!
پاشا:۔ جنہیں مرحوم نواب ذوالفقار علی سے بڑی عقیدت تھی، اپنے
ساتھ عقیدت کے پھول لائے ہیں۔
یاسمین:۔ شاہد بھائی! میں نے کل آپ کے ناول پر ایک رسالہ میں ریویو پڑھا تھا
ریاض:۔ جس میں انہیں مطعون کیا گیا تھا!
یاسمین:۔ بہرحال میں تبصرہ نگار کی رائے سے اتفاق نہیں رکھتی۔ وہ ناول
مجھے خود ذاتی طور پر بہت پسند ہے۔ میری کئی سہیلیوں نے بھی
اس کی بڑی تعریف کی ہے۔ میں نے جب اپنی ایک سہیلی کو بتایا کہ
آپ میرے عزیز ہوتے ہیں، تو اسے یقین نہیں آتا تھا۔
شاہد:۔ اچھا؟
یاسمین:۔ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ آپ کا آٹوگراف دلوا دوں گی۔
اس نے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کے آٹوگراف جمع
کر رکھے ہیں۔
شاہد: مگر میں تو بہت ہی چھوٹا سا ادیب ہوں
یاسمین:۔ پھر تو آپ سے ضرور آٹوگراف لینا چاہئے ورنہ کل کلاں کو
اگر آپ بڑے ادیب ہو گئے تو پھر دکھائی کہاں دیں گے آپ!
پاشا:۔ ہاں ہاں تم لوگ یہ ادب وب ڈسکس کرتے رہوگے یا اس وکیل
نابکار کو بلوانے کا بھی کوئی اپائے کروگے!
ریاض:۔ صبر سے کام لیجئے ماموں جان۔ وکیل آپ کا حق غصب نہیں
کر پائے گا۔
پاشا:۔ شام ہو رہی ہے دوستوں کی محفل چھوڑ کر یہاں بیٹھا ہوں۔
اچھا چلو بڑے میاں کو تو پکارو تاکہ جب تک کوئی چائے شربت
وغیرہ ہی ہو جائے۔ اپنا تو انتظار میں گلا ہی خشک ہو گیا۔
ریاض:۔ دوسروں کے تو گلے نہ پڑیئے آپ، لیجئے وہ بڑے میاں خود آگئے۔
(بڑے میاں اندر داخل ہوتے ہیں)
بڑے میاں:۔ حضور وکیل صاحب تشریف لے آئے ہیں یہیں بلا لوں۔
پاشا:۔ (داخل کر بیٹھ جاتے ہیں) ایں! وکیل صاحب آگئے؟ ویری گڈ۔
فوراً بلاؤ انہیں۔ اور ہاں، دیکھو بڑے میاں، کیا نام ہے تمہارا؟
خیر نام کو چھوڑو، نام میں کیا رکھا ہے۔
— ہاں تو وکیل صاحب کو بھیج کر تم جلدی سے شربت وغیرہ
بنا لاؤ۔

بڑے میاں :۔ بہت بہتر سرکار۔ (چلا جاتا ہے۔ اس کے جانے کے فوراً ہی بعد وکیل صاحب داخل ہوتے ہیں)

وکیل :۔ معاف کیجئے گا حضرات، مجھے ایک مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں ذرا دیر ہو گئی۔

پاشا :۔ کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں ہمیں کون سی ایسی جلدی تھی ہمارے کوئی حلق میں تو دم اٹکا ہوا نہیں میں ذاتی طور پر ہر کام آرام سے کرنے کا عادی ہوں۔ آپ نے سنا ہو گا۔ دیر آید درست آید۔

ریاض :۔ (کھانستا ہے)

پاشا :۔ کیوں بے گستاخ، تو کھانستا کیوں ہے؟

ریاض :۔ ذرا گلا خشک ہو گیا تھا۔

پاشا :۔ ہاں تو وکیل صاحب، پہلے آپ شربت وغیرہ پی لیں ــ تھوڑی دیر آرام کر لیں۔ اس کے بعد اگر مزاج چاہے تو وصیت نامہ ــ

وکیل :۔ جی ہاں، وہ میں ساتھ لے کر آیا ہوں۔ آپ خاطر جمع رکھیں۔
(وہ فائل کو اٹھا کر کاغذات کو الٹتا پلٹتا ہے)

پاشا :۔ وکیل صاحب، مناسب ہو گا کہ میں نواب صاحب مرحوم کے عزیزوں کا آپ سے تعارف کرا دوں۔ لیجئے داہنی طرف سے شروع کرتا ہوں۔ یہ میری بہن اور نواب صاحب مرحوم کی بھانجی رقیہ خاتون صاحبہ ہیں۔ ان کے یہ دو بچے ہیں۔ ریاض اور یاسمین اور یہ شاہد جمال صاحب ہیں۔ نواب صاحب مرحوم کے بھتیجے۔

وکیل :۔ اور آپ کی تعریف؟

پاشا :۔ میرا نام احمد علی پاشا ہے۔ اور میں نواب صاحب مرحوم کا بھانجا ہوں۔

وکیل :۔ خوب! تو گویا نواب صاحب مرحوم کے تمام عزیز اس وقت یہاں موجود ہیں!

پاشا :۔ جی ہاں ہمارے علاوہ نواب صاحب مرحوم کا اصلی عزیز اور کوئی نہیں۔

(دروازے پر گھنٹی کی آواز)

(بڑے میاں شربت کی ٹرے لئے ہوئے داخل ہوتے ہیں اور میز پر ٹرے کو رکھ دیتے ہیں)

بڑے میاں :۔ سرکار، ایک بٹیا تشریف لائی ہیں۔

رقیہ :۔ کوئی لڑکی ہے؟ کہہ دو اس وقت ہم لوگ یہاں ایک خاص کام سے جمع ہوئے ہیں۔ ہم اس وقت کسی سے نہیں مل سکتے۔

بڑے میاں :۔ وہ تو میں نے کہا تھا ان سے، مگر وہ کہتی ہیں کہ میں بھی اسی خاص کام کے سلسلے میں آئی ہوں۔

پاشا :۔ یعنی کوئی اور رشتہ دار پیدا ہو گیا نواب صاحب کا ــ خیر جاؤ بلالو۔

(بڑے میاں چلے جاتے ہیں تھوڑی دیر بعد کوکب آتی ہے)

کوکب :۔ آداب عرض کرتی ہوں۔

پاشا :۔ جی؟ فرمائیے کس غرض سے آنا ہوا؟

کوکب :۔ جس غرض سے آپ موجود ہیں۔

پاشا :۔ یعنی؟

کوکب :۔ یعنی میں نواب صاحب مرحوم کا وصیت نامہ سننا چاہتی ہوں۔

پاشا :۔ مگر آپ ہوتی کون ہیں وصیت نامہ سننے والی؟

کوکب :۔ میں ان کی لڑکی ہوتی ہوں۔

رقیہ :۔ کیا بکواس ہے۔ نواب صاحب تو عمر بھر کنوارے رہے۔

کوکب :۔ پھر اس معاملے میں خود وکیل صاحب وضاحت فرما دیں گے جن کے ہی بلاوے پر آئی ہوں۔

وکیل :۔ جی ہاں حضرات، نواب صاحب مرحوم نے اپنے وصیت نامے میں واقعی کوکب جہاں صاحبہ کو اپنی صاحبزادی قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ میں یہاں پر مزید تفصیل پیش کرنے کے لئے معذرت چاہوں گا۔

کوکب :۔ آپ غالباً میری پھوپھی زاد بہن یعنی رقیہ خاتون صاحبہ ہیں۔ ابا جان مرحوم نے آپ کی جو شکل مجھے بتائی تھی اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے۔

رقیہ :۔ بہرحال میں آپ سے بہن کہلوانا پسند نہیں کرتی۔

کوکب :۔ اور غالباً یہ ریاض اور یاسمین ہیں۔

یاسمین :۔ جی ہاں۔ اور یہ شاہد جمال صاحب ہیں۔

کوکب :۔ جی ہاں ان کا نام میرے لئے اجنبی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ کچھ ان کی ادبی کاوشوں سے بھی متعارف ہوں۔

یاسمین :۔ اور میرے ماموں جان ـــ
کوکب :۔ شطرنج کے شوقین!
پاشا :۔ تو گویا آپ ہم سب سے پوری طرح متعارف ہیں۔
کوکب :۔ جی ہاں بدقسمتی سے ذاتی طور پر شرف نیاز آج ہی حاصل ہو سکا۔
وکیل :۔ خیر، اب چونکہ آپ لوگ ایک دوسرے سے متعارف ہو چکے ہیں اس لئے اب میں نواب صاحب مرحوم کا وصیت نامہ اور دیگر کاغذات آپ لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہوں۔
رقیہ :۔ ریاض دروازہ بند کر دو۔
پاشا :۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرا خیال ہے نواب صاحب مرحوم کا کوئی خفیہ عزیز اب اور نہ ہوگا۔
وکیل :۔ وصیت نامے سے پہلے نواب صاحب مرحوم نے آپ لوگوں کے نام ایک خط تحریر کیا ہے (فائل میں سے ایک لفافہ نکالتا ہے) آپ لوگ یہ سربمہر لفافہ دیکھ رہے ہیں نا۔ یہ خط انہوں نے وصیت نامے سے پہلے آپ لوگوں کے سامنے پڑھ کر سنانے کی ہدایت کی تھی۔
شاہد :۔ ایک مردہ کا خط
پاشا :۔ ویسے یہ کیا سوجھی تھی نواب صاحب کو؟
شاہد :۔ بہرحال، تو لیجئے پہلے میں وہ خط آپ کو پڑھ کر سناتا ہوں۔
نواب صاحب لکھتے ہیں" بظاہر یہ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ مردہ زندوں سے خطاب کرے۔ مگر واقعہ کچھ ایسا ہی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میری موت کے بعد بھی اپنے عزیزوں اقارب کے لئے میرے دل میں جو جذبات ہیں وہ تبدیل نہ ہو پائیں گے میرے بیشتر عزیز جو اس وقت اسی ہال میں جمع ہیں، میری موت کا بڑے خلوص کے ساتھ انتظار کر رہے تھے۔ انہیں میری ضرورت نہیں، میری دولت کی ضرورت ہے۔ میں اپنے ان عزیزوں کے متعلق اختصار کے ساتھ اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرتا ہوں "
پاشا :۔ ماشاءاللہ نواب صاحب بڑے پائے کی نثر لکھتے تھے۔
وکیل :۔ آگے سنئے "میرے ایک اللہ کی سنوار بھانجے ہیں احمد علی پاشا۔ اس شخص نے تمام زندگی اپنے ہاتھ پاؤں نہیں ہلائے میں گذشتہ پندرہ سالوں سے اس مردود صفت انسان کی کفالت کا خرچ برداشت کرتا رہا، اس لئے یہ شخص ممنون ہونے کی بجائے ہمیشہ میری پیٹھ پیچھے میرا مذاق اڑاتا رہا۔
پاشا :۔ یہ نواب کی سراسر زیادتی ہے۔
وکیل :۔ دیکھئے حضرات! جب میں آپ کو مرحوم کا خط سنا رہا ہوں خدارا کوئی صاحب اس میں مداخلت نہ فرمائیں، ورنہ میں خط بند کر دوں گا۔
رقیہ :۔ نہیں نہیں، آپ سنائیے، ہم خاموشی سے سنیں گے۔
وکیل :۔ (آگے پڑھتا ہے) اس شخص کو شطرنج اور تاش کا جنون ہے یہ شخص نحوست کا پتلا ہے۔ میں ایسے ناکارہ اور نالائق انسان پر قطعی اپنی دولت ضائع نہیں کروں گا۔
پاشا :۔ (چونک کر) تو کیا نواب نے میرے لئے کچھ نہیں چھوڑا۔
وکیل :۔ جی نہیں مجھے افسوس ہے۔
پاشا :۔ خدا سمجھے گا تم سے نواب!
وکیل :۔ جی، تو نواب صاحب آگے لکھتے ہیں" ایک میری بھانجی صاحبہ ہیں رقیہ خاتون۔ جن کے متعلق مجھے یہ اعتراف کرنے میں قطعی باک نہیں کہ یہ انتہائی خود غرض قسم کی خاتون واقع ہوئی ہیں۔ ان کے دونوں بچوں کی پرورش اور تعلیم کا بوجھ گذشتہ پندرہ سال سے میرے ذمے ہے۔ میں ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ انہیں منی آرڈر بھیجتا رہا۔ مگر ان کی طرف سے مجھے منی آڈر کی رسید کے سوا شکریہ کا ایک لفظ تک نہیں ملا۔ اب چونکہ ان کا ایک لڑکا جوان ہو چکا ہے۔ اس لئے انہیں گھر کی کفالت کے لئے میری مدد کی محتاجی نہیں رہی
رقیہ :۔ تو انہوں نے میرے نام کچھ نہیں چھوڑا۔
وکیل :۔ آگے سنئے، آپ لوگوں میں ضبط کیوں نہیں رہتا ہے، البتہ یاسمین کی شادی کے لئے دس ہزار روپے چھوڑ رہا ہوں،
رقیہ :۔ صرف دس ہزار ؟!
وکیل :۔ جی ہاں، آگے سنئے، نواب صاحب لکھتے ہیں" اب میں ایسے شخص کا ذکر کر رہا ہوں، جو نہ میرا رشتہ دار ہے اور نہ میرا عزیز، مگر اس کا احسان میں کبھی تا دمِ زیست فراموش نہیں کر سکتا۔ میری مراد اپنے بوڑھے ملازم سے ہے۔ اس شخص نے میری زندگی میں ایک باپ، ایک بھائی، ایک بہن، ایک بیٹے، ہر چیز کی

ہم پاسباں ہیں اس کے یہ پاسباں ہمارا

کمی پوری کر دی میری موت کے بعد اگر واقعی کوئی شخص شدت کے ساتھ میری جدائی محسوس کرے گا تو وہ میرا بوڑھا ملازم ہوگا میں اس کے لئے ہمہ تن منت گذار ہوں۔ میں اس کے نام مبلغ پندرہ ہزار کی رقم چھوڑتا ہوں۔ اس کے علاوہ اس کی تنخواہ تا دم زیست ملتی رہے گی۔

یاسمین:۔ بڑے میاں کو بلا کر یہ خوش خبری سنا دینی چاہیئے۔

رقیہ:۔ (ڈانٹ کر) اوہو، سن لیکا نا، ایسی جلدی کیا ہے۔

وکیل:۔ ہاں تو آگے سنئے " اب میں اپنے بھتیجے کے متعلق چند حروف لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ شاہد جمال صاحب ہیں میں نے ان کی تصانیف خریدی ضرور ہیں مگر ان کی تحریریں مجھے کچھ ایسی خشک اور غیر دلچسپ محسوس ہوئیں کہ میں انہیں پڑھ نہ سکا میرے تمام عزیزوں میں یہ واحد شخص ہے جس نے میرے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اسی شہر میں اس نے فاقے کئے مگر میرے پاس نہیں آیا۔ اسے دنیا میں اگر کسی پر اعتماد ہے تو اپنے آپ پر مجھے اس شخص پر اتنا بھروسہ ہے کہ میں اپنی بقیہ رقم جو آٹھ لاکھ بچتی ہے اسی شخص کے سپرد کرتا ہوں۔

پاشا:۔ (منہ پھاڑ کر) آٹھ لاکھ!

شاہد:۔ (ہنس کر) میں یقین نہیں کرتا۔

وکیل:۔ وصیت نامے میں یہی رقم آپ کے نام چھوڑی گئی ہے۔

کوکب:۔ مبارک ہو شاہد صاحب!

شاہد:۔ میں حیران ہوں نواب صاحب کو آخر یہ کیا سوجھی۔ میں اس کا بالکل مستحق نہیں ہوں۔

پاشا:۔ تو پھر حضرت آپ اسے ہم میں تقسیم فرما دیجئے۔

رقیہ:۔ اچھا تو انہوں نے اپنی لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں لکھا؟

وکیل:۔ جی ہاں، ان کا ذکر بھی سن لیجئے! "میری بچی کو دوسروں کے ہاتھوں میں پلی بڑھی مگر اب تک میں نے اس کے تمام اخراجات کی کفالت کی ہے۔ اب ماشاءاللہ وہ اپنے سن شعور کو پہنچ چکی ہے یہی وہ وقت ہے جب اسے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ہے۔ اگر ایسے نازک موقع پر اگر میں اپنی دولت یا اس کا کچھ حصہ اس کے حوالے کر دوں تو اس کی زندگی کی رفتار ماند پڑ جائے گی۔ وہ پھر اپنے آپ بھروسہ کرنے کی بجائے دوسروں پر بھروسہ کرے گی۔ اس لئے میں اس کے نام کچھ نہیں چھوڑتا، البتہ اس کی تعلیم کے اخراجات حسب معمول میرا وکیل ادا کرتا رہے گا۔ میں کوکب کو شاہد جمال کی سرپرستی میں چھوڑتا ہوں۔ وہ اس کی جو مدد کرنا چاہیں انہیں اختیار ہے۔" (سانس بھر کر) بس نواب صاحب کا خط یہاں پر ختم ہو جاتا ہے۔

پاشا:۔ ہوں۔ تو گویا اس وقت ہم شاہد صاحب کے مہمان ہیں۔

شاہد:۔ یہ آپ کا ہی گھر ہے قبلہ۔

رقیہ:۔ ظاہر ہے شاہد کی دیکھ بھال کے لئے خود مجھے بھی یہاں رہنا پڑے گا۔

پاشا:۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ریاض اور یاسمین کا تمہارے بغیر کبھی جی نہیں لگے گا۔

کوکب:۔ اچھا تو میں اب اجازت چاہوں گی شاہد صاحب!

شاہد:۔ یہ تو آپ کا گھر ہے کوکب صاحبہ، آپ کا سب سے زیادہ حق ہے۔ آپ یہیں رہیئے۔

کوکب:۔ جی نہیں۔ میں اپنے پاؤں پر خود کھڑی ہو سکتی ہوں۔ خدا حافظ!

شاہد:۔ خدا حافظ!

(کوکب چلی جاتی ہے)

وکیل:۔ اچھا شاہد صاحب! میں چلتا ہوں۔ کل کسی وقت کاغذات لیکر آجاؤں گا۔ آپ کے دستخط لینے ہوں گے۔

رقیہ:۔ یاسمین! شاہد صاحب کے لئے اوپر بالکنی والا کمرہ تو درست کر دو۔

ریاض:۔ ماموں جان آپ کے دوست آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے آپ تو گھر جائیں گے۔

پاشا:۔ طبیعت کچھ میری بھی مضمحل معلوم ہو رہی ہے یہیں آرام کرنا پڑے گا۔

(پردہ)

دوسرا منظر

(نواب صاحب مرحوم کی کوٹھی کا ایک کمرہ)

رقیہ:۔ تو پھر انہوں نے پکچر ہاؤس میں تو تم سے باتیں کی ہوں گی۔

یاسمین:۔ نہیں وہاں بھی اسی طرح منہ سجائے بیٹھے رہے۔ انٹرول ہوا تو میرے لئے ومٹو کا گلاس منگوایا اور خود آرام سے

بیٹھے چائے نوش فرماتے رہے ۔

رقیہ :۔ تو تم نے ہی کچھ پہل کی ہوتی ۔

یاسمین :۔ موڈ بھی تو ہو انسان کا ۔ امی جان مجھے تو کچھ عجیب سا لگتا ہے وہ میرے ساتھ بالکل بچوں کی طرح سلوک کرتے ہیں

رقیہ :۔ خیر تم سے عمر میں بھی تو بڑے ہیں شاید کچھ نہیں تو دوگنے کا فرق ہوگا ۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کس طرح اسے ڈھب پر لاؤں ۔

یاسمین :۔ پچھلی دفعہ تم نے ان کے ساتھ پک نک پر بھیج دیا ۔ وہاں بھی اسی طرح بور ہوئی ۔ میں نے رومانٹک ہونے کی کوشش بھی کی تو وہ بالکل ٹھس بیٹھے رہے ۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگے ایک ناول کا پلاٹ سوچ رہا ہوں، دق نہ کرو ۔

رقیہ :۔ خیر ابھی بھی کچھ وقت نہیں گذرا ۔ اس سے زیادہ دولتمند لڑکا اور کہاں ملے گا ۔ نئی روشنی کا آدمی ہے ، اس لئے اگر تم سنجیدگی سے کوشش کروگے تو مغلوب ہو جائے گا ۔

یاسمین :۔ انہوں نے تو مزاج ہی بالکل جدا گانہ پایا ہے ۔ میں در اصل انہیں سمجھ ہی نہیں سکی ہوں ۔

رقیہ :۔ خیر بیٹی تم خود سمجھدار ہو ۔ کالج کی تعلیم یافتہ ہو ۔ اگر اس شخص نے تمہیں قبول کر لیا تو ساری زندگی عیش سے گذر جائے گی ۔

یاسمین :۔ (شرما کر آنکھیں نیچے کر لیتی ہے) لیکن یہ مارے باندھے کا بھی تو کام نہیں ۔

پاشا :۔ (باہر سے چلا کر) اماں کیا سب زہر کھا کر سو رہے ہو؟ کوئی سنتا ہی نہیں ۔

رقیہ :۔ اس پاشا نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے ۔ ایک ہفتے کیلئے آئے تھے اور تین مہینے سے پڑے روٹیاں توڑ رہے ہیں ۔

یاسمین :۔ اور پھر تنہا نہیں ۔ تین تین چار چار مصاحب ہر وقت بغل میں موجود رہتے ہیں ۔ موئے شطرنج کی بازیاں ہیں کہ کبھی ختم ہونے ہی میں نہیں آتیں ۔ شاہد بیچارہ ٹھیرا سیدھا سادا آدمی ۔ وہ اپنی زبان سے کاہے کو کچھ کہنے لگا ۔

پاشا :۔ (اندر آ کر) اماں کب سے پکار رہا ہوں ، تم لوگ کان میں روئی ڈالے بیٹھی ہو ۔ چار شریف آدمی کھانے کے انتظار میں بیٹھے ہیں ۔ کسی کے کان پر جوں ہی نہیں رینگتی ۔

رقیہ :۔ اے ہے تو میں نے کب چار آدمیوں کے کھانے کا ٹھیکہ اٹھا رکھا ہے ۔

پاشا :۔ ہاں تو جب تک میں اس گھر میں ہوں یہ ٹھیکہ تو اٹھانا ہی پڑے گا ۔

رقیہ :۔ جی رہنے دیجئے ۔ ہم سے یہ مفت کا تکلف نہیں ہونے کی ۔ میں روز روز یہ ناز برداریاں اٹھانے کو تیار نہیں ۔

پاشا :۔ ادھو تمہیں میرے دوست زہر کیوں لگتے ہیں ؟ وہ کوئی تمہارا دیا کھاتے ہیں جس کا کھاتے ہیں وہ تو پیشانی پہ شکن تک نہیں ڈالتا ۔

یاسمین :۔ تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آپ ایسے آدمی کی سادگی سے ناجائز فائدہ اٹھائیں ۔

پاشا :۔ ارے تم دونوں ماں بیٹی تو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو ۔ تم خوب عیش کرو ۔ نئے نئے سوٹ بنواؤ ۔ ہوٹلوں اور سینماؤں کا لطف لو ۔ دو سو چار سو کی شاپنگ کرو ۔ اگر میں نے دو شریف آدمیوں کو تفریح کے لئے بلا لیا تو تم دونوں کا دم نکلنے لگا ۔

رقیہ :۔ تم تو ایک ہفتے کے لئے آئے تھے ۔ تین مہینے سے جمے بیٹھے ہو آخر یہ کوئی شرافت ہے ۔

پاشا :۔ اور تم دونوں تینوں ! تم سے زیادہ خرچ ہے میرا ؟

رقیہ :۔ میں تو گھربار سنبھال رہی ہوں ۔

پاشا :۔ اور یہ صاحبزادی صاحبہ ؟ یہ خانہ داری کی ٹریننگ لے رہی ہیں یہاں ؟

رقیہ :۔ (جل کر) پاشا ، تم یوں ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے نہ پڑا کرو

پاشا :۔ تو پھر بھی میرے معاملے میں دخل نہ دیا کرو ۔

رقیہ :۔ دخل کیسے نہ دوں ، ضرور دخل دوں گی ، کوئی حرام کا روپیہ نہیں ہے کہ پانی کی طرح بہا دیا جائے ۔

پاشا :۔ پانی کی طرح روپیہ میں نہیں بہا رہا ، تم دونوں بہا رہی ہو میری زبان نہ کھلواؤ تو بہتر ہے ۔

رقیہ :۔ کیا کیا خورد برد کر دیا ہے ہم دونوں نے ؟ دھمکی کیا دیتے ہو اپنی اوقات دیکھ کر بات کرو ۔

پاشا :۔ ارے تم تو چاہتی ہو کہ ساری دولت تمہارے قبضے میں چلی آئے اور ہمیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکو ۔

رقیہ :- وہ تو خدا ہی جانتا ہے۔

پاشا :- یہ تم روزانہ یاسمین کو اس کے ساتھ کیوں باہر بھیجا کرتے ہو؟ اسی لیئے تاکہ تم اسے بہلا پھسلا کر داماد بنانے میں کامیاب ہو جاؤ مگر تمہیں اتنا بھی پتہ نہیں کہ اس کی نظر کہیں اور ہے۔

رقیہ :- کہیں اور ؟

پاشا :- ہاں ہاں کہیں اور۔

رقیہ :- کہاں ہو سکتی ہے اس کی نظر۔

پاشا :- کوکب بیگم! تم اتنی عقلمند بنتی ہو۔ تم نے محسوس نہیں کیا وہ اس کے سامنے کیا بھیگی بلی بنا رہتا ہے۔

رقیہ :- اس لئے کہ وہ اس کے باپ کا مرہون منت ہے۔

پاشا :- پرسوں ہوٹل میں بیٹھے وہ جس طرح باتیں کر رہے تھے اس سے تو کچھ اور اندازہ ہوتا تھا۔

رقیہ :- خیر یہ ہمارا کام نہیں کہ ہم ان کے معاملات میں دخل دیں۔

پاشا :- یہی تو میں کہتا ہوں۔ ہمیں ایک دوسرے کے معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیئے۔ میں تمہارے کاموں میں دخل نہیں دیتا اور نہ تمہیں میرے کاموں میں دخل دینا چاہیئے۔ اسطرح ہم زیادہ بہتر اشتراک کے ساتھ زندگی گذار سکتے ہیں۔ اچھا تو میں چلا۔ جبھی بازی چھوڑ کر آیا ہوں۔ کھانا جلدی بھجوا دو۔

(پاشا چلا جاتا ہے)

رقیہ :- (جبر سے) اچھی بات ہے۔

(باہر کار رکنے اور دروازہ بند ہونے کی آواز)

یاسمین :- امی شاہد صاحب آ گئے

رقیہ :- بس ٹھہر جاؤ۔ آج میں ان سے کہہ کر پاشا جی کا تو پتہ کٹواتی ہوں۔ تم جاؤ اپنے کمرے میں۔

یاسمین :- امی،

رقیہ :- کیا بات ہے ؟

یاسمین :- آج پھر تھوڑی سی شاپنگ کرنی ہے مجھے سو روپے دیجئے۔

رقیہ :- خیر لے لینا۔ تم اس وقت تو کھسکو یہاں سے۔ اور دیکھو، فضول پیسے نہ خرچ کر دو۔ لوگ یوں کیا کم آنکھ لگائے بیٹھے ہیں۔

(یاسمین چلی جاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد شاہد اندر داخل ہوتا ہے)

شاہد :- آپ لوگ کھانے پر میرا انتظار نہ کیجئے گا۔ میں اوپر اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ آپ لوگ کھانا کھا لیجئے۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

رقیہ :- (تشویش سے) کیوں، خیر تو ہے شاہد میاں ؟

شاہد :- جی ہاں، ویسے میں ٹھیک ہوں، البتہ صبح سے سر کچھ بھاری بھاری سا محسوس ہو رہا ہے۔

رقیہ :- تو کیا ہونا تا۔ لاؤ سر دبا دوں۔

شاہد :- ارے نہیں، میں ٹکیہ کھا لوں گا۔ ٹھیک ہو جائے گا درد

رقیہ :- نہیں نہیں۔ تم سوچتے بہت زیادہ ہو نا، اس لئے درد ہو گیا ہے۔ لاؤ دبا دوں، آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے، (پکار کر) یاسمین! اے یاسمین، ذرا تیل کی شیشی لیتی آنا۔

یاسمین :- (دور سے) اچھا — ابھی لائی۔

رقیہ :- آؤ یہاں آرام کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ لو اس اسٹول پر پاؤں پھیلا لو

شاہد :- آپ تو خواہ مخواہ زحمت کر رہی ہیں۔

رقیہ :- نہیں شاہد میاں، اس میں زحمت کی کیا بات ہے۔ اگر یاسمین یا یاسمین کے سر میں درد ہو تو ان کا سر دبانا میرے لئے زحمت ہو گی ؟ زحمتی ہے، بڑے شرمیلے ہو تم

شاہد :- یہ آپ کی عنایت ہے کہ آپ میرے لئے اتنی زحمتیں اٹھاتی ہیں۔

رقیہ :- دیکھو تم جاؤ گے تو میں برا مان جاؤں گی۔

شاہد :- (مصنوعی ہنسی کے ساتھ) اچھا تو پھر نہیں کہتا۔

(یاسمین اندر آتی ہے)

یاسمین :- یہ لیجئے شیشی۔ اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے لیجئے گا۔ (چلی جاتی ہے)

رقیہ :- اچھی بات ہے۔

(وقفہ)

رقیہ :- شاہد میاں!

شاہد :- جی

رقیہ :- کیا سوچا کرتے ہو تم اتنا ؟ جب ہی تو تمہارے سر میں درد ہو جاتا ہے۔

شاہد :- میں سوچا کرتا ہوں کہ خدا نے آخر مجھے یہ کس جرم کی سزا

دی ہے۔

رقیہ :- سزا!

شاہد :- جی ہاں، یہ اتنے سارے روپے، یہ اتنی ساری دولت۔
میں نے کبھی اس کی تمنا نہیں کی تھی۔

رقیہ :- تم کیا کہہ رہے ہو؟

شاہد :- جیسے خود سے) میں ایک معمولی سا ادیب تھا۔ جب اپنے قلم سے پیسے کمایا کرتا تھا تو فخر سے میری گردن اونچی ہو جاتی تھی۔ جب میرا ڈرامہ نشر ہوتا، میرے ناول کا مسودہ فروخت ہوتا، میری فلمی کہانی بک جاتی تو اس سے جو رقم مجھے مل جاتی، میں اس سے اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کی چیزیں خریدا کرتا۔ اس وقت میرے پاس فالتو پیسہ نہ ہوتا اور میں خوش ہوتا۔ میں اس خوشی میں میلوں پیدل چلتا، میرے جوتے گھس کر ٹوٹ جاتے میرے پاؤں کبھی نہ تھکتے۔ ایک جگہ سے ناکام ہو کر دوسری جگہ جانا اور ہر جگہ نئی امید بندھتی۔ میری زندگی کا ہر آن ہر لمحہ امید ول کے جال بنتی، نرم، خوبصورت اور رنگین جال!

رقیہ :- لیکن اب تمہیں اس بیکار کی بھاگ دوڑ سے نجات مل گئی۔
اب تم اپنی کتابیں خود چھاپ سکتے ہو۔

شاہد :- (خشک ہنسی کے ساتھ) اب میں لکھ ہی کہاں سکتا ہوں۔ میرے اندر جو قوت تھی وہ تو جیسے سراب ہو کر رہ گئی۔

رقیہ :- نہیں نہیں۔ میرا خیال ہے۔ اتنی ساری ذمہ داریوں کے احساس نے تمہاری طبیعت کو اچاٹ کر دیا ہے۔

شاہد :- کاش نواب صاحب نے مجھے ایسی سخت سزا دی ہوتی۔

رقیہ :- میرا تو خیال ہے تم شادی کر لو شاہد میاں۔

شاہد :- (چونک کر) شادی؟

رقیہ :- ہاں۔ تمہاری عمر کے انسان کے تمام تفکرات کا یہی ایک علاج ہے۔

شاہد :- لیکن میں نے تو اس معاملے میں کبھی سوچا تک نہیں۔

رقیہ :- اب تو سوچ سکتے ہو۔ اب تمہارے حالات پہلے کی نسبت بہت بدل چکے ہیں۔ (وقفہ) اگر تم پسند کرو تو لڑکی تو گھر میں ہے تمہیں باہر جانے کی بھی ضرورت نہیں۔

شاہد :- گھر میں؟

رقیہ :- ہاں، یاسمین کا تمہارے ساتھ رشتہ کرنے میں مجھے قطعی عذر نہیں۔

شاہد :- آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ میری اور اس کی عمر میں تو دگنے کا فرق ہے۔

رقیہ :- کوئی فرق نہیں پڑتا شاہد میاں۔

شاہد :- نہیں نہیں۔ معاف کیجئے میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔

رقیہ :- تم اتنے برہم کیوں ہو گئے؟ کیا میری بات بری لگی تمہیں؟

شاہد :- نہیں۔ یہ بات مجھے جچی نہیں۔

رقیہ :- (ہنس کر) یہ تو تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ میں نے تو یہ بات اس لئے کہی تھی کہ اس سے تمہاری بھلائی مقصود تھی۔

شاہد :- میری بھلائی؟

رقیہ :- ہاں، تم اپنی عمر کی اس منزل پر ہو شاہد میاں جہاں یہ پہاڑ سا رستہ تنہا نہیں کٹا کرتا۔ اس لئے ایک ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔

شاہد :- لیکن اس کمی کا مجھے احساس کیوں نہ ہوا؟

رقیہ :- یہی وجہ ہے کہ تم اس طرح رہتے ہو۔

شاہد :- تو میں کیا کروں؟

رقیہ :- وہی جو میں نے تمہیں کہا۔

شاہد :- مگر ــــ

رقیہ :- اگر تمہیں اپنی عمر کا اتنا احساس ہے تو اس کی ایک اور صورت ہو سکتی ہے۔

شاہد :- کیا؟

رقیہ :- تم کسی سن رسیدہ عورت سے، یعنی اپنی جوڑ کی عورت سے، شادی کر لو۔

شاہد :- یعنی؟

رقیہ :- یعنی جو صحیح معنی میں تمہاری رفیق حیات بن سکے گی جو تمام جذباتی طوفانوں سے گذر چکی ہو، سنجیدہ ہو، دور اندیش ہو ــــ ایسی ہی عورت تمہارے لئے پر سکون گھر بنا سکتی ہے۔

شاہد :- پر سکون گھر ــــ یہی خواب تھا جو میں ازل سے دیکھتا آ رہا تھا۔

رقیہ :- اگر تم نظر دوڑاؤ گے تو تمہیں ایسا ساتھی ڈھونڈنے

کے لئے دور نہیں جانا پڑے گا۔

رقیہ:۔ مجھے اپنی زبان سے کہتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ مگر۔ مگر۔

شاہد:۔ آپ بلا تکلف کہئے۔

رقیہ:۔ میں تمہارے لئے اپنا گھر بنا سکتی ہوں شاہد!

شاہد:۔ (حواس باختہ ہو کر) آپ!

رقیہ:۔ (اطمینان سے) ہاں، میں!

شاہد:۔ یقیناً میں خواب دیکھ رہا ہوں، یا میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں الٹی سیدھی باتیں سوچنے لگا ہوں۔

رقیہ:۔ کہاں چلے شاہد میاں؟

شاہد:۔ (خود سے) میں کس جال میں آن پھنسا؟

رقیہ:۔ شاہد! تم نے جواب نہیں دیا۔

شاہد:۔ نہیں، میں جواب نہیں دے سکتا۔

رقیہ:۔ شاہد سوچو۔ ایک لمحہ کے لئے رک کر میری بات سنو۔

شاہد:۔ اوہ —

رقیہ:۔ شاہد رک کر سوچو، کیا میں بری ہوں، کیا میری شکل، کیا میری —

شاہد:۔ (چیخ کر) خدا کے لئے مجھے چھوڑ دیجئے — میں پاگل ہو جاؤں گا!

(پردہ)

تیسرا منظر

(وہی کمرہ جو پچھلے منظر میں ہے)

شاہد:۔ نہیں، اب میں اس زندگی کو اور زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔

رقیہ:۔ پھر بھی میں ہرگز یہ رائے نہ دوں گی کہ تم روپے کا بٹوارہ کرو۔

شاہد:۔ تو پھر میں اتنی ساری دولت کا کیا کروں گا؟

رقیہ:۔ تمہارا جو جی چاہے کرو مگر اس کو بانٹ کر تباہ نہ کرو۔ اگر یہ روپیہ بانٹنا ہی ہوتا تو نواب صاحب خود ہی بانٹ کر جاتے۔ لیکن انہیں معلوم تھا اتنا روپیہ تمہارے ہی ہاتھوں میں محفوظ رہ سکتا ہے۔ وہ کچھ کو لے

کھیلے ہوئے تھوڑی تھے۔

شاہد:۔ میرے دل کا چین اور رات کی نیند حرام کر رکھی ہے۔ میں کچھ سوچ نہیں سکتا، کر نہیں سکتا۔ جب سے یہ روپے ملے ہیں میرا دماغ ٹھپ ہو کر رہ گیا ہے۔ میں تو اپنی پچھلی معمولی سی زندگی میں ہی خوش تھا۔

رقیہ: خیر تمہارا جو جی چاہے کرو مگر ایسی حماقت کبھی نہ کرنا اور پاشا سے تو اس معاملہ میں رائے لینے کی قطعی ضرورت نہیں۔ وہ یہاں ایک ہفتے کے لئے آئے تھے اور مستقل جا بیٹھے ہیں اور پھر ہر وقت چار پانچ مصاحب بھی ساتھ موجود۔

شاہد: وہ بے چارے ہمارا کیا بگاڑتے ہیں؟ جب تک وہ ہیں انہیں بھی آرام اٹھا لینے دیجئے۔

رقیہ: نہیں شاہد میاں، تم سیدھے سادے آدمی ہو، لوگ تمہاری سادگی سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ میں نے تو ان کو رخصت کرنے کے انتظامات بھی مکمل کر لئے ہیں۔

شاہد: آپ کیا کہہ رہی ہیں، وہ اس کا بہت برا مانیں گے۔

رقیہ: تم فکر نہ کرو، میں ایسے طریقے سے انتظام کروں گی کہ سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی۔

شاہد: کیا مطلب؟

رقیہ: مطلب یہ کہ میں آج خود بھی اپنے گھر واپس جا رہی ہوں، میں نے اپنا تمام سامان درست کر لیا ہے۔ اور پھر اب تمہیں میری خاص ضرورت بھی نہیں رہی۔

شاہد: نہیں نہیں، آپ کے رہنے سے مجھے واقعی خوشی ہوگی۔

رقیہ: تم نہیں سمجھتے۔ جب تک میں یہاں رہوں گی پاشا ٹلنے کا نام نہیں لیں گے۔

شاہد: لیکن ان کے رہنے سے ہرج ہی کیا ہوتا ہے۔

رقیہ: ہرج یقیناً ہے۔ نواب صاحب نے اپنی تمام زندگی پاشا کو اس مکان میں گھسنے نہیں دیا۔ انہیں زندگی بھر جن جن چیزوں سے نفرت رہی پاشا وہی چیزیں بیٹھ کر یہاں کر رہے ہیں۔ کیا مرحوم کی روح ان حرکتوں سے خوش ہوگی؟

شاہد: یہ تو آپ درست فرماتی ہیں، ہر وقت کم بخت شطرنج کی منحوس بساط ہے کہ بچھی رہتی ہے۔ مجھے تو ان کے دوستوں میں کوئی بھی

شخص سلیقے کا نظر نہیں آیا۔ پتہ نہیں کہاں سے وہ ایسے واہیات
لوگوں کو اٹھا لاتے ہیں۔

پاشا: (باہر سے چیخ کر) اماں بڑے میاں، چلم تو بھر لاؤ ذرا، مر گئے کیا؟

رقیہ: دن بھر ان کے لئے ایک آدمی محض چلمیں بھرنے کو چاہئے۔

شاہد: افسوس کہ اس شخص نے تمام زندگی واہی تباہی میں گذار دی۔

رقیہ: یہ سب تمہاری حد سے زیادہ سادگی کا قصور رہے۔ میں ہوتی تو
انہیں لمحہ بھر کو جو شکنے دیتی۔ (پاشا آتے ہیں)

پاشا: پچاس آوازیں دے چکا ہوں مگر کسی کو جنبش ہی نہیں ہوتی۔

رقیہ: بھیا، یوں شور نہ مچایا کرو۔ یہاں تمہارا کوئی نوکر نہیں لگا ہوا ہے۔

پاشا: سن رہے ہو شاہد میاں؟ یوں لگتا ہے جیسے ان ہی کا دیا تو
کھاتا ہوں میں۔ خدانخواستہ اگر مجھے ان کی روٹیوں پر پلنا پڑتا
تو یہ تو شاید میرے گلے میں کتے کی زنجیر ڈلوا دیتیں۔

رقیہ: شرم اور حیا بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

پاشا: اوہو، تمہارے پیٹ میں کیوں درد ہوتا ہے؟ شاہد میاں
کہدیں، میں ابھی چلا جاؤں یہاں سے۔

رقیہ: شاہد صاحب کہہ چکے ہیں۔

پاشا: (چونک کر) کہہ چکے ہیں۔

رقیہ: ہاں، میں بھی آج یہاں سے جا رہی ہوں اور تمہارا بھی سامان
بندھوا دیا ہے۔

پاشا: تم شوق سے جاؤ مگر میرا سامان کیوں بندھوا دیا؟

رقیہ: شاہد میاں کے حکم سے۔

پاشا: خوب، تو گویا اب ہم شاہد میاں کے لئے بار بن گئے ہیں۔

رقیہ: جو مہمان ایک ہفتہ کے لئے آئے اور چار مہینے آکر جما رہے وہ
بار نہیں تو اور کیا ہوگا؟

پاشا: کیوں شاہد میاں؟

شاہد: میں نے سوچا ہے کہ جاتے وقت آپ کی جو خدمت کر سکتا ہوں
وہ ضرور کروں گا۔

پاشا: یہ تمہاری سعادت مندی ہے لیکن وہ خدمت کیا ہوگی؟

شاہد: میں آپ کو دو ہزار روپے پیش کر دوں گا۔

پاشا: دو ہزار؟ خوب، اور رقیہ کو؟

شاہد: ان کے دونوں بچوں کو ملا کر چھ ہزار کا تخمینہ ہے۔

رقیہ: (پاشا سے) اب تو خوش ہو؟

پاشا: ہاں چلو چند روز اور آرام سے کٹ جائیں گے۔

شاہد: آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ میں آج تمام روپوں کا فیصلہ کر رہا ہوں۔

پاشا: میاں، میں نے تو تم سے بہت پہلے کہا تھا کہ اسے مستحق لوگوں میں
تقسیم کر دو۔

شاہد: میں نے یہ بات سوچی تھی مگر بانٹنا مناسب معلوم نہیں ہوا۔

پاشا: تو پھر خیرات کر دو۔

شاہد: وہ بھی بانٹنے ہی کی ایک شکل ہے۔

پاشا: اماں، یہ باتیں چھوڑو۔ آؤ ہم تم مل کر ایک اعلیٰ درجے کا ہوٹل
کھولیں۔ مغربی موسیقی اور کیبرے کا انتظام ہوگا۔ میری ایک واقف
لڑکی ہے۔ اول نمبر کا ڈانس کرتی ہے۔ پبلک پاگل ہو جائے گی
خدا کی قسم! بولو کیا کہتے ہو؟

شاہد: جی نہیں، شکریہ۔ میں اس مزاج کا آدمی نہیں۔

پاشا: تو پھر اسی طرح جنجال میں پھنسے رہوگے؟

شاہد: اب میں نے اس جنجال سے نکلنے کی صورت نکال لی ہے۔

پاشا: وہ بھلا کیسے؟

شاہد: یہ آپ کو ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔

(گھنٹی بجتی ہے)

پاشا: کیا وکیل کو بلوایا ہے؟

شاہد: نہیں۔

(کوکب اندر آتی ہے)

کوکب: شاہد صاحب آپ نے مجھے بلوایا ہے؟

شاہد: جی ہاں، میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا، آیئے تشریف رکھئے۔

کوکب: (بیٹھتی ہوئی) اچھا تو فرمایئے کیسے یاد کیا؟

شاہد: آپ کو شاید یاد ہو کہ آپ کے والد مرحوم نے اپنے خط میں مجھے
ایک طرح سے آپ کا سرپرست ٹھیرایا تھا۔

کوکب: جی ہاں۔

شاہد: میں نے ان کی خواہشات کا ہمیشہ احترام کیا ہے۔ آج وہ وقت
آگیا ہے کہ میں اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکوں۔

کوکب: میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔

شاہد: میں نے آپ کے والد سے ملی ہوئی ساری رقم آج آپ کے نام منتقل

کرادی ہے۔ آج سے میں پھر آزاد ہوں۔ آج میں چھوٹی سی دنیا میں واپس جا رہا ہوں۔ جہاں میں نے اپنی قوت بازو سے اپنی جگہ بنائی تھی۔

پاشا: تمہیں یقین ہے شاہد میاں، کہ اس فرض منصبی کو ادا کرنے کے بعد تمہیں کبھی افسوس نہیں ہوگا؟

شاہد: آج میرے سر سے بہت بڑا بوجھ ٹل گیا ہے۔ مجھے اس کا کبھی افسوس نہ ہوگا۔

رقیہ: دولت جن لوگوں کے آگے پیچھے بھاگتی رہی ہے وہ اسی طرح دولت سے کتراتے رہے ہیں۔

شاہد: جن لوگوں نے اپنا آدرش ان سے زیادہ بلند اور مستحکم قدروں پہ تعمیر کیا ہوتا ہے، وہ ان ہتھیاروں سے مات نہیں کھاتے۔

پاشا: تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آج تم پھر اپنی اوقات پہ آگئے۔

شاہد: ہاں، میں تو اسی اوقات سے مطمئن تھا۔ اچھا کوکب صاحبہ، اب میں اجازت چاہوں گا۔

کوکب: مگر ٹھہریئے آپ بھول رہے ہیں کہ آپ میرے سرپرست ٹھہرائے گئے ہیں اور میں آپ کی سرپرستی سے محروم ہونا نہیں چاہتی۔

شاہد: میں اب اس زندگی سے اکتا چکا ہوں کوکب۔

کوکب: اب ہم دونوں مل کر زندگی کا مقابلہ کریں گے۔ اب میں بھی زندگی کے بار میں آپ کے ساتھ حصہ بٹاؤں گی۔

بڑے میاں: (اندر آ کر) پاشا صاحب اور رقیہ بی کا سامان تیار ہے۔

رقیہ: اچھا تو شاہد میاں، ہم اجازت چاہتے ہیں۔

کوکب: پھر بھی جانے سے پہلے یہ قول دیجئے کہ آپ آئندہ بھی آتی رہیں گی۔ اور اگر ہماری کبھی ضرورت ہو تو فراموش نہیں کریں گی۔

رقیہ: میں قول دیتی ہوں۔

شاہد: اور پاشا صاحب آپ سے بھی یہی درخواست ہے۔

پاشا: مجھے تم دونوں اس معاملے میں انتہائی فراخ دل پاؤ گے۔

رقیہ اور پاشا: اچھا تو خدا حافظ! (دونوں چلے جاتے ہیں)

کوکب اور شاہد: خدا حافظ!

کوکب: (آواز دے کر) بڑے میاں، میرا سامان اٹھا کر بالکنی والے کمرے میں لگا دو۔

(پردہ)
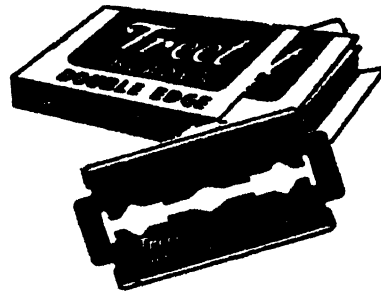
کاغذ نے تہذیب و تمدن کی ترقی میں ہمیشہ نمایاں حصہ لیا ہے۔ طباعت کی ایجاد کے بعد تو کاغذ کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی۔ محدود علوم کو چار دانگ عالم میں پھیلا کر کاغذ نے انسانی زندگی کو پہلے سے زیادہ روشن اور خوش آیند بنانا شروع کیا۔ جب تک کتاب انسان کا مایۂ ناز سرمایہ اور اس کی مسرتوں کا منبع بنی رہے گی، انسانی زندگی میں کاغذ کی اہمیت بھی برقرار رہے گی۔

پاکستان کی آیندہ ترقی بھی بڑی حد تک کرنافلی پیپر ملز کے ساتھ وابستہ ہے کیونکہ یہ کارخانہ ملک کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے لیے تمام اقسام کا کاغذ مہیا کرتا ہے۔

کرنافلی پیپر ملز لمیٹڈ، چندر گونا - مشرقی پاکستان

KP-6 UNITED

رپورتاژ:

جہلم کے اُس پار

عارف حجازی

جرنیلی سڑک ایک سیاہ اژدہے کی مانند ناہموار زمین اور ٹیلوں کے درمیان بل کھاتی ہوئی کبھی نظروں سے اوجھل ہو جاتی اور کبھی سیدھی سپاٹ دکھائی دینے لگتی۔ سڑک کے دونوں طرف اونچے اونچے درخت کھڑے تھے، جن کی گہری چھاؤں میں ابدی سکون اور فرحت کا احساس ہو رہا تھا۔ صدیوں پرانی سڑک بوڑھی اور تجربہ کار ماں کی مانند بھی تو تھی جس نے اپنے سینے پر نجانے کتنے سپوتوں کو کھیلتے کودتے دیکھا تھا۔ اسے لشکروں کے پُرعظمت مناظر بھی یاد تھے۔ پشاور سے لے کر کلکتہ تک سیکڑوں پرکیف و پُرخطر مقامات سے گزرتی چلی گئی ہے اور اس کی عظمت و تاریخی شان و شوکت سے لوگ صدیوں سے واقف ہیں۔ گویا وہ دلیس کی شہ رگ ہے، جس کی اہمیت اور تاریخی پس منظر میں شیر شاہی دور کی کئی سچی روایات وابستہ ہیں۔

چلتے چلتے میں اور میرا ملاقاتی کنک خاں جرنیلی سڑک چھوڑ کے بائیں ہاتھ پر ایک پگڈنڈی پر نکل آئے۔ بڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ کنک خاں ایک فوجی پنشن یافتہ معمر آدمی تھا۔ جنگ عظیم اور جنگ عالمگیر دونوں لڑائیوں میں اس نے سمندر پار جا کر بہت سے تمغے حاصل کئے تھے۔ جہاں دیدہ اور خوش مزاج ہونے کے سبب سے پہلی ہی ملاقات میں ہم دونوں بے تکلف ہو گئے، چنانچہ مارگلہ[1] کے چشمے سے لوٹ کر ہم بریگیڈیر جنرل جان نکلسن فاتح دہلی کے یادگار مینار کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ اس مقام کے شمال مغرب کی طرف کھیت اور ہری بھری جھاڑیوں سے ڈھکے ہوئے ٹیلے تاحدِ نگاہ پھیلے ہوئے تھے۔ فضا بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ کبھی کبھی گیہوں کی پکی فصل کاٹتے وقت کوئی سرو قامت دوشیزہ درانتی ہاتھ میں لئے ہماری طرف دیکھنے لگتی۔ اسے دور سے یوں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی یونانی مجسمہ گیہوں کی سنہری بالیوں کے جھرمٹ میں کھڑا ہے۔ ہم دونوں اس وقت دنیا بھر کے قصے لئے بیٹھے تھے اور پُراسرار مرغزاروں کے بدلتے ہوئے مناظر ہماری نگاہوں میں کھبے جا رہے تھے۔ اب میں نے کھڑے ہو کر مینار کے محراب کو دیکھا جس پر جنرل مذکور کے کارنامے کندہ تھے۔ لکھا تھا:

"۱۸۴۷ء اور ۱۸۴۸ء میں سکھوں سے جنگ کی۔ ۱۸۴۹ء اور ۱۸۵۷ء کی لڑائیوں میں شہرت دوام حاصل کی اور دہلی فتح ہونے کے بعد مارا گیا۔"

نکلسن کے یادگار مینار کو دیکھ کر جیسے آپ ہی آپ میرے دل میں نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ میں ۱۸۵۷ء کی آزادی کا تاریخی المیہ (جسے غیر مورخ "غدر ہند" کے نام سے موسوم کرتے ہیں) میری نگاہوں کے سامنے ایک پرانی تصویر کی مانند گزر گیا۔ اتنے میں کنک خاں بولا:

"شاہ جی انگریزی میں یہ کیا لکھا ہے؟"

"ایک انگریز جرنیل کے کارنامے لکھے ہیں۔ جس نے سن ستاون کی جنگ آزادی کے خلاف لڑ کے ہزاروں وطن پرستوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔"

یہ سُن کر کنک خاں کے چہرے کا رنگ بدل سا گیا اور بڑی سنجیدگی سے بولا "ہمیں ان یادگاروں سے عبرت حاصل کرنا چاہیئے۔"

"ٹھیک کہتے ہو کنک خاں۔ ظلم و تشدد کی ایسی یادگاریں قوم کو غفلت سے چونکانے کے ایک تازیانہ ہیں ——"

پھر میں نے موضوع گفتگو بدل کے دریافت کیا۔ "تم اس علاقہ کے چپے چپے سے واقف ہو گے؟"

"جی ہاں۔ آپ جہاں چلنا چاہیں، میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

ہم دونوں اپنی جگہ سے اٹھے اور پھر سڑک پر نکل آئے، تھوڑی دیر میں شمال کی جانب سے بادل کا ایک بہت بڑا ٹکڑا فضاؤں میں لہراتا ہوا

---

[1] راول پنڈی سے تھوڑی دور پر ایک پُرفضا مقام ہے۔

اٹھا اور ہوا تیزی سے چلنے لگی۔ دو چار منٹ میں سورج بادل کی اوٹ میں چھپ گیا۔ مست خرام ہوا سے درخت، جھاڑیاں جھوم رہی تھیں اور کہیں دور سے کوئل کی آواز آ رہی تھی۔ اتنے میں ہمارے اوپر سے ایک نیل کنٹھ شور مچاتا ہوا گزر گیا اور میرے کانوں میں ساتھی دیس کی دوشیزہ کے گیت کے بول لہرانے لگے ——

"کروں کون جتن اے ری اے ری سکھی مورے نینوں سے برسے بادریا۔ آئی کالی گھٹا یا دل گرجے چلے ٹھنڈی پون مورا جیا ترسے۔"

اس وقت کا منظر کچھ ایسا تھا کہ مجھے یہ گیت بہت بھلا معلوم ہوا۔ جب ہم ایک ٹیلے کے قریب سے گزرے تو ایک نوجوان دیہاتی درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھا بڑے مزے میں گا رہا تھا۔ اس کی درد بھری آواز اور لمبی تانیں جیسے میرے دل کی انتہائی گہرائی میں اترتی چلی گئیں۔ میں نے کنک خاں سے کہا۔

"گیت تو بڑا پیارا معلوم ہوتا ہے۔"

"اسے ماہیا کہتے ہیں" کنک خاں بولا۔

"ماہیا۔"

جی ہاں۔ پنجابی گیتوں میں ماہیا بہت مشہور گیت ہے۔ مرد، عورتیں، لڑکیاں۔ غرضیکہ بچے بچے کو یہ گیت بہت مرغوب ہوتا ہے۔ اس کے ڈیڑھ مصرع میں دل کے جذبات کی کائنات سمائی ہوتی ہے، یوں سمجھ لیجئے جیسے کوزے میں دریا بند کر دیا گیا ہو ——"

"خوب۔ خوب" میں نے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ اور پھر باتیں چھیڑ دیں۔

دیہاتی گیت خواہ کسی علاقے کے کیوں نہ ہوں اور کتنے ہی ناقابل فہم اور پیچیدہ کیوں نہ ہوں۔ لیکن مطلب اور معنی کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتے۔ کھلی آزاد فضاؤں میں بسنے والے غریب کسانوں اور لوگوں پر جو کچھ گزرتی ہے وہ گیت بن کر اُن کی نوکِ زبان پر آ جاتی ہے۔ یہی قدرتی شاعری ہے جس میں مناظرِ قدرت سے لے کر دکھ، سکھ اور پیار اور محبت کی منھ بولتی اور زندہ جاوید تصویریں ملتی ہیں۔ جہاں کہیں ان گیتوں کے شیریں بول کانوں میں پڑتے ہیں، سننے والے کا دل مطلب سمجھے بغیر ہی پھڑک اُٹھتا ہے۔

کنک خاں میری لمبی چوڑی تمہید سن کر کچھ سوچنے لگا، پھر اپنی لمبی چھنگلیا میں سگریٹ دبا کر گہرا کش لگا کے بولا۔ شاہ جی ہمارے علاقے میں آپ جہاں کہیں جائیں گے [illegible] چھوٹے سب ہی کو مسکراتا ہوا پائیں گے۔ دن بھر محنت مزدوری، کھیتی باڑی اور بوجھ ڈھوتے ڈھوتے جہاں ذرا سی مہلت ملی کسی درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر گیتوں سے دل بہلا کے اپنی ساری تھکن بھول جاتے ہیں۔ یہاں کے لوگ [illegible] سبھی مگر بڑے مہمان نواز اور دلیر ہوتے ہیں۔ مزاج میں [illegible] بھی خوب ہوتی ہے۔ ہنسی مذاق کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ لیکن یہ مذاق، ظرافت کبھی کبھار انھیں دست و گریباں تک پہنچا دیتی ہے۔ غرضیکہ انتہائی محبت اور دشمنی کے جذبات انھیں غیر انسانی فعل کرنے پر مجبور کرتے رہتے ہیں۔ جن کی مثالیں گیتوں میں بھی کہیں کہیں خوب ملتی ہیں"

میں اپنے ملاقاتی کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ بڑی دیر تک گیتوں پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا اور اس سفر کی طویل مسافت کا ذرہ بھر احساس نہ ہوا اور سورج چھپتے چھپتے ہم پنجہ صاحب پہنچے۔ اس مقام کے بارے میں میرا یہ خیال تھا کہ اس کا نام پانچ دریاؤں کی مناسبت سے رکھا گیا ہوگا۔ لیکن کنک خان نے اس مقام کے نام کی وجہ جیسے یہاں کے سکھ بیان کیا کرتے تھے سنائی کہ ایک مرتبہ سکھوں کے پیشوا گرو نانک ادھر آنکلے اس دوران میں انھیں سخت پیاس معلوم ہوئی پانی کی تلاش میں ادھر ادھر آدمی دوڑائے گئے مگر پانی تھا کہ عنقا۔ سب لوگ حیران تھے کہ گرو جی کے لئے پانی کہاں تلاش کیا جائے۔ گرو جی جہاں مقیم تھے وہاں سے تھوڑی دور پر انھیں ایک پہاڑی نظر آئی جس کی چوٹی پر ایک مکان دیکھا۔ خیال آیا کہ اس مکان میں ضرور کوئی رہتا ہوگا اور اس کے پاس پانی بھی ہوگا [illegible] شخص اس پہاڑی پر پہنچا۔ جب مکان میں داخل ہوا تو ایک مسلمان درویش بابا قندھاری رہتے تھے۔ اس شخص نے درویش سے پانی مانگا۔ مگر انھوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اگر تمہارے گرو جی کو کمال آتا ہے تو پھر نیچے بیٹھے بیٹھے پانی کیوں نہ منگوا لیا۔ اس نے واپس آکر اپنے گرو جی سے بابا قندھاری کا ٹکا سا جواب سنا دیا کہتے ہیں پھر گرو نانک نے اپنی کرامت دکھائی اور وہ چشمہ جو پہاڑی پر تھا اُسے بیٹھے بیٹھے زمین پر کھینچ لیا۔ اس پر بابا قندھاری بہت بگڑے اور طیش میں آکر انھوں نے اس پہاڑی کو جس پر چشمہ تھا لڑھکا دیا۔ گرو جی نے جب پہاڑ کو نیچے آتے دیکھا تو ہاتھ بڑھا کر اُسے روک لیا۔ اس طرح پہاڑ کو روک لینے سے ان کے ہاتھ کے پنجے کا نشان بن گیا اور اسی نشان کی مناسبت سے اس مقام کا نام "پنجہ صاحب" مشہور ہو گیا!!

اس کہانی کو سن کر مجھے حسن ابدال کے مشہور "واہ باغ" اور "واہ" گاؤں کی روایت یاد آگئی۔ یوں تو کئی تاریخی باغات نظر سے گزرے مگر "واہ باغ" کا پورا ماحول بڑا دلکش اور رومان پرور ہے۔ ایک نہایت پُرفضا مقام پہ یہ باغ واقع ہے اس کے سامنے چوڑے پاٹ کی ندی بہتی ہے۔ باغ کے بیچ میں ایک بہت صاف ستھرے پانی کا چشمہ ہے۔ جسے آب رسانی کے کام میں لایا جاتا ہے۔ اس باغ کو جلال الدین اکبر شہنشاہ ہندوستان نے بنوایا تھا۔ جب وہ کشمیر جاتا تو اسی باغ میں کچھ روز قیام کرتا۔ باغ میں مغلیہ فن تعمیر کی دو یادگار عمارتیں بھی ہیں۔ ایک تو گر کر رفتہ رفتہ کھنڈر میں تبدیل ہوگئی ہے اور دوسری کچھ بہتر حالت میں ہے۔ کہتے ہیں جب واہ باغ بن کر تیار ہوا تو شہنشاہ دیکھنے کے لئے آیا اور اس کی دلکشی کو دیکھ کر بے ساختہ اس کی زبان سے نکل گیا:

"واہ چہ باغ است!"

چنانچہ اسی وقت سے یہ "واہ باغ" ہر خاص و عام میں مشہور ہوگیا۔ اور آبادی کا نام بھی "واہ" پڑ گیا۔

رات کنک خاں کے ایک ملاقاتی بگو خاں کی حویلی میں بسر کی۔ بڑی دیر تک الکائے پر پنجابی اور مقامی گیت سنے، ہیر وارث شاہ کے شعر سُنے۔ اور خوب گہما گہمی رہی۔ بگو خاں نے ہماری خاطر مدارات میں بڑی فراخدلی سے کام لیا۔ جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ جب آدھی رات کو لیٹنے کا موقع ملا، تو لمحہ بھر میں ایسی نیند آئی کہ دوسرے دن سورج چڑھتے آنکھ کھلی۔ کنک خاں اور بگو خاں میرے بیدار ہونے کے جیسے منتظر تھے۔ بیٹھک میں منہ ہاتھ دھلانے کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ نہا دھو کر فارغ ہوا تو ناشتہ کیا۔ لسی، مکھن سے چپڑی ہوئی اور مہکتی ہوئی روٹیاں، ساگ اور اُبلے ہوئے انڈے کھا پی کر جیسے میرے ہاتھ پیروں میں بلا کی چستی آگئی تھی۔ اب ہم پنجہ صاحب کا گوردوارہ دیکھنے کے لئے روانہ ہوگئے۔

ایک چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں سکھوں کی مقدس عبادت گاہ دوسری تاریخی یادگاروں کی طرح ویران اور خاموش تھی۔ اس کے پاس ہی ایک چشمہ دیکھنے میں آیا۔ جس کی صاف و شفاف سطح آب پر سنہری دھوپ نے چاندی کا پانی پھیر دیا تھا۔ تہہ کی ہر چیز صاف دکھائی دے رہی تھی۔ نیچے کے پتھر الماس کی مانند جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ ہاتھ ہاتھ بھر سیاہ رنگ کی مچھلیاں اپنے گلپھڑے، پنکھ ہلاتی ہوئی سطح آب پر آکر رک جاتیں اور منہ کھولے ہوئے ہمیں بڑے غور سے دیکھنے لگتیں۔ جیسے وہ ماضی کے درد بھرے افسانے سنانا چاہتی ہیں۔ ان کی موتی جیسی آبدار آنکھوں سے مایوسی اور دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔ لمبی مونچھیں اور دونوں بازو ہلا ہلا کر شاید اپنی ناکام جد و جہد کے بارے میں کچھ بیان کر رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ یہ غریب مچھلیاں ہمارے پاس اپنی رہائی اور آزادی کی درخواست لے کر آئی ہیں۔ شاید صدیوں کے پرانے اور روایتی چشمے کی قید و بند سے اُکتا گئی تھیں اور یہ چاہتی تھیں کہ ہماری طرح وہ بھی آزاد ہو جائیں اور کھلے آزاد پانیوں میں اچھلیں، کودیں اور رقص کریں۔ یہ سوچ کر مجھے ان غریب مچھلیوں پر بڑا رحم آیا۔ اتنے میں کنک خاں نے تھوڑے سے مُرمرے اور بھنے ہوئے چنے ان کے سامنے پانی میں ڈال دیئے اور وہ سب بھوک کے مارے دوڑتی ہوئی نیچے تہہ کی طرف چلی گئیں۔ آخر پلٹتے ہوئے ہم دونوں گوردوارہ کے اندر جانے کے خیال سے بڑے دروازے کی طرف نکل آئے لیکن وہاں سنگینوں کا پہرہ تھا، اس لئے واپس آگئے۔

دوسرے دن صبح ہم پنجہ صاحب سے ٹیکسلا روانہ ہوگئے۔ دوپہر سے پہلے ہی وہاں قیام کیا۔ کھانا کھانے کے بعد اصل مقام دیکھنے کو ہی چاہا اور سامنے عجائب خانہ پہنچے۔ کئی چیزیں دیکھنے میں آئیں۔ چوڑیاں، کنگھیاں، موسل، مرتی کی مالائیں، چکیاں، صراحیاں، سونے چاندی کے برتن جنگی ہتھیار اور بہت سی روزمرہ کے استعمال کی چیزیں تھیں، جن سے قدیم ہند و تہذیب و معاشرت کا پتہ چلتا تھا۔ کنک خاں نے ان تمام چیزوں کو دیکھ کر مجھ سے دریافت کیا:-

"شاہ جی یہ تو میں نے بھی سنا ہے کہ اصل شہر ابھی تک زمین میں دفن ہے۔ مگر یہ تباہ کیسے ہوا تھا؟"

"اس کے متعلق مجھے بھی نہیں معلوم" میں نے جواب دیا۔

پھر عجائب خانہ سے باتیں کرتے ہوئے باہر نکل آئے۔ میں نے کنک خاں کے کندھے کا سہارا لے کر کہا:-

"اس شہر کی تاریخی کہانی بڑی طویل ہے۔ جب سکندر نے مغربی پاکستان کے اس علاقے پر حملہ کیا تو اس وقت یہاں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں جن میں دریائے سندھ اور جہلم کے درمیانی علاقے پر راجہ امبھی حکمران تھا اور ٹیکسلا اس کی راجدھانی تھی۔ جب سکندر واپس چلا گیا تو پھر یہاں کئی حکومتیں

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

برماشیل ترقی پاکستان کا ایک حصہ ہے

اکیلی بستیاں

محبوب خزاں

بکیں چمپلی، پھوٹے اکیلی، آہیں بھرے دل جلی
بھوری پہاڑی، خاکی فصیلیں، دھانی کبھی سانولی
جنگل میں رستے، رستوں میں پتھر، پتھر پہ نیلم پری
لہرلی سڑکیں، چلتے مناظر، بکھری ہوئی زندگی
بادل چٹائیں، مخمل کے پردے، پردوں پہ لہریں پڑی
کاکل پہ کاکل خیموں پہ خیمے، سلوٹ پہ سلوٹ ہری
بستی میں گندی گلیوں کے زینے، لڑکے دھما چوکڑی
برسے تو چھاگل، ٹھہرے تو ہلچل، راہوں میں اک کھلبلی
گرتے گھروندے، اٹھتی امنگیں، ہاتھوں میں گاگر بھری
کانوں میں بالے، چاندی کے ہالے، پلکیں گھنی کھردری
ڈھری پہ چہرے، چہروں میں آنکھیں، آئی جوانی چلی
ٹیلوں پہ جوبن، ریوڑ کے ریوڑ کھیتوں پہ چالر چڑھی
وادی میں بھیگے روڑوں کی پٹی، چشموں کی چمپا کلی
سانچے نئے اور باتیں پرانی، مٹی کی جادوگری

غزل

سید ضمیر جعفری

درد میں لذت بہت، اشکوں میں رعنائی بہت
اے غمِ ہستی تری دنیا پسند آئی بہت

ہو نہ ہو دشت و چمن میں کچھ تعلق ہے ضرور
بادِ صحرائی بھی خوشبوئیں اٹھا لائی بہت

مصلحت کا جبر ایسا تھا کہ چپ رہنا پڑا
ورنہ اندازِ زمانہ پر ہنسی آئی بہت

بے سہاروں کی محبت، بے نواؤں کا خلوص
ہائے یہ دولت کہ انسانوں نے ٹھکرائی بہت

بے خیالی میں بھی کتنے فاصلے طے ہو گئے
بے ارادہ بھی یہ دنیا دور لے آئی بہت

مطمئن ہو دل تو ویرانوں کے سناٹے بھی گیت
دل اجڑ جائے تو شہروں میں بھی تنہائی بہت

اپنی خلقت میں بھی روشن ہوں گے لیکن اے ضمیر
میری راتوں سے بھی تاروں نے چمک پائی بہت

غزل

عبداللہ خاور

ترے خیال نے شب کو فراق اثر نہ کیا
مگر خیال نے آسودۂ نظر نہ کیا
ترا کرم ہے تری پردہ داریوں سے عیاں
نگاہِ شوق کو رسوائے رہگذر نہ کیا
ترے اسیر ہوئے خوگرِ درازئ شبی
گذار تو نے مگر جلوۂ سحر نہ کیا
نسیمِ صبح ترے منتظر ہیں غنچہ و گل
کہ ہم نے سوزِ تمنا کو منتشر نہ کیا
جو رہگذر تری وادی کی سمت جاتی ہے
اسے بھی حیلہ گرِ دل نے ہمسفر نہ کیا
وہ ناشنیدہ ترانے ہیں منتظر تیرے
جنہیں خیال نے آلودۂ ہنر نہ کیا
ہوس ہے دل کو اسی رنگِ التفات کی آج
کہ جس نے کاوشِ حرماں کو بے اثر نہ کیا
شبِ فراق نے بڑھ کر مٹا دئے سائے
غمِ جہاں کو بہرحال معتبر نہ کیا
نگاہِ شوخ کی کچھ جنبشیں جو پنہاں ہیں
شعاعِ ماہ نے دل کی طرف گذر نہ کیا
ترے دیار کی بے مہریاں ہیں غور طلب
ترے جنوں نے بھی آمادۂ سفر نہ کیا
حریمِ ناز کے پردے بڑے سکوت میں ہیں
کہ آج آہ نے رخ سوئے بام و در نہ کیا
ہمارے غم لبِ اظہار پا سکے نہ کبھی
فسانۂ رخ و گیسو کو مختصر نہ کیا
حدودِ ذہن میں لمحہ کوئی نہیں خاور
سکوتِ یاس نے جس کو گداز تر نہ کیا

شائستہ بیزار

گزر رہا ہے عجب طرح زندگی کا سفر
نہ رہبروں کی تمنا نہ منزلوں کی خبر
ہمیں خبر تھی نہ تم آؤ گے مگر پھر بھی
ہزار بار نگاہیں اٹھی ہیں جانبِ در
وہ راہرو ہیں کہ جب منزلیں قریب آئیں
خود اپنی گردِ سفر میں ہی رہ گئے کھو کر
غرورِ ترکِ تمنا کی خیر ہو یارب
وہ اجنبی سی نظر پھر ہے مہرباں ہم پر
یہ کس طرح سے سحر آج مسکرائی ہے
دل و نگاہ میں ٹوٹے ہزارہا نشتر
غمِ حیات کی منزل سے آؤ لوٹ چلیں
بہت اداس ہے سنتے ہیں ان کی راہگزر
غمِ جہاں کی کٹھن راہ کس طرح کٹتی
ترا خیال نہ ہوتا اگر شریکِ سفر
یہ کس مقام پہ لائی ہے بے حسی دل کی
نہ ظلمتوں کی شکایت نہ آرزوئے سحر
چلو کہ درد کے روشن کریں دیئے بیزار
بھٹک رہے ہیں اندھیروں میں کب سے قلب و نظر

غزل

احسن علوی

یادِ جفائے دوست نہ کیوں بھول جائیں ہم
آخر یہ رنج کس لئے ناحق اٹھائیں ہم

آخر قریب آ ہی گئی منزلِ مراد
کیوں شوق و آگہی کے نہ قربان جائیں ہم

ہمت سے کام لیں تو ہو بیدار اک جہاں
پھر کیوں نہ اپنے خفتہ مقدر جگائیں ہم

فرسودہ ہو چکے ہیں فلک تیرے شعبدے
آبادگاہِ دل میں تماشا دکھائیں ہم

رازِ دنیازِ عشق میں برپا ہوا انقلاب
رنجور و شکوہ سنج ہوں وہ مسکرائیں ہم

کیوں احترامِ شیوۂ آہ و فغاں کریں
کیوں وقفِ آہ و نالہ ہوں کیوں گڑگڑائیں ہم

کتنی طویل ہے شبِ ہجراں، دلِ غریب
مضطر ہے بے قرار ہے کیسے لبھائیں ہم

احسن کلامِ عہدِ جوانی تلف ہوا
اب کیسے سوزِ غم کی حکایت سنائیں ہم

مومن کا اندازِ فکر و بیان

بقیہ صفحہ ۱۵

دھوم ہے تابشِ خورشیدِ قیامت کی مگر
غیر کو بام پہ آ جلوہ دکھایا تم نے

شاد شاد آتے عیادت کو دمِ آخر تم
یہ نہ دیکھا کہ پڑا ہے کوئی زیرِ دیوار

نیک نامی نہ سہی مجھ کو ہے تم سے سروکار
مجھ سے اللہ نہ پوچھے گا عذابِ شبِ تار

وہ جلے محفلِ دشمن میں جو ہو شمع لقا
ایسے بیدرد پہ کرتا ہے کوئی جان نثار

آپ دیکھا نہ سنا اور سے پر جھوٹ نہیں
چھوڑ دوں آج دنا گر ہو وفا سے بیزار

مجھ کو چھیڑا نہ کرو تم سے کہا ہے سو بار
تیری آنکھیں کہے دیتی ہیں نہ کرنا انکار

یہ رفعتِ اور شوکتِ الفاظ فطرت نے ہر ذہن کو ودیعت نہیں کی۔ رفعتِ تخیل کا جائزہ لینے کے بعد ادب میں مومن کے صحیح مقام کا پتہ چل جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ مومن کے کلام پر بہت کم توجہ دی گئی ہے حالانکہ اردو کے اس شاعر پر ابھی بہت کچھ کام کرنا باقی ہے؛

جہلم کے اس پار — بقیہ صفحہ ۴۳

قائم ہوئیں۔ ایک زمانہ ایسا بھی آیا۔ کہ ٹیکسلا قدیم علم و ادب کا مرکز بن گیا۔ ہر مکتبۂ فکر کے طالب علم دور دراز سے آکر یہاں فیضیاب ہوتے تھے۔ اس شہر کی رونق اور خوب صورتی کے بارے میں قدیم تاریخ میں بہت سے حوالے ملتے ہیں۔ لیکن اب شہر کی جگہ اس چٹیل میدان کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ تمام تاریخی کہانیاں فرضی داستانیں ہیں"۔ میں نے سپاٹ میدان کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ اور باتیں کرتا ہوا کنک خان کو لے کر اس پہاڑی پر پہنچ گیا، جہاں شہر کے کچھ آثار نکالے گئے تھے۔ جامعہ (یونیورسٹی) کی دو دو گز اونچی دیواروں کو دیکھ کر اس کے محل وقوع کا اندازہ لگانا بہت آسان تھا۔ اس کے علاوہ عبادت گاہیں، دیوتاؤں کے مجسمے، محرابی دروازے اور کچھ قبریں دیکھنے میں آئیں۔ اس زمانہ کا رواج تھا کہ مُردوں کو جلا کر ان کی خاک دفن کر دی جاتی تھی۔

"کافی دلچسپ شہر معلوم ہوتا ہے۔ نہ معلوم ابھی اور کتنی ایسی عمارتیں ہوں گی جو زیر زمین مٹ چکی ہوں گی۔ مگر اس کی دریافت کا کام کس نے کیا؟"

"انگریزوں کے زمانے میں اس شہر کے آثار نکالے گئے تھے اور یہ کام ایک مشہور انگریز سر جان مارشل کی نگرانی میں انجام پایا"۔

کنک خاں بڑی دلچسپی سے مصروف گفتگو تھا اور ہم دونوں پہاڑ کے دامن سے ہوتے ہوئے اسٹیشن کی سرائے کی طرف نکل آئے۔ شام کے دھندلکوں میں ہر چیز چھپ گئی تھی۔ سورج ڈوبتے ہی تاریکی چھا گئی۔ پرانے آثار اور یادگاروں پر جیسے الّو بولنے لگا۔ سرائے کے چاروں طرف عجب ہُو کا عالم اور سناٹا تھا۔ چند مقامی لوگ آپس میں سرائے کے باہر دکان پر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ان کے لب و لہجے اور گفتگو کو سن کر مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے پنجابی بولی پشتو بولی سے گلے مل رہی ہے۔

آئیے بہتر زندگی تعمیر کریں

چاندی بوئیے، سونا کاٹیئے!

کوئی دوسو برس پہلے کسی سیانے نے بڑی پتے کی بات کہی تھی - ''بھائیو مل جل کر کام کرو - ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاؤ - سب کاروبار اس طرح ہی تو چلتے ہیں'' - لیکن شاید ان بڑے میاں کی نظر میں اس ساجھے کی حیثیت صرف اتنی ہی تھی کہ کسی کنبے یا قبیلے کے لوگ مل کر جنگل سے شکار مار لائیں یا عورتیں گھر میں بیٹھ کر ہانڈی روٹی پکائیں -

یہ تو بالکل پرانے زمانے کی بات ہے - اس میں اور آج کل کے زمانے میں زمین آسمان کا فرق ہے - اس میں ہاتھ بٹانا صرف چکی پیسنے میں ہی ہاتھ بٹانا نہیں بلکہ سو سو کاموں میں سو سو طرح ہاتھ بٹانا ہے - ذرا غور کیجئے - تجارت، زراعت، صنعت، سب کے سب کس قدر پیچیدہ ہو گئے ہیں - اکیلا آدمی تو سمجھ لیجئے بالکل نہتا یا اپاہج ہے - اب تو دو ہاتھوں سے بھی ٹھیک تالی نہیں بجتی - جو کام ہوگا سنگت سے ہی ہوگا - چنانچہ اب تک سب ملک امداد باہمی کے اصول پر کام کر رہے ہیں اور دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں -

پاکستان میں آپ جانیں نجی سرمایہ کچھ کم ہی ہے اور جو لوگ کسی کاروباری مہم کا بیڑا اٹھائیں انہیں حکومت کو تھوڑا بہت سہارا اور مالی امداد دینا پڑیگی - اس طرح جن کاموں کو برسوں لگتے ہیں وہ دنوں میں انجام پاجاتے ہیں - اب اپنے ملک کی طرف دیکھئے، اس کا گذارہ ہی کھیتی باڑی پر ہے - ۸۰ فیصدی آبادی اس پر پلتی ہے - کسان جی لگا کر محنت کرتے ہیں، لیکن اس سے کیا ملتا ہے؟ کھیتی باڑی کے طریقے تھوڑے بدل گئے ہیں یہ تو وہی صدیوں کے پرانے طریقے ہیں - بیچارہ کسان دن بھر ایڑی سے چوٹی تک پسینہ بہائے لیکن ہاتھ کیا آئیگا؟ باقی دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی

مغربی پاکستان کا مطمئن و مسرور کسان

اور نئے نئے آلات سے پیداوار، سو بلکہ تین سو، گنا بڑھ گئی۔ ہماری بہت بڑی ضرورت یہی تھی کہ جیسے بھی ہو کھیتی باڑی کی کایا پلٹ ہوجائے اور ہماری پیداوار ایک دم دوسرے ملکوں کے برابر ہو جائے -

ملک میں جابجا کھیتی باڑی کے لائق زمین کے لمبے چوڑے ٹکڑے خالی پڑے تھے، یہ سیم، کلر، پانی کی وجہ سے بیکار تھے - اس طرح دولت کا بہت بڑا ذریعہ محض بے توجہی سے ضائع جارہا تھا -

کھیتی باڑی کو بہتر بنانا، بنجر زمین کو زیر کاشت لانا، پانی کا بندوبست، یہ ایک بہت بڑی مہم تھی - سوال یہ تھا کہ بیل منڈھے کیسے چڑھے - زمیندار اسے ہل جوتنے پر مشین خریدنے سے تو رہے -

اس کا حل ایک ہی تھا - یہ کہ کاشتکاری کو پرانے ڈھرے سے نکال کر نئے راستے پر ڈالا جائے اور اس کو دوسرے ملکوں کی طرح کے سازو سامان سے لیس کیا جائے - اس مقصد کے لئے ایک مرکزی ادارہ قائم کیا گیا جس کی شاخیں ملک بھر میں پھیلی ہوئی ہیں - نام بھی سن لیجئے : **مالی کارپوریشن برائے ترقی زراعت** -

اس مقصد کے لئے ایک مالدار مرکزی ادارے کی ضرورت تھی جس کی شاخیں ملک بھر میں پھیلی ہوئی ہوں - چنانچہ سنہ ۱۹۵۲ع میں ایسا ہی ایک ادارہ قائم کیا گیا - یہ ادارہ ایک

ٹریکٹر سے پیداوار میں اضافہ

قسم کا بینک ہے جو کسانوں اور زمینداروں کو کھیتی باڑی کی ترقی کے سلسلے میں قرضہ دیتا ہے -

شروع میں خیال تھا کہ کارپوریشن کا سرمایہ اس کے حصے فروخت کر کے جمع کیا جائے جن میں سے ۱۰ فیصد حکومت خریدے اور باقی صوبائی حکومتوں اور عام لوگوں کے لئے چھوڑ دیا جائے، لیکن اس طرح بات بنتی نہ تھی - سال ہی بھر کے اندر طے کرلیا گیا کہ کل سرمایہ حکومت ہی فراہم کرے گی - چنانچہ اب تک تین کروڑ روپیہ دیا جاچکا ہے -

کارپوریشن کے فائدے کا اس سے اندازہ کرلیجئے کہ اب تک چھوٹے چھوٹے کسانوں اور کاشتکاروں کو تقریباً سوا کروڑ کے قرضے دئے جاچکے ہیں - لوگوں نے سب سے زیادہ قرضہ ٹریکٹروں اور کل پرزوں کے لئے لیا ہے - ٹیوب ویل لگانے، ڈیری فارم کھولنے، بیل خریدنے، بند باندھنے، کھال کھودنے کے علاوہ لوگ نلکے لگانے، گودام بنانے، بیج اور کھاد خریدنے اور مچھلیاں اور مرغیاں پالنے کے لئے بھی قرضہ لیتے رہے ہیں - شروع میں سود کی شرح سوا چھے فی صد تھی - اب پانچ

فی صد ہے - یہ شرح بہت مناسب ہے - دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں ، جہاں حکومت کارپوریشن کو اخراجات کی گرانٹ بھی دیتی ہے یہ شرح کم ہے - امداد باہمی کی انجمنوں کے لئے تو شرح سود اور بھی کم ہے - ان سے صرف چار فیصد وصول کیا جاتا ہے - تاکہ وہ آگے قرضے دے سکیں -

قرضہ لینے کی شرطیں بہت آسان ہیں - طریقہ بھی سیدھا سادا ہے - ہر زراعت پیشہ شخص قرضہ لینے کا حقدار ہے - یا ایسا ہر شخص جو قرضہ لے کر کھیتی یا کھیتی کی پیداوار کو ترقی دینا چاہے ، پھر لمیٹڈ کمپنیاں اور امداد باہمی کی سوسائٹیاں بھی وہ قرضہ لے سکتی ہیں - خوبی کی بات یہ ہے کہ مالی کارپوریشن کے قرضے ایسے نہیں کہ ان کے بعد تقاوی اور امدادی قرضے نہ مل سکیں - یہ اپنی جگہ ہیں اور وہ اپنی جگہ - اگر سائل اپنا حق ثابت کرسکے تو وہ یہ قرضے ان کے علاوہ لے سکتا ہے -

پانچ سو روپے تک قرضہ لینے کے لئے ایک ضمانت اور ایک معاہدہ کافی ہے - زیادہ رقم کے لئے جائداد اور زمین گروی رکھنی پڑتی ہے - فرد کے لئے زیادہ سے زیادہ قرضے کی حد ایک لاکھ روپیہ اور کمپنی یا سوسائٹی کے لئے پانچ لاکھ ہے ، لیکن اس میں بھی کام نہ چلے اور کام ایسا ہی مفید اور ضروری ہو تو فرد کو دو لاکھ اور کمپنی یا سوسائٹی کو بیس لاکھ تک دیا جا سکتا ہے - قرضے کی وصولی میں بھی آسانیاں دی جاتی ہیں - تاکہ مقروض چھوٹی چھوٹی قسطیں ادا کرتا چلا جائے اور تکلیف نہ اٹھائے - چنانچہ بعض لوگوں کو دس بیس سال کی مہلت دی جا سکتی ہے - ضمانت میں جائداد کی مالیت قرضہ کی رقم سے دگنی ہونی چاہئے - سرکاری ضمانتوں کی صورت میں بازار کے بھاؤ کا پچھتر فیصد تک مل سکتا ہے - زندگی کا بیمہ ہو تو ادا شدہ رقم کا ۴۴ فیصد دیا جا سکتا ہے - اور اب تو متروکہ جائدادوں کی ضمانت بھی قبول کر لی جاتی ہے -

کارپوریشن کا کام ایسا آسان نہیں جیسا سائل کا - یہاں بڑی پیچیدگیاں ہیں - زرعی ترقی کا کام صنعتی ترقی سے کہیں زیادہ مشکل ہے - مثلاً صنعت کے مرکز بڑے بڑے شہروں میں ہیں جہاں نفع نقصان کا حساب بیٹھے بٹھائے لگایا جا سکتا ہے - لیکن زرعی آبادی ملک کے دور دراز اور ناقابل سفر کونوں میں ہے جہاں سائلوں کی ضرورتوں کی چھان بین ہی کے لئے کہیں زیادہ عملے کی ضرورت ہے جو ضروری تحقیقات کے لئے گھر گھر دوڑے اور [illegible] جائے - ظاہر ہے کہ یہ بڑی محنت کا کام ہے - اور آپ مانیں گے کہ رقم کے ڈوب جانے اور مقدمے بازی سے بچنے کے لئے جتنی بھی بھاگ دوڑ کی جائے کم ہے - کارپوریشن کے راستہ میں اور بھی کئی مشکلات ہیں - مثلاً مشرقی پاکستان میں لوگ قسطیں ٹھیک سے ادا نہیں کرتے - ویسے مغربی پاکستان میں بھی کہیں کہیں یہی حال ہے - سابق سندھ میں تو کام ٹھیک سے چل ہی نہیں سکتا - یہاں ایک قانون تھا جس کی رو سے تین سوا ایکڑ سے کم زمین رہن نہیں رکھی جاسکتی - یہ قانون اب بھی نافذ ہے - اس کی وجہ سے چھوٹے کسان زمین رہن نہیں رکھ سکتے اور نہ قرضہ

لے سکتے ھیں - پھر بعض علاقوں میں جمع بندی کے گوشوارے نا مکمل ھیں - مشرقی پاکستان میں تو بڑی گڑبڑ ھے - یہاں بندو بست اراضی کے انتقال چڑھائے ھی نہیں گئے اور زمین کی ملکیت کا کچھ پتہ نہیں چلتا - قلات میں جمع بندی کا وجود ھی نہیں چنانچہ ڈویژن کے کمشنر سے زمین کی ملکیت کے بارہ میں تصدیق نامہ لینا پڑتا ھے - مغربی پاکستان کے باقی حصوں میں تصدیق نامہ پٹواری دیتا ھے - لیکن جب کارپوریشن کا عملہ اسے اصل سے ملا کر دیکھنا چاھتا ھے تو اور بھی دیر لگتی ھے - ان مشکلات کے باوجود کارپوریشن نے حوصلہ نہیں چھوڑا اور برابر کام میں لگی ھے - افسوس کہ کارپوریشن کا کام ایسا نہیں کہ ہر شخص آنکھوں سے دیکھے - لیکن ایسا بھی نہیں کہ کچھ نظر ھی نہ آئے - کارپوریشن کے رجسٹر نہ دیکھیے، گاؤں میں جائیے اور لوگوں سے بات چیت کیجئے جنہوں نے قرضے لے کے سوکام نکالے ھیں، زمینیں ٹھیکہ کی ھیں، پیداوار بڑھائی ھے، اپنی اور اپنے گاؤں کی حالت سدھاری ھے، تب آپ کو معلوم ھو گا کہ کارپوریشن کے ھونے سے کیا فرق پڑا ھے - اس قلیل عرصہ میں کارپوریشن کو جتنی کامیابی ھوئی ھے اور لوگوں کو جو فائدہ پہنچا ھے اس کے پیش نظر فیصلہ کیا گیا ھے کہ کارپوریشن کی بہت سی شاخیں قائم کی جائیں تاکہ لوگوں کو قرضہ لینے میں اور بھی آسانی ھو - چنانچہ کراچی، لاھور اور ڈھاکہ کے علاوہ نئے کھلنے والے دفتروں کی تعداد نو ھے اور یہ تو ابھی ابتدا ھے، جب کام ذرا اور چل نکلیگا اور لوگوں کو کارپوریشن کے فائدے اچھی طرح معلوم ھوجائینگے تو نتیجے اور بھی اچھے نکلینگے *

نئی نہروں کے ذریعے آبپاشی کے بہتر ذرائع

نزلہ ؟
کھانسی ؟
Liqufruta
اس کا فوری علاج
لیکوفروٹا
جڑی بوٹیوں سے تیار کی ہوئی کھانسی کی دوا
آج ہی
ایک شیشی
خریدیئے
یہ بچوّں کیلئے بھی نہایت مُفید ہے !
تجارتی تفصیلات کے لئے، ایس۔ جے اینڈ جی فضل الٰہی لمیٹڈ پوسٹ بکس نمبر ۴۹۱۴ کراچی

ان کی تندرستی اہم شے ہے
اسی وجہ سے میں ہمیشہ ڈالڈا
سے کھانا تیار کرتی ہوں
اتنے ہی وٹامن جتنے کے اصلی گھی میں
اب ڈالڈا برانڈ وناسپتی میں بہت زیادہ غذائیت ہے
ڈالڈا کے ہر اونس میں وٹامن اے
کی اتنی ہی مقدار موجود ہے جتنی
کے اچھے اور خالص گھی میں ہوتی ہے
ڈالڈا میں وٹامن ڈی بھی موجود
ہے! آپ کے بچوں کی صحت مند
پرورش کے لئے ان کی غذا میں ان دونوں وٹامنوں کی
موجودگی ضروری ہے۔
ہمیشہ محفوظ اور پاک وصاف
ڈالڈا برانڈ وناسپتی کو عمدہ نباتی تیلوں سے تیار
کرکے حفظان صحت کے اصولوں کے تحت سربمہر اور ہوابند
ڈبوں میں بھرا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ تازہ اور صاف ستھرا
ہے۔ اپنے تمام کھانے ڈالڈا سے تیار کیجئے۔ اور اپنے گھر والوں
کو صحت مند رکھئے۔
ڈالڈا برانڈ وناسپتی
کھانوں کو بہتر بناتا ہے

دن بدن
حسین جلد
جی ہاں! کیڈل آمیز رکسونا کے استعمال سے
آپ کی جلد میں ایک نئی ملائمت پیدا ہو گی۔ روزانہ
اس کی جھاگ کو اپنی جلد پر ملئے۔ آپ کی جلد
دن بدن حسین ہوتی جائے گی۔
بلاشبہ
رکسونا
صابن سے
Rexona
دلکش اور
فرحت بخش خوشبو
جلد کو ملائم کرنے اور مقوی
جلد تیلوں کے ایک خاص
مرکب کا ملکیتی نام ہے۔

نئے بنگالی افسانے

افسانہ بنگالی ادب کی نہایت شائستہ صنف اور پاکستانی ادب کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ جس میں اپنے ماحول کی فنکارانہ عکاسی ، قومی و ملکی مسائل کو حل کرنے کی جستجو اور فکر کی نئی راہیں نظر آتی ہیں ۔

تعارف :— الطاف گوہر

اس مجموعے میں بنگالی زبان کے دس چیدہ افسانہ نگاروں کے بہت ہی نمائندہ افسانے شامل کئے گئے ہیں جس سے مشرقی پاکستان کی ثقافت اور معاشرت کے وہ پہلو سامنے آ جاتے ہیں جن کا جاننا ہم سب کے لئے بڑا ضروری ہے۔

کتاب مجلد ہے اور دیدہ زیب سر ورق کے ساتھ نفاست کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔

قیمت دو روپے

مسلم بنگالی ادب

(بنگالی سے ترجمہ)

ڈاکٹر انعام الحق ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی ۔

اس کتاب میں بنگالی زبان و ادب کی مکمل تاریخ اور اس کے ثقافتی ، ملی و تہذیبی پس منظر کا جائزہ لینے کے بعد بتایا گیا ہے کہ اس زبان کی نشو و نما اور ترقی و تہذیب میں مسلمان حکمرانوں ، صوفیا ، اہل قلم ، شعرا اور ادباء نے کس قدر حصہ لیا ۔ یہ جائزہ بہت مکمل ہے اور تحقیق و تفصیل کا شاہکار ہے۔ پوری کتاب نفیس اردو ٹائپ میں چھاپی گئی ہے اور مجلد ہے۔

سر ورق دیدہ زیب اور رنگین ۔

ضخامت ۴۰۰ صفحات — قیمت چار روپے

ادارہ مطبوعات پاکستان ، پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ ۔ کراچی

عوامی گیت:

سمّی

نورِ آخگر تونسوی

دریائے سندھ کے اس پار، دریائے سنگھڑ کے کنارے آباد سرزمین تونسہ نے نہ جانے کتنے انقلابات زمانہ دیکھے ہیں اور کتنے ہی انقلابات سے آج بھی دوچار ہے۔ یہاں عہدِ ماضی میں نہ جانے کتنے حوادث و واقعات نے جنم لیا اور کتنے ہی ابھی کتمِ عدم میں پڑے ہیں اس ریتلی زمین کا ہر ایک ذرہ اپنی پرانی تاریخ کا آئینہ دار ہے اور زبانِ حال سے پکار پکار کر ان پرانے واقعات کو عوام کے سامنے کھول کھول کر بیان کر رہا ہے جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ عہدِ ماضی کے کتنے ہی لوگوں نے ان واقعات کو سنا سمجھا اور لوحِ دل پر کندہ کر لیا۔ یہی واقعات سینہ بسینہ منتقل ہوتے ہوتے اس دَور تک بھی پہنچ گئے ہیں آجکل بھی کہیں کہیں ان کو کسی کی زبان سے سنا جا سکتا ہے۔ یہ واقعات ہماری تہذیب اور ثقافت سے متعلق ہیں۔

اگر ان عوامی روایات کو ہم نے اب جمع نہ کیا تو امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں وہ فنا ہو جائیں گے۔ اسی جذبہ سے متاثر ہو کر مغربی پاکستان کی قدیم تاریخی سرزمین تونسہ کی ایک ثقافتی جھلک یہاں پیش کی جاتی ہے۔

جب تونسہ کی ریتیلی زمین سورج کی کرنوں کو اپنے اندر جذب کرنے کے بعد دوزخ کے گرم ترین طبقے کی طرح گرم ہو جاتی ہے۔ جب یہاں کی گرم لو کے جھکڑ چلتے ہیں اور یوم الحساب کی "العطش" کو یاد دلاتے ہیں۔ جب یہاں کے غریب و نادار کسانوں اور کاشتکاروں کی آرزوؤں کی کھیتیاں مرجھانے اور کملانے لگتی ہیں، تو ہر آنکھ بے بسی کے عالم میں آسمان کی طرف اٹھ جاتی ہے اس وقت ہر انسان کا سر مالکِ حقیقی کی بارگاہ میں جھک جاتا ہے کہ وہی بندوں پر اپنی رحمت ارزانی کرے گا اور یہ تونس، (پیاس اور شدتِ گرما) دور ہوگی۔ بارانِ رحمت کی ایک جھال گرے گی اور روحیں تازہ ہو جائیں گی

سورج اس تپتی زمین کو آگ کے گولے کی طرح گرم کر کے خود پہاڑیوں کی اوٹ میں چھپ جاتا ہے تو لو کے جھکڑ اپنی خستہ سی سردی کے ساتھ ریت کو ٹھنڈا کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جوں جوں وقت گزرتا ہے زمین ٹھنڈی ہونے لگتی ہے۔ اب چاند اپنی پوری کرنوں اور روشنی کے ساتھ آسمان پر جلوہ گر ہو جاتا ہے اور تونسہ کی وہ زمین جو تھوڑی دیر پہلے سورج کی گرم کرنوں کی زد میں تھی اب چاند کی ٹھنڈی اور صحت بخش کرنوں سے ڈھک جاتی ہے۔ وہ زمین جو سورج کی گرمی سے بالکل مردہ ہو چکی تھی اب زندہ ہونے لگتی ہے —— اس وقت تونسہ کی نواحی بستیوں میں نوجوان لڑکیاں مختلف گروہوں میں اکٹھی ہو کر بڑی بوڑھیوں کی زیرِ ہدایت ایک دیہاتی لوک گیت گاتی ہیں۔ جسے "سمّی" کہا جاتا ہے۔ اس دیہاتی علاقہ میں یہ اعتقاد پایا جاتا ہے کہ "سمّی" کہنے سے رحمتِ خداوندی جوش میں آجاتی ہے اور اتنی بارش ہوتی ہے کہ اس علاقہ کی ریتیلی اور پیاسی زمین جل تھل ہو جاتی ہے۔ پہاڑی نالے جوش میں آجاتے ہیں۔ اور اس زمین پر جہاں پانی کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ پانی کی ایک موٹی تہہ پھیل جاتی ہے۔ نادار اور غریب کاشتکاروں اور کسانوں کی کھیتیاں سرسبز ہونے لگتی ہیں اور تمام زمین پر زندگی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔

"سمّی" ایک لوک گیت ہی نہیں بلکہ ایک برساتی نغمہ بھی ہے۔ فی الحقیقت وہ ایک گیت نہیں بلکہ پورا واقعہ ہے جو تونسہ کی سرزمین پر ہوا، ہزاروں دوسرے انسانی واقعات کے ساتھ یہ گیت ایک دکھیا ماں کی فریاد ہے جو اس نے اپنی لڑکی کی یاد میں خون کے آنسو رو رو کر اپنے خونِ دل سے لکھا۔ پھر یہ واقعہ مشہور ہوتے ہوتے ایک گیت کی صورت میں بکھر گیا اور تونسہ کے نواحی علاقہ میں آجکل بھی اتنا ہی مشہور ہے جتنا کے کسی اگلے سمے میں تھا۔

حضرت خواجہ سلیمانؒ کے تونسہ میں تشریف لانے سے پہلے (یعنی ۱۸۰۵ء سے پہلے)، تونسہ ایک معمولی سا قصبہ تھا۔ اس جگہ پر جہاں آجکل تونسہ کا وسیع و عریض قصبہ پھیلا ہوا ہے ریت کے ان گنت ٹیلوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ آجکل بھی یہ ٹیلے تونسہ کے نواحی علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس وقت یہاں دو تین بلوچ قبیلے آباد تھے۔ ان کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دو تین گھرانے قسباتی کاریگر دریعنی موچیوں، کمہاروں اور بڑھیوں کے بھی موجود تھے۔ انہی گھرانوں میں سے ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں ایک اندھی عورت رہتی تھی، جو بیوہ بھی تھی۔ اس کی زندگی کا سہارا صرف ایک لڑکی تھی جس کا نام "سمّی" تھا۔ وہ

بے چاری عورت امیر گھرانوں میں نوکری کر کرکے اپنا اور اپنی لڑکی کا پیٹ پالتی تھی وہ خود تکلیف اٹھاتی تھی لیکن "سمی" کو تکلیف نہیں پہنچنے دیتی تھی اس طرح اچھے یا برے زندگی کے دن کٹ رہے تھے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ لڑکی بھی جوان ہوگئی۔ اب اس بیوہ کو داماد ڈھونڈنے کا اہم اور نازک مسئلہ درپیش تھا۔ اس نے بہت کوشش کی لیکن اپنی منشا کے مطابق نیک اور اچھا رشتہ "سمی" کے لئے نہ مل سکا۔ جس طرح آجکل اچھے برے سب طرح کے سب ہی لوگ ہوتے ہیں اس وقت بھی ایسے ہی تھے۔ ان دنوں وہاں ایک بداخلاق آدمی تھا۔ اس نے ایک دن موقع پاکر اس بیوہ کو دھوکہ دے کر اس کی لڑکی کو اپنے قبضہ میں کر لیا اور اسے لے جاکر ایسا روپوش ہوا کہ پھر اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

ایک تو بے چاری غریب اور پھر ممتا کی ماری تھی اس لئے وہ سوائے رونے دھونے کے اس وقت اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ اس غم نے اُس کے دل پر اتنا اثر کیا کہ اس کے منہ سے جو آہ نکلتی شعر بن جاتی۔ چنانچہ ان اشعار کو جو دراصل فراق کے گیت ہیں اس لڑکی کے نام پر "سمی" کہا جانے لگا۔

جب ۱۸۶۵ء میں حضرت خواجہ سلیمان رحمۃ اللہ علیہ سر زمین تونسہ میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہوگئے تو اس وقت "سمی" کے یہ گیت کافی مشہور ہو چکے تھے جب بھی لوگ بارش نہ ہونے کی شکایت کرتے تھے تو حضرت خواجہ سلیمان رح انہیں "سمی" گانے کی ہدایت کیا کرتے تھے کیونکہ یہ ایک دکھی دل کی فریاد تھی "سمی" اتنا دردناک گیت ہے کہ اس کے کہنے سے رحمت الٰہی بھی جوش میں آجاتی تھی اور سرزمین تونسہ بارش کی رحمت سے جل تھل ہو جایا کرتی تھی۔

یوں تو سمیاں بہت ہیں مگر ذیل میں سمی قسم کا ایک گیت جو چند بندوں کی حالت میں ہے پیش کرتا ہوں؟

اُچا کُککُ سن مرڑیاں نی مجا اڑیاں شمڑیاں وانگ
کسی تاں دیلارات دا میڈا آیا شیرن دھل
شیرن دی منگیں تڑی جڑ بیٹھی گوڈے نال
سمی اللہ وسائی گھر آ

(ترجمہ): اے مرغ زور سے "سمی" کو آواز دے جو ایک موچی کی لڑکی ہے۔ اسے بتا کہ شیرن (سمی کا ہونے والا خاوند) بھی کل رات کو گھر آگیا ہے۔ شیرن کی ہونے والی بیوی بھی اس کے پاس آکر بیٹھ جائے۔ اے سمی تجھے اللہ اپنے گھر لے آئے!

سمی جڑی کجاوڑے مجاندی سخڑی وانگ
پچھو روندی ما گھول گھناں کجاوے کوں
میڈی صاحب موئی ما۔

(ترجمہ): سمی کو کجاوہ پہ لاد کر لئے جا رہے ہیں اور اس کی ماں اس کے پیچھے رو رہی ہے۔ خدا کرے وہ کجاوہ ٹوٹ جائے جس کے پیچھے میری ماں اپنی جان ہلکان کر رہی ہے۔

کندھی تے بروٹڑا مجاندی سخڑیں اے وانگ
جھل وے بروٹڑا جھل ساتھی نیڈے کڈ گئے
ڈو نینڈاں ڈیکھ نہ بھل

(ترجمہ) دریائے سنگھڑ کے کنارے ایک بوٹا کھڑا ہوا سے ہل رہا ہے۔ اے بوٹے تیرے ساتھ کھیلنے والی سمی تو چلی گئی ہے تو نہ جانے کیوں بے پروا کھڑا ہے۔

آجکل بھی جب بارش نہیں ہوتی تو عورتیں "سمی" گاتی ہیں۔ اُس وقت ایک دردانگیز سماں بندھ جاتا ہے۔ بارش ہو یا نہ ہو لیکن ہر آنکھ ساون بھادوں کے بادل کی طرح ضرور برسنے لگتی ہے۔ اب اگرچہ "سمی" کی اہمیت ایک برساتی گیت کی نہیں رہی لیکن ایک لوک گیت کی سی اہمیت اسے اب بھی حاصل ہے۔ اسے سن کر ہر اُس شخص کی جو اس کے پس منظر کو جانتا ہو راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے اور بہت دنوں تک اس گیت کی دردناک تانیں دل میں ہلچل پیدا کئے رہتی ہیں۔ وقت بڑی تیزی کے ساتھ گذرتا جا رہا ہے۔ نہ جانے ہمارے لوک گیت جو ضائع ہو گئے ان ہی کی طرح یہ گیت بھی ختم نہ ہو جائے اور صرف اس کی یاد دلوں میں باقی رہ جائے کیونکہ لوگ اب اور ہی طرح کی موسیقی اور گیت پسند کرنے لگے ہیں۔

عتاب — بقیہ صفحہ ۱۸

چوُمنے لگی، لیکن نوجوان پر اس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا۔ اس نے احتیاط سے اپنے پاؤں چھڑائے اور پھر منزل کی طرف چل پڑا۔ لونگینہ کو خبر بھی نہ ہوئی۔ اور وہ بدستور جھاڑیوں پر اپنی آنکھیں ملتی رہی۔ ان کو چومتی رہی کہ یہ اسی کے پاؤں ہیں — لوگوں نے کہا کہ اٹھ دیوانی وہ تو جا چکا۔ لیکن لونگینہ نے ایک نہ سنی۔ وہ پھولوں کو چوم رہی تھی اور پکار رہی تھی:

اے میرے عتاب کے پھول آ
آ کہ میں اپنی خوشبوئیں تجھے بخش دوں

صبح سے شام ہو گئی۔ سورج پہاڑیوں کی جھولی میں چھپ گیا۔ شام سے رات ہوئی پھر دن اور پھر رات .... بہار گرمی میں تبدیل ہو گئی اور پھر برفانی چوٹیوں سے ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے آنے لگے۔ اور ایک روز وادی، چراگاہوں سے لوٹنے والے ریوڑوں کی آوازوں سے گونج اٹھی۔

نوجوان گڈریے کے پاؤں آپ سے آپ اس مقام پر رک گئے جہاں لونگینہ نے اس کا راستہ روکا تھا۔ اس نے دیکھا کہ جھاڑیوں کی خشک شاخوں میں لال لال عتاب چمک رہے ہیں جو وادی کے لوگوں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ سب لونگینہ کے خونِ جگر کی تاثیر ہے۔ لونگینہ جس نے ان جھاڑیوں کو چومتے چومتے اپنی جان دے دی۔ اسی کے ہونٹوں کی حدت، شوق کی فراوانی اور جذبے کا خلوص عتاب بن کر چمک رہا ہے۔ ان میں اسی کے ہونٹوں کی رنگت، اسی کے جوان لہو کی لالی ہے۔

گڈریا خاموش کھڑا سنتا رہا۔ لوگ جب سب کچھ کہہ چکے تو نوجوان نے جھک کر ایک عتاب توڑا۔ اور اسے اپنے ہونٹوں پر پھیرا۔ اس کے ہونٹ کپکپائے۔ اس نے ایک دبی دبی ہلکی سی آہ کھینچی۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے ڈھلک کر اس مٹی میں جذب ہو گئے!

کافرستان کے لوگوں کو اب صرف لونگینہ کا نغمہ یاد رہ گیا ہے۔ کہانی کو وہ بھول چکے ہیں، معلوم نہیں یہ ان کہی کہانی میرے ذہن میں کیسے آ گئی؟

سیدھی پیٹھ اور مضبوط
اعضاء کے لئے
اپنے ننھے بچہ کو
یہ خالص دودھ دیجئے
OSTERMILK
جو مائیں اپنے شیر خوار بچوں کو ضرورت بھر یا بالکل ہی چھاتی کا دودھ نہ پلا سکتی ہوں وہ آسٹر ملک پر پورا بھروسہ کر سکتی ہیں۔ یہ بالکل خالص، قوت بخش اور نہایت عمدہ دودھ ہے جسکو اس طرح سے بنایا جاتا ہے کہ بچوں کے ہاضمہ کے موافق ہو۔ ہڈیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے اسمیں وٹامن ڈی ملایا جاتا ہے اور لوہا شامل کیا جاتا ہے تاکہ بچے خون کی کمی والی بیماری سے محفوظ رہ سکیں۔ آپ اپنے بچے کی نشو و نما سیدھی پیٹھ اور بازؤں کی مضبوطی کے لئے آسٹر ملک پر پورا اعتماد کر سکتی ہیں۔ یہ خاص کر پاکستان میں شیر خوار بچوں کے لئے بیحد موزوں ہے۔
آسٹر ملک
ماں کے دودھ سے قریب تر
ہر ماں کے لئے مفید مشورہ
بچے کی دودھ پینے والی بوتل کو صاف اور جراثیم سے پاک رکھنے کے لئے ایک برتن میں ٹھنڈا پانی لیجئے اسمیں خالی بوتل ڈال کر اتنا گرم کیجئے کہ اُبلنے لگے۔ پھر بوتل نکال لیجئے لیکن اس کے اندرونی حصہ کو صاف کرتے وقت خشک نہ کیجئے۔
گلیکسو لیبوریٹریز (پاکستان) لمیٹڈ
کراچی لاہور چٹاگانگ ڈھاکہ
R. 60

میری قمیص
پٹخنا بند کرو...
سن لائٹ صابن استعمال کیجئے
سن لائٹ صابن
پٹخے بغیر کپڑوں کو
سفید اور اجلے
دھوتا ہے
SUNLIGHT
SOAP
S 13—103 UD

اب
یورپ کی ہفتہ میں
دو بار سروس
اب اپنی سہولت کے مطابق سفر کا پلان بنائیے۔ بغداد - روم اور لندن جانیکے لئے
پی۔آئی۔اے کی ہفتہ میں دو بار تیز رفتار سپر کانسٹیلیشن سروس ہے ان میں سے کسی ایک سروس سے
سفر کیجئے۔ یورپ کے بہت سے شہروں اور امریکہ جانیکے لئے روم۔ جنیوا یا لندن سے آپ دوسرے جہاز
سے سہولت کے ساتھ سفر کر سکتے ہیں جسکا پی۔آئی۔اے انتظام کرتی ہے۔ راستہ میں کئی مقامات پر بغیر زائد
کرایہ ادا کئے آپ ٹھیر سکتے ہیں۔ سفر کے دوران میں پاکستانی مہمان نوازی کا لطف اٹھائیے۔ آپ سفر خواہ
ٹورسٹ کلاس میں کریں یا فرسٹ کلاس میں ہر طرح کے آرام و آسائش سے آپکے سفر کا لطف دوبالا
ہو جائیگا۔ فرسٹ کلاس میں خواب راحت کیلئے بستر کی مانند آرام دہ کرسیاں ہیں۔
بغداد اور یورپ کیلئے پی۔آئی۔اے کی سروس منگل اور جمعہ کے دن ہے۔
جنیوا کی سروس جمعہ کے دن ہے
سوئٹزرلینڈ میں چھٹیاں گزاریئے اور وہاں کے
دلکش مناظر سے لطف اندوز ہوئیے
اور بکنگ کے لئے اپنے ٹریول ایجنٹ یا کسی پی۔آئی۔اے آفس سے رجوع کیجئے
PIA
پی-آئی-اے
ایم۔اے۔ کھوڑو روڈ۔ کراچی۔ فون نمبر:- ۵۱۰۶۱
PIA/GRANT/96-U

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳، کراچی نے شائع کیا - مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ - کراچی
مدیر: رفیق خاور

"جنت نگاہ"

ڈیر سے چترال تک مغربی پاکستان کا سراپا بہار پہاڑی علاقہ

جس میں تا حد نظر پھول ہی پھول نظر آتے ہیں

REGD. S. No 1086 MAH-E-NAU NOV 1957

ہماری ادبی تاریخ ہماری قومی تاریخ کا ایک اہم جزو ہے۔ ملت کے ذہن و کردار کی پرداخت پچھلے دو سو سال میں کس کس طرح ہوتی رہی اور کن کن اہل قلم کی جگر کاوی ہمارے قومی شعور کی تہذیب و تربیت میں شامل رہی اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے اردو کی حریت پسند شاعری کے پچھلے دو سو برس کے سرمایہ پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

ادارہ نے اس ضخیم مجموعے میں دو سو برس کی ملی شاعری کا انتخاب پیش کیا ہے جس میں اردو کے بیشتر بلند پایہ شعرا کا کلام یکجا ہو گیا ہے۔ اس طرح یہ نہ صرف حوادث ملی کی ایک منظوم داستان ہے، بلکہ ایک نادر ادبی انتخاب بھی، جس کی قدر و قیمت محتاج بیان نہیں۔

ترتیب و مقدمہ : شان الحق حقی

اس دو سو سال کی شاعری کو چند ابواب میں سمو دیا گیا ہے۔ مثلاً :

۱۸۵۷ء سے پہلے — انقلاب ۱۸۵۷ء کا دور

پیغام بیداری — جدید عہد — صبحِ نو

مجلد، سرورق خوبصورت، رنگین اور دیدہ زیب

یہ کتاب نہایت نفیس اردو ٹائپ میں طبع کی گئی ہے

صفحات ۳۰۰ قیمت چار روپے آٹھ آنے

ادارہ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی

نذر سجاد حیدر	میراجی	صفیہ شمیم
روشن صدیقی	الطاف گوہر	سراج الدین ظفر
ڈاکٹر تصدق حسین خالد	سید عبدالحمید عدم	شیر افضل جعفری
سید جعفر طاہر	عبدالعزیز خالد	حمید کاشمیری

کراچی

(چند جھلکیاں)

(ملاحظہ ہو مضمون ''قدیم کراچی'' صفحہ ۹

۱۔ کیماڑی کا پل : ''سونے منزل''

۲۔ نیٹو جیٹی : صدہا سال سے ماہی گیر کشتیوں

۳۔ فریر ہال : مشہور تاریخی عمارت جو اب عجائب گھر ہے

۴۔ ساحل کراچی : ''اختلاط موجہ و ساحل''

۵۔ منوڑہ : روشنی کا مینار

''تیری شمعوں سے تسلی بحر پیمہ
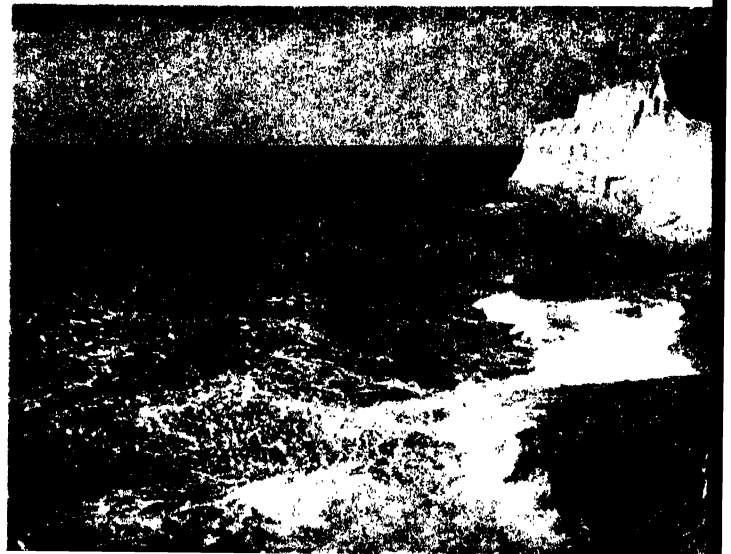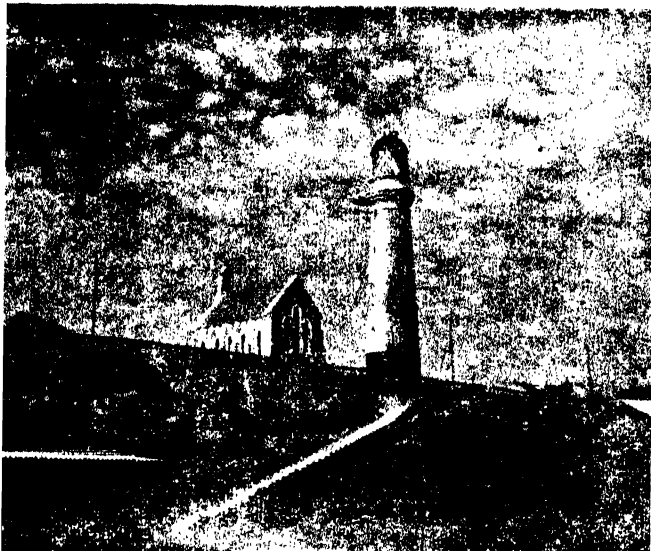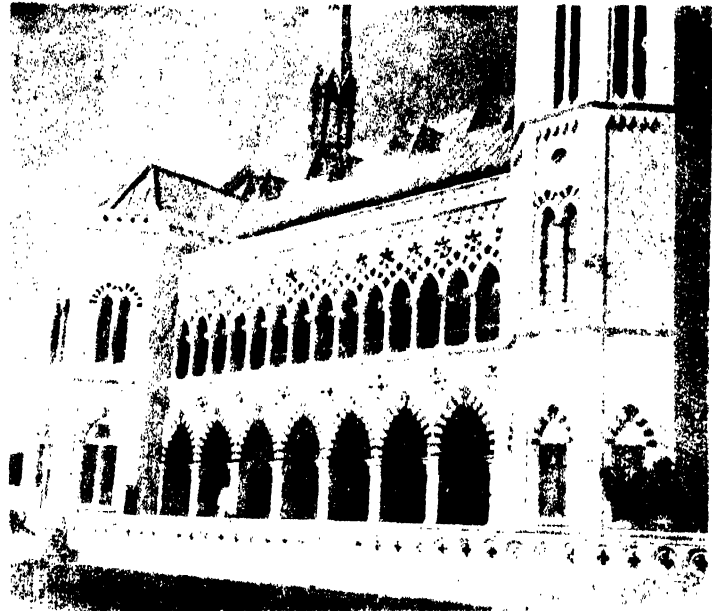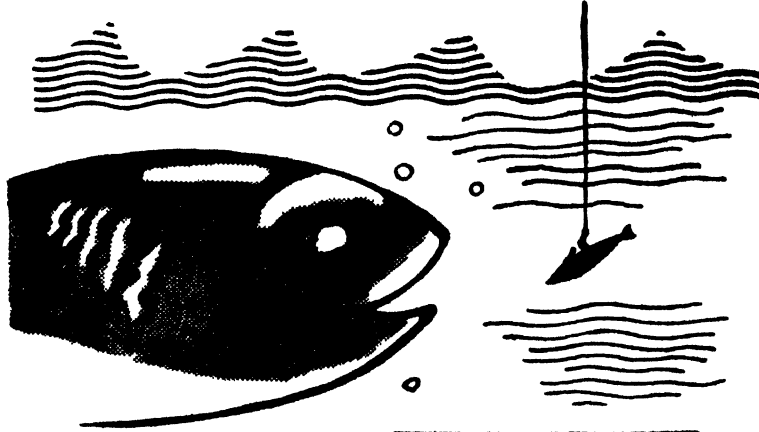
آپ نزلہ، زکام اور کھانسی سے کتنا ہی بچیں
یہ اکثر بیٹھے بٹھائے ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً
موسم کی تبدیلی کے وقت تو گویا ان پر سے ہر
روک ٹوک اٹھ جاتی ہے۔
ہر وقت چوکنے رہیئے اور ان کی روک
تھام سعالین سے کیجئے۔

"لکس کا سفید ترین رنگ ہی اس
کے خالص ہونے کا یقین دلاتا ہے
نمی کہتی ہے:
اسی لئے میں ہمیشہ لکس ٹائیلٹ صابن
استعمال کرتی ہوں"
LUX
TOILET SOAP
فلمی ستاروں کا سفید اور خوشبودار حسن بخش صابن
LTS 15—103 UD

ماہِ نو

جلد ۱۰ — شمارہ ۹

دسمبر — ۱۹۵۷ء

مدیر

رفیق خاور

نائب مدیر

ظفر قریشی

سالانہ چندہ

ساڑھے پانچ روپے

فی کاپی — آٹھ آنے

ادارۂ مطبوعات پاکستان

پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی

اداریہ:	آپس کی باتیں		۶
بہ یادِ قائدِ اعظمؒ	مردِ راہ داں (نظم)	عبدالرؤف عروج	۷
	خضرِ راہ	مطلوب الحسن سید	۸
مقالات:	میراجی کی شخصیت	الطاف گوہر	۱۰
	(غزل	میراجی)	۱۳
	تجربہ اور تخلیق	اصغر بٹ	۱۵
	یلدرم	نذر سجاد حیدر	۱۹
فن:	مصوری کی پہلی کل پاکستان نمائش	مریم شاہ	۲۳
افسانے:	اکھاڑہ	عنایت اللہ	۲۵
	ایک اور کرن!	حمید کاشمیری	۳۶
نظمیں:	ماں!	ڈاکٹر تصدق حسین خالد	۴۰
	انفس و آفاق	عبدالعزیز خالد	۴۱
	جتیاں	شیر افضل جعفری	۳۹
	پیغامِ بے صدا	صفیہ شمیم	۳۹
غزلیں:	روش صدیقی • سراج الدین ظفر • سید عبدالحمید عدم • سید جعفر طاہر • شان الحق حقی • ادیب سہارنپوری		۴۲-۴۴
مصور فیچر:	ٹھیک کھائیں ٹھیک جئیں:		۴۵
تعارف:	قدیم کراچی	ہمایوں مرزا	۴۹
سرورق:	منقش خشت سازی	(عہدِ مغلیہ)	

آپس کی باتیں

آج قائدِ اعظمؒ کو ہم سے جُدا ہوئے پورے نو سال گذر چکے ہیں۔ لیکن اُن کی یاد ہمارے دل میں برابر تازہ ہے۔ کیونکہ جو رشتہ ہمیں ان کے ساتھ وابستہ کرتا ہے وہ محبت کا لازوال رشتہ ہے اور ان کی جدائی نے اس کو اور بھی مضبوط کر دیا ہے۔

قائدِ اعظمؒ کے سلسلہ میں ان کے مولد کراچی کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس کا سنہرا ماضی ایک گہری دھند میں لپٹا ہوا نظر آتا ہے۔ ہمارے ایک مضمون نگار نے اس عروس البلاد کے چہرہ سے نقاب اٹھا کر ایسی جھلکیاں دکھائی ہیں جو ہماری دلچسپی کو اور بھی بڑھا دیتی ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا سید ہاشمی فرید آبادی نے بھی لفظ "کراچی" کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی تھی اور یہ بتایا تھا کہ اس کا نام قریش کی یادگار ہے، جن کی یہاں ابتداء میں اچھی خاصی آبادی تھی۔ کچھ عجب نہیں کہ ایسے موضوع پر قیاس اور تحقیق کے سرے آپس میں مل جائیں اور ایسی صورت حال پیدا ہو کہ حقیقت افسانہ اور افسانہ حقیقت بن جائے، تاہم اس بارہ میں جو معلومات بھی دستیاب ہوں، قابل قدر ہیں۔

یادرفتگاں کے سلسلہ میں ہماری نظر جواں مرگ شاعر میراجی کی طرف بھی جاتی ہے، جس کو سمجھنے کی کوششیں برابر جاری ہیں۔ "حلقۂ اربابِ ذوق" ایک طرح انہی کی یادگار ہے۔ اس سال حسب معمول حلقہ کی شاخ کراچی نے ان کی برسی منائی۔ اس موقع پر جو چیزیں پڑھی گئیں، ان میں سے دو اس شمارے میں پیش کی جارہی ہیں۔ شاید الطاف گوہر کا مضمون میراجی کے اعماق روح تک پہنچنے اور شخصیت کی گتھیوں کو سلجھانے میں مدد دے۔

کچھ عرصہ ہوا نذر سجاد حیدر صاحبہ نے اپنے سوانح لکھنے شروع کئے تھے، یہ سوانح ابھی تک مکمل نہیں ہوئے لیکن ان کا ایک حصہ جو ہمیں جلیل قدوائی صاحب کے ذریعہ سے حاصل ہوا ہے، اس شمارہ میں پیش کیا جا رہا ہے۔

پاکستان میں فنونِ لطیفہ کی روز افزوں مقبولیت نے آخر کار "پاکستان آرٹ کونسل" جیسے سرگرم ادارے کی شکل اختیار کی ہے، جو فنونِ لطیفہ کی ہمہ گیر نشوونما کا کفیل ہے۔ نقاشی کی پہلی کل پاکستان قومی نمائش اسی کی جدوجہد کی آئینہ دار ہے۔ یہ نمائش جس کی مختصر کیفیت اس شمارہ میں پیش کی گئی ہے، اس کی سرگرمیوں کا عکسِ اولیں ہے۔

ادب کو زیادہ سے زیادہ ترقی اور جلا دینے کی خواہش ہمارے اندر نئی نئی کوششوں اور تجربوں کی تحریص و تحریک پیدا کرتی ہے۔ اس مقصد کو بوجہ احسن حاصل کرنے کے لئے امعانِ نظر سے حالات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ تاکہ ہم ایک نیا لائحۂ فکر و عمل تلاش کر سکیں۔ ایک مضمون بہ عنوان "تجربہ اور تخلیق" میں ایسی ہی کوشش نمایاں ہے۔ امید ہے کہ جس موضوع پر مضمون نگار نے قلم اٹھایا ہے وہ دوسروں کو بھی غور و فکر اور اظہارِ خیالات کی ترغیب دلائے گا۔

"مردِ راہ داں"

عبدالرؤف عروج

قبائے شب پہ ستاروں کی ملگجی سی لکیر سرشکِ دیدۂ دل کی بہار کاری تھی
سکوت چیخ رہا تھا خزاں سلائے وحشی کا سکوں نژاد فضاؤں میں بیقراری تھی
نہ آرزو نہ تمنا نہ آگہی نہ طلب دلوں پہ ایک گماں زاد موت طاری تھی

عمیق سوچ کی دانش گداز راتوں میں کوئی چراغ نہ تھا اہلِ کارواں کے لئے
فتادہ گام —— بہرگام صاحبانِ سفر ترس رہے تھے کسی مردِ راہ داں کے لئے

قلندرانہ عزائم کی مشعلیں لے کر بہ التہابِ جنوں، ایک رہنما اٹھا
رکھی تھیں نبضِ زمانہ پہ انگلیاں اس کی مزاجِ عصر کو پہچانتا ہوا اٹھا
نشاطِ کارِ ہوس کے طلسم ٹوٹ گئے حجابِ مرحلۂ فکر و ارتقا اٹھا

دمِ مسیح وہی تھا وہی یدِ بیضا کفِ غبار کو تنویرِ آفتاب ملی
حریفِ ورطۂ غم، کوکبِ جلال ہوئے ضمیرِ وقت کو تقدیرِ انقلاب ملی

جمودِ کہنہ و افسردہ کی گرانی میں دلوں کو دولتِ انوار سونپ دی اس نے
غمِ حقائقِ سنگیں کے زیردستوں کو متاعِ عظمتِ کردار سونپ دی اس نے

اسی کا سازِ درا —— یعنی اتحادِ عمل بہ اہتمامِ یقیں حوصلہ بڑھاتا ہے
قدم قدم پہ نئی منزلیں ابھرتی ہیں اسی کا سحرِ نظر راستہ دکھاتا ہے
اسی کی روح کا پرتو، اسی کے عزم کا عکس دل و دماغ کے پردوں پہ تھرتھراتا ہے

نشیدِ حریتِ فکر، آرزو اس کی اسے زمانہ بڑی حیرتوں سے تکتا ہے
یہ بیکرانہ و مستانہ زندگی کا خرام یہ ارتقا کے قدم کون روک سکتا ہے

سلام اس کے خجستہ نظر جوانوں پر گزر رہے ہیں جو اک رہ سے سر اٹھائے ہوئے
جنوں نے محو کیے نسل و رنگ کے طاغوت
خیال فکر و نظر کی صفیں جمائے ہوئے

بہ یاد قائدؒ،

خضرِ راہ

مطلوب الحسن سیّد

پچھلی لڑائی سے چند مہینے قبل ہم چند دوستوں نے مشترکہ طور پر ایک چھوٹا سا مکان بمبئی میں کرائے پر لے رکھا تھا ہم میں سے کسی کی بھی شادی نہیں ہوئی تھی اور ہمارے مکان کا انداز ایک کالج کے بورڈنگ ہاؤس کا سا تھا۔ شام کو جب ہم سب اپنے اپنے کام سے واپس آتے تو طالب علموں کے انداز میں دن بھر کی کارگزاریوں پر تبصرہ ہوا کرتا۔

ہمارے اس گروہ میں ایک صاحب سب سے سن رسیدہ تھے۔ زیادہ نہیں صرف دو تین سال پہلے بھی ہم سب لوگ ان کو بھائی کہا کرتے تھے۔

بھائی کا انداز سب سے نرالا تھا۔ اس لئے کہ جہاں ہم سب قائدِ اعظم کے بے حد مداح اور جاں نثار معتقدین میں سے تھے، بھائی بے انتہا مخالف اور شدید معترض تھے۔ مگر بھائی کو ہم سب پر فوقیت تھی۔ وہ اسلامی تاریخ سے بخوبی واقف تھے۔ اور بین الاقوامی معاملات میں کافی دخل رکھتے تھے۔ سیاست سے ان کو بہت شغف تھا، چنانچہ عموماً شام کو روزانہ، سیاسیات پر ہی بحث ہوا کرتی اور بھائی ہم سب پر چھا جایا کرتے۔

مگر بھائی میں ایک بڑی خوبی اور بھی اور وہ یہ کہ وہ ہر چیز کو عملی پہلو سے جانچا کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ سخت اختلافات کے باوجود بھی ہم سب کے دلوں میں ان کی بڑی عزت تھی۔ ہم سب کو یقین تھا کہ ان کی دانست میں اب تک قائدِ اعظم نے کوئی عمل ایسا نہیں کیا جس سے وہ اپنی رائے تبدیل کر دیں۔

بہرحال بھائی کو دو باتوں کا یقین تھا: اسلامی تاریخ کے مطالعہ نے ان کو اس نظریہ پر مستحکم کر دیا تھا کہ انگریز مسلمانوں کے مفاد میں سوچ ہی نہیں سکتا۔ دوسری طرف کمپنی کے ایک ہندو ادارہ کی ملازمت نے ان کو یقین دلا دیا تھا کہ مسلمان خواہ وہ کتنا بھی قابل اور بے نفس ہو تعصب کی آنچ سے بچ نہیں سکتا۔ اس سے بحث نہیں کہ ان کا یہ نظریہ صحیح تھا یا غلط، مگر ان کو دونوں باتوں کا یقین کامل تھا۔ انہیں نظریات کے تحت ان کو قائدِ اعظم کی سیاست میں کوئی چیز ایسی نظر نہیں آتی تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ وہ انگریز یا ہندو سے کسی وقت بھی جنگ کرنے کو تیار ہوں گے۔ بلکہ ان کا یہ خیال تھا کہ مسلم لیگ کی ساری سیاست قائدِ اعظمؒ کے اپنے مفاد کے لئے ہے اور وہ اپنی قیادت کو اس حد تک پہنچانا چاہتے ہیں کہ ان کو انگریز اور ہندو سے سودا کرنے کا موقع مل جائے۔ وہ ہمیشہ ایک طرف قائدِ اعظم کی ولایتی تعلیم، مغربی طرزِ بود و باش اور دوسری طرف ہندو اداروں کی طرف ان کے رویہ کا ذکر کرتے اور کہتے تھے کہ اس قسم کا انسان مسلمانوں کی قیادت کا اہل نہیں ہو سکتا۔

لیکن ۲۴ مارچ ۱۹۴۰ء کے اخبار نے ان حضرت کے ذہن میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس اخبار میں لاہور کی مشہور قرارداد کو موٹی موٹی سرخیوں میں پیش کیا گیا تھا۔ ہمارے ان بزرگ دوست نے وہ اخبار اور وہ قرارداد کئی مرتبہ پڑھی اور جب شام کو ہم سب جمع ہوئے تو کہا "مسلمانوں کو اگر کوئی قائد نصیب ہوا ہے تو وہ محمد علی جناح ہی ہیں۔"

ہم لوگ سب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور سوچ رہے تھے کہ اپنے کانوں پر یقین کریں ... انہوں نے پھر کہا۔ "آج سے میں تم سب سے زیادہ قائدِ اعظم کا معتقد ہوں۔"

قائد اعظم رح

اور یہ واقعہ ہے کہ اس کے بعد انہوں نے کبھی کسی کی زبان سے قائداعظم کی شان میں گستاخی کا ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کیا۔

• دو ہفتہ بعد جب مجھے قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا تو میں نے ان کو یہ واقعہ سنایا۔ انہوں نے کہا "یہ شخص واقعی مسلمانوں کے میلانِ طبع کا صحیح نمائندہ ہے۔ تم دیکھو گے کہ اس قرارداد کو ہماری قوم اتنی اچھی طرح سمجھے گی کہ لوگ دیکھتے رہ جائیں گے"
اس کے بعد کے واقعات ہماری تاریخ میں اس قدر تازہ ہیں کہ ان کی تفصیل محتاج بیان نہیں۔

میں نے یہ واقعہ اس لئے بیان کیا ہے کہ اس سے قائداعظم کی عظیم شخصیت پر نئی روشنی پڑتی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا کوئی فیصلہ ایسا نہیں ہوتا تھا جس کے متعلق انہیں یقین نہ ہو کہ وہ قوم کے احساسات کی پوری ترجمانی نہیں کرے گا۔

ایک مرتبہ میں نے قائداعظم سے پوچھا کہ ان کو اپنے فیصلوں پر اتنا کامل یقین کیونکر ہوتا ہے؟ انہوں نے کہا ہر فیصلہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ قوم کے مفاد میں ہو اور فیصلہ کرنے والے کا ضمیر اس بات کی گواہی دے کہ وہ ایمانداری سے کیا گیا ہے، بس اتنا ہی کافی ہے۔
انہوں نے کہا، کچھ بھی ہو سچائی کی ہمیشہ جیت ہوتی ہے۔

قائداعظم اپنے فیصلوں میں کبھی جلد بازی سے کام نہیں لیتے تھے۔ انہوں نے اپنے خطبوں میں ہزاروں بار کہا ہے "فیصلہ کرنے سے قبل خوب غور کر لو۔ سو بار، بلکہ ہزار بار اور جب ایک نتیجہ پر پہنچ جاؤ تو پھر اس پر اڑے رہو" یہی وجہ ہے کہ قائداعظم نے اصولوں پر کبھی مصلحت کو ترجیح نہیں دی اور کبھی اصولوں پر سودا بازی نہیں کی۔ مثلاً حسب ذیل واقعہ سے بھی اس رائے کو تقویت پہنچتی ہے:

مسٹر پریرا بمبئی کے ایک مشہور وکیل تھے۔ انہوں نے مجھے یہ واقعہ سنایا کہ جس زمانہ میں قائداعظم وکالت کیا کرتے تھے، ان کے پاس ایک مقدمہ پیروی کے لئے آیا۔ مقدمہ جائداد کے متعلق تھا جس فریق کی طرف سے قائداعظم بحث کر رہے تھے، اس کے خیال میں جائداد کا حقدار وہی تھا، لیکن جو کاغذات عدالت میں پیش کئے گئے تھے ان کی رو سے جائداد مخالفوں کی ملکیت معلوم ہوتی تھی۔ جب یہ کاغذات قائداعظم نے ملاحظہ فرمائے تو انہوں نے اپنے موکل سے کہا کہ ان کی رائے میں جائداد پر اس کا کوئی حق نہیں اور یہ رائے دی کہ مخالفوں کی طرف سے سمجھوتہ کی تجویز قبول کر لے۔ موکل نے کہا "میں اس بات پر ہرگز راضی نہیں ہو سکتا، کیونکہ مجھے معلوم ہے یہ کاغذات سب جعلی ہیں"

جب قائداعظم نے دیکھا کہ موکل اپنی بات پر اڑا ہوا ہے تو انہوں نے عدالت سے درخواست کی کہ اصل کاغذات کی تصدیق شدہ نقلیں منگالی جائیں۔ چنانچہ کچھ دن بعد وہ نقلیں پیش ہوئیں وہ بھی موکل کے خلاف تھیں۔ قائداعظم نے پھر زور دیا کہ سمجھوتہ کر لیا جائے مگر موکل نے کہا نہیں یہ نقلیں بھی جعلی ہیں۔ اس پر قائداعظم کو بڑا غصہ آیا اور انہوں نے اس کو سمجھایا کہ عدالت کی تصدیق شدہ نقلیں غلط نہیں ہوا کرتیں۔ موکل نے کہا "میں سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں۔ آپ اصلی کاغذات منگالیں"

کئی دن تک قائداعظم اپنے موکل کو سمجھاتے رہے کہ اس مقدمہ کی مزید پیروی کرنا خواہ مخواہ روپیہ ضائع کرنا ہے۔ اور بجز نقصان کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ موکل نے کہا کچھ بھی ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ کاغذات جعلی ہیں۔ آپ اصلی منگالیں۔ بہرحال قائداعظم نے مجبوراً اصلی کاغذات منگانے کی درخواست دے دی۔

جب اصلیں عدالت میں پیش ہوئیں تو واقعی وہ قائداعظم کے موکل کے بالکل موافق تھیں۔ بعد میں یہ معلوم ہوا کہ مخالفین نے رشوتیں دے دے کر تمام کاغذات جعلی بنوا لئے تھے۔ اس واقعہ کے بعد قائداعظم نے کبھی اپنے موکل کو سمجھوتہ کی رائے نہیں دی اور نہ کبھی نقلوں پر اعتماد کیا۔

میراجی کی شخصیت

الطاف گوہر

میراجی کے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے اب مجھے جھجک سی محسوس ہوتی ہے، شروع شروع میں یہ سوچ کر کہ میراجی کا دائرہ احباب بہت مختصر تھا اس لئے جس کسی کو بھی ان کے بارے میں کچھ معلوم ہو ضرور کہہ ڈالے میں نے بھی ذاتی مشاہدات قلمبند کر دیئے تھے، مگر اس کے بعد پتہ چلا کہ وہ دائرۂ احباب مختصر سہی مگر اس دائرہ کا ہر رکن اپنی جگہ معلومات کا سرچشمہ ہے، اور ایسی ایسی باتیں سننے میں آئیں کہ جو میرے گمان میں بھی نہ تھیں بمبئی میں وہ بلانوشی کا عالم تھا کہ خم و ساغر سے معاملہ کچے گھڑوں کے وسطی مدارج طے کرتا ہوا بالٹیاں لنڈھانے تک پہنچا، ان بالٹیوں میں کیا بھرا ہوتا تھا اس کے بارے میں روایت میں اختلاف ہے، ولایتی شراب، دیسی ٹھرا، پٹرول، کیروسین کا تیل، گدلا پانی، یا ان سب اجزاء کا مرکب، ایک اور صاحب نے فرمایا کہ لین دین کے معاملہ میں میراجی اپنی مثال آپ تھے، شروع میں ادھار لیتے تھے، اور بعد میں جیب کاٹنے لگے، جس دوست کے ہاں جاتے اس کے تکیے کے نیچے سے اشرفیوں کی تھیلی صبح سویرے منہ اندھیرے نکال کر اپنی راہ لیتے، سود خور پٹھانوں کو اگر کوئی چرکا لگانے میں کامیاب ہوا تو وہ میراجی تھے، پشاور سے رنگون تک یہ پٹھان لٹھ لئے میراجی کی تلاش میں سرگرداں رہے مگر وہ اطمینان سے بمبئی کے ایک ہسپتال میں سانس کی ایرا پھیری میں لگے رہے، معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں بمبئی میں جو کوئی ادیب بھی تھا وہ دن بھر محنت مشقت کرتا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ کاٹ کر میراجی کی حسب توفیق امداد بھی کرتا تھا، مرحوم و مغفور سعادت حسن منٹو کو یہ جان کر بے حد دکھ ہوا کہ میراجی کو نہ صرف مفلسی بلکہ شراب خوری کی عادت بھی ہے، انہوں نے بارہا تلقین فرمائی اور ڈانٹ ڈپٹ بھی کی مگر میراجی نے ان کی ایک نہ سنی، اس کے باوجود منٹو مرحوم دامے درمے میراجی کی مدد کرتے رہے اور ایک دفعہ تو اپنے ساتھ انہیں ایک فلم اسٹوڈیو کے دروازے تک بھی لے گئے، پاکیزگی اور طہارت کا میراجی کو قطعی کوئی احساس نہ تھا، بڑھے ہوئے الجھے الجھے بال پھٹی ہوئی میلی شیروانی گھسے ہوئے تلے کا جوتا جس میں تسمے تک ندارد، اور صاحب کیا عرض کیا جائے۔ اور ملازمتیں تو نہ جانے کتنے لوگوں نے ان کو دلوائیں، مگر ان کی متلون مزاجی نے انہیں کہیں دم بھر کے لئے ٹھہرنے نہ دیا۔ یہ تو ہوئی ان کی ذاتی زندگی، اب شعر و ادب کی سنئے، جاہل مطلق، ادھر ادھر سے انگریزی اور فرانسیسی شاعری پڑھ کر مبہم مبہم باتیں کہتے تھے، ان کی ساری شاعری جنسی غلاظتوں سے بھری ہے شاعروں میں جاتے تھے بالکل دھت، پونا میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا بڑے عظیم الشان پیمانے پر جوش، جگر، فراق سبھی تھے، میراجی آئے اور حاضرین کی طرف پیٹھ کر کے پڑھنے لگے "نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا" غصہ کے مارے ساری محفل پر سکتہ طاری ہو گیا اور جب تک میراجی پڑھتے رہے محفل کا غصہ بدستور قائم رہا۔

ایک صاحب ہیں جنہوں نے بڑی عبادت کی شان سے اردو تنقید پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے اور جس میں ہر ایسے سوال کا جواب موجود ہے جو مڈل کے طالب علموں کو امتحان میں پوچھا جا سکتا ہے، ظاہر ہے کہ کوئی چیز ان کی فہم سے بالا نہیں ہو سکتی، میراجی کی دیدہ دہنی دیکھئے کہ ان کے سامنے اپنی ایک نظم "جنازے رکھے ہوئے ہیں ان کو اٹھاؤ، جاؤ" پڑھنے لگے، نظم سنتے ہی آپ نے کہا صاحب میری سمجھ میں تو کچھ آیا نہیں، میراجی نے پہلے بند کی وضاحت کی ڈرتے ڈرتے، پھر دوسرے بند کی، مگر محض دو بندوں کی وضاحت سے نظم کا تیسرا بند کیسے واضح ہو جاتا، انہوں نے بڑا اصرار کیا کہ تیسرے بند کی وضاحت بھی کیجیے، میراجی کو یہ ماننا پڑا کہ صاحب تیسرے بند کے

معنی تو مجھے خود بھی معلوم نہیں، صاحب تنقید نے فیصلہ دیا کہ میرا جی کو اپنی نظموں کے معنی خود بھی معلوم نہیں ہوتے تھے، پڑھنے والے کوئی شاعر کے زر خرید غلام تو نہیں کہ دو بند سمجھ لینے کے بعد تیسرا بند بھی ضرور سمجھ لیں، اور جنہیں تنقید پہ کتابیں لکھنا ہوں ان کے پاس اتنا وقت کہاں ہوتا ہے کہ خود ہی نظمیں پڑھیں اور خود ہی نہیں سمجھیں بھی :

میں یہ باتیں سنتا ہوں تو سوچتا ہوں ممکن ہے میرا جی وقت کے ساتھ ساتھ بدل گئے ہوں، جس میرا جی کو میں جانتا تھا وہ ایک سیدھا سادا سچ مچ کا شاعر تھا، ایسا ہی جیسے کوئی گاؤں کا گویّا جسے فطرت نے آواز بخش دی ہو اور جو دن بھر برگد کے نیچے بیٹھا گاتا ہے، یا کوئی جنگل کا جوگی جو پرندوں کی آوازوں میں کھویا ہوا فضا میں تکتا رہے، سیدھے سادے سچ مچ کے شاعر اس زمانے میں بہت کم ہوتے ہیں، شعری تخلیق کا فعل کچھ اسقدر الجھ گیا ہے کہ اب اس میں جذبات، فکر، استدلال، عقل سبھی کارفرما نظر آتے ہیں، جذبہ کی تمامیت اور راستی نہ صرف منتشر ہوتی ہے بلکہ اس میں ایسے اجزا بھی شامل ہوگئے ہیں جو بظاہر بے تعلق اور غیر مربوط معلوم ہوتے ہیں، پہلے جب عشق کی بات ہوتی تھی تو عشق ہی کی بات ہوتی تھی، بہت ہوا تو ایک آدھ اشارہ غم دوراں کی طرف ہو گیا مگر اب عشق کے تذکرے میں مہنگی کے بیوپار، ردعابیت کے اسرار، شخصی اور سماجی نامرادی، سبھی کا ذکر آ جاتا ہے، آجکل کا شاعر فلسفی بھی ہے، منطقی بھی، مصور بھی ہے سنگتراش بھی، صوفی بھی رہے، گیانی بھی، میرا جی یہ ـ کچھ نہیں مگر اسے یہ سب کچھ بننا پڑا، وہ دور کسی گاؤں میں ہوتا تو اپنی کٹیا کے ایک سیدھے سادے دوارے سے دیکھتا۔

"جنگل کی ہر اک ٹہنی نے سبزی چھوڑی، شرما کے چھپی تاریکی میں
اور رنگ برنگے پھولوں کے شعلے کالے کاجل بن کر روپوش ہوئے
اور بادل کے گھونگھٹ کی اوٹ سے ہی تکتے تکتے چنچل چندا کا روپ بڑھا
یہ چندا کرشن ـ ستارے ہیں جھرمٹ برندا کی سکھیوں کا!
اور زہرہ نیلے منڈل کی رادھا بنکر کیوں آئی ہے؟
کیا رادھا کی سندرتا چاند بہاری کے من بھائے گی؟
جنگل کی گھنی گپھاؤں میں جگنو جگمگ جگمگ کرتے، جلتے بجھتے چنگارے ہیں
اور جھینگر تال کنارے سے گیتوں کے تیر چلاتے ہیں،
نغموں میں بہتے جاتے ہیں! (سنجوگ)

اور اسی سے اس کی شعری تسکین ہوجاتی میرا جی کی شخصیت کا اصل شعری جوہر فطرت سے قرب اور ردعمل کا خلوص اور سالمیت ہے، اس ردعمل میں بار بار بچے کے ذہن کی پاکیزگی اور سادگی کا احساس ہوتا ہے :

دوپٹہ شب کا ڈھلکے گا
نہ ٹھہرے گا یہ سر پہ رات کی رانی کے اک پل کو
یہ روشن اور اُجلا چاند یعنی رات کا پرکھی
یہ آس کہ جگمگاتے، پیلے تاروں سے
سجا کر لایا ہے گھر سے، (آمد صبح)

یا "ایک تصویر" میں سے

کانوں میں دو بُندے جیسے ننھے منے جھولے ہیں
چنچل اچپل سندرتا کے سکھ میں سب کچھ بھولے ہیں

جوڑا بیل بنا لیتا ہے باہنیں گویا ڈالی ہیں
بیل اور ڈالی کی روحیں یوں مست ہیں مدمتوالی ہیں

اِن مصرعوں میں بالکل وہی کیفیت ہے جو دیہات کے نغموں اور بولیوں میں ہوتی ہے، ان میں نہ کوئی ابہام ہے نہ جذبے کا انتشار، ردِعمل مشاہدہ کی طرح بلا واسطہ اور مکمل ہے، یہ کیفیت میراجی کی شاعری کے کسی مخصوص دور سے متعلق نہیں بلکہ شروع سے آخر تک موجود ہے اس میں شک نہیں کہ ۱۹۴۰ء سے پہلے کی نظموں اور گیتوں میں اس کی مثالیں نسبتاً زیادہ ہیں اور آخری چند سالوں کی نظموں میں یہ کیفیت بہت حد تک مدھم پڑ گئی ہے، ان کی نظم "دھوبی کا گھاٹ" بہت بدنام ہوئی ہے، مگر اس میں بھی ایسے مصرعے موجود ہیں جن میں بچپن کی سی سادگی کا احساس ملتا ہے:

"کیوں صبحِ شبِ عیش کا جھونکا
بن کر
رخسار کی بے نام اذیت
سہلاتا ہے مجھ کو"

آخری دور کی ایک نظم ہے "ایک بچی عورت"۔ یہ نظم اس وقت کی ہے جب میراجی پر قریب قریب سب کچھ گذر چکا تھا، اس میں ایک بے حد الجھے ہوئے تجربہ کا اظہار ہے، اس نظم سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ شاعر کے ذہن میں اسی پہلی سادگی اور پاکیزگی کی طرف لوٹ جانے کی کتنی بے پناہ خواہش ہے:

"یہ جی چاہتا ہے کہ تم ایک ننھی سی لڑکی ہو اور ہم تمہیں گود میں لے کے اپنی بٹھا لیں
یونہی چیخو، چلاؤ، ہنس دو، یونہی ہاتھ اٹھاؤ، ہوا میں ہلاؤ، ہلا کر گرا دو
کبھی ایسے جیسے کوئی بات کہنے لگی ہو
کبھی ایسے جیسے نہ بولیں گے تم سے
کبھی مسکراتے ہوئے، شور کرتے ہوئے، پھر گلے سے لپٹ کر کرو ایسی باتیں
ہمیں سرسراتی ہوا یاد آئے
جو گنجان پیڑوں کی شاخوں سے ٹکرائے دل کو انوکھی پہیلی بجھائے مگر وہ پہیلی سمجھ میں نہ آئے"

میراجی کی شعری شخصیت کی سادگی اور بچپن کی سی پاکیزگی کے عنصر پر آپ کی توجہ مرکوز کرانے کے لئے میں نے یہ سب مثالیں ایک خاص ترتیب سے منتخب کی ہیں، شروع میں جو باتیں میں نے میراجی کی ذات کے بارے میں ان کے جاننے والوں کی طرف سے بیان کی تھیں انہیں سن کر یہ خیال نہیں گزرتا کہ ایک ایسی الجھی ہوئی اور متنازعہ شخصیت کا کوئی پہلو اتنا سادہ اور صاف ستھرا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کہے:

"کھلا کھیت گندم کا پھیلا ہوا ہے
بہت دور آکاش کا شامیانہ انوکھی مسہری بنائے رسیلے اشاروں سے بہکا رہا ہے
تھپیڑوں سے پانی کی آواز بچپن کے گیتوں میں گھل کر پھسلتے ہوئے اب نگاہوں سے اوجھل ہوئی جا رہی ہے"

(رس کی انوکھی لہریں)

مجھے میراجی کی شخصیت کے اس عنصر کی اہمیت کا اشارہ اس بات سے ملا کہ جس دور سے اس کا تعلق ہے اس دور کی شاعری میں ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں فیض، راشد، دونوں شخصیت کے اعتبار سے میراجی کی بہ نسبت کہیں زیادہ مربوط ہیں مگر ان کے مشاہدات اور تجربات میں ایک گہری سوفسطائیت پائی جاتی ہے، وہ فطری سادگی، اور ردِعمل کی وہ اولیت جو لوک گیتوں میں ہوتی ہے وہ میراجی کے

علاوہ اس دور کے اور کسی شاعر کے کلام میں نظر نہیں آتی، اس چیز کا احساس مجھے میراجی سے ذاتی واقفیت کے بنا پر نہیں ہوا، ان کے جاننے والے شاید اس بات پر متفق ہوں کہ ہزار الجھنوں کے باوجود ان کی شخصیت میں کوئی ایسی چیز ضرور تھی جو ایک مخصوص کشش رکھتی تھی، اور اب جو میں ان کے اور اپنے تعلقات کی بعض غیر اہم اور سرسری تفصیلات پر غور کرتا ہوں تو مجھے لگتا ہے جیسے اس کشش میں فطری سادگی اور بچوں کی سی ایمان داری تھی، بس ایک ملازمت کے انٹرویو کے سلسلے میں وہی گیا، ریڈیو اسٹیشن پر میراجی سے ملاقات ہوئی انہوں نے کہا یہ جو سوٹ آپ نے پہن رکھا ہے چونکہ مانگا ہوا معلوم ہوتا ہے لہذا پچاس نمبر تو اسی کے کٹ جائیں گے، انٹرویو کے کمرے کے باہر ہم لوگ بیٹھے تھے اور میراجی دن بھر ہمارے ساتھ رہے اور ہر ایک کو کامیابی کے گر سمجھاتے رہے، اسی موقع پر انہوں نے ضیا جالندھری صاحب سے کہا تھا کہ ضیا صاحب انٹرویو کے دوران میں آپ عقل استعمال نہ کیجئے بس سیدھے سیدھے جواب دیتے جائیے۔ اس فطری سادگی کے باوجود میراجی کی زندگی اور شاعری دونوں بری طرح سے الجھی ہوئی سی رہی، بعض شعرا کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہوئے، میراجی شاید اپنے وقت کے بہت بعد پیدا ہوئے، اور اپنے آپ کو وقت سے ہم آہنگ بنانے میں انہیں بڑی اذیت اٹھانی پڑی، جو وقت انہیں نصیب ہوا اس میں کوئی شے مستحکم نہ تھی، نہ سیاسی حالات پُرامن تھے، نہ کوئی سماجی اقدار قابل اعتماد تھیں۔ کوئی اخلاقی قدر ایسی نہ تھی جسے وہ اپنا رشتہ جوڑ کر اپنے تخلیقی جوہر کے اظہار کی کوئی راہ نکال سکتے، جمالیاتی نظریہ جو انہیں ورثہ میں ملا وہ یہ تھا کہ کوئی اخلاقی قدر قطعی نہیں اگر کوئی چیز قطعی ہے تو وہ حسن کی قدر ہے، ایک زمانہ کی اخلاقی قدریں دوسرے زمانے کی اخلاقی قدروں سے قطعی مختلف ہوتی ہیں، حسن کی قدر البتہ ہر دور اور ہر زمانے میں مشترک ہے، لہذا کردار اور عمل سے بے نیاز ہو کر میراجی نے حسن کی جستجو کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا، جی کے چیسٹرٹن نے وسلر کی مزاج نگاری پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ اسی موضوع کی طرف اشارہ کیا ہے: "جدید دور کے جمالیات پرست بڑے زوروں سے اخلاقی قدروں کے خلاف مظاہرہ کرتے ہیں..... وہ ہم پر یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ کہیں زیادہ حسن کے قائل ہیں، میلارمے کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں اور گھٹیا شراب خانوں میں بیٹھ کر پیتے ہیں"۔

غزل

غم کے بھروسے کیا کچھ چھوڑا، کیا اب تم سے بیان کریں
غم بھی راس آیا نہ دل کو اور ہی کچھ سامان کریں

کرنے اور کہنے کی باتیں کس نے کہیں اور کس نے کیں
کرتے کہتے دیکھیں کسی کو ہم بھی کوئی پیمان کریں

بھلی بری جیسے بھی گذری ان کے سہارے گذری ہے
حضرت دل جب ہاتھ بڑھائیں ہر مشکل آسان کریں

ایک ٹھکانہ آگے آگے پیچھے پیچھے مسافر ہے
چلتے چلتے سانس جو ٹوٹے منزل کا عنوان کریں

مجبوروں کی مختاروں سے دوری اچھی ہوتی ہے
مل بیٹھیں تو مبادا دونوں باہم کچھ احسان کریں

دستِ ہنر دمیں خشتِ رنگیں اس کا اشارہ کرتی ہے
ایک ہی نعرہ کافی ہے بربادئ ہر ایوان کریں

میرؔ ملے تھے میراجی سے، باتوں سے ہم جان گئے
فیض کا چشمہ جاری ہے حفظ ان کا بھی دیوان کریں

میراجی

میراجی کے ظاہرہ کردار پر اس آخری جملہ کا پورا پورا اطلاق ہوتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ بہت سے جدید شاعر یہ سب کچھ دکھاوے کے لئے کرتے تھے اور میراجی مجبور ہو کر، وہ دور کسی گاؤں میں برگد کے پیڑ کے نیچے بیٹھے اگر سیدھے سادے بول گاتے رہتے، تو انہیں نہ شراب کی ضرورت پیش آتی اور نہ میلارمے کی، چاند کا دھلا ہوا چہرا، ندی کا صاف پانی جگمگ جگمگ کرتے تارے، گہری خاموشی اور رات کے سائے یہی ان کے لئے بہت ہوتے مگر چاند کے چہرے پر، ندی کی شفاف سطح اور چمکتے تاروں کی روشنی میں نجانے کیسے کیسے سیاہ دھارے پھیل چکے تھے کہ وہ اپنی سادگی کے باوجود ان الجھی ہوئی تاریک اور گھناؤنی لہروں کو دیکھنے پر مجبور تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ہر پل اور ہر لمحہ کو حسن کا ہر مظہر سمجھ لیا، اور انہیں حواس کی لذت سے وابستگی ہو گئی:۔

ماہِ نو، کراچی، دسمبر ۱۹۵۷ء

ہر منظر، ہر انسان کی دنیا، اور میٹھا جادو عورت کا
اک پل کو ہمارے بس میں ہے، پل بیتا، سب مٹ جائے گا
اس ایک جھلک کو چھیلتی نظر سے دیکھ کے جی بھر لینے دو،
تم اس کو ہوس کیوں کہتے ہو،
کیا دار جو اک لمحے کی ہو وہ دار نہیں کہلائے گی؟
ہے چاند فلک پہ اک لمحہ
اور اک لمحہ یہ تارے ہیں
اور عمر کا عرصہ بھی سوچو اک لمحہ ہے (جل چلاؤ)

یہ وابستگی رفتہ رفتہ جنسی لذت کی شکل اختیار کرنے لگی:

سفید بازو
گداز سینے
زباں تصور میں حظ اٹھائے
اور انگلیاں بڑھ کے چھونا چاہیں مگر انہیں برق ایسی لہریں
سمٹتی مٹھی کی شکل دے دیں

اس وابستگی کی سب سے افسوسناک مثال "لب جوئبارے" ہے، شعری طور پر یہ نظم شاید اتنی گھناؤنی نہیں مگر جہاں تک شاعر کی شخصیت کا تعلق ہے وہ ضرور ایسی سطح پر پہنچ گیا جہاں سے ابھرنا اس کے لئے ناممکن معلوم ہوتا ہے، اور اس سے خلش کی شدت کا پتہ بھی چلتا ہے،

"کیوں لمس کے حسرت کے جنوں سے
ملتی نہیں تجھ کو
بے قید رہائی؟" (دھوبی کا گھاٹ)

حواس کی لمحاتی لذت میراجی کی شخصیت پر اس طرح حاوی ہو گئی کہ ان کے لئے جنسی فعل کا ہر پہلو، ہر اشارہ حسن کا ایک مظہر بن گیا، اس موضوع پر ان کی جو نظمیں ہیں ان میں بعض سماجی مسائل کا بھی ذکر ہے، عورت کی بے حرمتی، مفلسی اور مجبوری کا، مگر نہایت سطحی اور سرسری طور پر، میراجی کی شاعری کا یہ دور ایک عبوری حیثیت رکھتا ہے، اسی دور میں ان کے دل میں لمحہ کے حسن اور حواس کی وقتی لذت کے بارے میں شکوک پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے کچھ اشارے تو ان نظموں میں بھی موجود ہیں جن کا خطاب مخصوص عورتوں سے ہے، اس شبہ کی سب سے واضح مثال ان کی نظم "اخلاق کے نام" ہے، اس نظم کا ایک مصرعہ جو مختلف صورتوں میں خیال کی حرکت کے ساتھ چلتا ہے بڑا اہم ہے" اور یہ جھوٹ بھی اک لمحہ جواں رہتا ہے" پہلی بار یہ بات میراجی پر بڑی شدت سے واضح ہوئی کہ لمحہ کا حسن اک جھوٹ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور "دن کا ہر بھید ہے للچاتی ہوئی رات کا جادو، اس کو
کئی پھسلانے کے، بہکانے کے ڈھب آتے ہیں"۔

اس کے بعد میراجی کی شاعری کا وہ گہرا عارفانہ دور آتا ہے جسے تنقید نگار حضرات نے عموماً نظرانداز کیا ہے، اس دور کی نظموں کا رنگ "سمندر کا بلاوا" سے متعین ہوتا ہے، اس دور کی نظموں میں وہی پرانی شگفتگی، وہی فطرت سے قرب موجود ہے، اور ان میں ماضی کی طرف لوٹ جانے کی ایک پُر درد خواہش ہے "اے پیارے لوگو، تم دور کیوں"

میراجی کی شخصیت مجھے وقت کی ایک لہر معلوم ہوتی ہے جو بڑی سادگی اور حسن سے اتراتی ہوئی اٹھی، سنگریزوں پہ پھسلتی ہوئی نکلی، گھناؤنی چٹانوں سے الجھتی ہوئی بڑھی اور ایک سیاہ ساحل سے ٹکرا کر دم توڑ کر رہ گئی، مگر اس لہر کی ہر حرکت سچی، اور جاندار تھی۔

ماہِ نو، کراچی۔ دسمبر ۱۹۵۷ء

تجربہ اور تخلیق

اصغر بٹ

تجربہ سے مراد بظاہر تاثر اور ردعمل کا امتزاج ہے۔ تجربہ کرنا مراد نہیں ہے۔ تجربہ کا لفظ مشاہدے کے مقابلے میں اس لئے زیادہ موزوں نظر آتا ہے کہ فنی تخلیق کے لئے مشاہدے کی ضرورت بے شک سہی لیکن مشاہدہ جب تک محض شخصیت سے باہر کی دنیا کی تصویر بنتا ہے اور شخصیت کے اندر گہرے محرکات کا باعث نہیں بنتا فنی تخلیق کا موجد نہیں ہو سکتا۔ بیرونی دنیا کا ایک فن کار کی شخصیت پر اثر انداز ہونا مشاہدے کی حدود میں آتا ہے لیکن کبھی کسی فنی تخلیق کے لئے محض ایک تجریدی خیال ہی کافی ہوتا ہے اور اس تجریدی خیال کو کسی ایک بیرونی تاثر سے واسطہ نہیں ہوتا پس مشاہدے کو اس محدود تعریف کے ساتھ ہر فنی تخلیق کا محرک قرار دینا درست معلوم نہیں ہوتا۔ ہر مشاہدے کو فن کار کے لئے ایک تجربہ ہونا پڑتا ہے، اور کبھی کبھی بہت سے مشاہدات شخصیت میں اس حد تک جذب ہو جاتے ہیں کہ ذہنی تجربے کو وہ جنم دیتے ہیں وہ ہر مشاہدے سے الگ اور ماوری ہوتا ہے۔ پس تجربے کا مشاہدے کے مقابلے میں تخلیق سے کہیں زیادہ گہرا رابطہ ہے۔ اور کوئی معیاری فنی تخلیق اس کے بغیر ممکن نہیں:

تجربے اور مشاہدے میں فرق واضح کرنے کے بعد خود تجربے کی نوعیت کی جانچ اس لئے ضروری ہے کہ ہر تجربے کے بعد تخلیق کا وجود میں آنا ضروری نہیں۔ تجربے میں کم از کم اتنی وسعت ہونی چاہیئے کہ ادب پارے کی وسعت اس سے زیادہ نہ ہو۔ مثلاً اگر تجربے کی وسعت کی بنا پر محض ایک افسانہ لکھا جا سکتا ہے اور کوشش یہ کی جائے کہ اس سے ناول بن جائے تو نتیجہ خاطر خواہ نہ ہوگا۔ ناول کے تجربے کے لئے عمر کے ایک اچھے خاصے بڑے حصے کے واقعات کا ناول نگار کو متاثر کرنا ضروری ہے۔ اور اگر بات اتنی سی ہو کہ اس سے محض ایک لطیفہ مرتب ہو سکے اور اس پر پورا افسانہ لکھ دیا جائے تو وہی ناکامی ہوگی۔ نظم کے میدان میں طویل نظم کا تجربہ اور غزل کے ایک شعر کا تجربہ (اگر کسی کو غزل کے لئے کوئی تجربہ ہوتا ہے تو) مختلف فنی روپ اختیار کریں گے۔ وسعت کے بعد گہرائی آتی ہے۔ بلکہ شاید پہلے آتی ہے کہ اس کے بغیر کسی قسم کی فنی تخلیق ممکن نہیں۔ اور اس گہرائی کو قبول کرنے کے لئے نہایت حساس شخصیت کی ضرورت ہے۔ ایک ہی واقعہ شاید فنکار اور غیر فنکار دونوں کو متاثر کرے لیکن فنکار کے ذہن پر اس کا تاثر زیادہ گہرا ہوگا اور شاید زیادہ دیرپا بھی ہوگا۔ مثلاً سڑک پر موٹر کا حادثہ دیکھ کر ہر راہ گیر رک جائے گا۔ ہر اک کے دل میں تاسف کے جذبات ابھریں گے لیکن فن کار کی گوناگوں شخصیت میں بیک وقت سینکڑوں سوال پیدا ہوں گے۔ اور ان کے سینکڑوں ہی جواب آئیں گے۔ موٹر والے لوگ کون تھے۔ کیا سوچ کر گھر سے چلے تھے۔ گھر والے ان کے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے۔ حادثے کے وقت ان کی ذہنی کیفیت کیا تھی۔ اس سے کتنے گھروں کی زندگی اجڑے گی اور کہاں تک اجڑے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔ ہاں یہ درست ہے کہ دو فنکار اس ایک واقعہ سے غالباً مختلف تاثر لیں گے۔ ممکن ہے دوسرا فنکار اسے خودکشی سمجھ کر اپنے ذہن میں الگ قسم کے واقعات سوچنے لگے۔ لیکن دونوں فنکاروں کا ذہنی تجربہ ایک عام راہگیر کے مقابلے میں زیادہ وسیع بھی ہوگا اور گہرا بھی ÷

اب جس کڑی سے یہ تجربہ تخلیق میں بدل جاتا ہے۔ وہ ہے اظہار کی خواہش اور اظہار پر قدرت — خواہش پہلے آئے گی تو اگلا قدم یعنی خود اظہار ممکن ہوگا۔ لیکن اگر حادثہ دیکھ کر اور اس سے پورا پورا تاثر اخذ کر کے بھی اس کے بارے میں قلم اٹھانے کو جی نہیں چاہا تو تجربہ فن کے دائرے میں نہیں آسکے گا۔ اور اگر تجربہ مکمل ہے اور اس کے بیان کرنے کی خواہش بھی موجود ہے لیکن الفاظ پر قدرت نہیں ہے تو اظہار نامکمل ہوگا اور تخلیق ناقص ہوگی۔ بس وسیع اور گہرے تجربے سے لے کر خواہش اور اظہار تک کی منازل فنی تخلیق کے لئے ضروری قرار پاتی ہیں۔ لیکن اس میں گنجائش شخصیت کی اپج کی رہ گئی، فنکار کے منفرد نقطۂ نظر اور اس کے خلوص کی رہ گئی۔ ان کو شامل کر لیجئے تو فن پارے میں جاذبیت کی کمی یا بیشی کا جواز مل جاتا ہے؛

اس ساری بات کے کہنے میں کوئی نئی تحقیق شامل نہیں۔ فن کے بارے میں ان حقائق سے لوگ پہلے سے آشنا ہیں۔ اب ان کو دہرانے کا مقصد یہ ہے کہ کیا آج کی تخلیقات پر بھی ان حقائق کا اطلاق ہوتا ہے ۔۔ اور آج کی تخلیقات زیرِ بحث اس لئے ہیں کہ پاکستان بننے کے بعد سے ادبی تخلیقات کا کوئی مقام تعین نہیں ہو پاتا۔ بعض نقادوں کا یہ کہنا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد اردو ادب میں قابلِ ذکر اضافہ ہوا ہی نہیں۔ کچھ یہ کہتے ہیں پاکستان بننے کے فوراً بعد تو تقسیم اور فسادات کے موضوع اچھی خاصی ادبی تخلیقات کے محرک بنے لیکن پچھلے قریباً پانچ چھ برس سے پاکستانی ادب پر مردنی چھا رہی ہے۔

اپنے اس دعوے کے ثبوت میں ادبی تخلیقات اور تحریکات کا مفصل تجزیہ ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ ایک اقلیت اس سے غیر متفق بھی ہے یعنی وہ سمجھتے ہیں کہ اردو ادب میں اب بھی کمال کی چیزیں لکھی جا رہی ہیں۔ لیکن اس اقلیت کی آواز ذرا کمزور ہے اور انہیں اپنا دعوٰی ثابت کرنے میں کافی دِقّت پیش آتی ہے۔ مقالہ نگار اپنا موقف ان دعووں کے بین بین سمجھتا ہے یعنی یہ کہ پاکستان بننے سے پیشتر اچھے لکھنے والوں کی کھیپ کی کھیپ نے جتنا معیاری۔ دلچسپ۔ متنوع اور زیادہ ادب اردو کو دیا۔ اتنا اس کے بعد کے لکھنے والوں نے نہیں دیا۔ مقدار کی بھی کمی رہی اور معیار کی بھی۔ لیکن جہاں جاندار تحریکات کا قریب قریب فقدان رہا وہاں فرداً فرداً بعض فنکار اپنی جبلی صلاحیتوں کو اجاگر کرتے رہے اور اب بھی کر رہے ہیں یعنی پاکستان بننے سے پیشتر میراجی۔ کرشن چندر۔ عصمت۔ راجندر سنگھ بیدی۔ منٹو۔ راشد اور فیض وغیرہ کا نوجوان طبقہ تھا۔ پرانی اقدار سے بغاوت بھی تھی اور نئے میدانوں کی تلاش بھی۔ ایک ولولہ سا تھا جس میں باوجود فنی اور ذہنی اختلافات کے تکنیک میں تجربے کرنے کی خواہش اور اظہار کی بھرپوریت تھی۔ مارکیٹ میں نئی نئی کتابیں اور رسائل آ رہے تھے اور ہاتھوں ہاتھ بک رہے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد سیاسی ادیبوں میں سے قرۃ العین حیدر اور دو ایک اور لوگ رہ جاتے ہیں جو اسی ترنگ میں لکھتے رہے جس میں پاکستان بننے سے پیشتر لکھ رہے تھے لیکن ان کا فن ماحول سے اور بیرونی واقعات سے ماوریٰ محض انفرادی ہو کر رہ جاتا ہے۔

اس ادبی خلا کی نافدوں نے مختلف توجیہات کی ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں ادیبوں کو مالی پریشانیوں نے گھیر رکھا ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ جب حکومت نے ترقی پسند تحریک کو کچل دیا تو ادب کا ارتقا رک گیا۔ اسی خیال کے کچھ اور رہنما فرماتے ہیں کہ فی الحال طبقاتی جنگ اس منزل پر نہیں پہنچی جس پر پہنچ کر ادبی تحریکات کو جلا ملتی ہے اور ادیبوں کو لکھنے کے لئے اُکساہٹ ہوتی ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ پہلے ادبی تخلیق کا مقصد آزادی کا حصول تھا۔ جب آزادی مل گئی تو اب وہ محرکات نہیں رہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ادب کس کے لئے لکھیں۔ ادب پڑھنے اور ادب خریدنے والے لوگ ہی چلے گئے۔ اب ادبی رسالوں اور کتابوں کو کون خریدتا ہے۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ پچھلی کھیپ لکھتے لکھتے تھک چکی ہے۔ اُن کے پاس اب کہنے کو کوئی بات نہیں رہی اور نئی کھیپ ابھی تیار نہیں ہوئی۔

میرے نزدیک ان میں بعض باتیں ادبی بانجھ پن کی تہہ میں ضرور ہیں لیکن ساری نہیں۔ اور کوئی ایک وجہ تو قطعی طور پر تخلیق کے مانع نہیں ہو سکتی۔ اس کا ثبوت ہمیں ہر ادب کی تاریخ سے مل سکتا ہے۔ مالی پریشانی کو لیجئے۔ گولڈ سمتھ مالی پریشانیوں میں نہیں رہا یا منٹو نہیں رہا۔ پھر وہ جو یہ کہتے ہیں کہ ادب کا ارتقا ترقی پسند تحریک کے ساتھ منسلک تھا کہنا شاید یہ چاہتے ہیں کہ اس تحریک کے حامیوں کے علاوہ ادب کے میدان میں اور کوئی قابلِ ذکر شخصیتیں تھیں ہی نہیں اور ہمعصر ادب کا کون طالب علم ہوگا جو اس کو ماننے کے لئے تیار ہو۔ اسی طرح آزادی کی جد وجہد زندگی کے اور شعبوں کی طرح دلچسپ مواد مہیا کرتی ہے لیکن ادبی موضوعات کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور رہے گا۔ جن کو پڑھنے والے طبقے سے سرد مہری کی شکایت ہے وہ یہ جانتے ہیں کہ بعض قسم کی کتابیں اور رسائل اب بھی لاکھوں کی تعداد میں بک رہے ہیں اور کافی قیمت پر بک رہے ہیں، یہی پیسے یا ان کا کچھ حصہ معیاری ادب کی خریداری پر بھی صرف ہو سکتا ہے لیکن معیاری ادب مارکیٹ میں آئے تو سہی۔ سنجیدہ ادبی کتابیں اب بھی بک رہی ہیں اور ناشروں کو ان میں کچھ فائدہ نظر آتا ہے جبھی وہ انہیں چھاپتے ہیں۔ رہ گئی آخری وجہ کہ پُرانے ادیب اپنے آپ کو دہرا رہے ہیں اور نئے ادیب ابھی میدان میں نہیں اترے تو یہ کافی حد تک قابلِ اعتنا ہے۔ لیکن یہ جاننا زیادہ ضروری ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے۔

ایک تو اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ پرانے ادیبوں میں سے بیشتر ادبی بغاوت کی منفی خوبیوں کو لے کر اٹھے تھے۔ یہ بغاوت تھی جنسی ذکر کی ممانعت کے خلاف۔ رؤسا اور امراکی کہانیوں کے خلاف۔ اخلاقی سبق آموزی کے خلاف۔ دوسری طرف اکثر لکھنے والوں میں غور و فکر کی کمی تھی۔ کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ اور شعوری رو کا طرزِ تحریر مثبت پہلو تھے لیکن تجرباتی دور سے آگے نہ نکل سکے۔ پس ان ادیبوں نے خود اپنے موضوعات کا دائرہ محدود رکھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے تجربات ہی اتنے مختصر تھے کہ بسیار نویسی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ بسیار نویسی بذاتِ خود کوئی خوبی نہیں ہے لیکن ایک وسیع اور زندہ شخصیت کے اظہار کے لئے اکثر ضروری ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نقطۂ نظر منفی ہو یا مثبت تجربہ ہی وہ بنیادی مواد ہے جس سے تخلیق مرتب ہوتی ہے۔ تجربے کی کوتاہیاں تخلیق کی کوتاہیاں بن جاتی ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مغربی ادب کے تتبع میں جو بات چل نکلی تھی وہ بڑھ نہ سکی کیونکہ مقامی زمین میں اس کی جڑیں نہ تھیں۔ جب اسے زمین میں گاڑ دیا گیا تو اسے مضبوط ہونے کے لئے کچھ عرصہ درکار ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پچھلے پانچ یا چھ برس میں ادیبوں کے گرد و پیش یا ان کے اذہان میں ایسی فضا رہی ہے جس سے اخذ کرنے کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ عقلِ سلیم اسے تسلیم نہیں کرے گی۔ تجربے کے لئے راستے میں پڑے ہوئے پھول سے لے کر راستے میں پڑی ہوئی لاش تک ہر واقعہ محرک ہو سکتا ہے اور ایسے واقعات ملکوں اور قوموں کے انقلابات کے بغیر بھی پیش آتے رہتے ہیں۔ پھر اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ کیا ادیبوں اور فنکاروں کے اذہان اتنے حساس نہیں رہے۔ یہ بات بھی قبول کرنے میں ہمیں تامل ہوگا۔ پھر جبکہ تجربے کے مواقع موجود ہیں۔ حساس شخصیتیں موجود ہیں، اظہار کی راہیں موجود ہیں تو مانع کیا چیز ہے؟

اس سوال کا جواب ہمیں دنیا کے دوسرے ادبوں میں تلاش کرنا چاہیئے۔ آخر انگریزی ادب میں سترہویں صدی کیوں اتنی زرخیز گنی جاتی ہے۔ اٹھارہویں صدی کے مقابلے میں اور پھر انیسویں صدی یکایک پھر کیوں زرخیز ہو جاتی ہے جبکہ تجربے اور تخلیق کے مواقع ایک سے ہیں۔ انگریزی ادب کا تجزیہ کرنے والے یہ کہتے ہیں کہ یوں تو سب صدیاں قریب قریب برابر کی زرخیز تھیں لیکن ہر صدی میں ادبی مذاق بدلتا رہتا تھا۔ سولہویں اور سترہویں صدی میں ایک قوم بین الاقوامی طور پر اپنے لئے ایک مقام پیدا کر رہی تھی۔ مہم بازی میں مصروف تھی چنانچہ ادب میں بھی وہی مہم نوازی ہے۔ وسعتوں کی تلاش ہے۔ اٹھارہویں صدی میں جو مل چکا تھا اسے ہضم کر کے ایک ہموار اور آراستہ نظام کی ترویج ہو رہی تھی۔ چنانچہ ادب میں وہی باتیں ہیں۔ انیسویں صدی میں اس آراستگی کے خلاف بغاوت کی لہر اٹھی تو ادب میں بھی وہی بغاوت آ گئی۔ یہ توجیہہ اپنی سادگی اور صفائی کی وجہ سے کافی گمراہ کن ہے اور اردو ادب پر ابھی اتنی صدیاں نہیں گذریں کہ ہمارے بدلتے ہوئے مذاق کی کوئی ایسی ہی آسان سی ترتیب سامنے آ جائے۔ لیکن ہاں ایک اشارہ البتہ ملتا ہے اور وہ یہ کہ ہر صدی میں اونچی قسم کے ادب کا ایک دور سا آتا ہے اور اس سے پہلے اور بعد کی تخلیقات بہت کم معیاری ہوتی رہی ہیں۔ ادیبوں میں نئے خیالات کی ایک رَو سی پیدا ہوتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ تجربے کرتے ہیں۔ اچھوتے مضامین ڈھونڈتے ہیں اور آنے والی پود کے لئے زمین ہموار کر دیتے ہیں۔ اگلی پود میں حساس اور ذہین فنکار اس تیار زمین میں مقابلتاً آسانی سے اپنی کارگذاری دکھا سکتے ہیں۔ یہ معیاری ادب کا دور مانا جاتا ہے۔ اس زمین میں جب کہنے کی سب باتیں کہی جا چکتی ہیں تو بعد کے کچھ لوگ محض نقالی ہی کر پاتے ہیں۔ یہ اس ادبی دور کا زوال ہے ___ جب اردو ادب کے موجودہ دَور کو دیکھتے ہیں تو گمان ایسا ہوتا ہے کہ نئے خیالات کو پیش کرنے والی پہلی پود گذر چکی ہے، زمین ہموار ہے ان کی کہی ہوئی باتیں ذہنوں میں رچ رہی ہیں ان کے بتائے ہوئے راستے دعوتِ سفر دے رہے ہیں اور ایک نئی پود جو ان خیالات اور تجربات کو آگے بڑھائے گی آنے والی ہے۔ موجودہ دور کی خاموشی آنے والے ہنگامے کی پیش خیمہ ہے، اور چنانچہ ہمارے ادب کا مستقبل اتنا تاریک نہیں جتنا کہ کبھی کبھی نظر آنے لگتا ہے ___ لیکن ایک خدشہ یہ بھی ہے کہ تجربے اور معیاری ادب دونوں کی تخلیق کا دور گذر چکا اب محض نقالی کا دور رہ ہے اور اس خدشے کو تقویت اس امر سے ملتی ہے کہ کرشن چندر اور فیض کی کھیپ سے پہلے لکھنے والوں کا ایک گروہ ایسا بھی نظر آتا ہے جو نئے ماحول کے لئے سازگار فضا پیدا کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ لاہور میں وہ گروہ ہے سالک، حسرت، پطرس، عابد، اور تاثیر کا اور ہندوستان میں جوش۔ جگر۔ عظیم بیگ چغتائی اور بعض دوسرے ادیبوں کا۔ ان کا اپنا ادبی مقام کچھ بھی ہو

لیکن یہ ہمیں معلوم ہے کہ کرشن چندر اور فیض کے گروہ کے اکثر لوگ ان سے متاثر تھے، اور ان میں سے بعض ان لوگوں کے شاگرد بھی تھے۔ پس اگر ادبی تحریکیں کمال اور زوال کے اس جانے بوجھے نقشے پر چلتی ہیں جس کا ذکر کیا جا چکا ہے تو ہو سکتا ہے کہ پہلی منزل پر حسرت اور پطرس کا گروہ آئے۔ دوسری منزل پر کرشن چندر اور فیض کا اور آخری منزل میں بعض موجودہ لکھنے والے شمار ہو سکیں۔ چنانچہ ایک چکر پورا ہو چکا ہو اور آنے والے دور کی دھندلی سی کوئی تصویر بھی ہمیں معلوم نہ ہو اور جانے کتنی دیر اور ہمیں منتظرِ فردا رہنا پڑے۔

ہمعصر ادب کے بارے میں کسی قسم کی قطعی رائے قائم کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ کیا جانے موجودہ تعطل کے دور کی بعض تخلیقات آنے والی صدیوں میں کلاسیک ہوں اور جن تخلیقات کو ہم حاصل دورِ ادب کہہ رہے ہیں انہیں وقتی یا سطحی کہہ کر رد کر دیا جائے۔ لیکن مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کرنے میں تو کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ اور میری رائے میں کرشن چندر اور فیض کا دور عروج کا دور نہیں ہے بلکہ ابتدا کا دور ہے۔ اور عروج کے دور کی طرف اگر کوئی قابل شناخت رجحان نظر نہیں آ رہا تو اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ پچھلے چند برس میں تجربے کی منزل سے تو غالباً کئی بہتر قسم کے حساس ذہن گذر چکے ہیں لیکن اظہار کی خواہش نہیں رکھتے۔ اس اظہار کی خواہش نہ رکھنے کی بھی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہی کہ فنی تخلیق کے لئے کلچر کی رائج اقدار ادیب کو جو فنی پس منظر مہیا کر سکتی ہے وہ کچھ عرصے سے ناپید ہے۔ دھندلکے کی اس فضا میں افراد اور سماج کی ٹھوس قسم کی نقاشی کا بس وارد۔ دوسرے بعض ادوار میں ناشروں اور ادیبوں میں متحدہ طور پر جس عہد پروری کا جذبہ ابھرتا ہے وہ فی الحال نظر نہیں آتا۔ کسی زمانے میں دِلّی سے ساقی اور لاہور سے ادبِ لطیف اور ادبی دنیا نے یکایک اس وقت کے لکھنے والوں سے مل کر جو فضا قائم کر دی تھی اب ایسا لگتا ہے کہ بعض نامساعد حالات کی وجہ سے آں قدح بشکست و آں ساقی نماند، کبھی کاغذ مل جاتا ہے کبھی نہیں ملتا۔ کبھی اشتہارات مل جاتے ہیں کبھی نہیں ملتے۔ نشر و اشاعت میں کئی قسم کی بلیک مارکیٹ نے جو بحرانی کیفیت پیدا کر رکھی ہے وہ ایک حساس ادیب کے لئے کافی حوصلہ شکن ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ سوچ سکتا ہے کہ کس کے لئے لکھوں؟ کیوں لکھوں؟ یہ تعطل اس وقت ختم ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے جب تجربے اور تخلیق کی درمیانی کڑی یعنی اظہار کی خواہش تمام رکاوٹوں اور حوصلہ شکنیوں کو نظر انداز کر کے بروئے کار آئے۔ وفورِ تجربات اور جذبات سے ایک گھٹن سی ہونے لگتی ہے اور ادیب اور فنکار تخلیق کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے اس وقت ہم گھٹن کے دور میں سے گذر رہے ہیں۔ اور خدا کرے کہ آہ کو جو عمر اثر ہونے کے لئے چاہیئے وہ مختصر سے مختصر ہو جائے۔

★

یلدرم

نذر سجاد حیدر

آئینۂ دل میں شکل تیری
ہے طُرفہ جوابِ لاجوابی! (حسرت موہانی)

غالباً جنوری ۱۹۰۰ء کا زمانہ تھا۔ میرا بچپن ابھی پوری طرح ختم نہ ہوا تھا۔ ویسے سمجھدار، سیانی تھی۔ اردو اخبارات اور رسالے تو آٹھ سال کی عمر سے پڑھنے لگی تھی۔ خصوصاً رسالہ مخزن سے دلی انس تھا۔ میرا پہلا مضمون بھی اسی میں چھپا تھا۔ اخبارات میں سب سے زیادہ علی گڑھ گزٹ اور وکیل امرتسر کی قدر دان تھی۔ وکیل نہایت ہمدردِ قوم اور اصلاحی اخبار تھا۔ معاشرتی اصلاح میں پہلا قدم اسی کے ذریعہ اٹھایا گیا تھا۔ میں نے بھی اپنی کہنہ فضول رسوماتِ شادی و غم کے خلاف وکیل ہی میں لکھنا شروع کیا تھا، اس کے بعد تہذیب نسواں میں۔ مگر وہ زمانہ ۱۹۰۳ء و ۱۹۰۴ء کا تھا جب میرا شمار کمسن لڑکیوں میں تھا۔

ہاں تو جنوری ۱۹۰۰ء کی ابتدا تھی۔ مخزن کے لئے ڈاک کا انتظار رہتا تھا۔ جنوری کا مخزن جو ملا تو اس میں ایک بہت ہی اچھا دلچسپ مضمون دیکھا۔ ہیڈنگ تو یاد نہیں مگر وہ لکھا ہوا یلدرم کا تھا۔ میں نے پڑھا اور تعریف کے ساتھ اپنے ابا اور اماں جان کو دکھایا۔ اس دن سے تو اور بھی رسالہ کا شدت و بے صبری سے انتظار رہنے لگا۔ ان دنوں یلدرم بغداد میں تھے اور وہاں سے بہت ہی دلچسپ، کچھ معاشرتی اور جذباتی مضامین لکھا کرتے تھے۔ نوجوان تھے، اردو میں قابلیت رکھتے تھے، ترکی بھی جانتے تھے۔ ان وجوہ سے ان کے افسانے نہایت دلچسپ و دلکش ہوتے تھے۔ زیادہ تر ترکی سے ترجمے ہوا کرتے تھے۔

اس وقت تک ان کے صرف تین ترکی ناولوں کے ترجمے، جو زمانہ طالب علمی علی گڑھ کالج میں کئے تھے، شائع ہوئے تھے۔ بعد کو عراق گئے۔ تینوں چھوٹے چھوٹے قصوں کے نام تھے زہرا، ثالث بالخیر اور مطلوبِ حسیناں۔ پھر چار سالہ قیام بغداد میں تو یلدرم نے ایسے ایسے افسانے لکھے کہ ان کا شمار اردو کے ادیبوں میں ہو گیا۔ غالباً ۱۹۱۱ء میں وہ مجموعہ جس کا نام خیالستان ہے شائع ہو گیا تھا۔ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ نوعمری، بے فکری، عراق کا قیام، بار بار ترکی و ایران کی سیاحت۔ جذباتی ادبیت کا ایک چشمہ تھا کہ ابل رہا تھا۔ میں کیا سبھی پڑھنے والے بیتابی سے بغدادی نوعمر افسانہ نویس کی تحریر کے منتظر رہتے تھے۔ یلدرم نے اس وقت اردو میں ایک بالکل نئی طرز کی انشا کی بنیاد رکھی جس کی لوگوں نے برسوں نقل کی۔

آخر وہ وقت ختم ہوا اور یلدرم بادلِ ناخواستہ ہندوستان واپس آئے۔ ان کو ترکی سے عشق تھا اور بغداد پر اس وقت ترکی کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ گو تعلیم نسواں کا عراق میں ابھی زیادہ چرچا نہ تھا مگر قسطنطنیہ میں قابل خواتین موجود تھیں اور لڑکیاں پڑھائی جا رہی تھیں۔ یلدرم کو تعلیم اور آزادیٔ نسواں کا سودا تھا۔ یہی سبب تھا کہ ترکی کے نام پر مرتے تھے۔

غرض کہ وہ ان دنوں خوب جوشیلے اور دل آویز افسانے بغداد سے مخزن میں بھیج رہے تھے جسے ہمارا گھر بھر نہایت شوق سے پڑھتا تھا اور دوسرے لوگ مخزن چھین کر لے جاتے تھے۔ اتفاق کہ ان ہی دنوں میں نے بھی نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔ مسلمان لڑکیاں اس زمانے میں بہت ہی کم لکھا کرتی تھیں۔ اس وجہ سے میرے مضامین پر بہت سی نظریں پڑا کرتی تھیں۔ دو تین سال

گزر گئے اور یلدرم عراق سے اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ ہوکر ہندوستان واپس آگئے اور ڈیرہ دون میں معزول امیر کابل کے انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کے اسسٹنٹ مقرر ہوئے وطن واپس آجانے پر عزیزوں اور دوستوں نے انہیں جلد شادی کرنے کی رائے دی پہلے تو وہ یہ کہکر ٹالتے رہے کہ "میں بغداد میں ایک ترک لڑکی سے شادی کر آیا ہوں اور میری ایک لڑکی بھی ہے"۔ مگر اس بات کا کسی کو یقین نہیں آیا۔ اور سب نے شادی کر لینے پر مجبور کیا ؂

اب یہ فکر ہوئی کہ شادی کہاں کی جائے۔ وہ اپنے بھائیوں بلکہ اپنے خاندان بھر میں نہایت روشن دماغ، آزاد خیال اور حامئ تعلیم و حریت نسواں تھے۔ بیوی بھی اپنے ہم خیال چاہتے تھے۔ چند دوستوں نے اس زمانے کی ایک آزاد خیال اور حامئ تعلیم نسواں لڑکی بنت نذر الباقر کا نام بتایا اس لڑکی کے مضامین کی وجہ سے وہ خود بھی اس سے کچھ واقف تھے۔ اسی وقت ان کے مضامین کا مجموعہ خیالستان چھپ کر شائع ہوا تھا اور بنت نذر الباقر کے دو معاشرتی ناول، اختر النساء اور آہ مظلوماں چھپے تھے۔ دوستوں کے کہنے سے انہوں نے یہ مشورہ پسند کر لیا۔ اور ہمدرد نسواں شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی صاحب کے توسط سے میرے والدین کے پاس رشتہ کا پیام آیا ؂

کچھ دنوں یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ان کے خاندان اور میرے خاندان دونوں نے سخت مخالفت کی اور طرح طرح سے روڑے اٹکائے۔ اس کو بھی کچھ عرصہ گذر گیا۔ اس زمانے میں ایک بڑا لطیفہ ہوا جس پر بعد میں دوستوں نے ہمیں بہت چھیڑا اور ہم سے مذاق کیا۔ یلدرم کا ایک مضمون "آہ یہ نظریں!" مخزن میں شائع ہوا تھا، جو کسی حسینہ کی پُرکشش آنکھوں سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا۔ واللہ کہ اسکی مجھ کو بالکل خبر نہ تھی۔ میری والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی آخری، حسرت آمیز اور محبت بھری نگاہیں یاد آ آکر مجھے بے چین کرتی تھیں۔ میں نے بھی "آہ وہ نظریں" کے ہیڈنگ سے محبت بھری نظروں پر مخزن ہی میں مضمون لکھا تھا۔ جن لوگوں نے ان کا مضمون پڑھا تھا انہوں نے میرا بھی پڑھا۔ بہرحال کچھ عرصہ تک ان مخالفتوں کا بھی اثر رہا اور شادی نہ ہونے پائی۔ مگر یہ رشتہ بھی غالباً تقدیر کے زیر اثر ہوتا ہے۔ باوجود ان سب رکاوٹوں کے ہو کر رہا۔ جون ۱۹۱۲ء میں یلدرم معہ مولوی ممتاز علی صاحب اور اپنے بہنوئی وغیرہ کے ہماری جائے قیام پر یعنی سرحدی مقام کوہاٹ تشریف لائے۔ یلدرم اور بنت نذر الباقر کے درمیان عمر بھر کی رفاقت کا عہد و پیمان ہو گیا۔

اہل کوہاٹ ان کو دیکھنے کے بے چینی سے مشتاق تھے۔ علاوہ ان لوگوں کے جو شادی کے کھانے پر مدعو کئے گئے تھے۔ بہت سے ایسے لوگ بھی بن بلائے آگئے جنکو یلدرم کے دیدار کا مدت سے اشتیاق تھا۔ جس وقت وہ لوگ پہنچے یہاں کھانا ہو رہا تھا۔ وہ لوگ خاموش باغیچہ میں ٹہلتے رہے۔ میرے پاپا مہمانوں کی تواضع میں مصروف تھے۔ اس لئے ان کی نظر اس مجمع کی طرف نہ گئی۔ جب کھانا ختم ہوا اور سب لوگ باغ میں آکر بیٹھے جہاں نشست کا انتظام تھا تو پاپا دیکھ کر حیران ہو گئے۔ وہاں تو ساٹھ ستر صاحبان موجود تھے جن میں سے پاپا کسی کو بھی نہیں پہچانتے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب نے آگے بڑھ کر (جو یلدرم کے زمانے کے پڑھے ہوئے علیگ اور بیرسٹر تھے)، یلدرم کا ہاتھ پکڑتے ہوئے ہنس کر کہا "زہے نصیب ہمارے کہ آپ کوہاٹ تشریف لائے۔ جس طرح آپ کو زیارتِ قاہرہ کی کشش مصر لے گئی تھی۔ ہم کو زیارتِ یلدرم کی کشش بنوں ہنگو وغیرہ سے کوہاٹ لے آئی ہے"

پھر ان کے ساتھیوں کی قطار آگے بڑھ آئی اور یلدرم کو اپنے حلقہ میں لے لیا۔ اس وقت ذرا اندھیرا ہو گیا تھا۔ اور ان لوگوں کو یلدرم کی شکل اچھی طرح دکھائی نہیں دیتی تھی۔ بیرسٹر صاحب نے قریب ہی سے ایک گیس کی لالٹین اٹھا کر ان کے چہرہ کے برابر کر دی اور باآواز کہا "اے مشتاقان دیدار یلدرم! دیکھئے ع دلِ انگلش رخِ ترکانہ داری!" یہ سنتے ہی وہ سب ایک ایک کر کے سید سجاد حیدر صاحب کے سامنے آئے اور زیارت کرتے گئے بیرسٹر صاحب بھاری لالٹین ہاتھ میں لئے کھڑے تھے۔ بے سہرے کے دولہا کا ایک تماشہ بن رہا تھا۔ دولہا اس وقت بادامی چائنا سلک کے سوٹ میں تھے۔ باغ میں ہوا سے ان کی پیشانی پر گھونگریالے بال بکھر رہے تھے۔ پُرکشش بڑی بڑی آنکھوں پر سنہری عینک چمک رہی تھی۔ میرے پاپا بھی اپنے داماد کی ایسی شاندار قدردانی سے خوش ہو

قریب ہی کھڑے مسکرا رہے تھے۔ بھائی ممتاز علی صاحب وہیں کھڑے یہ نقشہ دیکھ رہے تھے۔ جب اس طریقہ سے دولہا کی نمائش ہو چکی تو پاپا نے ان سب بعد کے آنے والوں کو کھانا کھلوایا۔ اور یہ حالات ایک بجے شب کو، جب گھر کے اندر آئے، میری خالہ جان اور چھوٹی بہن ثروت آرا کو سنائے۔ میں قریب ہی پلنگ پر لیٹی ہوئی سب سن رہی تھی مگر سوتی بن گئی تھی۔

میں نے اب تک سوائے "مخزن" میں شائع شدہ تصویر کے ان کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ دوسرے دن دوپہر کو ہماری پہلی ملاقات مقرر ہوئی اور راسی پروز شام کو مسوری روانگی تھی۔ شاید گیارہ بجے ہوں گے، ثروت آرا میرے کمرہ میں آئی اور گھبراہٹ کے ساتھ کہا "باجی جان، بھائی جان کو اندر بلایا جا رہا ہے۔ آپ سے ملاقات کے لئے"۔ میں نے کہا "ابھی سے ملاقات کی کیا جلدی ہے، شام کو تو ان کے ساتھ جانا ہی ہے"۔ وہ بولیں "نہیں باجی یہ ضروری ہے۔ ماموں جان کی رائے ہے کہ سفر سے پہلے دونوں میں روشناسی ہو جانی چاہیئے"۔ میں نے کہا "آخر تم نے ایسا بھاری جوڑا کیوں پہنا ہے"؟ اس نے ہنس کر جواب دیا "لیجئے آج ہی اچھا جوڑا نہ پہنتی تو کب پہنتی۔ آج ہی تو اپنے دولہا بھائی سید سجاد حیدر یلدرم سے پہلی بار ملنا ہے، جن ملاقات کے شوق میں ۱۹۰۸ء سے بےچین تھی۔ خالہ جان پھوپی جان بھی تو آ رہی ہیں، کچھ ہی ملیں گے۔ آپ ذرا اچھے طریقہ سے بیٹھ جائیے۔ چھوٹے میاں انہیں بلانے باہر گئے ہیں"۔

اب میں حیران، ایک پردہ دار مسلمان لڑکی پہلی بار ایک غیر شخص سے کس طرح ملے جو بالکل اجنبی ہے مگر اسی کے ساتھ سب سے زیادہ اپنا بھی! .... اتنے میں خالہ اور پھوپی جان کمرہ میں آ گئیں۔ پھوپی نے مجھے صوفہ پر بٹھا دیا۔ جارجٹ کے دوپٹہ سے سر کو اچھی طرح ڈھک دیا۔ گھونگھٹ نہیں نکالا گیا۔ میرے قریب ہی ثروت آرا کو بٹھایا گیا۔ خالہ نے ہنس کر کہا "دونوں ایک ہی سی ہیں، سجاد کیسے پہچانیں گے کہ بیوی کون ہے اور سالی کونسی"۔ کیونکہ میرے سر پر جھومر اور ٹیکا تو تھا نہیں اور نہ ناک میں نتھ۔ سفید پھولدار ریشمی جوڑا اور ہلکا گلابی دوپٹہ۔ میرے جوڑے سے زیادہ شوخ اور بھاری تو ثروت کا جوڑا تھا۔

سوچا جا رہا تھا کہ مجھ میں کیا خصوصیت پیدا کی جائے کہ دلہن معلوم ہونے لگوں۔ پھولوں یا سہرے کا تو ذکر نہیں، میرے ہاتھوں میں مہندی بھی نہیں لگی تھی۔

پھوپی جان نے، جو میری دوست بھی تھیں، جلدی سے میرے لباس اور رومال پر سینٹ چھڑکا، میرا سر جھکا دیا، نگاہیں خود بخود نیچی ہو گئیں۔ میرے جسم میں ایک کپکپی سی تھی۔ سوچ رہی تھی کیا کرنا چاہیئے۔ باتیں کی جائیں یا عام دلہنوں کی طرح گپ چپ رہا جائے۔ وہ کیا خیال کریں گے۔ میں نیچے کی طرف قالین کے پھولوں اور اپنی ہائی ہیل کی روپہلی چمکیلی جوتی کو دیکھ رہی تھی۔ اور وہ تینوں چشم براہ تھیں کہ پردہ ہٹا.... پہلے میرا بھائی افضل علی عرف چھوٹے میاں، جو ایف اے کا طالب علم تھا، داخل ہوا اور بشاشت سے کہا "بھائی جان آ جائیں؟" "ہاں ہاں" فوراً پھوپی نے جواب دیا۔

وہ پیچھے منتظر تھے، اندر آئے۔ سب کو سلام کیا۔ خالہ جان کے کہنے سے ایک کرسی پر بیٹھ گئے جو نہایت خوبصورت کشنوں سے سجی تھی، اور اس کے تکیہ اور ہتھوں پر پھولوں کے ہار جھک رہے تھے۔

انہوں نے ہم دونوں پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ یہ مجھ کو بعد میں افضل علی نے بتایا تھا، اور خالہ اور پھوپی جان سے مخاطب ہو گئے، کیونکہ ان سے ایک بار ماہ مئی میں بھی مل چکے تھے جس وقت صرف عقد کے لئے آئے تھے۔ ثروت آرا اس وقت نہ مل سکی تھی کہ بیمار تھی۔ ۷ا جون، کوہاٹ کے تپتے ہوئے پہاڑوں کی گرمی، ۱۲ بجے دن کا وقت، گو پنکھا چل رہا تھا مگر شدت کی گرمی تھی۔ وہ بار بار پانی مانگ کر پی رہے تھے۔ ثروت کوئی پندرہ منٹ خاموش ان کو تکتی رہی۔ بہت بیباکی سے وہ بھی سنا کہ بار بار کنکھیوں سے ثروت کی طرف دیکھ لیتے تھے۔ آخر اس سکوت کو توڑنے اور ثروت سے ہمکلام ہونے کی پہل انہیں نے کی۔ اس کے بار بار دیکھنے اور میری

---

[1] میرا ماموں زاد بھائی اور ثروت کا منگیتر افضل علی۔

نیچی نظریں بلکہ سر اور گردن بھی جھکی دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ یہ بھر کیلیے لباس والی ہی سالی ہے۔

سلسلۂ گفتگو مسکرا کر شروع کیا "اب تو آپ کی صحت درست ہے۔ مئی میں جب میں حاضر ہوا تھا اس وقت طبیعت ناساز تھی" وہ تو منتظر تھی ہی کہ بہنوئی یلدرم کسی طرح بات کریں۔ فوراً جواب دیا "جی ہاں، بہت بیمار تھی، تبھی تو اس وقت آپ سے نہ مل سکی تھی۔ اب تو بہتر ہوں۔ مگر آج گرمی غیر معمولی پڑ رہی ہے۔ یہاں کے ریتیلے میدان جب تپتے ہیں تو غضب ڈھاتے ہیں۔ آپ پہاڑ سے تشریف لا رہے ہیں، بہت ہی گرمی اور پیاس محسوس کر رہے ہوں گے۔ دیکھئے ذرا سی دیر میں پانی کا جگ خالی کر دیا"

یہ نوک جھونک سنکر ہنسنے لگے اور کہا "بیشک میں بہت پانی پی رہا ہوں۔ باہر بھی لُو کھا گیا ہوں۔ شدت کی پیاس ہے"

جب سالی بہنوئی باتیں کرنے لگے تو خالہ اور پھوپی جان یہ کہتی ہوئی اٹھ گئیں "اب کھانا بھجوایا جاتا ہے۔ پانی ہی پیتے رہے تو کھانا مشکل ہو جائے گا"

ثروت آرا نے وہ برف کا جگ میز سے اٹھا لیا اور کھانے کی جگہ وہیں بنائی، دو چھوٹی میزیں جوڑ کر۔ نوکرنی کھانا لے آئی تو وہ بولے "آپ بھی بہیں کھائیں گی نا"۔ ثروت یہ کہتی ہوئی کھڑی ہو گئیں "نہیں بھائی جان، میری چند دوست مہمان آئی ہوئی ہیں" یہ کہا اور وہاں سے چل دی۔

اب یلدرم میری طرف متوجہ ہوئے۔ اپنی کرسی صوفے کے قریب کر کے فرمایا "السلام علیکم .... شدت کی گرمی ہے .... ذرا چہرے سے رومال ہٹا کر رخ میری طرف کیجئے"

بہت ہی ہمت سے کام لے کر میں نے ذرا چہرہ اونچا کیا مگر نظریں فرش پر گڑی رہیں۔ انہوں نے میرے ہاتھ سے رومال چھین لیا اور مسکرا کر فرمایا

"اب نہ کر پردہ کہ اے پردہ نشیں دیکھ لیا!"

پھر کھانے کی میز آگے کو بڑھا کر کہا "شروع کیجئے" اور خود مچھلی کا کباب اٹھا لیا۔

میں اس گھڑی سخت مشکل میں پھنسی تھی۔ اگر ان کی آزاد خیالی پر اعتماد کر کے بے تکلفی سے کھانا شروع کرتی ہوں تو دل میں کہیں گے کس قدر بے تکلف دلہن ہے .... کی پرورش کا اثر ہے۔ اور اگر شرم کا اظہار کروں تو دیہاتی، پرانی، پابندِ رسوم خیال کریں گے۔ بہ دقت تھوڑا سا کھایا۔ وہ باتیں کرتے رہے، میں آہستہ آہستہ جواب دیتی رہی۔

یہ تھی ہماری اولیں ملاقات۔ اگر شادی سے پہلے ملاقات کا موقع ملتا، بہ حیثیت ایک اجنبی ادیب اور افسانہ نگار کے، تو خدا جانے کتنی باتیں ہوتیں۔ یلدرم کو دیکھنے، یلدرم سے ملنے کا مدت سے اشتیاق تھا۔ مگر ملنا نہ ہوا اور آج وہ زریں موقع ملا تو کسی اور ہی عالم میں جس وقت کہ آزاد سے آزاد اور بے باک سے بے باک لڑکی بھی قدرتاً شرما جاتی ہے۔

ابھی کھانا ہو ہی رہا تھا کہ باہر سے بلاوا آ گیا۔ ان کے مشتاقانِ دیدار جون کی گرم دوپہر میں آ گئے۔ پاپا نے بلوا بھیجا تھا کیونکہ آج شب کو کوہاٹ سے روانگی تھی۔ پھر شام کی چائے باہر سب کے ساتھ جا کر پی۔ چھ بجے کے قریب اندر بلائے گئے۔ اس وقت مجھ کو خاص طور پر دلہن بنایا گیا تھا۔ مگر عزیزوں سے جدائی کا وقت قریب تھا۔ میں بیحد افسردہ تھی۔ ثروت اور پھوپی صاحبہ نے ایک خوبصورت صندلی رنگ کا جوڑا پہنایا جس پر ہلکا ہلکا زری کا کام تھا۔ زیور بھی لا دیے گئے اور سات بجے کے قریب سب سے رخصت ہو کر اپنے پاپا کا نوایجا زبرقعہ پہنکر اسٹیشن روانہ ہوئی۔ بے شمار لوگ اسٹیشن پر آئے تھے اور سب ہی غمگین تھے۔

گاڑی ہلی، میرا دل ہل گیا۔ کوہاٹ چھوٹ گیا... وہ اندر آ کر مرے پاس بیٹھ گئے۔ مگر میری حالت خراب تھی۔ ان کا چہرہ بھی کمدر و افسردہ تھا، آنکھیں نمناک، پسینہ پسینہ تھے۔ مجھ کو بہلانے کی یہ ترکیب نکالی۔ بولے "میرے سر میں سخت درد ہے۔ گرمی کی شدت سے سر پھٹا جا رہا ہے" یہ سنکر میں آنکھیں خشک کر کے اٹھ بیٹھی اور کہا "تھوڑا شربت پئیں یا آئس کریم کھائیں۔ گرمی

(باقی صفحہ ۵۴ پر)

فن:

مصوّری کی پہلی کل پاکستان نمائش

مریم شاہ

اس سال جب ہم اپنا دسواں یوم آزادی منا رہے تھے پاکستان آرٹ کونسل نے ایک نہایت اہم اقدام کیا جو ہماری قوم کی تاریخ، بالخصوص فنون لطیفہ کی نشو و نما کے سلسلے میں، یادگار حیثیت رکھتا ہے۔ یہ تھی پاکستانی مصوری کی پہلی کل پاکستان نمائش جو وفاقی پایۂ تخت کراچی میں منعقد ہوئی۔ یہ پہلی نمائش تھی جس کا اس قدر وسیع پیمانے پر اہتمام کیا گیا اور اس میں مشرقی و مغربی پاکستان دونوں کے بڑے بڑے فنکار اس کثرت سے شریک ہوئے۔ ادھر دلدادگانِ فن کی کثرت نے اس کی رونق دوبالا کر دی۔ غرضیکہ یہ واقعہ ہر اعتبار سے خاص اہمیت کا حامل ہے ÷

اس نمائش میں دو سو ستر تصاویر پیش کی گئیں لیکن ساتھ ہی سنگتراشی کے نمونے بھی تھے اور ایک منبت کاری کا نمونہ بھی۔ بہت فن کاروں نے فنکاری کے جو نمونے پیش کئے ان میں توقع سے کہیں زیادہ نقاشی کی قسموں، قلموں، پیرایوں (آب رنگی، روغنی وغیرہ)، موضوعوں اور طرحوں کا تنوع تھا۔ یہ دیکھ کر واقعی بڑی مسرت ہوتی ہے کہ پاکستان میں نقاشی کی اس قدر گوناگوں طرحوں اور پیرایوں کا بیک وقت فروغ ممکن ہے اور فنکار کسی ایک روایت کی پیروی نہیں کر رہے جو لوگ یہ امید لے کر آئے تھے کہ وہ پاکستانی مصوری میں کوئی معین رجحان پائیں گے انہیں یقیناً مایوسی ہوئی ہوگی۔ کیونکہ اس میں ایک نہیں کتنے ہی رنگ ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ فنکاروں نے جانے کتنے ذرائع سے اثر قبول کیا ہے۔ چنانچہ بعض کی تو یہ کیفیت ہے کہ ہم ان میں صاف صاف مغربی مصوروں کے اسالیب کا سراغ لگا سکتے ہیں ÷

ان تصاویر میں جہاں ایک طرف چغتائی کی لگی بندھی روایتی وضع دکھائی دیتی ہے تو دوسری طرف مشرقی پاکستان کی آبی رنگوں اور کوئلے سے بنی ہوئی نئی نئی تصاویر میں بڑے سے جرأت آمیز تجربے کئے گئے ہیں۔ اگر ایک طرف اللہ بخش کی بڑی پھیلی ہوئی قسم کی تشریحی رومانویت ہے جو یوں سمجھیئے تقریباً ماقبل رافیل (PRE-RAPHAELITE) مشرب ہی کا دوسرا روپ ہے، تو دوسری طرف قمر الحسن کی بڑی توانا قسم کی ماورائی آب رنگی تصاویر ہیں۔ مصور بڑی حد تک اپنی اپنی پسند کے مطابق اپنے اپنے انداز میں نقاشی کرتے ہیں۔ گویا کئی چھوٹی چھوٹی ندیاں نالے اپنے اپنے جدا جدا راستوں پر بہتے چلے جا رہے ہیں لیکن آپس میں مل کر کسی پُرزور دھارے یا گمبھیر دریا کا روپ نہیں دھارتے۔ اس نمائش سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ ترقی کوش فنکار آجکل کے مغربی مصوروں سے جوت جگانے اور اثرات قبول کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کرتے۔ وہ تجریدی آرٹ کے نمونے پیش کرنے میں جتنی بے باکی چاہیں برت سکتے ہیں، ان پر لازم نہیں کہ وہ مشرق کی خطی قلمکاری کی روایت کی پیروی کریں، یا روغنی اور آب رنگی تصاویر کھینچیں جو زیادہ مقبول ہیں۔ پاکستانی مصوروں کی یہ تجریدی نقاشی محض ایک تجربہ ہے کیونکہ مغرب کی طرح اس نے ایک باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار نہیں کی ÷

جب ہم تصاویر کو دیکھتے ہیں تو کئی ایک باتوں کی تلاش کرتے ہیں۔ مثلاً تکنیک، فیضان، تعبیر و تشریح اور انتخاب۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک ایسا پاکستانی مصور جس میں یہ تمام عناصر موجود ہوں، اس کے بروئے کار آنے کا وقت آ چکا ہے۔ پاکستان میں نئی پود کے مصور ابھی تک تجربات ہی کر رہے ہیں۔ وہ نئے نئے اسالیب اختیار کرتے اور رنگ پر رنگ بدلتے ہیں۔ چونکہ اس موقع پر کراچی میں پاکستان کے دونوں حصوں کے متعدد فنکار جمع ہوئے تھے اس لئے انہیں آپس میں ملنے اور تبادلۂ خیالات کرنے کا بھی موقع ملا۔ فنکاروں میں یہ لین دین اور تخلیقی عمل کی چھان بین بڑی اہمیت رکھتی ہے ÷

جدید مصوری کے گوشے میں سب سے زیادہ تنوع تھا۔ نئے ابھرنے والے فنکار، مثلاً امین الاسلام، کبریا، حنیف رامے، زوبی اور صادقین واقعیت سے روگردانی کر چکے ہیں اور کچھ اپنی شوخئ فکر اور کچھ ماحول سے کام لیتے ہیں۔ امین الاسلام ایک بڑے ہی نفیس احساس کا مالک ہے۔

اور بہت کم رنگ استعمال کرتا ہے۔ وہ بھی درمیانہ درجے کے نیلے، خاکی اور سبز۔ چونکہ اس نے اطالیہ میں تربیت حاصل کی ہے اس لئے اس کے اسلوب اور موضوعات میں مغرب کا اثر بہت نمایاں ہے۔ اس کی شبیہیں بہت سیدھی سادی قسم کی ہیں اور ان میں کسی نہ کسی مخصوص کیفیت پر زور دیا گیا ہے۔ یہی خصوصیت ان تصاویر کی ہے جن میں پورے سراپا کی مصوری کی گئی ہے۔ کبریا جس کو اپنی تصویر "لڑکی اور کلی" کے لئے پہلا انعام ملا۔ رنگوں پر ایسی ہی قدرت رکھتا ہے۔ منظر نگاری میں وہ تجریدی کی طرف مائل ہے۔ اس کی تصویر "شفق" جس میں اشجار اور پرندے باہم مل کر ایک مربوط اقلیدسی طرح اختیار کر لیتے ہیں، خاص طور پر دلآویز ہے۔ صادقین کے دو بڑے بڑے تختے اس کی آرائشی نقاشی میں دلچسپی ظاہر کرتے ہیں۔ اس کا پیرایہ مرکب یا منفرد رنگوں سے دھلائی ہے جس کو مزید قوت اور گہرائی عطا کرنے کے لئے قلم اور سیاہی سے کام لیا جاتا ہے۔

صفدر علی ایک "پرکشش" مصور ہے۔ جو اپنے ارد گرد بکھرے ہوئے موضوعات اور "خاموش" چیزوں کی عکاسی کرتا ہے اور ان کو نئے نئے ڈھنگ سے پیش کرتا ہے۔ اس کے رنگ بولتے ہوئے ہیں۔ سیاہ رنگ کسی پہلو کو ابھارنے یا اثر بڑھانے کے لئے برتا جاتا ہے۔ اس کی تصاویر میں رنگوں کی تہ ابھری ابھری نظر آتی ہے۔ پچھلے پانچ برس میں اس کی مصوری نے کتنے ہی مرحلے طے کئے ہیں۔ اس کی تازہ تصویریں پہلے کی بہ نسبت کہیں دھیمی دھیمی اور منجھی ہوئی ہیں۔

شاکر علی بھی اسی گروہ میں شامل ہے۔ لیکن وہ زیادہ پختہ کار مصور ہے جس کا کام کتنے ہی دوروں سے گزر چکا ہے۔ اس نمائش میں اس کی آٹھ تصویریں تھیں۔ جن میں سے ایک بڑا تختہ تھا: "بھینسیں"۔ دوسری تصویریں پورے قد کی انسانی تصاویر تھیں۔ شاکر علی کی سب تصویریں بڑی احتیاط اور دقتِ نظر سے کھینچی گئی ہیں۔ وہ ماورائی اور خیال انگیز یعنی ایمائی ہیں کیونکہ ان کا موضوع محض مصور کے لئے پروازِ تخیّل کا بہانہ ہے۔ رنگ آپس میں مبہم طور پر گھلے ملے ہیں اور تضاد زیادہ کھلواں نہیں ہے "سازندے" اس نمائش کی ان تصاویر میں سے تھی جس کو خاص طور پر سراہا گیا۔

روایاتی تصاویر کے حصے میں روغنی شبیہیں اور منظر نگاری کے مرقعے تھے۔ ان میں سے بعض تصویریں واقعیت نگاری اور بعض نیم واقعیت نگاری کے اصول پر بنائی گئی تھیں۔ لاہور اور کراچی کے بہت سے مصوروں کی تصویریں جو اس طرز کی نقاشی کے نمائندہ ہیں، نمائش میں موجود تھیں۔ لیکن ان میں سے کسی ایک نے اپنے فن کے بہترین نمونے پیش نہیں کئے تھے۔ غالباً یہ نمائش کا سب سے کم دلچسپ حصہ تھا۔ کیونکہ تصاویر کا معیار زیادہ بلند نہ تھا۔ ایسی واقعیت نگاری جس میں کوئی معنویت نہ ہو، کوئی اثر پیدا نہیں کرتی۔ آرٹ میں فطرت کی نقالی ہی کافی نہیں بلکہ توضیح و تعبیر اور کیفیت بھی ضروری ہے۔

اے۔ بی۔ نذیر نے عکاسی جیسی واقعیت نگاری کے ساتھ انسانی سراپا کھینچے ہیں۔ اور سعید ناگی کے روغنی رنگوں میں بنائے ہوئے سراپا اور شبیہیں واقعیت نگاری کی آئینہ دار ہیں۔ مبارک حسین کے روغنی رنگوں میں بڑے بڑے مناظر زیادہ نظر فریب تھے۔ بہت سی خواتین نے بھی مصوری کی اس صنف کو اپنایا ہے۔ ان میں مسز احمد، انور افضل، نسیم ایچ، قاضی، اور ذکیہ ملک کی بنائی ہوئی شبیہیں اور مناظر نمائش کی زینت تھے۔ شبنم منظر اور سعیدہ کریم نے خطۂ پنجاب کے رنگین مناظر پیش کئے تھے۔ مشہور مصوروں کے ساتھ کچھ نئے مصوروں کی تصاویر بھی پیش کی گئی تھیں۔

ان دو حصوں کے بعد نمائش کے اس حصے میں داخل ہونے پر جہاں آب رنگی تصویریں تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم گرم ممالک کے گھنے جنگلوں سے نکل کر کھلے میدان میں پہنچ گئے ہوں۔ مشرقی پاکستان کے مصوروں کی بنائی ہوئی تصویریں بڑی ہلکی پھلکی، تازہ اور نفیس تھیں۔ انہیں اپنی دھرتی کے لہلہاتے سبزہ زاروں اور بہتے دریاؤں کی تصویریں کھینچنے سے بہت رغبت ہے۔ ان کے لئے وہ آب رنگی شوب جس میں کالی کالی خط کشی کی گئی ہو، کا طریقہ بہت پسند کرتے ہیں۔ سید جہانگیر، دیب داس چکرورتی، اور قاضی عبدالرؤف نے اپنے مناظر اور سراپاؤں میں یہی تکنیک برتی ہے۔

قمر الحسن کے آب رنگی، رنگ کار پینسلوں اور خشک رنگوں سے بنائے ہوئے سراپاؤں میں رنگوں کی بہار اور مطلوبہ کیفیت کی توانائی

(باقی صفحہ ۵۴ پر)

افسانہ:
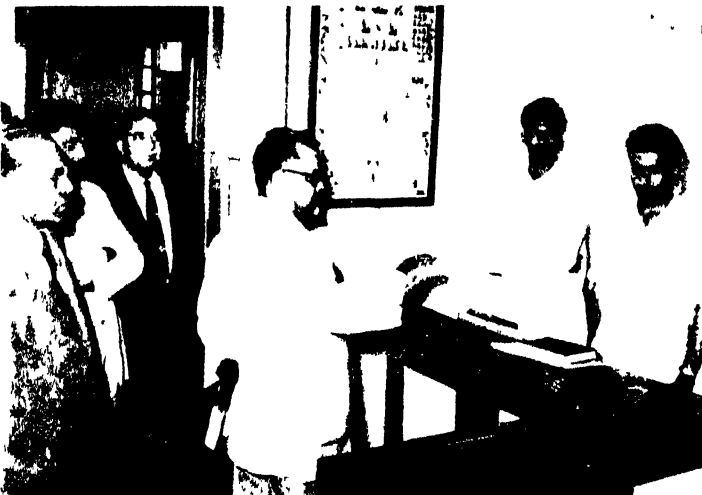
اکھاڑہ

عنایت اللہ

استاد کاموں کے اکھاڑہ کی کھدی ہوئی نرم و ملائم مٹی میں جانے کتنی کہانیاں، کتنی وارداتیں، کتنے ہی حادثے اور کتنے طریقے دفن تھے۔ اکھاڑے کے پروردہ جہاں بھی گئے جیت کے آئے اور یہاں جو بھی آیا ہار کے گیا۔ کہتے ہیں استاد کاموں کے باپ نے ایک بار نشہ سے ٹوٹے ہوئے ایک فقیر کو چرس کا کش لگوایا تھا۔ اس کے عوض فقیر اسے ایک تعویذ دے گیا تھا جو اس اکھاڑہ میں دبا دیا گیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب استاد کاموں کی رگ رگ میں بھرپور جوانی نے فولاد بھرا ہوا تھا اس کی شاگردی میں کوئی کوئی پٹھا ٹھہرتا تھا۔ جو ٹھہر گیا وہ بن گیا۔ اس اکھاڑے میں جامی اور سراج دین نوردین لوہار کی لڑکی کی شرط بد کر لڑے تھے اور جامی کا بازو ٹوٹ گیا تھا۔ چند دنوں بعد سراج دین کی شادی اس لڑکی کے ساتھ ہو گئی تھی اور جامی کا بازو ٹوٹ گیا تھا۔ چند دنوں بعد سراج دین کی شادی اس لڑکی کے ساتھ ہو گئی تھی اور جامی شاہدرہ کے قریب مال گاڑی کے نیچے آکر کٹ گیا تھا۔

اس اکھاڑے کی فضا میں جو تیل، پسینہ اور بادام کی بو سے بوجھل رہتی تھی "یا علی مدد!" اور "یا پیر استاد!" کے نعرے گونجا کرتے تھے ...... آخر وہ وقت بھی آیا جب سرسوں کے زرد پیلے پھولوں کی بو اجڑ گئی۔ کنوئیں کی ٹروں ٹروں نے نوحہ خوانی کی، لہلہاتے کھیت اجڑے، سہاگ اجڑے اور استاد کاموں کا اکھاڑہ بھی اجڑ گیا تھا۔ لیکن استاد کاموں کا دل زندہ رہا۔ پاکستان بننے کے دو ڈھائی ماہ بعد اس نے اکھاڑہ پھر سے آباد کر لیا۔ وہ خود تو اب کشتی کے قابل نہ رہا، پیٹ ضرورت سے زیادہ بڑھ گیا تھا، جسم بھی بے ڈھب اور بے قابو ہو چلا تھا اور گھٹنوں میں بھی کبھی کبھی درد کی ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ لیکن دل ابھی اسی طرح مچلتا تھا۔ اس نے بھاگ دوڑ کر دس بارہ شاگرد جمع کر لئے اور کسرت شروع ہو گئی۔ جمی اکڑی ہوئی مٹی ایک ایک بار پھر کھد کر نرم و ملائم ہو گئی اور تیل پسینہ اس مٹی کو جلا دینے لگے۔ استاد کاموں کے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔ وہ جب بھی لڑتا تھا، خود یا اس کا کوئی شاگرد، تو سینکڑوں روپوں کی شرط لگا کر لڑتا تھا۔ علاوہ ازیں کشتی کے دلدادہ اسے باقاعدہ وظیفہ دیتے تھے۔ اس کے ہاں کمی تھی تو اولاد کی۔ اس کے باوجود اسے بیوی کے ساتھ پہلے روز جیسا پیار تھا۔ فسادات نے جہاں ہزاروں امنگوں کا خون کیا تھا وہاں استاد کاموں کے گھر میں رونق آ گئی تھی۔ ایک پندرہ سالہ لڑکی نے استاد کاموں کے گھر آکر پناہ لی تھی، جسے کاموں کی بیوی نے سینے سے لگا لیا تھا۔ اور میاں بیوی نے اس کا نام بدل کر زینت کا نام دے دیا تھا اور منہ بولی بیٹی بنا لیا تھا۔ لڑکی کے لئے استاد کاموں اور اس کی بیوی اجنبی نہیں تھے کیونکہ لڑکی کو بچپن سے ہی پہلوانوں اور کشتی سے بے حد دلچسپی تھی۔ وہ ابھی سات آٹھ برس کی تھی کہ استاد کاموں کی گود میں بیٹھنے لگ گئی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ لڑکی استاد کاموں کے اکھاڑے کا لازمی جزو بن گئی تھی۔ بعض اوقات وہ کتنی کتنی دیر کسی ایک پہلوان کے جسم پر نظریں جمائے دیکھتی رہتی تھی۔ یہی وابستگی تھی کہ وہ بے بسی کے عالم میں بے خوف و خطر استاد کاموں کے گھر آئی تھی اور آتے ہی سسکیوں اور ہچکیوں کی زبان میں کچھ کہا تھا...... اور استاد کاموں کی بیوی نے لڑکی کو سینے کے ساتھ چمٹا لیا تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی کے مشفقانہ پیار محبت میں جذب ہو گئی۔ وہ ایک بار پھر اکھاڑے کی زینت بن گئی اور کمہلائی ہوئی زندگی کھل اٹھی۔

استاد کاموں کو بعض دوسرے شاگردوں کے چلے جانے کا رنج تو بہت تھا لیکن اس نے چھ ماہ کی محنت سے چار اندر لڑکے تیار کر لئے اور بھاٹی دروازے والے استاد شیرے کو چیلنج کر دیا۔ استاد کاموں کو "بھاٹی دروازے" کے ساتھ تو جیسے خدا واسطے کا بیر تھا جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ استاد شیرے نے اسے ایک بار گرا دیا تھا۔ استاد کاموں کو معلوم نہ تھا کہ یہ اس کی آخری کشتی ہے۔ اس کے دروازے پر بڑھاپا دستک دینے لگ گیا تھا اور استاد شیرا آئندہ کشتی کسی نہ کسی بہانے ٹالتا جا رہا تھا۔ آخر استاد کاموں استاد شیرے کو گرانے کی خواہش دل میں لئے بوڑھا ہو گیا۔ اور اب وہ شاگردوں کو "بھاٹی دروازے" والوں کے خلاف تیار کر رہا تھا۔ اس کے دو شاگرد اڑھائی ہزار کی بازی پر دو کشتیاں جیت چکے تھے لیکن استاد شیرے کا

شاگرد وسیم ابھی کسی سے نہیں گرا تھا اور استاد کامو کے تین شاگرد ڈیڑھ ہزار کی بازی ہار چکے تھے۔ تیسری بار اس کے چار شاگرد وسیم نے گرائے تھے۔ اب تو استاد کامو کی یہ حالت تھی دن بھر شاگردوں کو کسرت کراتا رہتا۔ اس نے باداموں کی دو بوریاں لا کر گھر میں رکھ دیں اور پانچ سو کی ایک بھینس خرید لایا جس کا دودھ شاگرد خود دوہتے اور خود ہی پیتے تھے۔

استاد کامو کے خاص حلقہ میں دو آدمی تھے جو اس کے ہمراز اور ہم نوالہ تھے۔ ایک کرما دس نمبریا اور دوسرا باقسم کا ایک لکھا پڑھا آدمی نیاز۔ کرما دس نمبریا، روپے پیسے والا غنڈہ تھا اور کئی غنڈے اس کے اشارہ پر ناچتے تھے۔ وہ استاد کامو کے اکھاڑے کا وزیر دفاع تھا۔ جہاں ڈانگ سوٹے کی ضرورت پڑتی وہ دو چار بالکے لے کر پہنچ جاتا۔ ایک بار استاد کامو دنگا فساد کے جرم میں گرفتار ہو گیا تھا تو کرمے نے دس جھوٹے گواہ پیش کر کے استاد کو بری کرا لیا تھا۔ اور کرمے کا سب سے بڑا احسان جو استاد کامو کے سر پہ تھا وہ یہ تھا کہ اس نے ایک لڑکی کو اغوا کر کے استاد کے ساتھ بیاہ دیا تھا۔ یہ اس کی موجودہ بیوی تھی۔ نیاز ہندوستان سینما کی مشین چلاتا تھا۔ فرصت کے وقت وہ استاد کامو کے خط پتر لکھتا۔ روپے پیسے کا حساب کتاب رکھتا اور کشتیوں کے جوڑوں کا انتظام کرتا تھا۔ وہ اکھاڑے کا اچھا خاصا منیجر تھا یا پہلوانی زبان میں "کھڑپینچ" تھا۔ نیاز جوان سال آدمی تھا، خوش وضع اور خوش پوش۔ زینت اب سولہ برس سے اوپر ہو چلی تھی اور اسے نیاز اچھا لگنے لگ گیا تھا۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ اسے نیاز کے بغیر اکھاڑہ سونا سونا لگنے لگا۔ پھر یہ خواہش بھی انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی کہ وہ نیاز کے ساتھ تنہائی میں باتیں کرے اور کرتی ہی رہے ساتھ ہی یہ جھجک کہ نیاز اسے کہیں تنہائی میں مل ہی نہ جائے۔ وہ کیونکر اس کا سامنا کرے گی۔ کچھ ایسی ہی کیفیت نیاز کی تھی۔ دونوں سینوں میں ایک ہی چنگاری سلگتے سلگتے جل اٹھی اور راتوں کی تیرگی نے نیاز اور زینت کو ایک رات اکھاڑے سے ذرا پرے پیپل کے اندھیرے سائے میں کھڑے دیکھا۔ زینت کو اکھاڑے اور پہلوانوں کے ساتھ دلچسپی تو تھی ہی، اب یہ دلچسپی شوق کی صورت اختیار کر گئی۔

پیپل کی اندھیری چھاؤں میں ہر دوسری تیسری رات دو سائے ایک دوسرے میں گھل مل جاتے اور پیپل کے ڈال پات رات کا بھید یوں اپنے اندر جذب کر لیتے جس طرح وہ ہوا اور زمین سے نمی چوس لیتے ہیں۔ ایک رات زینت وقت سے پہلے پیپل کے نیچے پہنچ گئی اور بے چینی سے ادھر اُدھر گھومنے لگی۔ نیاز آیا تو اس نے تقریباً بھاگ کر اس کا استقبال کیا اور ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "نیاز! خدارا کچھ کرو ورنہ میں کچلی جاؤں گی . . . . ." وہ بغیر سانس لئے کہہ رہی تھی: ". . . . میں کہہ نہیں رہی تھی کہ اندر ہی اندر کچھ کھچڑی پک رہی ہے۔ آج تو ساری بات صاف ہو گئی ہے"۔

"آخر ہوا کیا؟"

"کرمے دس نمبریے نے استاد چچا کو کہہ دیا ہے کہ زینت کو میرے ساتھ بیاہ دو۔ لڑکی جوان ہو گئی ہے اور دیر نہیں ہونی چاہئے"۔

"تو استاد نے کیا جواب دیا؟"

"یہ کہ جلدی کیا ہے، زینت تمہاری ہے۔ چار چھ مہینے انتظار کر لو۔ زبان تو تمہیں دے چکا ہوں۔ میں ذرا بھاٹی دروازے والوں سے نبٹ لوں۔ دیکھو نیاز! اب انتظار نہ کرو چلو کہیں . . . ."

"کیا تم انکار نہیں کر سکتیں؟" نیاز نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں پوچھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کرمے کی رقابت میں کیا کیا خطرات پنہاں ہیں۔ دس نمبریے کے مقابلہ میں آنا زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ اگر کرمے کو نیاز اور زینت کی ملاقاتوں کا علم ہو جاتا تو نیاز کی بلکی سی بو بھی اس دنیا میں نہ رہتی۔

"نیاز! ایک کام کرو" زینت بولی "استاد چچا تمہاری بات مان جاتا ہے۔ اسے کہو زینت کو دس نمبریے کے ساتھ نہ باندھو ورنہ وہ تباہ ہو جائے گی۔ مانا وہ روپے پیسے والا طرحدار بدمعاش ہے اور دیکھنے میں اچھا خاصا معزز آدمی دکھائی دیتا ہے لیکن خدا کی قسم نیاز! مجھے اس کی بڑی بڑی مونچھوں اور سرخ آنکھوں سے خوف آتا ہے"۔

نیاز کو یوں لگا جیسے وہ ایک پری سے محبت کر رہا ہے اور دونوں پر ایک دیو کا سایہ پڑ رہا ہے۔ بدلتے موسم کی خنک رات کو

نیاز نے قمیص کے اندر پسینے کے قطرے محسوس کئے اور خشک حلق میں تھوک نگل کر چپ ہو گیا۔ اس نے زینت کا ہاتھ دبایا اور صرف اتنا کہا۔
"جو خدا کرے گا، میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ یہ شادی نہیں ہو سکے گی۔"

نیاز زبان کا تیز تھا، اس نے استاد کامو کے دل میں گھسنے کی ان تھک کوشش شروع کر دی۔ نیاز اور زینت کی ملاقاتیں بدستور ہوتی رہیں۔ دونوں کا عشق ثابت تھا لیکن نیاز کی زبان لڑکھڑانے لگ گئی تھی۔ دیو کا سایہ اس کی ہستی پر منڈلاتا ہی رہا۔ اس نے بارہا سر کو جھٹکا بھی دیا لیکن کرمے کو خیالوں سے نہ دھکیل سکا اور نہ استاد کامو ہی کسی بات پر آتا تھا۔

چند روز بعد، ایک شام، جبکہ اکھاڑہ میں ہر شام والی رونق تھی۔ استاد کامو ایک شاگرد کو داؤ پیچ کا آخری سبق دے رہا تھا۔ دوسرے شاگرد آپس میں مشق کر رہے تھے۔ دو بوڑھے چارپائی پر بیٹھے حقے کی گڑگڑ اور دھوئیں کی دھندلاہٹ کے سہارے شاگردوں کے ننگے جسموں میں گم گشتہ ماضی کو تلاش کر رہے تھے۔ کچھ آدمی یوں کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے جیسے غیر ارادی طور پر یہاں آ رکے ہوں اور کشتی کے "ٹھرکی" (شوقین) شاگردوں کو یوں داد دے رہے تھے جیسے سارا زور انہی کا صرف ہو رہا تھا۔ دو شاگرد بادام رگڑ رہے تھے۔
زینت جو چند روز پہلے تک اس پُر ہنگامہ رونق کا جز بنی ہوتی تھی۔ اس شام نیم کے درخت کے نیچے کھڑی خلاؤں میں گھور رہی تھی۔

استاد کامو، شاگرد سے فارغ ہو کر مٹی میں لت پت اٹھا اور تمام شاگردوں کو اکھاڑے سے باہر نکال کر کہا: "چلو بھئی جمال اور اچھا" دوسرے لمحہ دو تیار شدہ شاگرد، جو ماہر پہلوان بن چکے تھے، اکھاڑے میں اُتر آئے اور کشتی شروع ہو گئی۔ دونوں اسی اکھاڑہ کے پروردہ تھے اور استاد کامو کے شاگرد، پون گھنٹہ تک اوپر نیچے ہوتے رہے لیکن فیصلہ نہ ہو سکا اور دونوں ہانپتے ہوئے الگ ہو گئے۔ استاد کامو نے دونوں کی پیٹھ تھپکائی۔ دو چار گالیاں دیں اور ابھی وہ پہلوانی زبان میں ان پر تنقید کر ہی رہا تھا کہ ایک اجنبی جو بہت دیر سے اکھاڑے کے کونے میں خاموشی سے کھڑا تھا، کپڑے اتار کر اکھاڑے میں آ گیا اور باوقار سنجیدگی سے استاد کو للکارا "استاد! کوئی پٹھا اتار دو۔" استاد کامو نے نووارد کو دیکھا اور چند ثانیئے دیکھتا ہی رہا۔ نووارد کا جسم ایسا تھا جیسے کسی بت تراش نے سالہا سال کی محنت سے بت تراش کر اکھاڑے میں رکھ دیا ہے۔ اس کا پیٹ پہلوانوں کی طرح بڑھا ہوا نہیں تھا بلکہ پیٹھ کے ساتھ لگا ہوا سارے جسم کو خوبصورت بنائے ہوئے تھا۔ کندھوں کے بیٹھے گٹھے ہوئے اور جسم کے تمام اعضا کا تناسب دلکش تھا۔ سر گول اور استرے سے منڈا ہوا، آنکھیں چھوٹی، اندر کو دھنسی ہوئی۔ بھرا ہوا سانولا چہرہ جیسے اس میں ہڈی ہے ہی نہیں۔ کھردرے ملیشیا کا پاجامہ اور اسی کپڑے کی قمیص پہنے اور منڈے سر کے گرد ڈیڑھ دو گز کا ململ کا میلا کچیلا صافہ لپیٹے، وہ جانے کب سے اکھاڑے کے کنارے کھڑا تھا۔ کسی کو گمان بھی نہ تھا کہ یہ شخص پہلوان بھی ہو سکتا ہے۔

"چلو جمال!" استاد کامو نے نووارد کے خلاف جمال کو اتارا۔ جمال نے ذرا سا دم لیا اور اکھاڑے میں اتر آیا۔ دیکھنے میں جمال کا جسم نووارد سے کم نہ تھا لیکن جونہی جمال نے حریف سے ہاتھ ملایا اور دونوں نے جھک کر ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو دوسرے لمحہ جمال چاروں شانے چت اور نووارد دو قدم پرے ہٹ کر استاد کامو کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جن میں سنجیدگی تھی، یہ نگاہیں داد طلب نہ تھیں۔ استاد کامو بے اختیار اچھل کر اکھاڑے میں آ گیا اور نووارد کو گلے سے لگا لیا۔ اسے جمال پر ناز تھا۔ اسے اس نے شبانہ روز کی محنت سے "بھائی دروجے" والوں کے خلاف تیار کیا تھا۔ اس نے اچھے کو نووارد کے خلاف اتارا، لیکن اس کا حشر بھی جمال جیسا ہوا۔ استاد نے نووارد سے پوچھا۔ اس نے کونسا داؤ کھیلا ہے تو اس نے جواب دیا: "طاقت اور دماغ"۔ استاد کامو نے اسے چارپائی پر بٹھایا۔ بڑے سائز کے پیالہ میں بادام پلائے اور کہا: "اگر تم اس اکھاڑے میں آیا کرو تو تمہیں پوری اُجرت دوں گا۔ روٹی کپڑا اور نصف سیر بادام ہر روز۔ دودھ جتنا پی سکو۔ اگر کچھ اور چاہو تو وہ بھی ملیگا۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہئے۔" نووارد نے اداس سی خاموشی سے کہا۔ اس اداسی میں بھی ایک گونہ متانت تھی۔ "روٹی کپڑا کافی ہے اور رہنے کی جگہ۔"

نووارد کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ اس کا نام کیا تھا؟ کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ وہ کسی کے ساتھ بات تک نہ کرتا تھا۔ اکھاڑے والوں

نے اسے سہراب کا نام دے دیا جو چند روز بعد شہراب، پھر شہرابا اور آخر میں شرابا بن گیا۔ وہ مکمل طور پر خاموش طبع انسان تھا۔ اس کے متعلق طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہونے لگ گئیں۔ کوئی کہتا یہ کانگڑہ کا ڈوگرا ہے۔ بعض کہتے مشرقی پنجاب کا گجر ہے اور اس نے اپنے آپکو پاکستان میں سمگل کیا ہے۔ ایک روایت یہ بھی تھی کہ وہ جاسوس ہے۔ لیکن شرابا جاڑے کے چاند کی طرح خاموشی سے بے آواز یا زندگی کا سفر طے کرتا جا رہا تھا۔ کشتی جیت گیا تو خوشی نہیں، ہار گیا تو غم نہیں۔ نصف سیر دودھ آیا تو پی گیا، نہ ملا تو نہ سہی۔ استاد کامو تو استاد تھا۔ لیکن وہ دل ہی دل میں شرابے کو استاد مان چکا تھا اور اس کا سینہ چوڑا ہوتا جا رہا تھا کہ اب "بھائی دروتجے" والوں کے ڈھول خاموش ہو جائیں گے۔

پھر وہ دن بھی آیا کہ بھاٹی دروازے والے ڈھول بجاتے ہوئے آئے اور سر جھکا کر لوٹ گئے۔ اکیلے شرابے نے استاد شیرے کے تین شاگردوں اور ولیم کو پچھاڑ دیا۔ اس رات استاد کامو نے جوش مسرت سے مغلوب ہو کر سینما دیکھا۔ پچپن سالہ زندگی میں یہ تیسری بار تھی کہ اس نے سینما دیکھا۔ "بھاٹی دروتجے" والوں کے دانت کھٹے ہو چکے تھے لیکن استاد شیرا کیونکر چین سے بیٹھتا۔ اس نے بھاری قیمت دے کر مقبوضہ کشمیر سے ایک "ہاتو" سمگل کر لیا جو شرابے کا ہم پایہ تھا۔ استاد شیرے نے اسے اپنے رنگ میں تیار کرنا شروع کر دیا، اور استاد کامو کو میٹھی عید پر دو بوڈ کشتی کا چیلنج بھیج دیا۔ عید کو اڑھائی مہینے باقی تھے۔

استاد کامو نے بارہا چاہا کہ شرابا اس کے ساتھ کھل کر باتیں کرے لیکن وہ بالکل ہی خاموش رہتا، گریاں نہ خنداں۔ اگر وہ کسی سے ذرا بے تکلف ہوا تو نیاز سے ہوا جس کی وجہ کوئی بھی نہ جان سکا سوائے اس کے کہ نیاز اسے کبھی کبھی سینما لے جایا کرتا تھا۔ نیاز کہتا تھا شرابا ذہن اور اعصاب پر کوئی بوجھ اٹھائے ہوئے ہے۔ استاد کامو نے کہا "کوئی شہر شرار ہو گا۔ مجھے تو پہلے روز ہی شک ہوا تھا کہ شرابے پر سید حسن عاشق ہے"۔ شرابا بعض اوقات خلاؤں میں کھو جایا کرتا تھا، گم سم۔ جانے وہ لاشعور میں کیا کچھ اٹھائے پھرتا تھا۔ اس کا شعور دو ہی موقعوں پر بیدار ہوتا تھا۔ ایک اکھاڑے میں اور دوسرا سر پر استرا پھرواتے وقت۔

عید کو ابھی اڑھائی ماہ باقی تھے لیکن استاد کامو یوں گھبرایا ہوا اور مصروف تھا جیسے عید پرسوں ہے اور اس کا کوئی پٹھا تیار نہیں۔ اس نے بادام کی ایک اور بوری منگوالی اور ایک اور بھینس خرید لی جس کا نصف دودھ صرف شرابے کے لئے مختص تھا لیکن شرابا کسی اندرونی خلش سے بے چین رہنے لگ گیا تھا۔ بعض اوقات اکھاڑہ میں بھی دیر سے جاتا اور ایک شام بالکل گیا ہی نہیں۔ استاد کامو نے ہزار منتیں کیں لیکن وہ خاموشی سے لیٹا رہا، جواب تک نہ دیا۔ استاد کامو نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں کرمے دس نمبریے کو بتایا کہ شرابے نے اکھاڑے میں آنے سے انکار کر دیا ہے۔ "اور نہ میرا حکم ہی ماننا ہے"۔ کرما آٹھ انچ لمبا چاقو لے کر استاد کے ساتھ چل پڑا اور کہا: "سالے کا پیٹ پھاڑ دوں گا۔ کمین ہماری روٹیاں کھاتا ہے اور یہ جرأت؟"۔

استاد کامو شرابے کے کمرے کے دروازے میں کھڑا تھا اور کرما کھلا ہوا چاقو لئے لیٹے ہوئے شرابے کو دھمکیاں دے رہا تھا "اگر تم دو منٹ کے اندر نہ اٹھے تو یہ چاقو تمہارے سینے میں ہو گا"۔ اور دو منٹ بعد کرما دس نمبریا برآمدے میں اوندھے منہ پڑا تھا اور اس کا کھلا ہوا چاقو شرابے کے ہاتھ میں تھا۔ یہ تو کرمے کی خوش نصیبی تھی کہ استاد کامو درمیان میں آ گیا ورنہ اس کی خیر نہ تھی۔ وہ کرمے کو لے کر چلا گیا اور شرابا پھر لیٹ گیا۔ نیاز کو پتہ چلا تو وہ رات تیسرے شو کے بعد شرابے کے گھر آیا۔ اس کی بتی جل رہی تھی اور وہ ابھی سویا نہیں تھا۔ نیاز اس کی ایک آدھ دکھتی رگ جانتا تھا اس نے آتے ہی اس رگ پر ہاتھ رکھا تو شرابے کے آنسو پھوٹ آئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ شرابا رو یا بھی۔ اس نے آنسو صاف کئے لیکن زبان سے کچھ نہ کہا۔ نیاز نے بہت کوشش کی کہ شرابا کوئی بات کرے تاکہ اس کے سینے کا بوجھ ہلکا ہو جائے لیکن اس نے کوئی بات نہ کی اور نیاز جھلا گیا۔

نیاز وہاں سے واپس آ رہا تھا تو اسے پیپل کے نیچے ایک مانوس سایہ متحرک نظر آیا اور نیاز بھی پیپل کے نیچے گم ہو گیا۔ "خدا کے لئے شرابے کا خیال رکھا کرو ورنہ وہ کسی کا خون کر کے پھانسی چڑھ جائیگا۔۔۔۔"۔ زینت نے نیاز کو کہا۔ "اگر وہ کرمے کو مار دیتا تو مجھے بہت خوشی ہوتی۔ لیکن شرابا۔۔۔" اس رات کی ملاقات میں زینت نے شرابے کے سوا اور کسی موضوع پر بات ہی نہ کی۔

دوسری صبح نیاز، شرابے کو چڑیا گھر کی سیر کو لے گیا۔ جانور اور پرندے دیکھ کر شرابے کی طبیعت میں کچھ شگفتگی آ گئی۔ اس کے چہرے پر مسرت کا

میری قمیص
پھٹنا بند کرو...
سن لائٹ صابن استعمال کیجئے
SUNLIGHT
سن لائٹ صابن
دھوتا ہے

نزلہ؟
کھانسی؟
Liqufruta
آج ہی
ایک شیشی
خریدیئے
اس کا فوری علاج
لیکوفروٹا
جڑی بوٹیوں سے تیار کی ہوئی کھانسی کی دوا
یہ بچوں کیلئے بھی نہایت مفید ہے
تجارتی تفصیلات کے لئے ایس۔ جے اینڈ جی فضل الٰہی لمیٹڈ پوسٹ بکس نمبر ۴۹۱۴ کراچی

یہ تاثر بھی اجنبی سا تاثر تھا۔ سب سے آخر اس نے ہرن دیکھے۔ ایک ہرنی بیٹھی ہوئی تھی اور اس کا ایک ماہ کا بچہ اس کے جسم پر لیٹا ہوا بڑی پیاری پیاری حرکتیں کر رہا تھا کبھی ماں کا منہ چاٹتا، کبھی اس کی ہیڈ پر بیٹھ جاتا۔ پیار محبت کے اس ننھے سے خوبصورت مجسمہ کو دیکھ کر قدرت بھی مسکرا اٹھی ہوگی۔

"دیکھا شرابے!" نیاز نے کہا۔ "بچہ کس طرح ماں سے پیار کر رہا ہے۔" لیکن شرابے نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ اس کے ہونٹوں پر لطیف سا تبسم تھا اور وہ محبت کے اس حسین کھیل میں کھویا ہوا تھا۔

اس شام شرابا اکھاڑے میں نہ گیا۔ گھر جا کر دیکھا تو وہ غائب تھا۔ دو رات بھر غائب رہا اور استاد کامو کا یہ حال کہ اس نے کھانا بھی نہ کھایا سارا دن ایک ہی فقرہ دہراتا رہا "میں تھانے جا کر بھاٹی دروازے والوں کے خلاف رپورٹ کروں گا کہ انہوں نے میرا شیر اغوا کر لیا ہے۔" استاد اور سارے شاگرد رات دن شرابے کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے۔ بھاٹی دروازے بھی جاسوس بھیجے گئے۔ حد یہ کہ دو شاگرد داتا گنج تک ہو آئے۔ اسی شام نیو سٹار سینما میں دوسرے شو کے درمیان جب نیاز مشین چلا رہا تھا منیجر نے اس کے ہاتھ میں ایک سلائڈ دی کہ وقفہ کے وقت دوسری سلائڈوں کے ساتھ دکھا دے۔ نیاز نے سلائڈ دیکھی۔ اس پر بھدے سے خط میں لکھا ہوا تھا: "چڑیا گھر سے ایک ہرنی کا بچہ گم ہو گیا ہے جس کی عمر تقریباً ایک ماہ ہے۔ ہرنی نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے اور ایک دن رات میں بے حد کمزور ہو گئی ہے۔ جس کسی کو یہ بچہ ملے یا جو کوئی اس کا سراغ لگا سکے اسے تیس روپے انعام دیا جائیگا اور جس کسی کے پاس بچہ پکڑا گیا اسے حوالۂ پولیس کیا جائیگا۔" نیاز نے سلائڈ پڑھی تو اس کے دماغ میں ایک خیال آیا اور وہ سلائڈ اور اپنے درمیان ایک خلا میں کھو گیا جس طرح دوروز پیشتر شرابا ہرنی اور بچے کے کھیل میں کھویا ہوا تھا۔ نیاز تیسرا شو دکھا کر پیپل تلے پہنچا جہاں زینت اس کا انتظار کر رہی تھی:

"شرابے کا کچھ پتہ چلا؟" زینت نے یاس انگیز لہجہ میں پوچھا۔

"نہ ملے۔" نیاز نے بے پروائی سے کہا۔ "ہم اس حسین رات کے یہ پیار بھرے لمحات کیوں ضائع کریں؟ کوئی اور بات کرو۔ کرسے نے پھر تو شادی کا قصہ نہیں چھیڑا؟"

"گولی مارو کرسے کو نیاز!" زینت نے کہا۔ "شرابے کو واپس آجانا چاہیئے۔"

"کیوں؟"

"آجائے تو اچھا ہے۔۔۔۔" زینت جھینپ سی گئی۔ "آجائے تو اچھا ہے۔ استاد جی بہت پریشان ہو رہے ہیں۔"

اس رات کی ملاقات بھی شرابے کے متعلق باتوں میں ختم ہو گئی۔ زینت تیز قدم اپنے گھر کے پچھواڑے میں گم ہو گئی اور نیاز خراماں خراماں مایوسی کے عالم میں شرابے کے دروازے کے سامنے سے گذر رہا تھا۔ رات کا پونا ایک بج رہا تھا۔ اس نے دیکھا شرابے کے کمرے میں بتی جل رہی ہے۔ اس نے سوچا شاید کوئی شاگرد ہوگا۔ شرابا کہاں۔ دروازہ کو ذرا دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ سامنے دیکھا تو کمرے کا بھی دروازہ کھلا ہوا پایا اور چارپائی پر اسے لالٹین کی مدھم روشنی میں شرابا لیٹا ہوا نظر آیا۔ نیاز دھک کر کمرے میں پہنچا۔ اس نے دیکھا شرابا گہری نیند سو رہا تھا اور اس کے پہلو میں ہرنی کا بچہ سویا ہوا تھا۔ نیاز نے چاہا کہ وہ لپک کر ہرنی کے بچے کو اٹھائے اور چڑیا گھر میں پھینک آئے لیکن وہ لالٹین کی طرف بڑھا، آہستہ سے لالٹین کا شیشہ اٹھایا، بتی کو پھونک مار کر بجھایا اور دبے پاؤں باہر نکل گیا۔ دوسری صبح نیاز ادھر آ رہا تھا تو استاد کامو اسے رستے میں مل گیا۔ اس کی باچھیں کانوں تک پہنچی ہوئی تھیں۔ وہ نیاز سے لپٹ گیا۔ "سنا تم نے بیٹے؟ میرا شیر لوٹ آیا ہے۔ میں ابھی ابھی دیکھ کر آیا ہوں۔ ہرنی کے بچے سے کھیل رہا ہے اور خوب ہنس رہا ہے۔" نیاز شرابے کے گھر میں داخل ہوا تو دیکھا شرابا ہرنی کے بچے کو سینے پر بٹھائے اس کا منہ چوم رہا تھا اور بچہ اس کے گول مٹول گال چاٹ رہا تھا:

"یہ بچہ کہاں سے لائے ہو شرابے؟" نیاز نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"چڑیا گھر سے چرایا ہے۔" شرابا غیر معمولی طور پر مسرور تھا۔ "اور رات کی طرف سے میں نے جنگلہ پھاندا اور ــــ"

"کیوں لائے ہو اسے؟"

"پیار کے لئے۔ محبت کی خاطر!" شرابے نے ہنستے ہوئے کہا۔ "دیکھو تو کیسے میرا منہ چاٹتا ہے۔" نیاز کے لئے شرابے کی ہنسی قدرے حیران کن تھی۔ یہ ہنسی اس کی پہلی ہنسی تھی اور اس کے ہونٹوں پر یوں لگ رہی تھی جیسے وہ یہ ہنسی بھی کہیں سے چرا لایا ہے۔

"یہ بچہ واپس کر دو ورنہ اس کی ماں مر جائے گی۔" نیاز نے کہا۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے تمہیں پولیس گرفتار کر لے۔" نیاز نے لمبا چوڑا لکچر دیا کہ بچہ واپس کرنا کیوں ضروری ہے۔ شرابے نے یہ باتیں ایسے انہماک سے سنیں جیسے وہ ایک ایک لفظ سمجھ رہا ہے اور قائل ہو گیا ہے۔ نیاز نے اطمینان کا سانس لیا کہ شرابے کے مغز میں بات آگئی ہے۔ اس نے کہا "تو اب یوں کرو کہ یہ بچہ خاموشی سے وہیں پھینک آؤ جہاں سے اٹھا لائے ہو۔"

"کیوں؟" شرابا یوں بولا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔

"میں ابھی تمہیں بتا رہا تھا کہ۔" نیاز نے اپنا لکچر پھر الف سے شروع کیا اور ہر فقرے اور خیال کی وضاحت کرتا گیا جس کے جواب میں شرابے نے کئی بار کہا "ہاں بھئی! یہ تو تم درست کہتے ہو۔ ہاں میں سمجھ گیا۔ یہ بھی ٹھیک ہے، اچھا بہتر ہے۔"

"تو اب اسے چڑیا گھر چھوڑ آؤ" نیاز نے کہا۔

"کیوں؟" شرابے نے پھر کیوں کہہ کر نیاز کو سٹپٹا دیا۔ "پھر میرے ساتھ پیار کون کرے گا؟ پھر میں کھیلوں گا کس کے ساتھ؟" شرابے نے بچے کو سینے کے ساتھ لگا لیا اور کہا "شام کو استاد نے دودھ اور بادام بھیجے تھے، وہ میں نے اسے پلا دیے ہیں۔"

"سنو شرابے!" نیاز نے کہا۔ اسے ڈر تھا کہ پولیس کو سراغ مل گیا تو شرابا گرفتار ہو جائے گا۔

"یہ بچہ سرکار کی ملکیت ہے اور اسے لوگوں کی تفریح ———"

"کون سی سرکار؟" شرابے نے پوچھا۔

"پاکستان!" نیاز نے جواب دیا۔ "یہ بچہ اور چڑیا گھر کے سارے جانور پاکستان کی ملکیت ہیں۔"

"اچھا!" شرابے کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔

دوسرے دن معلوم ہوا کہ رات کو پُر اسرار طریقے سے ہرنی کا بچہ چڑیا گھر میں واپس آگیا۔ شرابا پھر بادلوں کی دنیا میں پہنچ گیا۔ اس کی خاموشی اور اداسی کا [illegible] اختیار کر گئی اور وہ زیادہ سے زیادہ وقت بیٹھک میں ہی [illegible] رہنے لگا۔ [illegible] نے پاس آ کر اس کے گھٹنے چھو لئے اور کہا: "[illegible] تو۔"

"دیکھو استاد!" شرابے نے اداس سے لہجے میں کہا۔ "اللہ مہربان ہے۔ اس اکھاڑے میں تم سے کوئی جیت کے نہیں جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ میرے مقابلہ میں [illegible] آ رہا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ [illegible] کو تیار کر لو۔ اگر کوئی پہلوان ایسا ہی ڈھیلا نکلے تو مجھے بتانا۔ مجھے نہیں، رہنے دو۔"

شرابا [illegible] لحاظ سے [illegible] ہو رہا تھا۔ اور [illegible] دن بدن کول مٹول ہوتا جا رہا تھا۔ چہرے کا سانولا رنگ گہرا ہو گیا تھا۔ لیکن [illegible] ہوئی موم بتی کی طرح جھلملا رہا تھا۔ ہرنی کا بچہ پاکستان کے نام پر واپس تو کر دیا تھا لیکن اس کی محبت اسکے [illegible] پہ ہو اور [illegible] کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے اس کے ہونٹوں پہ لطیف سی مسکراہٹ اچانک جیسے سوتے ہوئے بچے کے لبوں پہ بادل کا سا تبسم ہوتا ہے لیکن اس [illegible] کے درمیان تاثرات کے درمیان یہ مسکراہٹ یوں لگتی جیسے قبرستان میں سے رات گذر رہی ہے۔ اور ایک دن شرابے کے گھر کے اوپر سینکڑوں کوؤں نے کائیں کائیں کر کے قیامت خیز شور برپا کیا ہوا تھا جیسے صحن میں یا کوٹھے پر کوئی مرا ہوا کوا پڑا ہو۔ نیاز اسی طرف چلا آ رہا تھا۔ وہ شرابے کے گھر میں داخل ہوا اور اندر کا منظر دیکھ کر ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ شرابا کوؤں کے دو ننھے ننھے بچے ہاتھ میں لئے منہ میں دام چبا چبا کر کھلا رہا تھا۔ نیاز کو دیکھ کر شرابا کچھ ایسے مسکرایا کہ شکستہ سی مسکراہٹ ٹمٹماتی ہوئی موم بتی کی لو پھر چمک اٹھی تھی لیکن دوسری صبح دونوں بچے مر گئے اور شرابے کا تو جیسے دل ہی مر گیا!

شرابے کے گھر کی فضا میں اداسیاں نوحہ گر تھیں۔ گرد و پیش کی دنیا میں گہما گہمی اور ہنگامی اسی طرح تھی جس طرح شرابے کے آنے سے پہلے تھی۔ لیکن شرابا اس ہنگامہ سے بے نیاز چار دیواری کے اندر بند رہا۔ نیاز اور زینت کی اندھیری راتوں میں ملاقاتیں اور دن کو ان کی خاموش نگاہوں کے

دوران پر دور تصادم بڑھتے گئے۔ کرما دس نمبریا جوئے اور غنڈہ گردی میں مصروف رہا۔ استاد کامو دن رات شاگردوں کی جان کھاتا رہا اور راتیں دنوں کو تڑپ تڑپ کر کر کے میٹھی عید کو قریب تر لاتی گئیں۔

ایک دن پچھلے پہر شیرابا خلاف معمول ٹہلتا ٹہلتا شہر کے شور و شر سے باہر نکل گیا۔ ادھر کھلے میدان میں ڈھول بج رہے تھے اور بے شمار لوگ گول دائرہ کی صورت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ شیرابا بھی غیر ارادی طور پر وہاں جا رکا۔ دیکھا کہ وہاں کتوں کی لڑائی شروع ہونے والی ہے۔ شیرابا بھی اس تماشہ میں مگن ہو گیا۔ اس نے دونوں کتوں کا جائزہ لیا۔ اس کی نظر ایک کتے پر جم گئی۔ یہ ایک پنشن یافتہ صوبیدار کا کتا تھا۔ رنگ تو سفید تھا لیکن شکل اور جسامت ببر شیر کی سی تھی۔ دو آدمیوں نے اسے زنجیروں سے باندھ کر پکڑا ہوا تھا۔ کتے کے چہرے پر اس قدر گوشت تھا کہ آنکھیں نظر ہی نہ آتی تھیں۔ بوڑھا صوبیدار کتے کے پاس بیٹھا تھا اور کتا اس کے ہاتھ چاٹ رہا تھا۔ شیرابا کتے کو بڑی حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگ گیا۔ اتنے میں مجمع کی دوسری طرف سے کسی نے زور سے کہا: "آجاؤ صوبیدار صاحب!" دوسرے کتے کا مالک للکار رہا تھا۔ یکبارگی دونوں طرف ڈھول بج اٹھے۔ مجمع نے ایک شور بلند کیا اور صوبیدار نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بید کی چھڑی سے اپنے کتے کو بری طرح پیٹنا شروع کر دیا۔ کتا بلبلا اٹھا۔ وہ زنجیریں توڑ کر بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن دونوں آدمی کتے کو پوری طاقت سے پکڑے ہوئے تھے اور کتا ڈھول کی آواز سے بھی اونچا چیخ رہا تھا۔ دوسرا کتا میدان میں آ چکا تھا۔

"یہ کتے کو مار کیوں رہا ہے؟" شیرابے نے ایک آدمی سے پوچھا۔

"اس طرح کتا طیش میں آجاتا ہے اور خوب لڑتا ہے۔" آدمی نے جواب دیا۔ "وہ پھر اپنے حریف پر پورے غصے کے ساتھ حملہ کرتا ہے۔"

"لیکن کتا تو اس سے پیار کر رہا تھا۔" شیرابے نے کہا۔ "جو پیار کرے اسے مارنا تو نہیں چاہئے۔"

"سارے مالک یوں نہیں کرتے۔ یہ صرف اسی صوبیدار کا طریقہ ہے۔"

شیرابا خاموش ہو گیا۔

اس شام شیرابا گھر واپس نہ آیا۔ استاد کامو ایک بار پھر تڑپ اٹھا۔ اکھاڑے کے گرد و نواح میں پھر وہی افراتفری مچ گئی۔ کرمے دس نمبریے نے اپنے بالکے ہر طرف دوڑا دئے۔ آخر ایک رات شیرابا لوٹ آیا۔ استاد کامو کو پتہ چلا تو بھاگا بھاگا اس کے گھر پہنچا۔ وہ جونہی صحن میں داخل ہوا ایک خونخوار قسم کا کتا ہیبت ناک طریقہ سے بھونکا اور غرا کر استاد پر جھپٹا۔ جب کتے نے اگلی دونوں ٹانگیں اٹھائیں تو اس کی اونچائی استاد کے برابر ہو گئی۔ استاد کامو الٹے قدموں کو دوڑا اور دروازے میں جا کر گرا۔ شیرابے نے لپک کر کتے کو گلے سے دبوچ لیا اور "خبردار ٹائیگر" کہا۔ کتا شیرابے کے قدموں میں لیٹ گیا۔
اس رات نیاز آخری شو دکھا کر لوٹا تو شیرابے کے گھر میں داخل ہوا۔ کمرے میں شیرابا سفید کتے کو اپنے ساتھ لٹائے بستر میں لیٹا ہوا تھا۔ نیاز کو دیکھ کر کتا غرایا لیکن شیرابے نے کتے کو ڈانٹ دیا اور کتا لیٹ گیا۔

"یہ کتا مالک کے ساتھ پیار کرتا تھا اور مالک اسے مارتا تھا۔" شیرابے نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اب یہ میرے ساتھ پیار کرتا ہے اور میں اس سے محبت کرتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"ٹائیگر!" اور اپنا منہ کتے کے منہ کے قریب کر دیا۔ کتے نے منہ شیرابے کے گالوں سے رگڑنا شروع کر دیا اور شیرابے کا چہرہ جس پر نیندہ اثر غالب تھا، چمک اٹھا۔

دوسری طرف صوبیدار کی راتوں کی نیند ختم ہو گئی تھی۔ یہ کتا اس نے جانے کتنے سو روپے خرچ کر کے چترال سے منگوایا تھا۔ اس وقت یہ ننھا سا پلا تھا۔ اس کتے پر اس نے دن رات محنت کی تھی اور اس نے کئی میدان مارے تھے۔ اب جبکہ اس کی شہرت نصف صوبہ میں پھیل گئی تھی، کتا چوری ہو گیا۔ اس نے اخباروں میں اشتہار دئے اور ایک سو روپے انعام کا بھی اعلان کیا لیکن کتے کا سراغ نہ مل سکا۔ یہ اعلان استاد کامو کے اکھاڑہ میں بھی سنائی دیا۔ استاد، نیاز اور چند ایک شاگردوں نے شیرابے کو کہا کہ کتا واپس کر دے لیکن شیرابے کی زبان پر ایک ہی جواب تھا "جس کسی نے کتا لینے کی ہمت کی اسے جان سے مار دوں گا۔" سب جانتے تھے کہ یہ خالی دھمکی نہیں۔ ایسے موقعوں پر شیرابا انسان نہیں درندہ

بن جایا کرتا تھا۔ اکھاڑے والوں نے سوچا کہ شرابا استاد بننے سے تو رہا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شرابا ہی ہاتھ سے جاتا رہے۔ سب نے کہا کتے کو باہر نہ نکالے اور استاد کامو نے سب کو ہدایت کی کہ یہ خبر اکھاڑے سے باہر نہ جانے پائے جس کسی کو ایک سو روپے انعام کی ضرورت ہے وہ مجھ سے لے لے شاگرد استاد کو پیر کی طرح مانتے تھے۔ بات اکھاڑے میں ہی رہی ؛

شرابے کی زندگی میں ایک بار پھر رونق آگئی۔ وہ اکھاڑے میں باقاعدہ جانے لگ گیا۔ اکھاڑے میں پھر ہما ہمی پیدا ہو گئی۔ استاد کامو کو ایک طرف بٹھا کر شرابا شاگردوں کو تیار کرنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ آدھ سیر دودھ اور بادام کتنے کو پلا دیا کرتا تھا اور رات کو اپنے ساتھ سلاتا۔ اس کے برعکس دمو بیدار اس کتے کو دن میں دو بار پیٹا کرتا۔ زینت جو شرابے کی غیر حاضری میں چپ چاپ سی ہو گئی تھی، پھر کھل اٹھی ؛

"زینت!" نیاز نے ایک رات ہنستے ہنستے زینت سے پوچھا "شرابا کہیں چلا جاتا ہے تو تمہیں کیا ہو جاتا ہے؟"

"ہوتا تو کچھ نہیں" زینت نے ایسے لہجہ میں کہا جیسے وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہے کہہ نہیں سکتی۔ خود اعتمادی سے خالی لہجہ میں اس نے کہا "شرابا اکھاڑے کی رونق ہے اور تم جانتے ہو مجھے اس رونق سے کس قدر پیار ہے۔ اور یہ بات بھی ہے کہ وہ بے چارہ تن تنہا اکیلا سا انسان ہے۔ نہ کسی کے اچھے میں نہ برے میں اگر وہ پہلوان نہ ہوتا تو اسے کون پوچھتا؟ سب کو اس کے فن اور جسم سے محبت ہے۔ اس کی ذات میں تو کسی کو دلچسپی نہیں" زینت باتیں کرتے کرتے نسوانی جذبات کی زد میں بہنے لگی "جانے میرا دل کیوں چاہتا ہے کہ شرابے کے پاس بیٹھ کر اس کے ساتھ باتیں کیا اور سنا کروں"؛

"معاملہ کہیں الٹا تو نہیں ہو رہا ہے" نیاز نے سنجیدہ سی ہنسی ہنس کر پوچھا۔

"ارے یہ نہیں ناجے!" زینت نے نیاز کے منہ پر ہلکی سی تھپکی دے کر کہا "تم سے بڑھ کر کون ہے"؟

دو اور دن ہنستے کھیلتے گزر گئے۔ تیسری صبح نیاز اپنے کمرے میں سویا ہوا تھا کہ اسے زینت نے آ جگایا۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے نیاز کو بتایا "رات کو ظلم ہو گیا۔ کرما رات کو آیا اور آتے ہی جلدی شادی کرنے کا قصہ چھیڑ دیا۔ استاد چچا اور چچی ٹالتی رہیں لیکن کرما تیز ہو گیا۔ وہ دونوں اس کے احسان مند ہیں۔ خلاف مرضی اس کے سامنے جھکنے لگے۔ مجھ سے رہا نہ گیا، میرا خون کھول رہا تھا۔ میں برس پڑی اور صاف کہہ دیا میں شادی نہیں کروں گی۔ خواہ گلا کاٹ دو میں کرمے کے ساتھ شادی نہیں کروں گی۔ میری بات سے تینوں پر خاموشی چھا گئی۔ سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اور کرمے کا رنگ غصہ سے لال ہو گیا۔ اس نے غصہ میں کہا "تو کس یار سے شادی کرے گی؟ ذرا نام تو لے اس کا؟" میں نے سوچا صاف کہہ دوں کہ میں نیاز کے ساتھ شادی کروں گی لیکن میں سنبھل گئی۔ خیال آیا وہ دس نمبریا بدمعاش ہے، کہیں تمہارے پیچھے نہ پڑ جائے۔ میں نے کہہ دیا میں شرابے کے سوا کسی دوسرے سے منہ نہ لگاؤں گی۔ میں جانتی تھی کہ کرما شرابے سے بدکتا ہے اور وہ میری جان چھوڑ کر ایک طرف ہو جائے گا۔ کرمے نے چاقو نکال لیا اور کہا "پہلے میں اس شرابے کمینے سے نبٹ لوں۔ پھر دیکھتا ہوں تم راہ پر آتی ہو یا نہیں" اس کا یہ کہنا تھا کہ کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور شرابا نمودار ہوا۔ وہ بجلی کی طرح نظر آیا اور دوسرے سانس میں اس نے کرمے کو اوپر اٹھا کر اس زور سے دیوار کے ساتھ پٹخا کہ اس کے ماتھے سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا اور کرما وہیں بیہوش ہو گیا۔ جتنی دیر میں استاد چچا اور چچی اٹھتے، شرابے نے کرمے کو پاؤں سے پکڑ کر فرش پر گھسیٹا اور دروازے سے باہر پھینک دیا۔ پھر شرابے نے بڑے اطمینان سے کہا "استاد ابا کتے کے لئے دودھ نہیں بچا۔ کچھ دودھ ہو تو دے دو" چچی نے اسے دودھ دیا اور وہ چلا گیا ؛

اب کرما گھر میں پڑا ہے۔ رات ہی کو استاد نے ڈاکٹر کو بلا لیا تھا اور مرہم پٹی ہو گئی تھی۔ صبح صبح اسے ہوش آئی ہے اور استاد چچا نے اسے ایک سو روپیہ دیا ہے کہ وہ تھانے میں رپورٹ نہ کرے۔ اور سنو نیاز بے! ایک مزے کی بات۔ کرمے کو ہوش آیا تو استاد کو کہنے لگا "اب میں زینت کے ساتھ شادی نہیں کروں گا، سالی کنجری ہے" اور کہتا بھی کیا؟ دراصل شرابا دودھ لینے آیا تھا اور دروازے سے باہر کھڑا ساری باتیں سنتا رہا ہو گا ؛

نیاز کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس کا سینہ اور باچھیں پھیلتی جا رہی تھیں۔ اس واقعہ کے دو روز بعد صبح سویرے شرابا خلاف معمول

نیاز کے گھر گیا اور اسے بے تکلفی اور مسرت سے بستر سے گھسیٹ کر بٹھا دیا۔

"نیاز! سن بے نیاز!" شرابے نے اس کے سر کو جھنجھوڑ کر کہا "میں رات کو کتا اسی گھر میں پھینک آیا ہوں جہاں سے لایا تھا۔ جانتے ہو کیسے؟ کل آدھی رات کو میں کتے کو ساتھ لے گیا اور اسے اٹھا کر اس کے مالک کے مکان کے صحن میں باہر سے پھینک آیا" نیاز اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ کتا خود ہی پھینک آیا ہے اور اس قدر خوش بھی ہے؟

"کیا کہہ رہے ہو شرابے" نیاز نے آنکھیں مل کر کہا "کیا تم کتے کے بغیر زندہ رہ سکو گے؟ اب تمہارے ساتھ محبت کون کرے گا؟" نیاز نے اس کے خیال کے مطابق بات کرنے کی کوشش کی اور کہا "اب تمہارے ساتھ کھیلے گا کون؟"

"زینت!" شرابے نے بھرپور مسکراہٹ سے کہا "اس رات اس نے ماں باپ کو صاف کہہ دیا ہے کہ میں شرابے کے سوا کسی کو نزدیک نہیں پھٹکنے دوں گی۔ اسی لئے تو میں نے کرمے کا سر کھول دیا ہے کیونکہ وہ زینت کے نزدیک پھڑکتا تھا" زینت کی محبت کے جوش میں جو منہ میں آیا، شرابا کہے جا رہا تھا اور نیاز کا خون کھولتا جا رہا تھا۔ اس نے سوچا ایک سے خلاصی ہوئی تو دوسرا دیو آدھمکا۔ لیکن نیاز کو تسلی تھی کہ شرابا غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ اس نے رات زینت کی یہ بات سن لی ہوگی کہ وہ شرابے کو چاہتی ہے اور وہ اسے سچ سمجھ بیٹھا ہے۔ کہاں زینت جیسی گڑیا سی لڑکی اور کہاں شرابا دیو!

"سنو شرابے!" نیاز نے اسے کہا "تمہیں غلطی ہوئی ہے" نیاز نے اسے ساری بات سمجھائی کہ زینت نے کیوں کہا تھا کہ "میں شرابے کے سوا کسی سے منہ نہ لگاؤں گی" نیاز نے اسے بتایا "یہ تو تم جانتے ہو کہ کرما دس نمبریا ہے اور میں اس کے مقابلہ میں ٹک نہیں سکتا۔ زینت نے تمہارا نام لے کر کرمے کو دھمکایا تھا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ تم اتفاق سے وہاں پہنچ گئے اور کرمے کو رستے سے ہٹا دیا" اس کے بعد نیاز نے اسے اپنی اور زینت کی محبت کی تمام روداد سنائی اور تفصیلاً بتایا کہ پیپل کے لرزتے پتوں میں اس کا ایک ایک لفظ لکھا ہوا ہے۔ آخر میں نیاز نے شرابے سے التجا کی کہ وہ دوست ہوتے ہوئے دوست کی راہ میں نہ آئے "کیونکہ زینت میری ہے۔ اور شرابے....." نیاز نے شرابے کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

شرابے کا ردِ عمل عجیب سا تھا۔ اس نے نیاز کی بات سمجھ لی اور مان گیا۔ اس نے زیرِ لب کہا "اوہو، یہ بات تھی!" اور اس کے ہونٹوں کے کونے میں صبح کاذب کی طرح مسکراہٹ کا دھوکہ ہوا اور تبسم کا یہ واہمہ وہیں کہیں گم ہو گیا۔ شرابا آہستہ سے اٹھا، دو قدم چلا، رکا اور پھر چل پڑا۔ وہ اس طرح جھک کر آہستہ آہستہ چل رہا تھا جیسے اعصاب پر جانے کتنا عظیم بوجھ اٹھائے ہوئے تھا۔ اگر وہ چاہتا تو نیاز کا بھی وہی حشر کر سکتا تھا جو اس نے کرمے کا کیا تھا، لیکن نیاز اس کا دوست تھا۔ نیاز نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ شرابے نے اس پر کس قدر مہربانی کی ہے کہ یوں خاموشی سے اس کی راہ سے ہٹ گیا ہے جس طرح خشک گھاس کا تنکا ہوا سے اڑ جاتا ہے۔ نیاز کو اچھی طرح علم تھا کہ شرابا گھاس کا تنکا نہیں۔ نیاز سے رہا نہ گیا۔ وہ اٹھا اور صحن میں شرابے کو روک کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اس کے قوی ہیکل جسم سے لپٹ گیا۔ پھر اس کا گول مٹول گہرا سانولا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر کہا: "شرابے! ناراض ہو گئے ہو؟ زینت اگر میری بیٹی یا بہن ہوتی تو میں اسے تمہارے قدموں میں ڈال دیتا" اس کے جواب میں شرابے کے ہونٹ ذرا سا لرزے اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں دو آنسو امڈ آئے جنہیں پلکوں نے وہیں دبوچ لیا۔ شرابا، نیاز کا گال تھپکا کر کچھ کہے بغیر چلا گیا۔

نیاز نے شرابے کو دروازے سے نکلتے دیکھا۔ دروازہ بند ہوا اور اس کی مستی کا دروازہ کھل گیا جس میں زینت اور شرابا داخل ہو گئے۔ نیاز کے منہ سے سرگوشی نکلی "بے چارہ!" اور وہ آہ بھر کر کمرے میں آ گیا۔

شرابا پھر گم ہو گیا۔ عید کو چند روز رہ گئے تھے۔ استاد کامو نے اب اس کے پیچھے آدمی نہ دوڑائے بلکہ سیدھا داتا دربار گیا اور وہاں ایک دنبے کا نذرانہ مانا۔ وہاں سے "کوڑیوں والے" سائیں کے ہاں گیا اور شرابے کی واپسی کی دعا کرائی۔ سائیں جی نے اسے دو تعویذ بھی لکھ دیئے جن میں سے ایک استاد کامو نے اکھاڑہ میں دبا دیا اور دوسرا شرابے والے مکان کے باہر والے دروازے کے اوپر اینٹوں میں۔ سائیں جی نے کہا تھا کہ شرابے کے صحن میں سوا پندرہ سیر چاول پکا کر غریبوں میں تقسیم کئے جائیں۔ دوسرے دن استاد کامو نے یہ خیرات بھی دی۔ سائیں

جی نے وثوق سے کہا تھا۔ "تمہارا آدمی تیسرے روز جب سورج اندر باہر ہوگا گھر لوٹ آئے گا۔"

نیاز اور زینت ملے تو نیاز نے اسے بتایا کہ شیرا بابا کس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا اور یہ بھی بتایا کہ وہ کس قدر خوش تھا۔ "شاید تمہاری محبت کا ہی فریب تھا کہ وہ کتا واپس کر آیا۔"

"وہ بہت خوش تھا؟" زینت نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"بے حد۔"

"اوہ!" زینت کے منہ سے جیسے تعجب آمیز آہ نکل گئی ہو۔ "اوہ شیرا بابے!" اس نے زیر لب کہا اور نیاز سے مزید بات کئے بغیر سر جھکائے ہوئے گھر چلی گئی۔

تیسرے دن پچھلے پہر ایک اجنبی آدمی استاد کامو کے پاس آیا اور اس سے پوچھا شیرا بابے نام کا کوئی پہلوان اس اکھاڑے میں ہوتا تھا؟ استاد نے اچھل کر جواب دیا "ہاں! وہ کہاں ہے؟ جلدی بتاؤ دوست! تمہارا منہ میٹھا کراؤں گا۔"

"وہ کوتوالی کی حوالات میں بند ہے۔"

"کہاں؟ حوالات میں؟" استاد کو چکر آ گیا۔

"قتل کے جرم میں۔ میں کوتوالی سے آیا ہوں۔ راوی روڈ پر ایک بہت بڑا سوبلی نما سفید مکان ہے نا؟ لکڑی کوئلے کے ٹال کے قریب۔ وہ جالندھر والے صوبیدار افضل خاں کا مکان ہے۔ ان کا کتا گم ہو گیا تھا اور بہت دن ہوئے وہ کتا خود ہی دیوار پھاند کر گھر آ گیا تھا۔ پرسوں آدھی رات کے وقت ایک ہٹا کٹا آدمی دیوار پھلانگ کر صحن میں آیا اور کتے کا دڑبہ کھولا۔ کتا اس کو دیکھ کر بھونکا تو نہیں لیکن زنجیر کی آواز اور کتے کے ہلکے ہلکے غرانے کی آواز سے صوبیدار کی آنکھ کھل گئی۔ صوبیدار کی بیوی کا بیان ہے کہ وہ اور صوبیدار صحن میں آئے تو دیکھا کتا اس آدمی کے ساتھ پچھلی ٹانگوں پر کھڑا اس طرح بغلگیر تھا جس طرح دو مرد آپس میں ملتے ہیں۔ اس نے بھی کتے کو بازوؤں کے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ صوبیدار برآمدے میں پڑی ہوئی ایک لوہے کی سلاخ اٹھا کر اس آدمی پر حملہ کرنے لگا تو کتے نے صوبیدار پر حملہ کر دیا اور ناخنوں سے اس کا چہرہ نوچ کر لہو لہان کر دیا۔ صوبیدار نے بڑی مشکل سے کتے کو الگ کیا اور سلاخ لے کر اس آدمی کی طرف بڑھا، لیکن کتا پیچھے سے صوبیدار پر جھپٹا اور اس کی پیٹھ میں پنجے گاڑ کر پھاڑ میں ایسا منہ ڈالا کہ صوبیدار کی چیخیں نکل گئیں۔ اس نے پوری طاقت لگا کر کتے سے جان چھڑائی۔ وہ آدمی خاموشی سے ایک طرف کھڑا تماشہ دیکھتا رہا اور صوبیدار کی بیوی اسے گالیاں دیتی رہی۔ صوبیدار کے سارے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ کتا پھر اس کی طرف آیا تو اس نے سلاخ کا بھرپور وار کتے کے سر پر کیا اور کتا زمین پر تڑپنے لگا۔ پھر دوسرا وار کیا اور کتا مر گیا۔ اس آدمی نے جب کتے کو مرتے دیکھا تو اس نے لپک کر زخمی صوبیدار کو دبوچ لیا اور سر سے اوپر اٹھا کر اس زور سے دیوار کے ساتھ پٹخا کہ صوبیدار نے ایک ہچکی لی اور دم توڑ دیا۔ پھر وہ آدمی مرے ہوئے کتے کے ساتھ لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ صوبیدار کی بیوی نے شور مچایا تو محلہ کے لوگ آ گئے۔ وہ آدمی ابھی تک کتے کے ساتھ لپٹا ہوا رو رہا تھا۔ لوگوں نے اسے گرفتار کر کے پولیس کے حوالے کر دیا۔ اس نے ذرہ بھر مزاحمت نہ کی۔ کوتوالی میں آتے ہی بیان دیا کہ مقتول کو میں نے قتل کیا ہے۔ کیونکہ اس نے میرا کتا مار دیا ہے۔ دوسرے دن پولیس نے چالان پیش کر دیا۔ اس نے اپنا نام شیرا بابا بتایا ہے اور مجھے کہا تھا کہ مزنگ والے اکھاڑے میں جا کر استاد کامو، نیاز اور زینت کو میرا سلام دینا اور کہنا کہ مجھے بخش دو۔"

استاد کامو نے اس آدمی کو دو روپے دے کر رخصت کیا اور اسی شام نیاز اور دو شاگردوں کو ساتھ لے کر کوتوالی گیا۔ بڑی منت سماجت سے اسے ملاقات کی اجازت مل گئی۔ سب نے شیرا بابے کو کہا کہ عدالت میں کہہ دے کہ میں نے قتل نہیں کیا اور گواہ پیش کر دئے جائیں گے کہ واردات کی رات شیرا بابا اپنے گھر پر موجود تھا۔ لیکن شیرا بابا اس کے سوا کچھ کہتا ہی نہ تھا کہ "میں نے اسے مارا کیونکہ اس نے میرا کتا مار دیا تھا۔ وہ کتا میرے ساتھ محبت کرتا تھا۔ اس نے میری محبت کو مارا۔ میں کتے کو گھر لانے وہاں گیا تھا۔" استاد کامو نے ایک وکیل کر لیا جس نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور دیگر کاغذات حاصل کر لئے اور کیس کی اونچ نیچ دیکھی۔ ڈاکٹر کی رپورٹ صاف تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ مقتول کی موت کتے کے حملے سے ہوئی ہے۔

چہرے اور پیٹھ کی خراشیں مہلک نہیں تھیں۔ کتے کے دانت پیٹھ کی طرف سے کھال میں اتر کر پھیپھڑوں تک پہنچ گئے تھے جس سے موت یقینی تھی۔

موقع کے صرف تین گواہ تھے۔ ایک مقتول کی بیوی جس نے سارا حادثہ بیان کیا اور دو محلہ دار جنہوں نے شرابے کو موقع پر پکڑا تھا۔ وکیل نے بھی شرابے کو کہا "استغاثہ کی کہانی بہت کمزور ہے، تم جرم سے انکار کر دینا" لیکن عدالت میں جا کر شرابے نے مختصر سے دو تین فقرے کہے "میں نے مقتول کو قتل کیا ہے۔ میں بتا دیتا ہوں۔ بیٹھ گیا تھا۔ اس نے میرا کتا مارا تھا۔ میں نے اسے دیوار کے ساتھ بھینچ کر مار دیا" ملزم کی صفائی استاد دکامو نے آٹھ گواہ پیش کئے جنہوں نے یہ ثابت کرنے کی پوری کوشش کی کہ واردات کی رات شرابا اپنے گھر پر موجود تھا اور کتا مقتول کا تھا، ملزم کا نہیں تھا اور نہ ملزم کا اس کتے کے ساتھ کوئی تعلق تھا۔ دو گواہوں نے یہاں تک کہا کہ یہ بھاٹی دروازے والوں کی سازش کا نتیجہ ہے۔ ملزم کو دراصل مزنگ سے، اس کے گھر سے گرفتار کیا گیا تھا۔ اور گرفتار کرنے والوں نے کہا تھا کہ شرابا، کرمے دس نمبریے کا دوست ہے اس لئے وہ اسے شک میں گرفتار کر رہے ہیں۔ ملزم کے وکیل کی جرح بھی پر مغز تھی لیکن شرابا ایسی خود اعتمادی اور دلیری سے اقبالِ جرم کر رہا تھا کہ استغاثہ کی کہانی قابلِ یقین ثابت ہوئی۔ مقدمہ طویل نہ تھا۔ سیشن کورٹ نے دوسرے روز فیصلہ سنا دیا کہ "ملزم کو سزائے موت اور اپیل کے لئے ایک ہفتہ کی مہلت دی جاتی ہے۔"

شرابے کے چہرے پر سکون و اطمینان تھا جیسے اس نے فیصلہ سنا ہی نہیں۔ استاد دکامو اور نیاز نے اسے کہا کہ اپیل کی جائے گی اور اگر ہائی کورٹ نے اسے دوبارہ بیان دینے کو کہا تو وہ کہہ دے کہ پولیس نے مار پیٹ کر کے کہلوایا ہے کہ تم نے قتل کیا ہے لیکن شرابے نے پھر بھی یہی کہا "نہیں۔ قتل میں نے ہی کیا ہے۔ اپیل پر روپیہ ضائع نہ کرو۔ اگر تم لوگوں نے اپیل کی تو میں منظور نہیں ہونے دونگا۔"

فیصلہ سن کر استاد دکامو اور دوسرے لوگ واپس آئے تو معلوم ہوا کہ کرمے دس نمبریے کا سر کا زخم خراب ہو گیا تھا اور پیپ پڑ گئی تھی۔ پیپ غالباً دماغ تک پہنچ گئی تھی۔ زخم اس قدر خطرناک ثابت ہوا کہ عین اس وقت جبکہ شرابے کا فیصلہ سنایا جا رہا تھا کرما مر گیا۔ استاد دکامو نے بیوی اور زینت کو بتایا کہ اپیل بیکار ہے کیونکہ شرابا خود بہت بڑی رکاوٹ ہے وہ کسی کی بات مانتا ہی نہیں۔ زینت نے جب یہ قصہ سنا تو اسے غش آنے لگا۔ وہ سیدھی نیاز کے گھر گئی اور اسے کہا۔ "خدا کے لئے استاد جی کو کہو کہ اپیل ضرور کرے اور شرابے کو بچائے۔"

"لیکن شرابا تو مانتا ہی نہیں" نیاز نے کہا "اس نے تو یہاں تک کہا ہے کہ میں اپیل منظور ہی نہیں ہونے دوں گا۔"

"نیاز!" زینت نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر کہا "مجھے استاد جی سے اجازت لے دو کہ میں شرابے سے ملاقات کرنے جاؤں۔"

"ارے پگلی! تجھے اس قصے سے کیا واسطہ!" نیاز نے زینت کو کہا "کرما اس طرح ختم ہو گیا ہے اور شرابا اس طرح جا رہا ہے۔ جانے دو۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔ جلدی بھول جاؤ۔ میں استاد کو شادی کے لئے کہتا ہوں، اور اپنی زندگی بناتے ہیں، تمہیں ایسی پڑی ہے۔"

"نیاز!" زینت نے سر جھکا کر کہا "برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔ مجھے شرابے سے محبت ہے" اور مدتوں سے دبے ہوئے جذبات کا سیل نوجوان لڑکی کے سینے کے بند توڑ کر باہر آ گیا "اب جبکہ شرابا یہاں نہیں ہے تو مجھے پتہ چلا ہے کہ یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ میں اس کے بغیر جی نہ سکوں گی۔ میں نے اپنے آپ کو بہت فریب دئے ہیں۔ شرابے کو دھکیل دھکیل کر اپنے دل سے نکالا ہے لیکن وہ ایک سایہ کی طرح میرے سینے کی دنیا اور دل کے ساتھ ساتھ گھومتا رہا اور میں اس سائے کو سینے سے دھو نہ سکی۔ سائے گم ہو جاتے ہیں نیاز! دھلتے نہیں۔ لیکن یہ سایہ اندھیری راتوں میں آسیب کی طرح میرے ساتھ لگا رہا، گم نہ ہوا۔ شاید اسے میں نے ہی گم نہ ہونے دیا۔ انسان اپنے ہی ہاتھوں، اپنے آپ سے مجبور ہو جاتا ہے۔ تجھے ان راتوں کی قسم نیاز! جن کی گھڑیاں تو نے میری محبت میں گذاری ہیں۔ مجھے جیل کے لرزتے ہونٹوں کی قسم، مجھے جیل لے چلو۔ میں شرابے سے ملوں گی۔ خدا کے لئے نیاز!"

نیاز کو یوں لگا جیسے وہ سمندر کی مہیب لہروں پر بے بس ہو کر بہا چلا جا رہا ہے۔ لہریں اس پر جھپٹتی ہیں، ٹکراتی ہیں، گر گر اچھلتی دھپیڑے مارتی ہیں۔ اور نیاز کو معلوم نہ تھا کہ وہ کس سمت بہا جا رہا ہے کیونکہ وہ ان لہروں کے سامنے بے بس تھا۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ تھا۔ اسے خیال آیا کہ اس نے شرابے کو دوستی کا واسطہ دے کر اپنی اور زینت کی راہ سے ہٹایا تھا تو وہ خاموشی سے ہٹ گیا تھا۔ نیاز نے ارادہ کر لیا کہ وہ شرابے کی دوستی کا جواب دے گا۔ اس نے استاد دکامو سے بات کی تو وہ مزاحم نہ ہوا اور کہا "اگر زینت اسے منا سکتی ہے تو تم اسے ساتھ لے جاؤ۔"

دوسرے دن نیاز اور زینت جیل گئے۔ جب انہیں شرابے کی ملاقات کے لئے بلایا گیا تو نیاز نے زینت کو کہا "تم اکیلی جاؤ، میں یہیں ٹھہروں گا۔"

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

ماہِ نو، کراچی، دسمبر ۱۹۵۰ء

افسانہ:

ایک اور کرن!

حمید کاشمیری

میں بھی اس بدنصیب گاڑی پر سوار تھا جس کے جانکاہ حادثے سے زندہ بچنے کی خوشی میں میاں حق نواز نے صدقہ دیا ہزاروں خانماں برباد، بے کسوں، لاوارثوں، یتیموں اور مسکینوں کو کھانے کھلائے۔ مفت کپڑے تقسیم کئے اور دلوں کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دعاؤں سے مالامال ہو گئے۔ اور دنیا کے ساتھ ساتھ اپنی آخرت بھی سنوار لی۔ میں ان دعاؤں سے قطعی محروم رہا۔ اس لئے کہ میں نے کسی یتیم مسکین، بے کس اور خانماں برباد کو کھانا نہیں کھلایا۔ اور مفت کپڑے تقسیم نہیں کئے۔ البتہ سفر میں نے بھی میاں حق نواز کے ساتھ فرسٹ کلاس میں ہی کیا تھا اور یہ اعزاز مجھے ان دستاویزوں کی وجہ سے ملا جو میں اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ اور جن کی بدولت ایک تو میں تھرڈ کلاس کی بھیڑ بھاڑ سے بچ گیا اور دوسرے مجھے اپنی گرہ سے ریلوے کا کرایہ نہیں دینا پڑا۔

جب دن بھر تیز دھوپ کا سینہ چیرتی ہوئی گاڑی رات کی تاریکی کے پہلے دھندلکے میں داخل ہوئی تو مجھ کو کچھ تکان سی ہو رہی تھی اور نیند نے میرے گرد ہالے سے بننے شروع کر دئے تھے۔ میرے اعضا کچھ ڈھیلے پڑتے گئے اور غنودگی کی وجہ سے میں نرم نرم گدے میں نیچے ہی نیچے دھنستا چلا گیا۔ اس وقت مجھے قطعی طور پر یہ محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ میں ریل کا سفر کر رہا ہوں، بلکہ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے کوئی خواب آور شے سنگھا کر نیم بے ہوشی کے عالم میں مخملیں بستر پر ڈال دیا۔ اور پھر کسی غیبی طاقت نے میرے پلنگ کو لے کر کوہ قاف کی وادی کی طرف اڑانا شروع کر دیا ہو۔ میں ریل کے صرف تھرڈ کے ڈبوں کی جان لیوا بھیڑ، گھٹن حبس اور گھبراہٹ ہی سے واقف تھا جہاں آدمی کے لئے سونا تو درکنار جاگنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ لیکن میں فرسٹ کلاس کے آرام دہ، فرحت بخش اور مسرت آگیں نرم و گداز گدوں سے آشنا نہیں تھا، جہاں نیند اپنے ساتھ ایک مسحور کن کیفیت لے کر آتی ہے اور آدمی ایک سرور کے سے عالم میں زمین سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ اور مخملیں بستر پر ایک شانِ بے اعتنائی کے ساتھ لیٹا لیٹا اوپر ہی اوپر ستاروں کے درمیان کسی جنت کی تلاش میں گردش کرتا رہتا ہے۔ میں کچھ اسی جنت کی تلاش میں خواب دیکھ رہا تھا اور میرا یہ خواب اس وقت ٹوٹا جب اچانک مجھے نجانے کیسے خیال آ گیا کہ میں ریل کا سفر کر رہا ہوں، اور ریل سے سفر کا خیال آتے ہی ایک جھٹکے کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی۔ اس وقت گاڑی بڑی تیز رفتاری کے ساتھ رات کے گھپ اندھیرے کو چیر رہی تھی، باہر کی طرف گاڑی کا وہی تھرڈ کلاس والا سا ہنگم شور بلند ہو رہا تھا جو فرسٹ کلاس میں خلاف معمول بہت اچھا معلوم ہوتا تھا جیسے بل بیلی اپنا آرکسٹرا لئے راک اینڈ رول پر گا رہا ہو۔ ہوا کے ٹھنڈے جھونکے اندر داخل ہو رہے تھے۔ ہمارے ڈبے میں میرے اور میاں حق نواز کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ میاں حق نواز میرے سامنے والے برتھ پر ٹیک لگائے جاگ رہے تھے۔ مجھے جاگتا دیکھ کر وہ ایکدم چونکے اور ایک ہلکی سی مشتبہ نظر میرے چہرے پر ڈالی۔ سیٹ پر رکھا ہوا ہیٹ اٹھا کے اپنے گنجے سر پر رکھ دیا۔ بجھے ہوئے پائپ کو کوئی پانچویں یا چھٹی تیلی سے سلگانے کی ناکام کوشش کی اور پھر تھوڑا سا پہلو بدل کے بجھا ہوا پائپ منہ میں لٹکائے کھڑکی سے باہر کی طرف اندھیرے میں دیکھنے لگے۔

دن بھر میاں حق نواز اپنے تین چار ہمسفروں کے ساتھ سیاست، تجارت، منڈیوں کے اتار چڑھاؤ، اسٹاک ایکسچینج حکومت کی کارگذاریوں، یتیم خانوں اور کچھ قومی انجمنوں کے متعلق گفتگو میں مصروف رہے تھے۔ اور میں نے یہ تمام وقت کتابیں پڑھتے گذار دیا تھا۔ اس دوران میں مجھے میاں حق نواز سے آشنائی پیدا کرنے کا کوئی موقع نہیں مل سکا تھا۔ اور نہ ہی میں نے ان کی مصروفیت کے پیش نظر

ان کی تندرستی اہم ہے
اسی وجہ سے میں ہمیشہ ڈالڈا
سے کھانا تیار کرتی ہوں
ڈالڈا
ڈالڈا برانڈ وناسپتی
کھانوں کو بہتر بناتا ہے

دن بدن
حسین جلد
جی ہاں ایکٹرل آ سیٹر ریکسونا کے استعمال سے
آپ کی جلد میں ایک نئی ملائمت پیدا ہوگی روزانہ
اس کی جھاگ کو اپنی جلد پر ملئے - آپ کی جلد
دن بدن حسین ہوتی جائے گی -
بلاشبہ
ریکسونا
صابن سے
Rexona
دلکش اور
فرحت بخش خوشبو
جلد کو ملائم کرنے اور مقوی

ایسی کوئی کوشش ہی کی تھی۔ لیکن میں نے ان کے تیوروں سے یہ اندازہ ضرور کر لیا تھا کہ وہ میرے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اور میری یہ خواہش تھی کہ ان کی غلط فہمی کو کسی طرح دور کر دوں۔ اور اس طرح جان پہچان کا ایک سلسلہ بھی جاری ہو جائے گا۔ جب میری آنکھ نہیں لگی تھی تو ان کے پاس ایک آدمی موجود تھا اور جب میں نے آنکھ کھولی تو ڈبے میں صرف میں اور میاں حق نواز تھے جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ بیچ میں کوئی اسٹیشن آیا ہوگا جس پر تیسرا آدمی اتر گیا ہوگا۔ میں نے برتھ کے نیچے رکھے ہوئے اپنے سوٹ کیس پر ایک نظر ڈالی جو بالکل صحیح سلامت تھا۔ پھر میں نے مطمئن ہو کر پیچھے کو ٹیک لگا لی۔

میاں حق نواز باہر کی طرف دیکھ رہے تھے لیکن ان کا دھیان میری طرف معلوم ہوتا تھا۔ میری نیند کچھ اکھڑ سی گئی تھی، اور مجھے تنہائی کا احساس سا ہونے لگا تھا۔ میں نے اس تنہائی کو ختم کرنے کے لئے میاں حق نواز سے بات چیت کا سلسلہ شروع کرنے کی کوشش کی۔

"وقت کیا ہوگا؟" میں نے دھیمے سے لہجے میں پوچھا۔

"میری گھڑی خراب ہے" انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر بے رخی سے جواب دیا۔ اور بدستور باہر کی طرف دیکھتے رہے۔ میں چپ ہو گیا اور کان باہر گاڑی کے پہیوں کی دھکا دھک کی طرف لگا دیئے۔ اس کی آواز میں مجھے ایک موسیقی سی ملنے لگی۔ میں جس قسم کا راگ دل میں سوچتا اسی قسم کے سُر باہر سے نکلتے۔ میں نے ہلکے ہلکے سروں میں گاڑی کی چھکا چھک کے ساتھ کچھ گانا شروع کیا اور خود ہی محظوظ ہونے لگا۔ پھر اسی دھن میں نرم نرم گدے پر ہولے ہولے اچھلتے ہوئے کتنے ہی میلوں کی مسافت طے کر لی۔ میاں حق نواز ابھی تک مجھ سے بے نیاز ہو کر باہر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور ان کے منہ میں لٹکا ہوا پائپ ابھی تک بجھا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے پھر ماچس نکالی اور ایک تیلی سلگا کے جھکتے ہوئے پائپ کی طرف بڑھا دی مگر ہوا کے تیز جھونکوں نے پائپ تک پہنچنے سے پہلے ہی تیلی کو بجھا دیا۔ میں اخلاقاً سگریٹ لائٹر ہاتھ میں لئے ان کی جانب بڑھا۔ جب میں نے لائٹر والا ہاتھ ان کے چہرے کی طرف بڑھایا تو وہ بدک کر اٹھ کھڑے ہوئے اور چوکنے ہو کر پیچھے کو ہٹ گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا اور کچھ کہے سنے بغیر چٹ سے لائٹر جلا ان کے پائپ پر رکھ دیا۔ انہوں نے کچھ سہمے سہمے انداز سے دو چار کش لگا کے تمباکو جلا دیا اور مجھے کنکھیوں سے دیکھنے لگے۔ میں چپکے سے واپس اپنی جگہ پر آ گیا اور غور سے ان کی طرف دیکھا تو وہ بہت سہمے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ ان کی سانس اندر سے قدرے پھولی ہوئی تھی جسے وہ باہر سے قابو میں لانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ اور جب میری ان کی نظریں چار ہوئیں تو وہ کچھ کھسیانے سے ہو گئے۔ پھر یکے بعد دیگرے انہوں نے کش لگا کے دھواں بکھیرنا شروع کر دیا۔ اور میرے اور ان کے درمیان دھوئیں کی ایک دھند سی چھا گئی اور جب یہ دھند چھٹی تو وہ پھر کھڑکی سے باہر گھپ اندھیرے میں دیکھ رہے تھے۔ اب میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے مشتبہ طریقہ پر دیکھتے ہی نہیں تھے بلکہ مجھ سے بے حد خائف معلوم ہوتے تھے۔ مجھے ان کا یہ رویہ بہت ناگوار گذرا۔ اندر ہی اندر میں نے ایک گھٹن سی محسوس کی اور ایکدم اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے اٹھتے ہی وہ پھر کچھ مستعد سے ہو گئے، چپکے سے ایک ہاتھ اپنی باہر والی جیب میں ڈال دیا۔ اور اس کے اندر ہاتھ کو آہستہ آہستہ جنبش دینے لگے۔ اب وہ میری طرف یوں دیکھ رہے تھے کہ جیسے ہی میں نے ذرا بھی حرکت کی، وہ جیب سے کوئی خطرناک قسم کا ہتھیار نکال کر مجھ پر حملہ کر دیں گے۔ میں غصے میں آ کر حاجتی میں چلا گیا اور اندر سے چٹخنی لگا دی۔ پھر کافی دیر تک حاجتی کے اندر آئینے میں اپنا چہرا دیکھتا رہا جس سے میاں حق نواز غیر معمولی طور پر خوفزدہ تھے۔ مجھے اپنے چہرے میں ایسی ڈرا دینے والی کوئی عجیب و غریب چیز نظر نہیں آئی یا اپنا چہرہ ہونے کی وجہ سے میں خوفزدہ نہیں ہوا۔

اچانک گاڑی کی رفتار سست پڑتی معلوم ہوئی تو اس خیال سے کہ اسٹیشن آ گیا ہوگا میں فوراً دروازہ کھول کے باہر آ گیا۔ ڈبے میں آ کر معلوم ہوا کہ گاڑی کی رفتار ذرا بھی سست نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ پہلے سے زیادہ تیزی کے ساتھ چل رہی تھی۔ اس وقت میاں حق نواز کی سیٹ خالی تھی۔ شاید وہ چلتی گاڑی سے کود گئے تھے۔ لیکن نہیں، میں نے آگے بڑھ کر دیکھا تو وہ دوسری طرف کھلی کھڑکی کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے تھے اور کش پہ کش لگاتے ہوئے دھواں چھوڑ رہے تھے۔ مجھ پر ایک انجانی سی نظر ڈالی اور بظاہر

دوسری طرف متوجہ ہو گئے۔ میں نے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا اور واپس آکر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ابھی پوری طرح بیٹھنے نہیں پایا تھا کہ معلوم نہیں کیا ہو گیا۔ ایک قیامت خیز قسم کا زلزلہ ہوا۔ زمین کے ستون ہلا دینے والے جھٹکے محسوس ہوئے اور آسمان کو پھاڑ دینے والے دھماکے بلند ہونے لگے۔ میں بار بار آمنے سامنے والے برتھوں سے ٹکرایا۔ اوپر والے برتھ سے کوئی چیز بڑے زور سے میرے اوپر آن گری اور اس کے بعد مجھے کچھ معلوم نہیں کیا ہوا۔ میں اپنے حواس کھو بیٹھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی قیامت خیز زلزلے سے زمین کا سینہ شق ہو گیا ہے۔ اور میں حواس باختہ ہو کر نیچے ہی نیچے دھنسا جا رہا ہوں۔ پھر مجھے اسی بے ہوشی کے سے عالم میں عورتوں، مردوں اور بچوں کی دلدوز چیخیں سنائی دیں اور میں ان چیخوں کے قریب اور قریب ہوتا چلا گیا۔ پھر میں نے بھی چیخنا شروع کر دیا اور پھر میری چیخیں بھی اور لوگوں کی چیخوں کے ساتھ شامل ہو گئیں۔ میں گلا پھاڑ پھاڑ کے چلّانے لگا لیکن مجھے کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ کیا ہو گیا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ پھر ایک دم میرے کانوں کے پردے جیسے کھل گئے اور میں نے اپنے آپ کو اس آہ و بکا کے درمیان گھرا ہوا محسوس کیا لیکن مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ پاؤں پھیلانے کی کوشش کی لیکن مجھ سے کچھ بھی نہ ہو سکا۔ نجانے اچانک میری آنکھوں میں کیسے حرکت پیدا ہو گئی۔ ایک دم تاریکی چھا گئی اور دھندلاہٹ سی نظر آئی اور پھر چاروں طرف آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔ میں نے اچھی طرح آنکھیں کھول لیں اور اپنے آپ کو ملبے کے ڈھیر میں پھنسا ہوا محسوس کیا۔ میں بے بس ہو کر ہانپنے لگا۔ چاروں طرف قیامت مچی ہوئی تھی۔ گاڑی کا ڈھچر نکل آیا تھا اور لوگ آسمان کی طرف منہ کر کر کے چیخ رہے تھے۔ جا بجا ملبے میں دہشتناک آگ لگی ہوئی تھی اور لمحہ بہ لمحہ خوفناک دھواں دھوں کی آوازیں چلی آ رہی تھیں۔ کچھ لوگ گاڑی کے سالم ڈبوں سے نکل نکل کر بھاگ رہے تھے۔ کبھی کوئی اپنے بچوں کو بچانے کے لئے آگ میں پھلانگ رہا تھا۔ کوئی جلتے ہوئے کپڑوں سمیت ادھر ادھر بھاگ رہا تھا۔ کہیں بچہ ماں کے بغیر چیخ رہا تھا۔ کہیں ماں بچے کی تلاش میں دیوانہ وار بھاگ رہی تھی۔ اس وقت کوئی کسی کا شوہر، بھائی اور بیٹا نہیں تھا۔ سب ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تھے۔ افراتفری کے عالم میں تمام رشتے ختم ہو چکے تھے۔ صرف ایک آہ و بکا تھی جو سب کے درمیان مشترک رہ گئی تھی۔ میرے بدن کا قیمہ سا ہو گیا تھا۔ پھر بھی بڑی کوشش کی لیکن جسم میں ذرا بھی حرکت پیدا نہ ہو سکی۔ اور میں اپنے اوپر سے ایک فٹ بھر کی تختی بھی نہ ہٹا سکا۔

اس دوران میں میرے قریب سے کتنے ہی زخمی، شدید زخمی، جلے کٹے ہوئے اور تندرست لوگ چیختے پکارتے گذر گئے میں ایک ایک کی طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھ کر آہ و بکا کرتا رہا لیکن میری کسی نے ایک نہ سنی۔ پھر میں نے دیکھا کہ آگ بالکل میرے قریب آ گئی اور جس ملبے میں دبا ہوا تھا اس کے ایک حصے میں بھی آگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ اب میں نے گھبراہٹ میں خود ہی ہمت کر کے زور لگانا شروع کیا اور میری ایک ٹانگ بمشکل تھوڑی سی باہر نکلی۔ میں نے محسوس کیا کہ میری دوسری ٹانگ ٹوٹ چکی تھی، میں بالکل بے بس ہو گیا۔ اتنے میں سامنے کی طرف آگ کے چیختے پکارتے شعلے سے دوڑنے لگے۔ میں نے غور سے دیکھا، وہ کوئی نوجوان عورت جل رہی تھی میں نے ایک دہشتناک چیخ بلند کی اور پھر وہ عورت میرے بالکل ہی قریب آ کر گر گئی۔ جس ملبے میں میں دبا ہوا تھا اس کے دوسرے حصے میں بھی آگ لگ گئی اور شعلے آسمان کی طرف بلند ہونے لگے۔ اب میں نے چیخ چیخ کے مدد کے لئے پکارنا شروع کیا اور چیختے چیختے میری آواز بیٹھ سی گئی۔ کوئی شخص میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ کوئی میری مدد کو نہیں دوڑا۔ میں زندگی سے بالکل ناامید ہو گیا تھا اور میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا تھا لیکن مجھے پھر امید کی کرن نظر آئی۔ میں نے دیکھا میاں حق نواز جلدی جلدی ملبے کو ہٹاتے ہوئے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ میری جان میں جان آئی اور آگ کے پہنچنے سے پہلے میاں حق نواز میرے پاس پہنچ گئے تھے میں نے احساس ممنونیت کے ساتھ ان کے پاؤں کو چھو لیا۔ اور بڑی عاجزی کے ساتھ ان کی طرف دیکھنے لگا۔ انہوں نے لمحہ بھر کے لئے مجھے غور سے دیکھا اور پھر میری طرف جھکے، مجھے دونوں ہاتھوں سے سہارا دے کر ایک طرف پلٹ دیا اور میرے نیچے سے ایک اٹیچی کیس نکال کر تیز تیز قدموں سے گرتے پڑتے ملبے سے باہر نکل گئے —— آگ میرے چاروں طرف پھیل گئی تھی اور ممکن ہے میں آگ کی لپیٹ میں آنے سے پہلے سر پھوڑ کر مر جاتا مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ مجھے فوراً ہی امید کی ایک اور کرن نظر آ گئی۔

جٹّیاں[1]

شبیر افضل جعفری

ہونٹوں پہ رنگیں خاموشی — آنکھوں میں شرمیلی باتیں
چہروں پہ سے خوار سویرے — زلفوں میں مدھ ماتی راتیں
قامت پر، عارض پر، قرباں — سرو و سمن کی اونچی ذاتیں
ان کا مالا مال تبسم — جیت کو بخشے لال زکواتیں
باتوں میں مصری کی ڈلیاں — ان[2] کی جھاتیں بھی کھنڈراتیں
چاندی سے کانوں میں لٹکیں — سونے کی پیلی سوغاتیں
چوٹوں[3] پر کومل تاگے سے — پھولوں کی رنگیں برساتیں
باہیں ان کی نور کے تڑکے — چرخوں پر یہ کرنیں کاتیں
موسم کی جھولی میں ڈالیں — گیتوں کی میٹھی خیراتیں
شرمیلی نظروں سے کھلائے — نرگس کی مستی بھی ماتیں
تاروں پر منتر برسائیں — ان کی جادوگرنی گھاتیں

جوبن کی رکھوالی ہمیشہ
شرم و حیا کی پاک قناتیں

[1] جاٹنیاں [2] ان کے جلوے منہ میں کھانڈ ڈال دیتے ہیں [3] کرنوں

پیغامِ بے صدا

صفیہ شمیم

بحرِ ہستی کی موجِ بے پایاں
بارشِ نور، جلوۂ یزداں
عارضِ گل پہ صبحِ نو کی کرن
نوعروسِ بہار کا دامن
بادۂ آگہی، بہشتِ خیال
روح کا حسن، زندگی کا جمال
قدسیوں کا تبسمِ رنگیں
موجِ کوثر کا نغمۂ شیریں
رُخ پہ حوروں کے دل ربا شوخی
تابِ قوسِ قزح کی رنگینی
قلبِ فطرت کا نغمۂ ابدی
زندگانی کا شعلۂ ازلی
جلوۂ سادہ، جذبۂ معصوم
دل میں رقصاں، نگاہ سے معدوم
گلشنِ دل پہ بارشِ الہام
سازِ خاموش، بے صدا پیغام
روحِ پیغمبریؑ، دلِ جبریلؑ
شوق کی صبح، حسن کی قندیل

★

ماں!

ڈاکٹر تصدق حسین خالد

کھیت سوتے ہیں
فضا میں کرگسوں کا ایک جھنڈ
تیرتا آتا ہے، منڈلاتا ہوا
سوئے زمیں
آنکھ میں تنہائیوں کی وسعتیں

جھونپڑی میں ایک ماں
اک جواں افسردگی
سینۂ عریاں سے لپٹائے ہوئے
ایک جانِ ناتواں

آنکھ پُرنم، ہونٹ لرزاں
"پی، مری جاں پی،
جواں ہو،
منتظر ہے تیری قرباں گاہِ امن"

★

نفس و آفاق

عبدالعزیز خالد

نہیں کاغان و ہمالہ کے مناظر بھی مثیل — گو رگِ سنگ بھی ہے بہرہ ورِ سوزِ دروں
دلِ زندہ کے مچلتے ہوئے ارمانوں کے — ساز و برگ اس کا ہے اعجازِ مسیحائے بہار
اک طرف صنعت و ترصیعِ خداوندِ جلیل — ہے مرا دل بھی تو زخموں سے گلستاں بکنار
اک طرف معجزے اہلِ ہنر انسانوں کے — اس کا سرمایہ۔ مذاقِ خرد و ذوقِ جنوں

مری آنکھیں بھی ہیں سرچشمۂ خونناب رواں — اُن کی فطرت سے ہے نیرنگیٔ قدرت کا ظہور
ان کا آغوش بھی گہوارۂ کُہسار و چناب — نشہ میرا نہیں ممنونِ خرابات و سبو
آسماں پوش مری آہِ شبانہ کا دھواں — کوہ الوند کہ ہوں قاف کے برج و بارو
اُن کا دامن بھی ہے جولانگہِ رہوارِ سحاب — عظمت و حُسن کے باوصف جمادِ مجبور

رگِ نَے، رختِ صبا، شعلۂ طور، آتشِ گُل
تذکرہ زہد و ورع کا، ہوسِ مطرب و مُل
پاسِ پیمانِ وفا، صحبتِ یارِ سرِ پُل
ایک مجموعۂ اضداد ہے یہ نادرہ کار
دل کہاں اور کہاں سلسلہ ہائے کہسار
سنگِ یخ بستہ پہ ہے جن کی فضیلت کا مدار!

غزل

روشن صدیقی

سحر کا ذکر، رسمِ عام بھی ہے
مجھے فکرِ چراغِ شام بھی ہے

غنیمت ہے کہ اب مانوس ہم سے
مزاجِ گردشِ ایام بھی ہے

کوئی سمجھے تو حسن کامرانی
خلوصِ کوششِ ناکام بھی ہے

فقیہِ شہر سے کہہ دو کہ برحق
کتابِ چہرۂ اصنام بھی ہے

سنبھل اے بادہ خوارِ چشمِ ساقی
یہی وقتِ شکستِ جام بھی ہے

سمجھتا ہوں کہ زنجیرِ مشیت
مری آزادیوں کا نام بھی ہے

بس اے صورت گرِ حسنِ معانی
یہاں رعنائی ابہام بھی ہے

یہ دنیا اک صنم خانہ ہے لیکن
حریمِ شاہدِ بے نام بھی ہے

فروغِ حسنِ منزل کا بہانہ
غبارِ وادئ اوہام بھی ہے

سن اے نامحرمِ حسنِ تغافل
سکوتِ ناز اک پیغام بھی ہے

بہ صد بیتابی و درد آفرینی
محبت گوشۂ آرام بھی ہے

کوئی خاصانِ میخانہ سے کہہ دے
یہ ہنگامِ صلائے عام بھی ہے

تکلف برطرف، یہ کفرِ افکار
نکھر جائے تو پھر اسلام بھی ہے

روش کی پارسائی ہے فسانہ
نگاہِ ناز پر الزام بھی ہے

سراج الدین ظفر

میں نے کہا کہ تجزیۂ جسم و جاں کرو
اس نے کہا یہ امر سپردِ بتاں کرو

میں نے کہا بہار کی شب کا کوئی سراغ
اس نے کہا تعاقبِ لالہ رخاں کرو

میں نے کہا کہ یوسفِ دل ناخریدہ ہے
اس نے کہا کہ نذرِ زلیخا وشاں کرو

میں نے کہا کہ فاصلۂ شوق ہے عظیم
اس نے کہا شراب سے طے یہ مکاں کرو

میں نے کہا کشائشِ مشکل ہو کس طرح
اس نے کہا وظیفۂ اسمِ بتاں کرو

میں نے کہ صرفِ دل رائگاں ہے کیا
اس نے کہا کہ آرزوئے رائگاں کرو

میں نے کہا کہ عشق میں بھی اب مزا نہیں
اس نے کہا کہ از سرِ نو امتحاں کرو

میں نے کہا کہ بابِ مشیت میں کوئی حکم
اس نے کہا نہ اس میں چنیں و چناں کرو

میں نے کہا کہ خیر بھی ہے رسم، شر بھی رسم
اس نے کہا کہ ترکِ رسومِ جہاں کرو

میں نے کہا کہ ہم سے زمانہ ہے سرگراں
اس نے کہا کہ اور اسے سرگراں کرو

میں نے کہا کہ رخ سے اٹھاؤ نقابِ راز
اس نے کہا کہ ہم سے نہ دل بدگماں کرو

میں نے کہا کہ زہد سراسر فریب ہے
اس نے کہا یہ راز یہاں کم بیاں کرو

میں نے کہا غزل نے بچھایا ہے خوانِ لطف
اس نے کہا کہ دعوتِ روحانیاں کرو

میں نے کہا کہ حدِ ادب میں نہیں ظفر
اس نے کہا نہ بند کسی کی زباں کرو

عبدالحمید عدم

شفا میں ایک جراحت بھی پائی جاتی ہے
دعا میں شوخیٔ قسمت بھی پائی جاتی ہے

نظر اگرچہ تری اک ورق ہے سادہ سا
تری نظر میں حکایت بھی پائی جاتی ہے

ستم وہ کرتے ہیں گو صبح و شام، اسی میں مگر
درونِ پردہ عنایت بھی پائی جاتی ہے

وہ چیز کہتے ہیں جس کو سکونِ دل ہمدم!
کہیں وہ حسبِ ضرورت بھی پائی جاتی ہے

سنا ہے آپ کے رجحانِ طبع کے اندر
ہماری طرزِ طبیعت بھی پائی جاتی ہے

تمہاری مانگ تو سرکار ہے دو عالم میں
کہیں ہماری ضرورت بھی پائی جاتی ہے

کہے تو حال طبیعت کا کیسے کہے کوئی
کہیں حضورِ طبیعت بھی پائی جاتی ہے

تمام بات ہی مبہم نہیں مشیت کی
ذرا ذرا سی صراحت بھی پائی جاتی ہے

ہوس کے آئینہ خانے کو غور سے دیکھو
کہ اس میں شکلِ محبت بھی پائی جاتی ہے

تمہارا حسنِ تصور تو ہے ہر اک شے میں
کہیں تمہاری حقیقت بھی پائی جاتی ہے

یہ دل جو شکلِ جہنم ہے بے کلی میں عدم!
اسی میں صورتِ جنت بھی پائی جاتی ہے

سید جعفر طاہر

ہم سے ہوتے نہ زمانے میں جو دیوانے چند
ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتے کہیں ویرانے چند

ظلمتِ ہجر کی آغوش میں ہے شہرِ وصال
راہ میں یوں تو فروزاں بھی ہیں کاشانے چند

بن گئی شعلۂ صد رنگ طربگاہِ بہار
ہائے وہ دستِ حنا بستہ وہ پیمانے چند

کون یوں ذکرِ نگارانِ حرم کرتا تھا
کاش دیتے جو دکھائی کہیں بتخانے چند

تتلیاں بن کے اڑے، لالہ و گل بن کے ملے
توڑ کر پھینک دیئے ہم نے جو پیمانے چند

شرم سے آنکھ اٹھاتی ہی نہیں شمعِ جمال
جان پر کھیل کے پہنچے تو ہیں پروانے چند

موجِ نشہ تری ہر لغزشِ مستانہ ہے
لیکن اس راز کو سمجھے بھی تو مستانے چند

سببِ ولولۂ موجِ صبا ہم سے سنو
رخ ہوا کا تو بتا دیتے ہیں فرزانے چند

آرزو ہے کہ ترا بندِ قبا ہاتھ آئے
ہیں غمِ دہر کے عقدے ابھی سلجھانے چند

شاعرو، نغمہ گرو، دیدہ ورو کچھ تو کرو
غم ہزاروں ہیں مگر نام کے میخانے چند

اتنا رسوا تو نہ تھا شہر میں جعفر طاہر
اب جہاں پہنچا وہیں چھڑ گئے افسانے چند

شان الحق حقی

سب جلوے ہو چکے وہ ہماری نظر کے خواب
یہ دیکھتی ہے چشمِ تمنا کدھر کے خواب
گرویدہ ہو گئے مرے ذوقِ نظر کے خواب
چھوڑینگے چشمِ شوق کو دیوانہ کر کے خواب
سو رنگ سے نگاہ میں آئے سنور کے خواب
بکھرے ہیں دل کے خون سے کیا کیا نظر کے خواب
آنکھ اب بھی دیکھتی ہے تری رہگزر کے خواب
جلووں سے جس کے گرد مرے عمر بھر کے خواب
ایسا بھی تھا کبھی کہ شبِ ماہتاب میں
میری نظر میں بھی تھے کسی کی نظر کے خواب
دیکھے کوئی شباب کی آسودہ خوابیاں
اللہ رے اس ایک شبِ مختصر کے خواب!
ساقی یہ شرط ہے کہ زمانے کی ضد پہ ہم
رکھ دیں ہر ایک تلخ حقیقت کو کر کے خواب
ہو جیسے آئینے سے خجل حسن بے حجاب
یوں بھاگتے ہیں میری نگاہوں سے ڈر کے خواب
آئینہ ہو گئیں تری نظروں کی شوخیاں
افسانہ بن گئے، مری حیراں نظر کے خواب
کیا کہئے اس جراحتِ پنہاں کی لذتیں
دل کے فسردہ زخم ہوئے ہیں نکھر کے خواب
اس طرح دل میں تیری تمنا ہے آج بھی
جیسے نگاہِ گل میں طلوعِ سحر کے خواب
یاد آ رہی ہے صحبتِ یارانِ ہم سخن
چونکا رہے ہیں دشت میں دیوار و در کے خواب
ہے مجھ کو آج بھی ترے وعدوں پہ اعتبار
کچھ رہ گئے ہیں خواب کی حد سے گزر کے خواب
گم ہو گئے ہیں آہ وہ جلوے کہ جن کا اب
نظارہ جیتے جی ہو میسر نہ مر کے خواب

ادیب سہارنپوری

توجہ کے تری قابل کہاں ہم
یونہی ہوتے رہیں گے رائگاں ہم
پریشاں کیوں ہیں اے دورِ زماں ہم
نہیں مہر و نجوم و کہکشاں ہم
محبت فاصلے کم کر رہی ہے
وگرنہ تم کہاں تھے اور کہاں ہم
تماشا ہیں، تماشائی نہیں ہیں
زمین و آسماں کے درمیاں ہم
خفا اس جرم پر ہم سے ہیں گلچیں
سمجھتے کیوں ہیں پھولوں کی زباں ہم
برت ہم سے نہ یہ بے اعتنائی
متاعِ باغ ہیں، اے باغباں ہم
سبک کیا تیری نظروں میں ہوئے ہیں
کہ جیسے ہوں دو عالم پر گراں ہم
خدارا یوں نہ اٹھلاتی ہوئی چل
بہت اے موجِ گل ہیں سرگراں ہم
نگاہیں تک نہ اٹھیں ان کے آگے
بہت مشہور تھے جانِ بیاں ہم
ادیب اُن سے جو مل جاتی ہیں نظریں
تو پھر رہتے ہیں آپے میں کہاں ہم

اپنے لئے بہتر زندگی کا انتخاب کریں

ٹھیک کھائیں ٹھیک جئیں

ہمارے شاعر تو زخم دل کھانے اور خون جگر پینے ہیں لیکن دوسرے تو ایسا کرنے سے رہے - انہیں تو کھانا بھی ہے اور پینا بھی - اگر کھائیں پئیں نہیں تو جئیں کیسے ؟ مگر سچ پوچھئے تو کھانے کا ڈھب انہیں بھی نہیں آتا - جو نظر آیا اور جب جی چاہا، کھالیا - بس اسی میں خوش ہیں کہ پیٹ تو بھر لیا - چٹپٹی چیزیں کھا کر مزا تو آگیا - زبان پر پھپھولے ہی کیوں نہ پڑ جائیں اور آنتیں چھلنی چھلنی ہی کیوں نہ رہیں - یونہی الابلا کھا لینے سے کیا بنتا ہے - کھانا بھی ضائع اور فائدہ بھی کچھ نہیں - اس سے صحت بنتی کم اور بگڑتی زیادہ ہے - آخر یہ ستم ظریفی کیوں ؟ آئیے ہم اپنی ضرورتوں کو سمجھیں اور جو کچھ کھائیں سوچ سمجھ کر کھائیں -

پہلے ایک گر سن لیجئے جو سو گروں کا ایک گر ہے : **ٹھیک خوراک، ٹھیک وقت، ٹھیک مقدار، ٹھیک طریقہ۔**

ٹھیک خوراک : اچھی خوراک وہی ہے جو ہلکی پھلکی، سیدھی سادی ہو، جلد ہضم ہوجائے، معدہ پر بوجھ نہ ڈالے، طاقت بڑھائے، چست و چاق اور کام کاج کے لائق بنائے، بیماری نہ پیدا کرے - اس کے ساتھ ہی جسمانی ٹوٹ پھوٹ کی مرمت بھی کرتی رہے، اور زہریلے فاسد مادوں کا اثر زائل کرے - ایسی خوراک وہی ہوسکتی ہے جس میں غذائی قوت ہو -

آئیے ہم مختلف قسم کی غذاؤں پر ایک نظر ڈالیں -

پروٹین: ان سب میں نائٹروجن پائی جاتی ہے - مثلاً گوشت ، انڈے ، دودھ ، پنیر ، مچھلی - یہ چیز دالوں ، مٹر ، سیم ، اور اناج میں بھی پائی جاتی ہے - اس کے دوسرے جزو ہیں : کاربن ، آکسیجن ، ہائیڈروجن ، گندھک اور کبھی کبھی فاسفورس بھی -

کام : یہ چربی اور نشاستوں کی طرح قوت پیدا کرتی ہیں، لیکن ان کا خاص کام ، جو صرف یہی انجام دے سکتی ہیں، گوشت بنانا ، عضلات وغیرہ کو بڑھانا اور جسم کی ٹوٹ پھوٹ کو دور کرنا ہے -

غلیظ ماحول میں غلط کھانا

کاربوہائیڈریٹ : کاربن ، ہائیڈروجن اور آکسیجن کے مرکب مثلاً نشاستہ اور سکر ۔ نشاستہ ہضم ہوکر سکر بن جاتا ہے ۔ یہ مرکب چیزیں بہت جلد ہضم ہو جاتی ہیں اور جسم میں قوت و حرارت پیدا کرتی ہیں ۔ مثالیں : اناج، دالیں ، چاول ، میٹھے پھل اور میوے ۔

چربی : یعنی چکنی چیزیں ۔ مرکب کاربوہائیڈریٹ جیسی ، لیکن آکسیجن کی مقدار نسبتاً کم چنانچہ یہ ان کی جگہ بھی جاسکتی ہیں ۔ مثالیں : دودھ ، مکھن ، گھی ، تیل ، وغیرہ ۔

نمک یا دھاتیں: مثلاً سودیم ، پوٹاشیم ، کیلسیم ، میگنیشیم ، فولاد وغیرہ ۔ یہ تندرستی کے لئے ضروری ہیں اور تھوڑی بہت ہر غذا میں پائی جاتی ہیں ۔ مثلاً سبزی ، ترکاری ، پھل اور ساگ وغیرہ ۔ لوہا خون کے سرخ ذروں کو بڑھاتا ہے اور کیلسیم سے ہڈیاں اور دانت بنتے ہیں ۔

پانی: یہ زندگی کے لئے اشد ضروری ہے ۔ خوراک کے ہضم ہونے میں مدد دیتا اور خون کو مائع حالت میں رکھتا ہے تاکہ وہ جسم میں آسانی سے دورہ کر سکے ۔ انسان میں ٦٥ فی صد وزن پانی ہی کا ہوتا ہے ۔

حیاتین یا وٹامن: یہ وہ جوہر ہیں جو غذا کو بہترین شکل میں کام دینے کے لئے لازمی ہیں ۔ ان سے جسم تندرست رہتا ہے اور بیماریاں دور ہوتی ہیں ۔ یہ خام طور پر تازہ پھلوں ، دودھ ، مکھن ، انڈے ، ساگ ، ٹماٹر وغیرہ میں پائے جاتے ہیں ۔ ان کی بہت سی قسمیں ہیں جن کو اے ، بی ، سی ، ڈی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے

پیسے بھی دیں اور بیماری بھی مول لیں !

بعض حیاتین کے نہ ہونے سے "کمی کی بیماریاں" مثلاً بیری بیری (فیل پا) ، کھجلی وغیرہ ہو جاتی ہیں ۔ زیادہ دیر آنچ سے ان کا اثر زائل ہو جاتا ہے ۔

ہم لوگ اپنے کھانے میں روٹی ہی سے بسم اللہ کرتے ہیں ۔ کیوں نہ ہو ، دانئہ گندم ہی تو انسان کی پہلی کمزوری تھی، اور ہے ۔ اس کی جسمت ایندھن کی سی ہے ، جس سے حرارت پیدا ہوتی ہے اور جو جسم کو گرم اور زندہ رکھنے کے کام آتی ہے ۔

نشاستہ کی چیزوں کو بہت زیادہ مقدار میں بھی کھایا جائے بات ایک ہی ہے ۔ وہ ہیں تو ایندھن ہی مگر ان کا کھانا بڑا ضروری ہے ۔ مگر ایک بات ہے ۔ ان کو ایسی شکل میں کھایا جائے کہ جلد ہضم ہو جائیں ۔ کمی بیشی کی بات ہے کہ ہم کھاتے تو ہیں لیکن جو چیز

اس میں کارآمد ہے۔ اس کو پھٹک دیتے ہیں یعنی بھوسی - اس میں نہ صرف چھلکے کے اعلیٰ غذائی جوہر ہوتے ہیں بلکہ یہ غذا کے لطیف جزو اخذ کرنے اور فضلے کو انتڑیوں سے گزرنے اور ان کو صاف رکھنے میں مدد دیتی ہے - اس لئے بن چھنے آٹے ہی کی روٹی کھانی چاہئے اور ہر حال میں موٹا آٹا ہی اچھا رہیگا - باریک آٹا، جس کو میدہ کہتے ہیں، معدہ اور ہاضمہ کی نالی کی نازک جھلی میں کھپ بھی جاتا ہے اور اس پر جم بھی جاتا ہے جس سے ان کا فعل ہی بگڑ جاتا ہے - گندم، جو، وغیرہ کو دانے کی صورت میں کھایا جائے تو وہ بہت مفید ثابت ہوتا ہے - آٹے یا سوجی کو خمیر کر کے پکایا جائے یا ڈبل روٹی بنا کر کھایا جائے تو وہ بھی بہت زود ہضم رہتا ہے -

میٹھا انسانی نشو و نما کے لئے ضروری ہے، لیکن اس کو مٹھائیوں کی شکل میں کھانا بہت مضر ہے - چینی کو انسانی نسل کا سب سے بڑا دشمن کہا گیا ہے کیونکہ اس میں عمدہ جوہر نہیں ہوتے اور اس کو جذب کرنے کے لئے جسم کو حد سے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے - یہی وجہ ہے کہ مٹھائیاں ہاضمہ پر بہت برا اثر ڈالتی ہیں - خصوصاً اس قسم کی گرد آلود اور مکھیوں کی پوٹ مٹھائیاں جو ہمارے بازاروں میں عام فروخت ہوتی ہیں - وہ در اصل مٹھائیوں کی شکل میں زہر ہیں - میٹھے کی ایک نہایت مفید شکل شہد ہے جس میں اعلیٰ درجے کی حیاتین بھی پائی جاتی ہیں -

سبزیاں ہاضمہ کے لئے بہت مفید ہیں - ان سے پیٹ صاف رہتا ہے، معدی نالی پر زور نہیں پڑتا - یہ فضلے کو خارج کرنے میں بھی مدد دیتی ہیں - پتوں والی سبزیاں مثلاً ساگ اور میتھی، بند گوبھی وغیرہ بھی بہت مفید ہیں - ان میں لوہا پایا جاتا ہے جو بڑی کام کی چیز ہے - زمین کے نیچے اگنے والی جڑیں، مثلاً شلغم، مولی، گاجر وغیرہ بھی بڑی مفید ہیں -

دودھ ایک بڑی مکمل غذا ہے - کیونکہ اس میں سب قسم کی حیاتین یکجا پائی جاتی ہیں - یہ چھوٹی عمر کے بچوں کو موافق آتا ہے - لیکن دیکھا گیا ہے کہ بڑی عمر کے لوگوں کے لئے یہ اکثر مفید ثابت نہیں ہوتا - اسی لئے بعض لوگ اس کو غیر مساوی طور پر ترش کر کے پینے پر زور دیتے ہیں - دودھ غٹاغٹ پینے کے بجائے گھونٹ گھونٹ پینا چاہئے تاکہ معدہ میں پہنچنے سے پہلے منہ کی ہاضم رطوبتیں اس میں اچھی طرح مل جائیں -

[illegible] کھانے کو [illegible] ہے - اور ہاضم رطوبتوں کو اس پر [illegible] پورا [illegible] ہیں [illegible]

تو پھر ٹھیک غذا کونسی ہے؟ ——

وہی جس میں تمام ضروری غذائی جزو موجود ہوں اور انہیں اس طرح کھایا جائے کہ غذائیت کو نقصان نہ پہنچے، جیسا کہ غلط طریقے پر پکانے اور ضرورت سے زیادہ بھوننے یا تلنے سے ہوتا ہے۔ غذا عمر اور ضرورت کے مطابق ہونی چاہئے۔ مختلف قسم کے کام کرنے والوں کی غذا بھی مختلف ہونی چاہئے۔

ٹھیک مقدار: کھانا اعتدال سے کھانا چاہئے بعض لوگ کھاتے ہیں تو اتنا کہ - اس میں احتیاط لازم ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارے ایک ظریف شاعر نے ہاتھ کی روانی پر جو نظم لکھی ہے وہ انہیں پر صادق آجائے!

ٹھیک طریقہ: کھانا وقت وقت سے کھائیں۔ اور اس وقت جب طبیعت اس کا پورا
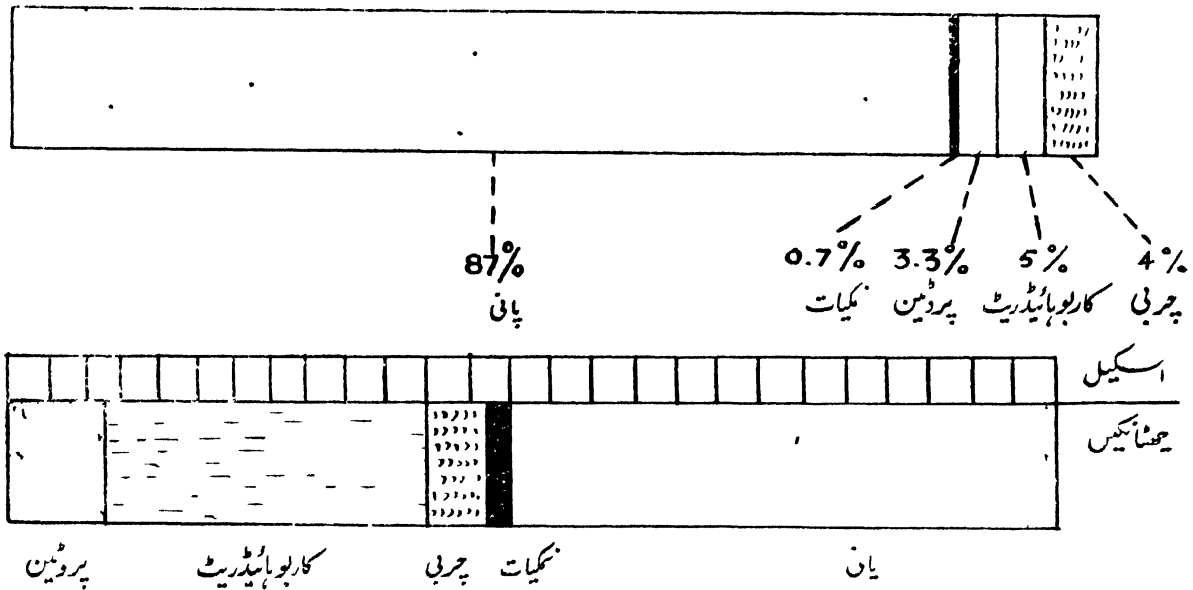
نقشہ ۶ — ٹھیک غذا کے جزو

مطالبہ کرے۔ کسی نہ کسی وقت ورزش اور کھیل کود بھی لازم ہے۔ کھانا خوب چبا چبا کر کھانا چاہئے تاکہ دانتوں کا کام آنتوں کو نہ کرنا پڑے۔ کھانا بڑی خوشی اور رغبت سے کھانا چاہئے اور بڑے سکون اور ستھرے ماحول میں۔ غم، غصہ، پریشانی اور جھنجھلاہٹ سے ہاضمہ بگڑ جاتا ہے۔ پانی صاف ستھرا پینا چاہئے اور اگر یہ گدلا اور بھاری ہو تو ابال کر پینا چاہئے۔ زیادہ گرم یا سرد چیزیں نہ کھائیں اور نہ ایک وقت سرد و گرم چیزیں ملا کر کھائیں *

کھانے کو لذیذ بنانے کے لئے مسالے بھی برتے جاتے ہیں۔ اگر یہ زیادہ تیز ہوں تو نقصان دہ ثابت ہوں گے۔ جو لوگ مرچیں، چٹنیاں، اچار، سرکہ زیادہ استعمال کرتے ہیں وہ اپنے ہاتھوں زندگی کی جڑیں کھودتے ہیں۔

ٹھیک وقت: بعض لوگ وقت بے وقت کھاتے ہی رہتے ہیں جب دیکھو منہ چل رہا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ بار بار کھانے سے ہاضمے کے قویٰ پر بار پڑتا ہے۔ کیونکہ معدے اور معدی نالی کو آرام کا موقع نہیں ملتا۔

بھی شامل تھیں ۔

سر چارلس نیپیئر، فاتح سندھ، یہاں کا پہلا گورنر تھا جس کی توجہ سے کراچی نے بہت ترقی کی۔ اس نے نہ صرف شہر کا رقبہ بڑھایا بلکہ بندرگاہ میں بھی توسیع کی، محکمہ حفظان صحت کا انتظام بھی کیا جو اس کا ایک اہم کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

کھاڑی کے ساحل کی تعمیر اور اس سے مضافات کراچی کا الحاق یعنی اس رقبہ میں کیماڑی کی شمولیت شہر کی توسیع کا پہلا اقدام تھا ۔

نیپیئر روڈ کی تعمیر نے، جس کا تعلق براہ راست بندرگاہ سے تھا، کاروبار تجارت میں بڑی سہولت پیدا کر دی تھی جو پہلے مفقود تھیں۔ کراچی بہت عرصہ سے پہلے کمشنر سندھ کا مستقر قرار دیا گیا جو پورے صوبے کا ناظم تھا۔ اس طرح تمام دفاتر یعنی محکمہ جات مال، عدالت، تعمیرات وغیرہ یہاں منتقل ہو گئے اور حیدرآباد (سندھ) کی اہمیت کم ہو گئی۔

۱۸۳۸ء میں انگریزوں کا کراچی پر قبضہ ہوا۔ لارڈ آک لینڈ کے زمانہ میں امیر دوست محمد خاں والئی کابل سے جنگ چھڑ گئی۔ تالپوری حکمراں طاقتور نہ تھے۔ سر جان کین صدر کمشنر صوبہ بمبئی، کو حکم دیا گیا کہ سندھ پر فوراً ہلّہ بول دیا جائے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اس بندرگاہ کا قدیم باب الداخلہ ۱۶۹۹ء کے زلزلہ کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ اس لئے یہ تمام فوج "منوڑا" پار لنگر انداز ہوئی اور یکم فروری ۱۸۳۹ء کو اسی مقام کے ایک چھوٹے سے قلعہ پر بغیر کسی پر گولی چلائے قبضہ ہو گیا مگر پھر صلح ہو گئی، جس کی رو سے منوڑا پر، جو گویا کراچی کا دل ہے، برطانوی فوج عارضی طور پر قابض رہی۔ چند سال بعد سرکاری طور پر انگریزوں کا پوری کراچی پر قبضہ ہو گیا ۔

۱۸۴۲ء میں سر چارلس نیپیئر اور دریائے سندھ کے نشیبی علاقہ کی حکومتوں کے درمیان دوستانہ صلح ہو گئی۔ جس کے مطابق کراچی اور چار دوسرے شہر جو دریائے سندھ کے کنارے پر واقع تھے، ہمیشہ کے لئے برطانیہ کے حوالے کر دئے گئے ۔

ان فتوحات کی یادگار میں سر چارلس نیپیئر نے ۱۸۴۹ء میں ایک مینار بنایا۔ اور گورنمنٹ ہاؤس کراچی کے ایک حصہ میں ایک "کھڑکی" گرجا گھر میں جنرل نیپیئر اور جنگ میانی کے فاتحین کی یاد میں بنائی گئیں ۔

بندرگاہ

"کروکالا" بحر ہند کا وہ پہلا بری مقام ہے جہاں یورپی بیڑہ آیا تھا۔ اس کا طول البلد ۶۷،۱۸،۰۰ مشرق (گرینویچ)، اور عرض البلد شمالی ۵۰، ۲۴ ہے ۔

کراچی کی کسی صحیح تاریخ کا پتہ نہیں چلتا، لیکن ڈاکٹر ولیم ونسنٹ (ڈین ویسٹ منسٹر) نے اپنی تالیف "بحر ہند میں قدماء کے تجارتی راستے اور بحری سفر" میں لکھا ہے کہ "میں اس خلیج کا ایک خاکہ پیش کرتا ہوں جس سے اطمینان بخش طریقہ پر واضح ہو جائیگا کہ بحر ہند کی وہ سب سے پہلی بندرگاہ کونسی تھی جہاں بیڑہ لنگر انداز ہوا" اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا یورپی بیڑہ ۳۲۶ ق م میں یہاں آیا تھا اور دریائے فرات کے دہانہ کی طرف سے دریائے سندھ کے دہانہ کی طرف پہنچا تھا۔ یہ ۲ اکتوبر ۳۲۶ ق م کو "کروکالا" کے مقام یعنی مضافات کراچی میں پہنچ گیا تھا۔ اور دوسرے ہی دن واپس ہو گیا تھا۔ کروکالا اور کراچی نیز کیماڑی کے متعلق بعض مسائل مابہ النزاع ہیں بعض مصنفین نے اسکو بندرگاہ سکندر سمجھا ہے بعض کا بیان ہے کہ قدیم زمانہ میں سندھ کا ایک ضلع کروکالا کے نام سے موسوم تھا۔ بہر حال یہ امر مسلمہ ہے کہ کراچی دریائے سندھ کے کسی معاون کے کنارے کبھی واقع نہیں تھا اور دریائے سندھ کے دہانے کی تبدیلیوں کی وجہ سے کوئی خاص بات پیدا نہیں ہوئی۔ راس مواری ایک قدرتی طور پر سنگلاخ زمین ہے۔ اور راس منوڑا کی شکل بالکل جداگانہ ہے ۔

بعد کے ماہرین مساحت نے لکھا ہے کہ یہ تنگ کنارہ صاف اور چکنی چٹان کی ایک روک ہے، جو خصوصاً ریتیلی ہے لیکن اس میں ریتیلی چٹانوں کے ٹکڑے، گول پتھر، سنگریزے اور کیچڑ موجود ہے۔ لفٹنٹ کمانڈر کارلس نے کراچی بندرگاہ کے متعلق ۱۸۳۸ء میں جو سروے رپورٹ پیش کی تھی اس میں بیان کیا ہے کہ تقریباً ۸۰ سال سے یہ بندرگاہ موجودہ مقام کے بجائے مغربی جانب، پانچ چھ میل کے

فاصلہ پر اسی جگہ واقع تھی جہاں اب ایک بڑی کم گہری جھیل سندھ سے علیحدہ ہو کر وجود میں آگئی ہے اور وہاں اب ایک ریت کا "ٹیلہ بن گیا ہے۔ اس زمانہ میں یہ ٹیلہ عام طور پر "آدرنگا بندر" کے نام سے موسوم تھا۔ آج کل اس مقام کو "اورنگی" کہتے ہیں۔ ہسندو باشندے اس کو "رام باغ" کہا کرتے تھے۔ ان کی قدیم ترین کتابوں اور کاغذات میں اس کو اسی نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اور اب تک اسی طرح مشہور ہے اور بول چال میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ شہر بہت بڑا تھا، آبادی کثیر تھی اور اس کا نام "کرک" تھا یعنی یہ موجودہ نام "کراچی" اسی سے مشتق ہے۔ اس بیان کے مطابق بندرگاہ کا باب الداخلہ "منوڑا" کے ریتیلے ٹیلے کے شمال مغربی جانب تھا اور اس کی تجارت کا مرکز نوانار یا نوانال ہوگا جہاں مذکورہ بالا مقام کرک واقع ہوگا۔

اسی مورخ نے بیان کیا ہے کہ سخت بارشوں کے باعث بہت سے سیلاب آئے جو ریتیلے تودوں کو بہا لے گئے جو ریت رفتہ رفتہ اس مقام کے سامنے کے حصہ میں جمع ہو گئے۔ بالآخر یہ حصہ اسقدر وسیع ہو گیا کہ پانی کے بہاؤ کا رخ پرانی بندرگاہ کے بجائے نشیبی پہاڑیوں کے سلسلہ کے کسی کشادہ حصہ کی طرف ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم بندرگاہ کا باب الداخلہ جلد بند ہو گیا۔ اس طرح "کرک" کا قصبہ ویران ہو گیا اور اس کے بجائے موجودہ "کراچی" کی سرزمین ظہور میں آئی۔ ایک اور روایت یہ ہے کہ گذشتہ صدی کے وسط میں کسی زلزلہ کی وجہ سے یہ باب الداخلہ مسدود ہو گیا اور "منوڑا" اور گھوگھوں کی چٹانوں کے درمیان موجودہ باب الداخلہ کھل گیا۔

یہ روایت کسی بزرگ درویش کی طرف بھی منسوب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کسی شریرالنفس انسان کو جو نوانال کا مکھیا تھا بد دعا دی تھی۔ اور ایک زبردست زلزلہ آیا تھا، جس میں پچاس ہزار آدمی ہلاک ہو گئے تھے اس طرح یہ بندرگاہ بند ہو گئی۔ اگر بمبئی میں جو یہاں سے صرف آٹھ سو میل دور ہے، اس کے متعلق مسلسل مراسلت ہوئی، تو کیا پچاس ہزار باشندوں کی ہلاکت کی اطلاع آس پاس کے شہروں میں نہیں پہنچی۔ اور اس کے اثرات وہاں محسوس نہیں ہوئے؟ قیاس ہے کہ اس کی اطلاع بمبئی کے گورنر کو ۱۸۷۵ء میں پہنچ گئی تھی۔

مگر لبتاً قریب تر زمانہ یعنی ۱۸۶۴ء میں اس زلزلہ کے متعلق معتمد محکمۂ تعمیرات عامہ کو چیف انجینئر، سندھ، سے دریافت کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی تھی۔ اور یہ بھی استفسار کیا گیا تھا کہ تقریباً ایک سو بارہ سال قبل بھی کسی زلزلہ کے آنے کی روایت صحیح ہے یا غلط۔

کمانڈر کارلس نے اس کو ۱۸۳۵ء سے تقریباً ۸۰ سال قبل اور معتمد تعمیرات عامہ نے ۱۸۶۴ء میں اس کو ۱۱۲ سال قبل کا زلزلہ شمار کیا ہے۔ یہ تقریباً وہی زمانہ ہے جبکہ سمندر کے تلاطم نے بندرگاہ کا نیا دہانہ بنایا تھا اور زلزلہ آیا تھا۔ ان دونوں میں ایسی مطابقت ہے کہ یہ زلزلہ ایک ہی واقعہ معلوم ہوتا ہے۔

کرنل ٹرمین ہیبرے نے اس کے متعلق ثبوت فراہم کیا ہے۔ لیکن قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ کبھی یہاں یا بندرگاہ کے باب الداخلہ کی طرف زلزلہ آیا تھا۔ لیکن اس زمانہ کے گورنر، سر بارٹل فریر نے ان دلائل کی تردید کی ہے۔ اور اس قیاسی روایت کو کوئی وقعت نہیں دی۔ اس نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ مجھے پرانے شہر کے کھنڈرات کی دریافت میں کوئی دقت نہیں ہوئی چنانچہ قدیم قبرستان تو بہت دور سے نظر آتا تھا۔

کلفٹن: پتھروں اور چٹانی سلسلوں سے ملا ہوا ساحل ہے۔ جو پہلے سطح سمندر سے تقریباً ۔ فٹ نشیب میں تھا۔ ظاہر ہے کہ پانی کے اتار کے وقت کوئی بڑا جہاز اسقدر کم گہرائی میں نہیں گذر سکتا تھا۔

یہ مسلمہ ہے کہ یہاں تقریباً سو فٹ چوڑی نہر "نوانال" موجود تھی اور جو کشتیاں مسقط (عرب) سے یہاں آیا کرتی تھیں ان کو ملاح رسیوں سے دونوں طرف باندھ کر چلایا کرتے تھے۔ بہت ممکن ہے کہ مغربی نہر کے بند ہو جانے کے کچھ عرصہ بعد دریائے
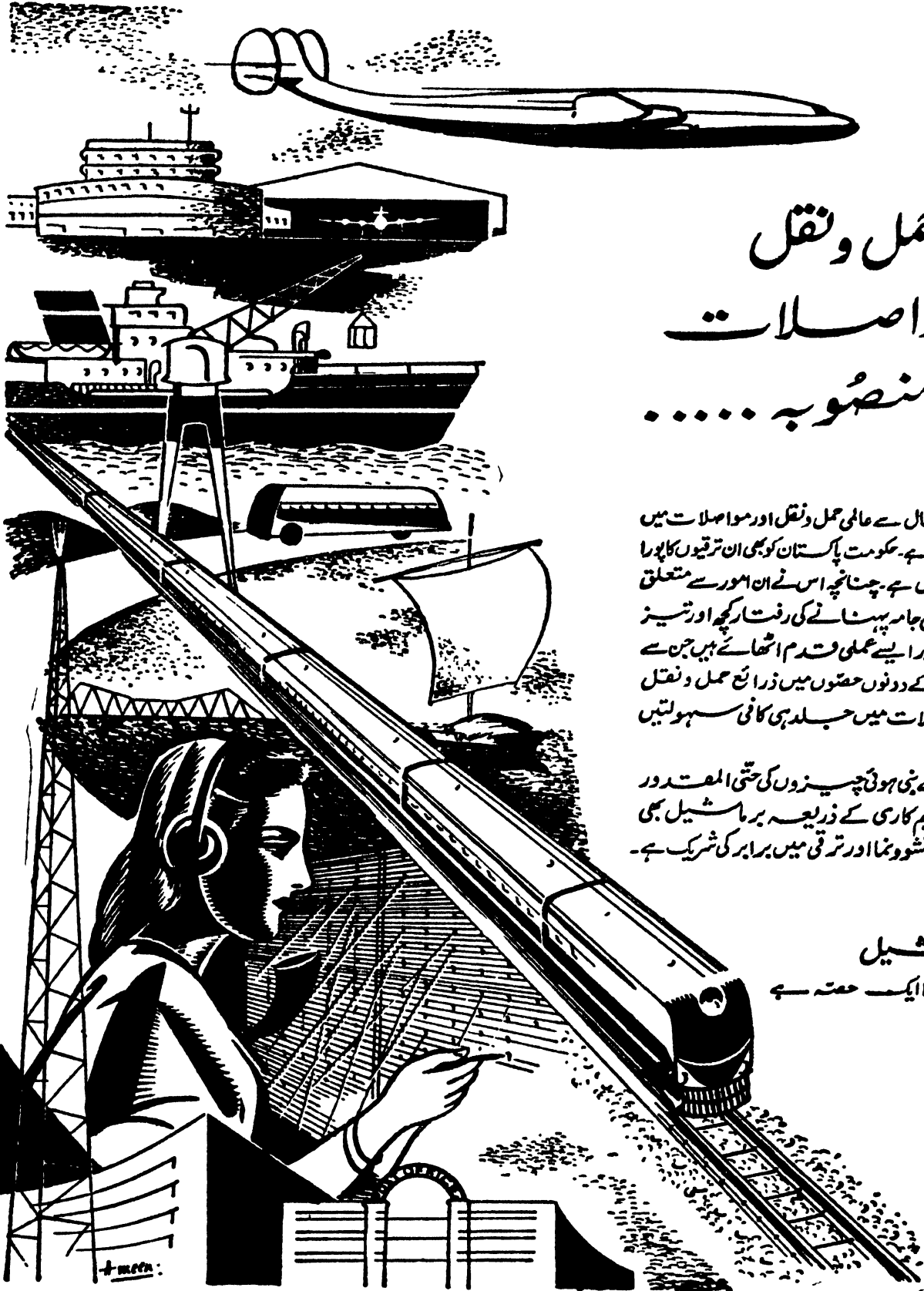
حمل ونقل
اورمواصلات
کا منصوبہ .....
گذشتہ چند سال سے عالمی حمل ونقل اور مواصلات میں
کافی ترقی ہوئی ہے۔ حکومت پاکستان کو بھی ان ترقیوں کا پورا
پورا احساس ہے۔ چنانچہ اس نے ان امور سے متعلق
منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی رفتار کچھ اور تیز
کردی ہے اور ایسے عملی قدم اٹھائے ہیں جن سے
پاکستان کے دونوں حصّوں میں ذرائع حمل ونقل
اور مواصلات میں جلد ہی کافی سہولتیں
ہو جائیں گی۔
پٹرولیم سے بنی ہوئی چیزوں کی حتی المقدور
باکفایت تقسیم کاری کے ذریعہ برماشیل بھی
پاکستان کی نشوونما اور ترقی میں برابر کی شریک ہے۔
برماشیل
ترقی پاکستان کا ایک حصّہ ہے

ٹیلی گرام بقیہ صفحہ ۲۳

وہ دھیرے سے مسکرا کر بولے "آئس کریم ابھی چائے کے بعد کھائی ہے۔ پانی پی پی کر تو تھک گیا ہوں"۔ میں نے آنکھیں جھکا کر کہا
لیٹ جائیے، میں سر دبا دوں"۔
یہ سنتے ہی فوراً اپنی سیٹ پر لیٹ گئے اور میرے دوپٹہ کا آنچل اپنے ہاتھ میں لے کر ذرا نرم سے فرمانے لگے: "یہ صندلی
دوپٹہ میرے سر سے باندھ دو!"

مصوری کی پہلی کل پاکستان نمائش بقیہ صفحہ ۲۴

اظہار کے سبب کافی امتیاز جھلکتا تھا۔ اس کی دونیلے سے بنائی ہوئی تصویر "سنگھار" کو تیسرا انعام ملا۔
مشرقی پاکستان کے اکثر مصوروں پر ڈھاکہ آرٹ اسکول کے پرنسپل "زین العابدین" کا گہرا اثر ہے۔ وہ بصیرت اور پختگی میں دوسروں پر نمایاں فوقیت رکھتے ہیں۔ لیکن نمائش میں ان کی ابتدائی زمانے کی صرف دو تصویریں ہی موجود تھیں۔ ان میں سے روغنی تختے "دستکاری" جس میں سنتھالی عورتیں سکونہ بیز شاخوں کے سامنے کھڑی دکھائی دیتی ہیں، ان شاہکاروں میں شامل تھا جس کو بے حد سراہا گیا۔
چغتائی اور اللہ بخش جیسے استاد بجائے خود ایک دبستاں ہیں۔ چنانچہ ان کے کتنے ہی شاہکار ان کی کماحقہ نمائندگی کر رہے تھے۔ اللہ بخش کی روغنی تصاویر پنجاب کے دیہاتیوں کی زندگی کا بڑا صحیح اور واقعاتی نقشہ پیش کرتی ہیں۔ اُدھر چغتائی اپنی خیالی دنیا میں کھویا ہوا خواب نما انسانوں اور مناظر کا تصور کرتا ہے اور نرم نرم آبی رنگوں اور سیاہ و سفید کندہ کاری میں ان کی پُر لطف کیفیت پیش کرتا ہے۔

اکھاڑہ بقیہ صفحہ ۳۵

زینت اکیلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد لوٹی تو اس کی آنکھوں میں دو آنسو اور ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اس نے کہا "اپیل کر دو، شرابا مان گیا ہے۔ اگر اس کے بیان کی ضرورت ہوئی تو وہ ہماری مرضی کے مطابق بیان دے گا"۔
لیکن بیان کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اپیل ہوئی تو ہائی کورٹ نے ڈاکٹر کی رپورٹ کافی سمجھی۔ استغاثہ کے تین گواہوں کے مقابلہ میں صفائی کے آٹھ گواہ تھے۔ ہائی کورٹ نے فیصلہ دے دیا "مقتول کو کتے نے مارا ہے۔ ملزم کو بری کیا جاتا ہے"۔
دو روز بعد استاد کامو کے اکھاڑہ کی فضا ایک بار پھر ڈھولوں کی گونج سے مرتعش ہوئی۔ یہ میٹھی عید کی شام تھی۔ اکھاڑے کے اردگرد، زمین پر، درختوں اور منڈیروں پر، ٹرکوں اور بسوں کی چھتوں پر آدمی ہی آدمی دکھائی دے رہے تھے۔ "بھاٹی دروازے" کا ہانو اکھاڑے میں اتر چکا تھا۔ شرابے نے زندگی میں پہلی بار کھل کر اور بلند آواز سے کہا "یا علی" اور کود کر اکھاڑے میں آ گیا۔ اس کے پیچھے استاد کامو آیا اور اس کی پیٹھ تھپکائی۔ شرابے کو جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ اس نے گھوم کر پیچھے دیکھا اور اکھاڑے سے نکل کر تماشائیوں کی طرف چل پڑا جہاں نیاز بیٹھا ہوا تھا۔ نیاز کے پاس پہنچ کر شرابے نے اس کے گھٹنے چھوئے، ہاتھ ملایا اور اکھاڑہ میں آ کر بائیں طرف ایک دو منزلہ مکان کی کھڑکی کی طرف دیکھا جہاں سے ایک نرم و گداز مرمریں بازو ہل رہا تھا۔ شرابا مسکرایا اور بڑھ کر حریف سے ہاتھ ملایا۔
بھاٹی دروازے والے جو ڈھول بجاتے ہوئے آئے تھے، ڈھول پیٹھ پیچھے لٹکا کر لوٹ گئے۔ اور مزنگ والے اکھاڑے کے ڈھول رات بھر بجتے رہے۔ پھر یہ ڈھول خاموش نہ ہوئے۔ دوسرا دن، تیسرا دن اور چوتھے روز ڈھولوں کی آواز اور باجوں کے شور و غوغا میں شرابا اور زینت ایک ہو گئے۔
اور استاد کامو کے اکھاڑے کی نرم و ملائم مٹی نے ایک اور واردات کو جنم دے کر اپنے اندر جذب کر لیا۔

ماہ نو، کراچی، دسمبر ۱۹۵۷ء

۱۵۰۰۰

ذیل پاک

ZEALPAK سیمنٹ فیکٹری لمیٹڈ حیدرآباد

پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

29/2/57
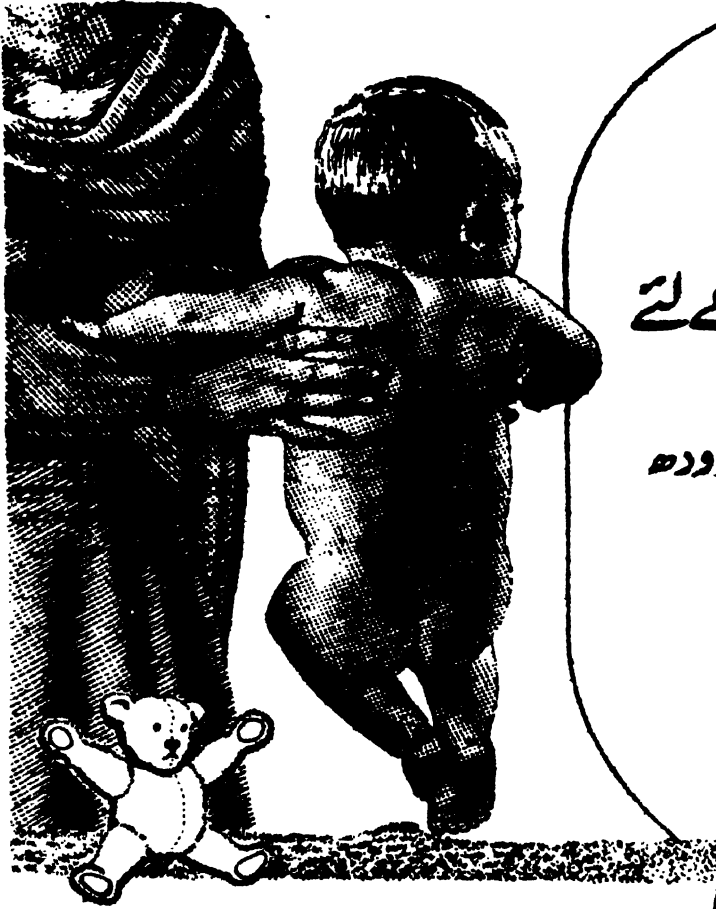
سیدھی پیٹھ
اور
مضبوط اعضاء کے لئے
اپنے
ننھے بچہ کو یہ خالص دودھ
دیجئے
OSTERMILK
اگر آپ کا بچہ بوتل سے دودھ پار ہا ہے تو اُس کے لئے آسٹر ملک بہترین ہے۔ یہ ایک خالص قوت بخش اور غذائیت والا دودھ ہے جس کے استعمال سے بچوں کی پیٹھ سیدھی اور اعضاء مضبوط ہو جاتے ہیں۔ ہڈیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے اسمیں وٹامن "ڈی" ملایا جاتا ہے اور لوہا شامل کیا جاتا ہے تاکہ بچے خون کی کمی والی بیماری سے محفوظ رہ سکیں۔ اس لئے آسٹر ملک فوراً خریدیئے۔ یہ خاص کر پاکستان میں بچوں کے لئے بیحد موزوں ہے۔
ہر ماں کے لئے مفید مشورہ
تین مہینے کی عمر تک بچہ کو ۲۴ گھنٹہ میں ۲۰ گھنٹہ سونا چاہئے اس عمر کے بعد نیند کم ہو جاتی ہے یہاں تک کہ نو مہینے کی عمر میں بچہ کو دن کے وقت صرف ۳ گھنٹہ اور ۲۴ گھنٹہ میں کُل ۱۶ گھنٹہ سونا چاہئے۔
آسٹر ملک
ماں کے دودھ سے قریب تر
گلیکسو لیبوریسٹریز (پاکستان) لمیٹڈ
کراچی لاہور چٹاگانگ ڈھاکہ

چین سے دو خط
انڈین ایجنسی جنرل
چنگ کنگ - چین
۲۵ اگست ۱۹۴۲ء
...... گذشتہ ہفتہ کی ڈاک میں آپ کی ارسال کردہ
"دل روز" کی شیشی ملی - شکریہ! مجھے دس سال کے عرصہ سے
یہ تکلیف تھی - ہر قسم کی دیسی و انگریزی ادویات استعمال
کیں مگر کچھ بھی آفاقہ نہ ہوا - "دل روز" کو صرف
چھ دن لگانے کے بعد تمام شکایت جاتی رہی -
کاش! مجھے پہلے ایسے تیر بہدف علاج کا علم ہوتا ......
ن - ا - خ
میجر
انڈین ایجنسی جنرل
چنگ کنگ - چین
۲۲ - جولائی ۱۹۴۲ء
...... مجھے کچھ عرصہ سے گردن پر ایک قسم کی تکلیف ہے
دانے سے ہیں جن کی وجہ سے خارش بہت ہوتی ہے
نشانات تو رنگ ورم سے ملتے جلتے ہیں مگر باوجود
انگریزی علاج کے آفاقہ نہیں ہوا - "الفضل" میں آپ
کی دوائی "دل روز" کا اشتہار دیکھ کر خیال ہوا کہ اسے بھی
استعمال کر دیکھوں ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ شفا دے کیا آپ
مہربانی فرما کر ایک شیشی "دل روز" مندرجہ بالا پتہ پر
بذریعہ پارسل روانہ کر سکتے ہیں ......
ن - ا - خ میجر
رجسٹرڈ
دل روز تمام لاعلاج جلدی امراض
ہر قسم کے پھوڑے پھنسی لاہوری پھوڑے
مغلائی پھوڑے - ناسور - بھگندر - بال توڑ - داد - چنبل - خارش
گنج - خنازیر - کچھ الی - گلٹی - رسولی - ماسخورہ - چنڈی - مستہ - مہاسہ
درد - جلن - سوجن - چوٹ - نئے اور پرانے زخم اور زہریلے جانوروں
کے کاٹے اور ڈسے کا بیضرر اور تیر بہدف علاج ہے -
چیر پھاڑ اور مرہم پٹی سے نجات دلاتی ہے
قیمت فی شیشی
دو روپیہ ---- ایک روپیہ ----
۱۹۰۴ء سے استعمال میں ہے
حکیم طاہر الدین اینڈ سنز دل روز والا فیروز پور روڈ لاہور پنجاب
ہر مشہور دوا فروش سے طلب کریں

ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ١٨٣ کراچی نے شائع کیا - مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس میکلوڈ روڈ - کراچی
مدیر: رفیق خاور

ہماری ادبی تاریخ ہماری قومی تاریخ کا ایک اہم جزو ہے۔ قوم کے ذہن و کردار کی پرداخت پچھلے دو سو سال میں کس کس طرح ہوتی رہی اور کن کن اہل کمال کی کارگزاری ہے۔ قومی شعور کی تربیت و ترتیب میں شامل رہی اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے اردو کی حریت پسند شاعری کے پچھلے دو سو برس کے سرمائے پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

ادارہ نے اس ضخیم مجموعے میں دو سو برس کی ملی شاعری کا انتخاب پیش کیا ہے جس میں اردو کے بیشتر نامور شعراء کا کلام یکجا ہو گیا ہے۔ اس طرح یہ نہ صرف حوادث ملی کی ایک منظوم داستان ہے، بلکہ ایک بہترین ادبی انتخاب بھی، جس کی قدر و قیمت محتاج بیان نہیں۔

ترتیب و مقدمہ : شان الحق حقی

اس دو سو سال کی شاعری کو چند ابواب میں سمویا گیا ہے۔ مثلاً:

۱۸۵۷ء سے پہلے		انقلاب ۱۸۵۷ء کا دور
پیغام بیداری	جدید عہد	صبحِ نو

مجلد، سرورق خوبصورت، رنگین اور دیدہ زیب

پوری کتاب نہایت نفیس ... میں طبع کی گئی ہے

صفحات ۳۵۰ - قیمت ... روپے آٹھ آنے

ادارہ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی